

اس شمارے میں

پرچے کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی ۔۔۔ [illegible] کہ تھوڑا سا میں بھی آرام کر لیتا ۔ یہی [illegible] خوبصورت وادیوں کی طرف نکل گیا تھا ۔

اس مرتبہ اُن تمام عنوانوں کے ماتحت مضامین [illegible] کئے جا رہے ہیں ۔ جن کا وعدہ سابقہ شمارے میں کیا گیا تھا ۔ نئے عنوان تھے گمشدہ مضامین ۔۔۔ حالات حاضر ۔۔۔ اور تصویریں ۔۔۔ ممکن ہے آپ اب کے [illegible] تصویریں نامی مضمونچے کو ڈھونڈیں اور وہ نہ ملے ۔ کیونکہ اس کی جگہ ایک اسکیچ (اختر اورینوی) پیش کیا جا رہا ہے ۔ ہرچند کہ دونوں مضمونوں کی حدود قدرے مختلف ہیں ۔ مگر ہیں یہ دونوں ایک ہی خاندان کے ۔۔۔ البتہ اس مرتبہ ایک اور نئے عنوان کے ماتحت ''کھلے خط'' چھاپے جا رہے ہیں ۔ کبھی کبھی مدیر کے نام بھی کام کے خط آ جاتے ہیں ۔ مگر وہ ذاتی چیز سمجھ کے ایک طرف ڈال دیئے جاتے ہیں ۔ اب کے راز یزدانی مرحوم کا ایک پرانا مگر تحقیقی نوعیت کا خط سامنے آ گیا تو میں نے اُسے ایک اور خط کے ساتھ پیش کر دینا مناسب جانا ۔ آئندہ بھی ہم اس سلسلے کو قائم رکھیں گے ۔

جن ادیبوں نے ہمیں نیا اندازِ فکر دیا ۔ اُن میں ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ بھی ہے ۔ آپ کو علم ہی ہوگا کہ میں بڑے ادیبوں کے مرنے پر یقین نہیں رکھتا ۔ اگر کسی ادیب کی تحریریں زندہ ہیں تو وہ خود زندہ ہے ۔ اگر یوں نہ ہوتا تو آج ہم ایلیٹ کے انتقال کے بعد' ان کی تحریروں کو نہ ڈھونڈھتے ۔۔۔ اس شمارہ میں ان کے ایک مضمون اور ایک نظم کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں ۔

نصیرالدین ہاشمی کا بھی ایک غیر مطبوعہ [illegible] ''اہلِ نوایط کی ادبی خدمات'' پیش کیا جا رہا ہے ۔ یہ مضمون وہ ہے ۔ جسے ہاشمی صاحب نے مرحمت فرماتے وقت وعدہ کیا تھا کہ اس کی دوسری قسط جلد ہی حیدرآباد جا کر بھجوادوں گا ۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون کے آخر میں لکھا ہے ۔ ''باقی آئندہ'' ۔۔۔ میں مرحوم نصیرالدین ہاشمی سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنا وعدہ پورا کریں ۔

ممتاز مفتی نے اب کے اپنے ایک نمائندہ افسانے ''آپا'' کا تجزیہ خود کیا ہے ۔ یہ سلسلہ بھی بڑا اہم ثابت ہو سکتا ہے ۔ ہم کوشش کریں گے کہ بڑے ادیبوں سے' ان کی نمائندہ تخلیق کے محرکات پر بھی لکھوائیں ۔

شوکت تھانوی کی ایک اہم تخلیق ''نسیم منزل'' کو بھی قسط وار پیش کرنے کا ارادہ ہے ۔ پہلی قسط حاضر ہے ۔ آئندہ بھی ہم اس سلسلے کو قائم رکھیں گے تاکہ ادارہ نقوش آپ کو یاد دلاتا رہے کہ شوکت تھانوی اُردو کے صاحبِ طرز ادیب تھے ۔ یوں اس لئے کر رہے ہیں کہ ہم اپنے محسنوں کو جلد ہی بھول جانے کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں ۔

بعض تخلیقات بر وقت نہ ملنے کی وجہ سے' صحیح جگہ پر نہیں آسکیں ۔ یہ مجبوری تھی ۔۔۔ ہر چند کہ کوئی بھی کسی کی مجبوری کو معاف نہیں کرتا ۔ مگر میں آپ سے درگزر کی درخواست تو کر سکتا ہوں ۔

• بابائے اُردو مولوی عبدالحق [illegible] تھے ۔ سوچتا ہوں ان کی یاد [illegible] کو بھی تحریر میں لائیں ۔

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

مجسٹریٹ ڈیکلریشن نمبر ۵۳۱۲

ٹیلیفون ۳۵۲۵
رہائش ۶۴۸۹۸

نقوش





قیمت موجودہ پرچہ
Rs. 15/2

مدیر
محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اردو ○ لاہور

ترتیب

افسانے، طنزیے، خاکے

حالاتِ حاضر

کُھلے خط

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر
ادارہ فروغِ اردو ایبک روڈ (انارکلی) لاہور سے شائع کیا

طلوع

جب سے میں نے یہ پڑھا ہے کہ تاریکیوں کے خلاف واویلا مچانے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا دیا جلا دیا جائے۔ اُس وقت سے میرا سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ میں اب یہ نہیں کہتا کہ فلاں ادارے نے کچھ نہیں کیا۔ فلاں ادیب نے کچھ نہیں کیا۔ فلاں رسالے نے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ اپنے طور پر یہ چاہنے لگا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے۔ ادب کی راہوں میں چھوٹے چھوٹے دیے جلا دوں۔

میرے ایک دوست نے کہا۔ "زندگی کسی کو مہلت نہیں دیتی۔ اِس لیے جلد سے جلد سب کچھ کر ڈالیں۔"

"مثلاً؟"

"گناہوں کا ارمان ہو تو اسے بھی جلد پورا کر لیجیے۔ اچھے کاموں کی خواہش ہو تو انہیں بھی جلد سے جلد پورا کریں۔"

گھبرا کر میں نے اپنے سارے ارمانوں پر نظر ڈالی۔ جو ابھی ناآسودہ تھے۔ چند ارمان ایسے نکلے۔ جس میں ذہن کی تسکین کے سامان نظر آئے۔ چند ارمان ایسے تھے۔ جن میں دل کی آسودگی کو مچلتے دیکھا۔ چند ارمان ایسے بھی تھے۔ جو محض خواب و خیال کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔

اپنے ارمانوں کو جب دل و دماغ کے ترازو میں تولا تو کبھی کوئی پلڑا جھکتا ہوا نظر آیا کبھی کوئی۔

میرے ذہن کے نہاں خانوں میں تو ایک دنیا بسی ہوئی تھی۔ جس سے میں کسی حد تک بے خبر تھا۔ یادوں نے ایک ساتھ پکارا تو نشے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اِس "مینا بازار" میں ایک خواہش کو رد کر کے دوسری کو فوقیت دینا مشکل ہو گیا۔

میں نے سوچا، زندگی مہلت دے یا نہ دے۔ کوئی مجھ سے میری آرزوؤں کو تو چھین کر نہیں لے جا سکتا۔ وہ میری ساتھی ہیں۔ دونوں جہان کی ساتھی!

میری سوچیں ابھی مجھے تھپکی ہی دے رہی تھیں کہ دفعتاً ایک ایک کر کے دیے جل اُٹھے اور میرا سینہ تن گیا!

اور اِدھر موت کو ایک ناآسودہ سی آرزو نے شکست دے دی!

محمد طفیل



سنتهالی

عمل ، زین‌العابدین

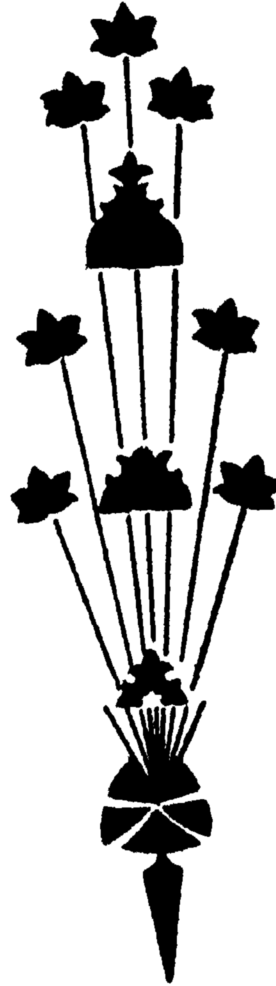
پیدائش : ۸ نومبر ۱۹۱۳ء

کلکتہ سکول آف آرٹس سے فائن آرٹس کی سند حاصل کی ۔ سپین ، میکسیکو ، جاپان اور ریاستہائے متحدہ میں کام کر چکے ہیں ۔ کالج آف آرٹس اینڈ کرافٹس ڈھاکہ کے پرنسپل ہیں ۔ اور اس وقت پشاور یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے قائم مقام چیئرمین ہیں ۔

یونیسکو اور دوسرے بین الاقوامی اداروں کے زیر اہتمام نمائشوں میں ان کی تصاویر نے خراج تحسین پایا ۔ برطانیہ ، فرانس ، ترکی ، جاپان ، میکسیکو ، ریاستہائے متحدہ اور روس میں ان کی یک شخصی نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں ۔

ہلال امتیاز اور صدر کے انعام یافتہ ہیں ۔

پدین



مقالے

شہر آشوب

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

میرا ایک مضمون 'شہر آشوب' کے عنوان سے لکھنؤ یونیورسٹی جرنل کے ۱۹۳۳ء کے سالنامے میں شایع ہوا۔ میں اُس مضمون میں وقتاً فوقتاً نئی معلومات کا اضافہ کرتا رہا۔ اِس اثنا میں محترمی ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک مبسوط تحقیقی مقالہ 'شہر آشوب کی تاریخ' کے عنوان سے لکھا جو اُن کے مجموعۂ مقالات 'بحث و نظر' میں شامل ہے۔ بہرحال میں اپنے مضمون میں اضافے کرتا رہا اور اب وہ مضمون تمام اضافوں کے ساتھ موجودہ صورت میں شایع کیا جا رہا ہے۔ موضوع کی یکسانی کے باعث میرے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے مقالوں میں بعض مضامین کا اشتراک ناگزیر ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جو ایک مقالے میں ہیں اور دوسرے میں نہیں ہیں۔ اس لیے ان دونوں مقالوں کے مطالعے سے شہر آشوب کے بارے میں سب کچھ نہ سہی، بہت کچھ ضرور معلوم ہو سکتا ہے۔

ادیب

شہر آشوب کا ابتدائی مفہوم اور اُس کی وجہِ تسمیہ

'شہر آشوب' ایک صنفِ نظم کا نام ہے، جو ابتدا میں ایسے قطعوں یا رباعیوں کا مجموعہ ہوتی تھی، جن میں مختلف طبقوں اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کے حُسن و جمال اور اُن کی دل کش اداؤں کا بیان ہوتا تھا۔ صرفی اعتبار سے لفظ 'شہر آشوب' یا مرکبِ اضافی ہے اضافتِ مقلوب کے ساتھ یعنی 'آشوبِ شہر' یا اسم فاعل ترکیبی ہے یعنی آشوبندۂ شہر۔ اس سے لغوی حیثیت سے شہر آشوب کے ایک معنی ہوئے شہر کے لیے فتنہ اور ہنگامہ، دوسرے معنی ہوئے شہر میں فتنے اور ہنگامے برپا کرنے والے۔ حاصل دونوں کا ایک ہے۔ حسین و جمیل لڑکوں کی ذات ہنگاموں کا باعث ہو سکتی تھی۔ یہی 'شہر آشوب' کی وجہِ تسمیہ ہے۔ خواجہ حافظ اور جامی کے مندرجۂ ذیل شعروں سے لفظ 'شہر آشوب' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے:-

فغان کین لولیانِ شوخ و شیرین کار و شہر آشوب
چنان بردند صبر از دل کہ ترکان خوانِ یغما را — حافظ

من نہ تنہا خواہم این خوبان شہر آشوب را
کیست در شہر آنکہ خواہان نیست رُوے خوب را — جامی

اکبر اعظم کے عہد میں یوسف علی حسینی جرجانی نے سو رباعیوں کا ایک مجموعہ صفت الاصناف کے نام سے مرتب کیا۔ اس کے دیباچے کی ابتدا رباعی اور حمد خدا سے کی ہے، جو حسب ذیل ہے :-

اے ماہ رُخ تو طالب اہلِ صلاح　　یوسف بجمالت نگران چون یعقوب

چون حُسن تو دو کرد آشہر آشوبے ست　　از حُسن جمال تست در شہر آشوب

اس رباعی کے آخری دو مصرعے بھی 'شہر آشوب' کی وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

شہر آشوب کا موضوع

حافظ محمود خاں شیرانی نے 'شہر آشوب' کی تعریف یوں کی ہے: "اس قسم کی نظمیں جن میں پیشہ وروں کا قطعات کی شکل میں ذکر ہو، 'شہر آشوب' کہلاتی ہیں۔" یہ تعریف ابتدائی شہر آشوبوں پر پورے طور پر صادق نہیں آتی۔ ان میں پیشہ وروں کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ جیسا اوپر کہا جا چکا ہے، پیشہ ور لڑکوں کے حُسن و جمال اور ان کی دل کش اداؤں کا ذکر ہوتا ہے۔ بعد کے بعض شہر آشوبوں کا موضوع بھی یہی ہے۔

شہر آشوب کی ہیئت اور موضوع میں تنوع

امتداد زمانہ کے ساتھ شہر آشوب کی ہیئت میں تنوع پیدا ہوتا گیا اور اس نے قطعوں اور رُباعیوں کے علاوہ کبھی مختصر مثنویوں یا منفرد شعروں کے مجموعے کی شکل اختیار کر لی، کبھی قصیدے کی، کبھی مخمس کی اور کبھی مسدس کی۔ اس کے موضوع میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ اس میں کبھی شہر کے مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا بیان کبھی ہمدردی کے رنگ میں کبھی تضحیک اور ہجو کے انداز میں ہونے لگا۔ اور آخر کار 'شہر آشوب' سے ایسی نظم مراد لی جانے لگی، جس میں کسی شہر کی تباہی اور اہل شہر کی بدحالی کا بیان ہو۔ اس طرح 'شہر آشوب' کی حسب ذیل تین قسمیں ہو گئیں :-

۱۔ ایسے قطعوں، رُباعیوں، مختصر مثنویوں یا منفرد شعروں کا مجموعہ جن میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کے حُسن اور ان کی دل کش اداؤں کا ذکر ہو۔

۲۔ ایسی نظم جس میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا ذکر ہمدردی کے رنگ میں یا تضحیک و ہجو کے انداز میں کیا گیا ہو، خواہ قصیدے کی شکل میں، خواہ مثنوی، مخمس یا مسدس کی شکل میں۔

۳۔ ایسی نظم جس میں کسی شہر کی تباہی اور اہل شہر کی بدحالی کا بیان کیا گیا ہو، خواہ کسی شکل میں ہو۔

'شہر آشوب' کی ہیئت اور موضوع کی توضیح کے بعد اب فارسی اور اُردو کے کچھ شہر آشوبوں کی کیفیت تاریخی ترتیب سے بیان کی جاتی ہے اور ان کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس طرح 'شہر آشوب' کے تدریجی ارتقا کا خاکہ سامنے آ جائے گا۔

شہر آشوب کا مُوجد

سب سے قدیم چیز جو 'شہر آشوب' کے نام سے ملتی ہے، وہ مسعود سعد سلمان متوفی ۵۱۵ھ کے باغی فارسی قطعوں کا مجموعہ ہے، جو ان کے کلیات میں شامل ہے۔ اس لیے ہم اسی قدیم شاعر کو 'شہر آشوب' کا مُوجد کہہ سکتے ہیں۔ ان قطعوں میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کا ذکر ہے، جو یار اور دلبر کے لفظوں سے

پائے گئے ہیں۔ مثال کے لیے چند قطعے مع عنوانوں کے نقل کیے جاتے ہیں۔ ہر قطعے کا عنوان ایک مصرع ہے۔

صفت یار رنگریز گُند

چشم زرد کرد آن رُخِ رنگریز — کہ بالاش سرو است ودرُخ آفتاب

بشستش پس از رنگ آب دو چشم — کہ شست آب ہجران آن ہر دو خواب

بلے بر چہ رنگش کُند رنگریز — از آن پس بشوید مرا در آب

در حق دلبر خباز بگفت

آنکہ او بر دُکان ز بس خوبی — ہمچو خورشید بر سپہر آمد

شد قمر از تنور چون دل من — باد در رفت و باد در مہر آمد

صفت یار کبوتر باز است

اُنس تو با کبوتر است ہمہ — تنگری از ہوس بجا کرخویش

ہم بساعت بر تو باز آید — ہر کبوتر کہ رانی از بر خویش

رفتن و آمدن نبرد رہی — چون نیاموزی از کبوتر خویش

صفت یار بربطی گفتہ

بتا زہرۂ آسمان جمالی — چو زہرہ بمن بر تو فرخندہ فالی

کمند تو خالی نہ باشد ز بربط — نہ بربط نہ باشد بلے زہرہ خالی

اسی طرح بہت سے طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کا ذکر ہے، جن میں سے چند یہ ہیں۔ عنبر فروش، چاہ کن، رقاص، آہن گر، فیروزہ فروش، کاتب، قصاب، طبیب، منجم، عطار، دیبا باف، شاعر، نجومی، چوگان باز، قلندر، لشکری، تیغ زن، کشتی گیر۔ بعض لڑکوں کا ذکر ان کے اوصاف کے ساتھ کیا ہے، مثلاً نو خط، خوش آواز، زرین کمر، خوش رو، حاجی، فلسفی۔ بعض لڑکوں کا ذکر ان کے عیوب کے ساتھ کیا ہے، مثلاً نابینا، گنگ، احول، رگ زدہ، خط بر آوردہ، سیل چشم، گریاں۔ یہ قطعے مختلف بحروں میں ہیں اور ان میں بیتوں کی تعداد دو سے نو تک ہے۔

ان قطعوں میں جن یاروں یا دلبروں کا ذکر کیا گیا ہے، عالمِ خیال کے سوا خارجی دُنیا میں اُن کا وجود نہیں، اور تفنّنِ طبع کے سوا ان قطعوں کی تصنیف کا کوئی مقصد نہیں۔ اِس قسم کے تمام شہر آشوبوں کا یہی حال ہے۔

اسی طرح کا ایک شہر آشوب امیر خسرو متوفی ۷۲۵ھ کی طرف منسوب کیا گیا، مگر غالباً کسی بہت بعد کے شاعر کی تصنیف

ہے۔ یہ شہر آشوب خسرو کی متعدد چھوٹی چھوٹی تصنیفوں کے ساتھ کتاب جواہر خسروی میں شامل کر کے شایع کر دیا گیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے میں بھی ہے۔ یہ شہر آشوب سترسٹھ رُباعیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر رُباعی میں کسی لڑکے کے حسن اور اُس کی اداؤں کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ لڑکے زیادہ تر پیشہ وروں کے ہیں، مثلاً بزاز پسر، حجام پسر، نجار پسر، زرگر پسر، بقال پسر، قصاب پسر، صراف پسر، حلاج پسر۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو کسی پیشے سے نہیں، بلکہ کسی قوم یا فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً ہندو پسر، ترسا بچہ، ترک زادہ، پسر زاہد، افغان پسر۔

شہر آشوب کی ادبی حیثیت

شہر آشوب رباعیوں کی صورت میں ہو یا قطعوں کی، مختصر مثنویوں کی صورت میں ہو یا منفرد شعروں کی، شاعر اُن میں لفظی رعائتیں، ذومعنی لفظ اور فقرے اور اسی طرح کے دُوسرے تکلفات کا استعمال التزاماً کرتا ہے، بلکہ اپنے بیان کی بنیاد انھی چیزوں پر رکھتا ہے۔ اس لیے اُن کی حیثیت ادبی لطیفوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ابتداً میں شہر آشوب کی تصنیف کا مقصد بھی تفنن طبع کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

رُباعیات شہر آشوب منسوب بہ امیر خسرو

جو شہر آشوب امیر خسرو کی طرف منسوب ہے، اس کی چند رُباعیاں ملاحظہ ہوں۔

در صفت بزاز پسر

بزاز پسر کہ کار اُش جور و جفاست ۔۔۔ با زلف سیاہ تافتہ طرفہ بلاست
مشروع بہ دین اوست ظلم و بیداد ۔۔۔ کز آب نیاز راہ او دیدۂ ماست

در صفت حجام پسر

حجام پسر بخوبی و رعنائی ۔۔۔ دی آئینہ بنمود بدان زیبائی
گفتم صنما در برت آیم نایم؟ ۔۔۔ فریاد بر آورد کہ نائی نائی

در صفت رنگریز پسر

رنگریز بچہ کہ دلم بیقرار اوست ۔۔۔ کش رو بہ عشوہ رنگ نمودن شعار اوست
شہنانہ اشک چشم مرا آل کردہ است ۔۔۔ در شہر ہر کجا رُخ زرد لیست کار اوست۔

در صفت بقال پسر

بقال پسر کہ راحت جان آمد ۔۔۔ یک گل بر خش ہزار بستان آمد

دویشں پسِ بچہ ترازو می تاختت — گوئی کہ مگر ماہ بمیزان آمد

در صفتِ ترسا بچہ

اے بُت بسر مسیح گر ترسائی — باید کہ ببوسے بندہ بے ترس آئی
گر چشم ترم بہ آستین پاک کُنی — گہ برلب خشک من لب تر سائی

شہرآشوب کی غلط مثالیں

امیر خسرو نے اپنے فارسی اشعار میں جو ہندی لفظ اور فقرے جا بجا داخل کر دیے ہیں، ان کی مثال میں حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اُردو میں یہ رُباعی پیش کی ہے:۔

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے — از دست و زبانِ چرب اُو واویلے
خالے بہ لبش دیدم و گفتم کہ تل است — گفتا کہ بر و نیست دریں تل تیلے

اور اس رُباعی کو از قسم شہرآشوب قرار دیا ہے لیکن صرف ایک رُباعی پر شہرآشوب کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ آگے چل کر فرماتے ہیں "اشعار ذیل بھی صنف شہرآشوب سے تعلق رکھتے ہیں":

رفتم بہ تماشا بہ کنارِ جوئے — دیدم بہ لب آب زن ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے مویت — فریاد بر آورد کہ دُر دُر موئے

اس رُباعی کو صنف شہرآشوب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں کسی پیشہ ور لڑکے کا ذکر نہیں ہے۔ صرف ایک فقرہ 'دُر دُر موئے' ایسا آگیا ہے جو ذو لسانین بھی ہے اور ذو معنیین بھی۔ اس فقرے کو اگر فارسی سمجھیے تو ایک معنی نکلتے ہیں اور اگر ہندی سمجھیے تو دوسرے معنی نکلتے ہیں۔[1]

---

[1] ملا عبدالباسط باسط امیٹھوی (متوفی ۱۱۶۵ھ) نے اپنی کتاب منار الضوابط میں امیر خسرو کا اِسی طرح کا ایک شعر لکھا ہے جو حسب ذیل ہے:

گفتم کہ درین خانۂ مامون تو مانم — گفتا کہ درین خانہ بلا ئیست ممانی

اس شعر میں دو لفظ مامون اور ممانی ذو لسانین اور ذو معنیین ہیں۔ باسط نے اسی مقام پر امیر خسرو کی ایک رُباعی بھی لکھی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

داریم آرزو کہ حکایت کنیم بات — لالہ غلام روئے تو صد برگ زیر پات
ہر برہمن کہ دید رُخ خوبت اے صنم — زنّار را گسست و لگد زد برُوئے لات

اس رُباعی میں نشان زدہ الفاظ پر ہندی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے مگر وہ فارسی ہیں۔ بات یعنی باتو 'لالہ' ایک مشہور و معروف پھول 'پات' یعنی پائے تو 'لات' ایک بُت کا نام۔ منار الضوابط کا ایک قدیم اور خوش خط لیکن ناقص نسخہ میرے کُتب خانے میں موجود ہے۔
ادیب

اکبر بادشاہ اور شہر آشوب

اکبری عہد کی تصنیف صنعت الاصناف کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف لکھتا ہے کہ ایک وقت بادشاہ نے کارخانۂ دولت کی طرف توجہ فرمائی۔ صنعت گروں کی صنعت ملاحظہ کی اور جس کسی کی صنعت دیکھی، اُس کے بارے میں ایک شعر کہہ دیا۔ چنانچہ چھیپی گر کی تعریف میں یہ مطلع کہا:

دلبر چھیپی گر اُو در حسن بے ہمتا بُود　　حرف ہائے چاپہ اُو سرنوشت ما بود

اسی حال میں حکم ہوا کہ شعرا صنعت گروں اور پیشہ وروں کے حسن کی تعریف میں اشعار کہہ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔ شاعروں نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہی عنایتوں سے سرفراز ہوئے۔ میں نے بھی چند شعر عرض کیے اور الطاف خسروانہ سے مستفیض ہوا۔ چونکہ بادشاہ نے مجھ پر سب سے زیادہ توجہ اور عنایت فرمائی، لہٰذا یہ قطعہ نظم ہوگیا:۔

خسرو عالم سخن رانی　　شاہ اکبر شہ فلک مقدار
شعرا را طلب نمود شبے　　کہ فشانند گوہر اشعار
ہمہ زنقد و پیش کش کردند　　از دُر نظم لولوے شہوار
بہ ہمہ لطفہا نمود و لے　　بہ ہمہ اندک و بہ من بسیار
گرچہ من خار بودم و ہمہ گل　　من شدم گل بہ پیش من ہمہ خار

دربار سے واپس آکر میں نے یہ رسالہ ترتیب دیا اور صنعت الاصناف[1] اس کا نام رکھا، کہ خسرو مُلکِ سخن کی نظر میں شرفِ قبول حاصل کرے۔

یوسف جرجانی کا شہر آشوب مسمّٰی بہ صنعت الاصناف

صنعت الاصناف میں کل ستّر رباعیاں ہیں۔ ذیل کی رُباعی سے شہر آشوب کی ابتدا کی گئی ہے۔

نقد سخنم کہ بے غش و دلخواہ است　　بادشاہ و گدا نفع رساں چوں ماہ است
در عالم معنی شرفش بر زرِ مہر　　از نام جہان پناہ اکبر شاہ است

اس کے بعد اٹھاونے رُباعیوں میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کی تعریف کی گئی ہے۔ آخری رُباعی در تعریف یوسف نام خود، جس پر شہر آشوب ختم ہوتا ہے یہ ہے:۔

یوسف سخن از بستان بازار مگو　　تا گل باشد حکایت خار مگو
در زاویۂ فکر کہ خاموشانند　　خاموش نشین بیہدہ بسیار مگو

یوسف جرجانی کی چند رُباعیاں صنعت الاصناف سے نقل کی جاتی ہیں:۔

---

[1] صنعت الاصناف کا ایک قدیم قلمی نسخہ راقم کے کُتب خانے میں موجود ہے۔

در تعریف شاعر پسر

شاعر پسرے کہ چوں سخن شیریں است — در ملک سخن خسرو معنی بین است
ہم سرو قدش چو طبع او موزو نست — ہم لعل لبش چو شعر او رنگین است

در تعریف آتشباز پسر

آتش بازے کہ آتش عشق افروخت — آتش بازی ز طرۂ خویش آموخت
در معرکہ کہ آتش افشانی کرد — یک چشم زدن تمام عالم را سوخت

در تعریف زرگر پسر

زرگر کہ دل از وفاش نازد مارا — در بوتۂ ہجر می گدازد مارا
از لطف بدست ما دہد خاتم لعل — تا حلقہ بگوش خویش سازد مارا

فارسی میں شہر آشوب کا وجود

گب ( ) نے اپنی کتاب 'ترکی شاعری کی تاریخ' میں مسیحی متوفی ۹۱۸ھ کی ایک نظم 'شہر انگیز' کا ذکر کیا ہے، جو اُس نے شہر ایدریانوپل کے متعلق لکھی تھی اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ فارسی میں اس طرح کی کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران میں اس دعوے کو رد کرتے ہوئے تحفۂ سامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ فارسی میں کم سے کم ایسی دو نظمیں ضرور موجود ہیں، ایک وحیدی قمی کی نظم تبریز پر اور دوسری حرفی اصفہانی کی نظم گیلان پر۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تحفۂ سامی میں ایسی دو نہیں، چار نظموں کا ذکر کیا گیا ہے جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

آگہی خراسانی کا شہر آشوب

سلطان حسین میرزا کے زمانے میں آگہی خراسانی (متوفی ۹۳۲ھ) ایک فاضل انشا پرداز اور قصیدہ گو شاعر تھا، مگر اس کے مزاج میں خباثت اور حرصِ دنیا بہت تھی۔ اُس نے امیر خسرو کے قصیدے 'دریائے ابرار' کے جواب میں اہل ہرات کی ہجو میں ایک شہر آشوب لکھا، جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

عرصۂ شہر ہری رشک بہشت افزاست — درگہش را چشمۂ خورشید گل میخ زر است
جرم طینی یکمشت خاک از خاک نیر خند فش — نرگس باغ جہاں آرائے او ہفت اختر است
پائے تخت صد ہزاران خسرو گیتی کشاست — کہنہ تاریخ بسے شاہان انجم لشکر است
چرخ کج رو بین کہ از تاثیر او شہر چنین — مسکن جمع پریشان رندگا رہ ابتر است

اس قصیدے میں رکیک الفاظ بہت آئے ہیں، جو ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن دو شعر جو خواجہ معین کیال کے لیے لکھے گئے ہیں اُن میں اُس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

از بس فشان ہاے نجاست مدہ ہزار | اخترہ زآبلہ بر روسے آن بدا خترا ست
[illegible] شتش از کثافت مطبخ مسرددرا | گنبد کگیر سیت لیکہ ولی خاکسترا ست

مولانا احمد طبسی جو احمد آتون کہلاتے تھے اور شاہ اسمٰعیل کے معتمد رہ چکے تھے، اُن کے لیے یہ شعر کہا:

احمد آتون گمے سشیعی گمے سُنی بود | چون طیواجے کرشش مہادہ وکشش مرزا ست

اس شہر آشوب سے ناراض ہوکر امیر خان حاکم ہرات نے اُنھی کا ہاتھ اور زبان کاٹ ڈالی۔

وحیدی قمی کا شہر انگیز

وحیدی قمی متوفی ۱۰۴۲ھ فہم عالی و ذہن جلی رکھتا تھا۔ اُس میں اور مولانا حبرتی مروی میں عمر بھر چپقلش رہی اور دونوں نے ایک دُوسرے کی نہایت رکیک ہجویں کہیں، جو نقل کرنے کے قابل نہیں۔

وحیدی نے تبریز کے لیے ایک 'شہر انگیز' بھی کہا، جس کے چند شعر یہ ہیں:

شکر للہ کہ بہر شہر انگیز | از ھری آدم سوے تبریز
تا بوصف بتانِ تبریزی | ہم چو طوطی کنم شکر ریزی
وہ چہ تبریز رشکِ بہشت بہشت | مردمش خوب رو و پاک سرشت
نازنینان بہ ناز و محبوبی | در کمالِ لطافت و خوبی

اس شہر انگیز میں پسر شیشہ گر کی تعریف میں یہ دو شعر کہے ہیں:

دلبرے شیشہ گر بہ رعنائی | مردم دیدہ راست بینائی
بسکہ شد شیشہ اش پسندیدہ | ہمچو عینک نہند بر دیدہ

ان شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحیدی کا 'شہر انگیز' قدیم مفہوم میں 'شہر آشوب' ہے۔

عشقی کا شہر انگیز

عشقی مکتب داری کرتا تھا۔ اُس نے تبریز کے لیے ایک 'شہر انگیز' کہا، جس کا ایک شعر یہ ہے:

ہر کہ او عاشق نہ مال ست | بر سر کوے عشق پامال است

حرفی اصفہانی کا شہر آشوب

حرفی اصفہانی گیلان گیا اور اُس شہر اور اہلِ شہر کی ہجو میں ایک 'شہر آشوب' لکھا۔ اُس پر مرتد ہونے کی تہمت لگا کر اُس کی زبان کاٹ ڈالی گئی۔

ذاتی لاری کا ایک مطلع

ذاتی لاری تبریز میں صحافی کا پیشہ کرتا تھا۔ شہر تبریز کی تعریف میں اُس کا یہ مطلع نسخۂ سامی میں نقل کیا گیا ہے:

ہر طرف شوخے و ہر گوشہ بلا انگیزیست | بہ تماشا قدمے نہ کہ عجب تبریزیست

اگر یہ کسی مسلسل نظم کا مطلع ہے تو وہ بھی شہر آشوب ہی کی قسم کی نظم ہو گی۔

تحفۂ سامی اور مذکورۂ بالا شہر آشوبوں کی نوعیت

تحفۂ سامی کا مصنف سام میرزا شاہ اسمعیل بانی سلطنت صفویہ کا فرزند تھا۔ اُس نے یہ کتاب ۹۵۷ھ میں لکھی۔ کتاب میں سات صحیفے ہیں۔ پانچویں صحیفے میں فارسی کے شاعروں کا ذکر ہے، صرف ان شاعروں کا جو مصنف کے ہم عصر تھے۔ سام میرزا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آگہی اور حرفی کے شہر آشوب میں ہرات اور گیلان کے لوگوں کی سخت ہجو کی گئی تھی اور وحیدی قمی کے شہر انگیز میں وصفِ بتانِ تبریزی، یعنی تبریز کے مختلف پیشہ وروں کے لڑکوں کے حسن و جمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ عشقی کے شہر انگیز کا صرف ایک ہی شعر سامنے ہے اور اس سے گمان ہوتا ہے کہ اِس نظم کا موضوع بھی 'وصفِ بتانِ تبریزی' ہے۔ یہ چاروں شاعر سام میرزا کے ہم عصر تھے۔ ان کی زیرِ نظر نظموں میں دو ایسی ہیں، جن میں کسی شہر کے لوگوں کی ہجو کی گئی ہے اور دو ایسی ہیں جن میں مختلف طبقوں اور مختلف پیشہ وروں کے لڑکوں کے حسن کا ذکر کیا گیا ہے۔ شکل کے اعتبار سے ایک قصیدہ ہے، ایک مثنوی ہے اور دو کی کیا شکل تھی معلوم نہیں۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:-

"تبریز اور ہرات کے علاوہ بعض اور شہر آشوبوں کا ذکر بھی تحفۂ سامی میں آیا ہے،
مثلاً فغفور لاہجی کا شہر آشوب گرجستان، عشقی کا شہر آشوب تبریز۔ اسی طرح
وجیہ الدین عبداللہ لسانی شیرازی کا شہر آشوب خطۂ تبریز۔"

میرے مطالعے میں تحفۂ سامی کا وُہ ایڈیشن رہا ہے جو پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۳۴ء میں شایع کیا تھا۔ اُس میں نہ فغفور لاہجی کا ذکر ملتا ہے نہ لسانی شیرازی کے شہر آشوب کا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے لسانی کا نام 'وجیہ الدین عبداللہ' لکھا ہے۔ یہ نام بھی تحفہ سامی کے اس ایڈیشن میں موجود نہیں ہے۔

طاہر وحید کے 'ابیات در تعریف ہر فرقہ'

شاہ عباس ثانی صفوی (۱۶۴۲ء تا ۱۶۶۶ء) کے وقایع نگار طاہر وحید (متوفی ۱۱۲۰ھ و ۱۷۰۸ء عیسوی) نے اپنی ایک نظم میں ہر طبقے کے لڑکوں کا ذکر ایک دو شعروں میں اور بعضوں کا تین چار شعروں میں کیا ہے۔ یہ اشعار قدیم بیاض میں، جو میرے کتب خانے میں موجود ہے، 'ابیات در تعریف ہر فرقہ' کے عنوان سے درج ہیں۔ ان میں سے چند شعر نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

زرگر پسر

زرگر پسران نازک اندام — ہستند ہمہ چو نقرۂ خام
خاطر دل خستہ پریشان — انگشتر زینہار ایشان

حدّاد پسر

حدّاد خبر ندارد از درد — بیہودہ چہ کوبم آہن سرد

نجار پسر

نجار پسر زند ہمیشہ — بر پای دلم ز جور تیشہ
گامے کہ نہادہ بس کشیدہ — چون ارہ امید من بریدہ

کمال

کمال کہ دبیری فن اوست — چشم روشن ز دیدن اوست

نعمت خان عالی کا قصیدۂ شہر آشوب

عہد عالم گیری میں نعمت خان عالی کی مشہور کتاب "وقایع محاصرۂ گولکنڈہ" میں ایک "قصیدۂ شہر آشوب" ملتا ہے، جس میں اہل دکن کی پریشاں حالی بیان کی گئی ہے۔ یہ قصیدہ شہر آشوب کے نئے مفہوم کے مطابق شہر آشوب ہے۔ لیکن اس میں شہر آشوب کے پرانے مفہوم کی جھلک بھی موجود ہے، کیونکہ اس میں مختلف طبقوں اور پیشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس قصیدے کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:-

درین فلک خراب امروز کس را نیست سامانے — چو گنج افتادہ اند اہل ہنر در کنج ویرانے
بسر حد رسیدہ خلق را افراد ناداری — کہ معنی ہم ندارد این زمان حرف سخندانے
سپاہی ہم بہ میدان قناعت می کند جولان — ز شمشیر و سپر دارد دم آبے لب نانے
طبیب از علم طب دریا دمی دارد بہ ہمین معنی — نباشد خوب تر از شربت دینار درمانے
منجم را نشد غیر فلاکت از فلک حاصل — ز ضعف جوع بیند قرص مہ را گردۂ نانے
محاسب سال را نبوشت ماہ روزہ در دفتر — برائے آن کہ معلومش نشد شوال و شعبانے
نماندہ پیش نشاطی بجائے رشتۂ شمعے — مگر از عشق بازان وام گیرد رشتۂ جانے
رسد تا جان سپاری کار جنبولی ز بے برگی — برائے سرخروئی چون ندارد بیسرۂ پانے
بردگر ارہ را از خانۂ خود راند از خست — مگر بر ریزۂ خوانش نمودہ تیز دندانے
نہ بیند روی زر حجام اگر آئینہ نفروشد — کہ یک مو در بساطش نیست غیر از چشم حیرانے
غم روزی بہ خلاج آتش است و پنبہ می گوید — بہ این نسبت بود بردار رفتن کار آسانے
ز گھریالی یکے پرسید از روزت چہ ماندہ آیا — بگفت احوال اگر این است پہرے ساعتے آنے
صدائے ماتمے از خانۂ برخاست پرسیدم — چہ شد گفتند در این خانہ وارد گشت مہمانے
ز جائے غلغل شادی شنیدم گفت ہمسایہ — کہ شخصے دید شب در واقعہ پُر آرد انبانے
یکے گفتہ خداوندا بحق نوح پیغمبر — برائے قلعۂ گولکندہ کن ایجاد طوفانے

یکے می گفت اے رحمان بحق موسیٰ عمران ... بیار از آسمان ترانگبین یا مرغ بریانے
یکے گفت اے خداوندکریم از حرمت موسیٰ ... برائے مافرست امروز ہم چون مائدہ خوانے
یکے می گفت بہر قرض دادن خلق کن یارب ... یہودے، ہندوے، نصرانیے، گبرے، مسلمانے

یکتاخوشابی کا جہان آشوب احمد یار خان یکتاخوشابی خلد مکان (شہنشاہ اورنگ زیب) کے اواخر عہد میں ملک سندھ کا صوبہ دار تھا۔ مثنوی خوب کہتا تھا۔ ایک مثنوی عالمگیر کے مرثیے میں کہی، جس کا نام 'جہاں آشوب' رکھا۔ اس کے دو شعر یہ ہیں :-

امیران کہن بے قدر وقیمت ... چو مال مردہ پامال غنیمت
ہمہ در خاک بے قدری فسردہ ... چو شمشیر اصیل زنگ خوردہ

(تذکرہ بے نظیر)

فارسی کے کل شہر آشوبوں کا پتا لگانا مقصود نہیں ہے۔ اوپر جن شہر آشوبوں کا ذکر کیا جا چکا ہے وہ شہر آشوب کے [لغو]ی اور اصطلاحی معنی اور اس کے بنیادی یا ابتدائی اور ثانوی یا توسیعی مفہوموں اور ہیئتوں کی توضیح کے لیے [کا]فی ہیں۔

[ا]ردو شہر آشوب کی ایک مشکوک مثال اردو میں متعدد شہر آشوب کہے گئے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں ذیل کا قطعہ شہر آشوب کی مثال میں پیش کیا گیا ہے اور امیر خسرو کی طرف منسوب کیا [گی]ا ہے :-

ہندو بچہ بین کہ عجب حسن دھرے چھے ... بر وقت سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم ؟ ... گفتا کہ ارے رام ترک کا ہیں کرے چھے

[ی]ہ قطعہ امیر خسرو کی تصنیف ہو یا نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ کسی قدیم شاعر نے اُس ابتدائی دور میں کہا ہے، جب فارسی اور [ہ]ندی کی آمیزش سے اُردو کا پیکر تیار ہو رہا تھا۔ اِس ایک قطعے کو انفرادی حیثیت میں شہر آشوب نہیں کہہ سکتے، مگر ممکن ہے کہ یہ کسی مجموعۂ قطعات میں شامل ہو، جس کو مجموعی حیثیت سے شہر آشوب کہہ سکتے ہوں۔

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا عام رواج محمد شاہ کے عہد میں ہُوا۔ اس عہد کے کئی شاعروں نے شہر آشوب کہے ہیں، جن [م]یں زمانی ترتیب قائم کرنا مشکل ہے۔ اس لیے ان ہم عصر شاعروں کے شہر آشوب بلا لحاظ ترتیب پیش کیے جاتے ہیں۔

ناجی کا شہر آشوب محمد شاکر ناجی محمد شاہی عہد کے نامی شاعر تھے۔ ان کے بارے میں آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں :-

"نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے۔ اس وقت دربار کا رنگ، شرفا کی خواری، پاجیوں کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور

[illegible] کو ایک طولانی مخمس میں دکھایا ہے۔"

ناجی کے اس مخمس کو شہر آشوب کہہ سکتے ہیں۔ آزاد نے اس مخمس کے حسب ذیل دو بند نقل کیے ہیں:۔

لٹے ہوئے تو برس بیٹی اُن کو بیتے تھے ۔۔۔ دُعا کے زور سے دائی و دوا کی جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالی منہ سے پیتے تھے ۔۔۔ نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے
گلے میں ہنسیاں بازو اُپر طلا کے نال

قضا سے بچ گیا مرا نہیں تو ٹھانا تھا ۔۔۔ کہ میں نشان کے ہاتھی اُپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا ۔۔۔ بلے تھے وھاں جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دکاں نہ فلہ و بقال

ناجی کے یہ دونوں بند چند لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ مجموعۂ نغز میں بھی نقل کیے گئے ہیں۔

کمترین کا شہر آشوب میر خان کمترین جو آبرو اور ناجی کے ہم عصر تھے اور میر و سودا کے عہد تک زندہ رہے، ہجو گوئی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ علی ابراہیم خاں تذکرۂ گلزار ابراہیم میں لکھتے ہیں، "مجریہ شہر آشوب دو ہجو بر قوم گفتہ" اور مخزن نکات کے مولف قائم چاند پوری کہتے ہیں" ہفت صد شعر در مذمت اہل حرفہ بر سبیل شہر آشوب ازو سے یادگار است۔" اگر قائم کا یہ بیان صحیح ہے تو شاید اس سے زیادہ طولانی شہر آشوب نہ فارسی میں کہا گیا اور نہ اُردو میں۔ ان سات سو شعروں میں صرف پانچ شعر میر نے نکات الشعرا میں اور پانچ ہی شعر میر حسن نے اپنے تذکرۂ شعرا میں نقل کیے ہیں، مگر وہ ایسے خلاف تہذیب ہیں کہ تذکرۂ میر حسن کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن میں حذف کر دیے گئے۔ ان شعروں میں مشعلچی، پکوان والی، خیمہ دوز، فراش اور پنکھا فروش کی ہجو کی گئی ہے۔

ان شعروں پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمترین کے شہر آشوب میں مختلف پیشوں کے آدمیوں کی ہجو ایک ایک مختصر مثنوی میں کی گئی ہے اور ان مثنویوں میں ایک بحر کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔

حاتم کی بارہ صدی شاہ حاتم کی دو نظمیں "بارہ صدی" کے عنوان سے ایک قدیم بیاض میں شامل ہیں۔[1] دونوں شکل میں مخمس اور موضوع کے اعتبار سے شہر آشوب ہیں۔ ان میں سے ایک نظم "شہر آشوب حاتم دہلوی" کے عنوان سے رسالۂ نقوش لاہور کے دسمبر ۱۹۶۱ء کے شمارے میں شایع کر دی گئی ہے، جس میں اکیس بند ہیں۔ بیاض میں صرف گیارہ بند ہیں، مگر اُن میں تین بند ایسے موجود ہیں، جو نقوش میں نہیں ہیں۔ اُن میں ایک اس نظم کا پہلا بند ہے اور ایک آخری۔

---

[1] دو نایاب زمانہ بیاضیں، مرتبہ عبدالباری آسی، مطبوعہ کراؤن پریس الہ آباد، ۱۹۴۲ء، شایع کردہ ہندوستانی اکیڈیمی، الہ آباد، ۱۹۴۲ء

اِس مخمس کا پہلا بند، جس سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ 'بارہ صدی' سے حاتم کی مُراد ہے بارھویں صدی ہجری، جس میں اُن کی زندگی گزر رہی تھی، حسب ذیل ہے:-

تُو کھول چشم دل اور دیکھ قدرت کرتار	کہ جن نے ارض و سما اور کیا ہے لیل و نہار
نوا کے سیس نگارہ سما تو ھسر کے دوار	کہ دور بارہ صدی کا ہے سخت ناہنجار

جہاں کے باغ میں یکساں ہے اب خزان و بہار

اور آخری بند یہ ہے:-

کرے ہے چرخ اگر تجھ اُپر جفا حاتم	تو سطلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتم
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم	تو انقلاب زمانے کا غم نہ کھا حاتم

تیسرا بند جو نقوش میں نہیں ہے حسب ذیل ہے:-

نہ کر تو جا تجھ کہ نقارچی کی نوبت ہے	مصاحبت کی اگر جلد اس کو خدمت ہے
کمینہ قوم کو ہر اک مکان پہ عزت ہے	تو کیا ہوا کہ رذالے کی زر پتی پت ہے

ہے افتخار نجیبوں کا فخر و عزت و عار

حاتم کے اس شہر آشوب کا بُنیادی موضوع وہ سماجی انقلاب ہے، جو نادر شاہ کے حملے سے وجود میں آیا تھا اور جس کے نتیجے میں طبقاتی نشیب و فراز میں کچھ ہمواری پیدا ہو رہی تھی۔ یعنی اونچے طبقے کچھ نیچے اُتر رہے تھے اور نیچے طبقے اُوپر اُٹھ رہے تھے۔ حاتم اُونچے طبقے کے آدمی تھے۔ وہ اس انقلاب کو ایک مصیبت عظیم سمجھ رہے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کو حاکموں، امیروں، منصب داروں اور اہلکاروں کی بداخلاقی اور بداعمالی کی شکایت بھی تھی۔ اس شہر آشوب کے کچھ ٹکڑے نقل کیے جاتے ہیں:-

شہروں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں	امیروں بیچ سپاہی کی قدر دانی نہیں
بزرگوں بیچ کہیں بوئے مہربانی نہیں	تواضع کھلانے کی چاہو کہیں تو پانی نہیں

گیا جہان سے جاتا رہا سخاوت و پیار

یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور	یہاں کے دیکھو سب اہل کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اُمرا کی اُور	یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سے شرم اور گور

یہاں نہیں ہے مدارا بغیر دار و مدار

امیرزادے ہیں حیران اپنے حال کے بیچ	تھے آفتاب پر اب آ گئے زوال کے بیچ

رذالے آج نشے بیچ زر کے ماتے ہیں	پہن لباس زری سب کو بیچ دکھلاتے ہیں

لٹو ہیں آتے ہیں پر کیسے آج تائی کے   اکڑتے پھرتے ہیں پی پی کے مُنہ دھنائی کے

شگفتہ لب ہے ہر اک آن پھول مالی کا   بھلایا دھیلے نے اب ٹل سے نرخ گالے کا

پھریں ہیں چکلے جہاں نِکا آج تیلی کے   ملیں ہیں تیل سدا بیلے اور چنبیلی کے
ہوئے ہیں صاحب مال و زر و حویلی کے   رکھیں ہیں شوق سدا دل کے بیچ سیلی کے
گئے ہیں بھول غذائے قدیم ماش و جوار
حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے   جو چور تھے وہ ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے
جو زیر دست تھے سو ان دنوں میں زور ہوئے   جنھوں کو زور تھا سو اب مثال مور ہوئے
جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار
بھرا ہے میوہ فروشوں کے پستہ و بادام   نظر میں لاتا نہیں اپنے صاحبوں کو غلام

جہاں ہیں صاحب خس خانہ گھاس والے ہیں   محل جنھوں کے تھے ان کو کھنڈر کے لالے ہیں

جنگل کو چھوڑ کے بوم آ بسے ہیں بستی میں   نجیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

نجیب خانہ بدوش ایک بینی اور دو گوش   ہے باغبان کے گھر میں بہار جوں گلزار

جہاں میں صاحب شمشیر ہیں گے صیقل گر   ہے گندھیوں کا معطر سدا دکان اور گھر
ہمیشہ نازاں ہیں بھڑبھونجے اپنے بختوں پر   امیر دو دو ملائی دہی کے ہیں خوگر
بنا ہے خانۂ نقاش رشک نقش و نگار
دلوں کے بیچ صفائی نہیں ہے یاروں میں   کہیں جو ڈھونڈے بھی شاید تو اب ہزاروں میں
صندوق ساز کے زر ہے بھرا انباروں میں   جو تھے سئیس سو نوکر ہیں اب سواروں میں
عراقیوں کے ہوئے ہیں سر طویلہ حمار

حاتم کی دوسری بارہ صدی

حاتم کی دوسری 'بارہ صدی' میں بھی کچھ اسی طرح کی باتیں کہی گئی ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں۔

صبح کے وقت جو امرا قصے ہیں آتے ہیں بنی ہے جن کی وہ کیا کیا سجیں دکھاتے ہیں
جو کشمکش میں ہیں مرے پیچ و تاب کھاتے ہیں کتنے خراب ہیں اور کتنے ذرکماتے ہیں
غرض خدا بھی یہی قدرتیں دکھاتے ہیں

عجب یہ دور ہے شرفا کا کچھ نہیں روزگار بہت عجیب قسم زندگی سے ہیں بیزار
ہزاروں عمدے پڑے پھرتے ہیں خدائی خوار کہو تو کس طرح ہوئے سپہ گری کا وقار
بہادر ہائے غضب پیچڑے کھاتے ہیں

رسالے نقدی کی بالکل طلب سے رو بیٹھے بہت امیر جاگیروں سے ہاتھ دھو بیٹھے
غنیم چاروں طرف صوبہ دار ہو بیٹھے جہاں پناہ سیتی ملک کو ڈبو بیٹھے
ولیک دور سے تو بھی دھمک دکھاتے ہیں

ہمارے دیکھتے ہی کچھ زمانہ اور آیا دلوں سے مہر گئی اب جفا و جور آیا
عجیب کیا کریں دنیا کا اور طور آیا کمینے پھیل گئے پاجیوں کا دور آیا
گلی و کوچوں میں بن کے سجیں دکھاتے ہیں

اس کے بعد کئی بندوں میں اس بند کے آخری مصرعے کی شرح کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ نیچے طبقے کے لوگوں کی مالی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ ان میں خود آرائی اور خود نمائی کا شوق تو پیدا ہو گیا ہے، لیکن سلیقہ ابھی نہیں آیا ہے۔ مختلف پیشے والوں کی اسی آرائش و نمائش کو مضحک انداز میں پیش کیا گیا ہے، مثلاً

لگا کے کھیرے کی نک کنجڑے کے چلے بن ٹھن چکتا سوئے کا طرہ کسیرو کی سمرن
بنا کے کدو کی چوگان گیند کر بینگن پھریں ہیں کھیلتے میدان کر کے گھر آنگن
پھر اُن کے باپ بھی اس سج پہ صدقے جاتے ہیں

یہ دھوبی نیچے بھی کر جامے کو کلپ کندی منڈا کے ڈاڑھیاں مونچھوں کو کر کے پونڈی
بجا کے سیٹی بلاتے ہیں چوک کی خندی پھریں ہیں کرتے بہم ہاٹ گھاٹ میں رندی
ہمیشہ دبھی کو صابن لگا دھلاتے ہیں

مشک کو چھوڑ کرے کام تیر تکے کا کسی کو زور دکھاتا پھرے ہے پٹے کا
سوار بسل پہ دم مارتا ہے حقے کا پھلے ہے دیج کو بناتا رذالہ سقے کا
دو چار یار پچھوں کھنڈ گھتے آتے ہیں

لگا کے گھنڈیاں پہرے انگرکھے طوسی کے لاہوری بن کے بجے پاجامے سوسی کے
ہاتھوں میں کھنڈیاں اور سونٹے آبنوسی کے پھریں ہیں اکڑے ہوئے دودھ پی کے گھوسی کے

سے زور بازو کا بھنیوں سے آزماتے ہیں

اس مخمس کے اٹھائیس بندے ہیں اور یہ غالباً ناتمام ہے۔ مقطع موجود نہیں ہے۔ اس کی زبان میں اتنی خامیاں ہیں کہ یہ حاتم کا کلام نہیں معلوم ہوتا۔

شفیق کا قصیدہ "حسب حال زمانہ" لچھمی نرائن صاحب شفیق اورنگ آبادی نے "حسب حال زمانہ" کے عنوان سے ایک قصیدے کی شکل کا شہر آشوب لکھا، جس کے ابتدائی چند شعر یہ ہیں:۔

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ صاحب سن ادھر — کیوں ریاست دن بدن ایسی ذلیل اور ہے بتر
اس دکن کے بیچ بچھ صوبوں کے بچھ تھے بادشاہ — عادل اور فیاض، صاحب عزم اور صاحب ہنر
اُن کی دولت میں مرفہ اور سبھی خوش حال تھے — کیا رعیت کیا سپاہی کیا امیر نامور
آسماں وہی ہے اور وہی زمیں خلقت ہے وہ — پھر ہوئی کس واسطے یہ زندگانی مختصر
شامت نیت ہے یا تدبیر میں ہے کچھ قصور — تب تو دشواری پڑی ہے ہر کسی کو اس قدر

یہ پوری نظم میسر سامنے نہیں ہے۔ اس لیے اس کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

میرحسن کی رباعیات در تعریف اہل حرفہ میر حسن کے کلیات میں "رباعیات در تعریف اہل حرفہ" کے عنوان سے تیرہ رباعیاں ملتی ہیں، جن میں نقاش، طباخ، نجار، کسان، زرگر، سقا، باغبان، تیلی، کاغذی، خیاط، تنبولی، بقال اور معمار کے دلبروں کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے:۔

سقے کا پسر کہ وہ چھپ جاتا ہے
اس حور بہشتی کو کوئی پاتا ہے
وہ چاہ سے کھینچتا ہے ڈول کی طرح
اور ہاتھ سے اس کے جی بھر آتا ہے

عیار بڑا ہے پسر تنبولی
ٹوٹا مجھے اور گرہ نہ اپنی کھولی
ہوش و خرد و تاب و تواں دل کی سے
جو کچھ کہ متاع خاص تھی سب ڈھولی

ان رباعیوں کا محور شہر آشوب ہے اپنے ابتدائی مفہوم میں۔

سودا کا قصیدہ شہر آشوب سودا کے دو شہر آشوب ہیں، ایک قصیدے کی شکل میں اور ایک مخمس کی شکل میں۔ "قصیدہ شہر آشوب"[۹۲] سودا نے شعر کی طویل نظم ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے — دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

---

۹۲ مقدمہ چمنستان شعراء ۲۳-۲۴

قصیدے میں اہلِ دہلی کی مفلسی اور اہلِ کمال کی بے قدری اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ قصیدے میں ہجر کی شان پیدا ہو
ہے۔ چند شعر نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:۔

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے

گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے ہاں ہے

سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے

قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ پہ دزدی کا گماں ہے

ملائی اگر کیجے تو ملا کی ہے یہ قدر
ہوں دو روپے اُس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے

اور ماحضر آخوند کا اب کیا میں بتاؤں
یک کاسۂ دال عدس اور جو کی دو ناں ہے

دن کو تو بچارہ وہ پڑھایا کرے لڑکے
شب خرچ لکھے گھر کا اگر منشی سداں ہے

وہ بیت ٹکے سیکڑہ لکھنے کا ہے محتاج
خوبی میں خط اب جس کا بہ از خطِ بتاں ہے

ہدیہ ہو سوا پانچ ٹکے گزری میں آ کر
یاقوت پکارے جو بکاؤ یہ قرآں ہے

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت
چھٹتے ہی تو شعرا کے وہ مطعون زباں ہے

دیتا ہے دُمِ خر سے کوئی شملے کو نسبت
گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے

دُنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اُس کا نشاں ہے

سو اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے
یہ بات بھی گو بندہ ہی کا محض گماں ہے

یاں فکرِ معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے

ندرجہ بالا اشعار مختلف مقامات سے لیے گئے ہیں۔ شاعر نے اپنے زمانے کے طبیبوں اور شاعروں کی جو حالت لکھی ہے اُسے
م بے کم و کاست نقل کرتے ہیں:۔

طبیب

بیٹھے پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
سو دو سو روپے کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے

صحبت ہے یہ اُس سے اگر آقا کے تئیں چھینک
آ جائے تو وہ اُس کو بہ خشونت نگراں ہے

دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اُس کے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اُس وقت گماں ہے

اور ماحضر اُوپر جو وہ نوّاب کو دیکھے
کھانا تو یہ کھاتے ہیں پہ اُس کو خفقاں ہے

معجون میں ہے خربزہ اور خربزے پر دُودھ
ہے دُودھ پہ مچھلی تس اُوپر گاؤزباں ہے

یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی سے ہو تسلّی
اس سب پہ تفنن کے لیے بیسنی ناں ہے

اس میں جو کہیں درد اُٹھا پیٹ میں اُن کے
پھر بو علی سینا ہے تو واں ہیچمداں ہے

رکھتے ہیں غرض مرگ سے لڑنے کو سپاہی | گر ذکر کیجو یہ طبابت کی کہاں ہے

شاعر

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال | دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشتاق ملاقات انھوں کا کس و ناکس | ملنا انھیں اس سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانہ | نیت قطعۂ تہنیت خان زماں ہے
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر | گر رحم میں بیگم کے کسی نطفۂ خاں ہے
اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا | پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

سودا کا مخمس شہر آشوب

سودا کا دوسرا شہر آشوب چھبیس بند کا مخمس ہے۔ اس میں بھی دہلی کی تباہی، وہاں کے لوگوں کی بے روزگاری، امیروں کی پریشان حالی اور شریفوں کی کس مپرسی کا بیان ہے۔ اس شہر آشوب میں کہیں کہیں ہجو کا رنگ بہت گہرا ہو گیا ہے۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں:

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول | پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول | جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند | سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند | جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

بس ان کا ملک میں مار فسق جو یوں ہو تباہ | کرے جو زر ہو زراعت میں تو نہ دیں پرکاہ
بتاؤ وہ کون سی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ | کہاں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگاہ
کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

رہی فقط وہ ہی باجے پر انھوں کی شان | جو چاہو اس کو نہ بجوائیں تو یہ کیا امکان
پر ان کا فکر ہے تخفیف خرچ پر ہر آن | رہے گا حال اگر ملک کا یہی تو ندان
گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول

مخل ہو یہ نہ سمائے زمیں بہت چھائی | کئی وہ شوری کیسیں ہیں جو سوا پاٹی[1]
تمام عمر رہے تو بیہ ملک میں کاٹی | ندان کر اٹھے بل کر گھر اینٹ کا ماٹی
پر اپنے زعم میں ہر اک بجائے خود بہلول

---

[1] کلیات سودا کے دو مطبوعہ اور تین قلمی نسخوں کی مدد سے بھی یہ مصرع صحیح نہیں پڑھا جا سکا۔ (ادیب)

پڑے جو کام انھیں تو نکل کے کھائی سے ۔۔۔ رکھیں وہ فوج جو موٹی پھرے لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے ۔۔۔ سوار گر پڑیں سوتے ہیں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

نہ صرفِ خاص میں آمد نہ خالصہ جاری ۔۔۔ سپاہی تا متصدی سبھوں کو بے کاری
اب آگے دفتر تن کی کہوں میں کیا خواری ۔۔۔ سوال و دستخطی کو پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ اور کسی کو کنڈول

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار ۔۔۔ تلاش کر کے ڈھیلتے اُنھوں نے ہو ناچار
نمان قسمن میں بنیوں کے دی سپر تلوار ۔۔۔ گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لے کے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کچکول

امیر اب جو ہیں دانا اُنھوں کی ہے یہ چال ۔۔۔ ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال
کبھی ہے سوزنی خوجہ کھڑا جھلے ہے رُمال ۔۔۔ حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہلِ کمال
دھری ہے سامنے ایک پیکدان اک تنبول

سودا بڑے زندہ دل تھے۔ جن باتوں پر دوسرے روتے اُن پر وہ ہنستے تھے۔ لیکن اپنے شہر کی تباہی سے وہ بھی آخر کہاں تک متاثر نہ ہوتے۔ آخر ہنستے ہنستے رو دیے اور شہر آشوب کا آخری حصہ دہلی مرحوم کا مرثیہ بن گیا۔ چند بند ملاحظہ ہوں :-

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس ۔۔۔ کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اُداس ۔۔۔ بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم ۔۔۔ نہ جانے کن نے رکھا یہاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر اب اس جگہ ہے زقوم ۔۔۔ مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھی کلول

عجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول ۔۔۔ وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول ۔۔۔ اور اُن کے حسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجے مول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا ۔۔۔ مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا ۔۔۔ عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے ہستی تھی خلق موتی رول

سودا کے اس شہر آشوب کے متعلق آزاد لکھتے ہیں :-

"بعض درد نظاہر ہیں کہتے ہیں کہ بادشاہ اور دربار بادشاہ کی ہجو کہی ہے۔ غور سے
دیکھو تو ملک کی دل سوزی نے اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے۔"

میر کے چند مخمسوں میں شہر آشوب کی جھلک میر نے کوئی باقاعدہ شہر آشوب نہیں کہا، لیکن ان کے چند مخمس ایسے ہیں جن میں بعض مقامات پر شہر آشوب کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ دو مخمسوں میں لشکر کی ہجو کی ہے اور سپاہیوں کی مفلسی، بھوک اور بے سروسامانی کا بیان کیا ہے۔ ایک مخمس کے چار بند اور دوسرے کے تین بند درج کیے جاتے ہیں :-

جس سے [illegible] ہے گمراہ آوے لشکر میں رکھ اُمید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ

[illegible] جس کو دیکھو سو ہے اُداس بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر یراق ننگے سپاہ

جان اُڑتی ہے صبح سے تا شام شام سے صبح تک ہے فکر طعام
زندگی جا ہے حال تنگ انام ایک دو ہوں تو لوں کسو کا نام
سیکڑوں کے منہ ہیں بستر میں آہ

[illegible] سے رہا ہے کسو میں حال خورش و خواب ننگے خواب و خیال
[illegible] ہوئے ہیں وبال زندگی اپنے طور پر ہے محال
مرگ ملتی نہیں ہے خاطر خواہ

[illegible] اپنی عمر جو بُود و باش آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
[illegible] کے دیکھی یاں کی طرز معاش ہے لب ناں پہ سو جگہ پہ خراش
نے دم آب ہے نہ کچھ آش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
[illegible] سپاہیوں کا حال ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال

بادشاہ و وزیر سب قلّاش

مجتے واے جو تھے ہوئے ہیں فقیر — تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں مکذب عزمن صغیر و کبیر — مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

ایک مخمس میں ایک "شیخ جی" کی ہجو کی ہے، جن کے پاس دستخطی فرد، اجرا کے لیے سے گئے ہیں اور انھوں نے جھوٹے وعدے کر کے میر کو خوب دوڑایا ہے۔ ذیل کے دو بند انھیں شیخ جی کی زبان سے ہیں:

گھڑے جو ہیں دونوں کو بھرتے ہیں — سو بھی اسباب گردی دھرتے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں — لو بڑ پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال

دینے کا ہو کہیں ٹھکانا بھی — جو کرے چاہیے زمانہ بھی
یاں نہیں شہ کے گھر میں دانا بھی — کبھو ہوتا ہے پینا کھانا بھی
ورنہ بھوکے رہے ہیں بیٹھے نڈھال

ایک مخمس میں شہر — میں خود اپنی پریشان حالی بیان ہے۔ اس مخمس کا آخری بند مشہور رہے، جو حسب ذ:

ہے:—

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ — دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ — ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ان نظموں کے متعلق آزاد نے سچ لکھا ہے:

"چند مخمس شکایت زمانہ میں بطور شہر آشوب کے کہے ہیں۔۔۔۔ مگر ایسے
کمزور کہے ہیں کہ گویا کچھ نہیں ہے۔" (آبحیات ص۲۶)

میر کے "ابیات در تعریف ہر فرقہ"

ان مخمسوں کے علاوہ میر کی غزلوں میں جا بجا ایسے شعر ملتے ہیں، جن کو ہم رباعیات در تعریف اہل حرفہ کے قبیل کی چیز سمجھ سکتے ہیں یا ظاہر وحید منقولۂ بالا اشعار — کی طرح "ابیات در تعریف ہر فرقہ" کہہ سکتے ہیں، ان اشعار میں جن فرقوں کے نام آئے ہیں وہ یہ: نائی، دھوبی، معمار، عطار، بزاز، صراف، زرگر، گل فروش، اتوکش، آتش باز، باغبان، افسانہ خوان، مطرب، مغنی، کشتی گیر، قاضی، مفتی، طبیب، سید، برہمن، ترک، مغل، ہندو، اہل دول، امیر۔ اگر میر کے یہ منتشر اشعار یک جا کر دیے تو ایک شہر آشوب اپنے ابتدائی مفہوم میں تیار ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ایسے چند شعر مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر — پڑے ہیں کٹھائی میں مدت سے ہم

پُر شور سے ہے عشق مغنی پسراں کے — یہ کاسۂ سر کاسۂ طنبور ہوا ہے

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب — اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

نظر اک سپاہی پسر سے لڑی — قریب اس کے تلوار کر کر گئے

افسانہ خواں کا لڑکا کیا کہیے دیدنی ہے — قصہ ہمارا اُس کا یارو شنیدنی ہے

وہ باغباں پسر کچھ گل گل شگفتہ ہے اب — یہ اور گل کھلا ہے اک پھولوں کی دکاں کا

وہ اتو کش کا بھی پر کیا ہے سرگرم جفا — مارے تکراروں کے اُن نے بہتوں کو اتو کیا

گیا نظر سے جو وہ گرم طفل آتش باز — ہم اپنے چہرے پہ اُڑتے ہوائیاں دیکھیں

دل لشکر میں ایک سپاہی زادے نے ہم سے چھین لیا — ہم درویش طلب میں اس کی ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

وہ دھوبی کا کم ملتا ہے میاں دل اودھر ہے بہت — کوئی کہے اس سے ملنے میں تجھ کو کیا ہم دھوبیں ہیں

اس طرح کے اشعار بالعموم حقیقت پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ ابتدائی شہر آشوبوں کے زیرِ اثر تقلیدی اور روایتی انداز میں کہے گئے ہیں۔

قائم کا شہر آشوب

قائم چاند پوری نے بھی ہفت بند[35] کا ایک مخمس شہر آشوب کہا ہے، جس میں شہروں کی ویرانی اور شہریوں کی پریشانی کا بیان ہے۔ ابتدا بادشاہِ وقت کی سخت ہجو سے کی گئی ہے، کہ وہی ملک کی تباہی اور رعایا کی بدحالی کا ذمہ دار ہے۔ شروع کے دو بند دیکھیے:

کیسا یہ شہ کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہے — ہاتھوں سے جس کے ایک جہاں داد خواہ ہے
لٹوا کے آپ ساتھ کشیری سپاہ ہے — ناموس خلق سایے میں اس کے تباہ ہے

شیطان کا یہ ظلّ ہے، نہ ظلِّ الٰہ ہے

رہتی تھی ایک خلق کے جی میں یہ آرزو   ہووے گا بادشاہ بھی پھر ہند میں کبھو
تا زمرے وہی ہوں اسیر تو وہی غلو   سو آسماں نے لا کے مسلط کیا تو تو
جس کے ستم سے چار طرف آہ آہ ہے

آگے چل کر بادشاہ کے باپ دادا تک کی خبر لی گئی ہے اور اس کی حماقتوں کو اُس کے بزرگوں کا ورثہ قرار دیا گیا ہے۔

تو تو خدا کے فضل سے اُس باپ کا پسر   جس کا خطاب شاہِ حماقت پناہ ہے
دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا   کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو بر ملا
اس خانداں میں حمق کا جاری ہے سلسلہ   دوں دوش کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا
آخر گدھا پن اُس کا ترا عذر خواہ ہے

اسی بادشاہ کے عہد میں شہر ویران اور ضروریاتِ زندگی نایاب ہیں:۔

جو شہر میں تھے معبرے ہر چیز میں خراج   ٹھیکے دوا کے گنج میں رہتے تھے جوں اناج
واں درد سے شکم کے کوئی مر نہ جاؤ آج   کس چیز سے حکیم کرے بیٹھ کر علاج
نے زیرہ ہے نہ سونف ہے نے نانخواہ ہے

اجڑے پڑے ہیں شہر میں وے وے مکان خوب   جن کی صفا سے جائیں تھے موتی عرق میں ڈوب
اک ریزہ خس پہ جان جہاں دیں تھے خاک روب   تو دوں اب اُس زمین میں صافر سفید دوب
بوجھوں اب اُس جگہ پہ دھتورا سیاہ ہے

غریب ہوں یا امیر سب کے سب افلاس کا شکار اور فقر و فاقے میں گرفتار ہیں۔

اک نانِ خشک شب جو میسر کسی کو آئے   ممکن ہے کیا کہ بیٹھ کے آسودگی سے کھائے
نیچے چھپے زمین کے یا آسماں پہ جائے   یوں گرد و پیش گھیرے ہے اک خلقت خدائے
جیسی طرح حصار میں ہالے کے ماہ ہے

تن زیب پہرتے جنہیں آتی تھی جی میں عار   خاصہ ہمیشہ جسم میں اُن کے تھا بے قرار
سو ظلم سے ترے ہیں وہ یاں تک ذلیل و خوار   دستار موسے سر سے ہے ان کے سروں پہ بار
جامہ اگر ہے تن پہ تو وہ گرد راہ ہے

کیا جانے آسماں کی بگڑ کیا گئی ہے کل   محتاج مایہ دار سے لے تا بہ کم بغل
کوئی روز آگے گھر میں تھی جن کے چہل پہل   مطبخ میں اُن کے آج نہیں گر پکا تھا کل

پرسوں سے اصطبل میں نہ دانہ نہ کاہ ہے

مفلسی نے سبکے اخلاق خراب کر دیے ہیں:-

اس سبب سے عاشق و معشوق کا یہ ڈھنگ ۔۔۔ دیکھے جو نور شمع پہ تو جل مرے پتنگ
عالم سے اٹھ گیا تخم ناموس و پاس ننگ ۔۔۔ جس سے سنو تو رشک سے بیٹی کے ماں ہے تنگ
دیکھو جدھر تو باپ کو بیٹے کا داہ ہے

روزی کمانے کا دروازہ بند اور سرکاری ملازمت نایاب ہے۔

حاکم جو اس ضلع کا ہے ماجد گلاب رائے ۔۔۔ روزی ہزارہا کی تھی دان بلکہ کچھ سوائے
سو اب جو نوکری کو کوئی اس کے پاس جائے ۔۔۔ کہتا ہے رکھ توروں میں پہ چھٹا کہاں سے آئے
نے ملک ہے نہ مال نہ دولت نہ جاہ ہے

یہ زبوں حالی اور بد اخلاقی شہروں سے گزر کر قصبوں میں بھی پہنچ گئی ہے۔

قصبات اک جگہ تھی شریفوں کی بود و باش ۔۔۔ فاسق نظر پڑے جو کوئی وہاں بصد تلاش
عصمت زنوں کی عصمت مریم سے زیادہ فاش ۔۔۔ تقوے کی رو سے مرد فرشتوں کی سی معاش
سو تھوکھ سے حرام پہ اُن کی نگاہ ہے

اس شہر آشوب میں مختلف فرقوں، طبقوں اور پیشہ وروں کا ذکر کم ہے، مگر ہے ضرور۔

آیا ہے کاتبوں پہ جو کوئی دنوں کا پھیر ۔۔۔ سررشتہ دار دفتر مالی پہ ہے یہ کھیرا (؟)
ڈالیں ہیں لا کے پینٹھ میں یہ کاغذوں کے ڈھیر ۔۔۔ لیکن وہ کون ہے جو خریدے چھدام سیر
.... کو کچھ ضرور نہ ...... کو چاہ ہے

مفتی پھریں ہیں بھوکھ سے کرتے تھے محضر ۔۔۔ قاضی کے لکھی تھی مری ہی قضا مگر
ہے چودھری کے گھر میں ہمیشہ سٹر پٹر ۔۔۔ عاشق کے یہاں بھی ہیں تو ......
اللہ جس طرح سے رکھے واہ واہ ہے

یہ چند بند جو اوپر نقل کیے گئے ہیں، قائم کے شہر آشوب کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔

حسرت کا مخمس در احوال دہلی

جعفر علی حسرت نے بھی ایک شہر آشوب لکھا ہے جو "مخمس در احوال دہلی" کے عنوان سے اُن کے کلیات میں شامل ہے۔ اس مخمس میں چالیس بند ہیں۔ ڈاکٹر محمد عمر نے رسالہ "نقوش" لاہور کے اکتوبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں مطلع کو چھوڑ کر اس مخمس کے انتالیس[۳۹] بند دیوان حسرت کے اس قلمی نسخے سے لے کر شائع کیے ہیں، جو بقول اُن کے رضا لائبریری، رام پور میں محفوظ ہے اور مصنف دیوان کے بارے میں لکھا ہے:-

"اگرچہ اس دیوان کا اندراج فہرست کتب خانہ میں ذوقی رام حسرت کے نام سے ہے، لیکن حقیقت میں یہ میر محمد حیات المخاطب بہ ہیبت قلی خاں حسرت عظیم آبادی المتوفی سنہ ۱۲۱۱ھ [۹۶ - ۱۷۹۵ء] کا دیوان ہے۔"

میرے استفسار پر مولانا عرشی ناظم رضا لائبریری نے تحریر فرمایا کہ " حسرت کے دیوان میں یہ مخمس نہیں ہے۔ اس کو شایع کرنے والے نے انتساب میں سخت غلطی کی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ مخمس جعفر علی حسرت کا ہے، جو مشہور معاملہ بند شاعر جرأت کے اُستاد تھے۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے، مگر اُن کی عمر کا زیادہ حصہ فیض آباد اور لکھنؤ میں گزرا۔ جعفر علی حسرت کے کلیات کا ایک قلمی نسخہ جلسۂ تہذیب لائبریری، لکھنؤ میں محفوظ ہے، اور اُس میں مخمس در احوال دہلی، بھی شامل ہے۔

حسرت نے اپنے شہر آشوب میں پہلے افغانوں کے حملے سے دہلی کی تباہی کا حال تیرہ بندوں میں بیان کیا ہے۔ ابتدائی چار بند سُنیے :-

نہیں ہے مرثیے سے کم جہان آباد کا حال — اگر لکھوں تو قلم نالہ زن ہونے کی مثال

وگر پڑھوں تو کہاں غم سے ہے سخن کی مجال — اگرچہ چرخ ستمگر نے اس پہ لایا زوال

پر آپ روتے ہے رکھ منہ پہ ابرِ وبال

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویران — کہ جیسے باد خزاں سے ہو حالتِ بُستان

نہ سیل حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفان — گزر گیا ستمِ افغاں کے ظلم سے جو وہاں

فغاں کہ ہو گیا یہ کشتِ سبز سب پامال

وہ باغ جس میں کہ گل رو تھے سب جبیں گل سے — اور اُن کی زُلفیں فزوں تر تھیں جعدِ سُنبل سے

چمن کے رشک تھے رخسار و خط و کاکل سے — دراز اُس پہ ہو دستِ ستم تطاول سے

دریغ مٹ گیا نقشہ رہا نہ وہ خط و خال

سواد اُس کے سے تھی زلفِ مہوشاں نجیر — بہار اُس کی سے عرق آب شرم تھا کشمیر

ہر ایک اُس کے مکاں میں بہشت کی تعمیر — جدھر نظر کرو سو جھے تھا عالم تصویر

نہ سر کے واں سے جدھر جا پڑے نگاہِ خیال

اس کے بعد یہ دکھایا ہے کہ بادشاہ، شاہی خاندان کے افراد، امیر، جاگیردار، ملازمت پیشہ، سپاہی، نجیب، نجومی، طبیب، شاعر، مصوّر، سوداگر، پیرزادے، مرثیہ خوان سب کے سب مفلسی اور بے روزگاری کا شکار ہیں۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں :-

جو بادشاہ وہاں کا رکھے تھا تخت و تاج — وہ اپنے قُوت کو اطفال کے ہے محتاج

خدائی ہے جسے دیتا تھا سارا ہند خراج — غنیم آن کے لے اُس سے اُس کے شہر کا باج

وہ مشکل ہے کہ کرے شیر کو شکار شغال

جو حشم اور خزانہ تو سب لُٹا یکسر، رہیں سو کس پہ یہ فرقے کے لوگ اور چاکر
رہا نہ مال بجز سنگ کوٹھوں کے اندر جو چھت تھی چاندی کی دیوانِ خاص کے اندر
سو وہ وزیر نے کی خرچ بیچ کر شال

نجیب تو ہوئے فاقوں سے اب سبھی رنجور رہی نہ منہ پہ ہے رونق نہ اس کی چشم میں نور
جو اہلِ حرفہ ہیں اُن کا تو کیجیے کیا مذکور جنھوں کا کسب تھا گوٹی اُن کا یہ دستور
کہ جا کے چوک میں دیکھیں ہیں اک دمڑی پہ فال

وہ جو کہ فنِ طبابت میں تھے ارسطو سے اُنھوں نے دیکھا غذا ہوئے تب شما کری کھائے
مرض ہے جو رہا بقر کا سو کس طرح سے جائے وہ چھوڑ طب کو کہیں جو کچھ اب خدا کھلائے
سلائی سر سے بازار میں بنے کتال

جنھوں کا پیری مریدی تھا سلسلہ جاری اُنھوں کو ملنے لگی گھر میں نان دشواری
مرید فاقوں سے مرتے ہیں خود یہ ناچاری سنی جہاں کہیں مجلس ہے واں کی تیاری
دو روٹی تیلے پہ جا کر لگے وہ کہنے حال

مصور اُن میں جو تھے کھینچتے ہیں حیرانی شبیہ کو کھینچ دے تصویر گرچہ ہو مانی
جو خط کے لکھنے میں مہر علی کے تھے ثانی قلم کو اُن کے ہے دن رات خون افشانی
لکھیں ہیں دمڑی کو خط خطِ پشت لب کی مثال

آخری بند میں شاعر کہتا ہے کہ شہر کی تباہی اہلِ شہر کی بد اعمالی کا نتیجہ ہے۔

جہاں آباد نہ ہوتا کسی طرح سے تباہ جو حسرت ایسے عمل کرتے ہم نہ نامہ سیاہ
پرائے مال پہ ناموس پر رکھیں جو نگاہ تو اُن پہ کیونکہ نہ بھیجے بھلا غضب اللہ
ہمارے آگے ہی آئے ہمارے یہ اعمال

جرأت کا مخمس، حسرت کے شاگرد جرأت کا ایک ترجیع بند مخمس ایک قدیم بیاض میں ملا، جس کا مصرعِ ترجیع، حضورِ بلبل بستاں کرے نوا سنجی، لازمی قرار دیتا ہے کہ ہر بند کسی ایسی بات پر ختم کیا جائے جو اسی مصرعے سے مناسبت رکھتی ہو۔ یہ پابندی اس مخمس کا خاص عیب ہے، لیکن اس میں شہر آشوب کی شان پوری طرح موجود ہے۔ متعدد دوسرے شہر آشوبوں کی طرح اس میں بھی شاعر کو زمانے سے یہ شکایت ہے کہ اس نے امیروں کو مفلس اور غریب کو تونگر کر دیا ہے، اور شریفوں کو زوال سے دوچار کر کے کمینوں کو عروج دے دیا ہے۔ اس مخمس میں بائیس[۲۲] بند ہیں۔ چند بند اور کچھ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں، جن سے اس کی شہر آشوبی نوعیت واضح ہو جائے گی۔

اب ان کو دے شفق چرخ شال نارنجی — بُنا جو کرتے تھے لیل و نہار شطرنجی
یہ دیکھ کیوں نکلے نہ آہ بے بخانۂ تن بھی — ظہور حشر نہ کیوں ہو جو کھچڑی گھنجی

حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

جو گل فروش تھے اب ہیں وہ مالکِ صد باغ — جو مفلس ازلی تھے رکھیں ہیں عیش و فراغ
جو خاک روب تھے اب اُن کا عرش پر ہے دماغ — یہ کاؤں کاؤں خوش آوے کسے جو مادہ زاغ

حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

سمجھتے خاک نہیں سانڈے کے جو تیل سوا — حکیم جیو کہاویں سب ان سے پوچھیں دوا
چلے جب ایسی حماقت کی اس چمن میں ہوا — تو کیوں نہ پھر سرِ گردن بلا بلا کے لوا

حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

دیا سلائی جو بیچے تھا پا کر سر کنڈا — ہوا ہے صاحب لشکر بنا کے اک جھنڈا
ہوائے باغ جہاں سے ہو کیوں نہ دل ٹھنڈا — جو ٹینی مُرغ کا بچہ کھٹکتے ہی انڈا

حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

گدا گدا اُن کو دے چرخ منصب شاہی — جو گھس کھدے تھے وہ اورنگ و نشانگاہی
لگا کے بیٹھے تھے جو خوانچہ کھائے ہے خان — بڑا گھر اس کا ہے بیت الخلا تھا جس کا مکان
جو بیچ کھاتے تھے گنجشک دام میں لا کے — کریں ہیں عرش پہ پرواز اب وہ چڑیا کے
جنھوں کے گھر تھی امارت گھر اُن کا ہے سونا — بنی گھر اس کے عمارت جو بیچے تھا چونا
معاملات میں اب اعتبار اُن کا ہے — کر جی کو کتے تھے پیدے کی ضامنی کیا ہے

آخری بند:۔

عبث عدو کو ہے جرأت کی ہمسری کا خیال — وہ بھولے اپنی بھی کو آ چلے جو ہنس کی چال
کھوا دلے انہیں ہما حسد کو جی سے نکال — ہنسیں گل اس پہ جو بچھد کی پھلا پھلا پر و بال

حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

راسخ عظیم آبادی کی مثنوی در بیان انقلاب زمانہ

غلام علی راسخ عظیم آبادی متوفی ۱۲۳۸ھ نے مثنوی کی شکل میں ایک شہر آشوب کہا ہے، جو مثنویات راسخ مرتبہ ممتاز میں حسب ذیل عنوان کے ساتھ شامل ہے:۔

"مثنوی در بیان انقلاب زمانہ و شکایت فلک و مجملۂ احوال متیان بلدۂ عظیم آباد۔"

اس مثنوی میں راسخ نے عظیم آباد (پٹنہ) کی گزشتہ خوش حالی و فارغ البالی اور موجودہ مفلسی و ناداری کا ذکر کرنے

کے بعد جن پیشوں اور پیشہ وروں کا حال لکھا ہے وہ یہ ہیں، مشایخ، خطاط، معلم، شاعر، وکالت، زراعت، تجارت، طبابت، مصاحب، سپاہ گری۔ مثنوی میں کل ایک سو بیس شعر ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:-

گزرتی تھی آرام سے بے تعب — کرتے جمع اسباب عیش و طرب
کہیں مجلس عیش و بزم نشاط — کہیں دوستوں میں بہم اختلاط
جہاں اک عجب باغ تھا دل کشا — ہر اک گل میں تھی اس کے بوئے وفا
یہ گلزار اب ہو گیا خار زار — خزاں ہو گئی ہائے اس کی بہار
کوئی اس چمن میں تونگر نہیں — کوئی غنچہ ساں صاحب زر نہیں
ہے اب خاک رہ پائے اور ان کا فرق — جو تھے سر سے پا تک جواہر میں غرق
جنھیں فرش قاقم پہ تھی دار و گیر — ہوئے ہیں وہ محتاج فرش حصیر
معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے — فقط مفلسی بر سر کار ہے
گدائی کا کاسہ لیے در بدر — ہیں آوارہ ارباب فضل و ہنر
ہنر مند کا ہے جگر ریش ریش — نہیں جاتا ہے کوئی پیشہ بھی پیش

مشایخ جو ذی عز و تعظیم ہیں — دل ان کے بھی صد سرکش بیم ہیں
غم قوت ہے یاں تلک ہر زماں — کہ ہیں رشتۂ سبحہ ساں ناتواں

لکھوں خوشنویسوں کا میں حال کیا — نوشتے پر اپنے ہیں گریاں سدا
بہت فکر روزی سے ہیں دردناک — قلم غم سے ان کے ہوا سینہ چاک

وکالت کا بازار بھی سرد ہے — وکیل اب جو ہے وہ بڑا مرد ہے
کہاں اب وکالت ہو رونق پذیر — موکل ہی سب ہو گئے ہیں فقیر

زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے — دُر مدعا یاں تو نایاب ہے
کرے کب یہ پیشہ کسو کو نہال — کہ سر سبز ہونا بہت ہے محال

طبابت میں بھی کچھ نہیں اب حصول — اطبا ہیں اس عہد میں سب ملول

ہر اک کو مرض مفلسی کا ہے آج   طبیب اب بچارے کریں کیا علاج

سپاہی کی مٹی بھی ہے اب خراب   کہ بیٹھا ہوا نوکری کا تو باب
جو اشجع ہیں اب ان کا یہ رنگ ہے   کہ قسمت سے اپنی انھیں جنگ ہے
ہیں افلاس سے ایسے اندوہگیں   کہ مٹی کا گھوڑا میسر نہیں
نہ ترکش ہے نے تیر ہے نے کماں   خدنگ الم کے نشاں ہدف زماں
کہاں کی کماں ہو رہے ہیں تباہ   اگر تیر ہے تو فقط تیر آہ

مختلف پیشوں اور پیشہ وروں کی کس مپرسی اور مفلسی کا بیان کرنے کے بعد شاعر شہر کی خوش حالی اور بدحالی کو اہلِ شہر کی اخلاقی حالت کا نتیجہ قرار دیتا ہے:۔

یہ پٹنہ عجب دل کشا شہر تھا   طلسمات تھا واہ کیا شہر تھا
تھے صدق صفا پیشہ اس کے مقیم   طریقِ وفا پر بہت مستقیم
بہت نیتیں نیک رکھتے تھے سب   زباں اور دل ایک رکھتے تھے سب
اب اس شہر کا طور ہی اور ہے   مکینوں کا اس کے بُرا طور ہے
کوئی ان میں غمّاز و نمّام ہے   کسو کا سخن چینی ہی کام ہے
بہت جانتے ہیں فریب اور زور   بہت بڑھ گیا حد سے فسق و فجور
نہیں نیک نیت کوئی یاں ولیک   اگر ہے تو ہے وہ ہزاروں میں ایک

نظیر کا شہر آشوب

نظیر اکبر آبادی نے پینتالیس مخمس بند کا ایک شہر آشوب کہا ہے، جس میں آگرے کے پیشہ وروں، سپاہیوں اور امیر زادوں کی پریشاں حالی بیان کی ہے۔ اس کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں:۔

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند   رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موج دار بند   ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ   آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے بُرے وقت سے پناہ   وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج ہیں اب آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

صراف بنئے جوہری اور سیٹھ ساہوکار   دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب ادھار

کے بعد جن پیشوں اور پیشہ وروں کا حال لکھا ہے وہ یہ ہیں: مشایخ، خطاط، معلم، شاعر، وکالت، زراعت، تجارت، طبابت، مصاحب، سپاہ گری۔ مثنوی میں کل ایک سو بیس (۱۲۰) شعر ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:-

گزرتی تھی آرام سے بے تعب   کرتے جمع اسباب عیش و طرب
کہیں مجلس عیش و بزم نشاط   کہیں دوستوں میں بہم اختلاط
جہاں اک عجب باغ تھا دل کشا   ہر اک گل میں تھی اس کے بوئے وفا
یہ گلزار اب ہو گیا خار زار   خزاں ہو گئی ہائے اس کی بہار
کوئی اس چمن میں ثمر ور نہیں   کوئی غنچہ ساں صاحب زر نہیں
ہے اب خاک وہ ہائے اور ان کا فرق   جو تھے سر سے پا تک جواہر میں غرق
جنھیں فرش قاقم پہ تھی دار و گیر   ہوئے ہیں وہ محتاج فرش حصیر
معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے   فقط مفلسی بر سر کار ہے
گدائی کا کاسہ لیے در بدر   ہیں آوارہ ارباب فضل و ہنر
ہنر مند کا ہے جگر ریش ریش   نہیں جاتا ہے کوئی پیشہ بھی پیش

مشایخ جو ذی عزت و تعظیم ہیں   دل ان کے بھی صد مرکش بیم ہیں
غم قوت ہے یاں تلک ہر زماں   کہ ہیں رشتۂ سبحہ ساں ناتواں

لکھوں خوشنویسوں کا میں حال کیا   نوشتے پر اپنے ہیں گریاں سدا
بہت فکر روزی سے ہیں دردناک   قلم غم سے ان کے ہوا سینہ چاک

وکالت کا بازار بھی سرد ہے   وکیل اب جو ہے وہ بڑا مرد ہے
کہاں اب وکالت ہو رونق پذیر   موکل ہی سب ہو گئے ہیں فقیر

زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے   ڈر مدعایاں تو نایاب ہے
کرے کب یہ پیشہ کسو کو نہال   کہ سر سبز ہونا بہت ہے محال

طبابت میں بھی کچھ نہیں اب حصول   اطبا ہیں اس عہد میں سب ملول

ہر اک کو مرض مفلسی کا ہے آج   طبیب اب بچارے کریں کیا علاج

سپاہی کی مٹی بھی ہے اب خراب   کہ نیفا ہوا نوکری کا تو باب
جو اشجع ہیں اب اُن کا یہ رنگ ہے   کہ قسمت سے اپنی انھیں جنگ ہے
ہیں افلاس سے ایسے اندوہگیں   کہ مٹی کا گھوڑا میسر نہیں
نہ ترکش ہے نے تیر ہے نے کماں   خدنگ الم کے نشاں ھدف زماں
کماں کی کماں ہو رہے ہیں تباہ   اگر تیر ہے تو فقط تیر آہ

مختلف پیشوں اور پیشہ وروں کی کس مپرسی اور مفلسی کا بیان کرنے کے بعد شاعر شہر کی خوش حالی اور بد حالی کو اہل شہر کی اخلاقی حالت کا نتیجہ قرار دیتا ہے:-

یہ پٹنہ عجب دل کشا شہر تھا   طلسمات تھا واہ کیا شہر تھا
تھے صدق صفا پیشہ اس کے مقیم   طریق وفا پر بہت مستقیم
بہت نیتیں نیک رکھتے تھے سب   زباں اور دل ایک رکھتے تھے سب
اب اس شہر کا طور ہی اور ہے   مقیموں کا اس کے بُرا طور ہے
کوئی ان میں غماز و نمام ہے   کسو کا سخن چینی ہی کام ہے
بہت جانتے ہیں فریب اور زور   بہت بڑھ گیا حد سے فسق و فجور
نہیں نیک نیت کوئی یاں ولیک   اگر ہے تو ہے وہ ہزاروں میں ایک

نظیر کا شہر آشوب نظیر اکبرآبادی نے پینتالیس مخمس بند کا ایک شہر آشوب کہا ہے، جس میں آگرے کے پیشہ وروں، سپاہیوں اور امیرزادوں کی پریشاں حالی بیان کی ہے۔ اس کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں:-

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند   رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موج دار بند   ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ   آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے برے وقت سے پناہ   وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج ہیں اب آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

صراف بنئے جوہری اور سیٹھ ساہوکار   دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب ادھار

بازار میں اُڑے ہے پڑی خاک بے شمار　　بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنی دکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

ماریں ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار　　اور جتنے پیشہ ور ہیں سو روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لہار تو پیٹے ہے سر سنار　　کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند

بیٹھے بساطی راہ میں تنکے سے چنتے ہیں　　جلتے ہیں نانبائی تو بھڑبھونجے بھنتے ہیں
دُھنیے بھی ہاتھ ملتے ہیں اور سر کو دھنتے ہیں　　روتے ہیں وہ جو مشروع و دارائی بُنتے ہیں
اور وہ تو مر گئے جو بُنیں تھے ازار بند

ہر دم کماں گروں کے اُوپر پیچ و تاب ہیں　　صحاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں
مرتے ہیں مینا ساز مصور کباب ہیں　　نقاش ان سبھوں سے زیادہ خراب ہیں
رنگ و قلم کے ہوگئے نقش و نگار بند

حجام پر بھی یاں نہیں ہے مفلسی کا زور　　پیسہ کہاں جو سان پہ ہو استروں کا شور
کانپے ہے سر جھکتے ہوئے اس کی پور پور　　کیا بات ایک بال کٹے یا ترا شے کور
یاں تک ہے استرے و نہرنی کی دھار بند

کیا چھوٹے کام والے وہ کیا پیشہ ور نجیب　　روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آ شام من قریب　　اُٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہوگئی بے اختیار بند

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات　　سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دُکھ کو روئیے کس کس کی کیجے بات　　روزی کے اب درخت کا پتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند

دیکھے کوئی چمن تو پڑا ہے اُجاڑ سا　　غنچہ نہ پھل نہ پھول نہ سبزہ ہرا بھرا
آواز قمریوں کی نہ بلبل کی ہے صدا　　نہ حوض میں ہے آب نہ پانی ہے نہر کا
چادر پڑی ہے خشک تو ہے آبشار بند

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے　　ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے　　شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اُس نے لکھے پانچ چار بند[1]

اب تک جن شہر آشوبوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ابتدائی مفہوم کے شہر آشوبوں کو چھوڑ کے باقی سب شہر آشوب نادر شاہ اور احمد شاہ دُرّانی کے حملوں سے دہلی کی تباہی اور اہلِ دہلی کی بد حالی کے اثر سے وجود میں آئے ہیں۔ ان میں شہر آشوب کے ابتدائی مفہوم کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یعنی ان میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا حال بیان کیا گیا ہے، طبقاتی درجہ بندی میں بکایک جو فرق آگیا تھا اور اس سے امرا اور شرفا کے اقتدار اور سربلندی میں جو خلل پڑ گیا تھا، اس پر غم و غصّے کا اظہار کیا گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے نے دہلی کے زمین و آسمان کو بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ آس پاس کے دیہاتیوں نے شہر میں گھس کر قتل و غارت کا بازار گرم کر کے شریف، معزز اور خوش حال باشندوں کو بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا اور انگریزوں نے دہلی کے بڑے بڑے نامی گرامی لوگوں کو پھانسی پر لٹکوا دیا۔ ان الم ناک اور دہشت خیز واقعات کے بیان میں بہت سی نظمیں کہی گئیں۔ یہ نظمیں حقیقت میں دہلی مرحوم کے مرثیے ہیں۔ ان کو شہر آشوب کہنا کچھ بہت مناسب نہ تھا۔ لیکن اب شہر آشوب کے مفہوم میں اور وسعت پیدا ہو گئی اور وہ نظمیں بھی شہر آشوب کے دائرے میں آگئیں، جن میں پیشہ وروں اور طبقوں کا تخصیص کے ساتھ ذکر نہیں ہے، بلکہ شہر کی تباہی کا عمومی انداز میں بیان ہے۔

اس طرح کی نظموں کا ایک مجموعہ منشی محمد تفضل حسین خاں کوکب نے مرتب کر کے فغانِ دہلی[2] کے نام سے شایع کیا، جن میں کچھ نظموں کا اضافہ کر کے نظامی بدایونی نے فریادِ دہلی اور انقلابِ دہلی کے دُہرے نام سے ۱۹۳۱ء میں شایع کیا۔ ان نظموں میں زیادہ تر غزل کی شکل میں ہیں، مگر چند مخمس اور مسدس بھی ہیں۔ داغ دہلوی کا مسدس اپنی نوعیت میں اس مجموعے کی دوسری نظموں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، لیکن شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے سب سے بہتر اور سب سے زیادہ مشہور ہے۔ خود مصنف نے اپنی اس نظم کو 'شہر آشوب' قرار دیا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ شہر آشوب کے نئے مفہوم کی بنیاد اسی نظم سے پڑی ہو۔ اس مجموعے کی نظموں کی تفصیلی کیفیت ڈاکٹر سید عبد اللہ کے اُس مقالے میں دیکھی جا سکتی ہے، جو 'شہر آشوب کی تاریخ' کے عنوان سے ان کے مجموعۂ مقالات بحث و نظر میں شامل ہے۔ یہاں صرف داغ کے شہر آشوب کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں :-

فلک زمین و ملائک جناب تھی دِلّی بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دِلّی

---

[1] پانچ چار کے عدد اگر اسی طرح بلا فاصلہ ہندسوں میں لکھے جائیں یعنی ۴۵ تو اس مخمس کے بندوں کی تعداد ظاہر ہوگی جو پینتالیس ہے۔

[2] ڈاکٹر سید عبد اللہ نے فغانِ دہلی مطبوعہ احسن المطابع، دہلی ۱۲۸۰ھ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ مجموعہ تین شراروں میں منقسم ہے: شرارۂ اوّل کلام حضرت محمد سراج الدین ظفر و مرزا رفیع السودا، شرارۂ دوم در مسدسات شہر آشوب، شرارۂ سوم در غزلیات وغیرہ" میرے کتب خانے میں فغانِ دہلی کا وہ نسخہ ہے جو مطبع بدر الدجیٰ، دہلی میں ۱۲۸۰ھ میں چھپا تھا۔ اس میں صرف دو شرارے ہیں۔ مولف کتاب نے دیباچے میں لکھا ہے: "نامش فغانِ دہلی گزاشتہ بر دو شرارہ بفرجام رسانیدہ .... نخستین شرارہ در مسدسات شہر آشوب۔ دو دمیں در غزلیات و قطعات وغیرہ"

[illegible]ب کا ہے کہ تھا لاجواب تھی دلی   مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھا دلی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی

خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ انسان و جان کا دل تھا   یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدر دان کا دل تھا

یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا   یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا

رہی نہ آدمی یہاں سنگ و خشت کی صورت

بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

عجب شکل گل و گلستاں نظر آئی   پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی

جب اٹھ کے تا مژۂ خونچکاں نظر آئی   تو کوئی جنبش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گلرخان سمن بر کے قہقہے نہ رہے

وہ بلبلان خوش الحان کے چہچہے نہ رہے

برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے   غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے

نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے   قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے

مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی

یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

پیادہ پا ہوں رواں شہسوار صد افسوس   لہو کے گھونٹ پییں بادہ خوار صد افسوس

ذلیل و خوار ہوں اہل وقار صد افسوس   ہزار حیف! دل بیقرار صد افسوس

جھکے ہیں بار الم سے تنے ہوئے کیسے

بگڑ گئے ہیں بیکایک بنے ہوئے کیسے

برقؔ لکھنوی کا شہر آشوب

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ پر جو مصیبتیں ڈھائیں، اُن سے قیاس کیا جا سکتا ہے، کہ اُن کے بیان میں شاعروں کی زبان خاموش اور قلم بے حرکت نہ رہے ہوں گے۔ لیکن ان نظموں کا مجموعہ مرتب کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ اور اب اتنی مدت گزر جانے کے بعد اُن کی تلاش میں کامیابی مشکل ہے۔ اس وقت صرف ایک مسدس میرے سامنے ہے جو اپریل ۱۹۴۰ء کے الٰہ آباد یونیورسٹی اُردو میگزین میں ایک قلمی بیاض سے نقل کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف برقؔ لکھنوی نے خود اس کو 'شہر آشوب' کہا ہے[1]

---

[1] یہ مسدس برقؔ کے مجموعہ دیوان میں نہیں ہے۔ لیکن ان کے ایک قلمی دیوان میں شامل ہے۔ اس کے بتیس ۳۲ بند جو صفیر بلگرامی

لیکن یہ مسدس بھی ۱۸۵۷ء کے غدر سے متاثر ہو کر نہیں کہا گیا ہے۔ اس کے مضامین، شاعر کا لب و لہجہ، اس کے غم کی نوعیت، ان سب چیزوں سے صاف ظاہر ہے کہ غدر سے متاثر ہو کر واجد علی شاہ کی معزولی اور کلکتے کو روانگی کے بعد لکھنؤ کی بے رونقی اور اداسی کا اس میں بیان کیا گیا ہے۔ ابھی وقت تک شہر ان تباہیوں سے اور اہل شہر ان مصیبتوں سے محفوظ تھے، جو کچھ دن بعد غدر کے نتیجے میں پیش آنے والی تھیں۔ اس مسدس کا آخری بند، جس میں اس کو شہر آشوب قرار دیا گیا ہے، حسب ذیل ہے:

ہم پہ اسے برق جو گزرا ہے سنایا ہم نے — نقشہ سب کھینچ کے شعروں میں دکھایا ہم نے
شہر آشوب کہا رو کے رُلایا ہم نے — وقت پر دوستوں کو دوست نہ پایا ہم نے
خلق میں نیر اقبال ہمارے وہ تھے
سب کو ثابت ہے کہ سیارے ستارے وہ تھے

اس بند کی بیت کے دونوں مصرعوں میں وہ کا اشارہ واجد علی شاہ کی طرف ہے۔ دو اور بندوں میں بھی اسی طرح اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔ اس نظم میں واجد علی شاہ سے محبت اور ہمدردی اور اودھ کے تخت سلطنت پر ان کی واپسی کی تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے انگریزوں کے خوف سے بادشاہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس مسدس میں اکتالیس بند ہیں۔ اس کے چند بند نقل کئے جاتے ہیں:

کل کے مذکور یہ ہیں اپنے بھی افسانے تھے — رشک فردوس بریں شہر کے میخانے تھے
تھالیاں ہیروں کی بھیں لعلوں کے پیمانے تھے — ماہ و خورشید رخ شمع کے پروانے تھے
سب ہوا خواہ سلیمان کہا کرتے تھے
رات دن پریوں کے جھرمٹ میں رہا کرتے تھے

قہقہے اڑتے تھے جمگھٹ تھے پریزادوں کے — جیسے ہر روز ہوا کرتے تھے آزادوں کے
نالے سنتے تھے نہ ہرگز کبھی فریادوں کے — کبھی آگاہ نہ تھے نام سے بیدادوں کے
کیا کہیں کس سے کہیں ہائے وہ صحبت کیا تھی
راجہ اندر کے اکھاڑے کی حقیقت کیا تھی

جانتے تھے کہ اسی طرح گزر جائے گی — چمن عیش میں ہرگز نہ خزاں آئے گی
آرزو نخل محبت سے ثمر پائے گی — یہ نہ سمجھے تھے قضا رنگ نیا لائے گی

بقیہ ص۲۹ ـــــ نے تذکرۂ جلوۂ خضر میں درج کیے ہیں، وہ تذکرۂ ابن طوفان کے حاشیہ نمبر ۹۲ میں نقل کر دیے گئے ہیں۔
(تذکرۃ الشعرا مصنفہ ابن امین اللہ طوفان ص ۳۹-۴۲)

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

ایک بھی پیش نظر ان میں کی تصویر نہیں — قدر دنیا میں نہیں خلق میں توقیر نہیں
جز اجل اور کچھ اس خواب کی تعبیر نہیں — تیر ہے دل کے لیے نالۂ شبگیر نہیں
غم نے داغوں سے کیا جسم مرصّع اپنا
بٹ گیا سامنے آنکھوں کے مرقع اپنا

اب بھی آجائیں جو وہ پھر وہی صورت ہو جائے — وہی ہنسیاں وہی چہلیں وہی عشرت ہو جائے
رنج سب جانے رہیں روح کو راحت ہو جائے — پھر وہی شان ہو اپنی وہی شوکت ہو جائے
پھر وہی سیر کریں پھر وہی آبادی ہو
پھر وہی ناچ وہی رنگ وہی شادی ہو

ایک بس ان کے نہ ہونے سے یہ سب قہر ہوا — شربت زندگی ہجر میں زہر ہوا
دل کو شیشہ در دم آب لب نہر ہوا — ہم کو دوزخ سے زیادہ چمن شہر ہوا
نالۂ دل سے دلِ عرش ہلا دے یا رب
موت آئے ہمیں یا ان سے ملا دے یا رب

موت جینے سے کہیں اپنے لیے بہتر ہے — بال نشتر ہیں تو ہر ایک نفس خنجر ہے
تکیہ ہے خشت لحد فرش زمیں بستر ہے — در ہیں آغوش اجل گور سے بدتر گھر ہے
چارہ اس میں نہیں برعکس جو قسمت ہو جائے
زہر کھانے کے لیے کھائیں تو امرت ہو جائے

جان صاحب کا شہر آشوب | لکھنؤ کے مشہور ریختی گو شاعر جان صاحب نے بھی ایک شہر آشوب اپنے زمانے کی مذمت میں کہا ہے۔ یہ بیالیس [۴۲] بند کا مخمس ہے۔ چند بند اس کے بھی سن لیجیے

کم نہیں تھا دن سے ہر اک کی خصلت آجکل — دفن مردے کی طرح گھر گھر ہے دولت آجکل
مردوں کی ہو گئی نامرد ہمت آج کل — لکھنؤ میں شاد ہے شوموں کی خصلت آجکل
گور پہ حاتم کے روتی ہے سخاوت آجکل

اینٹ سے یہ اینٹ بجوائیں نہ ہرگز خوف کھائیں — پیسے والے اک ٹکے کے واسطے سو گھر کو ڈھائیں
حاجی بی اپنے ولی کھنگر کے بھی چونا لگائیں — پہلے ہمسائے کے گھر کھودیں محل بجرے بنائیں
نیو کی جا ہے ہر اک دل میں کدورت آج کل

رنگ یہ بدلا زمانے نے ہر اک حیران ہے مُفلسی کے ہاتھ سے انساں بھی حیوان ہے
جو مُحا حیوان تھا پیسے سے وہ انسان ہے اے دوگانہ جان دیکھو کیا خدا کی شان ہے
ہوش میں پاجی ہیں اور ہم کو ہے وحشت آجکل

مُفلسی میں کام آتا ہے نہ کوئی رشتہ دار باپ ہے ماں ہے جو کچھ ہے' ہے بڑا پروردگار
غیر کیسے حال اپنوں کا یہ ہے اب آشکار ایک بھائی کو ہے فاقہ ایک ہے کرتا نہ ہر بار
اُٹھ گئی دُنیا کے پردے سے محبت آج کل

ہوگئی راحت ہے دشمن رنج ہے بنو حبیب دُور دولت ہوگئی کس طور ہو عشرت قریب
پاؤں جو پھیلا کے سوئے پھر نہیں جاگے نصیب جو سخی تھے پیسے والے اب وہ ہیں مُفلس غریب
اُن کے گھر مہمان رہتی ہے قناعت آجکل

نائی دھوبی کنجڑے بھٹیارے قصائی نابکار ایک کوڑی کے لیے ہوتے ہیں گردن پر سوار
لُوٹ کر ہم کو ہوئے تیلی تنبولی مالدار ہم فقیروں سے ہیں بدتر دیکھو لو ہے آشکار
پاجیوں کے گھر میں ہو کیوں کر نہ دولت آجکل

کیفی دہلوی کا 'عالم آشوب'

بعد کے بعض شاعروں نے شہر آشوب کے طرز پر 'عالم آشوب' اور 'دہر آشوب' لکھے ہیں۔ اردو کے ذی علم اور ممتاز ادیب اور شاعر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے ۱۹۲۲ء میں ایک نظم 'عالم آشوب' کے نام سے کہی۔ اُنھوں نے میری طلب پر جس خط کے ساتھ یہ نظم مجھے بھیجی تھی اُس میں اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے:

"یہ نظم شہر آشوبوں سے مختلف ہے۔ اُن میں اکثر تضحیک یا ایک قسم کی ہجو کا پہلو ہوا کرتا تھا۔ یہ متین عرضِ حال ہے۔"

اور اس نظم کی وجۂ تصنیف یہ بتائی ہے:۔

"یکم مارچ ۱۹۲۲ء کو دہلی میں کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی میں حکومت ہند کا بجٹ (موازنہ) پیش ہوا۔ تیس کروڑ سے زیادہ گھاٹا دکھایا گیا۔ نئے ٹیکسوں کی تجویزیں پیش ہوئیں۔ سارے صوبوں میں گھاٹے کے بجٹ پیش ہوئے۔ وطن کا افلاس مدت سے دل کو دُکھ دے رہا تھا۔ یہ نئی صورتیں اس نظم کی محرک ہوئیں۔"

یہ 'عالم آشوب' قصیدے کی شکل کی بہت طولانی نظم ہے اور اس میں ہندوستان کے افلاس کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ مصنف نے پہلے عام اہلِ ملک کی مُفلسی کا بیان کیا ہے' پھر ملازمت پیشہ' تجارت پیشہ' تعلیم یافتہ' مزدوری پیشہ' اہلِ حرفہ' اور زراعت پیشہ طبقوں کی پریشاں روزگاری دکھائی ہے۔ یہ مختلف طبقوں کے لوگوں کا ذکر کرنا 'شہر آشوب' کے قدیم مفہوم کا پرتو ہے

ر اس نظم کے ایسے حصے ایسے بھی ہیں جو شہر آشوب سے مختلف ہیں اور جن کو بقول مصنف حقیقی عرض حال کہنا چاہیے۔ اُن
ں سے بعض کے عنوان یہ ہیں۔ "وطن پرستی اور کفایت شعاری" "حکومت اور رعیت کی فلاح"، "عالمگیر افلاس کے اسباب"
ن عالم آشوب کے چند اقتباس ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

تمہید

چھانے ہیں ملک پر افلاس کے منحوس آثار   تنگ دستی کا ہے جن سر پہ خلائق کے سوار
شہر آشوب لکھا کرتے تھے پہلے مگر اب   عالم آشوب کے لکھنے کا ہے مضمون تیار

ملازمت پیشہ

نوکری پیشہ جو ہیں اُن کا نہ پوچھو احوال   اُن پہ رہتی ہے مصائب کی ہمیشہ بھرمار
کیونکہ کہتے ہیں تو اس سے سمجھ لیں بس آپ   ہونے لگتا ہے پندرھویں ہی پہلی کا شمار
سادہ خوری کی ہے ماہانہ یہ مجمل روداد   پہلے سالن اُڑا پھر دال سے چھوٹا ہے بگھار
نوبت اب یہ ہے مہینے میں ہے باقی ہفتہ   پان بیوی سے تو چھوٹا ہے میاں سے بھی سگار
ذکر ہی خرچ کا آیا تو چرا لیں آنکھیں   کوئی ہمدرد کسی کا ہے نہ کوئی غمخوار
بن پڑے کس کی مدد ہاتھ بٹائیں کس کا   خود مصیبت میں ہوں تو ایک ہیں یار و اغیار

تجارت پیشہ

ملک کی ان کو امارت کا سمجھنا نہ امین   تم کو دیتے ہیں دکھائی جو یہ بڑھیا تجار
ان کے ہاتھوں ہی نکلتی ہے وطن کی دولت   قوم کے سر پہ چلاتے ہیں یہی تو تلوار
نفع آتے ہیں تعیش کے جو سامان نہیں   ملک میں اُن کی درآمد کے یہ ہیں ذمہ دار
ہیں یہ دلال اگر حیثیت اصلی دیکھو   غیر ملکوں کی یہ آڑھت کے ہیں فرمانبردار

تعلیم یافتہ

کرنا چاہیں نہ وہ کچھ کر ہی سکیں ہاتھ کا کام   وہ تو اک نوکری پر بیٹھے ہیں بس کھائے ادھار
بھول بیٹھے ہیں بزرگوں کے ہنر اور فن کو   ایک لے دے کے قلم رہ گیا اُن کا ہتھیار
اک اسامی کہیں خالی ہوئی پھر دیکھیں آپ   بابو لوگوں کی دو رویہ رہ دفتر میں قطار
عرضیاں عرضیوں پر ہیں کہ چلی آتی ہیں   منسلک جن سے سفارش کے خطوں کے [illegible]

پیچ در پیچ کچھ اُلجھاؤ پڑے ہیں ایسے   عقل انسانی ہے سلجھانے میں جن کے بیکار
لابُدی اس کا نتیجہ جو ہے وہ ظاہر ہے   عہد حاضر سے ہوئے جاتے ہیں سب دل بیزار

ہے حکومت جو تھی وست تحیت کنگال — کون امداد کرے کس کی سبھی ہیں ناچار

صفی لکھنوی کا 'دہر آشوب'

لسان القوم سید علی نقی صفی لکھنوی نے اپنی مثنوی تنظیم الحیات مطبوعہ ۱۹۲۸ء کے دیباچے میں اکتیس شعر کا ایک 'دہر آشوب' لکھا ہے۔ اُس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

پُر شور و شر آج کل ہے آفاق — ایسے بگڑے ہوئے ہیں اخلاق
اگلوں نے لکھے تھے 'شہر آشوب' — مجھ کو لکھنا ہے 'دہر آشوب'
افریقہ و ایشیا و یورپ — ہر خطہ سوادِ کفر سے گھپ
چھائی ہوئی مادہ پرستی — فرضی نقطہ خدا کی ہستی
کمتر اُن میں خدا کے بندے — اکثر حرص و ہوا کے بندے
فرماں بر نفس ہر کہ و مہ — باشندۂ شہر و ساکن دہ
جنباں رگِ مادہ پرستی — ہر نفس میں انتہا کی پستی
کھانا پینا مزے اُڑانا — جو اس پہ عمل کرے وہ دانا
افراد کو زعمِ کبریائی — انفار کو دعویٰ خدائی
مخصوص 'اقوامِ ابیض اللون' — ایک ایک دماغ تختِ فرعون
خونخوار آئینِ زندگی ہے — تہذیبِ بشر درندگی ہے
جب عقلِ فساد حکمراں ہو — درہم برہم نہ کیوں جہاں ہو

(تنظیم الحیات ص ۱۳-۱۵)

عمر انصاری کا 'دہر آشوب'

اخبار ترقی، لکھنؤ کے یکم جولائی ۱۹۳۶ء کے پرچے میں عمر انصاری لکھنوی کا ایک مسدس 'دہر آشوب' کے عنوان سے شایع ہوا، جس میں پچیس بند ہیں۔ ابتدا کے چند بندوں میں اپنے زمانے کی بُرائیاں بیان کرنے کے بعد اُس عہد کے رند، قاضی، واعظ، مولوی، فلسفی، جوگی، سادھو، لیڈر، ماسٹر، طالب علم، شاعر ہدفِ ملامت بنائے گئے ہیں۔ چند بند اور کچھ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں:-

آج اک قصۂ دیرینہ سُناتا ہوں میں — خوابِ غفلت سے زمانے کو جگاتا ہوں میں
عہدِ پارینہ اُسے یاد دلاتا ہوں میں — خود بھی روتا ہوں جہاں کو بھی رُلاتا ہوں میں

دُور جا پہنچی ہیں اس وقت نگاہیں میری
اب سے روکے سے رُکتی نہیں آہیں میری

نہ وہ ہم ہیں نہ وہ مستی ہے نہ وہ کیف و خمار — نہ وہ ساقی نہ وہ مطرب نہ وہ ہنگام بہار

نہ وہ دنیا نہ وہ عالم نہ وہ دوست نہ وہ یار　　نہ وہ صیاد نہ گلچیں نہ وہ گلشن نہ بہار

وہ محبت نہیں وہ مجمعِ احباب نہیں
وہ خریدار نہیں وہ دُرِ خوش آب نہیں

ساز کے ٹوٹے ہوئے تار ہیں محفل برہم　　نغمہ مفقود ہے موجود ہے شورِ ماتم
گردِ تیرہ و تاریک فضائے عالم　　بحرِ ذخّار کا ہمسر ہے سرابِ شبنم

پھول مرجھائے گلستاں میں کہ لو چلتی ہے
پتی پتی کفِ افسوس پڑی ملتی ہے

اس نظم میں مختلف طبقوں کی ہجو کا انداز یہ ہے:-

رند اب وہ ہے کہ جس کا کوئی مشرب ہی نہیں　　قاضی وہ ہے کہ جسے عدل سے مطلب ہی نہیں

مولوی وہ ہے کہ تا ناف رکھے ریش دراز　　فلسفی وہ ہے کہ جس کی ہو خدا تک پرواز
جوگی وہ ہے کہ ہو عریانی پہ اپنی جسے ناز　　صوفی وہ ہے کہ جو اللہ کا ٹھہرے ہم راز

سادھو وہ ہے جو گراں لوہے کا زیور پہنے
سب سے بہتر وہی لیڈر ہے جو کھدر پہنے

طالبِ علم وہ بہتر ہے کہ جب کالج جائے　　زلفِ شب رنگ کو جس طرح بنے خوب بنائے
پھر ہوا سے جو وہ اُڑ کر رخِ زیبا پہ آئے　　جھٹکا دے دے کے بصد ناز وہ گردن کو ہلائے

ماسٹر وہ ہیں کہ تعلیم کو کمرے میں جو آئیں　　غالب و مومن و آزردہ کے کچھ شعر سنائیں
پہلے جس طرح سے ممکن ہو گپیں خوب اڑائیں　　گھنٹہ بج جائے تو کمرے سے وہ رخصت ہو جائیں

شعر ایسے کہے کہ ہوں اس میں معانی نایاب　　متمتع کسی مطلب سے نہ ہو رائے صواب

زمزمہ و نغمہ میں کچھ فرق نہ سمجھا جائے　　باندھ دے شاعر غزل جو جہاں سے پائے

بزم میں جا کے جو اچھا کوئی گا لیتا ہے　　سننے والوں کو وہ البتہ رجھا لیتا ہے

اے مجرّب ہیں زمانے کے یہی لیل ونہار　　یعنی ہر مذہب و ملت کے یہی ہیں اطوار
مجھ کو اچھے نہیں آتے ہیں نظر کچھ آثار　　صاف کہتا ہوں کہ ہے صاف دلی میرا شعار
دھر آمادہ ہے کچھ رنگ بدلنے کے لیے
جانبِ غرب ہے سورج ہے نکلنے کے لیے

یہی عشرت ہے تو پیدا کوئی زحمت ہوگی　　یہی راحت ہے تو ظاہر کوئی کلفت ہوگی
یہی دن ہے تو یہاں شام مصیبت ہوگی　　یہی شب ہے تو عیاں صبح قیامت ہوگی
پھر زمانے کے سب اطوار بدل جائیں گے
وہی دُنیا وہی اوضاع نظر آئیں گے

شریر بن باسی کا 'شہر آشوب'

شریر بن باسی کا چوالیس بند کا مخمس 'شہر آشوب' کے عنوان سے اخبار 'ہمدم' لکھنؤ میں ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو شایع ہوا۔ ایڈیٹر نے جو نوٹ اس پر لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریر اس وقت زندہ تھے اور اُن کا کلام ہمدم میں شایع ہوتا رہتا تھا۔ اس شہر آشوب میں شاعر پہلے خطۂ لکھنؤ کے پُر فضا باغ، پُر شکوہ عمارتیں، آباد محلے، اہلِ فن، اہلِ علم اور لکھنؤ والوں کی شیریں زبانی، خوش پوشاکی، شائستگی اور تہذیب یاد کر کے افسوس کرتا ہے۔ پھر دوسرے شہر آشوبوں کے خلاف مختلف پیشہ وروں کی جگہ مختلف اداروں کا حالِ زار بیان کرتا ہے اور مختصراً پیر، فقیر، صوفی، عالمِ دین، مفتی، ڈاکٹر، سرجن، نرس، عطار، انجینیر، معمار، چنگی کے ممبر، ٹیلی فون والیاں، لکچرر، پروفیسر، ڈین، اڈیٹر اور شاعر کی ہجو کرتا ہے۔ چند بند نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:-

کیا لکھنؤ کے شہر کی حالت کروں بیاں　　باغوں کا شہر کہتے تھے جس کو کبھی میاں
جس کی صفت میں تھا کبھی رطب اللساں جہاں　　ہوتا تھا جس پہ خُلدِ بریں کا کبھی گماں
افسوس اس کو میٹ گیا دورِ آسماں

وہ باغ کیا ہوئے وہ گلستاں کدھر گئے　　وہ بوستاں بہشت بہ داماں کدھر گئے
ہر شاخ سے جلوۂ حسنِ خزاں کدھر گئے　　فوارے کیا ہوئے وہ خیاباں کدھر گئے
ہم نے کبھی تو ایسی نہ دیکھی کوئی خزاں

منشی نہیں دبیر نہیں منطقی نہیں　　مُلّا نہیں فقیہ نہیں مولوی نہیں
مرشد نہیں مرید نہیں متقی نہیں　　عارف نہیں فقیر نہیں باطنی نہیں
واحسرتا کمال کا ملتا نہیں نشاں

۱؎ میٹنا لکھنؤ کی زبان نہیں ہے۔

جو ہے فقیر ہے مرشد ہے شاہ ہے — چالاک ہے حریص ہے نامہ سیاہ ہے
اور صوفیوں کی جو بھی یہاں خانقاہ ہے — اب تو تلاشِ سینوں کی آماج گاہ ہے
کیونکر نہ دل کی آگ سے اُٹھنے لگے دھواں

کالج یہاں پہ جتنے ہیں سب لاجواب ہیں — اسکول بھی ہمارے یہاں بے حساب ہیں
بیکار کچھ ہیں بعض حماقت مآب ہیں — بیکار مدرسے ہیں مکاتب خراب ہیں
بڑھ کر ہے جامعہ تو از اندیشہ و گماں

گو لکچرر ہیں ذہین ہیں اور ہیں پروفیسر — کچھ ان میں بے وقوف ہیں بعض ان میں بے خبر
کچھ بحث کم نگاہ قیامت کے بے ہنر — تعلیم کی ہے فکر نہ تدریس پر نظر
پیشہ غریب لوگوں کا کرتے ہیں رائگاں

آتا نہیں ہے کوئی ہنر اور ہیں شریر — نالائقی میں جن کی نہ ہوئے کہیں نظیر
بے شرم بے حجاب سیہ بخت اور فقیر — اب ایسے لوگ ہو گئے اخبار کے مدیر
جن کو لگانی بھی نہیں آتی ہیں سرخیاں

مطلب مردمن سے نہ قوافی پہ ہے نگاہ — کیا ہو فصاحت اور بلاغت میں دستگاہ
ان شاعروں کے غزل سے اللہ کی پناہ — اک شعر پہ بھی ہو گئی گر اُن کے واہ واہ
اپنے کو آپ لکھتے ہیں خاقانیِ زماں

سب ہو چکا بیان تباہی کا ماجرا — جو کچھ ہوا ہمارے گناہوں کی ہے سزا
ہر ایک دل سے اب تو نکلتی ہے یہ دعا — اُجڑا ہوا یہ دیس بسے پھر سے اے خدا
تو ہے کریم فضل کی اپنے دکھائے شاں

اس مخمس کا آخری بند نظیر اکبرآبادی کے 'شہر آشوب' کے آخری بند کی نقل ہے۔ دونوں بند ملاحظہ ہوں۔

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے — مُلّا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے — شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے
اس واسطے یہ اس نے لکھے پانچ چار بند

قیدی کہو اسیر کہو لکھنؤ کا ہے — قاصد کہو سفیر کہو لکھنؤ کا ہے

شاعر کو فقیر کہو لکھنؤ کا ہے احمق کو شریر کہو لکھنؤ کا ہے
ہو کس طرح نہ اُس کی تباہی پہ نوحہ خواں

خاتمۂ کلام مسعود سعد سلمان سے شہر بن باسی تک تقریباً نو صدیاں گزری ہیں۔ اِس طُولانی مدّت میں فارسی اور اُردو میں بہت سے شہر آشوب کہے گئے ہوں گے۔ اِن میں سے چند جو راقم کے علم میں آئے اُن کا ذکر اور اُن کے نمونے اس مقالے میں تاریخی ترتیب سے پیش کر دیے گئے ہیں۔ اِس طرح جو شہر آشوب' کے مفہوم میں جو تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اس کی ہیئت اور موضوع میں جو تنوّع پیدا ہوتا رہا، اُس کا ایک خاکہ قاریوں کے سامنے آگیا ہوگا اور یہی اس مقالے کا مقصد ہے۔

مولانا ابوالکلام کی شخصیت

مولانا عبدالماجد دریابادی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کوئی اور مومن اس آن، اس شان، اس سج دھج، اس خو بو کا ابھرا نہ ہو، ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے نظم حقیقت نظم کی کھینچی ہوئی اپنے زمانہ میں دیکھ لی۔ اور تصویر بھی کیسی! بالکل سچائی، ایک ٹکسال سے درست، نوک پلک سے آراستہ، یگانوں کی محفلیں ہوں یا یاران بے تکلف کا مجمع، تو آپ دیکھئے کہ مولانا کے منہ سے کس طرح پھول جھڑ رہے ہیں، لطیفوں پر لطیفے، دینی، ادبی، سیاسی، علمی، شخصی، ہر قسم کے تذکرے اور تبصرے، لطیف و شگفتہ، ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شعر سنا رہے ہیں، کہیں بول چال کی نذر کر شعر لگائے ہوئے ہیں اور طبیعت کی آمد ہے کہ بس پکار رہی ہے ؎

ہے زبان میری ابر گوہر بار

گھنٹوں نہیں پہروں بیٹھئے اور دل نہ گھبرائے، نہ اکتائے نہ پچھتائے۔

اور جو کہیں موقع اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے ضمیر اخلاقی یا حس دینی پر پڑی، وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر اب سماں ہی دوسرا ہے۔ ایک شیر ہے کہ گرج رہا ہے، اژدہا ہے یا سو دیئیں، کہ دلائل کی، خطابت کی آگ برسا رہا ہے، اور زبان ہے کہ آپ ہی صدا لگائے ہے کہ

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار

لیکن جوش و خروش کے عالم میں بھی شرع جوانی کے دور کو چھوڑ کر قلم یا زبان قابو سے باہر نہیں، قابو کے اندر خلق پر اور نفس پر جیسے پہرا لگا ہوا، اشتعال کے سمندر سے جیسے لہریں اٹھ رہی ہیں اور حلم و متانت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں۔

ایک دن کی بات سنیئے، لیکن چشم تصور کے سامنے زمانہ آج سے تینتالیس ۴۳ سال قبل سنہ ۲۰ء کا لے آئیے۔ وقت تحریک خلافت و تحریک ترک موالات کی بھرپور جولانی کا۔ بچہ بچہ کی زبان پر خلافت کے پرجوش نعرے اور "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ترانے لیکن یو۔پی ہی کا ایک معلوم و معروف دینی مرکز اینٹی خلافت مرکز بھی۔ اس کے مفتی کا حکم کہ تحریک خلافت مردود گمراہی میں داخل اور اس کے علمبردار دائرہ اسلام سے خارج۔ ادھر خلافت والوں کو یہ سوجھی کہ اپنا ایک کانفرنس اسی کے شہر میں کیجئے ——— اچھا صاحب، جلسہ ہوا اور گویا مخالفین کے طبل جنگ پر چوٹ پڑ گئی۔

مخالفین بپھرا اٹھا کر چلے کہ آج عام جلسہ کو ہی درہم برہم کیجئے اور جلسہ کو فرقہ کا اکھاڑا بنا دیجئے اور علمائے خلافت

دامن کو اپنی متھر ا منی گھیرے تار تار کر کے رکھ دیجیے ! ـــــــــ ادھر خلافت والے بھی فکر مند کہ آج تو

ہے سانپ کے مُنہ میں اُنگلی اپنی

عالم دیکھیے کیا ہو، مناظرہ، مجادلہ، تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔ بہیجے جلسہ شروع ہو گیا۔ مخالفین کی طرف سے میدانِ خطابت کا ایک پہلوان، شہ زور اور اڑیل تو اکھاڑے میں اُتارا گیا، کُشتی پر کُشتی مارے ہوئے، داؤں پیچ کی اُستادی میں نام پائے ہوئے۔ اور اُس نے تقریر یا بالا وہ مار لے کے انداز میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے جاری۔ یاد نہیں کہ صدرِ جلسہ خود مولانا ابو الکلام ہی تھے یا کوئی اور، بہرحال جواب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے لوگ سمجھے کہ لوہے کی کاٹ کے لیے نکلا اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پتھر چلا۔ ادھر پولیس ہر طرح لیس، ہنگامے فساد کی منتظر، ہلڑ گڑ کی متوقع ـــــ لیکن ـــــ لیکن ۔۔۔۔۔ یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی اور کہیں نہ تکفیر نہ تفسیق، اور یہ تو بہت دُور کی چیزیں ٹھیں، نہ تعریض، نہ تشنیع نہ تضحیک نہ تفضیح! شروع سے آخر تک بس تفہیم و تذکیر، تشریح و تبیین، نہ مناظرہ نہ متاخرہ، نہ مکابرہ، نہ مبادلہ! تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی، معقولیت اور سلامت روی کے پھولوں میں گندھی ہوئی ـــــ حریف اب زبانی تو کیا کرتا۔ سارے ارمان چپٹا کر رہ گئے، غالب کے پُرزے اُڑنے کی جو خبر گرم تھی وہ مولانا کے علم و تدبر کے آگے سرد ہو کر دھری کی دھری رہ گئی اور تماشا ہو نہ پایا! ؎

تیغِ حلم از تیغِ آہن تیز تر
بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

شعر پڑھا مثنوی میں تھا، اُس کا سماں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی بڑائی کے لیے کیا تھا۔ کم سن ہی تھے کہ تحریر و تقریر دونوں کا شہرہ بلند ہو گیا اور دُور دور والے اسی دھوکے میں پڑے رہے کہ یہ بڑا کوئی بوڑھا ہو گا۔ اور شاگرد تو علوم و فنون میں کہنا چاہیے کہ کسی کے بھی نہ ہوئے۔ فیض بس مبدءِ فیض سے پائے ہوئے۔ رسماً کسی سے کچھ پڑھ پڑھا لیا تو اور بات ہے ورنہ حقیقۃً شاگردی کے نام سے ناآشنا اور مصداق ؏

شاگردِ رشیدِ حق تعالیٰ

کے بنے ہوئے۔

خدنگِ نظر لکھنؤ کا ایک ادبی ماہنامہ تھا، اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکزِ نظر بن گئے۔ لسان الصدق کلکتہ سے نکالا تو وقت کی صحافت میں چار چاند لگا دیے۔ الندوہ کے کوچۂ علم و فضل میں جب آنکلے تو اڈیٹر بنے بغیر اڈیٹر بن گئے اور جب وکیل (امرتسر) ہاتھ میں لیا تو اس کا نام دُور دُور چمکا دیا اور یہ سب اُس سن کی باتیں ہیں جب لڑکے کالج کے درجوں میں پڑھتے ہوتے ہیں جب کل کے کاچول بننے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے اُفق سے آب و تاب سے نکالا تو

چھو فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

یہ نام کا الہلال چند ہفتوں میں ماہ دو ہفتہ یا ہفتہ وار کامل تھا۔ انگلیاں ہر طرف سے اٹھتی تھیں اور مرحبا اور خوش آمدید کے غلغلے ہر شہر اور ہر قریہ سے بلند ہوئے۔

تقریر و تحریر کی جامعیت جیسی اس بھرپور شخصیت کے حصہ میں آئی کم کسی کے نصیب میں آئی۔ خطابت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ اُردو میں خطابت کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ صبح زندگی سے لے کر شام حیات تک سیکڑوں نہیں ہزاروں تقریریں کر ڈالیں، ہر تقریر انتخاب بلکہ اپنی جگہ لاجواب۔ قائلین کے کہنے میں یہ جوہر اور زیادہ چمکتا اور اُن کے ہوائی قلعوں کو دم کے دم میں ڈھا دیتا۔ جواب کے لیے چھوٹا لفظ ہمارے عوام کیا، خواص کی زبان پر بھی "دندان شکن" ہے لیکن ابوالکلام کی تقریر نے نہ کسی کا دانت توڑا نہ جبڑا، کانوں کی راہ سے سیدھی دل میں اُترتی اور وہیں اپنی جگہ بنا لیتی۔

تحریر و انشا میں اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ شروع میں اسلوب بیان ذرا ثقیل تھا اور کتاب تذکرہ میں تو ثقیل سے گزر کر اثقل ہو گیا ہے لیکن جاذبیت نے رفاقت اس حال میں بھی نہ چھوڑی۔ رفتہ رفتہ ثقل لطافت میں تبدیل ہو گیا۔ غبار خاطر و کاروان خیال شگفتہ بیانی کے اعلیٰ یا بہترین نمونے ہیں۔ دین کی خدمت علمی رنگ میں اپنی تفسیر کے ذریعہ سے بھی کی اور متعدد فقہی رسالے جو اپنی یادگار چھوڑ گئے وہ اس کے علاوہ —— ان کی ادبی شخصیت کی وسعت اور بلندی دونوں کا پرچم اونچا ہی کیا۔ ہزارہا صفحات پر چھاپ لگی ہوئی اُن کی انفرادیت کی، ان کے قلم کے بانکپن کی، ان کی خدمت تحقیق کی۔ زبان کے باب میں کیا لکھ رہے کہہ گئے تھے: لکھنؤ میں مستقل قیام کچھ زیادہ لمبا نہیں رہا تھا، چند ہی مہینے تو شاید رہے تھے، لیکن زبان لکھنؤ کی نزاکتوں پر وہ عبور حاصل کر لیا کہ جیسے سدا کے لکھنؤ ہی میں ہوں۔

سیاسیات کے کوچہ میں قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے صف اوّل کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے۔ نوبت یہ پہنچی کہ سردار پٹیل سے اپنا لوہا منوا لیا اور گاندھی جی اور جواہر لال نہرو جیسے ان کا کلمہ ہی پڑھنے لگے، مگر اُن کی پُرجوش خطابت کا نہیں بلکہ ان کی فہم و فراست کا، دانش و بینش کا، دُور بینی اور تدبر کا —— کسی دُوسرے کی شخصیت سے مرعوب بلکہ متاثر ہونا تو شاید ابوالکلام نے عمر بھر جانا ہی نہیں، البتہ اپنی شخصیت سے دُوسروں کو متاثر کرتے رہے۔ نظریاتی اختلاف کیا دینی، اور کیا سیاسی، اپنے معاصرین میں خدا معلوم کتنوں سے تھا اور وہ ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن اپنے ذاتی تعلقات میں فرق نہ کسی دینی اختلاف سے آنے دیا نہ کسی سیاسی اختلاف سے اور نہ اپنی طرف سے کسی اختلاف کو مخالفت میں تبدیل ہونے دیا —— حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے بعد جو انقلاب آیا اس کی لپیٹ میں اگر قریب تھا کہ عربی زبان اور اسلامی علوم کا نادر و نامور ادارہ دائرۃ المعارف گردش روزگار کی نذر ہو جائے، عین وقت پر ابوالکلام کی شخصیت آڑے آئی اور اُس نے اس بین الاقوامی ادارہ کو قائم و برقرار رکھ کر بھارت کے سیکولرزم کا بھرم قائم رکھا اور اپنے ملک کی نیک نامی پر آنچ نہ آنے دی۔



بابائے اردو

ذکرِ عبدالحق

مولوی عبدالحق، ترتیب: معین الرحمٰن

"چند ہم عصر" مولوی عبدالحق کا معروف نثری مجموعہ ہے۔ مختلف اوقات میں لکھی گئی ان تحریروں کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق کے ایک عزیز شاگرد شیخ چاند (مرحوم) ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ (ریسرچ اسکالر، جامعۂ عثمانیہ) نے جمع کیا، لیکن وہ اسے اپنی زندگی میں طبع نہ کرا سکے۔ اُن کی موت کے بعد یہ مجموعہ سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیِ اُردو (ہند) نمبر ۱۹۲ کے تحت اب سے کوئی پچیس برس پہلے شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں چودہ مضامین شامل تھے۔ اِن میں سے کچھ تو رسالوں میں پہلے چھپ چکے تھے، کچھ اس مجموعے کے لیے خاص طور پر لکھے گئے اور بعض شیخ چاند مرحوم نے کتابوں کے تبصروں یا مولوی عبدالحق کے خطوط سے اقتباس کر کے اس میں داخل کر دیے۔ شیخ چاند کا خیال تو یہ بھی تھا کہ ہر تصویر کے ساتھ صاحبِ مضمون کی تصویر بھی لگا دی جائے لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ دُوسرا ایڈیشن اسی سلسلۂ مطبوعات کے تحت، منیجر انجمن ترقیِ اُردو (ہند) دہلی کی مختصر "التماس" کے ساتھ جمال پریس دہلی سے ۱۹۴۲ء میں طبع ہوا۔ اس میں راس مسعود اور میرن صاحب کے حالات کا اضافہ کیا گیا جو رسالہ "اُردو" میں شائع ہوئے تھے۔ نام دیو مالی کا تذکرہ خاص طور پر اسی ایڈیشن کے لیے لکھا گیا۔

یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ تقسیمِ ہند کے بعد، نظرِ ثانی و اضافہ کے ساتھ اس کا تیسرا ایڈیشن سلسلۂ مطبوعاتِ انجمن ترقیِ اُردو (پاکستان) نمبر ۱۹۲ کے تحت قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی (مرحوم) کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں چھپا۔ سرسید پر مولوی عبدالحق کا بیر حاصل مضمون اسی ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ چوتھا ایڈیشن انجمن کے اسی سلسلۂ مطبوعات کے تحت تمکین سرمدی کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۵۹ء میں چھپا، جس میں عبدالرحمٰن صدیقی، حسرت موہانی، پروفیسر اقبال، پروفیسر ری۔ ہیٹ سک اور عبدالرحمٰن بجنوری پر مضامین کا اضافہ کیا گیا۔ "چند ہم عصر" کا پانچواں ایڈیشن بھی انجمن ہی کی جانب سے شایع ہوا۔ اس پر سالِ اشاعت کہیں درج نہیں لیکن انجمن کے کتب خانۂ خاص میں نسخے کے اندراج سے سالِ اشاعت ۱۹۶۸ء قیاس کیا جا سکتا ہے۔ نواب عماد الملک پر مضمون اسی ایڈیشن میں پہلی بار شامل ہوا۔

"چند ہم عصر" کا چھٹا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن مولوی عبدالحق کے اپنے مختصر دیباچے کے ساتھ

اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں منشی امیر احمد مینائی پر مضمون، جو مولوی عبدالحق نے امیر مینائی کی وفات ہی کے روز لکھ کر رسالہ "افسر" میں شائع کر دیا تھا، اس اعتذار کے ساتھ حذف کر دیا ہے کہ "یہ بہت ہی سرسری مضمون ہے جس میں نہ پوری سیرت نگاری ہے اور نہ اُن کے کلام پر مکمل تبصرہ۔"

آخری ایڈیشن میں کل چوبیس شخصی خاکے شامل ہیں؛ جن میں سے مرزا حیرت پر مضمون مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا نہیں ہے اس کی نشاندہی اُنھوں نے دیباچے میں کی ہے۔ بقیہ تیئیس ۲۳ خاکوں میں سب سے پرانی تحریر پروفیسر ڈی۔ بٹ سک پر ہے، جو پہلی بار رسالہ "افسر" شمارہ جون ۱۹۰۱ء میں چھپی اور جسے "چند ہم عصر" کے چوتھے ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ آخری خاکہ خالدہ ادیب خانم کا ہے جو لکھا "چند ہم عصر" کے اس ایڈیشن ہی کے لیے گیا تھا لیکن پہلی بار یہ ہفت روزہ "لیل و نہار" کے سالنامہ ۱۲ اپریل ۱۹۵۹ء (جلد : ۹ شمارہ نمبر ۱۵) میں شائع ہوا۔ اس طرح یہ سیرتیں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۹ء تک کوئی ساٹھ سال کی طویل مدت میں مختلف مواقع پر لکھی گئیں۔ اس صدی کا یہ عرصہ ہی قریب قریب مولوی عبدالحق کی زندگی کا کل دورانیہ بھی ہے۔ اُردو کے رشتے سے اپنی زندگی میں مولوی عبدالحق کا ہزارہا افراد سے راست اور قریبی تعلق رہا۔ شناساؤں کی کثرت اور وقت کے اس پھیلاؤ کے باوصف محض ان چند ممدوحین کا انتخاب اپنی جگہ قابلِ غور اور توجہ طلب ہے۔

مولوی عبدالحق کو سمجھنے کے لیے ایک بات پیشِ نظر رہنی بہت ضروری ہے۔ "بیکاری اور بیگاری" اُن کی طبع ہم رسا کی ضد تھیں۔ وہ عمر بھر برسرِکار رہے اور جو کام بھی کیا جی سے کیا، پیشہ وری کے داغ سے اپنے دامن کو کبھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ یہ خاکے بھی نہ سیرت نگاری کی خانہ پری کے لیے لکھے گئے اور نہ سیرت کشی کے لیے افراد کا یہ انتخاب ہی اضطراری تھا۔ دراصل وہ زندگی کے وسیع میدان میں ان افراد سے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طور متاثر ہوئے اور اسی داخلی ربط نے اُن سے یہ خاکے لکھوائے۔ متاثر محض ان معنوں میں ہی نہیں کہ ان شخصیتوں کو اُنھوں نے اپنے تئیں آدمیت و انسانیت کی مکمل اکائی اور عظمت و بزرگی اور بڑائی کا معیار جانا، یقیناً اُنھوں نے ایسا جانا اور سمجھا اور شاید شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن کی پیروی بھی کی ہو لیکن اس سے ہٹ کر اس انتخاب اور چناؤ کے پس پشت بہت کچھ ان افراد سے خود مولوی عبدالحق کی اپنی ذہنی ہم آہنگی، طبعی رجحان و میلان اور گزرانِ حیات کے اصولوں اور ضابطوں میں یک گونہ اشتراک کو بھی دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "چند ہم عصر" کے نگار خانے میں قدم قدم پر ہمیں

مولوی عبدالحق کی اپنی سیرت کی جھلکیاں اور پرچھائیاں ملتی ہیں ۔ انھوں نے اپنے بعض بزرگوں اور ہم نشینوں کی سیرت و کردار کے جو خاکے اور نقشے تیار کیے ہیں، اُن میں غیر شعوری طور پر انھوں نے اپنی ہی طبیعت کا رنگ کچھ یوں بھر دیا ہے کہ اُن کے آئینہ خانۂ فن کے عرض میں اُن کی شخصیت کا جوہر تڑپتا نظر آتا ہے اس طرح ہم عصروں کے اس انتخاب کے سہارے ہمیں خود مولوی عبدالحق کی سیرت تک رسائی میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ اس دستاویز کا بہت ہی دلچسپ اور نادر پہلو ہے۔

مولوی عبدالحق کی مُرقع نگاری سے متعلق اپنے ایک مضمون (ادبی دُنیا : شمارہ نہم) میں ضمناً "چند ہم عصر" کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ :

> شخصیتوں کی آڑ میں اُن کا "شوقِ بے اختیار" دیدنی ہوتا ہے اور اِن
> پر "عشقِ پیشہ اسیر" کے ایسے "آفتِ زماں" کا گماں ہونے لگتا ہے جو
> "اپنے سارے مطلب پردے میں ادا کرے ہے"

اپنے اس بیان کے حق میں بخوفِ طوالت میں نے مثالیں پیش کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تھا۔ ذیل کا یہ مضمون اسی فرض کی ادائیگی کے لیے وقف ہے۔ دیکھیے کہ در بیانِ حکایتِ دیگراں مولوی عبدالحق نے اپنی ذات و صفات سے کیسے نقاب اُٹھائے ہیں۔ یہ مضمون تمام کا تمام مولوی عبدالحق کی اپنی زبان و عبارت میں ہے، جسے میں نے "چند ہم عصر" کے مضامین سے اقتباس کیا ہے۔ عبارت کے اصل حوالہ جات صفحہ وار ذیلی حاشیے میں دے دیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں "چند ہم عصر" کا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۰ء کا نسخہ میرے پیشِ نظر رہا ہے۔

مضمون میں ربط اور تسلسل قائم رکھنے کے لیے مجھے ضمیروں اور صیغوں میں خفیف رد و بدل کرنا پڑا ہے لیکن اسے جہاں تک ممکن ہو سکا، قوسین کے ذریعے نمایاں کر دیا گیا ہے تاکہ تشابہ اور التباس کا امکان باقی نہ رہے۔ اس کے علاوہ مضمون کی واقفیت کے اتمام کے لیے ایک فنی رعایت کے ساتھ کچھ تعزیتی پیغامات اور تاریخی قطعات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ میں اس ضمن میں ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری، پروفیسر حامد حسن قادری اور حضرت رئیس امروہوی کا ممنون ہوں کہ ان بزرگوں نے اس مضمون کے لیے مجھے اپنے رشحات سے نوازا اور "رعایتِ خاص" کے استقرار میں میری مشکل کشائی فرمائی۔ بیجا نہ ہوگا اگر میں یہاں اپنے بزرگ حکیم اسرار احمد کریوی کا شکریہ بھی ادا کر دوں، جن کی رہنمائی مجھے حاصل رہی۔

معین الرحمٰن

خطاب یا نام اکثر دیکھ دیے جاتے ہیں، کسی کی خصوصیات کا ان میں مطلق لحاظ نہیں ہوتا۔ نام رکھتے وقت تو ممکن ہی نہیں، مصرعے خطاب کے وقت بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا لیکن (بابائے اُردو) عبدالحق مرحوم کا نام اور خطاب (دونوں) اُن کے لیے بہت ہی موزوں نکلے ——— (فرہاد کو شیریں سے اور نل کو دمن سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا انہیں (اُردو) سے تھا۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے یہی اُن کا وِرد تھا۔ وہ بلا مبالغہ فنا فی (الاُردو) کے درجے کو پہنچ گئے تھے (اور) سچائی، بات کی اور معاملے کی، اُن کی سرشت میں تھی خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے، وہ سچ کہنے سے کبھی نہ چوکتے تھے اس میں اُنھیں نقصان بھی اٹھانے پڑے۔ مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔

(مولوی عبدالحق) مرحوم عجیب و غریب شخص ہوئے ہیں۔ وُہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے۔

وُہ بہت بڑے ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کے مقرر تھے....... وہ آزادی کے دل دادہ اور جبر و استبداد کے پکے دشمن تھے لیکن اگر کبھی اُن کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑے جابر اور مستبد ہوتے۔ وہ محبت و مروت کے پُتلے تھے اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتے تھے کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اُن کے جاں نثار اور فدائی تھے، لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔ وہ اپنے رفیقوں اور ہم کاروں کے ساتھ بڑی شفقت اور عنایت سے پیش آتے تھے اور طرح طرح کے سلوک کرتے تھے لیکن جب بگڑتے تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے اس وقت انھیں نہ کسی کی عزت و آبرو کا خیال رہتا تھا نہ اپنے کام کا۔ اسی لیے وہ ہم کاروں سے نباہ نہ سکے اور وہ لوگ جنھیں وہ کچھ سمجھ کر لائے تھے آخر کار ایک ایک کر کے الگ ہو گئے (لیکن)، خفا ہو جانے کے بعد پھر ملتے تو بالکل صاف ہو جاتے اور دل پر مطلق میل نہیں رہتا تھا۔ یہ ان میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی تھی۔

مرحوم (ہاپوڑ) کے ایک نہایت شریف و نجیب خاندان سے تھے۔ شادی آخر عمر تک نہ کی۔ وہ میانہ قد اور (اکہرے) جسم کے آدمی تھے۔ چہرے سے اُن کے رعب و داب اور متانت ٹپکتی تھی۔ چہرہ بھاری بھرکم، سر بڑا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور دیکھنے سے رعب اور اثر پڑتا تھا۔ سفید گول داڑھی رکھتے اور ہمیشہ شیروانی پہنتے۔ اُن کی ٹوپی اکثر ترکی ہوتی تھی۔ گندمی رنگ خوبرو آدمی تھے.... سفید داڑھی بھلی معلوم ہوتی تھی..... جامہ زیب تھے ہمیشہ ہندوستانی لباس پہنتے تھے.....اُن کے قرابت اپنے تھے بہت قابل

۱۔ چند ہم عصر، صفحہ ۱۰۲ [illegible]
۲۔ صفحہ ۱۰۵۔ ۱۰۶ مولوی محمد علی [illegible]
۳۔ صفحہ ۲۰۳ درویش پروفیسر [illegible]
۴۔ صفحہ ۲۰۱ مولانا حسرت موہانی
۵۔ صفحہ ۱۰۲ سر سید احمد خاں
۶۔ صفحہ ۱۰۹ مولوی سید علی بلگرامی
۷۔ صفحہ ۲۰۸ مولوی چراغ علی
۸۔ صفحہ ۲۲۰ نواب عماد الملک
۹۔ صفحہ [illegible]
۱۰۔ صفحہ ۱۰۹ مولوی سید علی بلگرامی
۱۱۔ صفحہ [illegible]

رشک تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں کبھی بیمار نہیں ہوا اور نہ کبھی میرا سر دُکھا۔ کبھی کبھار زکام البتہ ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ دماغ صاف ہو جاتا ہے۔ اُن کا...... پُر رعب چہرہ، اُن کی شان اور اُن کا وقار ایسا تھا کہ درحقیقت وہ زیارت کے قابل تھے۔ اُن سے اکثر ہم عصر اور ہم رُتبہ لوگ اُن کا بہت احترام اور ادب کرتے تھے اس طرح ملتے تھے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل و صورت کے لوگوں پر اُن کے علم و فضل اور قابلیت کا بھی رعب پڑتا تھا۔

مرحوم لڑکپن سے ذہین و ذکی مشہور تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ اپنے ہمسروں میں ممتاز رہے اور (اعزاز) کے ساتھ بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ تمام طالب علم (سوائے بعض کھلنڈروں کے) اور پروفیسر اُنھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے...... خود سرسید مرحوم اُنھیں اُن کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اُنھوں نے بزمانۂ قیام (علی گڑھ) ایسے ماہرینِ فن اور علمائے نامور سے تلمذ حاصل کیا جو اس وقت آسمانِ فضل و کمال کے آفتاب و ماہتاب تھے مثلاً پروفیسر (آرنلڈ) پروفیسر (بیک) پروفیسر (ماریسن اور شبلی وغیرہ) جن میں سے ہر ایک اپنے فن میں یکتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں اُن سے پہلے اور غالباً اُن کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مُطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسی وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا انتھک ہو...... وہ ہمیشہ علمی معاملات پر گفتگو کرتے...... وہ درحقیقت علی گڑھ کالج کے سپوت تھے۔

یہ (مولوی عبدالحق) کی خوش نصیبی تھی کہ اُن کی والدہ بڑی دانش مند اور نیک سرشت بی بی تھیں اور اُن میں انسانی اخلاق کی بہت سی خوبیاں تھیں (مولوی عبدالحق) کی زندگی پر اُن کا بڑا اثر تھا۔ جس طرح اُنھیں طالب علمی میں مولانا (شبلی) جیسے بے مثل ادیب اُستاد ملے اسی طرح اس کے بعد سرسید اور مولانا حالی جیسے عالی خیال پیشوا بھی نصیب ہوئے۔ ان بزرگوں نے اُن کے خیالات اور ادب پر بہت بڑا اثر ڈالا مگر وہ عمر بھر طالب علم ہی رہے۔ مصلحت وقت اور زمانہ شناسی اُن کے نصیب میں نہ تھی لہٰذا جو کبھی بدنصیبی سے اُنھوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں لغزش کھائی۔ اس چیز کے لیے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیے اور کچھ صحبت اور تجربہ، ان میں سے اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایامِ طالب علمی و ملازمت میں وہ جہاں کہیں رہے اُنھوں نے اپنے فرضِ منصبی کو ایسی مستعدی و جفاکشی اور دیانت کے ساتھ ادا کیا کہ لوگ قائل ہو گئے اور جب قومی خدمت پر کمر باندھی تو اسے بھی خوش اسلوبی، بے نفسی اور بے ریائی کے ساتھ انجام دیا اور ثابت کر دیا کہ محبِ وطن اور قومی درد کسی خاص طبقے یا کسی خاص عمر پر موقوف نہیں ہے۔

اُن میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک شریف انسان میں ہونی چاہییں۔ گھر میں اُن کی تربیت والدہ کی زیرِ نگرانی ہوئی اور یہ ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اخلاق اور تہذیب کے جو نکتے اس فرزانہ اور نیک بیوی نے اپنے عمل اور قول سے اُن کے دل میں بٹھا دیے تھے وہ عمر بھر نہ بھولے اور اُن پر عامل رہے۔ بڑے ہو کر جو صحبت ملی وہ اس زمانے کے بہترین افراد

---

۱۶ صفحہ ۲۷۲ درویش پروفیسر ری بیٹ ملک
۱۷ صفحہ ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا
۱۸ صفحہ ۱۰۵ خواجہ غلام الثقلین
۱۹ صفحہ ۹۹ مولانا محمد عزیز مرزا

۲۰ صفحہ ۱۰۵ سر سید راس مسعود
۲۱ صفحہ ۱۰۸ خواجہ غلام الثقلین
۲۲ صفحہ ۲۲۶ سر سید احمد خاں
۲۳ صفحہ ۲۳۱ سر سید احمد خاں

۲۴ صفحہ ۴۸ مولوی چراغ علی
۲۵ صفحہ ۱۷ مولوی سید علی بلگرامی
۲۶ صفحہ ۱۲۰ مولانا وحید الدین سلیم

تھے۔ ان میں سے ہر ایک جوہر قابل تھا۔ اُن کے نام اب تک ہمارے ادب میں عزت سے لیے جاتے ہیں۔ تربیت اور صحبت
بڑی چیز ہے۔ علم سے [illegible] علم اور اربابِ سخن کی صحبت نے صحیح ذوق پیدا کیا۔ مطالعہ کا شوق پہلے سے تھا۔ جودتِ فکر اور
درستی کا ملکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا اُن سب کے بل پر انھوں نے وہ کام کیے جو رہتی دُنیا تک یادگار رہیں گے۔

طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد وہ حیدر آباد آگئے۔ اگرچہ ابتدا میں وہ معمولی خدمت پر مقرر ہوئے لیکن خدا داد ذہانت[۴]
اور قابلیت کی وجہ سے انھوں نے یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ اس میں شک نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کو مولانا سے بہتر پروفیسر
نہیں مل سکتا تھا۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے وہاں اُردو کا پروفیسر بھی ایسا ہی ہونا چاہیے
جو اس کی شان اور ضرورت کے مناسب ہو۔ انھوں نے اس جامعہ کے طلبہ میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا وہ انھیں کا کام تھا۔
اور یہ بہت بڑا احسان ہے۔ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے اور پھر وہ اپنا رستہ خود نکال لیتا ہے۔

حیدر آباد کی زندگی عجیب و غریب زندگی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ یہاں کے اطراف و جوانب کا اثر انسان پر نہ پڑے اور کچھ نہیں
تو کاہلی تو ضرور ہی ہو جاتا ہے لیکن مرحوم کی جفاکشی اور مستعدی میں آخر دم تک فرق نہ آیا۔ وہ کبھی راست بازی اور دیانت کے راستے
سے نہ ہٹے۔ اُن کی زندگی جیسی سادہ اور بے ریا پہلے تھی ویسے ہی آخر دم تک رہی۔ غالباً[۵] مولوی (عبدالحق) سے بڑھ کر کسی شخص
نے سرکاری کام کبھی بے لاگ، بے تعلق اور بے لوث رہ کر سر انجام نہ دیا ہوگا۔ وہ رعایت اور جانبداری جانتے ہی نہ تھے۔ معاملات
میں وہ بالکل بھول جاتے تھے کہ اُن کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات اُن کے پیشِ نظر رہتے تھے اور انھیں پر سے وہ
بلا رو رعایت فیصلہ کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اہل حیدر آباد جو ان باتوں کے عادی نہیں اُن سے کبھی خوش نہیں رہے۔ لیکن آخر[۶]
میں حیدر آباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقش خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا مگر بے عیب ذات خدا کی ہے کون ہے جس میں
کوئی عیب نہیں اور خاص کر یہ ضعف نہ ہو۔ اُن کی[۷] زندگی نہایت سادہ اور بے ریا تھی۔ باوجود جاہ و منصب اور قیام حیدر آباد
کے کبھی بھولے سے بھی راحت و عیش کی طرف مائل نہ ہوئے اور ہمیشہ طالب علمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

جب[۸] اہل علم میں سے کوئی شخص حیدر آباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کہیں کا ہو تو اُن کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ اُن کا مہمان
ہو چنانچہ (مختلف موقعوں پر مشہور قوم پرست ترک خاتون خالدہ ادیب خانم اور رؤف بیگ، سابق امیر البحر ترکی) جب
حیدر آباد تشریف لائے تو مولوی (عبدالحق مرحوم) کے مہمان ہوئے۔

کوئی پچاس سال ہوتے ہیں جب .... آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چند صیغے الگ الگ قائم ہوئے
(ترقی اُردو) کا صیغہ اُن کے سپرد ہوا۔ انھوں نے اپنے اس فرض کو جس مستعدی اور قابلیت سے انجام دیا وہ مخفی نہیں ہے
کانفرنس کے کئی صیغے تھے اور ان کے بعض سیکرٹری بھی اُن سے زیادہ نامور نامور لوگ تھے لیکن جیسا (ترقی اُردو) کا صیغہ

۱؎ صفحہ ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا
۲؎ صفحہ ۱۵۰، ۲۰۶ مولوی چراغ علی
۳؎ صفحہ ۹۰ مولوی سید علی بلگرامی
۴؎ صفحہ ۱۲۰ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی
۵؎ صفحہ ۹۵-۹۶ مولوی محمد عزیز مرزا
۶؎ صفحہ ۱۰۱ غلام الثقلین
۷؎ صفحہ ۹۴ مولوی محمد عزیز مرزا
۸؎ صفحہ ۹۴ مولوی محمد عزیز مرزا

چکا وہ بات کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔

(شیخ سر عبدالقادر) کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اُردو کے صدر (عبدالحق) ہی منتخب ہوئے۔ انجمن سے اُنھیں بڑا شغف تھا اور اس پر اُن کا بڑا احسان ہے۔ اس کے لیے اُنھوں نے جگہ جگہ سے چندے وصول کیے (اور) بلا مبالغہ سُخنے، قدمے، دامے، مدد دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا بلکہ سب سے آگے رہتے تھے۔ انجمن پر جب کوئی کٹھن وقت آیا تو وہ اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ وہ تو اپنی ذات سے ایک انجمن تھے!

مرحوم نے حیدر آباد سے ایک ادبی رسالہ "اُردو" نامی (۱۹۲۱ء) میں جاری کیا تھا جس کے چیف ایڈیٹر مرحوم ہی تھے۔ سالہا سال تک (یہ رسالہ) اُن کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس رسالے نے ادبی ذوق کے پھیلاؤ میں بڑا کام کیا۔ اس میں اچھے تنقیدی اور ادبی مضمون نکلتے رہے۔ رسالہ اُردو سے اُنھیں خاص لگاؤ تھا۔ (خود) اُن کے بعض بہترین مضامین "اُردو" میں (ہی) شائع ہوئے (یہ رسالہ) جاری کر کے (اُنھوں نے) اپنے انداز تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے (مضمون) نویسی کا پایہ بڑھایا (اس) کے ذریعہ اُردو ادب میں انقلاب پیدا کیا (اور) ٹائپ کو رواج دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ (یہ رسالہ اُن کے انتقال) کے بعد بند ہو گیا۔ ایسے رسالوں اور اخباروں کی اب بھی ضرورت ہے۔

(مرحوم) بحیثیت ایک عام انسان کے ایک عجیب غریب شخص تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی نسبت رائے قائم کرنے میں لوگوں کو مغالطہ ہوتا ہے۔ عموماً ہر شخص دوسرے سے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق توقع رکھتا ہے اور چونکہ وہ تقریباً ہر شخص سے جُدا اور نرالی طبیعت رکھتے تھے اس لیے بہت کم لوگ ایسے تھے جو اُن کی صحیح طور سے قدر کر سکتے تھے۔ مثلاً مولوی صاحب مرحوم ایک تو طبعاً خاموش طبع تھے اور دوسرے اُنھیں اپنے وقت کی قدر بہت تھی۔ (وہ) ایک کم سخن .... فلاسفر مزاج، کوہ وقار اور عالی خیال شخص تھے (اور وقت) ایسی بیش بہا شے کو فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہر وقت مطالعے یا غور و فکر یا لکھنے میں مصروف رہتے تھے اور ایسے وقت میں کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے اُن سے صرف کام کی بات کے سوا دوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔ یہی نہیں کہ بات چیت کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زائد باتوں سے اُنھیں طبعی نفرت تھی اور جو کوئی خواہ مخواہ دیر لگاتا تھا اور نہیں ٹلتا تھا تو وہ بہت جز بز ہوتے تھے...... اور سوائے بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن چھوٹے بچوں سے بے تکلف باتیں کرتے تھے اور ان سے مزے مزے کے سوالات کرتے اور ان کے سوالوں کے جواب نہایت شرح و بسط اور خوبی کے ساتھ دیتے...... لیکن جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اس میں ادب و تمیز پیدا ہو جاتی تو پھر اُس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں میں جو بھولا پن

م۱ صفحہ ۲۰۲ سر سید راس مسعود | م۲ صفحہ ۳۶۶ آغا عبدالرحمن صدیقی | م۳ صفحہ ۱۱۷ حکیم امتیاز الدین
م۴ صفحہ ۷۷ مولوی سید علی بلگرامی | م۵ صفحہ ۳۶۲ مولانا حسرت موہانی | م۶ صفحہ ۱۲۱ مولانا وحید الدین سلیم
م۷ صفحہ ۲۰۲ سر سید احمد خاں | م۸ صفحہ ۷۷ مولوی سید علی بلگرامی | م۹ صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی
م۱۰ صفحہ ۴۴ مولوی چراغ علی | م۱۱ صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی | م۱۲ صفحہ ۴۴ مولوی چراغ علی
م۱۳ صفحہ ۱۴۰-۴۱ مولوی چراغ علی | م۱۴ صفحہ ۴۴ مولوی چراغ علی | م۱۵ صفحہ ۴۱ [illegible]

خیال کے ظاہر کرنے میں بے تکلفی اور سادگی، گفتگو میں بے ساختہ پن اور [illegible] کہ جو مساوات ہوتی ہے وہ بڑے چھوٹے میں نہیں رہتی۔
بڑے ہوکر خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ تصنع اور کچھ ادب اور لحاظ مانع ہوتا ہے۔ پھر وہ مساوات کا خیال بھی نہیں رہتا اور دنیا
داری کے خیالات پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچے پیارے ہوتے ہیں اور اگر کوئی بتانے والا
ہو تو اس وقت انھیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔

اگرچہ وہ بہت کم باتیں کرتے تھے مگر مقالات میں خوب گفتگو کرتے تھے لیکن اس میں بھی کوئی لفظ زائد اور فضول نہیں کہتے تھے
اور ان کا جملہ اکثر دو تین یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ صرف کام کے دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے جس میں مافی الضمیر
ادا ہوجاتے۔ جب کسی مسودے میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری تحریر میں جان ڈال دیتے تھے۔ اگرچہ وہ خاموش طبع تھے اور ان میں
عالمانہ متانت پائی جاتی تھی لیکن اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں خوب باتیں کرتے تھے جس سے ان کی زندہ دلی کا
ثبوت ملتا تھا۔

زندہ دلی ان کی فطرت میں تھی۔ اگرچہ عمر کے ساتھ ساتھ کام کی کثرت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور نئے نئے حالات اور
واقعات ان پر ہجوم کرکے ٹوٹ پڑے تھے لیکن ان کی زندہ دلی میں فرق نہ آیا۔ وہ اپنے بعض بے تکلف دوستوں سے بڑی
دل لگی اور شوخی کی باتیں کرتے تھے بلکہ بچوں سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہ زندہ دلی ان کے کٹھن کام میں سہارے کا کام دیتی۔ (ان
کے) چہرے پر (بالعموم) مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں
بوڑھے تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ ان سے ملنا اور
باتیں کرنے میں غم غلط ہوتا تھا اور آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔ ان کے دوستوں کو ان کی زندہ دلی، خوش طبعی، ان
کے لطیفے اور ان کے سفر کے عجیب غریب واقعات . . . . . ہمیشہ یاد آئیں گے۔ ان کی ظرافت، خوش طبعی اور شوخی کے چٹکلے
اور لطیفے ایک دو نہیں سینکڑوں ہیں جو افسوس کسی نے جمع نہیں کیے اگر ان کے خطوط جو تعداد میں بے شمار تھے یک جا مرتب ہوجاتے
تو ان میں علاوہ اور بہت سے نکتوں کے ان کی ظرافت کے پُرلطف لطیفے بھی ملتے۔ ان کے خطوط کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے۔ وہ
اصل خطوں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ ظرافت دلیل ذہانت ہے اور زندہ دلی سلامت طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام
کے بار گراں کو ہلکا کرنے میں سب سے بڑی معین اور ایک کثیر الاشغال شخص کے لیے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے۔

جن صاحبوں کو اس بے نظیر شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر فن میں خواہ ادب ہو یا فلسفہ یا تاریخ وہ ایسی
ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ خود اس فن کے ماہرین بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ قدرت نے (مولوی عبدالحق) مرحوم کو بہت
سی خوبیاں عطا کی تھیں۔ وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی ان کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی چند

---

۱) صفحہ ۲، مولوی چراغ علی
۲) صفحہ ۱۳۹، محمد ذکی کا اعلیٰ ارزنگاں
۳) صفحہ ۳۱۳، سید محمود
۴) صفحہ ۵۸-۲۵۷، ڈاکٹر محمد اقبال
۵) صفحہ ۳۹۰، ۱۰: عبدالرحمن صدیقی
۶) صفحہ ۱۳۹، محسن الملک
۷) صفحہ ۱۳۸، سرسید احمد خان
۸) صفحہ ۱۴۶، سرسید احمد خان

منشا کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا۔ . . . . . ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو، اُن سے چھُوا نہیں اور کُندن ہوا نہیں! اُن کی باتیں نہایت پُر لطف اور مزے کی ہوتی تھیں۔ ان میں ایک جادو ہوتا تھا جو سامعین کے دل پہ بے اختیار اثر کرتا تھا اور لوگ گرویدہ ہو جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ عام و خاص ہر فرقے میں مقبول تھے۔ وُہ بڑے پُر اثر اور پُر جوش مقرر تھے اور بلا تکلف تقریر کرتے تھے لیکن تقریر سے زیادہ اُن کی تحریر پُر زور اور شان دار ہوتی تھی۔ چنانچہ اُن کے بعض مضامین اُردو انشا پردازی کے بہت عمدہ نمونے ہیں۔ اُن کے قلم[1] اور آواز میں بڑا زور تھا۔ اُن کے چہرے سے اُن کی طباعی اور ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ باتیں[5] مزے لے کر اور ٹھیر ٹھیر کر کرتے تھے۔ جلدی اُن کے مزاج میں نہ تھی۔ آواز[6] میں شیرینی اور دل کشی تھی۔ اکثر لوگ جو ان سے ملنے یا کسی معاملے میں گفتگو کرنے آتے تو ان کی ذہانت اور لیاقت کے قائل ہو جاتے۔

حافظہ[7] اُن کا بڑے غضب کا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وُہ پتھر کی لکیر تھی۔ (وُہ) صُبح[8] کے نو بجے سے شام کے ۵ بجے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اُن[9] کا علم اس قدر وسیع تھا کہ گویا زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ اور اس لیے اُن کی باتیں نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہوتی تھیں۔ کسی قسم کا مسئلہ اور کسی فن کی بحث اُن کے سامنے پیش کیجیے وہ کوئی نہ کوئی بات ضرور سمجھا دیتے۔

وہ بڑے ظریف بھی تھے۔ اُن کی ظرافت عجیب شان کی ظرافت تھی۔ ان کے ایک ایک چٹکلے میں وُہ وُہ مضمون و نکات ہوتے تھے جو عُمر بھر کے مُطالعہ اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک چٹکلے میں بڑے بڑے مسائل کا فیصلہ کر دیتے تھے۔ اُن کے خاص لفظ اور جُملے جن میں جدت اور طباعی کی بُو پائی جاتی تھی اب تک دلوں میں چُبھتے ہیں اُن کا لب و لہجہ (اور) اُن کی شیریں بیانی بعض اوقات . . . . . . انسان کو پھڑکا دیتی تھی۔ اُن کی گفتگو میں جو سحر تھا وُہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ علاوہ اس کے اُن سے باتیں کرنے میں جو سبق حاصل ہوتا تھا وُہ یہ تھا کہ واقعات کے ہر پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ورنہ صحیح نتیجے کا اخذ کرنا محال ہے۔ رسوم کی پابندی، عادت کی بندش ہمیشہ بلا ارادہ بھیڑ چال پر مجبور کرتی ہے اور تقلید اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات جو خلافِ عادت ہے نظر نہیں آتی۔ وہ ہر بات میں ایک نیا پہلو دکھاتے جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا اور معمولی سے معمولی بات میں وُہ شان پیدا کر دیتے تھے جو دُوسروں کو نہیں سُوجھتی تھی اور یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ انسان واقعات کے پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے مُفید نہیں ہو سکتی لیکن افسوس کہ اب ہم اُن کی صحبت سے مُستفید نہیں ہو سکتے۔ وُہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا ہو گئے گو وہ ہم میں سے تھے مگر اُن کی باتیں ہم سے نرالی تھیں سے

یا وہ جوہر ہی الگ تھا جوہرِ انسان سے یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

۱؎ صفحہ ۴ سید محمود
۲؎ صفحہ ۵۵ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی
۳؎ صفحہ ۷۰ مولانا سید علی بلگرامی
۴؎ صفحہ ۳۶۶ تا ۳۶۵: عبدالرحمن صدیقی
۵؎ صفحہ ۲۲۱ مہدی صاحب
۶؎ صفحہ ۳۶۳ [illegible] پرنسپل بیک
۷؎ صفحہ ۹۱ مولوی محمد عزیز مرزا
۸؎ صفحہ ۱۴۲ محسن الملک
۹؎ صفحہ ۵/۲ سید محمود

وُہ بڑے ذکی [illegible] کس قدر نازک طبع واقع ہوئے تھے۔ وہ بڑے خوددار (بھی) تھے اور کسی ایسی بات کو جو خودداری کے خلاف ہوتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جس کام کو لیتے تھے اس میں ہمہ تن منہمک ہو جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ جو جوش اور آگ اُن میں ہے وہی دوسروں میں بھی ہو لیکن یہ کہاں ہوتا ہے خصوصاً ایسے زمانے میں جہاں ہمیں پتھروں سے سر پھوڑنا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ مایوسی ہوتی ہے اور یہ مایوسی اُنھیں پریشان کر دیتی تھی۔ چنانچہ انھیں ناکامیوں اور ناکامیابیوں نے اُنھیں ایک بار (صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سے رجوع ..... ہونے پر) مجبور کیا۔

مخالفت سننے کا اُن میں عجیب و غریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وُہ صبر کے ساتھ سنتے رہتے تھے جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر (ضرور) غصہ آتا تھا خاص کر جب کسی دوست کی طرف سے مخالفت ہوتی تو اُنھیں بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ وُہ دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں وہ بہت مبالغہ کرتے تھے اور اکثر عقل پر جذبات غالب آ جاتے تھے کارزارِ دُنیا میں رُوٹھے بیٹھے سے کام نہیں چلتا بیانیاں ہر کے بھی سننے پڑتے ہیں، زخم بھی کھانے پڑتے ہیں، سر بھی دینا پڑتا ہے جو اس کے لیے تیار نہیں اس کے لیے پسپا ہو جانا ہی بہتر ہے بلکہ سرے سے اس میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے (لیکن) رائے کے اختلاف سے ذاتی تعلق اور ملاقات میں کبھی فرق نہ آتا۔ ان معاملات میں وہ خوب بحث کرتے اور بعض اوقات شدت کے ساتھ لیکن اُن کا دل صاف رہتا وُہ عمر بھر مخالفتیں برداشت کرتے رہے اور (آخر آخر) یہ اُن کے لیے معمولی بات ہو گئی تھی۔

وُہ نہایت تیز فہم، صائب الرائے، جفاکش، مستقل مزاج اور اپنے ارادے کے پکے تھے۔ کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اُن کی جیت تھی۔ بڑے غور و خوض کے بعد رائے قائم کرتے اور رائے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے کبھی نہ ٹلتے تھے گویا وُہ رائے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ آدمی مفکر بھی ہو اور عملی بھی ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے .... (وُہ) جو کہتے اور سمجھتے تھے اس پر عامل بھی تھے۔ وہ ہمیشہ علمی مباحثوں میں بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے ..... اُن کی رایوں میں خاص بات ہوتی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک ایسے شخص کے دماغ کا نتیجہ ہیں جو غور و فکر کا عادی ہے۔ (لیکن) مرحوم میں ایک بڑا نقص تھا کہ بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بہک جاتے تھے (اور) ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو ان کی شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں۔

عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور ہوتا ہے — آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے (لیکن وہ) مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دن ہو یا رات ہو، ہر وقت کام کے لیے تیار۔ ڈٹ کے کام کرنے والے تھے۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے (قومی زبان) اور (اُردو) کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے۔ معترضین کے جواب بھی دیتے تھے۔ (اُردو) کالج کے حساب

ص۱ صفحہ ۱۹۰ سرسید راس مسعود
ص۲ ۔ ۱۱۱ خواجہ غلام الثقلین
ص۳ ۔ ۲۳۰ سرسید احمد خاں
ص۴ ۔ ۲۳۰ ۔ ۔
ص۵ ۔ ۲۳۰ ہم ورہ ۔ مالی
ص۶ ۔ ۲۴۲ خواجہ غلام الثقلین
ص۷ ۔ ۱۳۴-۳۵ گریٹیزی کا اول نزر خاں

ص۸ صفحہ ۲۰۱ سرسید راس مسعود
ص۹ ۔ ۱۸۶ حالی
ص۱۰ ۔ ۱۹۰ سرسید راس مسعود
ص۱۱ ۔ ۲۹ مولوی چراغ علی
ص۱۲ ۔ ۲۸ ۔ ۔
ص۱۳ ۔ ۱۰۶ مولوی سید علی بلگرامی
ص۱۴ ۔ ۲۲۵-۲۶ سرسید احمد خاں

ص۱۵ صفحہ ۲۲۲ سرسید احمد خاں
ص۱۶ ۔ ۱۹۸ سرسید راس مسعود
ص۱۷ ۔ ۲۴۳ مولوی [illegible]
ص۱۸ ۔ ۱۵ مولوی چراغ علی
ص۱۹ ۔ ۱۸۰ حالی
ص۲۰ ۔ ۲۲۸ ہم وطن ۔ مالی

کتب اور دُوسرے اہم کاموں کی نگرانی بھی کرتے تھے...... خطوں کے جواب لکھتے یا لکھواتے، ملاقاتیوں سے ملتے.... کس کس کام کا ذکر کیا جائے کاموں کا ایک ہجوم تھا جسے وہ استقلال اور اطمینان سے صبح سے لے کر شام تک برابر کرتے رہتے تھے۔ بڑھاپے کے زمانہ میں بھی اُن کے انہماک اور محنت کا یہی حال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کام اور محنت کرنے ہی سے انسان بنتا ہے اور اسی سے اس کی سیرت بنتی ہے اور اسی سے اس کے دماغی اور اخلاقی قوا کی جلا ہوتی ہے۔ اس سے مُراد وہ کام ہے جس کے کرنے میں انسان کو لذّت ملے اور شوق اسے اور اُبھارے، ورنہ کام، کام نہیں رہتا بیگار ہو جاتی ہے۔ (عبدالحق) کا یہی حال تھا وُہ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام ایسے شوق اور تندہی سے کرتے تھے گویا اُن کی دُنیا اور عاقبت کا انحصار اسی پر ہے۔

اُن[۱] کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور اُن کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دُوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسے اچھے آدمی تھے۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے (عبدالحق) ہوتے!!

وُہ[۲] بہت سادہ مزاج، بھولے بھالے اور مُنکسرالمزاج تھے مگر بکارِ[۳] (اُردو) ہوشیار اور بکارِ دُنیا بے کار تھے۔ اُن[۴] کی کاردانی اور کارگزاری ریاست حیدر آباد میں ضرب المثل (تھی) وُہ کام کرنے میں بجلی اور محنت کرنے میں آندھی تھے۔ معاملات کی تہ کو اس قدر جلد پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے انھیں معاملات کو ہفتوں اور مہینوں مُطالعہ کیا تھا وُہ بھی دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سرکاری خدمت کی کٹھن اور دُشوار منزلوں کو اُنھوں نے ہمیشہ اس آسانی سے طے کیا کہ کبھی ان کی طبیعت پر گراں نہ گزرا جو کام دُوسرے لوگ آٹھ آٹھ دس دس گھنٹوں میں طے نہیں کر سکتے تھے۔ وُہ مرحوم نے دو تین گھنٹوں میں بھگتا دیا اور پھر اس دقیق النظری کے ساتھ کہ کیا مجال کہ کوئی بات رہ جائے۔ اپنے فرائض نہایت دیانت داری اور دلچسپی کے ساتھ ادا کیے۔ اور نہ کبھی کام کرنے سے اُکتائے اور نہ آج کا کام کل پر چھوڑا ——— تعلیم[۵] یافتہ شخص کے یہی معنی ہیں کہ وہ جس کام پر ہاتھ ڈالے اُسے حُسن و خوبی کے ساتھ ادا کرے۔ خدا[۶] نے اُنھیں ایسا جوہر عطا کیا تھا جس کے سامنے بڑی بڑی تصانیف کی کچھ حقیقت نہیں وُہ جوہر ان کی غیر معمولی دماغی قوت تھی جو نہ امتحانات کے پاس کرنے سے حاصل ہوتی ہے نہ کتابوں کے پڑھنے اور فضیلت کی دستار باندھنے سے۔ مرحوم[۷] کی ذہانت، قابلیت اور وسعتِ معلومات پر ایک عالم گواہ ہے۔

اگر[۸] چہ بظاہر اکھڑ تھے مگر دل میں خلوص تھا...... اور دوستوں کے قدردان تھے..... تصنع سے دُور نہایت بے تکلف اور آشنا پرست تھے۔ وُہ[۹] کم آمیز اور دیر آشنا تھے مگر نہایت[۱۰] باوضع، دوستی کے پکّے اور صادق القول شخص تھے۔

۱؎ صفحہ ۱۳۰، گمشدہ کا حال، لڈن خاں
۲؎ صفحہ ۹۰ مولوی محمد عزیز مرزا
۳؎ صفحہ ۹۱ مولوی محمد عزیز مرزا
۴؎ صفحہ ۲۱۱ میراں صاحب
۵؎ صفحہ ۲۳۰ نام دیو ——— مالی
۶؎ صفحہ ۹۱ مولوی محمد عزیز مرزا
۷؎ صفحہ ۱۵۷/۵۸ شیخ غلام قادر گرامی
۸؎ صفحہ ۱۵۸ شیخ غلام قادر گرامی
۹؎ صفحہ ۲ سید محمود
۱۰؎ صفحہ ۲۲۸ سر سید احمد خاں

(اور) جس سے جو تعلق ہوگیا اُسے آخر دم تک نبھایا ...... وہ اُن کے سچے ہمدرد اور اُن کی بہبودی اور سلامتی کے خواہاں رہتے ...... وہ دوستی ... رشتے ناتے کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ "اگر ساری دُنیا قبضے میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اگر ساری دُنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے تو ارزاں ہے"۔ لیکن اُن کی دوستی آسان نہ تھی۔ وہ کہا کرتے تھے دعوتوں میں جانے اور بہت سے دوست پیدا کرنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اور بہت سی فضول اور بے مصرف باتیں کرنا پڑتی ہیں بجز دو تین خاندانوں کے اور کسی سے راہ و رسم نہ تھی مگر جن کے ساتھ محبت تھی خلوصِ دل سے تھی۔

وہ مصیبت کے وقت کام آتے اور ایسی حالت میں بے طلب مدد کے لیے پہنچتے اور جہاں تک امکان ہوتا وہ ہر قسم کی مدد کرتے تھے اُن کی دوستی پُرانے لوگوں کی سی دوستی تھی جو دوست کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے اور ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ جس طرح دوستی میں پکے تھے اسی طرح نفرت میں بھی شدید تھے۔ یہ نفرت کسی ذاتی بنا پر نہ تھی بلکہ جو لوگ بے اصول ہوتے، ذاتی فائدے کے لیے ایمان بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے یا قوم سے غداری کرتے اُن سے نفرت ہی نہیں اُنھیں سخت عداوت ہو جاتی تھی وہ ایسے لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے جو بدتمیز یا گندے ہوتے چونکہ وہ خود صاف گو تھے اس لیے غیبت کو پسند نہیں کرتے تھے خصوصاً اپنے کسی دوست کے خلاف ایک لفظ بھی گوارا نہ کرتے تھے (وہ خود بھی) دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دوستی پُرانے وقتوں کی دوستی تھی۔ پُرانے بزرگ اسی پر عامل تھے کچھ بھی کہے یا کچھ بھی کرے وُہ اُدبدا کے دوست کا ساتھ دیتے۔

قدامت اور جدت عجب طرح سے اُن کے مزاج میں سموئی ہوئی تھیں۔ قدامت ایسی کہ اچھے اچھے پُرانے بزرگ اُن کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے اور جدت ایسی کہ نئی روشنی کے ستارے بھی اُن کے آگے ماند تھے۔ وہ کسی ملازم کو شکایتیں سُننے کے بعد برطرف نہ کرتے یہ بات اُن میں پُرانی تہذیب کی تھی۔ میں نے ایسے کئی بزرگوں کو دیکھا ہے کہ جب اُنھوں نے کسی پر اعتماد کر لیا تو پھر کوئی کچھ کہا کرے اور کیسی ہی شکایت کرے اُن پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا بلکہ اُلٹا خفا ہونے لگتے اسی قسم کی مروت (مولوی عبدالحق) میں بھی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے "خانۂ مروت بناہ" چنانچہ اُن کے (ایک پروردہ نوجوان) کے معاملہ میں یہی ہوا۔ یہ شخص (لکھنو) کے (ایک) ممتاز خاندان کا تھا...... بارہا اُن تک شکایت پہنچی کہ یہ آدمی قابلِ اعتماد نہیں ہے (کسی ذریعۂ معاش کے باوجود) بڑی شان سے رہتا ہے۔ اُس کی دیانت مشتبہ ہے۔ میں نے بھی اس شخص کو دیکھا تھا۔ وہ فی الحقیقت رئیسوں کی طرح رہتا تھا۔ ان شکایتوں کے جواب میں وہ کہتے کہ شریف زادہ ہے گھر سے خوشحال ہے۔ وُہ صاف ستھرا اور سلیقے سے رہتا ہے تو لوگ اُس سے جلتے ہیں۔

اُن میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم ملی ہوئی تھیں کہ اس امتزاج نے اُن

ا؎ صفحہ ۳۰۹، ۳۲۳ سرسید احمد خاں
۲؎ صفحہ ۳۲۰ سرسید احمد خاں
۳؎ صفحہ ۲۰/۲۷۲ درویش پروفیسری ہٹ سنگھ
۴؎ صفحہ ۱۱۹ حکیم امتیاز احمد
۵؎ صفحہ ۳۴۳ نواب عماد الملک
۶؎ صفحہ ۹۴/۳۹۹ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی
۷؎ صفحہ ۲۲۱ سرسید احمد خاں

کی روشنی زندگی میں ایک قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا۔ وہ[1] کبھی کبھی مغربی مزاج کے آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن اکثر وہ ٹھیٹ ہندی تھے۔ اُن کی طرزِ معاشرت پُرانے اور نئے دونوں طبقے کے لوگوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ تھی۔

وہ اگرچہ کبھی کبھی رنجیدہ ہو جاتے تھے لیکن یہ[2] عارضی صورت ہوتی تھی کچھ دنوں کے بعد یہ کدورت دل سے محو ہو جاتی اور ویسے ہی خلوص اور محبت سے ملتے جیسے پہلے مِلا کرتے تھے۔ کبھی[3] دل میں کینہ یا بغض نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا فیض عام تھا دوست، دشمن بلا امتیاز اس سے متمتع ہوتے تھے۔ انتقام کا کبھی خیال نہ کیا بلکہ جن لوگوں نے اُن سے بُرائی کی اُنھوں نے اس کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیا اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی موجود ہیں کہ دوستوں سے بڑھ کر اُنھوں نے دشمنوں کو نوازا۔

حقیقت[4] یہ ہے کہ (مجموعی طور پر) اُن کو دوست بھی ایسے ملے تھے کہ اُن پر جان چھڑکتے تھے اور یہ اُن کی بڑی خوش نصیبی تھی۔ یہ سب (مولوی عبدالحق) کے خلوص، سچائی، راست بازی اور محبت کا اثر تھا۔ اس جاں[5] لیوا بیماری میں (اُن کے رفیق حکیم اسرار احمد کریوی، اُن کے نیاز مند متین الرحمٰن مرتضیٰ اور اُن) کے ملازم (نبارس خاں) نے جیسی خدمت کی نہ جورو کر سکتی تھی نہ فرزند کر سکتا تھا (یہ) اُن کی خفگی، درشتی اور چڑچڑے پن کو ہنس ہنس کے گوارا کرتے تھے اور اُنھیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔

(مولوی[6] صاحب کو) عامیانہ خیالات سے بہت چڑ (اور) جھوٹ[7] سے سخت نفرت تھی۔ جھوٹے کو کبھی مُنہ نہیں لگاتے تھے ہمارے شرفا مروّت میں آکر یا تالیفِ قلوب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو سچ کو چھپاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں یا ایسے کام کی حامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا ان کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے (مولوی عبدالحق) کا مسلک بالکل صاف تھا جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ وہ[8] راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ اُنھوں[9] نے اپنے خیالات کو کبھی نہیں چھپایا۔ جو دل میں تھا وُہی اُن کی زبان اور قلم پر تھا۔ کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ اس سے اُن کی ذات کو نقصان پہنچے گا۔ اُن کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے جب اُن کے خیر اندیش اور مخلص دوستوں نے ان کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی اور دُنیاوی اعتبار سے معاملے کی اُونچ نیچ سمجھائی لیکن اُنھوں نے وُہی کیا جو اُن کے ضمیر نے کہا اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرأت سے کام لیا۔ بے ریائی اور صداقت عمر بھر ان کا شعار رہا۔

مصلحت[10] کا داغ اُن کے دامن پر نہ تھا۔ جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی ٹوک دیتے تھے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ان کی باتوں

---

[1] صفحہ ۲۰۴ سر سید راس مسعود
[2] صفحہ ۳۶۰ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی
[3] صفحہ ۳۶۲ " "
[4] صفحہ ۴۱۶ نواب عمادالملک
[5] صفحہ ۹۳ مولوی محمد عزیز مرزا
[6] صفحہ ۹۴ " "
[7] صفحہ ۴۰۱ نواب عمادالملک
[8] صفحہ ۳۳۷ سر سید احمد خاں
[9] صفحہ ۹۴ مولوی محمد عزیز مرزا
[10] صفحہ ۳۴۰ سر سید احمد خاں
[11] صفحہ ۴۱۵ نواب عمادالملک
[12] صفحہ ۱۱۹ مولانا وحیدالدین سلیم

سے اکثر ناراض ہو جاتے [illegible] اُنؒ کے مذہب میں دل آزاری کفر تھی لیکن رائے کی آزادی میں وہ سب سے آگے تھے۔ وہ اس قدر راست باز اور بے لوث تھے کہ سچ بات کہنے میں کبھی کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اس لیے بعض لوگ ان سے خوش نہیں رہتے تھے مگر ان کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے۔

(انھوںؒ نے) ہر جگہ سچ کی حمایت اور آزادی کی تائید کی۔ اصول کی خاطر برائیاں کیں، نقصان اٹھایا، دوستوں کی ناراضگی اور لیڈروں کی خفگی برداشت کی لیکن اصول نہ چھوڑا۔ وہ حسابؒ کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہؒ انگریزی شو ساحتی کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے آداب و تکلفات کو مہمل سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم حُبِ جاہ و مال میں منہمک رہتی ہے اور اسے صرف روپیہ کمانا اور اس کا صرف کرنا آتا ہے۔ اور باقی کسی دوسری بات کی پروا نہیں۔ وہ انگریزی قوم کو اچھا نہیں سمجھتے تھے (یو پی کے مہاجروں) کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ پچاس سال میں فنا ہو جائیں گے کیونکہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ کر نوکری کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

اُنؒ کا گھر مہمان سرائے تھا۔ آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف اُن کے گھر پہنچ جاتے اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے...... بعض اوقات ٹولیاں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ اُن کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اُنؒ کی مہمان نوازی دیکھ کر عرب کی ضرب المثل مہمان نوازی یاد آتی تھی۔ ہند اور غیر ملک کے سیاح اور علما کے لیے اُن کا مکان مہمان خانہ تھا اور بڑی فراخدلی کے ساتھ حق میزبانی ادا کرتے تھے۔ سچےؒ دل سے خاطر تواضع کرتے اور (مہمان) کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

(مولوی عبد الحق) کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی، دوسری دردِ دل...... خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر رتبے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے (عزت) اور خلوص سے ملتے تھے...... اُن کا رُتبہ بہت بڑا تھا مگر اُنھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے سے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ اسؒ سے بڑھ کر خاکساری کا کیا ثبوت ہوگا کہ اُنھوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی اور حقیقی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ "مرتبہ" لکھا۔ "مؤلفہ" یا "مصنفہ" کا لفظ نہ لکھا۔

وہؒ ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ مصیبت زدوں کی داستان سن کر اُن کا دل بھر آتا تھا اور فوراً مدد کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ ایسے متعدد واقعات میرے سامنے پیش آئے۔ خود میں نے اُن سے کہہ کر بہت سے لوگوں کے کام نکالے مشکل کے وقت اُن کے دوست انھیں آگھیرتے تھے۔ وہ بلا تامل سینہ سپر ہو جاتے، یہاں تک کہ اُنھوں نے بعض

---

١ صفحہ ٢٥٩ ذاکر بجنوری
٢ صفحہ ٥٠، [illegible]
٣ صفحہ ٥٩، "
١٠ صفحہ ١٠١ حالی

٤ صفحہ ١٠٩ [illegible]
٥ صفحہ ١٠٢-١٠٣ مولوی سید علی بلگرامی
٦ صفحہ ١٠٢ "
١١ صفحہ ١٠٢ حالی

٧ صفحہ ٢٦٥ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی
٨ صفحہ ١٠١ مولوی سید علی بلگرامی
٩ صفحہ ١٦٣ حالی
١٢ صفحہ ٢٠٢ [illegible]

ایسے دوستوں کو مصیبت اور تباہی سے بچایا جو شاید اس کے مستحق نہ تھے۔ حاجت مندوں[1] کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے تھے...... (اور) اپنے پرائے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ سفارشیں کر کے لوگوں کے کام نکالتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ (انھوں[2] نے) غریبوں اور مستحقوں اور مفلوک الحال شرفا کی ہمیشہ مدد کی۔ اکثر اس طرح دیتے تھے جس پر یہ قول صادق آتا ہے کہ "دہنے ہاتھ سے یوں دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔" مولوی[3] صاحب مرحوم اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا سے بھی سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ روپے پیسے کی بالکل محبت نہیں تھی، بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہوئے تھے۔ جب[4] روپیہ اُن کے پاس آتا تو اس کے دینے میں وہ بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، اگرچہ اکثر اس سے وہی متمتع ہوتے تھے جو چالاک یا چلتے پرزے ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے پاس کبھی روپیہ جمع نہ ہوا اور خالی ہاتھ اس دُنیا سے کوچ کیا۔ مرحوم[5] کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص علمی کام یا تجارت کے لیے روپیہ طلب کرتا تو حتی الامکان بڑی خوشی سے اس کی مدد کرتے تھے۔ مرحوم[6] بہت بامروّت (بھی) تھے اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اسے پُوری نہ کر سکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دُوسری بار پھر آتا تو اس شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد براری میں کوشش کرتے۔

مرحوم[7] اپنے دوستوں کو مدد دینے اور ان کے کام نکالنے میں بڑے بہادر تھے اور اس میں وہ کسی قسم کی رکاوٹ یا مشکل کی پروا نہیں کرتے تھے (اُس[8]) کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے اور بعض اوقات دلیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بیکسوں اور درماندوں کا سہارا اور مایوسوں کی آس تھے نہایت بے تعصب اور روشن خیال مسلمان تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس درماندہ قوم کی دستگیری کرنا فرض ہے۔ لڑ[9] جھگڑ کر، خوشامد سے، چاپلوسی سے، غرض ہر طرح کام نکال لیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے سینکڑوں آدمیوں کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا کام نکال لینے کا بھی خوب ڈھب یاد تھا۔ دوسروں[10] سے کام لینے کا اُنھیں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ وہ کچھ ایسے مہر آمیز طریقے سے کہتے تھے اور اس طرح ہمت افزائی کرتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی ان کا کام کرتے تھے۔ اپنے ملازموں اور ماتحتوں سے بھی اُن کا حُسنِ سلوک ایسا تھا کہ وہ اُن کی فرمائش کی تعمیل ایسی تن دہی اور شوق سے کرتے تھے جیسے اُن کا کوئی ذاتی کام ہو اور وقت پر جان لڑا دیتے تھے۔ کام[11] کرنے والوں کی قدر بھی کرتے تھے اور اُنھیں فائدہ پہنچانے کی تاک میں رہتے تھے اور بے دھڑک فائدہ پہنچاتے تھے۔ اپنے دوستوں سے بھی خوب کھُل کر کام لیتے تھے۔ وہ[12] اپنے دفتر کے ملازموں پر نیچے کے نوکروں سے بڑی شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی سختی یا درشتی سے پیش نہیں آتے تھے اور اُن کے عیوب سے چشم پوشی کرتے تھے۔ وہ[13] اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ملازموں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا

م۱ صفحہ ۱۹۳ حالی
م۲ صفحہ ۱۰۴ مولوی سید علی بلگرامی
م۳ صفحہ " " "
م۴ صفحہ ۲۰۱ سر سید راس مسعود
م۵ صفحہ ۲۴۱ " "

م۶ صفحہ ۳۷۷ سر سید احمد خاں
م۷ صفحہ ۴۴ مولوی محمد عزیز مرزا
م۸ صفحہ ۹۰ مولوی سید علی بلگرامی
م۹ صفحہ ۱۷۶ محسن الملک
م۱۰ صفحہ ۲۴۰ سر سید راس مسعود

م۱۱ صفحہ ۲۲ مولوی چراغ علی
م۱۲ صفحہ ۹۲ مولوی سید علی بلگرامی
م۱۳ صفحہ ۱۰۵ " "
م۱۴ صفحہ ۲۰۱ سر سید راس مسعود

جانے۔ (نوکروں کو مار پیٹ اور بد زبانی کو نہایت مکروہ فعل اور بد اخلاقی سمجھتے تھے۔ نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے نہ کبھی کسی معاملے میں ان سے باز پرس کرتے اور نہ کبھی کوئی سخت کلمہ کہتے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی نوکر نے ان کی کوئی عزیز یا بیش قیمت چیز توڑ ڈالی، خفا ہونا تو درکنار اُنھوں نے پوچھا تک نہیں کہ کیوں کر ٹوٹی اور کس نے توڑی۔[۱]

آدمی کے پہچاننے میں اُنھیں خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی ملاقات اور بات چیت میں آدمی کو پوری طرح بھانپ لیتے تھے۔ اُن کے ملنے والے بُرے اور بھلے ہر قسم کے آدمی تھے۔ دُنیا نیکوں ہی کے لیے نہیں اس میں بدوں کا بھی حصّہ ہے اور شاید دُنیا کی بہت سی رونق اُنھیں کے دم سے ہے۔ وہ دونوں سے کام لیتے تھے۔[۲]

(مرحوم) کی چال ڈھال، اُن کی ہیئت، ان کی طرزِ معاشرت، اُن کا برتاؤ سب نرالے تھے ...... وہ اپنے فن میں باکمال تھے ...... وہ غریبوں کے غم خوار اور دوستوں کے ہمدرد تھے۔ افسوس کہ (ملک) ایک ایسی ذات سے خالی ہوگیا جس کی نظیر اب نہیں ہے لوگ اُنھیں بہت یاد کریں گے۔ احباب کے جلسے اُن کے بغیر سونے ہوں گے اور سب سے زیادہ اُن کے غریب دوست اُن کا ماتم کریں گے۔[۳]

(دُنیا) میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے اور ایک جھگڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے وہ اسی طرح رہے جیسے طوفان موج خیز میں لائٹ ہاؤس ...... وہ اپنے تمام سرکاری نیز (ذاتی) اُمور میں ہر قسم کے تعصبات سے بری تھے (اور) سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے اُن کی توجہ اور ان کا دل کہیں اور تھا ؎[۴]

پاک ہیں آلودگیوں میں، بندشوں میں بے لگاؤ

رہتے ہیں دُنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ (حالی)

بے تعصبی کا وصف اُن ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔ اُن[۵] کے احباب میں ہندو اور عیسائی بھی تھے اور ان سے اُن کا برتاؤ ویسے ہی خلوص اور محبت کا تھا جیسا مسلمان دوستوں سے۔ اُنھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کہی جس سے دُوسرے مذہب والوں کی دل آزاری ہو۔ اگرچہ بعض معاملات میں اُنھیں ہندو سرگروہوں سے اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کا اثر کبھی ان کے اخلاق یا برتاؤ پر نہیں پڑا۔ کسی مذہب[۶] و ملت سے اُنھیں خصومت یا پرخاش نہ تھی یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ آخر[۷] زمانے میں (وہ) گفتگو میں اکثر محاسن اسلام کا ذکر کرتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور توہمات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔

شیعہ[۸] سُنّی کے جھگڑے کے متعلق اُن کی رائے یہ تھی کہ یہ پولیٹیکل جھگڑا ہے (وہ اکثر اپنے رفیق حکیم اسرار احمد کریوی سے ایک مصری عالم کی کتاب (کا ذکر کرتے تھے) جس میں اُس نے اس پر خوب بحث کی ہے۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ

۱؎ صفحہ ۴۹ مولوی چراغ علی
۲؎ صفحہ ۱۴۲ ؍ ؍ ؍
۳؎ صفحہ ۴۴ ؍ ؍ ؍
۴؎ صفحہ ۷۹ محسن الملک
۵؎ صفحہ ۱۶۴ حالی
۶؎ صفحہ ۲۴۴ وقار الملک
۷؎ صفحہ ۱۱۰ حکیم امتیاز الدین
۸؎ صفحہ ۲۵۰ سر رشید احمد خاں
۹؎ صفحہ ۲۹۰ مولوی سید علی بلگرامی

اُردو میں (کرائیں) لیکن افسوس یہ خیال عمل میں نہ آیا۔ مرحوم[1] صحیح بخاری کے بڑے مداح اور قدردان تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان سیکھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ مرحوم[2] مولوی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کو (بھی) بہت پسند کرتے تھے۔

مگرچہ[3] مرحوم تعصب سے بری اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت و حمیت قومی اُن میں ضرور تھی اور اسلام و بانیٔ اسلام پر دل سے یقین رکھتے تھے۔ مگر مولویوں کی جاہلانہ اور متعصبانہ باتوں سے سخت ناراض ہوتے تھے۔ وہ[4] اس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے باقی تمام تفریقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے۔ مرحوم[5] ہندوستان کے مروجہ پردے کو بہت بُرا سمجھتے تھے نیز ان لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدد ازدواجات کے حامی ہیں۔

(مرحوم[6]) طالب علموں اور اہلِ علم کا بہت خیال کرتے تھے اور[7] خواہ اُن کی دُنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو اور وہ کیسے ہی پھٹے حال میں کیوں نہ ہوں اُن سے بڑی مروت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائز مدد دینے میں کبھی دریغ نہ کیا تھے، اُن کی صحبت سے خوش ہوتے تھے۔ وہ[8] اہلِ علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان ہوتے اور اُن کے لیے جو کچھ ممکن ہوتا کرنے کو تیار ہو جاتے۔ اور[9] جب ان کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کر کے حکومت سے امداد دلوانے میں دریغ نہ کرتے (اور اسی لیے[10]) اُن کی مجلس میں عموماً علمی چرچے رہتے تھے . . . . افسوس کہ اب کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں ایسی صحبت کا لطف حاصل ہو سکے۔ جب[11] کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یوں[12] تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاص کر یہ بڑا عیب ہے کہ اپنے لوگ ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بخل کرتے ہیں لیکن مرحوم اس میں بڑے فیاض تھے۔ وہ صرف اہلِ علم کی قدر و منزلت نہ کرتے تھے بلکہ ان کے کام کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قدردانی[13] کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزری تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے۔

(مرحوم[14]) جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہتے لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ (انھیں) اکثر[15] یہ خیال رہتا تھا کہ تحصیلِ علم کے لیے سہولتیں پیدا کی جائیں۔ طلبہ[16] میں وہ خاص طور پر مقبول تھے . . . . طالب علموں سے انھیں دلی ہمدردی تھی اور طرح طرح سے اُن کی مدد کرتے تھے، وہ[17] اپنی جیب سے نادار طلبہ کو وظیفے دیتے تھے۔ سفارشیں کرتے تھے، نوکریاں دلواتے تھے، اُن کی مشکلوں میں کام آتے تھے، جائز معاملات میں اُن کی حمایت کرتے تھے، اُن کے وقار کو اپنا وقار اور اُن کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے تھے۔ نام و نمود کی خاطر یا[18] اپنے کی غرض سے نہیں بلکہ وہ ان کے سچے خیر اندیش اور بہی خواہ تھے اور

ح۱ صفحہ ۹۸ مولوی سید علی بلگرامی
ح۲ صفحہ ۴۴ ″ چراغ علی
ح۳ صفحہ ۱۰۳ ″ ″
ح۴ صفحہ ۹۳ ″ محمد عزیز مرزا
ح۵ صفحہ ۱۰۵ حالی
ح۶ صفحہ ۱۹۶ سر سید راس مسعود

ح۷ صفحہ ۸۸ مولوی سید علی بلگرامی
ح۸ صفحہ ۱۰۱ ″ ″
ح۹ صفحہ ۲۲۵ نواب عماد الملک
ح۱۰ صفحہ ۱۰۵ حالی
ح۱۱ صفحہ ۱۸۱ ″
ح۱۲ صفحہ ۱۹۰ سر سید راس مسعود

ح۱۳ صفحہ ۹۸ مولوی سید علی بلگرامی
ح۱۴ صفحہ ۹۹ ″ ″
ح۱۵ صفحہ ۲۹۸ نواب عماد الملک
ح۱۶ صفحہ ۹۶ سید علی بلگرامی
ح۱۷ صفحہ ۸۴ ″ ″
ح۱۸ صفحہ ۲۶۸ سر سید احمد خاں

طلبہ بھی اُن سے دلی محبت کرتے تھے اور اُن کی سعادت مندانہ اطاعت کرتے تھے۔

(مولوی عبدالحق) کا اصلی ذوق علمی و ادبی تھا۔ اُن کا مطالعہ طالب علمی سے لے کر آخر تک جاری رہا۔ مطالعے میں بے حد شغف تھا۔ گویا یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا .... تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک آدھ گھنٹہ ہوا خوری میں نوالبتہ گزر جاتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاص کر مطالعہ کتب اور تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا۔

تحقیق و تفتیش کی یہ کیفیت تھی وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہ تک پہنچتے اور اس کے ماخذ و علیہ کے سراغ میں چپے چپے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پاتال تک کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب (یا مضمون) کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے۔ اور لوگوں کو بھیج کر دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے .... اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر انھوں نے قلم اٹھایا دوسروں نے لیے بہت کم گنجائش چھوڑی ہے۔ اُن کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا اور مواد فراہم کرنے کے لیے انھوں نے کس قدر محنت اور مشقت اُٹھائی ہے۔ وہ قدامت پرست نہ تھے بلکہ انھوں نے بہت سی پرانی رسموں کو توڑ چھوڑ کے رکھ دیا۔ ہر بات کو تحقیق اور عمل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے جو اس میں پوری اُترتی اس پر عمل کرتے۔ تقلید کے مطلق قائل نہ تھے۔ جدت اور نئی روشنی کے حامی تھے۔ وقار اور متانت اُن پر ختم تھی استقلال میں پہاڑ تھے۔ آزاد خیال ایسے تھے کہ سچ بات کہنے یا لکھنے میں کبھی نہ چوکتے۔ مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

وہ علم کی قدر کرتے تھے ..... خود بھی طالب علم تھے اور باوجود اس مرتبہ پر پہنچنے کے اُن کے مزاج میں طالب علمانہ سادگی موجود تھی اور ادبی و علمی گفتگو میں اُن کا انداز تخاطب بالکل ایسا ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم سے ہوتا ہے۔ اس وقت وہ فرق مراتب کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

مرحوم کو کتابوں کا حد درجے شوق تھا۔ ہمیشہ عمدہ اور نادر الوجود کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ قلمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدردانی پر ہے بعض وقت وہ اگر نہیں انمول کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پچھتاوا عمر بھر رہتا ہے (مولوی عبدالحق) کتابوں کے بڑے قدردان تھے اور اس قدردانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آ گئی تو بے بغیر نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ چنانچہ (انھوں نے) ایک نہایت عمدہ کتب خانہ چھوڑا ہے جس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں۔ یہ ذخیرہ بہت بیش قدر اور نادر الوجود ہے اور تمام ہندوستان میں کہیں دوسری جگہ ایسا بیش بہا مجموعہ موجود نہیں۔ اور اس میں بہت کم ایسی کتابیں ہیں جن پر اُن کے نشان یا نوٹ نہ ہوں۔

۱؎ صفحہ ۸۶۷ سرسید احمد خاں
۲؎ صفحہ ۳۳ مولوی چراغ علی
۳؎ صفحہ ۱۰۰ نواب محسن الملک
۴؎ صفحہ ۲۹۲ ″ ″
۵؎ صفحہ ۱۳ خواجہ غلام الثقلین
۶؎ صفحہ ۲۳۳ سرسید احمد خاں
۷؎ صفحہ ۰۰ مولوی سید علی بلگرامی
۸؎ صفحہ ″ ″
۹؎ صفحہ ۳۰ مولوی چراغ علی
۱۰؎ صفحہ ۳۱-۳۲ مولوی چراغ علی
۱۱؎ صفحہ ۲۳ ″
۱۲؎ صفحہ ۱۸ سید علی بلگرامی
۱۳؎ صفحہ ۱۸ ″

علم و ادب کا ذوق انہیں پہلے سے تھا۔ تحقیق اور تلاش و جستجو کی لگن نے اس ذوق کو بہت پختہ کر دیا تھا۔ طبیعت بہت حساس اور نظر بہت وسیع تھی۔ دُنیا کے ادبی شاہکار بہت کم ایسے ہوں گے جو اُن کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے۔ اس سے اُن کے ذوق میں عجیب لطافت اور وسعت پیدا ہو گئی تھی جو اُن کے مضامین سے صاف ظاہر ہے۔ اس فاضل شخص کی زندگی عجیب و غریب تھی۔ انھوں نے تمام عمر علم کے مطالعہ اور علم کی خدمت میں صرف کی۔ گو خود درویشوں کی طرح (زندگی) بسر کی مگر دُوسروں کو ہر طرح فائدہ پہنچایا۔ ہمارے مدارس اور کالج کے اُستادوں اور طالب علموں کو اس بے ریا اور بے نفس شخص کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ سچے عالم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اُن کی صحبت مغتنمات میں سے تھی۔ اس میں حکیمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے پرانے حالات (اگلے) بزرگوں کی خودداری، وضع داری اور شجاعت کے کارنامے اور اُن کے توہمات، اسراف اور شیخی کے قصے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ اُن کا تخیل اس قدر بلند تھا کہ فہم وہاں پہنچتے پہنچتے لڑکھڑانے لگتا تھا۔ شعر کا ذوق ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صحبتوں میں اُن کا منتخب کلام سُناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے جسے سن کر اُن کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلم بند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی ...... (وہ خود ہمیشہ) اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض (مولوی عبدالحق) کی صحبت میں بعض اوقات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گہرے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اُن کے علمی ذوق، علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ (شاید) ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ استوار اور دُوررس ہے!

علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔ آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام، محنت سے مل جاتا ہے لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آ جاتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور اوگھٹ گھاٹیوں کے سفرِ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ (مولوی صاحب) کا ذوق بہت سلیم اور پاکیزہ تھا اور یہ ذوق علم و ادب تک ہی نہ تھا .... زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں لطف آتا تھا۔

طبیعت میں نفاست پسندی بہت تھی۔ صناعی کے دلدادہ تھے۔ اچھی چیز کو دیکھ کر پھڑک جاتے تھے۔ بڑی صفائی اور سلیقے سے رہتے تھے۔ کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ خوب کھاتے تھے کھلاتے تھے۔ جب کوئی دعوت میں انگریزی کھانے

۱؎ صفحہ ۲۰۹ ڈاکٹر بجنوری ۔ ۴؎ صفحہ ۲۷۵ درویش پروفیسر ری سرچ تک ۔ ۷؎ صفحہ ۳۴۴ نواب عماد الملک
۲؎ ،، ۱۱۰/۱۱۹ حکیم امتیاز الدین ۔ ۵؎ ،، ۳۴۴ نواب عماد الملک ۔ ۸؎ ،، ۲۵۵ ڈاکٹر محمد اقبال
۳؎ ،، ۳۴۲ نواب عماد الملک ۔ ۶؎ ،، ۲۵۵ ڈاکٹر محمد اقبال ۔ ۹؎ ،، ۲۰۳ سر سید راس مسعود

کھانا تو بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے اور اس کا بہت بُرا مانتے تھے۔ (مولوی) صاحب کھانا تو خیر اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خوبی اور اس کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے (اور) کھانے کے عیب و ہنر کو بھی خوب پرکھتے تھے .... ان کا باورچی (شیرا) تعلیہ بھی (میرٹھ) کا تھا ...... خوب کھانا پکاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاص مزہ تھا۔ رہنے سہنے، کھانے پینے، پوشاک غرض ان کی ہر چیز میں نفاست پائی جاتی تھی۔

شاد کی دیرکاری کمال صناعی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کر دیے جائیں۔ ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اسی کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اسی لیے کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کامل عبور ہے۔ وہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں ایسے مرغوب طرز بیان کے ذریعہ عام فہم مثالیں دے کر ادا کرتا ہے کہ مضمون قابل فہم اور دلکش ہو جاتا ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے، وہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کر سکتے۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار اور تضیع اوقات ہے۔ (مولوی عبدالحق) کی تحریر اسی لیے مقبول ہوئی کہ وہ سادہ، پُر اثر اور پُر خلوص تھی۔ معمولی لکھے پڑھے شخص کی سمجھ میں بھی آتی اور اس کے دل میں گھر کرتی ...... یہ اثر رنگین عبارت، مقفیٰ مسجع جملوں، تشبیہوں اور استعاروں کے ایچ پیچ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے مطلب کو سادہ لفظوں میں صاف صاف بیان کرنے کا بہت خیال رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔

(مولوی عبدالحق) کا یہ کمال تھا کہ کیسا ہی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہو۔ وہ اس خوبی اور صفائی سے بیان کرتے تھے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اترتا چلا جاتا تھا۔ ضبط اور اعتدال ان کے بہت بڑے اوصاف تھے۔ یہ دو خوبیاں ان کے (ہاں) کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ ورنہ جوش میں آکر آدمی سررشتۂ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلانے لگتا ہے۔

اس خیال کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اسے سنسکرت یا کم سے کم بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔ ایک بار جب اردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ "اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف، کثرت سے داخل کرنے چاہئیں"۔ خود اپنی (تحریر) میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی موقع کے لیے وضع ہوئے

---

۱ صفحہ ۲۲۲ نواب عماد الملک
۲ " ۲۲۰-۲۲۹ سر سید احمد خاں
۳ " ۱۹۹ حالی

۴ صفحہ ۱۴۰ محسن الملک
۵ " ۲۰۰ سر سید احمد خاں
۶ " ۹۰، ۱۶۰ حالی

۷ صفحہ ۱۴۸ محسن الملک
۸ " ۱۶۷ حالی

ھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اُردو ادب میں داخل کیے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی
سو ادیب یا شاعر نے کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے
یں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ
(مولوی عبدالحق) سے سیکھے! ——— دِلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر ادب میں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے!

ایک بار فرمایا کہ "جو لوگ تذکیر و تانیث اور دلی لکھنؤ کی زبان کے متعلق دُور از کار اور فضول بحثوں
اور جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زبان دلی اور لکھنؤ کی تابع نہیں
بلکہ خیالات کی تابع ہے۔ کسی تحریر[۱] یا ادب کی پُشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں
سے کھیلنا پڑتا ہے۔ جن[۲] لوگوں کے خیالات رکیک ہیں اُن کی زبان کبھی فصیح نہیں ہو سکتی"

حقیقت[۳] یہ ہے کہ (مولوی عبدالحق) جیسی طبیعت اور ذہانت اور جدت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ وُہ[۴] اعلا درجے
ارتھے۔ اُن کی تحریر[۵] جامع و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔ یہ حال اُن کی تمام تصانیف کا ہے۔ اُن[۶] کی تحریر میں بڑی
بتی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ بات کی تہ تک خوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو اُستاد تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وُہ الفاظ
بڈوں اور اُن کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے۔ اور یہ لفظ
موزوں اور جلد بنالتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں جن سے الفاظ ڈھلتے چلے
ے ہیں۔ وہ[۷] دُوسرے ادیبوں کی طرح الفاظ اور محاورے سوچ سوچ کر اور ڈھونڈ کر نہیں لکھتے تھے اور نہ عبارت کے
نے اور سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ وُہ شروع سے آخر تک بلا توقف اپنے خیالات لکھتے چلے جاتے تھے اور پوری
ایک مسلسل خُوب صورت لڑی ہوتی تھی۔ میں اس کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہُوں لیکن طوالت کے خوف سے
ندہوں۔

حقیقت[۸] یہ ہے کہ اُردو نثر میں جو انقلاب اور ترقی ہم اس وقت دیکھتے ہیں اور اس میں جو وُسعت اور ادبی صلاحیت
انی ہے وُہ (اُن ہی) کا طفیل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ متین، سادہ اور خوشگوار نثر لکھنا جو علمی[۹] اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوت
ہے۔ (اُنھوں) نے سکھایا۔ اُردو[۱۰] زبان میں ابھی تک وہ توانائی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ایک زبان کے ادب کے لیے لازم ہے۔
ی عبدالحق) نے اس کے قالب میں ایک نئی رُوح پھونکی اور اُردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اُنھوں نے زبان کو
سے نکالا۔ انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا۔ جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی
رائے۔ خود کتابیں لکھیں اور دُوسروں سے لکھوائیں۔

---

۱ صفحہ ۸۷ مولوی سید علی بلگرامی
۲ " ۱۲۲ مولینا وحید الدین سلیم
۳ " ۱۲۲ " " "
۴ " ۲۰۱ نواب عمادالملک

۵ صفحہ ۲۸۳ سرسید احمد خاں
۶ " ۱۱۸ مولینا وحید الدین سلیم
۷ " ۲۹۳ سرسید احمد خاں
۸ " ۲۸۵ " " "

۹ صفحہ ۸۰ مولوی سید علی بلگرامی
۱۰ " ۲۹ مولوی چراغ علی
۱۱ " ۱۹۱ سرسید احمد خاں

اُن[1] کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ نمونے کا کام دیں۔ بعض[2] وقت جو کوئی اعلیٰ درجے کی کتاب چھپتی تو اس کی تعریف کرتے اور دُوسروں کو بھی پڑھنے کا شوق دلاتے۔

علمی و ادبی اعتبار سے اُردو زبان میں اُن کا بہت بڑا درجہ ہے۔ اُن کا ذوقِ ادب (بہت) اچھا تھا۔ . . . . . اُن کی بے شمار تحریروں میں . . . (اگر) ادبی نقطۂ نظر سے ایک انتخاب کیا جائے تو یہ انتخاب ہماری زبان و ادب کا بے مثل شاہکار ہوگا۔ یہ ادبی ذوق ہی تو تھا جس نے انھیں تذکرہ، لغات اور اُردو کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ اُن کی تحریروں میں اکثر جگہ ادبی جواہر ریزے اور حسنِ بیان[3] کے نمونے، ٹھیٹ زبان، بامحاورہ الفاظ اور محاورے اور مزاح و ظرافت کی پھلجھڑیاں نظر آئیں گی۔ (لیکن اُن[4]) سے یہ توقع کرنا کہ اُن کی ہر تحریر ادب کا اعلیٰ نمونہ ہو، عبث ہے۔ (انھیں) ادائے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض وقت وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حسنِ بیان کو قربان کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے (کہیں کہیں) اُن کی عبارت سست اور پھسپھسی معلوم ہوتی ہے لیکن جو ادبی یا علمی تحریریں اور مضامین دل لگا کر لکھے ہیں وہ حسنِ بیان اور خیالات اور زبان کی سلاست و فصاحت کے اعتبار سے اُردو ادب کے خزانے میں بے نظیر جواہر پارے ہیں۔ ان میں تمام ادبی خوبیاں ہیں۔ تلمیحات بھی ہیں، تشبیہات و استعارات بھی ہیں، محاورات بھی ہیں، لطفِ زبان بھی ہے، مزاح اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے لیکن ہر چیز اپنے محل پر ہے اور تکلف و تصنع سے بری۔

یوں[5] تو عمر کے ساتھ ساتھ اُن کے کام بھی بڑھتے گئے جو مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں کے تھے لیکن اصل کام جس پر اُن کی پوری ہمت اور توجہ صرف ہوئی وہ (اُردو زبان کے پھیلاؤ) کا تھا۔ اُردو[6] کے عاشق تھے اور اسے برصغیر کی قومی زبان خیال کرتے تھے اور[7] اس کی ترقی و فروغ کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ اُردو[8] کی حمایت میں (مولوی عبدالحق) نے کبھی کوتاہی نہیں کی جب کبھی اُردو پر آنچ آتے دیکھی تو اس کی حمایت کے لیے فوراً کمربستہ ہو گئے۔ اُردو[9] کی حمایت کو (وہ) اپنا بہت بڑا فرض اور ایک اہم قومی خدمت سمجھتے تھے اور اس معاملے میں انھوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی بلکہ سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا۔

(یہ[10]) بات اُن کی سیرت میں ایسی تھی کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ . . . . . (اُردو کو انھوں نے) اپنی بیٹی کی طرح پالا پوسا۔ . . . (اس کی) پرورش کی . . . . اور مرتے دم تک کبھی اپنے سے جُدا نہ کیا۔ جو کچھ کماتے وہ اس کے (لیے) لا کر رکھ دیتے تھے۔ انھوں[11] نے اپنے پرچے (اُردو) کے ذریعے سے (زبان و ادب) پر بڑے بڑے پُر زور مضامین خود لکھے اور دوسروں سے لکھوائے اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جگہ جگہ جا کر لیکچر دیے اور تقریریں کیں۔ انھیں[12] کیا پڑی تھی کہ (اور کملا)

---

۱ صفحہ ۱۸۲ حالی
۲ صفحہ ۲۹۱، ۲۹۲ سرسید احمد خاں
۳ صفحہ ۱۴۴ سرسید راس مسعود
۴ صفحہ ۲۲۳ میراں صاحب
۵ صفحہ ۲۰۵ سرسید راس مسعود
۶ صفحہ ۲۲۱ سرسید احمد خاں
۷ صفحہ ۲۰۹
۸ صفحہ ۱۱۰ خواجہ غلام الثقلین
۹ صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴ سرسید احمد خاں
۱۰ صفحہ ۲۵۹ ڈاکٹر محمد اقبال
۱۱ صفحہ ۲۲۳ سرسید احمد خاں
۱۲ صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴ میراں صاحب

چھوڑ کر مارے مارے پھرتے لیکن محض (اُردو زبان) کی خاطر وُہ زمین کے گز بنے ہوئے تھے۔ وہ خود طرح طرح کی تکلیف اُٹھاتے لیکن اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُنھیں ہر وقت اس کا فکر رہتا تھا اور اُن کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا۔ ۔ ۔ کہ جس طرح بن پڑے اس کی خدمت کریں۔ حق (پدری) شاید کسی نے اس طرح ادا کیا ہو۔ یہ وضع داری، یہ محبت و شفقت اور ایثار اب کہاں نظر آتا ہے۔ اپنے کو مٹا کر (مقصد) کی خدمت کرنا یہی جوہر انسانیت ہے۔

ہر شخص[28] میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے اور پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے یہ محمود کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی۔ خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تُو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وُہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اُسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچا یا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو (عبدالحق) نیک بھی تھے اور بڑے بھی!

افسوس[29] کہ ان کی زندگی کے آخری ایام انتہا درجے کی تلخی اور کرب و الم میں گزرے۔ (مرحوم[30] کا) بڑے بڑے حاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ حالت بہت ردّی ہو چکی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کی حذاقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی اور حکمت و تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی۔ وُہ وقت جو ٹلنے والا نہیں ہے اور جس سے کوئی جاندار بچ نہیں سکتا آن پہنچا اور وُہ (۱۶ ر اگست ۱۹۶۱ء کو) ہمیشہ کے لیے اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

قلم[31] اُن کا آخر دم تک نہ رُکا۔ موت[32] سے چند روز پہلے تک جب تک کہ بالکل مجبور نہ ہو گئے۔ برابر لکھتے رہے۔

ایسا[33] جامع صفات اور جامع حیثیت، بے لوث و بے نفس، پُر عزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت ہی اس سے پہلے (ملا) اور نہ اس کے بعد نصیب (ہوگا)۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آخر دم تک مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے دُنیا سے چل بسا۔ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔

ہمارے[34] مُلک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں وُہ ہر بڑے آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان جب ہوتا ہے جب وُہ بڑا آدمی اپنے اقتدار سے محروم ہو جاتا ہے۔ (ان) کی (رحلت) کے وقت کہرام مچ گیا تھا اور ہزارہا آدمی کا ٹھٹھ باہر اور اندر لگا ہُوا تھا۔ سینکڑوں آدمی جن میں امیر، غریب، بیوائیں، یتیم سب ہی تھے زار و قطار رو رہے تھے۔ وُہ کیا چیز تھی جس نے چھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا؟ مرحوم کی وفات پر تمام اُردو انگریزی اخبارات میں اظہار افسوس و ملال کیا گیا لیکن ہم یہاں بخوف طوالت صرف دو تحریروں کو نقل کرتے ہیں ایک (صدر

---

۲۸ صفحہ ۳۲-۲۳۱ نام ور ۔۔۔ حالی
۲۹ " ۱۵۱ سرسید احمد خاں
۳۰ " ۲۵۲ " "

۳۱ صفحہ ۱۵۲ سرسید احمد خاں
۳۲ " ۱۱۴ خواجہ غلام الثقلین
۳۳ " ۱۴۴ محسن الملک

۳۴ صفحہ ۱۵ مولوی چراغ علی
۳۵ " ۱۵۲ سرسید احمد خاں
۳۶ " ۵۵ مولوی چراغ علی

مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان) کا اظہارِ افسوس جو اُنھوں نے (تعزیت) سے کیا اور جو (مختلف رسائل و اخبارات میں) طبع اور شائع ہوا۔ دُوسرا (ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری) کا الم نامہ جو اس دردناک خبر (پر) اُنھوں نے خود رقم کیا، لکھا تھا۔ حقیقت میں دونوں تحریریں سچی اور دل سے لکھی گئی ہیں۔

(از جریدہ "قومی زبان" تعزیتی پیغام فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان: جلد ۱۹ شمارہ ۹ تا ۱۲)

(مولوی عبدالحق کی وفات ایک عظیم قومی نقصان ہے۔ اُن کے انتقال سے ہم علم و ادب کے ایک سچے پرستار سے محروم ہو گئے ہیں۔ مرحوم اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایک مضبوط اور غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے۔ اُن کی ذات برصغیر پاک و ہند کے گزشتہ ایک سو سال کی اسلامی ثقافت کی مظہر تھی۔ اُن کا ہمارے درمیان سے اُٹھ جانا ایک عظیم ادارے کے ختم ہو جانے کے برابر ہے۔

ذاتی طور پر اُن کے انتقال سے میں اپنے ایک قابلِ احترام دوست سے محروم ہو گیا ہوں اپنے مقصد سے انھیں جو لگاؤ تھا میں اس سے ہمیشہ فیض حاصل کرتا رہا ہوں۔

میری دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔")

(ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری کا اظہارِ غم اور خراجِ عقیدت از مکتوب محررہ یکم اپریل ۱۹۶۲ء)

("اُردو کا ذکر آتے ہی ہمارے دور کے ادب و شعر کی دُنیا میں آج کون ہے جو مولوی عبدالحق مرحوم کے نام پر ادب و احترام کا خراج ادا نہ کرے۔ ہم لوگ میں اور میرے ہم عصر جو اُردو میں شعر و شاعری یا نثر نگاری کے دعویدار ہیں، سب کے سب بابائے اُردو مولوی عبدالحق مغفور کے زیر بارِ احسان ہیں۔ وہ اوّل سے آخر تک اس زبان کی ترویج و ترقی اور حفاظت کے لیے سرگرمِ کار اور برسرِ پیکار رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو (کبھی کی) نیا میا نہ سہی کونوں کھدروں میں پناہ گزیں ہو چکی ہوتی اور ہم سب بھانت بھانت کی بولیاں بولتے نظر آتے۔

بر صغیر اعظم ہند کے باشندے، وہ کوئی بھی ہوں، اس قدر جلد اُردو اور ہندی کی وہ معرکہ آرائی نہیں بھول سکتے جو اس صدی کے آغاز سے مسلسل جاری ہے اور میں سمجھتا ہوں ابھی مدتوں جاری رہے گی۔ یہ معرکہ آرائی چند نمایاں پہلو اختیار کر چکی ہے۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُردو نے کسی محاذ پر شکست نہیں کھائی۔ مولوی عبدالحق صاحب اس یورش کے مقابل اُردو کی حفاظت کرنے والوں کے محاذ کے سپہ سالار تھے۔

آج پاکستان کی دو قومی زبانوں میں اُردو جو ایک زبان تسلیم کر لی گئی ہے یہ مولوی عبدالحق ہی کی مساعیِ جمیلہ اور ایسی کارگزاری کا ثمر ہے جس کے لیے اس مردِ حق پرست نے اپنی جان تک

دے دی، قربان ہو گئے اور کہا

ہم یہاں کام آگئے، آگے تمہارا کام ہے

فرزا کر جسمانی طور پر ہم سے رخصت ہو گئے ہیں۔ لیکن الحمد للہ اردو کا پرچم آگے ہی آگے لہرا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق کی روح پھولی بر سا رہی ہے اور ہم سب کو حوصلہ بخش رہی ہے اور آگے بڑھتے جانے کی تلقین فرما رہی ہے۔

مرحوم کے انتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں۔ ان میں سے چند یہاں لکھی جاتی ہیں۔ سید (ہاشمی فریدآبادی صاحب) نے جو (عربی) صنائع میں تاریخ کی صنعت کو بہت پسند کرتے تھے یہ تاریخ نکالی:

"غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ"

۱۳۸۱ھ

(حضرت رئیس امروہوی) مدظلہ العالی نے اسے نظم میں اس طرح موزوں فرمایا ہے ؎

"رحلت مولوی محترم عبدالحق

مرگ تازہ پئے توسیع زبان اردو

زندہ شد۔ شیوۂ اسلاف گرامی از وے

بود است از صف سرسیدؒ وحالیؒ ہم او

ہاشمی۔ فکر چو فرمود پئے سال رئیس

ہاتف غیب صدا زد غفر اللہ لہٗ"

۱۳۸۱ھ

(حضرت رئیس امروہوی) نے خود بھی ایک قطعہ (تاریخ) مرحوم کی وفات پر لکھا ہے جس میں گویا مرحوم کے کام اور سیرت کی کامل تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ یہ ہے ؎

"ہزار رنگ یہ دنیا نے نو بہ نو بدلے

مگر کہاں بدل مولوی عبدالحق

نقوش خدمت اردو کریں جہاں افروز ۔۔۔ نتائج عمل مولوی عبدالحق

رفیق سید و حالی و اکبر و آزاد ۔۔۔ وجود بے بدل مولوی عبدالحق

ہراک محاذ پہ اردو کا پاسباں ٹھہرا ۔۔۔ جہاد بر محل مولوی عبدالحق

۱؎ صفحہ ۹۵ مولوی چراغ علی ۔۔۔ ۲؎ صفحہ ۹۵ مولوی چراغ علی ۔۔۔ ۳؎ صفحہ ۹۵ مولوی چراغ علی

ادارۂ اپنے ترقی و خدمت ادب ۔۔۔ اساس ہے نخلِ مولوی عبدالحق

فنونِ نثر میں عظمت و نگارش و تحریر ۔۔۔ قصیدۂ غزلِ مولوی عبدالحق

رئیسِ اہلِ عقیدت بھلا نہیں سکتے ۔۔۔ مزیت و عملِ مولوی عبدالحق

جو اہلِ دین بھی سالِ اجل رہے درپیش

کہو "غمِ اجلِ مولوی عبدالحق"

۱۳۸۱ھ

(پروفیسر[۱] حبیب اللہ صاحب غضنفر امروہوی) نے بھی جو ایک عالم شخص ہیں اور ایک زمانے تک (ناگپور) میں ملازم تھے اور اب (اُردو کالج، کراچی میں صدر شعبۂ اُردو) ہیں ایک اچھا قطعہ تاریخ لکھا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؎

نے غضنفر وصف کیا بابائے اُردو کے لکھوں ۔۔۔ ذاتِ والا فخرِ پاکستان و صد عظمت نشان

صاحبِ نقد و نظر بھی صاحبِ اسلوب بھی ۔۔۔ آفتابِ نثرِ اُردو بالیقین و بے گماں

تلخ و شیریں زندگی کا کس قدر انجام ہے

"شامِ غم" سے ہے سنِ رحلت عبدالحق عیاں

۱۳۸۱ھ

(پروفیسر[۲] حامد حسن صاحب قادری) نے بھی مرحوم کی دو تاریخیں ایک سنِ عیسوی میں، دوسری ہجری نبوی میں (کہیں) جو یہ ہیں ؎

جُدا ہم سے بابائے اُردو ہوئے ۔۔۔ ہم اب فیض سے اُن کے محروم ہیں

اُنھوں نے جو اُردو کی کیں خدمتیں ۔۔۔ وہ سب قوم کے دل پہ مرقوم ہیں

بہت اُن کے احسان آئیں گے یاد ۔۔۔ کہ اب محسن اُن کے سے معدوم ہیں

یہ اللہ کے فضل سے ہے اُمید ۔۔۔ کہ باغِ جناں میں وہ مرحوم ہیں

لکھا قادری نے یہ سالِ وفات

کہتے "خادمِ قوم، مخدوم ہیں"

۱۹۶۱ء

مولوی عبدالحق احسان شعار : ۔۔۔ جن سے پاک و ہند دونوں فیض یاب ہیں

برگزیدہ محسنِ علم و ادب ۔۔۔ پھر نہ کیوں "بابائے اُردو" ہو خطاب

۱؎ صفحہ ۵۰، مولوی چراغ علی ۔۔۔ ۲؎ صفحہ ۵۰، مولوی چراغ علی

خدمتِ اُردو میں دی جانِ عزیز ایسی ہستی ہے جہاں میں انتخاب
نامِ عشاقِ زباں میں کر گئے بے نظیر و بے مثال و لاجواب!
قادری اُن کی ہے تاریخِ وفات
"خادمِ قومی زباں، عزت مآب!"

۱۳۸۱ھ

بہت سے ایسے ہیں جو ایک چیک پر دستخط کر دینے سے دُنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ہیں جنھیں اتفاقاتِ زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ہیں محض نام و نمود کے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں لیکن کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔ مرحوم اسی مظلوم اور چھوٹے گروہ میں سے تھے۔ باوجود اس لیاقت و (عظمت) کے اپنی زندگی درویشانہ بسر کی۔ شہرت، دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے وُہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے ورنہ چاہتے تو اس قدر شہرت اور دولت حاصل کر سکتے تھے جو دُوسروں کی قدرت سے باہر ہے لیکن انھوں نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی اور مستانہ وار ٹھکرا کر چلے گئے۔

ملٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شہرت انسان کا فطری ضعف ہے" اور حقیقت میں یہ سچ بھی ہے۔ اس سے بچنا قریب قریب محال ہے لیکن بعض خدا کے بندے جنھیں غیر معمولی دماغی قوت عطا ہوتی ہے اور جن کا علم و فضل تبحر کے رُتبے کو پہنچ گیا ہے ایسے بھی ہیں کہ شہرت پر لات مار کر کنج تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنے فلسفے اور خیالات میں، خواہ بادہوائی کیوں نہ ہوں مگن ہیں۔ یا تو وُہ اس صنعت کی قوت سے واقف نہیں کہ وہ انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے یا وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ کر پستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے تئیں ایک غلام یا بیل گھوڑے کی طرح ناگوار محنت پر مجبور نہیں کرتے اور چند بد مذاقوں کی [۱] یا چند سمجھ داروں کی واہ واہ کے لیے کاغذ کو سیاہ اور لب کو وا کرنا گوارا نہیں کرتے۔ بعینہٖ یہی حالت اُن کی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے۔ "کیا حاصل ہے شہرت سے؟ یہی کہ لوگ ہمارے نام سے واقف ہو جائیں۔ بالفرض اگر یہ ہوا بھی تو اس سے کیا خوشی ہو سکتی ہے اور اگر یہی ہے تو کیوں نہیں ہزاروں لاکھوں کارڈ چھپوا کر اپنا کام اور نام درج کر کے تقسیم کر دیں کہ ایک دُنیا اُن دونوں سے واقف ہو جائے اور پھر پیٹ بھر کر خوش ہولیں"۔ . . . . اس پاک نفس، عالی دماغ شخص کی حالت پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پارسا صفت، درویش منش، صوفی مشرب اور بالغ نظر حکیم تھا۔ وُہ خواجہ حافظ کی غزلیں اور قطعات پڑھتے اور مزے لیتے۔ وُہ اپنی روزانہ ضروریات کی . . . . . کچھ پروا نہ کرتے اور بے تکلف سادہ زندگی بسر کرتے جس میں نہ نئے فیشن کو دخل

---

[۱] صفحہ ۱۰۰ خواجہ غلام الثقلین
[۲] صفحہ ۸ - ۱۰۰ سید محمود

تھا اور نہ پُرانی وضع کا زور چلتا تھا۔ مگر جس قدر وہ ان چیزوں سے بے پروا تھے اسی قدر اخلاص میں مستثنیٰ تھے۔

انسان کی اصلی فضیلت اور برتری اس کے اخلاق (ہی) میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق کے زوال میں اُن کا زوال اور اخلاق کی پابندی اور استواری میں اُن کی عظمت و وقعت ہے۔ (مولوی عبدالحق) کی کامیابی کا راز اُن کے اخلاقِ حمیدہ میں تھا۔ اخلاق سے صرف یہی مُراد نہیں کہ آدمی دُوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے، وقت پر کسی حاجت مند کی حاجت روا کر دے۔ زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے یا جیسا کہ اکثر تعریف کے طور پر کہا جاتا ہے "مرنج و مرنجان" ہو ——— اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم و استقلال، ضبط و تحمل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت) کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری، انصاف، ہمدردی، ایثار انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے ؎

می تواں شد قطبِ عالم می تواں شد غوثِ وقت
ہر چہ خواہی می توانی شد بجز انساں شدن!

چیست انسانی تپیدن از تپِ ہمسایگاں
وز سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن

خوار دیدن خویش را از خواریٔ ابنائے جنس
در شبستانِ تنگ دل از محنت زنداں شدن

اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ورثہ میں ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسر آتے ہیں لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم، تعلیم نہیں رہی۔ ہماری تعلیم گاہیں دکانیں ہیں جن میں دساوری مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے یا ایک قسم کے کارخانے ہیں جن میں فرمائشی مال تیار ہوتا ہے۔ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ حافظے یا ذہن تک ہوتی ہے۔ اخلاق، صرف و نحو و منطق یا ریاضیات و تاریخ کی طرح نہیں رٹائے جا سکتے۔ رہا صالح ماحول اور صحبت ——— تو وہ سرے سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ اُن بزرگوں اور اُولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنھوں نے اپنی قوم یا ملک یا بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اور دکھ سہے اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا کام دیں گے۔ ان قربانیوں، صبر و استقلال اور بے نفسی کے ذکر اذکار سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ (عبدالحق) کی ہستی بھی ایسی ہی تھی:

اُن کی اخلاقی جرأت، آزادیٔ خیال، رواداری، انصاف پسندی، بے تعصبی، فیاضی اور ہمدردی کے ہندو مسلمان سب

۱؎ صفحہ ۳۶، ۳۵، ۴۴، ۲۲۳ سر سید احمد خاں

۲؎ صفحہ ۲۲۰ سر سید احمد خاں

قابل تھے جس کام کو انھوں نے اپنے ہاتھ میں لیا ـ اُسے کامل خلوص اور تندہی سے انجام دیا ـ ایسے وقت میں جب کہ بے لاگ اور بے ریا کام کرنے والوں کی شدید ضرورت ہے، جب کہ قومی ترقی کے ہر شعبے میں انسانوں کی تلاش ہے، جب کہ کام بہت ہیں اور کام کرنے والے کم، ایک صائب الرائے، معتدل مزاج، بے لاگ اور باخلوص کام کرنے والے کا اُٹھ جانا غضب ہے! ——

آدمی کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں ـ موت اٹل ہے اور سب کو آنے والی ہے اور اس لیے کوئی ڈر کی چیز نہیں لیکن ایسی موت جو بے وقت ہو اور خصوصاً جب اس کا وار ایسے شخص پر پڑے جو اپنی خوبیوں اور لیاقت میں عدیم النظیر ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی نظر نہ آتی ہوں ـ اور خاص کر جب کہ یہ سانحہ ایسی قوم میں واقع ہو جہاں پہلے ہی سے قحط الرجال ہو تو ایسی موت (واقعی) غضب ہے اور قیامت ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے ـ

ہمیشہ جو اس قوم کے اعضا ہیں جس میں آج کل ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی بہت قدر کرنی چاہیئے جن کا ہونا ہمارے لیے فخر ہے اور جن کے سہارے اور مدد سے قوموں کو ایسی مدد ملتی ہے کہ ایک ایک ان میں سے لاکھوں پر بھاری ہوتا ہے. دُنیا میں اکثر ہوا ہے کہ ایک سپاہی کی ہمت سے شکست کھاتے کھاتے فوج فتح پا گئی ہے، ڈوبتے ڈوبتے جہاز صرف ایک شخص کی دانشمندی سے پار اُتر گئے ہیں ـ یہ زمانہ ہمارے لیے بڑا کڑا زمانہ ہے ہمیں ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے ان کا ہونا ہمارے لیے نعمت اعظمیٰ اور ان کا مر جانا ہمارے لیے ایک بلائے مبرم ہے ..... اُن کا غم مدتوں ہمارے لیے تازہ رہے گا.

مرحوم میں اس قدر محاسن اور خوبیاں جمع تھیں کہ آج باوجود تلاش کے کوئی اُن کا جانشین نہیں ملتا ـ لوگ اُنھیں زمانہ دراز تک یاد رکھیں گے —— انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے، یہی اس کی پونجی یہی اس کی آل اولاد اور یہی اس کی کمائی ہے ...... اولاد کس کے نہیں ہوتی اور کون جاندار ہے جو اس پر قادر نہیں، بلکہ جتنے ادنیٰ اور حقیر جانور ہیں اُتنی ہی اُن کے زیادہ اولاد ہوتی ہے ـ چنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ اُن کے چند گھنٹوں میں ہزاروں لاکھوں بچے پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن انسان کا نام اُس کے کام سے ہے ـ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں تو کیا اُن کی اولاد اور مکانات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے؟ —— ہرگز نہیں یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں بلکہ اُن کے کیرکٹر اور کام کی وجہ سے ـ اُن کا کیرکٹر اور کام خود ہمیں اُن کی یاد دلا رہا ہے ـ اُن کی بھلائیاں، اُن کے کارنامے اور اُن کے احسانات اُن کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے ـ بس یہی ایک چیز ہے جو مرحوم کو زندہ رکھے گی اور یہی ایک چیز ہے جو دُنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہے ـ میں اُن کی موت کو قومی سانحہ سمجھتا ہوں ـ اُن کے ہونے سے ہمیں بڑا سہارا تھا ـ ہر ملی و ادبی کام میں ہم اُن کا نام سب سے

---

۱۱ صفحہ ۱۰۰ خواجہ غلام الثقلین
۱۲ ،، ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا
۱۳ ،، ۱۲ سید محمود
۱۴ ،، ۶۵ مولوی محمد عزیز مرزا

۱۵ صفحہ ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا
۱۶ ،، ۱ سید محمود
۱۷ ،، ۶۵ مولوی محمد عزیز مرزا
۱۸ ،، ۵۲ مولوی چراغ علی

۱۹ صفحہ ۱ سید محمود
۲۰ ،، ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا
۲۱ ،، ۵۱ مولوی چراغ علی
۲۲ ،، ۱۲۲ مولانا وحید الدین سلیم

پہلے شریک کرتے تھے اب وہ نہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوت کم ہو گئی ہے۔

(مولوی عبدالحق) کی زندگی سے ہمیں بہت سے سبق ملتے ہیں۔ ان کا اپنے نصب العین پر آخر دم تک قائم رہنا۔ اس کے لیے ہر جائز ذریعہ کو کام میں لانا۔ مخالف قوتوں کا دلیری سے مقابلہ کرنا۔ محنت و مشقت سے کبھی جی نہ چرانا۔ دن رات کام میں لگے رہنا۔ تساہل اور کاہلی کو پاس نہ پھٹکنے دینا خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے مرحوم کی طرح اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دی ہو۔ اس راہ میں مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم بننا بہت دشوار ہے۔ مرحوم اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دُنیا میں جاہ و ثروت، لیاقت و فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے جو دُوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وُہ خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا چاہتا ہے اُس سے زیادہ کھوتا ہے۔ . . . . . . اُن کی زندگی ایک سبق ہے اُن لوگوں کے لیے جو دُنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے کارنامے جو ان مُلک کے لیے دلیلِ راہ کا کام دیں گے۔

یہ عالی دماغ شخص سرزمین ہندوستان میں ایسے پیدا ہوئے ہیں کہ اُن پر جتنا فخر کریں بجا ہے اور ایسے وقت میں ہوئے جب کہ موقع بہت نازک ہو چلا تھا۔ غالباً (مولوی عبدالحق) سے بڑھ کر کسی شخص نے کام کو اس طرح بے لوث، بے تعلق اور بے لاگ ہو کر سرانجام نہ دیا ہوگا۔ مرحوم بوجہ اپنی اعلیٰ قابلیت، تجربہ کاری، عالی ظرفی اور راستی و راست بازی کے، ہماری قوم کے بے مثل افراد میں سے ہیں۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے (عبدالحق) ہوتے!!

آج اُن کی موت پر ایک بڑے حلقے کو حقیقی رنج اور افسوس ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو علم و ادب کا ایک ستون گر گیا۔ مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھے اُن کے رفقا، اور اُن کے ہم عصر اُن کے سامنے بونے تھے۔ (اُن) کے انتقال سے اُردو ادب کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی ہے جس کا پُر کرنا آسان نہیں۔ (اُن) کا غم مدتوں ہمارے لیے تازہ رہے گا۔ اُن کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں، جسے ہم کمال کہتے ہیں وُہ انھیں دونوں کا خانہ زاد ہے ——————

وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دُوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر بھی اس کی قدر نہیں کرتا اور قدر اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ انسان دُنیا میں نہیں رہتا مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنھیں بقا ہو؟ جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں؟ اور لوگوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں . . . . انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے بہت مشکل ہے کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ تکمیل کو بھی پہنچے اور پھر ایسے کام بھی کرے جنھیں بقائے دوام ہو اور خلقِ خدا کو اُن سے فائدہ پہنچے . . . . مرحوم نے زندۂ جاوید صحت اور باقی عمر میں

ص۱ صفحہ ۲۳۳ سرسید احمد خاں
ص۲ " ۲۲ مولوی چراغ علی
ص۳ " ۱۰۳ [illegible] - نور خاں
ص۴ " ۱۱۰ مولانا وحید الدین سلیم
ص۵ صفحہ ۱۲۲ مولانا وحید الدین سلیم
ص۶ " ۲۵ مولوی چراغ علی
ص۷ " ۱۲۳ مولانا [illegible] سلیم
ص۸ " ۱۲ سید محمود
ص۹ " ۱۰۶ مولوی سید علی بلگرامی
ص۱۰ صفحہ ۱۳ مولوی چراغ علی
ص۱۱ " ۱۱ "
ص۱۲ " ۱۵۵ مولانا محمد علی
ص۱۳ " ۱۲۳ مولانا وحید الدین سلیم

بہت سے کام ایسے ہیں کہ دُنیا میں یادگار رہیں گے جن کا اثر دُوسروں کے قلوب اور دماغوں تک پہنچے گا۔ اور یہ اُن کی تحریریں ہیں جو اُن کے قلم سے نکلیں اور ملک میں پھیلیں اور سُورج کی روشنی کی طرح ایک سرے سے دُوسرے سرے تک حیاتِ عالم میں اپنا مُفید کام کرتی رہیں گی اور مرحوم کی یاد کو اُن کے قدر دانوں کے دلوں میں تازہ رکھیں گی۔

جو لوگ[1] یہاں کامیابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اُنھیں مولوی (عبدالحق) مرحوم کی مثال پیشِ نظر رکھنی چاہیے اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمین قشور میں قبلہ رانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے کُچھ نہیں۔ اُنھیں مولوی (عبدالحق) مرحوم کی طرح اُس زرخیز زمین میں تخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیے جس کے نتائج اب تک بارور ہیں اور جس کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ عزت و حُرمت کے ساتھ یاد کیا جائے گا ؎

بارے دُنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کُچھ کر کے چلو، یاں کہ بہت یاد رہو (میر)

وہ ہم[2] میں نہیں رہے لیکن وہ اپنی زندگی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ چھوڑ گئے ہیں، جو ہمارے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔ اُن کی رائے میں کہیں کہیں غلطیاں بھی نظر آئیں گی۔ لیکن اُن کے خلوص و صداقت اور راست کرداری میں مُطلق شک و شُبہ کی گنجائش نہیں۔ اس میں شُبہ نہیں کہ انسان کی اصلی ترقی دماغی قوت پر منحصر ہے۔ دولت اس کی محض معین ہے۔ انسان کی رُوح کو اگر ایک گاڑی تصور کیا جائے تو یہ جوڑی اس کو کھینچنے والی ہے، لیکن اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ میں ہے تو یہ زمین تو کیا فلک الافلاک تک پہنچ جائے گی۔ لیکن خدانخواستہ اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ سے چھین لی جائے تو وہ پاش پاش ہو جائے گی۔ لیکن ہم اُن کی (آخر) زندگی سے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہیں گے کیونکہ اب وُہ وہاں ہیں جہاں ہماری آواز نہیں پہنچ سکتی اور جو کُچھ اُنھوں نے چھوڑا ہے وُہ ایسا کُچھ ہے کہ اُس کی نظیر نہیں.....

...... دُنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح نہ انسان بے عیب ہُوا ہے نہ ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب کسی شخص میں ایسی خُوبیاں ہوں جو عام طور پر دُوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور جن کا ہونا عجائبات اور نوادر میں سے ہے تو ایک ایسے شخص کا ہم میں سے اُٹھ جانا کیسے کُچھ رنج اور کیسے کُچھ اَلم کا باعث نہ ہوگا۔ زمانے کی ترقی کبھی رُکتی نہیں اس کا قدم ہمیشہ آگے پڑتا ہے ممکن ہے ہم میں بہت سے لائق اور فاضل لوگ پیدا ہوں یہ سب کُچھ ہوگا مگر (مولوی عبدالحق) کہاں! ــــ اُن کی باتیں فسانے کے طور پر رہ جائیں گی اور مدتوں اُن کا ذکر کر کے لوگ اُنھیں یاد کریں گے ؎

دو رہا باید کہ تا صاحب دلے پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

......وُہ ہم میں ایسے تھے جیسے پو دنوں میں دیو۔ افسوس ایسی نسلیں ہم میں سے مٹتی جاتی ہیں۔ عظیم الشان چیزیں گو وہ

ھ۱ صفحہ ۷۹ مولوی چراغ علی ھ۲ صفحہ ۲۵۲ سر سید احمد خاں ھ۳ صفحہ ۹ تا ۱۱ سید محمود

عل [illegible] صاحت ہوں لیکن صرف اُن کے وجود ہی سے دُنیا پر اس قدر اثر پڑتا ہے جو بڑے بڑے کاموں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ [illegible] ہے بات کہ جب ہم نیلگوں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جس کی وُسعت کی کوئی انتہا نہیں تو کیا ہمارے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا؟ —— جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی وسیع سطح اور بے پناہ موجوں کو دیکھتے ہیں تو کیا اس سے قلب پر عجیب کیفیت پیدا نہیں ہوتی؟ یہی حال اُن ؎ وسیع النظر عالی دماغ لوگوں کا ہے کہ گو وُہ کچھ نہ کہیں لیکن اُن کا اثر نہایت پر زور اور عجیب و غریب ہوتا ہے۔

آخیر زمانے میں (اُن کے بعض بے تکلف دوست اُنھیں) "ایک شاندار انسانی کھنڈر" کہا کرتے تھے۔ لیکن کیا کھنڈر ہم کو عزیز نہیں ہوتے؟ —— کیا کھنڈروں کی وقعت ہمارے دلوں میں نہیں ہوتی؟ —— کیا ہم گوارا کر سکتے ہیں کہ کسی زمانے کی وُہ زندہ یادگاریں جو زندہ ثبوت ہیں ہماری تہذیب و شائستگی کا، دُنیا سے نیاً منیاً ہو جائیں —— ؟ ایک جدید اور نئی عمارت کے خراب ہو جانے اور اس کے ٹوٹ جانے کا اتنا رنج نہ ہوگا جتنا ایک کھنڈر کے مٹ جانے کا۔ لیکن افسوس کہ وُہ عالی شان کھنڈر ہماری نظروں سے غائب ہو گیا اور مادر گیتی کا نہایت لائق فرزند زمین کا پیوند ہو گیا اور وہاں جگہ پائی جو اس بزرگ کی سب سے مستحکم اور زندہ یادگار ہے جسے اُس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اُسی دُھن میں دُنیا سے گزر گیا جہاں اب تک اُس کی رُوح پھر رہی ہوگی۔ یہاں سیاح اور مسافر دُور سے آئیں گے اور دو آنسو بہا جائیں گے!

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ اُن کی ذہانت، جودتِ طبع، وسیع النظری اور علم و فضل کو دیکھ کر دل میں عزت و احترام پیدا ہوتا تھا اور جب اُن کی شرافتِ نفس، عالی ظرفی، شگفتہ دوستی اور خود داری کو دیکھتے تھے تو دل بے اختیار اُن کی طرف کھنچتا تھا اور اُن سے محبت ہونے لگتی تھی۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب اُن سے ملتے تو اُن کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دُوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں اُن کے ڈنک یہاں آ کر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آ سکتے ہیں ورنہ دُنیا میں پند و نصائح کی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں، کیسا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دُنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحب علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں۔ مگر افسوس کہ کوئی (عبدالحق) نہیں!!

۱؎ صفحہ ۱۲ سید مسعود ۲؎ صفحہ ۱۴۳ حالی ۳؎ صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳ ۴؎ صفحہ ۹۰، ۹۱ ڈاکٹر بجنوری

اُردو کا قدیم ترین ادب

ڈاکٹر سہیل بخاری

اُردو ادب کے مورخین اپنی بات کی ابتدا حضرت امیر خسرو دہلوی سے کرتے ہیں اور کچھ کہہ مکرنیوں، دو سخنوں اور پہیلیوں کا ذکر کرنے کے بعد ایک غزل بھی اُن کے نام سے منسوب کرتے ہیں جس کا مطلع ہے "ز حالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں" اس کے فوراً بعد وہ دلّی سے سیکڑوں میل دُور دکن پہنچ کر بیجاپوری شعرا کا کلام سُنانے لگتے ہیں۔ لیکن ان کی اس سلسلہ بندی سے ادب کی تاریخ میں جو جھول پیدا ہو جاتا ہے وہ ایسا نہیں ہے جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔

حضرت امیر خسرو دہلوی کے فارسی کلام سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ہندی زبان میں بھی طبع آزمائی کی تھی لیکن اس بات کی کوئی داخلی یا خارجی شہادت نہیں ملتی کہ وہ جس زبان کو ہندی کہتے ہیں وہ یہی زبان ہے جسے بعد میں زبان اُردو یا زبان اُردوئے معلیٰ کا نام دیا گیا۔ نہ ان کا ہندی کلام ہی کسی مخطوطے یا مطبوعہ کتاب کی صُورت میں ہم تک پہنچ سکا ہے جس سے اُن کی زبان کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے البتہ ان کا وہ ہندی کلام جس کا اُوپر ذکر کیا گیا روایتاً اُن کے نام سے منسوب چلا آ رہا ہے جس کی حیثیت ابھی تک محض الحاقی ہے۔ جب سے حافظ محمود شیرانی نے اپنی تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی نہیں بلکہ عالمگیری عہد کے ایک بزرگ خسرو نامی کی تصنیف ہے اس وقت سے حضرت امیر خسرو کا مندرجہ بالا ہندی کلام بھی مشتبہ ہو گیا ہے۔

اس الحاقی کلام کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہے جو اس شُبہے کو تقویت بخشتی ہے۔ چُنانچہ ان کی مشہور غزل "ز حالِ مسکیں" کا اگر لسانی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی زبان اُردو نہیں برج بھاشا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے اُردو کو برج بھاشا سے مشتق بتایا تھا لیکن یہ بات حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اُردو" کی تصنیف سے پہلے کی ہے۔ اس لحاظ سے ادب اُردو کی تاریخوں میں اس غزل کے تذکرے کا کوئی جواز نہیں ہے اور کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں پر ابھی تحقیق کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ بھی انھیں بزرگ خسرو کی تصنیف نہ ہوں جنھوں نے خالق باری لکھی ہے۔ البتہ تاریخ ادب میں ان کو اس وقت تک جگہ دی جا سکتی ہے جب تک کہ وہ تحقیق سے کسی غیر کی ثابت نہ ہوں۔

ان مورخینِ اُردو کے پاس جو حضرت امیر خسرو کے بعد تاریخ ادب کا سلسلہ بیجاپوری شعرا کے کلام سے ملاتے ہیں اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ اگر اُردو دہلی کی قدیم زبان تھی اور وہاں اس کا اس حد تک چرچا تھا کہ حضرت امیر خسرو جیسے شاعر اس میں پیدا ہوئے تو پھر ان کے بعد اُردو شعر گوئی کی روایت دہلی میں یکایک ختم کیوں ہو گئی۔ متداول کُتب تاریخ میں ہندِ شمالی کی باقاعدہ شاعری دبستان دہلی سے شروع ہوتی ہے جس کی پیش نامندگی آرزو، آبرو، مظہر جانجاناں وغیرہ کرتے ہیں لیکن یہ لوگ حضرت امیر خسرو کی وفات کے تین سو سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔ جو مورخین اُردو تاریخ کے اس طویل خلا کو بیجاپوری شعرا کے کلام سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں

وُہ یہ نہیں بتاتے کہ اسی دہلی میں جسے اُردو کی جنم بھوم کہا جاتا ہے حضرت امیر خسرو کے بعد اُردو شاعری کے یکایک سو جانے اور پھر تین سو سال کے بعد اچانک بیدار ہو جانے کے وجوہ کیا ہیں۔

یہاں اس مسئلے کا یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ مورخینِ ادب بیجاپوری شعرا کے جس کلام کو تاریخِ ادب میں شامل کر رہے ہیں وہ اُردو نہیں بیجاپوری زبان میں ہے۔ یہ بات بعض طبائع پر گراں ضرور گزرے گی اور وہ محض تکلف پر وری یا دُوسری مصلحتوں کی خاطر اس کو تسلیم کرنے سے انکاری ہوں گی لیکن کیا کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے۔ میں نے "اُردو نامہ" کراچی کے اٹھارھویں شمارے میں نہایت تفصیل سے لسانی تجزیہ کر کے اُردو اور دکنی دونوں کے کثیر تعداد اختلافات واضح کر دیے ہیں اور یہ جتا دیا ہے کہ ہم نے تاریخی تسلسل قائم کرنے کی کوشش میں وقت کی خلیج کو جس مراد سے پاٹنا چاہا ہے وہ اتنا کمزور ہے کہ اس پر سے گزرنا تو درکنار اس پر کھڑا ہونا بھی ناممکن ہے اس لیے اہلِ دہلی کی شعرگوئی کے اس طویل تعطل کی تشریح دکنی شعرا کے کلام سے نہیں ہو سکتی۔

اس مقام پر جس عام غلط فہمی کا اظہار کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ بیجاپوری بولی جس زبان کی قدیم شکل ہے ہماری بول چال اس کا جدید رُوپ ہے یعنی ہماری زبان اور بیجاپوری میں جدید و قدیم کا رشتہ ہے لیکن بیجاپوری کو قدیم کہنے والے شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ بیجاپور میں آج بھی وہی زبان بولی جا رہی ہے جس میں قدیم دکنی شعرا و ادبا نے آج سے چار سو سال پہلے اظہارِ خیال کیا تھا اور جسے ہمارے مورخین اُردوئے قدیم کا نام دے رہے ہیں۔ آج اُسی زبان میں وہاں لوک گیت گائے جا رہے ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں اور بازاروں میں اسی بولی سے کام چلا رہے ہیں اس لیے یہ زبان جس قدر قدیم کہلانے کی مستحق ہے اسی قدر اسے جدید بھی کہا جا سکتا ہے۔ دُوسری طرف ہماری زبان (اُردو) جس قدر جدید ہے اسی قدر قدیم بھی ہے بلکہ اس زبان کا سُراغ جو ہم آج کل بول رہے ہیں آج سے چار سو سال نہیں بلکہ چھ سو سال تک بھی مل جاتا ہے جیسا کہ سطورِ آئندہ میں ظاہر ہوگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو لوگ امیر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کو جو قدیم دکنی شاعری سے بھی قدیم تر ہیں اُردو زبان کے اولیں نمونے کہتے ہیں اور دُوسری طرف دکنی کو اُردوئے قدیم بھی مانے جا رہے ہیں حالانکہ ہماری بول چال دکنی کے مقابلے میں امیر خسرو کی مذکورہ بالا تخلیقات سے بہت قریب ہے۔ ایسی صُورت میں دکنی کے بجائے امیر خسرو کی زبان کو اُردوئے قدیم کہنا زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔

خُود دکنی کے بعض شعرا و مصنفین نے بھی اس موقف کی تائید کی ہے کہ دکنی اور اُردو دو مختلف زبانیں ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد باقر آگاہ ویلوری نے اپنے رسالے "من درپن" (سن تصنیف ۱۲۰۶ھ) میں جو معجزات نبی کریمؐ سے متعلق مفصل معلومات فراہم کرتا ہے اس خیال کو یوں واضح کر دیا ہے۔

اگر بھاکے میں اُردو کے میں کہتا
کوئی اس کو یہاں کے لوگوں سے نہ چہتا

ماہنامہ "قومی زبان" کراچی بابت جنوری ۱۹۶۴ء کے صفحہ ۲۹ پر اس مقام کی عبارت یہ ہے:

"آگاہ نے اسے آسان دکنی زبان میں لکھا ہے جسے وہ اُردو نہیں کہتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں دکنی و اُردو دو جُداجُدا زبانیں ہیں۔"

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اُردو ادب کے متعلق ہمارا ایک مخصوص نظریہ قائم ہوگیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اُردو صرف اس زبان کو تسلیم کرتے
ہیں جو ایرانی لپی میں لکھی جاتی ہے اور ایرانی لپی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی ہے۔ اس لیے اس زبان کا جو ادب مسلمانوں کی آمد سے
پہلے دیوناگری لپی میں جمع ہوا اسے ہم اپنے ادب میں شامل نہیں کرتے۔ دُوسری طرف ایرانی لپی کا بیجا پوری ادب اُردو ادب کا سب سے زیادہ قدیم اور
کافی مقدار میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو زبان کو قلم بند کرنے کے لیے ایرانی لپی کا استعمال مسلمانوں کی آمد کے صدہا سال بعد ہوا ہے
بلکہ بیجا پور میں مقامی زبان ابتدا ہی سے ایرانی لپی میں منتقل ہو چکی تھی۔ شمالی ہندوستان میں فارسی زبان سن ۱۸۳۲ء تک سرکاری اور دفتری
کاروائیوں کا واحد ذریعہ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں فارسی زبان کے مقابلے میں جسے سرکاری پُشت پناہی حاصل تھی اُردو زبان کی
طرف لوگوں نے بہت کم توجہ دی اور اس کا جو تھوڑا بہت سرمایہ جمع بھی ہوا تو وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھا لیکن دکن میں بیجا پور کی
زبان کو ابتدا ہی سے سرکاری منصب مل گیا تھا اس لیے اسے حکومت اور عوام دونوں کی سرپرستی بیک وقت نصیب ہوگئی تھی۔ غرض لپی
کے اس اشتراک نے ہمارے ادب میں ایک غلط فہمی کو جنم دیا اور ہم بیجا پوری ادب کو اُردو کا قدیم کہنے لگے۔

اُردو ادب کا یہ نظریہ جس کی بُنیاد لپی پر قائم کی گئی ہے لسانی اعتبار سے بالکل باطل ہے کیونکہ زبان روح اور لپی اس کا جسم ہوتی
ہے اور جس طرح جسم کی تبدیلی سے رُوح کی ماہیت نہیں بدلتی اسی طرح لپی کے فرق سے زبان کی اصلیت میں فرق نہیں آسکتا۔ اس سلسلے میں
خود ہمارے خیالات میں ایک عجیب تضاد ملتا ہے کہ ہم نہ صرف اس ایرانی ادب کو جو عربی لپی میں لکھا جا رہا ہے ایرانی تسلیم کرتے ہیں بلکہ
اس سرمائے کو بھی ایرانی مانتے ہیں جو ایران میں مسلمانوں کے ورود سے ہزاروں سال پیشتر جمع ہو چکا تھا لیکن جب اُردو ادب کا مسئلہ سامنے
آتا ہے تو فوراً اپنا موقف تبدیل کرکے دیوناگری لپی میں جمع ہونے والے اُردو زبان کے ادب کو سنسکرت یا ہندی وغیرہ کہہ کر اپنی تاریخ
سے خارج کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جس طرح ایران قدیم میں مسلمانوں کے وہاں پہنچنے سے قبل خالص ایرانی ادب کے نمونے ملتے ہیں اسی
طرح ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی آمد سے پہلے خالص اُردو کے ادب پارے دستیاب ہوتے ہیں جو تاریخ ادب اُردو کی تکمیل کے لیے اسی
طرح ضروری ہیں جس طرح قدیم ایرانی نمونے تاریخ ادبیاتِ ایران کا اہم جزو ہیں۔

تاریخ ادب کی اسی کمی کے باعث زبان اُردو کی ابتدا کے بارے میں بھی بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں کیونکہ محققین و مورخین
نے تحقیق و تاریخ زبان کی بُنیاد اسی ادب پر قائم کی جو ایرانی لپی میں دستیاب ہوتا ہے چنانچہ اُردو کا آغاز بالعموم شاہجہانی عہد سے کیا جاتا
ہے جبکہ اُردوئے معلّیٰ کے علاقے کی نسبت سے اس کا نام زبان اُردو رکھا گیا اور نمونے تو اس کے بھی بعد کے زمانے سے شروع
ہوتے ہیں۔ مورخین نے امیر خسرو کو اُردو کا پہلا شاعر ضرور مانا ہے لیکن وہ امیر خسرو کے بعد کے قدمائے دہلی تک ہند شمالی کی اُردو کے
نمونے پیش کرنے سے قاصر ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اس درمیانی عہد کے نمونے دیوناگری لپی میں ملتے ہیں جو یا تو ان کی نظر سے نہیں گزرے یا اگر
ان کی نظر پڑی بھی تو انھوں نے انھیں اس لیے نظر انداز کر دیا کہ وہ صرف ایرانی لپی میں ہی لکھی ہوئی زبان کو اُردو تسلیم کرتے ہیں۔
چنانچہ اس سلسلے میں قدیم دیوناگری مخطوطات و مطبوعات کی جستجو از حد ضروری ہے کہ تاریخ ادب کی صحیح تکمیل صرف اسی طرح ممکن
ہو سکتی ہے۔

دراصل اُردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو رُوپ ہیں جسے ابرہام بلنبر? نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔ ان کے موجود

دونوں میں دو فرق واضح ہیں ایک لپی اور دوسرا ذخیرۂ الفاظ۔ ہندی دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے اس لیے اس میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہو گئی ہے اور اُردو نے ایرانی لپی میں تحریر ہونے کے باعث بے شمار عربی فارسی الفاظ مستعار لیے ہیں لیکن علم زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابلِ التفات نہیں کیونکہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس نقطۂ نظر سے ہندی اور اُردو کی تاریخ ایک ہی ہے خاص کر کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اُردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصہ ہے۔ جیسا ہندی زبان کا اور اس کے قدیم ادب میں سنسکرت یا دوسر معاصر بولیوں کے مستعار الفاظ کی موجودگی کے باوجود اسے اُردو کے قدیم ماننے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے سطور ذیل میں اسی کھڑی بولی کے کچھ قدیم نمونے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے ادب کے ابتدائے وینگ ہیں اور صرف ایسے ٹکڑے منتخب کیے ہیں جن میں سنسکرت الفاظ کم سے کم اور عربی فارسی الفاظ زیادہ سے زیادہ پائے جاتے ہوں۔ اس کے باوجود اگر کہیں سنسکرت الفاظ کی تعداد زیادہ نظر آئے تو اسے نمونوں کی کمی کے بجائے میری تلاش کی کمی سمجھنا چاہیے کیونکہ میں نے کچھ شعرا کا ذکر اس علم کے باوجود کہ وہ کھڑی بولی کے شاعر تھے محض اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کا کلام میرے سامنے نہیں ہے۔ ان کے علاوہ ابھی ایسے بہت سے شاعروں کے نام بھی رہ گئے ہوں گے جن کی دریافت مزید تحقیق کی محتاج ہے۔ چنانچہ جب تک ان تمام شعرا کا کل کلام سامنے نہ ہو نہ نمونوں کا قرار واقعی انتخاب ہو سکتا ہے نہ اس ادب پر صحیح تنقید ہی ہو سکتی ہے۔

میرامّن نے مقدمہ "باغ و بہار" میں زبانِ اُردو کی ابتدا عہدِ اکبری سے کی ہے لیکن میں اپنی گفتگو کا آغاز حضرت امیر خسرو کے عہد سے ہی کرتا ہوں جن کو ہمارے مورخین اُردو زبان کا پہلا شاعر مانتے ہیں۔ امیر خسرو کے زمانے میں مہاراشٹر دیس کے ایک نامور درویش گیا نیشور نامی گزرے ہیں جو موجودہ پیٹھن (دکن) سے چار کوس پر دریائے گوداوری کے جانب شمال اپنے گاؤں میں سن ۱۲۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے آج کل چار کتابیں ملتی ہیں جن میں بھگوت گیتا کی شرح جو اُنھوں نے گیا نیشوری کے نام سے لکھی تھی بہت مشہور ہوئی۔ ان کے اُردو کلام کا ایک نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سو ہی کپتا کے ہے کپتا دے نہیں گرو کا تپا
دُنیا تج کر کھاک (خاک) لگائی جا کر بیٹھا بن مون
کھیچر مدرا بجراسن میں دھیان دھرت ہے من کون
تیرتھ کرے اور مرکھوئی جوگ جگت میں ساری
دھن کامن اوکھنہ تیاگے جوگ کمایا بھاری
گپت ہوئے کر پرگٹ ہوئے گوکل متھرا کاسی
بندھ ہوئے ہی پیاں جو نکلے ستیہ لوک کے باسی
شاستروں میں تو نہیں رہا کچھ پیاں گاین نا یا
بھید بدھی کا مارگ چلتا تن کا ٹکڑا کا یا
کنڈلنی کو ن کھوب (خوب) اچڑھائے برہم رندھر کو جو دے

چلتا ہے پانی کے اُوپر بوت سو ہی ہووے
حکم قدرتی کا گیانیشور کون تو کون اوپر جب نا
سدگرو کی جان کرپا بھئی تان آپ ہی آپ پچھانا

اس نمونے میں کچھ الفاظ سنسکرت کے ہیں کیونکہ دیوناگری لپی کے اشتراک کے باعث ہندوستانی زبانوں میں سنسکرت کے دخیل ذکا پایا جانا فطری ہے۔ ان کے علاوہ چند الفاظ برج بھاشا کے بھی بیساختگی سے نظم ہو گئے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ برج بھاشا اُردو دونوں زبانوں کے مہاراشٹری گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اس لیے انھیں مکانی اور زمانی قرب ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ دُوسری یہ بھی ہے کہ گیانیشور ایک بھگت تھے اور بھگتوں کا کلام باغ و بہار زبان میں ملتا ہے۔ بہرحال ان تھوڑے سے لفظوں کو چھوڑ کر ری نظم میں اُردو کا ٹھاٹھ قائم ہے بلکہ اس میں کچھ فارسی اور عربی کے لفظ بھی موجود ہیں جو اس ابتدائی زمانے میں ہندوستانی زبانوں مسلمانوں کے اثرات ثابت کر رہے ہیں۔ اس نظم کا شعرائے بیجاپور کے کلام سے موازنہ کر کے دیکھیے جو گیانیشور کے بعد کے زمانے میں گزرے ہیں اور پھر فیصلہ کیجیے کہ ان میں سے کس کی زبان کو اُردو کہا جا سکتا ہے۔

گیانیشور کی ایک بہن کتابائی بھی مرہٹی زبان کی شاعرہ تھیں جو ان سے عمر میں چار سال چھوٹی تھیں۔ ان کے کلام میں بھی اُردو ان کا دخل ملاحظہ فرمائیے۔ نمونہ یہ ہے۔

واہ واہ صاحب جی سدگرو لال گسائیں جی
لال بیچ میں ادو کالا اوٹھ پیٹھ سون کالا
پیت انمنی بھر مرگمپا رس جھوٹے واو
سہسر دل موں الکھلی کھائے آج لون پرانا
جہاں تہاں سادھو دسو آپ ہی آپ ٹھکانا
سدگرو چیلے دونوں برابر ایک ساموں بھائی
ایک سے ایسے درس پانے مہاراج کتا بائی

اب یہاں سے بھگتوں اور سنتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں نام دیو کا نام سب سے پہلے آتا ہے جو گیانیشور کے معاصر اور ذات کے درزی تھے۔ ان کے اُردو کلام ملاحظہ کیجیے:

میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کھندکارا (خداوندگار)
میں گریب میں مسکین تیرا نام ہے ادھارا

آج نامے بیٹھل دیکھا مورکھ کو سمجھاؤں رے
پانڈے تمری گایتری لودھے کا کھیت کھاتی تھی

دونوں میں جو فرق واضح ہیں ایک لپی اور دوسرا ذخیرہ الفاظ۔ ہندی دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے اور جیسے اس میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہو گئی ہے اور اُردو نے ایرانی لپی میں تحریر ہونے کے باعث بے شمار عربی فارسی الفاظ مستعار لیے ہیں لیکن علم زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابلِ التفات نہیں کیونکہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس نقطۂ نظر سے ہندی کا اور اُردو کی تاریخ ایک ہی ہے خاص کر کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اُردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم جزو ہے۔ جیسا ہندی زبان کا اور اس کے قدیم ادب میں سنسکرت یا دوسری معاصر بولیوں کے مستعار الفاظ کی موجودگی کے باوجود اسے اُردو کے قدیم ادب مانے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے سطور ذیل میں اسی کھڑی بولی کے کچھ قدیم نمونے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے ادب کے اجنبی گوشے ہیں اور صرف ایسے ٹکڑے منتخب کیے ہیں جن میں سنسکرت الفاظ کم سے کم اور عربی فارسی الفاظ زیادہ سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کہیں سنسکرت الفاظ کی تعداد زیادہ نظر آئے تو اسے نمونوں کی کمی کے بجائے میری کاوش کی کمی سمجھنا چاہیے کیونکہ میں نے کچھ شعرا کا ذکر اس علم کے باوجود کہ وہ کھڑی بولی کے شاعر تھے محض اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کا کلام میرے سامنے نہیں ہے۔ ان کے علاوہ ابھی ایسے بہت سے شاعروں کے نام بھی رہ گئے ہوں گے جن کی دریافت مزید تحقیق کی محتاج ہے۔ چنانچہ جب تک ان تمام شعرا کا کلام سامنے نہ ہو نہ نمونوں کا قرار واقعی انتخاب ہو سکتا ہے نہ اس ادب پر صحیح تنقید ہی ہو سکتی ہے۔

میر امن نے مقدمہ "باغ و بہار" میں زبانِ اُردو کی ابتدا عہد اکبری سے کی ہے لیکن میں اپنی گفتگو کا آغاز حضرت امیر خسرو کے عہد سے ہی کرتا ہوں جن کو ہمارے مورخین اُردو زبان کا پہلا شاعر مانتے ہیں۔ امیر خسرو کے زمانے میں مہاراشٹر دیس کے ایک نامور درویش گیانیشور نامی گزرے ہیں جو موجودہ پیٹھن (دکن) سے چار کوس پر دریائے گوداوری کے جانب شمال اپنے گاؤں میں سن ۱۲۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے آج کل چار کتابیں ملتی ہیں جن میں بھگوت گیتا کی شرح جو انھوں نے گیانیشوری کے نام سے لکھی تھی بہت مشہور ہوئی۔ ان کے اُردو کلام کا ایک نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سو ہی کپٹا کے بے کپٹا دے نہیں گرو کا بچا
دُنیا تج کر کھاک (خاک) لگائی جا کر بیٹھا بن مرن
کھیچر مدرا بجراسن میں دھیان دھرت ہے من مون
تیرتھ کرے اور کھوئی جوگ جگت میں ساری
دھن کا من او کھنہ تیاگے جوگ کمایا بھاری
گپت ہوئے کر پرگٹ ہوئے گوکل متھرا کاسی
بستہ ہوئے جی پران جو نکلے ستیہ لوک کے باسی
شاستروں میں تو نہیں رہا کچھ پران گا ین مایا
بید بدھی کا مارگ چلتا تن کا ٹکڑا کایا
کنڈلنی کون کھوب (خوب) چڑھاتے برہم رندھر کو جو دے

چلت ہے پانی کے اوپر ہوت سو ہی ہو وے
حکم فورتی کا گیا نیشور کون تو کون اوپر جب نا
سد گرو کی جان کرپا بھئی تان آپ ہی آپ پچھانا

اس نمونے میں کچھ الفاظ سنسکرت کے ہیں کیونکہ دیوناگری لپی کے اشتراک کے باعث ہندوستانی زبانوں میں سنسکرت کے دخیل الفاظ کا پایا جانا فطری ہے۔ ان کے علاوہ چند الفاظ برج بھاشا کے بھی بیانگی سے نظم ہو گئے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ برج بھاشا اور اُردو دونوں زبانوں کے بھار اشتری گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اس لیے انھیں مکانی اور زمانی قرب ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ دُوسری وجہ یہ بھی ہے کہ گیانیشور ایک بھگت تھے اور بھگتوں کا کلام باغ و بہار زبان میں ملتا ہے۔ بہرحال ان تھوڑے سے لفظوں کو چھوڑ کر پوری نظم میں اُردو کا ٹھاٹھ قائم ہے بلکہ اس میں کچھ فارسی اور عربی کے لفظ بھی موجود ہیں جو اس ابتدائی زمانے میں ہندوستانی زبانوں پر مسلمانوں کے اثرات ثابت کر رہے ہیں۔ اس نظم کا شعرائے بیجا پور کے کلام سے موازنہ کر کے دیکھیے جو گیانیشور کے بعد کے زمانے میں گزرے ہیں اور پھر فیصلہ کیجیے کہ ان میں سے کس کی زبان کو اُردو کہا جا سکتا ہے۔

گیانیشور کی ایک بہن کتا بائی بھی مرہٹی زبان کی شاعرہ تھیں جو ان سے عمر میں چار سال چھوٹی تھیں۔ ان کے کلام میں بھی اُردو زبان کا دخل ملاحظہ فرمائیے۔ نمونہ یہ ہے۔

واہ واہ صاحب جی سد گرو لال گسائیں جی

لال بیچ میں اولا کالا اونٹھ پیٹھ سون کالا
پیت امنی بھرمر گمپھا رس چھونے والا
سہسر دل موں الکھل کھائے آج لون پرانا
جاں تہاں سادھو دسوا آپ ہی آپ ٹھکانا
سد گرو چیلے دونوں برابر ایک سامون بھائی
ایک سے نیسے درسن پائے مہاراج کتا بائی

اب یہاں سے بھگتوں اور سنتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں نام دیو کا نام سب سے پہلے آتا ہے جو گیانیشور کے ساتھ اور ذات کے درزی تھے۔ ان کے اُردو کلام ملاحظہ کیجیے:

میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کھندکارا (خداوندگار)
میں گریب میں مسکین تیرا نام ہے ادھارا

آج نامے بیٹھل دیکھا مورکھ کو سمجھاؤں رے
پانڈے تمری گائتری لودے کا کھیت کھاتی تھی

لے کر لیتا گھری تری لاگت وہٹ جاتی تھی
پانڈے ترا مہادیو دھوے بدچڑھا آوت دیکھا تھا
مودی کے گھر کھانا پاکا وا کا لڑکا مارا تھا
پانڈے ترا رام چندر سو بھی آوت دیکھا تھا
راون سیتی سر بر ہوئی گھر کی جوئی گنوائی تھی

نام دیو کے بعد ان سادھوؤں میں کبیر داس کا نام بہت مشہور ہوا۔ یہ قوم کے جولاہے تھے۔ بنارس ان کا مولد اور مگہر (ضلع بستی یو۔ پی) ان کی جائے وفات ہے۔ ان کے عہد کے متعلق محققین میں شدید اختلاف ملتا ہے۔ بہرحال ان کا زمانہ سن ۱۳۹۹ء سے ۱۵۱۸ء تک مانا جا سکتا ہے کیونکہ یہ سکندر لودھی کے معاصر تھے۔ ان کا نمونہ کلام یہ ہے:

برہ کی چوٹ لگی مرے من میں بیدھ گیا تن سارا
اوشدھ مول کچھ نہیں لاگے کیا کرے بید بچارا

ہاڑ جلے جیسے لکڑی کا تودو　　　کیس جلے جیسے گھاس کا پولو

جات نہ پوچھو سادھو کی پوچھ لیجئے گیان　　　مول کرو تروار کا پڑا رہن دو میان

بید کتیب افترا بھائی دل کا فکر نہ جائے　　　ٹک دم کراری جو کرو حاضر حضور خدائے

سب آئے اس ایک میں ڈار پات پھل پھول　　　اب کہو پاچھے کیا رہا گہہ پکڑا جب مول

سم درشٹی ست گرو کیا میٹا بھرم بکار　　　جہاں دیکھوں تہاں ایک ہی صاحب کا دیدار

رام سمر پچھتائے گا من
پاپی جیئڑا لوبھ کرت ہے آج کال اٹھ جائے گا
لالچ لاگے جنم گنوایا مایا بھرم بھلائے گا
دھن جوبن کا گرب نہ کیجے کاگد جیوں گل جائے گا
جو جم آئے کیس گہہ پٹکے تا دن کچھ نہ بس آئے گا

سرن بھن دیا نہیں کینی ترگھر چوٹان کھا سئے گا
دھرم رائے جب لیکھا مانگے کیا مکھ لے کے جائے گا
کہت کبیر سنو رے سنتو سادھو سنگت تر جائے گا

رہنا نہیں دیس برانا ہے

یہ سنسار کاگد کی پڑیا بوند پڑے گل جانا ہے
یہ سنسار کانٹ کی باڑی اُلجھ پلجھ مر جانا ہے
یہ سنسار جھاڑ اور جھانکڑ آگ لگے بر جانا ہے
کہت کبیر سنو بھئی سادھو ست گرو نام ٹھکانا ہے

من پھولا پھولا پھرے جگت میں کیسا ناتا رے
ماتا کہے یہ پتر ہمارا بہن کہے بر میرا
بھائی کہے یہ بھجا ہماری نار کہے نر میرا
پیٹ پکڑ کے ماتا روئے بانہہ پکڑ کے بھائی
لپٹ جھپٹ کے تریا روئے ہنس اکیلا جائی

ہمن ہیں عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا ۔۔۔ رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا
جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے دربدر پھرتے ۔۔۔ ہمارا یار ہے ہم میں ہمن کو انتظاری کیا
خلق سب نام اپنے کو بہت کر سر پٹکتا ہے ۔۔۔ ہمن گرو نام سانچا ہے ہمن دنیا سے یاری کیا
نہ پل بچھڑے پیا ہم سے نہ ہم بچھڑیں پیارے سے ۔۔۔ انھیں سے نیہہ لاگی ہے ہمن کو بے قراری کیا
کبیرا عشق کا ماتا دوئی کو دور کر دل سے ۔۔۔ جو چلنا راہ نازک ہے ہمن سو بوجھ بھاری کیا

کبیر کے گرو بھائی سے داس کاشی کے ایک چمار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ نے ان کے سادھو پن سے تنگ آکر گھر سے نکال دیا تھا اس لیے جوتیاں بنا بنا کر اوقات بسر کرتے تھے۔ کبیر داس کے بعد ان کا اتنا اثر ہوا کہ جودھپور کے راٹھور رتن سنگھ کی اکلوتی بیٹی میرا بائی ان کی چیلی ہو گئی تھیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

نرپت ایک سنگھاسن سویا سپنے بھیا بھکاری ۔۔۔ اچھت راج بچھرت دکھ پایا سو گت بھئی ہماری

جل کی بھیت پون کا تھمبا رکت بند کا گارا   ہاڑ ماس ناڑی کا پنجر پنچھی بسے بچارا

کہانی کیا میرا کیا تیرا   جیسے تروز پنکھ بسیرا

ڈھکیا دردوند در آیا   بہت پیاس جواب نہ پایا

دھرم داس کسوندھن باندھوگڑھ کے بڑے مہاجن تھے۔ ان کے صحیح سن ولادت و وفات کا علم نہیں ہے لیکن کبیر داس کے ہم عصر تھے۔ سن ۱۵۱۸ء میں کبیر کی وفات پر ان کے جانشین ہوئے اور پندرہ بیس سال بعد وفات پائی۔ اُنھوں نے دُور دُور تک یاترا کی تھی۔ متھرا سے واپسی پر ان کی مُلاقات کبیر داس سے ہوئی جنھوں نے اُنھیں بھگتی کی طرف مائل کیا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہم ست نام کے بیپاری
کوئی کوئی لادے کانسا پیتل کوئی کوئی لونگ سپاری
ہم تو لادیو نام دھنی کو پورن کھیپ ہماری
پونجی نہ ٹوٹے نفع چوگنا بنج کیا ہم بھاری
ہاٹ جگاتی روک نہ سکے نربھے گیل ہماری
موتی بوند گھٹ ہی میں اپجے سکرت بھرت کٹھاری
پتّی پدارتھ لاد چلا ہے دھرما داس بیپاری

گرو نانک کا نام سکھ مت کے بانی کی حیثیت سے کافی مشہور ہے۔ یہ ۱۴۶۹ء میں کلیان چند کھتری کے یہاں پیدا ہوئے جو موضع تلونڈی تحصیل شرقپور ضلع لاہور کے صوبہ رائے بلار بھٹیان کے کارکن تھے۔ اُنھوں نے اپنی عمر کے تیتیس سال سیر و سیاحت میں گزارے آخر سولہ سال کرتارپور میں گزار کر تقریباً ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ اگرچہ ان کا بیشتر کلام پنجابی زبان میں تھا لیکن کبھی کبھی اُردو میں بھی طبع آزمائی کر لیتے تھے۔ نمونہ یہ ہے:

ٹھاکر کا سیوک آگیا کاری   ٹھاکر کا سیوک سدا پجاری

در گر مکاں بستی گھوڑے چھوڑ ولایت دیس گئے   پیر پیکامبر سالک صادق چھوڑی دُنیا تھائیں پئے

کوجا بانگ نواج مستی نیل روپ بنواری   گھر گھر میاں سبھناں جیاں بولی اور تمہاری
بے تو میر مہی پت صاحب قدرت کون ہماری   چارے کونٹ سلام کریگے گھر گھر صفت تمہاری

گھولی گیرو رنگ چڑھایا دستر بھیس بھیکاری　　کاپڑ پھاڑ بنائی کنتھا جھولی ماپا دھاری

گھر گھر مانگے جگ پربودھے من اندھے پتیاری　　بھرم بھلانا سبد نہ چینے جوئے بازی ہاری

انھیں بھگتوں میں پندرھویں صدی عیسوی کے کرشن منی کا بھی نام آتا ہے جو سارنگ گڑھ (پنجاب) کے باشندے تھے اور تجارت کی غرض سے جو مہاراشٹر پہنچے تو وہیں کے ہو رہے۔ یہ مہان بھاونتھ کے مبلغ تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

جڑ مول بن دیکھا ایک درخت گولر کا

اس کو اننت اپار گولر لاگے شمار نہیں پھولوں کا

زمیں آسماں برابر دیکھے ددو چندا سورج دیکھے نولاکھ تارے۔

چودھا بھون ساتوں دریا میر و پربت ندی نالے کئی ھزار

بھگتوں کے کلام کے مندرجہ بالا نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانے بھی ہماری زبان کا روپ وہی تھا جو ہم آج دیکھ رہے ہیں چنانچہ لوگوں نے جو ایک طلسم باندھا ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں سے صرف اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو اپنے روپ فلمی تصویروں کی طرح جلد جلد بدلتی رہی ہے وہ ان تحریروں کے پیش نظر یک لخت ٹوٹ جاتا ہے۔ بہرحال سولھویں صدی کے نصف اوّل تک اُردو زبان کے نمونے ہمیں بھگتوں کے یہاں ملتے ہیں۔ اس کے بعد تاریخ ہندوستان میں ایک نیا موڑ آتا ہے اور آگرہ سکندر لودھی کے بعد ایک بار پھر عہد اکبری میں راجدھانی قرار پاتا ہے تو مغل کلچر کے دور کی تمام رعنائیاں ادب و فن کی صورت میں ایک مقام پر جمع ہو جاتی ہیں۔ غالباً آگرے کی اسی چہل پہل کو دیکھ کر میر امن نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اُردو زبان کا آغاز اکبر بادشاہ کے زمانے سے ہوا ہے چنانچہ وہ باغ و بہار کے مقدمے میں کہتے ہیں۔

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔"

حقیقت صرف اتنی ہے کہ عہد اکبری میں اطراف ملک کے اہل کمال آگرے میں سمٹ آئے تھے چنانچہ اس زمانے میں جہاں ادبیات فارسی کو ابوالفضل، فیضی، عرفی وغیرہ سے اور اودھی زبان کو تلسی داس اور ملک محمد جائسی سے اور برج بھاشا کو سور داس جیسے عظیم شاعروں اور انشا پردازوں سے فروغ ہوا وہاں اُردو زبان کے پودے کو بھی اس وقت کی آب و ہوا راس آئی اور اس کے بھی کچھ سرپرست پیدا ہو گئے چنانچہ برج بھاشا میں شعر کہنے والے کبھی کبھی کھڑی بولی یعنی اُردو میں بھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔ یہی حال نثر میں بھی ہے کہ ایک ہی کتاب یا عبارت میں اُردو اور برج بھاشا دونوں شیر و شکر نظر آتی ہیں۔ چونکہ برج بھاشا بعض فرقہ والوں کی مذہبی زبان بن گئی تھی۔ اس لیے ان کی مذہبی کتابوں میں ایسے نمونے ملتے ہیں جن میں برج بھاشا کے ساتھ ساتھ اُردو بھی استعمال کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس دور میں جن شاعروں اور نثر نگاروں کی تخلیقات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان کو مذہب کے علاوہ دوسرے موضوعات پر اظہار خیال کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے لیکن دیوناگری لپی کے باعث بعض نظموں میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہے۔

یہاں میں اس عہد کے جن شعرا کا اُردو کلام پیش کرنا چاہتا ہوں ان میں عبدالرحیم خان خاناں کا نام سرفہرست آتا ہے جو عہد اکبری

کے ایک بہت بڑے امیر گزرے ہیں۔ ان کے نام پر آگرے کا ایک محلہ "کٹرہ خانخاناں" آج تک چلا آرہا ہے۔ ان کا سنِ ولادت ۱۵۵۳ء اور سنِ وفات ۱۶۲۵ء ہے۔ یہ بیرم خان کے بیٹے اور اکبری دربار کے نورتنوں میں سے ہیں۔ اکبر ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ عربی، فارسی، سنسکرت، برج بھاشا اور اردو کے اچھے عالم تھے۔ ان کی محفل میں علما کا ہجوم رہتا تھا۔ بڑے فقیر، شریف النفس اور کرشن جی کے معتقد تھے جو ان کی شاعری کا اصلی موضوع ہیں۔ برج بھاشا کے بہت اچھے شاعر ہونے کے باوجود اردو میں بھی انھوں نے کچھ چھند کہے ہیں جو ان کی کتاب "مدناشٹک" میں پائے جاتے ہیں۔ ایک چھند پیش کیا جاتا ہے۔

کلت للت مالا وا جواہر جڑا تھا — چپل چکھن والا چاندنی میں کھڑا تھا
کٹ تٹ بیچ میلا پیت سیلا دُیلا — البن البیلا یار میرا اکیلا

پرمانند داس کانیہ کبج برہمن اور قنوج کے باشندے تھے اور ولبھ آچاریہ کے شاگرد تھے۔ ان کا ذکر "چوراسی ویشنووں کی وارتا" میں ملتا ہے۔ ان کی کھڑی بولی کا چھند ملاحظہ کیجیے۔ کرشن جی کی تعریف میں کہتے ہیں۔

دیکھو ری یہ کیسا بالک رانی جسمت جایا ہے — سُندر بدن کمل دل لوچن دیکھت چند لجایا ہے
پورن برہم الکھ ابناسی پرگٹ نند گھر آیا ہے — پرمانند کرشن من موہن چرن کمل چت لایا ہے

عالم دربار اکبری کے ایک مسلمان شاعر تھے جنھوں نے ۹۹۱ھ میں "مادھونل کام کندلا" نامی قصہ کو برج بھاشا میں نظم کیا تھا۔ ان کے کلام اردو کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

غم کے نصیب سے غنی ہے جیسے راج پائے — عاشق غریب کو گمان منی لال کیا
ناز تے نواز کے بھیک ہی نہال کیا — جیونے کی جوک میں جدائی کا زوال کیا
وہ اس روز سے غریب ہوا خاک ہی میں — خیمہ نہیں خوفی بیچ تیرا خیال کیا
دل لے جو آئے سو دلا سا بھی پاوے وا تو — یار دلدار ایسے بیدل کا حال کیا

اسی زمانے میں سوامی نپٹ نرنجن نامی ایک اور شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام اردو میں برج بھاشا کا پٹ بھی ملا ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

چھن میں چھپا جا کے چھپے تے اچک جات — اچک چھپا ہے گھوم گھومت حنساری کا
نس دن نس دن جب سدھ آوت ہے — تب لجاوے سدھ صاحب ستاری کا
نپٹ نرنجن امر مرنے کا نہیں — ایک بار ارو نام آوے نا دوباری کا
بیٹوں تو متوالا اوچھے مد کا نہ لیں والا — پور کر پیالا گھر رہے نا خماری کا

ایک اور سوامی چیتو (مہاراشٹر) کے ایک سنت اور جناردھن سوامی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے شمالی ہندوستان کا بھی دورہ کیا تھا چنانچہ یہ کچھ دن کاشی میں بھی رہے اور وہیں انھوں نے اپنی کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کا عہد ۱۶۰۰ء بتایا جاتا ہے۔ ان کی اردو شاعری کا نمونہ یہ ہے:

اللہ رکھے گا ویسا رہنا — مولا رکھے گا ویسا رہنا
کوئی دن سر پر چھپتر اُڑاوے — کوئی دن سر پر گھٹڑا چڑھاوے
کوئی دن ترگٹ اُوپر چڑھاوے — السں کھالس چپڑھاوے
کوئی دن شکر دُودھ ملیدا — کوئی دن اللہ مانگت جبدا
کوئی دن سیوک ہاتھ جوڑ کھڑے — کوئی دن نجیک نہ آوت ٹھڑے
کوئی دن راجا بڑا ادھکاری — ایک دن ہوئے کنگال بھکاری
ایکا جنار دن کرت کرتاری — غافل کیوں کرتا مغروری

دیو چھنال کا چھنال کا — کھیل کھلاڑی بانیا
چھند بڑا سکھر کو بانا — جاکر جھروکے ہیں جیٹا
بڑا دُھوم کا داتا — نہیں جات پات کچھ ناتا
ایک ناتھ کا والی — یا سے کون دیوے گالی

دل کی گانٹھ کھولو — یارو رام نام بولو
کوئی نہیں آوے ساتھ — بھنڈے کاہے کون کہے بات
جورو لڑکے ماں باپ — سب پسارے ہاتھ
ہتی گھوڑے پالکی پینا — نہیں آوے ساتھ
دو دن کا بزار یارو — کاہے کون کرتا بات
جھوٹی مایا جھوٹی کایا — جھوٹا سب دن رات
ایکا جناردن بولے بھائی — کوئی نہیں آئے ساتھ

حضرت بھولا مولا — سب دُنیا پالن والا
سب گھر موں سائیں براجے — کرست ہے بول بالا
غریب نواز ہیں غریب تیرا — تیرے چرنن کون رت والا
اپنا سائیں سمجھ کے لینا — سلیل وہی اللہ
جو رُوپ سے ہے جگت پیدا — وہی ستول اللہ

جنی جناردن ایک ناتھ سوامی کے گرو بھائی۔ جناردن سوامی کے چیلے اور مہاراشٹر کے رہنے والے تھے اور بیجاپور

میں تیمار تھے۔ اُن کی تاریخ وفات سن ۱۶۰۱ء ہے۔ ان کا بھی کچھ کلام اُردو زبان میں ملتا ہے مثلاً

جب تو آیا تب کیا لایا کیا لے جائے گا

کس نے بویا جو نشا دھندا چڑیا پھندا دیکھت کیا ہو اندھا

کہت جنار دن سُن ارے من نہ چھوڑ اس سائیں کے چرن

اس عہد کے سنتوں میں دادو دیال کا نام سب سے نمایاں ہے۔ یہ ۱۵۴۴ء میں احمد آباد (بھارت) کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۱۶۰۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ہندوستان کا دادو پنتھ انہیں سے چلا ہے۔ جے پوری فوج کے ناگا انہیں کے پنتھ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اُردو، برج بھاشا، فارسی، گجراتی، مارواڑی اور مرہٹی کے عالم تھے۔ ان کی زندگی بیشتر راجپوتانے میں گزری ہے اس لیے ان کی زبان پر برج بھاشا اور راجستانی کا زیادہ اثر ہے لیکن کچھ کلام پنجابی اور ریختہ میں بھی موجود ہے۔ ریختے کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

عشق اللہ کی ذات ہے عشق اللہ کا رنگ — عشق اللہ اوجود ہے عشق اللہ کا رنگ

عاشق معشوق ہو گیا عشق کہاوے سوئے — دادو اس معشوق کا اللہ ہی عاشق ہوئے

سب آیا اس ایک میں ڈال پات پھل پھول — دادو پیچھے کیا رہا جب نج پکڑا مول

کالا منہ سنسار کا نیلے کیے پاؤ — دادو تین طلاق دے بھادیں تیہ سر جاؤ

جب سائیں کو سجدہ کیا تب سر دھرا اُتار — یوں دادو جیوت مرے حرص و ہوا کو مار

عہد اکبری کے ایک مشہور شاعر و مصنف گنگ برہم بھٹ نے اُردو نثر میں بھی ایک کتاب "چند چھند ورنن کی مہما" نامی لکھی تھی۔ اس کا نمونہ یہ ہے:

"ستدھ شری شری ۱۰۸ شری شری پات ساہ جی شری دل پت جی اکبر ساہ جی آم کاش (عام خاص) میں تکت (تخت) اُوپر براجمان ہو رہے اور آم کاش بھرنے لگا ہے جس میں تمام امراؤ آئے آئے کرنش (کورنش) بجا بجا [illegible] اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں اپنی اپنی مسل سے۔ جن کی بیٹھک نہیں سو ریشم کے رسے میں ریسم (ریشم) [illegible] پکڑ کے کھڑے تاجیم (تعظیم) میں رہیں۔"

"اتنا سُن کے پات ساہ جی شری اکبر ساہ جی آد (آدھ) سیر سونا نرہر داس چارن کو دیا۔ ان کے ڈیڑھ سیر سونا ہو گیا۔ راس ونچنا پورن بھیا۔ آم کاش (عام خاص) برکاس (برخاست) ہوا جس کا سمبت ۱۶۲۷ کاتی کھ ماس سدی ۱۳ گُرو وار کے دن پورن بھئے۔"

اکبر کے انتقال پر یہ سولہویں صدی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ۱۶۰۵ء میں سلطنت جہانگیر کو منتقل ہوتی ہے اور پھر ۱۶۲۷ء میں شاہجہاں بادشاہ بن جاتا ہے لیکن آگرہ بدستور پایۂ تخت رہتا ہے یہاں تک کہ ۱۶۴۸ء میں شاہجہاں آگرے سے اُٹھ کر دلی جاتا ہے۔ اس زمانے کی اُردو کا کچھ حال تذکروں اور تاریخوں سے بھی معلوم ہونے لگتا ہے اور پایۂ تخت سے منسلک سمجھنے والوں کے علاوہ اطرافِ ملک کے جگتوں کے یہاں سے بھی اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نورجہاں سے بھی مندرجہ ذیل اشعار منسوب کیے جاتے ہیں:

دیں مجھ زخم جفا کو دل صد چاک میں ہم   دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بُت بے باک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحت جان عاشق   تیرے قدموں سے جُدا ہو کے ملے خاک میں ہم

جہانگیر کے بیٹے شہریار کے اردو کلام کا بھی نمونہ دیکھیے۔

چاند سے چکور ٹلے میگھ سے بھی مور ٹلے   چوری سے چور ٹلے دل سے دلدار جو
روگیوں سے روگ ٹلے بھوگیوں سے بھوگ ٹلے   جوگیوں سے جوگ ٹلے کامیوں سے نار جو
پربت سے سیر ٹلے دھن سے کبیر ٹلے   دن کا بھی پھیر ٹلے ہو بڑا ہزار جو
لیکن (اے) شہریار مانو یہ اعتبار   ٹلے نہیں ہونہار ہووے ہونہار جو

سُندر داس ایک ڈھوسر بنیے پرمانند نامی کے گھر ۱۵۹۶ء میں بمقام دوسہ ریاست جے پور پیدا ہوئے۔ جس وقت دادو دیال دوسہ آئے ہیں اُن کی عمر چھ سال کی تھی۔ یہ اسی وقت سے ان کے چیلے ہو کر ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ کاشی میں تیس سال کی عمر تک (۱۹ برس) سنسکرت، ویدانت اور پُران پڑھتے رہے۔ سنسکرت کے علاوہ ہندی، فارسی، گُجراتی، اور واڑی وغیرہ زبانیں بھی خوب جانتے تھے۔ ۱۶۲۳ء میں ایک اور سادھو کے ساتھ فتح پور (شیخاواٹی) چلے گئے اور وہیں رہ پڑے۔ فتح پور کے نواب الف خان، دولت خان اور طاہر خان سے ان کی اچھی رسم و راہ تھی۔ الف خان بھی بھاشا کے شاعر تھے۔ سندر داس فنِ شاعری کے ماہر تھے۔ انھوں نے ویدانت پر اچھے شعر کہے ہیں۔ ان کی مختصر تصنیفات کی تعداد ۴۰ سے اوپر ہے۔ ۱۶۸۹ء میں بمقام سانگانیر (جے پور) انتقال کیا۔ ان کے کلام ریختہ کا نمونہ یہ ہے:

سُندر جو غافل ہوا تو وہ سائیں دُور   جو بندہ حاضر ہُوا تو حاضر آن حضور

سُندر اندر پیس کر دل میں غوطہ مار   تو دل ہی میں پائیے سائیں سرجن ہار
شخص ہمارا اینہے مت کھو جے کوں اور   سائیں سینے بیچ ہے سندر سدا حضور
سُندر دل کی بیچ پر صورت ہے اردواح   اس کو جا گیا چاہیے صاحب بے پرواہ

ملوک داس کڑا ضلع الہ آباد کے رہنے والے ۱۵۷۴ء میں سُندر داس کے یہاں پیدا ہوئے جو ذات کے ککڑ کھتری تھے۔ لڑکپن میں کمبل بیچتے گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد بھگوت گیتا کا ورد شروع کیا۔ دُور دُور تک شہرت پھیلی اور لوگ زیارت کو آنے لگے۔ یہ وِٹھل داس کے چیلے تھے۔ انھوں نے ۱۶۸۲ء میں ۱۰۸ سال کی عمر پا کر انتقال کیا ہے۔ کڑا (الہ آباد) جے پور، گجرات، پٹنہ، کابل، نیپال، کابل، مُلتان اور جگناتھ پوری میں ان کے پنتھ کی خاص گدیاں رہی ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام   داس ملوکا کہہ گئے سب کے داتا رام

تیرا میں دیدار دوانا
گھڑی گھڑی تجھے دیکھا چاہوں سُن صاحب رحمانا

ہوا الست خبر نہیں تو کی پیپا پہ پیہ پیا
شاہا ہو وں تو گر گر پڑتا تیرے رنگ متوالا
کہیں طرک اب قضا کر بہوں ول بچ سوں دل لایا
سچے تج جتے میں دیکھیا نہ رہبر مرشد پایا
جہاں جہاں تجا پھرے تہاں تہاں پھیرے گئے
کہیں طرک جہاں ست بن ہتاں دیپ باجے

شواجی کے معاصر تکارام کے ابھنگ بھی اُردو زبان کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے ابھنگوں کی تعداد پانچ چھ ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ یہ مہاراشٹر کے باشندے اور ذات کے شودر تھے۔ سن ۱۶۰۸ء میں پونہ کے قریب ایک گاؤں دیہو نامی میں اُن کی پیدائش ہوئی۔ تجارت ان کا ذریعۂ معاش تھی۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ملک میں قحط پڑ گیا اور ساتھ ساتھ ان کے کاروبار میں بھی خسارہ آیا۔ اسی عالم مفلسی و بے کسی میں ان کی بیوی نے فاقوں سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی تو تکارام کا دل دُنیا سے اُچاٹ ہو گیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھگت بن گئے۔ شواجی ان پر بڑا مہربان تھا۔ اس نے ایک بار انہیں برہمنوں کے مظالم سے بچایا تھا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

کیا گاؤں کوئی سُننے والا	دیکھیں تو سب جگ ہے بہرا
کیسوا اپنے رام ہی ساتھ	جیسی دیسی کر رہیں بات
کہاں سے لاؤں مدھری بانی	ریجھے ایسے لوک پرانی
گردھر لال بجاؤ کا بھوکا	راگ کلا نہیں جانت تو کا

سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں تاج نامی کوئی مسلمان خاتون بھی گزری ہیں جو کرشن جی کی عقیدت مند تھیں۔ ان کے خاندان اور وطن کے متعلق علم نہیں ہو سکا ہے۔ ان کا کلام رنگیلا اور رسیلا ہے جس میں اُردو کے ساتھ ساتھ پنجابی کے بھی کچھ الفاظ ملتے ہیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ ان کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہوگا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

سنو سنو جانی پیکر دل کی کہانی	تم دست ہی بکانی بدنامی بھی سہوں گی میں
دیو پوجا ٹھانی میں نماز ہو بھلانی	تجے کلمہ قراں سارے گنن گہوں گی میں
سیاہ سلونا سرتاج سر کلے دیے	تیرے نیہ داگ میں نداگ ہو دہوں گی میں
نند کے کمار قربان تانڈی صورت پہ	تانڈ نال پیارے ہندوانی ہو رہوں گی میں

چھیل جو چھبیلا سب رنگ میں رنگیلا بڑا	چت کا اڑیا کہوں دیوتوں سے نیارا ہے
مال گلے سوہے ناک موتی سیت سوہے	کان کنڈل ہے موکٹ کنڈل سیس دھارا ہے
دشٹ جن مارے سنت جن رکھوالے تاج	چت ہت دارے پریم پریت کروارا ہے

نسعد جو کا پیارا جن کنس کو پچھاڑا　　وہ بندرابن وارا کرشن صاحب ہمارا ہے

اسی زمانے میں آگرے کے پنڈت چندر بھان برہمن کا نام بھی سامنے آتا ہے جو دارا شکوہ کے منشی تھے۔ پنڈت برج موہن دتاترَیہ کیفی کی تلاش کے مطابق برہمن کی یہ غزل "خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے" اُردو کی پہلی غزل شمار کی جاتی ہے۔

۱۶۴۳ء کے آس پاس ایک اور شاعر دنے ودے نامی بھی گزرے ہیں جو سنسکرت کے بہت اچھے عالم تھے۔ ان سے ایک کتاب "دنے ولاس" یادگار ہے۔ ان کا اُردو کلام ملاحظہ کیجیے :

گھوڑا جو ملے رے تو مت بھولے اسوارا
توئے دایہ لاگت پیارا انت ہوئیگا نیارا
چرے چیز اور ڈرے قید سوں لبٹ چلے اُتارا
زین کسے تب سویا چاہے کھانے کو ہشیارا
خوب خزانہ خرچ کھلاو دیو سب نعمت چارا
اسواری کا اوسر آوے کلیا ہوئے گنوارا
چھن تاتا چھن پیاسا ہوئے خدمت کراون ہارا
دوڑ دُور جنگل میں ڈارے جھوٹے دمنی بچارا
کرو چوکڑا چاتر چوکس دیو چابک دو چارا
اس گھوڑے کو دنے سکھاؤ جیون پاؤ بھوپارا

کل پتی مسر آگرے کے رہنے والے اور ذات کے برہمن تھے۔ ان کے والد کا نام پرشن رام مسر تھا۔ ان کا سال ولادت ۱۶۲۰ء اور عہد تصنیف ۱۶۷۰ء بتایا جاتا ہے۔ ریاست جے پور کے راجا رام سنگھ کے یہاں رہتے تھے۔ سنسکرت کے اچھے عالم تھے اور فن شعر گوئی میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ ان کی کھڑی بولی کا چھند ملاحظہ کیجیے :

ہُوں میں مُشتاق تیری صورت کا نُور دیکھ دل بھرپور ہے کہنے جواب سے
مہر کا طالب فقیر ہے مہربان چاتک جیون جیتا ہے سوات والے آب سے
تُو تو ہے دانی یہ خوبی کا خزانہ تسے کھول کیوں نہ دیجے سیر کیجے ثواب سے
دیر کی نہ تاب جان ہوتی ہے کباب 'بول حیاتی کا آب' بولو مکھ مہتاب سے

مہاتما ناگری داس ریاست کشن گڑھ (راجپوتانہ) کے راجا، ببھی فرقے کے گوسوامی رنچھور داس جی کے چیلے اور کرشن جی کے بھگت تھے۔ انھوں نے ۱۷۶۵ء میں برج میں انتقال کیا ہے۔ یہ سنسکرت، فارسی، کھڑی بولی اور ڈنگل کے طالب علم تھے اور گجراتی، پنجابی اور گڑھوالی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے جیسا کہ ان کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی کھڑی بولی کا نمونہ یہ ہے :

میں تجھ سے مقابل کرنا بیان کیا ہے   پر چشم کو کامنی شاعر دیان کیا ہے

عشق اس کی جھلک ہے جیوں سورج کی دھوپ   جہاں عشق تہاں آپ ہے کادر نادر روپ

آیا عشق لپیٹ میں لائی چشم چپیٹ   سو بکا آیا خلق میں اور بھریا سب پیٹ

[illegible] کے آس پاس مجالسی (یو پی) میں ایک مسلمان شاعر رس رنگ ہو گزرے ہیں۔ یہ بزرگ برج بھاشا اور کھڑی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی کھڑی بولی کا نمونہ یہ ہے:

تیرے محبوب بانکے نے چشم کی چوٹ ماری ہے   کھڑا ہے سامنے پی میں ذرا نہیں پلک ماری ہے
جلایا انھیں نے مجھ کو جنھوں یہ گانس ماری ہے   تڑپتا کدہی نہ جیتا بچھوڑا درد بھاری ہے

بھردو داس آگرے کے باسی اور وفات کے جینی ایک شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے سنہ ۱۶۲۳ء میں جین شتک نامی ایک کتاب[3] بھی تصنیف کی تھی۔ یہ برج بھاشا کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

جوگی تو جب تک سے ترا وہ لال کپڑے پہرتا   اس رنگ سے محرم نہیں کپڑے رنگے سے کیا ہوا
پرتھمے ترا بانچا گھر گھر کتھا کہتا پھرے   نج برہم کو چینا نہیں برہمن ہوا تو کیا ہوا

سیتل ایک مشہور مہنت تھے جو ہردوئی شاہ آباد کے قریب کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کا عہد سنہ ۱۷۲۳ء کے لگ بھگ کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے ایک پوری کتاب کھڑی بولی میں لکھی ہے جس کے تین حصے ہیں۔ گلزار چمن، آنند چمن اور بہار چمن۔ اس کتاب میں مختلف موضوعات پر ۱۰۵ چھند ہیں۔ سیتل بھاشا، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ جوتش کے بھی ماہر تھے۔ ان کا کلام جوشیلا اور تشبیہات و استعارات سے مرصع ہے۔ اُنھوں نے بڑے بڑے قافیے باندھے ہیں اور ندرتِ مضامین کے ساتھ ساتھ تخیل کی بلند پروازی بھی دکھائی ہے۔ ان کے کلام سے تین چھند نیچے درج کیے جاتے ہیں:

گو سرد چند پر ٹھیر گیا جب ذرے بوند پسینے کا
یا کندن کمل کی اوپر جھلکا بست رکت بینے کا
دیکھے سے ہوش کہاں رہوے جو چور رہا کل سینے کا
یا لعل بدخشاں پر کھینچا چوکا الماس نگینے کا

ہم غضب طرح سے جان گئے جیسا آنند کا کند کیا
سب رُوپ سیل کی تیج پُنج تیرے ہی تن میں بند کیا
تجھ حسن پر بھا کی باقی ہے پھر بد صفے یہ فرفند کیا
چیک دل سوں جو بی نرگس چامی کر چلا چند کیا

چندن کی چوکی چار پڑی سوتا تھا سب گن جٹا ہوا
چوکے کی چمک ادھر ہنس نقاب واژم پھٹا ہوا
ایسے میں گرمن سے سیتل اک خیال ٹرا اٹھا پڑا ہوا
ہنس نے نجھ نجھ تے ادنی انگ اچھلے نٹ کا بٹا ہوا

اب ہم قدمائے دہلی کے دور میں داخل ہو چکے ہیں اس لیے مزید نمونے پیش کرنے کی حاجت نہیں ہے بلکہ اُردو زبان کے قدیم ادب پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس کی چند خصوصیات کو واضح کر دینا ضروری ہے۔

(۱) یہ تمام سرمایہ دیوناگری لپی میں لکھا ہوا ملتا ہے جس کے گنجلک حصے مزید تحقیق و تلاش سے صاف ہو سکتے ہیں اور غلطیاں بھی تقابل اور موازنے سے دُور کی جا سکتی ہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ اس طرح ہمیں مندرجہ بالا نمونوں سے بھی بہتر نمونے مل جائیں گے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ تلاش و جستجو سے ایرانی لپی کے بھی کچھ نمونے دستیاب ہو جائیں لیکن ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہوگی۔

(۲) یہ سرمایہ بیشتر منظومات پر مشتمل ہے جس میں دیسی یعنی پنگل کے عروض سے کام لیا گیا ہے اور اقسام نظم کے نام بھی دیسی ہیں مثلاً دوہا، سوَیا، چوپئی، چھپئی وغیرہ۔ البتہ کہیں کہیں بعض شعرا نے ایرانی اوزان بھی استعمال کیے ہیں جو یقیناً ایرانی ادب کے بڑھتے ہوئے اثرات کا ثبوت دے رہے ہیں۔

(۳) چونکہ شعرائے مذکورہ بالا میں زیادہ تعداد بھگتوں اور سنتوں کی ہے اس لیے نمونوں کا بیشتر حصہ بھی درویشانہ اور صوفیانہ خیالات سے مملو ہے جس میں طبقاتی امتیاز، رسم پرستی اور نمائشی زہد و اتقا سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے اور دُنیا کی بے ثباتی کے پیش نظر عمل صالح، مساوات اور انسان دوستی کی تعلیم دی گئی ہے لیکن عام شعرا کے یہاں دُوسرے موضوعات بھی ملتے ہیں جہاں عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے بلکہ کرشن بھگتی کے پردے میں تو شعرا نے حسن و عشق کی مجلہ واردات کی ترجمانی کی ہیں اور ہجر و وصل، سراپا نگاری، معاملہ بندی، درد و غم وغیرہ کے تمام مرقعے کھینچ دیے ہیں۔ تحقیق سے ایسے نمونوں میں بھی کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۴) بھگتوں کی زبان سدھکڑی ہے جس میں ہندوستان کی مختلف بولیوں کے تانے بانے گتھے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ

[illegible] بھگتی تحریک کے علمبرداروں نے جو مختلف علاقوں سے اٹھے اور جنہوں نے اپنے اپنے عقائد و نظریات کے پرچار کے لیے جگہ جگہ کی یاترائیں کیں اور ہر زبان کی بولیوں کے الفاظ اپنی تبلیغی نظموں میں اس لیے شامل کیے کہ ان کا پیغام عوام کی سمجھ میں آ جائے لیکن عام شعرا کے یہاں برج بھاشا کا اثر زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ دیوناگری لپی میں لکھی جانے والی دوسری زبانوں کی طرح اس ادب میں بھی سنسکرت کے کافی الفاظ ملتے ہیں جس کا سبب مذہبی وابستگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ البتہ عربی، فارسی الفاظ جو اس کے بعض حصوں میں کم اور بعض شعرا کے یہاں زیادہ نظر آتے ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسلمانوں کی زبانوں کا اثر یہاں کے عوام پر ابتدا ہی سے پڑ چلا تھا جو بڑھتے بڑھتے ادیبوں اور انشا پردازوں تک جا پہنچا۔

(۵) زبان کی بحث ہمیں ریختے تک لے جاتی ہے۔ "ریختہ" کے لغوی معنی گری پڑی پریشان چیز کے ہیں۔ فن تعمیر کی اصطلاح میں ریختہ پلاسٹر کو کہتے ہیں جو پسے ہوئے کنکر اور چونے کے ملانے سے تیار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی اور ایرانی سُروں کو ملا کر جو موسیقی تیار ہوتی ہے اسے بھی ریختہ کہتے ہیں۔ ادب میں ریختہ کا لفظ نظم کے لیے استعمال ہوا ہے جس کی مختلف قسمیں میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ مختلف ادوار کے ریختے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ صرف مسلمانوں کی شاعری ہی سے مخصوص نہ تھا بلکہ ریختے تو بہت سے ہندوؤں کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ میں نے کبیر داس، رے داس، دادو دیال، غریب داس وغیرہ کے ریختوں کے مخطوطے دیکھے ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ریختے کی تعریف میں لپی یا اوزان کی کوئی پابندی نہیں ہے کیونکہ ریختے دیوناگری لپی میں بھی لکھے گئے ہیں اور پنگل کی بحروں میں بھی۔ البتہ ریختہ دوسری عام نظموں سے صرف زبان کے معاملے میں مختلف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ریختہ اس نظم یا شعر کو کہتے ہیں جس کی زبان اُردو (کھڑی بولی) ہو اور اس میں عربی فارسی کے کچھ الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہوں۔ اب اگر اس ادبی یا لسانی اصطلاح کو فن تعمیر اور فن موسیقی کی اصطلاح سے ملا کر دیکھا جائے تو لفظ ریختہ کے معنی مرکب یا آمیزے کے نکلتے ہیں جس کا فارسی معنی گری پڑی پریشان چیز سے کوئی تعلق نہیں اور اس لیے لفظ ریختہ کو ان معنوں میں خالص دیسی لفظ "ریکھتا" کی تفریس سمجھنا چاہیے۔

اُردو زبان کے مندرجہ بالا نمونوں سے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ اُردو کا جو قدیم ادب ہماری تاریخوں میں ملتا ہے اس سے پہلے کا ادب دستیاب ہو سکتا ہے اور ہماری زبان اور ہمارے ادب کی تاریخ میں جو تین سو سال کا خلا ہے اسے بھاکھا یا پُرانی زبان کے ادب سے پُر کرنے کے بجائے خود اُردو زبان کے ادب ہی سے پُر کیا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں محنت، تن دہی اور جانفشانی درکار ہے کیونکہ یہ سرمایہ مخطوطات اور مطبوعات کی صورت میں جا بجا بکھرا پڑا ہے لیکن اسے یکجا کرنا دلدادگانِ ادب کا اہم فریضہ بھی ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

اس مضمون کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ ہندی ساہتیہ کا ویوچناتمک اتہاس مرتبہ سوریہ کانت۔

۲۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ۔ رام چندر شکل
۳۔ مشر بندھو ونود حصّہ اوّل مرتبہ مشر بندھو
۴۔ ہندی کے مسلمان کوی۔ گنگا پرشاد سنگھ
۵۔ سنت ساہتیہ ۔ بھونیشور ناتھ مسر
۶۔ اشٹ چھاپ ۔ دھیریندر ورما
۷۔ دادو دیال کی بانی مرتبہ پنڈت شری دھر شولال جی
۸۔ مہاتما کبیر۔ ہری فراس دویدی۔
۹۔ گرو گرنتھ صاحب ۔ (گورمکھی)
۱۰۔ تذکرہ جلوۂ خضر حصّہ اوّل۔ صفیر بلگرامی ۔

مشترک الفاظ

رشید حسن خاں

اردو میں "مشترک الفاظ" خاصی تعداد میں ہیں۔ مشترک الفاظ سے وہ لفظ مراد ہیں، جن کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف کئی طرح کا ہے: کچھ لفظ، دلی لکھنؤ کے دبستانی اختلاف کے تحت آتے ہیں، کہ دلی والے مذکر استعمال کرتے ہیں اور لکھنؤ والے مونث، یا اس کے برعکس۔ کچھ لفظوں کی صورت یہ ہے کہ ایک ہی دبستان کے کچھ لوگ مذکر کہتے ہیں، کچھ لوگ مونث۔ یہ بھی ہے کہ ایک ہی استاد نے ایک لفظ کو کبھی مذکر نظم کیا، کبھی مونث۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک لفظ ایک زمانے میں مذکر تھا، بالاتفاق؛ رفتہ رفتہ اس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا، اور اب وہ بالعموم مونث بولا جاتا ہے۔ لیکن لغات میں یا دوسری متعلقہ کتابوں میں یہ تفصیل موجود نہیں۔

ہمارے یہاں ایک بڑی کمی یہ بھی ہے کہ مختلف لغات میں مختلف قول ملتے ہیں۔ یہ اختلافات کبھی تو اپنے مکتبۂ خیال کی طرف داری کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور کبھی عدم تحقیق کا۔ معائب شعر کے قاعدوں اور تلفظ کے مسائل میں بھی سب سے بڑی دقت یہی ہے کہ عموماً لغات میں نقل قول پر بھروسا کیا گیا ہے۔ بہت سے الفاظ ایسے ملیں گے جن کی تذکیر و تانیث کا تعین شرح میں نہیں ہو سکا۔ استعمال میں دونوں طرح آتے رہے کچھ دنوں کے بعد کسی نے ایک صورت کو قبول کر لیا؛ کسی نے دوسری صورت کو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کتاب میں ایک قول کو ترجیح دی گئی، کسی میں دوسرے قول کو جگہ دی گئی۔ مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے اس طرف نہایت خوبی کے ساتھ اشارہ کیا ہے:

> "جنس یا تانیث و تذکیر کا اختلاف ہر دور میں رہا ہے۔ اور یہ اختلاف مکان اور زمان دونوں پر مبنی ہے۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ زمان و مکان کا تفاوت نہیں، پھر بھی اختلاف موجود ہے۔ ایک ہی شاعر ایک لفظ کو کبھی مونث، کبھی مذکر کہہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اردو نے مختلف اور متعدد زبانوں سے لفظ لیے ہیں۔ جب کوئی نیا لفظ آیا، اگر اس میں اردو کی رو سے کوئی علامت تانیث یا تذکیر کی نہ تھی، تو ایک مدت تک اس کی جنس معین نہ ہو سکی۔ اور اسی لیے اکثر لفظوں کا فیصلہ آج تک نہ ہو سکا۔ جنس ہی کے معین ہونے پر جمع کی صورت کا انحصار ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے اردو میں جنس اور عدد، دونوں سیال حالت میں ہیں۔"
>
> (مقدمۂ کلیاتِ ولی۔ طبع دوم۔ ص ۳۴)

ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شاعر نے غلطی سے ایک جگہ کسی لفظ کو رواجِ عام کے خلاف مذکر یا مونث نظم کر دیا۔ اس استعمال کو قبولِ عام حاصل نہیں ہوا، لیکن بعض لغت نویسوں نے اسی کو سند کے طور پر قبول کر کے، اس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ ایسا بھی ہے کہ جس اشعار کو یا کسی ایک شعر کو، کسی لفظ کی تذکیر یا تانیث کے لیے بہ طور سند پیش کیا گیا، ان اشعار کو یا اس شعر کو صرف بہ طور سند پیش ہی نہیں کیا جا سکتا تھا، بعض غلط فہمی کا کرشمہ تھا۔ لیکن اس سے ایک غلط اندراج کا اضافہ ہو گیا اور بعد والوں کے لیے

ب اختلافی مسئلہ بن گیا۔ ایسے الفاظ کا جائزہ، ایک نہایت دلچسپ اور مفید کام ہوگا۔ ذیل میں ایسے کچھ الفاظ کو ضروری تفصیلات
ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے۔ قسطِ اول میں ۶ لفظوں کو شامل کیا گیا ہے :
ب، ساد، آخرش، الاپ، ایجاد، املا۔

---

۱) آب :

یہ لفظ حقیقی معنی کے لحاظ سے، پانی کا مرادف ہے اور بالاتفاق مذکر۔ مجازاً، تاب اور آبداری کے معنی میں بھی مستعمل ہے
ان معانی میں، مونث ہے۔ اُردو لغات میں بھی اس کو مونث ہی لکھا گیا ہے۔ لیکن جلال نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث '
دالشعرا' میں اس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کیا ہے (اگرچہ مونث کو مرجح لکھا ہے) اور سند میں آتش کا ایک شعر اور ایک
ع، اور بحر کا ایک شعر پیش کیا ہے۔ جلال کی تقلید میں، 'رشحاتِ صفیر' اور 'ارمغانِ احباب' میں بھی اس لفظ کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے۔ اور
کی سند میں آتش کا وہی ایک شعر پیش کیا گیا ہے، جس کو جلال نے درج کیا ہے ———— لیکن جلال کا یہ فیصلہ محلِ نظر ہے۔
نے مذکر کی سند میں یہ ذیل شعر پیش کیے ہیں۔ [انھوں نے آتش کے دوسرے شعر کا صرف مصرعِ ثانی لکھا ہے۔ مصرعِ اول
ضافہ کیا گیا ہے] :

حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی (متوفی ۱۳۲۷ھ؛ تذکرۂ کاملانِ رام پور) کا یہ قابلِ قدر رسالہ پہلی بار ۱۲۹۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت اس کا
نام کارآمد شعرا تھا۔ جلال نے نظرِ ثانی کے بعد، اس کو مفید الشعرا کے نام سے شائع کیا۔ اس رسالے کے کچھ مندرجات سے اختلاف
کیا گیا ہے لیکن اس کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے اور مستند سمجھا گیا ہے۔ جلال کے سب سے بڑے مخالف، مولوی سید ظہیر احسن
شوق نیموی نے اس رسالے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مختلف
رسائلِ تذکیر و تانیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : " ان میں مفید الشعرا، جناب جلال کی تالیفات سے ہے۔ . . . یہ رسالہ بہ اعتبار
حجم اگرچہ چھوٹا ہے اور سند کے اشعار بھی بہت کم ہیں۔ مگر الفاظ اس میں سب رسالوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ چونکہ اس کا مولف اہلِ زبانِ
لکھنؤ سے ہے اور زبان حال لکھی ہے۔ اگرچہ بعض جگہ بمقتضائے بشریت فاحش لغزش بھی ہے، مگر پھر بھی اس کو ترجیح ہے کیونکہ دوسرے
رسالوں کی بنا صرف تتبع پر ہے۔ زبانِ قدیم و جدید و شاذ وغیرہ کی کیفیت ان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ رشحاتِ صفیر میں اس کی کوشش
کی گئی ہے۔ مگر وہ بات جو مفید الشعرا میں ہے، نہیں۔" (حاشیۂ رسالۂ اصلاح ص ۲۱)
شیخ امداد علی بحر لکھنوی، تلمیذ ناسخ (تذکرۂ نادر)۔ "تحقیق الفاظ میں رشک کے بعد، ناسخ کے شاگردوں میں یہی ممتاز تھے" (آب
بقا ص ۲۴۲)۔ ان کا مطبوعہ دیوان موجود ہے، جس کا نام ریاض البحر ہے۔ قواعدِ زبان و لغت پر مشتمل ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا جس
کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ راقم الحروف نے اس قابلِ قدر رسالے کو مجلۂ اُردو ادب (علی گڑھ) کے شمارہ ۱
۱۹۶۲ء میں شائع کرا دیا ہے ———— کتابوں میں بحر کا سالِ وفات ۱۲۹۵ھ لکھا ہوا ہے۔ غالباً سب سے پہلے صفیر بلگرامی نے

[illegible] یا اٹھائے کشتی کو ہمت شے کیا گہر کی قدر، جب آب گہر جاتا رہا (آتش)
جب [illegible] یار تر ہے انت پسینا ڈوبوں گا میں ڈبائے گا آب گہر مجھے (۰)
جب کر بچے زندگی مرنا تر شمشیر یار اپنے حق میں آب حیواں آب آہن ہو گیا (بحر)

اس سلسلے میں کئی باتیں قابل توجہ ہیں:

(۱) آب، بمعنی تاب و آبداری، مونث ہے۔ لیکن جب یہ مرکب ہو جیسے آب گہر، آب آہن، آب تیغ وغیرہ، اور اس کو مذکر استعمال کیا جائے، تو وہاں درحقیقت آب حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے۔ لفظ آب کے مجازی معنی (آبداری) مراد نہیں لیے جاتے۔ ایسے مقامات پر آب حقیقی کے لوازم مذکور ہوتے ہیں۔ اس لیے ان مرکبات کو لازماً مذکر استعمال کیا جائے گا۔ اس سے مفرد لفظ آب کی تانیث پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جیسا کہ امیر مینائی نے لکھا ہے:

> "شعرا، جب آب گہر یا آب تیغ کو مذکر باندھتے ہیں، تو وہ آب حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے۔ اور لوازم آب حقیقی کے ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ بحر کے اس شعر میں، گھٹوں کمر یا گلو تک ہونا آب حقیقی کے لوازم سے ہے۔ ؎ کٹپے کٹواتے ہیں میرے، بازو پہ ہے آب تیغ ؛ آج گھٹوں تک ہوا، کل تا گلو ہو جائے گا۔" (امیر اللغات ص ۱۳)

آتش کے شعر ثانی اور بحر کے شعر میں، آب آہن اور آب گہر کی یہی صورت ہے کہ معمول شعرا کے مطابق، دونوں جگہ آب حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے اور آب حقیقی کے لوازم موجود ہیں۔ اس لیے ان اشعار کو مفرد لفظ آب کی تذکیر کی سند میں کسی طرح نہیں پیش کیا جا سکتا۔

جلوۂ خضر میں اس سند کو لکھا ہے۔ بعد کو اسی کو نقل کیا جاتا رہا۔ امیر مینائی کے ایک شاگرد، مولوی مہدی علی خاں ممتاز رامپوری نے ایک مجموعۂ قطعات تاریخ وفات مرتب کیا تھا۔ جس کا مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس کا نام تاریخ لطیف ہے۔ اس میں امیر کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ وفات بحر موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا انتقال ۱۲۶۵ھ میں ہوا تھا۔ اس قطعے کا شعر آخر یہ ہے ؎ سال ختم کر بتاریخ وفاتش جو اسیر ؛ گفت دل "بحر یک موج گہر تر سید" ۱۲۶۵۔ یہ واضح رہے کہ اسیر کا انتقال ۱۲۹۹ھ میں ہوا ہے۔

۱۲ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، متوفی ۱۳۰۸ھ (تلامذۂ غالب) کی معروف تالیف میرے پیش نظر اس کا وہ ایڈیشن ہے، جو صفیر کی نظر ثانی کے بعد مطبع احمدی پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ آئندہ اس کتاب کے لیے صرف لفظ رشحات استعمال کیا جائے گا۔

۱۳ مؤلفہ منشی قادر علی صفی پوری۔ ملازم ریاست بھوپال، مطبع شاہجہانی بھوپال میں ۱۳۰۸ھ میں چھپا تھا۔ اچھا خاصا رسالہ ہے۔ البتہ تحقیق سے نسبتاً کم کام لیا گیا ہے۔ آئندہ اس کے لیے لفظ ارمغان لکھا جائے گا۔

(۲) آتش کے پہلے شعر میں "آبِ گہر" مزور اس طرح آیا ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں اُن سے تسامح ہُوا۔ اور اُمخفوں نے اپنے خیال میں "آبِ گہر" کو اس طرح نظم کر دیا جیسے آبِ حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہو۔ حالانکہ یہاں لفظِ آب مجازی معنی میں آیا ہے۔ اس خیال کی تائید کئی طرح ہوتی ہے:

(الف) آتش کے کلیات میں، زیرِ بحث شعر کے علاوہ، جہاں کہیں یہ لفظ بہ ترکیب آیا ہے "آبِ حقیقی کے لوازم کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً:

گلیاں آبِ گہر کی بھی جو خوش و کرتے | تیرے دانتوں کی نہ دانتوں میں صفائی ہوتی (کلیات نولکشور پریس ص ۲۲۳)

ہمارے اشک کے قطرے میں جا منزہ آبِ گوہر سے | بھرا چاہے جو پانی وہ صنم چاہِ زنخداں میں (ص ۱۹۱)

رُوح کو تفریح اُن دانتوں کے دیکھے سے ہوئی | آبِ گوہر سے ہمارا دل کا صنوبر ہو گیا (ص ۱۰۰)

الٰہی بازو قاتل میں زورِ دستِ قدرت دے | روانی ہے اسی کے دم سے آبِ خشک خنجر میں (ص ۱۸۹)

(ب) آتش نے مُفرد لفظ آب کو (مجازی معنی میں) مذکر نظم نہیں کیا۔ البتہ ایک جگہ مؤنث ضرور نظم کیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

جا سے مر گئے تو اسے کاش میں گردن رکھتا | آب، ابرو کے ہر اک بال میں تلوار کی تھی (ص ۲۹۸)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آتش درحقیقت اس کی تانیث کے قائل تھے۔

(ج) آتش اور اُن کے تلامذہ کے یہاں (زیرِ بحث شعر سے قطع نظر کرتے ہوئے) "آبِ گہر" (موتی کی آب کے معنی میں) کہیں مذکر نظم نہیں ہوا ہے۔ البتہ تانیث کی مثال مل سکتی ہے۔ مثلاً:

چاہیے انسان کو بھی پاسِ حفظِ آبرو | یاد رکھے، جائے پھر آبِ گہر بنتی نہیں

رند (دیوان نولکشور پریس ص ۱۸۴)

(د) آتش کے زیرِ بحث شعر کو، مُفرد لفظ آب کی تانیث کی سند کے طور پر، جلال اور اُن کی تقلید میں مولفِ ارمغان کے سوا کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ نہ "آبِ گہر" کی تانیث کی سند میں قبول کیا بلکہ سب نے یہ صراحت کر دی ہے کہ آتش نے یہ خلافِ جمہور کہا ہے۔
صفیر بلگرامی، جنھوں نے جلال کی تقلید میں اس لفظ کو مختلف فیہ لکھ دیا ہے، لکھتے ہیں:

"یا بعض الفاظ جن میں سب شعرا و فصحا متفق ہیں۔ مگر ایک دو شاعروں نے اُن کے خلاف باندھا۔ تو ہم کو جمہور کی تقلید کرنی ہوگی۔ جیسے آبِ گہر، کہ جو قواعد کی رو سے بھی مونث ہے اور فصحا کا برتاؤ بھی یہی ہے؛ اُس کو آتش مذکر باندھ گئے ہیں۔" (رشحات ص ۳۹)

شوق نیموی نے رسالۂ اصلاح میں "آب بمعنی آبداری کو" مونث لکھ کر، لکھا ہے:

ء مولوی سید ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی۔ تلمیذ شمشاد لکھنوی۔ اپنے زمانے کے نہایت معروف اہل علم میں تھے۔ جلال کے سب سے بڑے حریف تھے۔ کئی رسالے ان کے رد میں لکھے ہیں۔ متوفی ۱۷ رمضان ۱۳۲۲ھ۔ "شوق سخنور" مادۂ تاریخ وفات ہے۔ ان کی مثنوی "سوز و گداز" کے آخر میں قطعاتِ تاریخ بھی شامل ہیں۔ ایک قطعہ میں ان کی تصانیف کے نام بھی ہیں۔ (مثنوی سوز و گداز مطبوعہ

...نے جہاں اس کو مذکر استعمال کیا ہے، وہ جمہور شعرا کے خلاف ہے۔" (ص ۲۱)

یہ درحقیقت ایراد ہے جلال کے اس قول پر کہ یہ لفظ، الفاظِ مشترک میں سے ہے ——— اسی ذیل میں شوق نے مزید لکھا ہے: "جہاں جہاں پانی کی رعایت کی گئی ہو، وہاں مذکر بھی استعمال کرنا درست ہے" ——— اور مثال میں ناسخ کا ایک مصرع اور بحر کا وہی شعر لکھا ہے، جس کو جلال نے آب بمعنی آبداری کی تذکیر کی سند میں پیش کیا ہے ——— یہ بھی درحقیقت ایراد ہے اس پر کہ جلال نے سند میں یہ شعر پیش نہیں کیا اور "لوازمِ آبِ حقیقی" والے نکتے تک اُن کی نظر نہیں پہنچی۔

مؤلف معین الشعرا نے آب بمعنی آبداری کو مؤنث لکھ کر حاشیے میں لکھا ہے:

"خلافِ جمہور کے ایک جگہ آتش نے مذکر بھی لکھا ہے۔"

اور آتش کے زیرِ بحث شعر کو درج کیا ہے۔

(د) بحر کا جو شعر جلال نے مذکر کی سند میں درج کیا ہے، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس کو لفظ آب کی تذکیر کی سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا؛ نہ جلال کے سوا کسی نے اس کو پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ بحر نے ہر جگہ آب (بمعنی آبداری) کو مؤنث باندھا ہے۔ اُن کے دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے، جس میں یہ لفظ بہ تذکیر آیا ہو۔ مؤنث کی چند اسناد درج کی جاتی ہیں۔

جو آب آئنے کی جانے ہم معتبر ہوں ——— دو کوڑی میں جو اس کی جبیں آبرو بیچتے (ریاض البحر ص ۲۰۰)

مشاقی موتیوں کی آب اس کے دہاں سے ——— اُتر اور یا سب نظمیں نے رنگت لولوں کا (ص ۱۴۱)

گردوں گوں ہے ٹپکے اندر چھوٹیا ہے ——— ایک قطرہ سے موتی کی آب ہوگا (ص ۹۰)

نیز اُن کے دیوان میں آبِ گہر یا اسی نوع کا کوئی مرکب، جس میں آبِ حقیقی سے استعارہ نہ ہو بلکہ آبداری کے معنی مراد ہوں، مذکر نظم نہیں ہوا ہے۔

(س) اُردو کے کسی لغت نگار نے لفظ آب بمعنی آبداری کو مذکر نہیں لکھا، سب نے صرف مؤنث لکھا ہے۔ نیز آبِ گہر، آبِ رخ، آبِ تیغ جیسے مرکبات کو، جن میں آبداری کے معنی ہوں، صرف مؤنث لکھا ہے۔ اسی طرح جن رسائلِ تذکیر و تانیث کا ذکر آ چکا ہے،

(ما بقیہ) نظامی پریس پٹنہ، ان کا رسالہ "اصلاح" اس زمانے میں خاصا مقبول ہوا تھا۔ میرے پیشِ نظر وہ ایڈیشن ہے جس کو مولانا حسرت موہانی نے اُردو پریس علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔ یہ دراصل ان کے دو رسالوں کا مجموعہ ہے۔ ایک فارسی رسالہ "ازاحۃ الاغلاط" جو لغت کے موضوع پر ہے۔ دوسرا "اصلاح" جس میں مختلف قواعدِ زبان درج کیے گئے ہیں۔ کارآمد رسالہ ہے۔

ما مولفہ منشی غلام حسین آفاق بنارسی تلمیذ جلیس مانکپوری۔ متوفی ۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء (مقدمہ معین الشعرا) تذکیر و تانیث کے موضوع پر غالباً سب سے ضخیم کتاب ہے۔ بلکہ اچھا خاصا لغت ہے۔ اسناد کے ساتھ ساتھ ہر لفظ کے اعداد بھی لکھ دیے ہیں۔ یہ کتاب مؤلف کے انتقال کے بعد صدیق بکڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ سالِ طبع درج نہیں۔ سنِ تکمیلِ تالیف ۱۳۲۸ھ ہے۔ اچھی علمی کتاب ہے۔

اُن کے علاوہ دُوسرے قابلِ ذکر رسائل میں بھی مُفرد لفظِ آب یا اس کے مذکورہ مرکبات کو صرف مونث لکھا گیا ہے۔ مثلاً رسالہ بسیط[۱]، رسالہ جمیل[۲]۔

مختصر یہ کہ مفرد لفظ آب بمعنی تاب و آبداری متفق علیہ مونث ہے۔ اس کے مرکبات، جن میں آب حقیقی سے استعارہ ہو، مذکر آتے ہیں۔ جن میں آبداری کا مفہوم ہو، وہ مونث آتے ہیں۔ آتش کے ایک شعر کی حیثیت شاذ کی ہے۔ یہ آتش کا تسامح ہے۔ اس لیے اس شعر کی بنا پر، اس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ جلال نے آتش و بحر کے جو دو اشعار اس کی تذکیر کی سند میں پیش کیے ہیں، یہ جلال کا تسامح ہے۔ ان اشعار میں ایسے دُوسرے اشعار کی طرح "آب حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے" اس لیے ان کو "آب بمعنی آبداری کی بحث میں پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔

صاد :

عربی کے حروف تہجی میں چودھواں حرف ہے۔ آنکھوں کو بھی اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ صحیح یا منظور ہونے کی علامت بھی ہے۔ ان سارے معانی میں اس کو مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ اسناد لغات میں موجود ہیں۔ لیکن ایک غلط فہمی کی بنا پر اس کو بھی مشترک الفاظ میں شامل کر لیا گیا۔ معلوم نہیں اس غلط فہمی کا آغاز کس سے ہوا، البتہ یہ معلوم ہے کہ بیشتر اربابِ لغات و رسائل اس میں مبتلا ہوئے۔ ایک ایسے شعر سے اس کی تانیث پر استدلال کیا گیا، جس کو تانیث کی سند میں ہرگز نہیں پیش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن "نقل قول" کو کیا کہا جائے، کہ رفتہ رفتہ اس کا مختلف فیہ ہونا مسلم ہو گیا۔

جلال نے مفید الشعرا میں، اس کو صرف مذکر لکھا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس کو "اسم مذکر و مونث" لکھ کر مثال میں مثنوی گلزار نسیم کا یہ شعر لکھا ہے :

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی بینائی نے چشم پر نظر کی

اور اس شعر کے نیچے مزید صراحت کی ہے کہ "تانیث کی مثال بھی اسی شعر سے ثابت ہے"۔ ——— مولفین رشحات و نور اللغات

---

۱ یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔ مولفہ آغا محسن علی عرف آغا جو ہندی لکھنوی ابن محمد علی خاں ابن نواب شجاع الدولہ (تذکرہ انتخاب یادگار) یہ دربار رام پور سے متعلق تھے۔ یہ مخطوطہ، فہرست کتب خانہ کی صراحت کے بموجب، مولف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں الفاظ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) مذکر (۲) مونث (۳) مشترک۔ مشترک الفاظ میں اس کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ مولف کی رائے میں ترجیح کسے ہے۔ رسالے کا سال اتمام ۱۲۹۴ھ ہے۔ بعض اعتبارات سے خصوصاً مولف کی شخصیت کے لحاظ سے یہ رسالہ قابل ذکر ہے۔ ان کی متعدد تصانیف غیر مطبوعہ کتاب خانہ رام پور میں محفوظ ہیں۔ ۱۳۱۲ھ میں انتقال ہوا (تاریخ نصیف) لکھنؤ میں غفران مآب کے امام باڑے میں قبر ہے (آب بقا)

۲ حافظ جلیل حسن جلیل مانکپوری (تلمیذ و جانشین امیر مینائی) کی تالیف اس کا نام ... رسالہ تذکیر و تانیث ہے۔ سال ترتیب ۱۳۲۹ھ ہے۔ اختر دکن پریس حیدر آباد میں چھپا تھا۔

دار مقال نے بھی نسیم کے اسی ایک شعر کو تانیث کی سند میں پیش کیا ہے۔ اور اس طرح ان حضرات نے بھی اس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ حالانکہ نسیم کے شعر سے تانیث ثابت نہیں ہوتی۔ اثبات تانیث کے لیے ضروری ہے کہ مصرع کو یوں لکھا جائے ؎ صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسری۔ لیکن یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس مصرع میں "آنکھوں کی" کی جگہ "آنکھوں کے" نہیں ہے؟

قواعد تذکیر و تانیث میں یہ ایک مانا ہوا قاعدہ ہے کہ کوئی ایسا شعر جس میں محض "کی" "یا" "کے" سے تذکیر و تانیث ظاہر ہوتی ہو اور اس مقام پر غلط کتابت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہو یا اسی قبیل کی اور کوئی محتمل الطرفین صورت ہو، ایسے شعر کو بطور سند پیش نہیں کیا جا سکتا۔ سند کے شعر کے لیے ضروری ہے کہ اس سے وضاحت اور قطعیت کے ساتھ، تذکیر یا تانیث کا اظہار ہوتا ہو۔ چونکہ نسیم کے مذکورہ شعر سے اس قطعیت کا اظہار نہیں ہوتا، اس لیے اس شعر کو تانیث کی سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اس شعر میں میری رائے میں "صاد آنکھوں کے" پڑھنا چاہیے۔ دو وجوہ سے: (۱) "آنکھوں" جمع ہے، تناسب بیان کا تقاضا ہے کہ یہاں اس کی مناسبت کامل کے لحاظ سے مشبہ بہ بھی جمع ہو یعنی مصرع کو یوں پڑھا جائے ؎

صاد آنکھوں کے دیکھ کر پسری

(۲) اس وقت تک صاد کی تانیث کی کوئی دوسری سند نہیں پیش کی جا سکی ہے۔ باوصف تلاش، مجھے نظم و نثر میں کہیں بھی یہ لفظ مونث نہیں ملا۔ البتہ مذکر کی بیسیوں مثالیں ہیں۔ اس اعتبار سے بھی "صاد آنکھوں کے" مرجح ہے۔

اب سے پہلے یائے معروف و مجہول کی کتابت میں کوئی امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ اسی بنا پر اس زمانے کی کسی تحریر میں اگر کوئی لفظ بیائے معروف یا بیائے مجہول لکھا ہوا، یا چھپا ہوا ہو، تو اس کتابت کی بنیاد پر اس کی تذکیر و تانیث کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثنوی گلزار نسیم کا پہلا اڈیشن ۱۲۶۰ھ[1] میں مطبع حسینی میر حسن رضوی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں اس زمانے کے رواج کے مطابق یائے معروف و مجہول کا امتیاز نہیں ہے۔ یہ مصرع اس طرح لکھا ہوا ہے ؎

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسری

لطیفہ یہ ہے کہ چکبست نے ۱۹۰۵ء میں اس مثنوی کا جو اڈیشن شائع کیا (جو اس زمانے میں معرکۂ چکبست و شرر کی بنیاد بنا تھا) اس میں بھی "صاد آنکھوں کی" ہے۔ جن لوگوں نے پہلے اڈیشن کو یا نسخۂ چکبست کو دیکھا اور اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ یہاں "کی" "یا" "کے" میں سے کیا مرجح ہو سکتا ہے۔ یا یہ کہ کچھ ہو یا کے، اس سے نہ تانیث پر استدلال کیا جا سکتا ہے نہ تذکیر پر۔ (اس کے لیے دوسرے اساتذہ کا طرزِ عمل دیکھنا ہوگا) انھوں نے اسے "صاد آنکھوں کی" پڑھا اور اس کی بنیاد پر یہ فرض کر لیا کہ نسیم نے اس لفظ کو مونث نظم کیا ہے —— شروع میں ایک لغت نویس نے لکھا، دوسروں کے لیے محض اس لغت نویس کا لکھنا، آیت و حدیث ہو گیا۔

مجھے تعجب اس پر ہے کہ صفیرؔ بلگرامی نے رشحات میں اس شعر کو تانیث کی سند میں قبول کر لیا۔ اور اس طرح انھوں نے اس

---

[1] یہ اڈیشن کمیاب ہے رضا لائبریری رام پور میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ حالانکہ صفیر نے اس رسالے میں متعدد جگہ یہ صراحت کی ہے کہ جن اشعار میں غلط الکاتب کا احتمال ہو، یا عض کی اکے، پر سند کا انحصار، ایسی اسناد کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں، انھوں نے دُوسروں پر اس سلسلے میں اعتراضات بھی کیے ہیں۔ مثلاً جلال نے مفید الشعرا میں لفظ مشتری کی تانیث کی سند میں یہ دو شعر لکھے ہیں:

نقدِ جاں لائی ہے تالے مول تو راُس ماہ سے ‌‌ ‌ ‌ مشتری رکھا ہے نام اپنے لیے برجیس کا ‌ ‌ (ناسخ)

تیرا غلام کچھ مہ کنعاں فقط نہیں ‌ ‌ ‌ ‌ کہتی ہے مشتری بھی میں تیری خریدہ ہوں ‌ ‌ (")

صفیر نے ان اسناد پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مولف کہتا ہے کہ کار آمد شعرا کی ان مثالوں سے مونث ہونا کچھ ضرور نہیں کہ ثابت ہو۔ کیونکہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی نقد جاہ لایا ہے، اور کہتا ہے 'مشتری' بھی کہہ سکتے ہیں۔" ‌ ‌ (رُشحات ص ۴۷)

جلال نے طوطی کی تانیث کی سند میں رشک کا یہ شعر بھی پیش کیا ہے:

طوطیِ سبزۂ خط صاف یہی کہتی ہے ‌ ‌ ‌ ‌ ہیں ڈری عارضِ آئینۂ جاناں اب تک

صفیر نے اس پر بھی یہی اعتراض کیا ہے۔

"اور رشک کے شعر کی سند جو دی گئی، اس کو ماننا مشکل ہے۔ کیونکہ، طوطی سبزۂ خط صاف یہی کہتا ہے، بھی ہو سکتا ہے۔ از روئے غلطی کتابت یہ مثال کافی نہیں۔ حضرت جلال ایسی ہی مثالیں دیا کرتے ہیں۔" ‌ ‌ (رُشحات ص ۴۸)

ایک طرف تو یہ احتیاط کہ افعال میں بھی غلطی کتابت کے احتمال کی بنا پر اُن کو بطور سند قبول نہ کرنا۔ دُوسری طرف یہ صورت کہ جس سند کا انحصار "کی" اور "کے" کے فرق پر ہے، اُس کو بے تکلف قبول کر لیا!!

بہرحال، صاد مذکر ہے۔ جن لوگوں نے گلزارِ نسیم کے زیرِ بحث شعر کی بنا پر مونث فرض کر کے، اس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا، اُن سے غلطی ہوئی۔ اس شعر میں "صاد آنکھوں" کے "مرجح ہے۔ بالفرض کوئی صاحب مرجح نہ مانیں، تب بھی اصولاً اس شعر کو تانیث کی سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اور جب تک کوئی مثال تانیث کی نہ ملے۔ اُس وقت تک اس کو مختلف فیہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

۳۔ الاپ:

جلال نے مفید الشعرا میں 'الاپ' کو مشترک الفاظ میں شامل کیا ہے۔ اس کی صراحت نہیں کی کہ ترجیح کسے ہے۔ البتہ آغا حجو ہندی نے رسالۂ بسیط میں مذکر کو مرجح لکھا ہے۔ جلال نے مذکر کی سند میں ایک شعر لکھا ہے، اور مونث کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی سند کلامِ اساتذہ میں نہیں ملی۔ ان کی عبارت یہ ہے:

"الاپ مختلف فیہ ہے۔ مذکر و مونث دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قدرت نے مذکر کہا ہے ؎

ایک ہی پٹے کے تم سمجھو تو ہیں یہ سب الاپ ‌ ‌ ‌ ‌ گر صدائے بانگ ہے در نغمۂ ناقوس ہے

اور مونث کی مثال متوسطین کے کلام اساتذہ میں ملی نہیں۔ اتنا یاد پڑتا ہے کہ مونث بھی کہا گیا ہے۔"

جلال نے مذکر کی سند میں جو شعر نقل کیا ہے، وہ شاہ قدرت اللہ قدرت دہلوی کا ہے۔ تذکرۂ میر حسن، تذکرۂ ہندی اور سخن شعرا میں یہ انہیں کے نام سے درج ہے۔ یہ ان کی بہت مشہور غزل کا شعر ہے، جس میں وہ معروف ترین قطعہ بھی شامل ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

کل جو میں اس حرم سے ترغیب دیتی تھی مجھے　　کیا ہی ملک روم ہے کیا سرزمین روس ہے

ان تذکروں میں زیر بحث شعر کا متن مختلف ہے، جو درج ذیل ہے:

ایک ہی پردے کی گر سمجھو تو ہے یہ سب الاپ　　گر صدائے بانگ ہے، ور نغمۂ ناقوس ہے　(تذکرۂ میر حسن)

ایک ہی پردے کے یہ سب سمجھے تو ہیں الاپ　　گر صدائے بانگ ہے، ور نغمۂ ناقوس ہے　(تذکرۂ ہندی)

ایک ہی پردے کی گر سمجھو تو یہ ہیں سب الاپ　　گر صدائے چنگ ہے یا نغمۂ ناقوس ہے　(سخن شعرا)

تذکرۂ میر حسن کے مطبوعہ نسخے کے ساتھ ساتھ اس کا ایک قلمی نسخہ (محفوظہ رضا لائبریری رام پور) بھی پیش نظر ہے، دونوں میں ایک متن ہے۔ اور اس سے الاپ کی تذکیر کے بجائے تانیث ظاہر ہوتی ہے۔ اصولاً اس شعر کو سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ قدرت کا دیوان ابھی تک نہیں چھپا ہے، سنا ہے پٹنے میں کوئی صاحب اس کو مرتب کر رہے ہیں، ممکن ہے اس سے کوئی قطعی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ صفیر الشعرا، رسالۂ بسیط، اور ترشحات میں اس کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے۔ جلال نے مذکر کی سند میں قدرت کا شعر پیش کیا ہے، ترشحات میں بھی وہ منقول ہے؛ گویا مذکر کی سند میں صرف ایک شعر پیش کیا گیا ہے، جس کو اصولاً پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح اس کی تذکیر جو سند ہے، اور اس اعتبار سے یہ محل نظر۔

آصفیہ، امیر اللغات، نور اللغات، رسالۂ جمیل اور معین الشعرا میں اس کو صرف مونث لکھا گیا ہے۔ نور اللغات میں تانیث کی سند میں واجد علی شاہ اختر کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

طبلوں پہ ٹھیکیں جو پڑنے لگی ہیں　　پہنچیں گردوں پہ وہ الاپیں

یہی شعر معین الشعرا میں منقول ہے۔ آصفیہ میں مثنوی میر حسن کا یہ شعر سند تانیث میں پیش کیا گیا ہے:

وہ رقص بتاں اور وہ ستھری الاپ　　وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ

یہی شعر امیر اللغات میں ہے۔ مولف بہار ہند نے بھی تذکیر و تانیث کی صراحت کے بغیر اسی شعر کو درج کیا ہے۔ لیکن میر حسن کے اس

ف۱ مولانا مرزا محمد مرتضیٰ عرف محمد بیگ عاشق لکھنوی اردو میں ستم ظریف کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ یہ لغت جون [illegible] میں مطبع شرکت جعفری لکھنؤ میں چھپا تھا۔ مرتب کی صراحت کے مطابق اس کو چار جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ تھا، لیکن صرف جلد اول چھپ سکا۔ یہ صرف حرف الف پر مشتمل ہے۔ مرتب لکھنؤ کے ارباب اعتبار میں سے تھے۔ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتا تو واقعی کام کا لغت ہوتا۔ بقول چکبست: "لکھنؤ کی زبان اور محاوروں کی جتنی تحقیق مرزا صاحب مرحوم کو تھی، اس کا اندازہ ان کی مشہور تالیف "بہار ہند" کے دیکھنے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے، افسوس ہے کہ ملک نے اس لغت کی کافی قدر نہ کی، ورنہ اگر اس کے باقی تین حصے بھی چھپ جاتے تو اردو زبان کی اصطلاحوں اور محاوروں کا ایک لاجواب مجموعہ مرتب ہو جاتا۔" (مضامین چکبست ص ۲۲۵)

رسے تانیث تو ثابت نہیں ہوتی۔ "ستھرے الاپ" بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس شعر کو تانیث کی سند میں پیش کرنا درست نہیں۔ اختر کے شعر
ہ یقیناً تانیث ظاہر ہوتی ہے۔ میں فی الوقت یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ شعر اُن کی کس مثنوی سے ماخوذ ہے اور یہ کہ اصلاً اسی طرح ہے۔
اس شعر کا متن بالکل صحیح ہے اور یہ اختر کا ہے، تو بالیقین اثبات تانیث کے لیے کافی ہے —————— لیکن یہ واضح رہے کہ اس
مسے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ یہ لفظ صرف مونث ہے۔ جیسے رشک کے اس شعر سے :

"وصل کی رات بنا نامۂ شوقِ گیسو شام تغلیس ہیں، سپیدی ہی سحر کا غذ کی

(مجموعۂ دواوین رشک ص ۳۱۴)

ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ "لفظ" صرف مونث ہے۔

ہندی کے متعدد اساتذہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنسکرت اور ہندی میں الاپ مذکر ہے۔ لغات میں بھی صرف مذکر
ما ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ہندی شبد ساگر (شائع کردہ ناگری پرچارنی سبھا) برہت ہندی کوش (شائع گیان منڈل بنارس) سنسکرت
بد ارتھ کوستبھ (مرتبۂ دوارکا پرشاد شرما)۔

یہ لفظ فنِ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس فن سے تعلق رکھنے والے حضرات سے استصواب کیا
ئے۔ اس سلسلے میں جناب شاہد احمد دہلوی سے رجوع کیا۔ موصوف اس فن کے قابلِ ذکر جاننے والوں میں سے ہیں۔ شاہد صاحب
ے از راہِ التفاتِ خاص ضروری تفصیل سے مطلع کیا۔ موصوف کے مکتوب کا اقتباس درج ذیل ہے :

"پیشہ وروں کی زبان پر "الاپ" مذکر ہے اور کتابوں میں بھی، اس لیے میں بھی مذکر ہی بولتا ہوں۔

(۱) معارف النغمات مصنفہ ٹھاکر نواب علی خاں، جو اُردو کی واحد مستند کتاب ہے۔ اُس میں بھی ص ۴۰ پر
یہ عبارت درج ہے : "آج کل الاپ بھی، دھرپد کی طرح، چار حصوں پر منقسم کر دیا گیا ہے۔"

(۲) "آجکل" کے موسیقی نمبر مطبوعہ اگست ۱۹۵۶ء کے ص ۹۰ کالم ۱ سطر ۲ میں کہا گیا ہے کہ "دھرپد کا الاپ یا بین کا رکا جوڑ
وہ ماحول پیدا کر دیتا ہے جو دُوسری گائیکیوں یا باج نے ابھی تک پیدا نہیں کیا ہے —————— مضمون نگار ہیں اُستاد
رحیم الدین خاں ڈاگر، جن کا کام ہی الاپ کرنا اور دھرپد گانا ہے۔

(۳) کتاب اسرارِ کرامت عرف نغماتِ نعمت، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، ص ۸۰، س ۹، "ہر راگ کے الاپ کے واسطے تین سے مقرر
کی گئی ہیں" —————— یہ کتاب نعمت اللہ خاں نے لکھی تھی اور اس کی تکمیل اُن کے بیٹے کرامت اللہ خاں نے کی تھی۔ نعمت اللہ
خاں "دربارِ خیال کے گائک تھے۔

الاپ مذکر ہی بولا جاتا ہے۔ مگر غیر پیشہ وروں سے مونث بھی سُنا ہے۔ لغت میں شاید اسی وجہ سے دونوں طرح درج کر دیا
گیا ہو۔"

اس عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ فنِ موسیقی سے تعلق رکھنے والے بالعموم اس
کو مذکر استعمال کرتے رہے ہیں (یہ غالباً ہندی کا اثر ہے) اور دُوسرے لوگ بالعموم مونث۔ اسی لیے اکثر اربابِ لغات نے اس

کو صرف مؤنث لکھا ہے۔

ارمغان میں الاپ کو مذکر کی سند میں قدرت کا زیرِ بحث شعر نقل کیا گیا ہے۔ لیکن پہلا مصرع اس طرح لکھا ہوا ہے:

ایک ہی پردے کی تم سمجھو تو ہیں یہ سب الاپ

اس سے تو تانیث ظاہر ہوتی ہے! یہ تو خیر غلطیِ کتابت ہو سکتی ہے۔ لیکن واقعی دلچسپ بات یہ ہے کہ جلال نے تو مفید الشعرا میں یہ صراحت نہیں کی تھی کہ قدرت دہلوی ہیں یا لکھنوی۔ مگر مؤلفِ ارمغان نے اپنا دبدبہ سے کام لے کر انھیں "لکھنوی" بنا دیا۔

مؤلفِ آصفیہ نے الاپ کو "غلط العوام" لکھا ہے اور آلاپ (بہ الف ممدودہ) کو صحیح لفظ مانا ہے۔ لیکن اس فیصلے میں وہ منفرد ہیں، مجموعاً اربابِ لغت اور اساتذہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مستعمل عام و خاص الاپ (بغیر مد) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحبِ آصفیہ نے، بغیر غور کیے ہوئے، فیلن کی تقلید کی ہے۔ سنسکرت میں آلاپ ہے (سنسکرت شبد ارتھ کوستبھ) ہندی میں الاپ بھی مستعمل ہے (ہندی شبد ساگر) متعدد مستشرقین نے اپنے لغات میں الاپ کو "آلاپ کی بگڑی ہوئی صورت بتایا ہے" فیلن بھی انھیں میں شامل ہے۔ مولوی صاحب نے اس کا خیال کیے بغیر کہ اردو میں کس طرح مستعمل ہے، اُس کے نوشتے کو صرف آلاپ مان لیا۔

۴۔ آغوش:

جلال نے مفید الشعرا میں لکھا ہے:

"آغوش" بعضوں کے عندیے میں مرد کے قیاس پر مؤنث ہے، حالانکہ بہ قیدِ نظم مذکر پایا جاتا ہے۔"

مذکر کی سند میں آتش و رند کا ایک ایک شعر پیش کیا ہے۔ --- جلال کی عبارت مبہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اساتذۂ دہلی نے اس لفظ کو مؤنث نظم کیا ہے، اور اساتذۂ لکھنؤ نے مذکر۔ صرف میر علی اوسط رشک لکھنوی (تلمیذ ناسخ) کا ایک شعر عام طور سے مؤنث کی سند میں پیش کیا گیا ہے، وہ شعر یہ ہے:

شبِ فرقت کی آمد پا کے، آغوشِ لحد پھیلی | قضا کی مہربانی ہے، اجل سرگرمِ احساں ہے

(مجموعۂ دواوینِ رشک ص ۳۰۴)

رشک کے مجموعۂ دواوین میں اور کہیں یہ لفظ اس طرح نظم نہیں ہوا کہ تذکیر یا تانیث کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہی جا سکے، مثلاً:

منظورِ الٰہی تھی ہم آغوشیِ جاناں | تب تو مری آغوش تنا کر بنایا (ص ۸۰)

آغوشِ زمیں تو ہاتھ آئی | گو ہم مردودِ آسماں ہیں (ص ۲۲۲)

دونوں شعروں میں، مری اور آئی کو، بیائے مجہول بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ جلال کا یہ لکھنا کہ "بقیدِ نظم مذکر پایا جاتا ہے" صرف اس حد تک صحیح ہے کہ عموماً اساتذۂ لکھنؤ نے اس کو مذکر نظم کیا ہے۔ لیکن اساتذۂ دہلی نے اس کو مؤنث باندھا ہے اور اس کی مثالیں عام ہیں یہی صراحت امیر اللغات میں ہے۔ مؤلف نے لکھا ہے:

"شعرا نے مذکر بھی کہا ہے اور مؤنث بھی استعمال کیا ہے، چنانچہ مثالوں سے پیدا ہے، مگر مؤلف کے

نزدیک اس کی تذکیر کو ترجیح ہے۔"

یہ صورتِ حال یہ ہے کہ لکھنؤ سے متعلق حضرات میں سے بیشتر نے اس لفظ کو یا تو صرف مذکر لکھا ہے (رسالۂ بسیط) یا مذکر کو مرجح بتایا ہے (امیر اللغات، مفید الشعراء، معین الشعراء، رسالۂ اصلاح)۔ صفیر نے رشحات میں اس کو مختلف فیہ لکھا ہے لیکن یہ صراحت نہیں کی کہ ترجیح جسے ہے۔ صرف مولفِ نور اللغات نے مونث کو مرجح لکھا ہے۔

دہلی سے متعلق حضرات نے اس کو صرف مونث تسلیم کیا ہے۔ ابتداءً فرہنگ آصفیہ میں آغوش مذکر چھپا ہوا تھا۔ مولفِ اختلاف اللسان[1] نے اس سلسلے میں لکھا تھا:

"آغوش۔ لکھنؤ میں مذکر بولا جاتا ہے...... منشی سید احمد صاحب دہلوی نے فرہنگ آصفیہ میں آغوش کو مذکر لکھا ہے۔ اس کے متعلق صاحب فصیح اللغات نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یا تو کاتب کی غلطی ہے۔ یا حقیقت میں اہلِ دہلی بھی اس لفظ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ حضرت اُستاد مرحوم (فصیح الملک داغ دہلوی) نے فرہنگ آصفیہ میں آغوش کو مذکر چھپا دیکھ کر، قافیہ و ردیف کے لحاظ سے یہ لفظ مونث کہا ہے ؎

سُنتا ہی نہیں وُہ بُت سے فرش ہماری — خالی ہے شبِ وصل بھی آغوش ہماری

اہلِ دہلی آغوش کو عموماً مونث ہی بولتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں جو اس کو مذکر لکھا ہے تو یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے کیونکہ ایسی غلطیاں کتاب مذکورہ میں اکثر پائی جاتی ہیں۔" (اختلاف اللسان ص ۲)

مؤلفِ اختلاف اللسان کا خیال صحیح تھا۔ یہ کتابت کی غلطی تھی، کیونکہ اس کے بعد جو باضابطہ اڈیشن شائع ہوئے[2]، ان میں یہ مونث لکھا ہوا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مولفِ آصفیہ کی دو اور فروگزاشتوں کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا:

(۱) مولفِ آصفیہ نے آغوش کی تانیث کی سند میں دو شعر درج کیے ہیں۔ لیکن ان اشعار سے نہ تانیث ثابت ہوتی ہے نہ تذکیر۔ (یہ اشعار اشاعت اوّل میں نہیں تھے) شعر یہ ہیں:

---

(۱) مؤلفہ منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی، تلمیذ داغ۔ سالِ طباعت ۱۹۰۶ء، مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور۔ مؤلف کے الفاظ میں اس کتاب میں "دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے الفاظ اور محاورات کا فرق بیان کیا گیا ہے۔ یہ ۹۰ صفحے کا رسالہ ہے۔ بعض الفاظ سے متعلق مُعرِوفی بحثیں بھی شامل ہیں جو اس زمانے میں مختلف رسائل میں شائع ہوئی تھیں۔ ان سے بہت سے اختلافات اور ضروری امور سے متعلق بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ مؤلف نے سرورق پر "زبانِ دہلی کو اُردوئے معلّٰی اور زبانِ لکھنؤ کو اُردوئے معلّٰی لکھا"

(۲) ۱۸۷۸ء میں "ارمغانِ دہلی" کے نام سے اس کا ایک حصہ شائع ہوا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں مؤلف نے چھوٹی تقطیع پر ایک رسالہ نکالنا شروع کیا جس میں اجزائے لغت شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں فرہنگ آصفیہ کی چوتھی جلد شائع ہوئی۔ تیسری جلد ۱۸۹۸ء میں چھپ چکی تھی۔ اس وقت مؤلف نے ان ماہانہ رسالوں کے اجزا کے مجموعے کو جلد اول و دوم قرار دیا۔ پھر ۱۹۰۸ء پہلی جلد بڑی تقطیع پر باضابطہ شائع ہوئی۔ دوسری بار یہ ۱۹۱۸ء میں چھپی۔

کروٹ بھی نہ لی راحت آغوش لحد میں | بند آنکھ کے بیٹھے ہی بچا ہو کے صابر ایسے (نسیم دہلوی)

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا کہ قالب جاں کا گل | مدام آغوش میں تیکھے گریزاں ہی رہا (ذوق)

(۲) "آغوش کھول کر لینا" کی سند میں تقی لکھنوی کا یہ شعر لکھا ہے:

ہوگئی ہے قرار تہ صدمہ موج | دوڑی آغوش کھول کر ہر موج

صاف ظاہر ہے کہ یہ شعر "آغوش کھول کر لینا" کی سند نہیں ہو سکتا۔ امیر اللغات وغیرہ لغات میں "آغوش کھول کر لینا" درج نہیں، ہاں "آغوش کھول کر ملنا" ضرور درج ہے اور سند میں ناسخ کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

بساں ساحل دریا ہو مشکل چھوٹنا ناسخ | لپٹ جاؤں اگر میں کھول کر آغوش جاناں سے

امیر اللغات میں "آغوش سے نکلنا" کی سند میں داغ کا ایک شعر درج کیا گیا ہے، جس میں کاتب صاحب نے یائے معروف کی جگہ یائے مجہول لکھ دی ہے، جس سے تانیث تذکیر سے بدل گئی ہے۔ شعر یہ ہے:

جس طرح تم مرے آغوش سے نکلا اے شوخ | یوں ہی ہاتھوں سے نکلتی ہے طبیعت میری

"مری آغوش" ہونا چاہیے۔

۵۔ ایجاد:

لفظ ایجاد کی داستان خاصی دلچسپ ہے۔ اساتذۂ دہلی و لکھنؤ نے بالعموم اس لفظ کو بالاتفاق مذکر استعمال کیا ہے، لیکن متعدد تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس کی تانیث کے بھی قائل رہے ہیں، اگرچہ تانیث کی کوئی مثال[1] پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں گفتگو میں یہ تانیث رائج ہوگا، چونکہ بعض اساتذہ بالاتفاق اس کو مذکر مانتے رہے ہیں، اس لیے بہ تذکیر نظم کرنے کی جرأت نہیں کی گئی۔ اس سے زیادہ دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ جس لفظ کو دونوں دبستانوں کے اساتذہ بالاتفاق مذکر مانتے ہیں، رفتہ رفتہ اس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا، یہاں تک کہ آج کل عام طور سے اس کو مونث استعمال کیا جاتا ہے۔

مفید الشعرا، آصفیہ، امیر اللغات اور ارمغان میں ایجاد کو صرف مذکر لکھا گیا ہے۔ اختلاف کا مطلق ذکر نہیں۔ صفیر نے رشحات میں اس کو مذکر لکھ کر مزید صراحت کی ہے: "مولف کہتا ہے کہ ایجاد جو مونث مشہور ہے، اس کی سند مجھے ابھی تک نہیں ملی" (ص ۱۵۱) آگے چل کر مزید لکھا ہے: "عوام میں ایجاد کا لفظ مونث مستعمل ہے، حالانکہ مذکر ہے۔" (ص ۲۲۲) مولف نور اللغات نے بھی اس کو مذکر لکھا

---

(۱) مولف مصباح الشعرا نے ایجاد کو مذکر لکھ کر حاشیے میں یہ صراحت کی ہے کہ منشی امیر اللہ تسلیم نے اسے مونث بھی نظم کیا ہے اور سند میں تسلیم کا یہ شعر لکھا ہے: دشمن اعدا سے کیا تسلیم خستہ کو شہید / دیکھیے ایجاد اس ترک ستم ایجاد کی۔ لیکن مولف کا یہ خیال صحیح نہیں۔ حضرت مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کے مکتوب سے معلوم ہوا کہ اس غزل کی ردیف "کی" کے بجائے "کا" ہے۔ یعنی مذکورہ مصرع درحقیقت اس طرح ہے: دیکھیے ایجاد اس ترک ستم ایجاد کا۔ تسلیم کی یہ غزل ان کے دیوان موسوم بہ نظم دل افروز میں ص ۲۰۹ پر ہے۔

ہے، البتہ یہ صراحت کر دی ہے کہ "بعض حضرات کی زبان پر یہ لفظ مونث ہے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب رشحات کی تحریر کے برعکس، بعض خواص بھی اس کو گفتگو میں مونث استعمال کرتے تھے۔

امیر مینائی نے امیر اللغات میں تو اختلاف کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، البتہ ایک خط میں اس کی صراحت کی ہے:

"ایجاد مذکر ہے۔ اس لفظ کی تانیث و تذکیر میں بحث چھڑی ہوئی ہے...... سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ کا قول ہے کہ دلی میں مونث ہے۔ مگر کلام میں مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہوتا، تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے۔ اور بغیر کلام میں آئے ہوئے، کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں۔" (مکاتیب امیر مینائی ص ۱۴۲)

ان تصریحات سے یہ بہر طور ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تانیث بھی معرض بحث میں رہی ہے۔ یہاں پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ امیر نے داغ سے جو قول منسوب کیا ہے۔ وہ صحیح نہیں۔ معلوم نے امیر کو یہ غلط اطلاع کہاں سے ملی، جس کو انھوں نے مان بھی لیا۔ داغ قطعیت کے ساتھ اس کی تذکیر کے قائل تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد مولانا احسن مارہروی کو ایک خط میں لکھا ہے:

"ایک اشتہار اس گلدستے میں آپ چھاپ دیجیے کہ اکثر استاد کے شاگرد، بجائے خود استاد بن کر، اپنی غزلیں بے اصلاح چھپوا دیتے ہیں، اس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کسی نے لفظ ایجاد اور ارشاد کو مونث باندھا، حالانکہ اہل دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔" (انشائے داغ ص ۱۳۳)

مختصر یہ کہ ایجاد کو اساتذۂ دہلی و لکھنؤ بالاتفاق مذکر مانتے آئے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ اس سلسلے میں داغ کے شاگرد رشید مولانا احسن مارہروی کے دو اقتباسات قابل توجہ ہیں، جن سے اس رجحان کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

احسن صاحب نے، داغ کے خط کے جواب میں لکھا ہے:

"میری غزل میں ایجاد کہیں مونث نہیں ہے اور نہ میں نے لکھا۔ غالباً حضور نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ میاں احسن شاہجہاں پوری نے مونث لکھا ہے، جس کی اگلے پرچے میں تصحیح ہو جائے گی۔ مولوی عبدالحی بیخود نے ایجاد کو مونث لکھا ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ ایسے کہنہ مشق بھی، ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں۔"

یہی مولانا احسن، ایک زمانے کے بعد، اپنی کتاب تاریخ نثر اردو میں لکھتے ہیں:

"لفظ ایجاد، کہ اس کو تمام باعزت شعرائے دہلی و لکھنؤ نے مذکر استعمال کیا ہے۔ لیکن اب چند شعرا کے سوا، اس کی تذکیر پر ہر شخص کو تامل ہے۔ یہی حال لفظ فہم وغیرہ کا ہے۔" (ص ۳۵۸)

جناب اثر لکھنوی نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا ہے:

"ایجاد اور اپیل میری زبان پر مونث ہیں، مگر اس کے برخلاف بھی سنا ہے۔ تذکیر و تانیث کے لحاظ سے مختلف فیہ کہنا مناسب ہوگا۔" (مکتوب اثر بنام راقم الحروف)

میں نے بالعموم اس کو مونث سنا ہے اور آج کل کی تحریروں میں بھی مونث دیکھا ہے۔ مثلاً - زبانوں کا سیکھنا سکھانا، جدید زمانے کی ایجاد

ہے۔" عبدالحق صاحب (قواعد اردو ص ۲) "امریکہ کی ایک نئی ایجاد" سب کہتے ہیں، یہ کوئی نہیں کہتا کہ "امریکہ کا ایک نیا ایجاد"۔
چونکہ اس کو اساتذہ نے مذکر استعمال کیا ہے اس لحاظ سے اس کو مشترک الفاظ میں شامل کرنا چاہیے لیکن اس صراحت کے ساتھ کہ آج کل یہ عام طور سے مؤنث استعمال کیا جاتا ہے۔

۶۔ املا :

جلال نے مفید الشعرا میں اس کو مختلف فیہ لکھا ہے :

"املا مختلف فیہ ہے، یعنی مذکر و مؤنث دونوں طرح بولا جاتا ہے، لیکن مذکر بیشتر اور مؤنث کم تر، جیسا کہ رشک مغفور مؤنث فرماتے ہیں ؎

نامہ جاناں ہے کیا لکھا مری تقدیر کا — خط کی انشا اور ہے لکھنے کی املا اور ہے

اور مؤلف اس کی تذکیر ہی کا قائل ہے۔"

رشک[1] کے دونوں مطبوعہ دواوین میں یہ شعر اور کہیں اس طرح نہیں آیا ہے کہ تذکیر یا تانیث کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہی جا سکے۔ اہل لغت بھی اس سلسلے میں مختلف الرائے ہیں۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس کو صرف مذکر لکھا ہے، تانیث کا مطلق ذکر نہیں کیا ——— مولف فصیح اللغات[2]

---

(۱) میر علی اوسط رشک لکھنوی، تلمیذ ناسخ، متوفی ۱۲۸۴ھ (کلیات تیز شکوہ آبادی) محاورات زبان و قواعد شاعری میں یگانہ تھے۔ عہد ناسخ سے منسوب بہت سی اصلاحات زبان و قواعد کے واضع در اصل رشک تھے (آب حیات ذکر ناسخ)۔ رشک کے دو دیوان ایک ہی جلد میں چھپے تھے۔ ایک کا نام "نظم مبارک" ہے اور دوسرے کا "نظم گرامی"۔ یہ تاریخی نام ہیں۔ یہ مجموعہ ان کی زندگی ہی میں ۱۲۶۳ھ میں چھپا تھا۔ ایک دیوان متن میں ہے، دوسرا حاشیے پر۔ تیسرا دیوان جو ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا (دیباچہ نفس اللغۃ) شائع نہیں ہو سکا۔ اس کا ایک نسخہ پاکستان میں ہے اور ایک آزاد لائبریری علی گڑھ میں (حواشی تذکرۂ ابن امین اللہ طوفان ص ۲۲)

(۲) داغ کے عزیز شاگرد مولوی احسن مارہروی نے اس لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا تھا۔ بقول مولوی احسن "اول اول تو حضرت مرحوم (داغ) کو اس کتاب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی۔ مگر رفتہ رفتہ جب میرے شوق اور خلوص عقیدت کا اندازہ فرمایا تو اس کتاب کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ایسی توجہ فرمائی کہ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، احسن ہے اور فصیح اللغات، فصیح اللغات ہے اور احسن" (مقدمہ یادگار داغ)۔ داغ کا خیال یہ تھا کہ اس طرح "زبان دہلی" کا ایک صحیح مفصل مرتب ہو جائے گا۔ فرہنگ آصفیہ بھی زبان دہلی کا گنجینہ ہے۔ لیکن مولف آصفیہ کے متعلق داغ کی جو رائے تھی، وہ مولوی عبدالرزاق کانپوری (مولف البرامکہ) کے اس بیان سے معلوم ہوگی۔ مولوی صاحب نے دہلی دربار کے موقع پر داغ سے ملاقات کی تھی، اس کا حال لکھتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے :
"میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگ آصفیہ لکھی ہے، تحقیقات لغات اور محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ سید احمد عرب سرائے کے باشندے تھے۔ اور یہ کہ

نے بھی اس کو مذکر لکھا ہے، اور جلال کے علی الرغم نے اس کی نفی کی ہے کہ فصحا اس لفظ کو دونوں طرح بولتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے :

"یہ لفظ اور قصبوں کی بول چال میں بحالتِ تذکیر و تانیث، دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے۔ مگر اب تک شعرائے متقدمین و متاخرین میں، رشک لکھنوی کے سوا، اور کسی کے کلام میں املا کی تانیث نہیں پائی گئی۔" (فصیح الملک۔ مئی ۱۹۰۹ء)

صفیر نے رشحات میں اس کو صرف مختلف فیہ لکھنے پر اکتفا کی ہے۔ مولفینِ امیر اللغات و نور اللغات و معین الشعرا نے اس کو مذکر لکھ کر، یہ صراحت کر دی ہے کہ صرف رشک نے اسے مونث لکھا ہے [یہ واقعہ ہے کہ رشک کے مذکورہ شعر کے علاوہ، اور کوئی مثال اس کی تانیث کی نہیں پیش کی جا سکی ہے] یہی بات نفس اللغۃ کے دیباچہ نگار نے لکھی ہے : "یہ لفظ عموماً زبانوں پر تذکیر کے ساتھ ہے ..... لیکن رشک نے مونث باندھا ہے۔" گویا ان سب حضرات کے نزدیک اس کی تذکیر مرجح ہے، اور یہ کہ رشک کا شعر، از قبیل شاذ ہے۔ ان میں سے کسی نے جلال کی طرح یہ نہیں لکھا کہ یہ لفظ مونث بھی بولا جاتا ہے۔ (کمتر سہی) اس سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بھی یہ لفظ بہ تانیث مستعمل نہیں تھا۔

لیکن صاحبِ رسالۂ تبصرہ نے اسے مختلف فیہ لکھ کر، مونث کو مرجح لکھا ہے۔ اس کے علاوہ، مرزا غالب کی ایک تصنیف میں بھی یہ لفظ بہ تانیث موجود ہے : "املا، اہلِ ہند کی املا کے موافق رہی۔" (تیغ تیز۔ مطبوعۂ اکمل المطابع۔ ص ۲۴)

صاحبِ رسالۂ تبصرہ کے اس قول، اور مرزا صاحب کے اس جملے سے، جلال کے اس قول کی مکمل تائید ہوتی ہے کہ یہ لفظ دونوں

(بقیہ) کر خاموش ہو گئے۔ مکرّر سوال کرنا میں نے بھی ادب کے خلاف سمجھا۔" (یادِ ایام ص ۲۵۴) یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ مرحوم سراج پرانی دہلی کے باہر ہے۔ اس سے داغ کی رائے کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مولوی صاحب موصوف کو اہلِ زبان میں سے نہیں سمجھتے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ لغت مکمل نہ ہو سکا۔ حیدر آباد کے ایک پریس میں اس کے کچھ اجزا چھپے بھی تھے، لیکن معلوم نہیں کیا ہوئے۔

مولانا احسن نے مئی ۱۹۰۹ء سے رسالۂ فصیح الملک جاری کیا (مقتدر یادگارِ داغ) اس لغت کے کچھ اجزا اس میں شائع ہوئے تھے۔ اب اس رسالے کے تمام شمارے بھی یکجا بہ مشکل ملیں گے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے۔ داغ اس لغت کے لیے سند کے اشعار خاص طور سے کہتے تھے۔ اگر یہ مکمل ہو جاتا تو واقعی کام کی چیز ہوتا۔ صولت پبلک لائبریری رام پور میں اس کے کئی سال کے شمارے محفوظ ہیں۔

۵؎ یہ رشک کا مصنفہ ہے۔ اس کا نام تاریخی ہے۔ اس کا صرف حصۂ اول، ان کی موت کے بعد نیّر پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ یہ صرف حرف ت تک ہے۔ باقی حصوں کا پتا نہیں چلتا۔ امیر مینائی نے ایک خط میں، لفظ مسالا کے ذیل میں، اس لغت کی ایک عبارت درج کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت مکمل ہو چکا تھا اور اس کا مخطوطہ امیر کی نظر سے گزرا تھا۔ امیر کا یہ خط، مکاتیبِ امیر مینائی (مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب) میں شامل ہے۔ جلال، رشک کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے لغت گلشنِ فیض میں، نفس اللغۃ کی بہت سی عبارتوں کو شامل کر لیا ہے اور کہیں حوالہ نہیں دیا۔ نفس اللغۃ کا دیباچہ نشتر لکھنوی نے لکھا ہے، جس میں بہت سی کام کی باتوں کو یکجا کر دیا ہے۔

طرح مستعمل تھا، البتہ [illegible] زیادہ تر مونث کہتے۔ رشک کا مذکورہ شعر اگر قابلِ استناد (تانیث کے لیے) نہ مانا جائے (جس کی بحث آگے آئے گی) تب بھی اس کی تانیث ثابت رہے گی اور اس میں دہلی و لکھنؤ کی تخصیص نہیں ہوگی۔

مختصر یہ کہ بیشتر اساتذۂ دہلی و لکھنؤ کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ املا مذکر ہے۔ ارباب لغت نے رشک کے مذکورہ شعر کو قبیلِ شاذ مانا ہے۔ لیکن مؤلف فصیح اللغات کی طرح یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہوگا کہ یہ لفظ محض نا واقفوں کی بول چال میں بہ تانیث مستعمل تھا۔ ایک گروہ مختصر اس کی تانیث کا قائل تھا۔ اور یہ لوگ بھی اُتنے ہی معتبر تھے جتنے دُوسرے گروہ کے لوگ۔ یہ بات جلال کی صراحت سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ البتہ آج کل بالعموم مذکر بولا جاتا ہے شاید ہی کوئی شخص اب اسے بہ تانیث استعمال کرتا ہو۔ کم از کم میری نظر سے ایسی کوئی مثال نہیں گزری۔ نہ مونث بولتے ہوئے سُنا۔

اس بحث کے بعد، یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کیا رشک کے اس شعر کو تانیث کی سند میں پیش کیا جا سکتا ہے؟

لفظ صاد کے ذیل میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ایسے اشعار جن میں غلط الکاتب کا احتمال ہو سکتا ہو، فائدۂ استناد نہیں دیتے۔ جب تک کسی شعر میں زیرِ بحث لفظ اس طرح نہ نظم ہوا ہو کہ قطعیت کے ساتھ اُس کو بطورِ سند پیش کیا جا سکے، اُس وقت تک اُس شعر کو نہ سند میں پیش کیا جا سکتا ہے نہ قبول کیا جا سکتا ہے ——— رشک کے اس شعر کی یہی صورت ہے۔ اس میں لفظ املا کی تانیث کی "بنیاد" "کی" پر ہے۔ یہ مصرع یوں بھی ہو سکتا ہے ؎

خط کی انشا اور ہے لکھنے کا املا اور ہے۔

ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ رشک نے درحقیقت کیا لکھا تھا۔ حقیقی صورتِ حال کچھ بھی ہو، مُسلّماتِ قواعد اور مُختاراتِ اربابِ فن کے اعتبار سے، اس شعر کو بہ طورِ سند نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اس شعر سے تانیثِ املا کی سند لینا، بالکل ایسی بات ہے جیسے اربابِ لغت اور بعض دُوسرے حضرات نے "مثنوی گلزارِ نسیم" کے ایک شعر سے (جو صاد کی بحث میں مذکور ہوا ہے) محض اس بنا پر کہ "صاد آنکھوں کی" چھپا ہوا ہے، صاد کی تانیث فرض کر لی۔

مجھے تعجب اس پر ہے کہ جلال نے اس شعر کو کس طرح بطور سند قبول کر لیا؟ جب کہ وہ اس کے قائل تھے کہ ایسے مواقع پر محض "کا" "کی" سے تانیث و تذکیر کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے لفظ رقم کے ذیل میں اس کی صراحت بھی کر دی ہے:

"ہندسے کے معنی پر رقم کو جناب مرزا داغ مرحوم نے مذکر فرمایا ہے ؎

ہمارے رزق کا ہے فردِ قسمت میں رقم خالی ہمیشہ صفر کے مانند رہتا ہے شکم خالی

حالانکہ رقم بمعنی مذکر، بالاتفاق مونث بولا جاتا ہے۔ پس مؤلف مستام کہتا ہے کہ عجب نہیں ہے کہ اصل میں یہاں "کی" ہو۔ اور کاتب نے "کا" لکھ دیا ہو۔"

ستیفر کی بھی اس سلسلے میں یہی رائے تھی کہ ایسے مقامات پر محض کا یا کی سے فائدۂ استناد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی عبارت لفظ صاد کے ذیل میں پیش کی جا چکی ہے۔ لیکن دونوں حضرات نے رشک کے اس شعر کو قبول کر لیا کسی اختلاف کے بغیر۔ حالانکہ اس کی بھی بالکل وہی صورت ہے۔

ہندستان میں ایک دل چسپ مشغلہ ہے : اس میں مفرد لفظ املا درج نہیں۔ البتہ "املا و انشا" درج ہے، گویا یہ مرکب امتزاجی ہے ! مولف نے اس مرکب کو مونث لکھ کر، سند میں رشک کا زیر بحث شعر درج کیا ہے۔ موصوف نے املا کی مسلمہ تذکیر کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ مہذب اللغات میں، املا کو مذکر لکھا گیا ہے۔ مولف نے اس کے بعد یہ صراحت کر دی ہے کہ "رشک اور اختر (شاہ اودھ) نے مونث بھی نظم کیا ہے، لیکن موجودہ دور میں مذکر ہی ہے "۔ تانیث کی سند میں رشک کا زیر بحث شعر اور واجد علی شاہ کا یہ شعر لکھا ہے:

محو یہ بھی نکلا سراپا غلط   تھی انشا غلط اور املا غلط

مولف مہذب اللغات کا یہ خیال ہرگز صحیح نہیں کہ اختر کے اس شعر سے املا کی تانیث ثابت ہوتی ہے۔ اس شعر سے نہ تانیث ثابت کی جاسکتی ہے نہ تذکیر۔ مصرع ثانی میں یہ لازم نہیں ہے کہ "تھی" کا اطلاق املا پر بھی ہو ——— مولف نے اسی ذیل میں مزید لکھا ہے: "املے کی کاپی، املے کا قلم وغیرہ رائج ہیں "۔ لفظ املا میں امالہ روا نہیں۔ ورنہ پھر "انشے کی کاپی" بھی لکھا جاسکتا ہے۔

مفید الشعرا میں رشک کے مذکورہ شعر کا مصرع اول اس طرح ہے ؏

نامۂ جاناں ہے کیا تمھاری تقدیر کا

اس رسالے کے جو اڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں، ان میں اسی طرح ہے۔ رشک کے دیوان میں "یا تمھاری تقدیر کا" ہے۔ (ص ۲۵۵)

ادب اور زندگی کا تعلق

ڈاکٹر گیان چند

ادب اور زندگی کا تعلق اتنا واضح نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ایک عرصہ ہوا ابو اللیث صدیقی نے ۱ پر جو کتاب لکھی تھی اس میں پہلا باب تاریخی پس منظر کا تھا کیونکہ میری تحقیقی و تنقیدی سلسلے میں یہ سیاسی پس منظر دکھانے کی پہلی کوشش تھی۔ 'لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' اور 'دلی کا دبستانِ شاعری' بھی اسی موضوعات سے شروع ہوتے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے 'میر۔ حیات اور شاعری' لکھی تو کتاب کا کافی حصہ میر کے زمانے کے تاریخی حالات کی نذر کر دیا۔ پھر کیا تھا ہر مقالہ نگار کو ایک سہل سا نسخہ مل گیا کہ کتاب کی ابتدا میں دلی اور لکھنؤ کی وہی تاریخ دہرا دی گئی جو سو بار پڑھ چکے ہیں۔ وہی غلام قادر روہیلے کا شاہ عالم کی آنکھیں نکالنا۔ وہی نصیر الدین حیدر کی جلسہ بازیاں اور وہی جان عالم پیا کا پری خانہ سجانا۔ اودھ پنچ کے طنز نگاروں نے مسدسِ حالی پر اکبری ٹکسال کی زبان کی فقرہ چست کیا تھا:

جناب مصنف نے جغرافیے کا تو خاتمہ کر دیا ہے۔ مسدس یاد کر و اور انٹرنس کا امتحان پاس۔ کوئی کتاب ہے کہ علم تاریخ میں تو ماکرو وہ جلد ہے کہ ہسٹری آف گریس اور ہسٹری آف روم تو گیا گھر کی زندگی ہے۔

ان مقالوں کے پہلے باب پر بھی یہی پھبتی چست ہوتی ہے اب تو یہ عالم ہے کہ تحقیقی مقالہ لکھنے والوں کو تاریخی پس منظر لکھنے کے لیے تاریخوں کی ورق گردانی بھی نہیں کرنی پڑتی۔ اب تک کے شائع شدہ مقالوں ہی سے کافی سامان مل جاتا ہے۔

تنقید کو بعض کلچرل ہسٹری آف انڈیا بنا دینا اس وقت تک بے سود ہے جب تک کہ ان واقعات کا زیرِ بحث صنف یا مصنف سے تعلق روشن نہ کیا جائے۔

آرٹ برائے آرٹ کی رسم اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود آرٹ لیکن ایک نظریے کی صورت میں اسے سب سے پہلے اٹھارویں صدی کی ابتدا میں فرانس کے وکٹر کزن نے L'art pour l'art کے فقرے سے ادا کیا۔ اس کے برعکس انگلستان میں میتھو آرنلڈ نے ادب کو زندگی کی تنقید قرار دیا۔ اردو میں ادب برائے زندگی کا نعرہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بلند ہوا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اعلان کیا:

۱۔ یہ اعتراض مجھ پر بھی صادق ہوتا ہے کیونکہ میں کے ڈی لٹ کے مقالے 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' میں بھی یہ باب ہے۔ ابتدا میں میں نے اسے بہت مختصر لکھا تھا لیکن ایک ممتحن نے اعتراض کیا کہ تاریخی پس منظر کو اور مفصل ہونا چاہیے تھا۔ مجبوراً میں نے بھی اسے بڑھایا لیکن سیاسی واقعات کی بجائے سماجی اور معاشی حالات پر زیادہ زور دیا۔ ۲۔ ادب اور انقلاب۔ ص۔ ۰۔ دوسرا ایڈیشن۔

تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے۔"

مولوی عبدالحق[علا] نے بھی شہادت دی۔

"ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچر سی کہانی ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا ایک آئینہ ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔"

سوال پیدا ہوتا ہے: کیا اچھا ادب وُہی ہے جو زندگی کی آئینہ داری کرے یا اس سے بھی بڑھ کر زندگی کی اصلاح کرے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں دریافت کرنا ہے کہ

زندگی ادب کو کس حد تک متاثر کرتی ہے؟

ادب زندگی کو کس حد تک متاثر کرتا ہے؟

زندگی کے معنی کیا ہیں؟ جتنے ذی رُوح ہیں ان سب کو ملا کر زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے جذبات و خیالات کو بھی زندگی کا جزو قرار دیا جائے گا کیونکہ ان کا چشمہ زندگی ہی سے اُبلتا ہے۔ تو وہ تخلیقیں جن میں کسی جاندار کا بالواسطہ بھی ذکر نہ ہو زندگی سے معرّا سمجھی جائیں گی کہ نہیں مثلاً:

گلابی سا ہو جانا دیوار و در — درختوں سے آنا شفق کا نظر
وُہ چادر کا چھٹنا وُہ بادل کا زور — ہر اک جانور کا درختوں پہ شور
وُہ سرو سہی اور آبِ رواں — وہ پانی کا مستی سے بہنا وہاں

(مثنوی میر حسن)

یا

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ — پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

(اقبال ۔ ایک آرزو)

ان اشعار میں زندگی نہیں فطرت ہے لیکن ان کے حسن میں شبہ نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے بغیر بھی ادب پارے میں حسن ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ استثنائی صورتیں ہیں۔ یہ نظموں کے اقتباس ہیں۔ ان کے پہلے اور بعد کے اشعار زندگی سے خالی نہیں۔

اگر زندگی کو محض ذی روحوں کے تذکرے کے مترادف قرار دیا جائے تو وہ کون سا ادب پارہ ہے جو اس وسیع حصار میں نہ سما سکے۔ طلسم ہوش رُبا اور مثنوی گلزار نسیم میں بھی زندہ کرداروں کا ذکر ہے لیکن ادب برائے زندگی کے نظریے کا کوئی مبلغ ان سے آسودہ نہیں۔ انہیں زندگی کا آئینہ دار نہیں قرار دیا جاتا۔ شاید ان کے فوق فطری کردار ان داستانوں کو زندگی کی بارگاہ

علا افکار عبدالحق ص ۲۰

سے خارج کر دیں تو ہمارے پاس ایسی داستانیں بھی ہیں جو ہمیں کوئی ذوقِ نظر کا منظر نہیں دکھاتیں باغ و بہار کے چاروں درویش کی سیر یا الف لیلہ میں سوتے جاگتے کی کہانی یا قصہ حدیث دگر۔ نئے ادیب انھیں بھی زندگی آمیز اور زندگی آموز نہیں مانتے۔ ان میں کسی نہ کسی زمانے کی زندگی کا تو ذکر ہے ہی۔ غالباً ادب کو زندگی کا آئینہ کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ادب ہم عصر زندگی کا آئینہ ہو کبھی گئے گزرے ماضی کا نہیں۔ چنانچہ اختر رائے پوری کہتے ہیں:

'ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے'[1]

اس میں پہلی قباحت تو یہ ہے کہ اپنے ماحول کی ترجمانی کا مطالبہ ادیب سے تاریخی ناول اور نظمیں لکھنے کا حق چھین لیتا ہے۔ اس سے قطع نظر ہم عصر زندگی کی محض ترجمانی سے بھی بات نہیں بنتی۔ واسوخت امانت، مثنوی بہارِ عشق اور دیوانِ جان صاحب اپنے عہد کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری میں شبہ نہیں پھر بھی انھیں سراہا نہیں جا سکتا۔ مجنوں گورکھپوری نے سوال اٹھایا۔

'کیا ادب کے معنی صرف زندگی کی تکرار یا نقل کے ہیں۔ اگر زندگی کے محض اعادہ یا مثنیٰ کو ادب کہتے ہیں تو پھر اصل اور مثنیٰ میں کیا فرق ہے اور اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے۔ ادب یا حسن کاری اگر زندگی کی محض ایک سادہ نقل ہے تو یقیناً ایک فعل عبث ہے جو زیادہ سے زیادہ تفریح کا ذریعہ بن سکتا ہے'[2]

احتشام حسین نے اس کا جواب دیا۔

'چونکہ ادب ہوائی قلعہ بنانے کا کام نہیں ہے اس لیے شاعر اور ادیب کا کام یہیں نہیں ختم ہو جاتا کہ وہ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا ہے وہی لکھ دے بلکہ وہ جس طرح محسوس کرتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے اس کا اظہار بھی کرے۔'[3]

بھارتیہ ساہتیہ پرشد ناگپور کے تاریخی اجلاس اپریل ۱۹۳۶ء میں جو اعلان نامہ پنڈت جواہر لال نہرو، منشی پریم چند، ڈاکٹر عبد الحق اور اختر رائے پوری وغیرہ کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا اس میں کہا گیا تھا

'کیا آج جب ترقی اور پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے ادب اپنے کو غیر جانبدار رکھ سکتا ہے؟ .... اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو شاید کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو .... زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔'

واسوخت امانت اور بہارِ عشق یہ فریضہ سر انجام نہیں دیتیں۔ انھیں پڑھ کر کسی ذکی الحس قاری کے دل میں جنسی ظلم کے خلاف جذبات ابھر آتے ہیں تو یہ مصنف کے منشا کی وجہ سے نہیں۔ لیکن اس کوتاہی کا الزام صرف انھیں کتابوں پر کیوں رکھا جائے؟ باغ و بہار، فسانۂ عجائب، مثنوی میر حسن، گلزارِ نسیم، قصائدِ ذوق، دواوینِ میر و غالب چند منتخب اشعار کے سوا نہ سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوتے ہیں نہ سماج کو بدلنے کا اشارہ کرتے ہیں لیکن ہم انھیں ٹھکرا نہیں سکتے سو نتیجہ نہیں توڑ سکتے۔ ان سے بھی آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو عہد عتیق اور عہد وسطیٰ کے عظیم عالمی شاہکار بھی بیکاری، افلاس اور ظلم کے خلاف تیغ بکف نہیں نظر آتے

---

[1] ادب اور انقلاب ص ۱۱ [2] ادب اور زندگی [3] تنقیدی جائزے ص ۸۵ طبع سوم

...یڈ، اوڈیسی، شاہنامہ، کالیداس اور شیکسپیر کے ڈراموں میں سماج کو بدلنے کا جذبہ کوئی خاص نمایاں نہیں۔ جاگیرداری دَور کی ان
...داروں کو پرکھنے کے لیے ہم اپنے معیاروں کو نہیں بدل سکتے چنانچہ اختر رائے پوری نے کالیداس، تلسی داس، ٹیگور اور اقبال سب کو
...بت پرستی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

ماضی کے ادب عالیہ نے ترقی پسند نقادوں کو عجیب دُبدھا میں ڈال دیا۔ اُنھوں نے اچھے ادب کے لیے جو اصول و معیار قائم
...یے تھے وہ ان شاہکاروں کے سامنے دم توڑ دیتے تھے لیکن اب ان شاہکاروں کی عظمت اتنی مُسلّم ہے، ان کے بقائے دوام پر صدیوں
...ایسی اَمِٹ مُہر لگ چکی ہے کہ جو نظریۂ ادب ان سے مُنکر ہو اس نظریے کو ناقص ٹھہرایا جائے گا اس لیے ترقی پسند نقاد ادب عالیہ کو اپنانے
...مجبور ہوئے۔ سردار جعفری نے 'ترقی پسند ادب' میں اختر رائے پُوری کے اعتراضات سے انحراف کیا اور تسلیم کیا کہ ماضی کا عظیم ورثہ ہمارا
...تی سرمایہ ہے؛ اُنھوں نے کالی داس، شیکسپیئر، ٹیگور، میر، غالب، اقبال سب کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کیا۔

اپنا موضوع ترقی پسندی نہیں۔ صرف یہ اشارہ کرنا مقصود تھا کہ ادب کے وہ شاہکار بھی عظیم ہیں جو زندگی اور سماج کے معاشی حالات
...بہتر بنانے کے مدعی نہیں اور اس کا اعتراف ترقی پسندی کے سرکاری ترجمان بھی کرتے ہیں۔

اب تین طرح کی تخلیقات ملاحظہ ہوں۔ اوّل وہ ہیں جن میں زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش بھی ہے اور جمالیاتی پہلو بھی خاطر خواہ
...ہے مثلاً

شہانِ کج کلہ پر تنگ ہے عالم کی پہنائی
درِ دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شانِ دارائی

جہاں بانی دہکتی آگ ہے گرتی ہوئی بجلی
ہمیشہ اُس نے دُنیا میں کیا دردِ محن پیدا

ہزاروں تجربوں کے بعد اب انساں یہ سمجھا ہے
کہ شاہی سے نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا

نہ ہو چینِ جبیں جب تک جبینِ شہریاری پر
نہیں ہوتا کلاہِ خسروی میں بانکپن پیدا

سُن اے غافل کہ تا روزِ قیامت نسلِ شاہی سے
نہ ہوگا بزمِ انسانی کا صدرِ انجمن پیدا

(جوش۔ زوالِ جہاں بانی)

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار

جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب

خُون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہِ آفتاب

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

(جوش۔ کسان)

...کسی بھی پیمانے سے دیکھا جائے۔ ادب میں ان کا اعلیٰ مقام ہے اور رہے گا۔

دُوسری وہ تحریریں ہیں جن میں زندگی کو سنوارنے کی کوشش نہیں جو بعض نقادوں کے نزدیک رجعت پسندانہ بھی کہی جا سکتی
...ہیں لیکن جن کی حسن کاری میں کوئی شبہ نہیں مثلاً

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(غالب)

یہ نغمے یہ ترانے یہ شباب و شعر کا عالم

یہ آرائش مکانوں کی یہ زیبائش مکینوں کی

یہ رعنائی حسینوں کی یہ صحبت نازنینوں کی

یہ حوریں یہ بہاریں یہ شباب و شعر کا عالم

نہ لے جا خلد میں یارب یہیں رہنے دے تو مجھ کو

یہ دُنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

(دُنیا کی بہاریں۔ اختر شیرانی)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(درد)

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

(غالب)

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

(فانی)

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے — تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے

(جگر)

ان تخلیقات میں کہیں شکست ہے کہیں فرار، کہیں فقدانِ عمل ہے۔ کہیں افسردگی لیکن یہ انسان کے بنیادی جذبوں اور آفاقی تجربوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض پر ایک یا ڈیڑھ صدی گزر چکی ہے لیکن وہ ابھی تک تر و تازہ ہیں۔ حافظ و خیام کی شاعری کئی صدیاں دیکھ چکی ہے اگر اس کی بہار ابھی تک جواں ہے تو کیوں نہ ہم امید کریں کہ یہ ابھی اور کئی صدیوں تک وقت کے دھارے کی مزاحمت کر سکے گی۔ ادبیاتِ ماضی کے بیشتر کارناموں میں زندگی کو بدلنے کا کوئی جذبہ یا محرک موجود نہیں۔ نثر میں الف لیلیٰ، باغ و بہار، فسانۂ عجائب وغیرہ اسی طرح کی پُر جوش، رنگین تخلیقات ہیں جو ذہن پر چھا کر قلب کو مسرور کر دیتی ہیں۔

تخلیقات کی تیسری قسم وہ ہے جن میں زندگی کو بہتر بنانے کا سودا ہے لیکن جو شعریت کے حُسن سے عاری ہیں مثلاً

کام اچھا کرنا چاہیے نہ کہ بُرا

کام اچھا کوئی ہو گیا اگر انسان سے — اس میں کی تاثیر اس نے جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں — بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

حالی

غریبوں کی فاقہ کشوں کی صدا ہے
مرے جا رہے ہیں
امیروں کے عیشوں کا انبار سر پر
لدے ہیں زمانے کے افکار سر پر
زمیندار کاندھوں پہ سرکار سر پر
مرے جا رہے ہیں

(ڈاکٹر تاثیر ۔ غریبوں کی صدا)

اے مئے پندار سے مخمور اے سرمایہ دار — اے کہ ہے دولت پرستی تیرا بے مایہ شعار
اے کہ دولت ہی تری دنیا ہے اور دولت ہی دیں — اے کہ تو دولت کو ہے سمجھا ہوا پروردگار
زعم میں سرمایہ داری کے یہ وحشت یہ جنوں — قصۂ مزدور سننا بھی ہے تجھ کو ناگوار
خود بخود ہی تو نے دولت خون سے مزدور کے — اور پھر غم خواریٔ مزدور بھی ہے تجھ پہ بار
حقِ محنت اس کا دینے میں تجھے سو عذر ہیں — ہیں عرق جس کی جبیں کا تیرے دُرہائے شاہوار
اپنی عشرت گاہ میں تو محوِ خوابِ عیش ہے — اور مزدور اک شکستہ جھونپڑی میں بے قرار

(سیماب ۔ اے سرمایہ دار)

یہ تخلیقات گرد آلود کتابوں میں دفن ہیں۔ یہ زندگی آمیز بھلے ہوں لیکن خود اُن کی قسمت میں زندگی نہیں۔ ان کی پیدائش چند سال بعد ہی ان کا کوئی نام لیوا نہیں۔ زندگی اور سماج کو بہتر بنانے کی خواہش بڑا نیک جذبہ ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے یہ ادب کی حیاتِ ابدی کا ضامن نہیں۔ ہم لاکھ چاہیں کہ بہترین ادب وہی قرار دیا جائے جو ان طاقتوں کا ساتھ دے جو دُنیا سے ظلم کی بے انصافی کو مٹانا چاہتی ہیں لیکن زمانے کا فیصلہ کچھ اور ہے اور کہا گیا ہے کہ وقت بہترین منصف ہے۔

تلنگانہ میں کسانوں کی شورش ہوئی جھٹ ایک ناول لکھ دیا گیا۔ کوریا کی لڑائی ہوئی یا لومبا کی شہادت ہوئی ایک افسانہ وجود میں آگیا۔ ہندوستان پر چین کا حملہ ہوا تو قومی نظموں کا سیلاب آگیا گویا بارود کی جگہ یہ نظمیں ہی معرکہ سر کریں گی۔ ان ہنگامی موضوعات سے متعلق ہنگامی ادب کو اپنے دور میں ضرور داد و تحسین مل جاتی ہے لیکن کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ سو دو سال بعد اس قسم کی تخلیقات پڑھی جائیں گی۔ اگر نہیں تو انہیں ادب عالیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی مثال سینما کے ان چلتے ہوئے چٹپٹے گانوں کی سی ہے جو کچھ دن کے لیے ہر ریڈیو، ہر لاؤڈ سپیکر، ہر زبان پر شورِ قیامت مچا دیتے ہیں۔ یہ غلغلہ کوئی چار چھ ماہ تک رہتا ہے۔ اس کے بعد

داستانوں اور افسانوں کی مانند کتابوں کو اس طرح طاق نسیاں میں ڈال دیا جاتا ہے جیسے وہ کبھی تھیں ہی نہیں۔ اس کے مقابلے میں پچھلے دور کی کچھ اس طرح زبان زد عوام نہیں ہوتے لیکن ان سے [illegible] ہوتا رہے گا۔ زندگی کی سب سے بھرپور آئینہ داری روزانہ اخبار کرتا ہے لیکن اخبار ایک دن کے بعد ہی ایسا باسی، بے جان اور مردہ ہو جاتا ہے کہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں زندہ جاوید ادب عالیہ زندگی کا اتنا بڑا عکاس نہ ہوتے ہوئے بھی زندہ و پائندہ رہتا ہے۔

ادب کو زندگی کا آئینہ کہنے والے بیشتر نقاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ زندگی کو خارجی ماحول کا ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ زندگی میں مادی ماحول کی اہمیت مسلم ہے۔ ہم اکثر مسائل کو (سب کو نہیں) اپنے معاشی طبقے کے زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ادیب کے ذہن اور جذبات کی تعمیر و تشکیل میں ماحول بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے لیکن فن کار کی شخصیت کے خد و خال تنہا یہی متعین نہیں کرتا۔ آخر کیا بات ہے کہ میر اور سودا، انشا اور مصحفی، ذوق اور غالب، اصغر اور جگر ایک شہر ایک ماحول میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف تھے جتنے دو مختلف علاقوں دو مختلف زمانوں کے باشندے ہو سکتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ اجتماعی ماحول کے ساتھ ساتھ ہر شخص کا انفرادی ماحول بھی اتنا ہی اہم ہے لیکن یہ بھی انسانی ذہنیت کی پوری تاویل نہیں کر سکتا۔

کیا آپ نے ایسی مثالیں نہیں دیکھیں کہ دو حقیقی بھائیوں کے مزاج اور سیرت میں بُعد مشرقین ہے۔ دونوں ایک معاشرے کے جزو ہیں۔ دونوں کا انفرادی ماحول یکساں ہے لیکن خیالات یکساں نہیں۔ ایک خوش باش مجلس آرا تو دوسرا خلوت پسند فلسفی مزاج ہو سکتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا۔

شیخ جی کے دونوں لڑکے باہنر پیدا ہوئے — ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی چڑھے

بہت ممکن ہے دونوں کا ماحول مختلف ہو گیا ہو۔ دونوں مختلف قسم کے حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے ہوں لیکن دونوں کے مزاج اور کردار، پسند و ناپسند میں بھی ضرور فرق رہا ہو گا۔

سماجیات میں ایک بحث ہے کہ انسانی ذہن و کردار کی تشکیل میں ماحول زیادہ اہم ہے کہ وراثت۔ سماجیات کا موضوع چونکہ سماج ہے اس لیے وہ وراثت کو نظر انداز کر کے ماحول کے حق میں فیصلہ دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں علم الاجسام ([illegible]) ماحول پر وراثت کو ترجیح دیتا ہے۔ نسلی خصوصیات پر زور دینا مبالغہ ہے لیکن بالکل بے اصل بھی نہیں۔ شیخ محمد اکرام نے غالب نامے میں غالب کے کلام میں نسلی ذہنیت کے نقوش تلاش کیے۔

انگریزی کی کہاوت [illegible] بڑی حد تک سچ ہے۔ کسی تخلیق کا اسلوب مصنف کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ انشا ہنسوڑ تھے تو ان کی اکثر تخلیقات میں بھی وہی ہنسوڑ پن مسکراتا منہ چڑاتا دکھائی دیتا ہے۔ حالی نہایت شریف اور منکسر المزاج تھے تو ان کی تحریریں سادہ ہوتی ہیں۔ شبلی کا جمالیاتی ذوق بالیدہ تھا تو ان کا اسلوب بھی جمالی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ انسان کا مزاج ایسی پیچیدہ گتھی ہے کہ اس کے اعمال اور حرکات کا صحیح تجزیہ مشکل ہے۔ بعض انسان خلوت پسند ہوتے ہیں تو بعض گنبد افلاک میں غلغلہ برپا کر دینا چاہتے ہیں۔ بعض شقی القلب ہوتے ہیں تو دوسرے آنچہ بر خود نہ پسندی بہ دیگراں مپسند کو اپنا اصول حیات بنا لیتے ہیں۔ بعض اشخاص [illegible] کے قائل ہیں تو بعض ہمیشہ "ہے جستجو کہ خوب سے خوب تر

ماں کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ کسی کو جنس زدہ ([illegible]) یا سینے کی فستے داری اس کے خارجی ماحول پر ہی نہیں ہوتی۔ جذباتی شخصیت کی تشکیل کرنے والے عوامل کی تعیین موجودہ مقالے کا مقصد نہیں نہ راقم السطور کو اس کی صلاحیت ہے لیکن یہ طے ہے کہ شخصیت محض ماحول کی زائیدہ نہیں ہوتی اور ادب شخصیت کا انعکاس ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی دماغ میں مختلف جذبوں اور صلاحیتوں کے مختلف خطّے ہوتے ہیں۔ اعصابی نظام بعض غدّود اور ان کی رطوبتیں انسان کی داخلی شخصیت میں ترمیم کرتی رہتی ہیں۔ انسان کی نفسیاتی دُنیا محض شعور پر مشتمل نہیں اس میں تحت الشعور اور لاشعور بھی مصروف عمل ہیں۔ جوانی اور ضعیفی میں انسان کے مزاج، پسند و ناپسند اور رُجحانات میں جو تبدیلی ہوتی ہے کیا وہ خارجی ماحول میں تبدیلی کے باعث ہوتی ہے؟ نہیں ماحول اور معاشرے میں اکثر کوئی انقلابی فرق نہیں ہو جاتا ہاں جسم کی ساخت میں ضرور انقلاب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے شباب اور شیب کی ادبی تخلیقات کا رنگ جُدا جُدا ہوتا ہے۔ صحت مند اور مریض دُنیا کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔

اب تک کی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ :

> اگر 'ادب زندگی کا آئینہ ہے' کہہ کر زندگی سے خارجی ماحول مُراد لیا جاتا ہے تو یہ مکمل صداقت نہیں۔ 'ادب ماحول کا آئینہ ہے' سے بہتر صداقت ہے "ادب شخصیت کا آئینہ ہے۔" اور شخصیت کی تعمیر میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے لیکن یہ تنہا محرک نہیں۔

بحث کا دُوسرا رُخ یہ ہے کہ ادب زندگی کو کہاں تک متاثر کرتا ہے۔

حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں کچھ واقعات درج کیے ہیں کہ شاعر کی نظموں نے بدصُورت کنواریوں کی خانہ آبادی کرا دی۔ قبیلوں کو انتقام لینے پر اُکسا دیا اور غریب الدیار بادشاہ کے دل میں وطن کی یاد گُدگُدا دی۔ بعض تنقیدی مضامین میں یہ پڑھنے میں آتا ہے کہ نئی نسل شبلی سے (یا کسی اور سے) متاثر ہے تو ذہن میں یہی سوال اُبھرتا ہے کہ اس نئی نسل کے کتنے افراد ہیں جن تک شبلی کی رسائی ہو سکی ہے۔ شخصی حکومتوں کی بات دُوسری تھی بادشاہ یا رئیس جس شاعر کو نوازتے تھے عوام بھی اس کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ رسل و رسائل کے آج جیسے ذرائع تو تھے نہیں نتیجہ یہ تھا کہ نثری کتابوں کی اشاعت کم ہو پاتی تھی چونکہ نظموں کا یاد رکھنا آسان ہے اور وہ ولولہ انگیز بھی ہیں اس لیے زبان سے زبان پر گزر کر وہ دُور دُور تک پہنچ جاتی تھیں۔ آج جس کثرت سے کتابیں رسالے اور اخبار چھپتے ہیں ان میں منظومات کا حصّہ عشرِ عشیر بھی نہیں۔

ہمارے ملک کی آبادی میں پڑھے لکھوں کا تناسب ۲۰ فی صد سے زیادہ نہ ہوگا۔ ان میں اُردو پڑھے لکھے اور بھی تھوڑے ہوں گے۔ ان میں بھی ادبیات کا مطالعہ کتنے آدمی کرتے ہیں۔ حکومت اور سیاسی پارٹیوں کے پاس پروپیگنڈے کے کتنے وسائل ہیں ریڈیو۔ اخبار و ستاویزی فلمیں وغیرہ۔ ہم پر دن رات اس پروپیگنڈے کی بوچھار ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے عقائد اسی سے تشکیل پاتے ہیں۔ اُردو پڑھنے والے بھی کوئی مستثنیٰ مخلوق نہیں ان کی محبت و نفرت کے معتقدات کی تشکیل میں اقبال و جوش، نیاز اور کرشن چندر کی تحریروں کا زیادہ اثر ہوگا یا روزنامہ اخبار اور ریڈیو کا۔ ہم اخبار میں پڑھتے ہیں کہ امریکہ میں گورے نوجوانوں کی ایک عجیب جیشوں پر گولیوں کی

پوچھا کرتے ہیں کہ گنگا جمنی یا افریقہ سے ہندوستانیوں کو نکالا جا رہا ہے تو ہمارے دماغ کا درجۂ حرارت ایک سو دس ڈگری پر پہنچ جاتا ہے۔ ادب اتنا مُردہ اثر کہاں۔

آج کی زندگی بڑی پیچیدہ ہے۔ ادیب لاکھ اپنے منہ میاں مٹھو بنیں کہ وہ زندگی کو دیں جنت بنا رہے ہیں اور دین استبداد و بربریت کی طاقتوں کے خلاف برسرِ جنگ ہیں لیکن واقعتاً سماجی زندگی کا رُخ متعین کرنے میں ان کی حیثیت پہاڑ پر چیونٹی یا سمندر میں قطرے سے شاید ہی زیادہ ہو۔

جنگ آزادی میں شاعر انقلاب نے اپنی نظموں میں غلامی کے خلاف کیا کیا جھلاہٹیں اور جھنجھلاہٹیں نکالیں ع اے ہند کے ذلیل غلامان روسیاہ اور ... نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں ——— وغیرہ۔ ان سے پوچھا جا سکتا تھا کہ حضرت ان کوسنوں سے کہیں آزادی مل سکتی ہے۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے کچھ کیجئے کوئی راہ عمل بتائیے کہ بدیسی حکومت سے کیونکر گلو خلاصی ہو۔ اور کرنے والے کر رہے تھے۔ ان کی جدوجہد اور قربانیوں نے آزادی دلائی۔ جوش اور دُوسرے ادیبوں کی تخلیقات سے اس کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق پڑتا نہیں دکھائی دیا۔ ملک کی آزادی اور تقسیم جوش و اقبال کی مرہونِ منت نہیں بلکہ مختلف سیاسی تحریکوں کی آویزش اور سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔

ملک کا سماجی اور معاشی ارتقا کس جہت میں ہوگا یہ نہ ادیبوں کے ناول طے کرتے ہیں نہ شاعروں کی نظمیں۔ یہ سیاسی پلیٹ فارم اور تکنیکی ماہروں کا میدان ہے۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند ——— گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

سیاسی پارٹیوں کا پروگرام ایوان قانون ساز اور حکومت کی معرفت عمل کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن ہے۔ قومی لیبوریٹریاں ہیں۔ طرح طرح کے ماہرین ہیں ہماری زندگی کس طرح گزرے گی اس کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ جو کچھ سمجھاتے ہیں ہم اس پر چل سکتے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان مراسلت کا وسیلہ روزنامہ اخبار ہیں۔

آج دُنیا کی تقدیر سیاستدانوں اور تکنیکی ماہروں (Technocrat) کے ہاتھ میں ہے ادیبوں کے نہیں۔ ادب کی تاثیر اور ہمہ گیری کی بات صرف ادیب کرتے ہیں۔ اربابِ اقتدار کے سامنے یہ دعویٰ دُہرایا جائے تو وہ اس معصوم دعوے پر مسکرا کر گزر جائیں گے۔ مزدور یا کسان کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں کا ذکر کیا جائے تو وہ حیرت سے پوچھیں گے کہ یہ کن مخلوقات کا نام لے رہے ہو۔

ہمارے ذہن اور معتقدات کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والے ہمارا پسندیدہ روزنامہ اور ہمارے قومی ریڈیو کی خبریں ہیں۔ تاثیر کی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے ادبی تخلیقات صحافت کے آگے پانی بھرتی ہیں۔ یہ صورتِ حال صرف ان ملکوں میں نہیں جہاں خواندگی کی کمی ہے۔ مغرب میں جہاں تعلیم بہت عام ہے اور ادیبوں کی آواز بہت زیادہ لوگوں تک پہنچتی ہے وہاں بھی ادیب سماجی ارتقا کا رُخ متعین نہیں کرتے۔ وہاں کی حکومت، سیاسی گروہوں اور سرمایہ داروں کے پاس رائے عامہ کو متاثر کرنے والے وسائل افراط سے ہیں۔ وہاں پروپیگنڈا ایک فنِ لطیف بن گیا ہے۔

چنانچہ تخلیقات اثر انگیز ہوتی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

ے بڑے مصنفوں کے قلم میں جادو ہوتا ہے۔ وہ قاری کو کم از کم وقتی طور پر اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز حکو
ے جوش کی نظم ضبط کی اور روسی حکومت نے نوبل پرائز پانے والے ناول کو اپنی قلم رو میں شائع نہ ہونے دیا۔ ایک اچھے ناول یا
سانے کا اثر کئی روز تک رہتا ہے اور شاید تحت الشعور میں بس کر رہ جاتا ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے ملکوں کے سیاست
ں ادبیات کا مطالعہ نہیں کرتے۔ قانون ساز ایوانوں کے بیشتر اراکین تو محض حرف شناس ہی ہوتے ہیں۔ جو پڑھے لکھے ہیں انھیں
ی ادبیات کے مطالعے کی فرصت نہیں۔

آج ادبیات کے علاوہ دوسرے موضوعات مثلاً تاریخ، معاشیات، سیاسیات، سائنس وغیرہ پر کثرت سے لکھا جا رہا ہے
ربیات کے طلبہ کے علاوہ دوسرے قارئین اپنے اپنے پسندیدہ موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سردار جعفری[1] نے سچ کہا ہے۔

"ادب حقیقت کو بدلتا ضرور ہے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔۔۔
وہ پہلے انسان کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح انسان میں داخلی تبدیلی پیدا
کرتا ہے۔"

ادب کا اثر ہوتا ہے لیکن ان پڑھے لکھوں پر جن تک اس کی رسائی ہو سکے۔ ابھی ملک میں خواندگی بہت کم ہے۔ مستقبل میں جوں
ں خواندگی بڑھے گی ادب کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔ لیکن اب ایک اور خطرہ ہے۔ ملک کی ضرورتوں کے درپیش بجا طور پر
زور دیا جا رہا ہے کہ فنون کی تعلیم کے مقابلے میں سائنس اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ فروغ دیا جائے۔ ادبیات کا ہر پروفیسر اپنے بچوں کو انجینیری
ڈاکٹری کی تعلیم دلا رہا ہے اور کسی انجینیر یا میڈیکل کالج کے پروفیسر یا ماہر معاشیات کے سامنے شعر و ادب کا ذکر چھڑ جائے تو وہ اسے
بیکاری کے مشغلے سے زیادہ اہمیت نہ دے گا۔ آنے والی نسلوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب کی مقبولیت اسی تناسب سے بڑھ جائے گی
یسا سوچنا خوش فہمی ہے۔ تعلیم کے فروغ کے معنی مطالعۂ ادب کا فروغ نہیں۔

جب یہ صاف نظر آتا ہے کہ سماج کے ارتقا میں جو طاقتیں کام کر رہی ہیں ادب ان میں سب سے پیچھے سب سے کم زور ہے تو پھر ادب
یا مقصدیت کی بحث اپنی بہت کچھ معنویت کھو دیتی ہے۔

سماج کی بہتری کی کوشش کتنا مستحسن کام ہے لیکن یہ کام ادب کی نسبت صحافت، سیاسی کتابیں، سیاسی نیتا، ماہرین معاشیات، موجدان
سائنس زیادہ حسن و خوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ادب کو بھی اس مبارک کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن ادب اگر کبھی کبھار اس جد و جہد
سے منہ موڑ لے تو بھی سماجی ترقی کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق نہ پڑے گا۔ یہ مسلّم کہ ادیب کو کوئی ایسی چیز پیش نہ کرنی چاہیے جو سماج کو مضا

---

[1] ترقی پسند ادب بار دوم ص ۲۹

ادب کو ... سے بچانے کا یقین اگر وہ بعض اوقات ایسی چیزیں پیش کرے جو سماج کو ادبی اعتبار سے دیا ئیں دکھائیں بلکہ جذبات کو
اور مسرت ... بخش کر کیا اخراض ہو سکتا ہے۔ جو مثلاً یہ:

سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں
بہار و کیف کی جولی اتر آئے گی وادی میں
سرود و نور کا گہر زمزمہ چھڑ جائے گی وادی میں
نسیم بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں
شباب و حسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

(اختر شیرانی)

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشموں کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم — اُمید اُن کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

(اقبال)

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس قسم کی تخیلات مفید ہیں کہ نہیں ہیں لیکن انھوں نے انسان کو ہمیشہ آسودگی بخشی ہے اور ہمیشہ آسودگی بخشیں گی۔ مجھے مجنوں کے اس قول سے کامل اتفاق ہے۔

"اخبارات میں سوائے روح عصر کے کچھ نہیں ہوتا اور ادب میں علاوہ روح عصر کے بھی ایک عنصر ہوتا ہے جس کا تعلق ماورائے عصر سے ہوتا ہے اور جس کی بدولت وہ ادب ہر زمانے کی چیز بن جاتا ہے یعنی وہی واقعیت (Realism) اور تخیلیت (Idealism) کا شیر و شکر ہونا۔ آج کل کے مشہور انگریزی نقاد جے۔ بی۔ پرسیلی (J. B. Priestley) کا خیال بہت صحیح ہے کہ ہم کو اپنی آرٹ کو زندہ رکھنے کے لیے تھوڑی سی افیون کی ضرورت ہمیشہ پڑے گی۔"

زندۂ جاوید ادب میں اس افیون کا شائبہ ضرور رہتا ہے لیکن افیون کی مقدار تھوڑی ہی ہونی چاہیے۔ زیادہ ہو گی تو وہ زندگی کے لیے سم قاتل ہے۔

ط ادب اور زندگی بار دوم ص ۲۰

اہلِ نوایط کی اُردو خدمات کا ایک جائزہ

نصیرالدین ہاشمی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جنوبی ہند میں مسلمان فوجی تزک و احتشام سے آنے سے صدیوں پہلے جہازوں کے ذریعہ پُرامن طریقے پر تجارت اور تبلیغِ اسلام کے لیے آچکے تھے۔ ان آنے والے مسلمانوں میں اہلِ نوایط کا بڑا حصہ تھا۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب عرب اور ہند کے تعلقات میں حسب ذیل صراحت فرمائی ہے:۔

> "روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور عربوں کا تیسرا مرکز ہندوستان کا وہ آخری کنارہ ہے جس کو ہندوؤں کے پرانے زمانہ میں کیرالا کہتے تھے اور بعد کو ملیبار کہنے لگے...... ملیبار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکینِ وطن ہیں جو موپلا اور نائت کے ناموں سے ہندوستان میں مشہور ہیں اور جن کے ہاتھوں میں پرتگیزوں سے پہلے تک سمندر کی باگ تھی...... (صفحہ ۲۶۵، ۲۶۹)

ملیبار کے دُوسرے مقابل ساحل کو عرب معبر کہتے تھے اس کا موجودہ مشہور نام کارومنڈل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساحل کا یہ حصہ بھی چند صدیوں کے بعد عربوں کے استعمال میں آیا ہے۔ چند ہی صدی کے آخر سے اس کا نام سننے میں آتا ہے۔ ساتویں صدی میں یہاں عربوں کا اچھا خاصا عمل دخل معلوم ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۷۰ و ۲۷۱)۔

اگرچہ مولانا سید سلیمان نے صرف کیرالا کے سلسلہ میں اہلِ نوایط کا ذکر کیا ہے اور کارومنڈل کے تذکرہ میں اُن کا نام نہیں بتایا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کیرالا کی طرح کارومنڈل میں اہلِ نوایط آئے ہیں۔ چنانچہ ندوی صاحب نے ساتویں صدی کا جو تذکرہ کیا ہے وہ ابنِ بطوطہ کے سفرنامہ سے ماخوذ ہے اس کی صراحت بھی ندوی صاحب نے فرمائی ہے۔ ابن بطوطہ کی صراحت خصوصیت سے پڑھنے کے قابل ہے جس کی صراحت آگے آتی ہے۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ اہلِ نوایط کس سنہ میں ہندوستان آئے۔ چونکہ تمام اہلِ نوایط شافعی مذہب کے پیرو ہیں اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے بعد آئے ہوں گے۔ لیکن جو دُوسرے تاریخی شواہد ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے بہت پہلے ہی ہندوستان میں آگئے تھے۔ بہرحال ان کے ہندوستان آنے کا زمانہ صحیح طور پر ہنوز متعین نہیں کیا جا سکتا۔

اہلِ نوایط کے ہندوستان میں متوطن ہونے کے متعلق جو مواد ملتا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اوّلاً سواحل کارومنڈل اور کرناٹک پر اُترے اور جنوبی ہند میں دکن تک پھیل گئے۔ جن مقامات پر اہلِ نوایط نے قیام کیا وہ کوکن، بھٹکل، بمبئی،

گلبرگہ ۔ بیدر ۔ بیجاپور ۔ حیدرآباد ۔ ویلور ۔ ارکاٹ ۔ مدراس ۔ بنگلور ۔ میسور ۔ سدھوٹ ۔ کرنول وغیرہ مقامات ہیں ۔ ان میں سے اکثر مقامات پر اب بھی اُن کی خاصی تعداد موجود ہے ۔

اہلِ نوایط کا ذریعۂ معاش تجارت تھا اس کے ساتھ ہی وہ درس و تدریس تبلیغِ اسلام کے کاموں میں پوری توجہ ، مُستعدی اور انہماک سے مصروفِ عمل رہے ۔ جب وہ ہندوستان آئے تھے تو ان کی مادری زبان عربی تھی ۔ ہندوستان میں آکر بود و باش کرنے لگے ۔ تجارت اور تبلیغِ اسلام میں مصروف ہوتے تو دیسی زبانوں کو حاصل کرنا ان کے لیے ضروری تھا ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوب میں آپس کے میل جول سے زبان پیدا ہونے لگی یعنی قدیم اُردو میں اُن کا بڑا حصہ تھا ۔ مگر سرِدست اس کے متعلق بھی کچھ طور پر اسے پیش نہیں کی جا سکتی ۔

دکن میں جب اسلامی حکومتیں ، بہمنی ، عادل شاہی ، قطب شاہی ، نظام شاہی ، مغلیہ اور پھر آصفیہ وغیرہ قائم ہوئیں اور ان میں سے اکثر حکومتوں کی سرکاری زبان فارسی تھی تو اہلِ نوایط نے بھی عربی کے ساتھ فارسی اور پھر اُردو کو اپنا لیا ۔

دکن کی ادبی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہاں عربی فارسی ایک زمانہ دراز تک علماء اور فضلاء اور اصحابِ علم کی تصانیف اور تالیفات کی زبان رہی حتیٰ کہ خطوط بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے ۔ اگرچہ دکن میں سنہ ۸۰۰ھ کے اوائل سے دکنی (قدیم اُردو) کا رواج رہنے کا ثبوت ملتا ہے ۔ اور نہ صرف بول چال بلکہ تحریر میں آجانے کا ذخیرہ وغیرہ بہم دست ہوگیا ہے لیکن اس کے باوجود علماء اور اصحابِ علم میں فارسی کا ہی رواج عرصۂ دراز تک باقی رہا ۔ کیونکہ اکثر علماء اُردو میں تصانیف کرنے کو اپنی سبکی تصور کرتے اور پس و پیش کرتے تھے ۔ اظہارِ خیالات کے لیے اس کو کمتر پایہ تصور کیا جاتا رہا ۔

میرے مضمون کا عنوان اہلِ نوایط کی اُردو خدمات کا جائزہ ہے علمی خدمات نہیں ہے اس لیے اہلِ نوایط کے علمی و ادبی کارناموں کو جو عربی فارسی میں ہوئے نظرانداز کر کے صرف اُردو کے متعلق صراحت کی جاتی ہے ۔

اہلِ نوایط کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا اور اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ صدیوں سے اہلِ نوایط نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا اور اس قوم کے کئی مشاہیر اس خصوص میں نام آور ہوئے ہیں ۔ چنانچہ مشہور اسلامی سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس قسم کے دو بزرگوں کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے :

"دوسرے دن صبح کو ہنور میں پہنچے ۔ یہ ایک بہت بڑی کھاڑی پر واقع ہے ۔ اس شہر کے عابدوں میں شیخ محمد ناگوری ہیں انھوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی ۔ فقیہ اسمٰعیل جو کلام اللہ پڑھاتے ہیں اس شہر میں رہتے ہیں ۔ وہ نہایت پرہیزگار خوش خلق اور فیاض .... اس شہر میں تیرہ مکتب لڑکیوں کے ہیں اور تئیس مکتب لڑکوں کے ہیں ۔ یہاں کا بادشاہ جمال الدین ہے ۔ ملیبار کے راجہ کو کچھ معین خراج دیتا ہے ۔ بادشاہ سلطان جمال الدین محمد بن حسن بڑا نیک بخت ہے ہمیشہ باجماعت نماز پڑھتا ہے ۔ جب میں اس کے پاس ٹھہرا ہوا تھا تو افطار کے وقت مجھے بلایا کرتا تھا ۔ فقیہ علی اور فقیہ اسمٰعیل بھی موجود رہتے تھے ۔"

(ہنور کو اب ہنوور کہتے ہیں احاطۂ بمبئی میں شمالی کنڑا کے ضلع میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ ملا علی جن کا تذکرہ ہے وہ ملا علی ہاشمی تفسیر رحمانی کے مصنف ہیں اور فقہ اسمٰعیل راقم کے اجداد میں شامل ہیں اس لیے واضح ہے کہ اہلِ نوایط کرناٹک کے علاوہ کارومنڈل میں بھی آگئے تھے۔ یعنی ٹنک کوکن کا مرکز بنا ہوا تھا۔)

اس زمانے کے بعد بھی اس قوم کے مشاہیر نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو جو ان کا آبائی ورثہ تھا متروک نہیں کیا۔ اہلِ نوایط کی عربی اور فارسی تصانیف کا سلسلہ ۱۳۰۰ھ کے بعد بھی جاری رہا۔ اگر مشاہیر نوایط کی صرف عربی فارسی تصانیف کی فہرست پیش کی جائے تو کئی سو کتابوں کا تذکرہ کرنا ہوگا۔ یہاں اس موقع پر دشوار ہے کیونکہ ہم کو صرف اردو کا تذکرہ کرنا ہے۔ اولاً یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ اہلِ نوایط نے اردو کی خدمت کی ابتدا کب سے کی ہے۔ اور کس نے اردو کا نامہ پیش کرنے کا آغاز کیا۔

واضح ہو کہ اہلِ نوایط کا شاہکار نامہ تبلیغ اسلام اور درس و تدریس کے ساتھ تجارت بھی رہا۔ زمانہ سابق میں عام طور سے تمام علماء و فضلاء اردو کے قطع نظر عربی فارسی کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ قرار دیتے تھے چنانچہ ان ہی وجوہ سے سنہ ۱۳۰۰ھ (سنہ ۱۸۸۳ء) تک ہی ان کے فارسی یا عربی تصانیف بدست ہوئے ہیں حتیٰ کہ خطوط بھی عرصۂ دراز یعنی ۱۳۲۴ھ[1] تک بعض اصحاب فارسی میں لکھا کرتے تھے۔

اگر میں یہ صراحت کروں کہ قاضی محمود بحری وہ پہلے نائطی شاعر اور مصنف ہیں جنھوں نے قدیم اردو میں طبع آزمائی کی ہے تو شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ اب تک مورخین ادب نے قاضی صاحب کو نائطی نہیں لکھا ہے پھر کس طرح قاضی صاحب کو اہلِ نوایط میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس خصوص میں مصنف تذکرہ گلزارِ اعظم کی صراحت قابلِ ملاحظہ ہے جو حسبِ ذیل ہے:

> • مختار تخلص باقر حسین مخاطب بہ خطاب پدر خود حسن علی خان از اولاد قاضی محمود بحری از قوم نائطہ معززان این شہر است۔ صفحہ (۳۴۷)

یہ تذکرہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں طبع ہوا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قاضی محمود بحری کی اولاد اس زمانہ میں موجود تھی اور اہلِ نوایط میں ان کو شامل کیا گیا تھا۔

اگر سر دست قاضی محمود کے نام کو مزید تحقیق کے لحاظ سے حذف کر دیا جائے تو جس نائطی شخص کو اردو کا پہلا نائطی شاعر تسلیم کرنا چاہیے وہ سعادت اللہ ہیں۔

یہ وہی سعادت اللہ خان ہیں جن کو عالمگیر نے ذوالفقار خان کے خطاب سے ارکاٹ کا صوبہ دار بنایا تھا۔ آپ کے دربار میں فارسی گو شاعروں کا ہمیشہ جمگھٹا رہتا تھا۔ جن میں قزلباش خان، فضل اللہ خان، آغا محمد مقیم دکھنی، رائے بست رائے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مصنف سیرنامہ (جو ان کے عہد کی تاریخ ہے) اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ ان کے دربار میں شعرا کے کلام

---

[1] ماموں میاں امیر نواب شرف الدولہ جو راقم کے ماموں تھے ۱۳۲۴ھ تک فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔

پر مباحثہ ہوتا تھا۔ خواص [illegible] کی تصنیف کا ذکر رہا کہ سعادت اللہ خاں خود بھی شاعر تھے اُن کو شعر کا ذوق تھا۔ فی البدیہہ شعر کہا کرتے۔ ایک مرتبہ بیجاپور کے شاعر مہا لشہ ذکر نے اپنی مدح خواست شعر میں پیش کی . . . .

. . . . محرم میں اکثر اوقات دکنی زبان میں مرثیے کہا کرتے جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہوتے افسوس ہے کہ اُن کا کوئی مرثیہ دستیاب نہیں ہوا۔ [illegible] میں ان کا انتقال [illegible] (ارکاٹ) میں ہوا۔ بہر حال موجودہ معلومات کی حد سے اہل نوایط میں ان کو پہلا اردو گو شاعر تسلیم کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔

اب مضمون کو سہولت کی غرض سے چند ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ ہر دور کی اُردو خدمات کا حال واضح ہو سکے۔ حسب ذیل ادوار قائم کیے جائیں گے۔

پہلا دور	ماقبل سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۰۰ء
دوسرا دور	سنہ ۱۸۰۱ء تا سنہ ۱۸۵۷ء
تیسرا دور	سنہ ۱۸۵۸ء تا سنہ ۱۹۰۰ء
چوتھا دور	سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۴۷ء
پانچواں دور	سنہ ۱۹۴۷ء تا سنہ ۱۹۶۳ء

ان ہی ادوار کے تحت یہاں مختصر صراحت کی جاتی ہے۔ امید ہے کہ موجب دلچسپی ہوگی۔

پہلا دور

ماقبل سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۰۰ء

اس دور میں اہل نوایط کی اُردو خدمات کے سلسلہ میں صرف شاعری اور نثر نگاری کی صراحت کی جاتی ہے۔ اس دور کے کئی ایک نوایط کے نظم اور نثر نگاری کے ذخیرے بدست ہوئے ہیں۔ جن شعراء اور نثر نگاروں کو پیش کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں:-

مولوی محمد باقر آگاہ ان کے والد بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد ویلور (علاقہ مدراس) آگئے اور باقر آگاہ کی ولادت، نشو و نما اور تعلیم و تربیت ویلور میں ہوئی۔ آپ [illegible] میں تولد ہوئے اور مدراس میں [illegible] میں انتقال فرمایا۔ آگاہ کی عربی فارسی تصانیف کی تعداد (۳۰۳) ہے۔ اس میں سے (۱۶) اُردو میں۔ تمام کتابیں نظم میں ہیں اور مثنوی کی صنف میں ہیں مگر اکثر کتابوں میں کئی صفحوں کا دیباچہ نثر میں ہے۔ ان کتابوں میں اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ مثنوی [illegible] ایک کے باقی تمام سوانح۔ سیرت، مناقب وغیرہ کے عنوان پر لکھی ہیں خصوصیت سے عورتوں کے لیے ان کتابوں کو لکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے کیونکہ اصحاب علم عام طور سے عربی فارسی میں تعلیم پاتے اور ان ہی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ عورتوں کے لیے یہ سہولت نہیں تھی اس لیے باقر آگاہ نے خصوصیت سے عورتوں کا تذکرہ کیا ہے

باقر آگاہ کا کلیات بھی ہے جس میں اصنافِ شعر کے کئی اقسام مثلاً قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ سب کچھ شامل رہے۔ آگاہ کو خاندانِ والاجاہی ارکاٹ کے دربار سے زیادہ تعلق رہا مگر ان کا کوئی قصیدہ والیٔ ملک کی مدح اور ستائش میں ہے بلکہ تمام قصاید نعتیہ ہیں، آگاہ کی بلند کرداری کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔ آگاہ کی مثنویاں، قصیدہ اور غزل کے چند شعر یہ جاتے ہیں۔

آنحضرت صلعم کی سخاوت کا تذکرہ

سخاوت میں کوئی اوس کا ثانی نہیں نہ تھا جود کوں اس کی . . . نہیں
سوا ان سوں دیا اونٹ روز حنین عربیاں کوں او خلق کا نور عین
بقول جوازن دیا چھے ہزار درم او شہنشاہ عالی تبار
نمے یک مسلماں کوں او بے بدل دیا یک جنگل بھر کو بجری سیکل
کہاں قوم کوں جاکر اسے گریان محمد اوپر لاؤ ایمان جان
سخاوت کوں اوس کی نہیں انتہا جو ظاہر سخاوت کا ہے مدعا
میں رحمت کا اوس کی کروں کیا بیاں سراپا ہے اوس کوں خدا در قرآن
رکھا رحمت العالمین اوس کا نام روف رحیم بھی اسے شاد کام
شہنشاہ کی رحمت اسے نام در ابھی سب پر حتیٰ کہ شیطان و دہر

امت میں نبی کی جو ہیں عورات افضل ہیں سب عورتاں سے سن بات
لکھتا ہوں میں اس کتاب اندر احوال نساء کا اے برادر
اس شاہ کی دختر ان کا احوال اس شاہ کی عورتاں کا احوال
امت میں جو عورتاں تھے کامل تھا قرب خدا کا ان کو حاصل

غزل کا نمونہ :-

فریاد میری تیرے تغافل کو بڑھایا کیا خوب بلا نمرہ ہے میری فغان کا

کوں سے گلرو کی جلوہ گاہ ہے تاب اندر شراب
یوں جھلکتی ہے جواب میرے گلاب اندر شراب

پر مباحثہ ہوتا تھا۔ خواص [illegible] کی تصنیف کا ذکر رہا کرتا۔ سعادت اللہ خاں قدیم شاعر تھے [illegible] کو شعر کا اچھا مذاق تھا۔ فی البدیہہ شعر کہا کرتے۔ ایک مرتبہ بیجاپور کے شاعر [illegible] نے اپنی درخواست شعر میں پیش کی . . . . .

. . . . . محرم میں اکثر اوقات دکنی زبان میں مرثیے کہا کرتے جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہوتے۔ افسوس ہے کہ ان کا کوئی مرثیہ دستیاب نہیں ہوا۔ ۱۱۷۲ھ میں ان کا انتقال محمد پور (ارکاٹ) میں ہوا۔ بہرحال موجودہ معلومات کے لحاظ سے اہل نائطہ میں ان کو پہلا اردو گو شاعر تسلیم کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔

اب مضمون کو سہولت کی غرض سے چند ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ ہر دور کی اردو خدمات کا حال واضح ہو سکے۔ حسب ذیل ادوار قائم کیے جائیں گے۔

پہلا دور	ماقبل سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۰۰ء
دوسرا دور	سنہ ۱۸۰۱ء تا سنہ ۱۸۵۷ء
تیسرا دور	سنہ ۱۸۵۸ء تا سنہ ۱۹۰۰ء
چوتھا دور	سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۴۷ء
پانچواں دور	سنہ ۱۹۴۷ء تا سنہ ۱۹۶۳ء

ان ہی ادوار کے تحت یہاں مختصر صراحت کی جاتی ہے۔ امید ہے کہ موجب دلچسپی ہوگی۔

پہلا دور

ماقبل سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۰۰ء

اس دور میں اہل نائطہ کی اردو خدمات کے سلسلہ میں صرف شاعری اور نثر نگاری کی صراحت کی جاتی ہے۔ اس دور کے کئی ایک نائطے نظم اور نثر نگاری کے ذخیرے بدست ہوئے ہیں۔ جن شعراء اور نثر نگاروں کو پیش کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں:۔

مولوی محمد باقر آگاہ ان کے والد بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کے خاتمے کے بعد ویلور (علاقہ مدراس) آگئے اور باقر آگاہ کی ولادت، نشو و نما اور تعلیم و تربیت ویلور میں ہوئی۔ آپ ۱۱۵۸ھ میں تولد ہوئے اور مدراس میں ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ آگاہ کی عربی فارسی تصانیف کی تعداد (۳۰۳) ہے۔ ان میں سے (۱۶) اردو میں۔ تمام کتابیں نظم میں ہیں اور مثنوی کی صنعت میں ہیں مگر اکثر کتابوں میں کئی صفحوں کا دیباچہ نثر میں ہے۔ ان کتابوں میں اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہوگی۔ مثنوی [illegible] ایک کے باقی تمام سوانح، سیرت و مناقب وغیرہ کے عنوان پر لکھی ہیں خصوصیت سے عورتوں کے لیے ان کتابوں کے لکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے کیونکہ اصحاب علم عام طور سے عربی فارسی میں تعلیم پاتے اور ان ہی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ عورتوں کے لیے یہ سہولت نہیں تھی اس لیے باقر آگاہ نے خصوصیت سے عورتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

باقر آگاہ کا کلیات بھی ہے جس میں اصناف سخن کے کئی اقسام مثلاً قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ سب کچھ شامل ریچہ آگاہ کو خاندان والاجاہی ارکاٹ کے دربار سے زیادہ تعلق رہا مگر ان کا کوئی قصیدہ والی ملک کی مدح اور ستائش میں ہے بلکہ تمام قصائد نعتیہ ہیں۔ آگاہ کی بلند کرداری کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔ آگاہ کی مثنویوں، قصیدہ اور غزل کے چند شعر ہے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلعم کی سخاوت کا تذکرہ

سخاوت میں کوئی اوس کا ثانی نہیں — نہ تھا جود کوں اس کی . . . نہیں

سوال سوں دیا اونٹ روز حسین — ہزیاں کوں او خلق کا زر مین

بقول ہوازن دیا چھے ہزار — درم او شہنشاہ عالی تبار

نے یک مسلمان کوں او بے بدل — دیا یک جنگل بھر کر بکری سینگل

کہاں قوم کوں جا کر اسے گریاں — محمد اوپر لاؤ ایمان جان

سخاوت کوں اوس کی نہیں انتہا — جز ظاہر سخاوت کا ہے مدعا

میں رحمت کا اوس کی کروں کیا بیاں — سراپا ہے اوس کوں خدا در قرآن

مکار رحمت العالمین اوس کا نام — رؤف رحیم بھی اسے شاد کام

شہنشاہ کی رحمت اسے نام در — ابھی سب پر حتی کہ شیطان و دہر

اُمت میں نبی کی جو ہیں عورات — افضل ہیں سب عورتاں سے سن بات

لکھتا ہوں میں اس کتاب اندر — احوال نامدار اے برادر

اس شاہ کی دختران کا احوال — اس شاہ کی عورتان کا احوال

اُمت میں جو عورتان تھے کامل — تھا قرب خدا کا ان کو حاصل

غزل کا نمونہ:۔

فریاد میری تیرے تغافل کو بڑھایا — کیا خوب بلا [illegible] میری فغان کا

کون سے گلبدن کی جلوہ گاہ ہے تاب اندر شراب

یوں جھلکتی ہے جواب میرے گلاب اندر شراب

دل میں میرے سماتی نہیں داستانِ شوق
کس طرح سے کروں میں بیانِ شوق

جب تلک نہ خوں میں دل کو میرے شرار
پانی ہی بھرتے بھرتے گزرا اپنی پائے چشم

ہے میری جان خلل پہ حکم غمزہ کا تیری نافذ
مگر تقدیر کے نائب ہیں تیری آج کل انکھیا

ہستی سے تنگ دل جہاں اب نیستی کی
پھر کاش اس جہان سے ہو جاؤں بے خبر میں

جو چشم تجلی سے تیرے دور پڑے ہیں
حیرت میں ہوں کہ ذرے سے مجبور پڑے ہیں

عشق میں ہم تو کچھ گنہ نہ کیے
بے گنہ ہوں کہ کیوں ستاتے ہو

جب سے ہم تجھ کو اک نظر دیکھے
تجھ کو ہر شے میں جلوہ گر دیکھے
تو ہی منظورِ چشم و دل ہے سدا
کیا ہوا گر ادھر ادھر دیکھے
کب شعلہ زارِ عشق کا دل تاب لا سکے
ذرہ میں آفتاب کہاں ہے سما سکے

رباعی :

تا دل میں سماتا ہے تیرا عکس جلال
نہ آنکھ میں ماتا ہے تیرا نورِ جمال
ہیں ملک و ملک میں جتنے ارباب کمال
تمہید میں تیرے ہو گئے یکسر لال
اس گریہ و زاری و دعا سے توبہ
اس توبہ پر عجب دریا سے توبہ
پستی کی علامات ہیں یہ سب چیزیں
یا رب یہ علامات بلا سے توبہ

دیوان

زین العابدین نام دیوان تخلص۔ علی دوست خان فرزند حسین خان دوست خان چندا صاحب کے داماد تھے۔ فارسی اردو میں شاعری کرتے تھے۔ صاحب گلدستۂ کرناٹک اور تذکرہ گلزار اعظم میں آپ کا حال درج ہے۔
افسوس ہے کہ ان کے دیوان کے غزلیات وغیرہ بدست نہیں ہوئے۔ صرف مرثیوں کا مواد بدست ہوا ہے۔ نمونہ ہے :

آج سلطان پیمبر پر ہے غم	شاہ مردان شبیر اکبر پر ہے غم
سخت ہے خاتون جنت غم میں	شاہِ دین شبیر و شبر پر ہے غم

کیا کربلا میں آل عبا پر ستم ہوا	جب اور امام دوسرا پر الم ہوا
آل رسول حق پہ تظلم کا حال دیکھ	... کے دل عیش بکام عدم ہوا
مانند گردِ خم سوں بگڑا... تشنہ دہان	عالم پہ کی جب سنے ایجاد غم ہوا

....

افسوس کیا کہ غم سوں کھے دو کے زار زار
دیوان پر کیا یوم ماتم جو غم ہوا [1]

---

[1] کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد ۔ رقعات امام اللہ حسینی ۔ ادب نثر فارسی (۱۴۴)

مرثیہ :-

ہوا ختم یارغم سوں سرو بستان نبوت کا
ہوا بادِ ظلم سوں گل شمع بزم ولایت کا
سیا غم گینی دو عالم کوں کیا ہے چاند ماتم کا
سکایا ہے خیال عیش کوں یادِ خزاں غم کا
دھلیا تخت امامت جب سنے سرؤں دو عالم کی
گھری .... رہتی حرفِ غم کا
ہوا ختم شہادت قتل خاک کربلا میں جب
خوشی کا نام مجلسوں کم ہوا ہے جام جیوں جم کا

....

شفاعت ..... کوں کریں گے ساقی کوثر
دیکھیا جوں اس امحشر کوں اس شاہ مکرم کا
سدا دیوان رویا حیف کا غم سو شہیدان کی
پھرتا ہے سر پہ اس کی کرو اہل بیت اکرم کا

مرثیہ :- کربلا جب مقتل شہزادۂ اکمل ہوا
خاک اس کا بر زمین آسمان افضل ہوا
غم کیوں نہ ہو دو عالم کوں محیط
آفتاب دین کی مغرب عرصہ کربل ہوا

---

(۳) اس دور کے ایک اور شاعر معجز ہیں :-

غلام محی الدین نام تھا۔ ارکاٹ میں ۱۱۵۵ھ میں تولد ہوئے اور ۱۲۲۱ھ میں مدراس میں انتقال ہوا۔ والاجاہ کے قریب فرزند عظیم الدولہ کی تعلیم اور تربیت سے متعلق کئی فارسی کتابوں کے مصنف ہیں اپنے انتقال تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ فارسی اور اردو میں دیوان مرتب کیے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو فارسی اور اردو میں ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

ہے خبر عشق بتاں سے تھا میرا دل افسوس
اس بچارہ پہ بحث فتنہ چلا میں آنکھیں

یار کے عشق نے جب سے مجھے سرشار کیا
چشم انگار کو . . . . خون بار کیا

ہمیں کعبہ و دیر سے نہیں کچھ کام
کہ ہر جا ترا جلوہ ہم دیکھتے ہیں

کیا تیری چشم کا پیمانہ ہے
حسن جس اسر کا مستانہ ہے

مدّت گزر گئی نہ سُنی یار کی خبر
اس شوخ دلربا بت غم خوار کی خبر

معجز خیال ہستیِ موہوم کر وداع
درپیش ہے سفر مجھے دارالبقا طرف

ایک دم جلنے پر مت لاف کرئے پروانہ
شمع کو دیکھ کہ تا صبح جل جاتی ہے

مختار

باقر حسین نام مختار تخلص ۔ قاضی محمود بحری کے پوتے تھے ۔ فارسی شاعری میں اچھی دست گاہ حاصل تھی ۔ مشاعروں میں شریک ہوا کرتے ۔ اپنے دادا کی طرح اُردو سے بھی دلچسپی تھی ۔ تصوّف سے بھی شغف تھا ۔

افسوس ہے کہ اُردو کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے ۔

ان کے علاوہ کئی اور شعرا کا پتہ چلتا ہے جو اس دور میں اُردو کی خدمت کرتے تھے ۔ بہرحال اُردو کی خدمت شاعری کے لحاظ سے کئی اصحاب نے کی ہے ۔

شاعری کی طرح نثر نگاری کی جانب بھی اہلِ نوایط نے توجہ کی تھی اس دور کی نثر کا نمونہ پیش ہے ۔

(۱) مولانا باقر آگاہ کی نثر کا نمونہ یہ ہے :-

اگرچہ باقر آگاہ نے اُردو نثر میں اپنی کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی ہے مگر اکثر نظم کی کتابوں میں طویل دیباچہ نثر میں قلمبند کرتے رہے ہیں جس میں اُردو کی تاریخ اور تنقید بھی آگئی ہے ۔ چنانچہ یہاں اس قسم کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے ۔ جو نصرتی کے متعلق تحریر کیا ہے ۔

" تعصب کو یک طرف رکھ کر کلیات سودا کو بغور ملاحظہ کر کر انتخاب کرے اور ان سبھوں کو یک

داستانِ [illegible] جشن یا علی نامہ سے مقابلہ دیوے تا انداز سے اس کی اور اس کی بلاغتی واقف ہوئے۔ سودا کو چھوڑئے جس شاعر فارسی کو سے چاہے خواہ قصاید میں جگن خواہ مثنوی میں لے مقابل کیا جائے۔ بالفعل بھی مہرو ماہ یکسانے فن طرازی پاقل خان رازی کی تین بقصہ مہر و ماہ کے گلشنِ عشق سے موازنہ کر دیکھیے تا معنی مثل دکھنی کے ہاتھ لگی کہ آرسی کیا کا خوب ہے۔"

کس انفرقی سخن کے یہ دوار   طا بعد مدت کے مجھکو چلا
کہا سودا کتیں انصاف سے   کر سنے کر دمجہ کو آگاہ سے

---

(۲)

مولوی محمد غوث شرف الملک عربی فارسی کے عالم متبحر تھے۔ چند سال تک ریاست ارکاٹ کی وزارتِ عظمیٰ کے فرائض انجام دیے مگر اپنے علمی مشاغل میں اس ملازمت کو باعث قرار دے کر مستعفی ہوئے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد (۲۱) ہے جو عربی اور فارسی میں ہیں۔ آپ کی ایک کتاب جو فقہ کا ترجمہ ہے اردو میں ہے۔ آپ سنہ ۱۱۹۶ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۳۸ھ میں انتقال ہوا۔ نمونہ نثر یہ ہے :۔

"جان تو بے شک بندہ جانچا گیا ہے درمیان اس کے کر فرمانبرداری کرے وہ اللہ برتر کی پس ثواب پاوے اور درمیان اس کے کر نافرمانی کرے اس کی پھر عذاب کیا جاوے اور جانچ اللہ کی موقوف ہے ساتھ عمل شرع کے اور ساتھ عمل غیر شرع کے۔"

تبصرہ اگرچہ اس پہلے دور کے شعرا اور نثر نگاران کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر شعرا نے اصنافِ سخن کے تمام شعبوں میں اپنے فکر کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل۔ رباعی۔ قطعہ اور مرثیہ میں اپنے خیالات کے تخیل کے جواہر پیش کیے ہیں۔ ان کی شاعری اسلوب کی جدت طرز ادا کی ندرت اور تخیل کی بلند پروازی کے لحاظ سے قابلِ داد رہی ہے۔ انھوں نے اس وقت کی عام اور سلیس زبان کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔

دکن کے دوسرے شعرا داستانوں میں اپنے افکار کو زیادہ سے زیادہ پیش کرتے رہے مگر نایطی شعرا نے عشقیہ داستانوں کے بجائے۔ سیر۔ مناقب۔ سوانح، فقہ اور عقاید کے مضمون کو اپنے خیالات کی جولان گاہ بنا رکھا تھا۔ انھوں نے باوجود تقرب شاہی مدحیہ قصاید پیش کرنے سے اجتناب کیا۔ نعتیہ قصاید پیش کرتے رہے۔

دوسرا دور

سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۵۷ء

اس دور کے کئی شعرا کا تذکرہ تذکرۂ گلزارِ اعظم میں موجود ہے جن میں سے بعض فارسی کے ساتھ اردو میں بھی

میں آزمائی کرتے تھے۔ مگر افسوس ہے ان شعرا کا اُردو کلام سردست بہم نہیں ہوا۔ اس دور کے فارسی گو شعرا جن کا تذکرہ گلزار میں ہوا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) آگاہ، علی رضا خاں (۲) احمد، قاضی احمد (۳) انست، حکیم اشرف الدین (۴) رفیع، حسن علی (۵) احسن، سید محمد اسحٰق (۶) برہان، سید برہان الدین (۷) بیہوش، محمد قادر علی متوفی سنہ ۱۲۲۰ھ (۸) جودت، غلام حسین (۹) حیدری، غلام حسن متوفی سنہ ۱۲۱۳ھ (۱۰) ذہن، علی دوست رسا (۱۱) رسا، محمد رحمت اللہ (۱۲) شایان، محمد اسلم متوفی سنہ ۱۲۲۴ھ (۱۳) صاحب، غلام علی (۱۴) عزت، عبدالقادر (۱۵) عتیق، محمد صبغۃ اللہ (۱۶) فرحت، محمد صبغۃ اللہ (۱۷) لائق، غلام دستگیر (۱۸) مختار، باقر حیدر (۱۹) نجمی، اشرف الدین (۲۰) گوہر، محمد باقر خان (۲۱) نصرتی، افضل خاں (۲۲) واضح، حکیم شاہ زین العابدین (۲۳) افسر

ان میں سے بعض کے اُردو میں شعر کہنے کی صراحت کی گئی ہے مگر افسوس ہے کہ ان کا اُردو کلام تذکرہ مذکور میں نہیں ہے اور دوسرے ذرائع سے سردست کوئی کلام نہیں ملا ہے۔

جن شعرا کا کلام بہم دست ہوتا ہے ان کی صراحت کی جاتی ہے:۔

(۱) ملک محمد نام جوہر تخلص تھا۔ کرنول کے جاگیردار تھے۔ والی کرنول کے مصاحبوں میں شامل تھے۔ آپکے فرزند غلام حسین گوہر اور پوتے غلام حیدر شہوار تخلص بھی شاعر تھے۔ جوہر کا قلمی دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

چاہ میں اوس مہ کنعان کی جو میں ڈوب رہا
میری آنکھوں کی مدد گریۂ یعقوب رہا

قیامت کا مجھے کیا ڈر ہے اپنے دل کو اے جوہر
بھروسہ ہے پیمبر کا بھروسہ ہے پیمبر کا

بوسہ دے لبوں کا تو کہا چشم کالی ہے
شکر سے بھی شیریں ہے بادام محبت

آج آنے سے ترے میرا ہوا گھر آباد
تا قیامت رہے تو اور ترا گھر آباد

تم او جیتو میکے لال لال آنکھوں سیں
رکھوں گا پتلی سا تم کو سنبھال آنکھوں میں۔

اس چشمِ پرخمار میں جوہر نہیں ہے دل
یک سوختہ کباب ہے جامِ شراب میں

یوں دُرِ اشکِ غمِ شاہِ نجف سے نکلے
ایسے موتی نہ کبھو صاف صدف سے نکلے

یاد تیری مجھے اے ساقی کل رات لگی
ہچکی شیشہ کو بھی فی الفور برسات لگی
جہاں اوس اخترِ روشن کی جلوہ گاہ رہی
بشکلِ قبلہ نما اپنی بھی نگاہ رہی

عجب اپنی بنی ہے شکل اوس کے عشق میں جرسر
نہ طاقت وصل کی ہے مجھ کو نہ تاب جدائی ہے

۲۔ ناظر غلام عبدالقادر نام اور ناظر تخلص۔ قادر اعظم خان خطاب دربار ارکاٹ سے ملا تھا۔ سنہ ۱۲۰۰ھ میں ولادت ہوئی اور سنہ ۱۲۴۴ھ میں انتقال ہوا۔ ناظر تخلص تھا۔ ریاست ارکاٹ کے مہرساماں اور مہتمم کتب خانہ تھے۔ فارسی اور اُردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

بہار اعظم۔ شرح سکندر نامہ۔ گلستان نسب اُن کی تصانیف ہیں۔

۳۔ ذکا حبیب اللہ نام۔ ذکا تخلص۔ سنہ ۱۲۴۴ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ اگرچہ آپکا انتقال سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا ہے مگر آپ کی شاعری کا آغاز اور اُس کے پختہ ہونے کا زمانہ سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے اس لیے آپ کا تذکرہ قدرے کیا گیا ہے۔

ذکا نے غالب سے بھی اصلاحِ سخن لی اور غالب کو اپنے شاگرد رشید پر فخر تھا۔ ذکا اصنافِ سخن کی ہر شاخ میں طبع آزمائی کرتے تھے قصیدہ، غزل، مثنوی میں ذکا کا طنزیہ کلام بھی ملتا ہے۔

ذکا کے متعلق غالب کی صراحت یہ ہے:۔

۱۔ یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں کسی شیخ و شاب کا نہیں۔ یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر دوست کے کلام کو معرض اصلاح میں بنظر دشمنی دیکھتا ہے

پس جب . . . . . . بنیں ادا نہیں تو جو مجھ کو نظر آتا ہے بے حیف

میں کہوں کا نثر میں نعمت خان عالی کے طرز کا احیا کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اور دیا ہے۔ قصاید میں انوری کا چربہ اٹھایا ہے مگر طبیعت نے اعجاز دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز منشی محمد حبیب اللہ صاحب ذکا سخن سنج و دان و یکتا نکتہ طراز۔ آفریں آفریں صد آفریں صد ہزار آفریں۔"

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ ذکا کا شاعری میں کیا درجہ تھا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اے خداوند کار بندہ نواز	فی المثل تو طبیب میں بیمار
ہے جگہ رحم کی تیرے آگے	کہ میں چلاوں روؤں زار نزار
شعر و انشا کی قدر ایک طرف	ہوں میں چودہ برس کا کارگزار
اتنی مدت ہوئی مگر نہ ہوا	کسی صورت سے ملزم سرکار
چاہتا ہی رہا کوئی خدمت	جس میں دو راہ ہوئے بیش قرار
ہے مری ذات میں وہ استعداد	کہ نہیں سیوا میرا استعداد
ہے کوئی کام جو نہ دوں انجام	کون سا گھاٹ جو نہ اتروں پار
بس ذکا دیکھی تیری لسانی	باادب ہے یہ آصفی دربار

غافل کبھی مجھ سے وہ ستمگر نہ ہوا تھا	یعنی کہ میں اندیشہ محشر نہ ہوا تھا
اچھا کیا پہلی سے جو رخصت کی شادی	مرنے کا مرے وقت مقرر نہ ہوا تھا

نازک تم ایسے ہو تو مجھے کیا امید قتل

ایک ہاتھ کی تو ہاتھ میں تلوار چاہیے

تمام ہوگیا کام اپنے روتے روتے میں

بہانا اشک کا پس موت کا بہانا ہوا

...سے سانڈنی تجھے دیکھتے نہیں
ہمسندوں کو اپنے عجز پہ کتنا غرور ہے

گیسوئے رخ کا بوسہ دو
چاند گہن ہے صدقہ دو
بیٹھ لگی ہے اوپر اوسکے
آگے سے سرکو رستہ دو

زیبرا جنازہ اُٹھتا ہے
تم بھی آکر کندھا دو

قابو نہیں جو چھا... پر اوسکے پاؤں میں
گنگا کو سات گھاٹ کا پانی پلاؤں میں
ہاتھ گرمی سے میرے نفس کے جل جائیگا
موسیٰ بن جاؤ گے یا حضرت عیسیٰ دیکھو

قائل ہوں میں غالب کے ذکا طبع زسخن کا
ایسا کوئی دلی میں سخن ور نہ ہوا تھا

طاعت کی کس کو سوجھتی ہے حبِ نفس میں
کعبہ کو کون جائے جو گھر میں حرم رہے

ترنیق بھنگ پینے کی دے خدا سبزے
کیوں حال کچھ مرک کے بھی چہرے اٹا... میں

اس دور کے نثر کے نمونے کے لیے ہم صرف قاضی بدرالدولہ کو پیش کرتے ہیں جن کی تصانیف کی آج بھی مانگ ہے۔

مولوی محمد صبغۃ اللہ مولوی محمد صبغۃ اللہ، مولوی محمد غوث شرف الملک کے چھوٹے فرزند تھے۔ سنہ ۱۲۱۱ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ مدراس کی جامع مسجد میں مدفون ہیں۔

مولوی محمد صبغۃ اللہؒ نے اپنے زمانہ کے جید علماء سے تعلیم حاصل کی اور اپنے ذوق و شوق سے بہت جلد فارغ التحصیل ہو گئے۔ حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ، فلسفہ کے علاوہ ریاضی، ہیئت اور طب میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔

اعظم جاہ اور غلام غوث خاں کے زمانہ میں خدمات صدارت قضات اور مفتی سے سرفراز تھے اولاً عمدۃ العلماء بدر الدولہ ...ی الملک معتمد جنگ کا خطاب ملا۔ پھر امام العلماء منصف الدولہ۔ معدلت خان قاضی الاسلام مستعد جنگ کے خطاب سے موسوم ہوئے مگر آپ زیادہ تر قاضی بدر الدولہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

قاضی بدر الدولہ ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ عربی، فارسی کے علاوہ آپ اردو زبان کے بھی مصنف ہیں۔ آپ کی ...ر کتابوں کے قطع نظر اردو کتابیں (۱۳) ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

شمار	نام کتاب	فن	کیفیت
(۱)	ریاض النسوان	فقہ	خاص کر عورتوں کے لیے لکھی گئی ہے۔
(۲)	رسالہ در احکام عدت	"	جو عورتوں کے لیے مرتب فرمایا تھا۔
(۳)	فواید بدریہ	سیر	آنحضرت صلعم کی مکمل سیرت ہے۔
(۴)	بہشت گلزار	"	ابو بکر صدیقؓ کے حالات ہیں۔
(۵)	نثر الجواہر	"	شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات
(۶)	خزانۂ معدلت	اخلاق	
(۷)	توشۂ فلاح	مناسک	حج کے مناسک
(۸)	قوت الارواح	"	توشۂ فلاح کی شرح ہے۔ کتاب کی ضخامت بڑے سائز کے ۸۰۰ صفحے ہیں۔ عربی میں بھی کوئی کتاب اس فن میں اتنی ضخیم نہیں ہے۔
(۹)	گلزار ہدایت	عقاید	
(۱۰)	ترجمہ حصن حصین	حدیث	
(۱۱)	حواشی بر مسلم	"	

۱؎ تاریخ احمدی و تاریخ النوایط

۱۴۲ شفیع الحکیم تفسیر یہ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ مصنف کا انتقال ہوگیا۔

باقر آگاہ نے جس کام کو شروع کیا تھا اس کو قاضی بدرالدولہ نے اسی طرح ترقی دی۔ اُردو نظم کی بجائے نثر میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا چونکہ آپ کی زبان مقابلتاً تدریجی زیادہ صاف تھی اس لیے اب آگاہ کی جگہ آپ کی کتابوں نے لے لی۔ صوبہ مدراس اور بمبئی میں آپ کی تصانیف کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

فوائد بدر، سیرۃ النبی کی بہترین کتاب ہے۔ سنہ ۱۲۶۸ھ میں اس کی تالیف ہوئی ہے۔ اس کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں پیدائش سے وفات تک کے حالات درج ہیں اور دوسرے باب میں صورت اور سیرت، اخلاق و عادات کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں جو واقعات بعثت و ہجرت کے سنین کے لحاظ سے بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے باب میں شمائل کا ایک بے مثل خلاصہ مرتب کیا ہے جس سے زیادہ واضح اور بہتر اور ناممکن ہے۔ عربی الفاظ کے لیے نہایت موزوں و مناسب الفاظ کچھ اور پیرایا کہ پڑھنے والے کو اردو زبان کا لطف آئے اور نامانوس الفاظ نہ معلوم ہوں درحقیقت کامیاب کوشش ہے۔ اس امر کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ فی زمانہ بھی ایسی مستند اور مکمل کتاب معدودے چند ہی ہوں گے۔

اس کتاب کا ایک جدید ایڈیشن حال ہی میں حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔ قاضی بدرالدولہ کی دیگر اُردو کتابیں بھی اسی طرح قابلِ قدر ہیں۔ شرح توشہ فروع مناسک میں ایک ایسی گراں قدر کتاب ہے کہ فارسی تو کجا عربی میں بھی ایسی کوئی کتاب نہیں ہے۔ ہشت گلزار میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مفصل سیرت لکھی گئی ہے جو اپنی حیثیت سے اُردو زبان کی تنہا کتاب ہے۔

قاضی بدرالدولہ نے زبان اُردو کی جو خدمت انجام دی ہے وہ فراموش نہیں ہوسکتی اب تک ان کی تصانیف کا مروج رہنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ایک صدی کے بعد بھی وہ اسی طرح قابلِ قدر ہیں۔ قاضی صاحب کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

" آنکھیں حضرت کی بڑی تھیں اور آنکھوں میں سرخی تھی اور حلقہ بہت سیاہ تھا۔ جب حضرت دیکھتے تو پورا دیکھتے اور آنکھیں نیچے کرتے۔ پیشانی مبارک کشادہ تھی اور بھویں دونوں ملے ہوئے اور کماندار تھے اور ان کے موئے پر سے تھے۔ بینی مبارک ہموار باریک اور بیچ میں بلند تھی اور دہن شریف بلند تھا۔ دندان مبارک نہایت سفید درخشاں براق آبداری اور رونق کے ساتھ تھے۔ "

آنحضرت صلعم کی بزم کا حال اس طرح قلمبند فرماتے ہیں:۔

" بعد عروہ مسعود کو کوری آنکھ دیکھنے لگا کہ حضرت کے روبرو نہایت ادب سے بیٹھتے ہیں اور کچھ کلام فرماتے تو اس کو کمال دوست رکھتے اور منھ کیے تو اس پانی کو پینے ایک پر ایک گرتے ہیں اور بات پکار نہیں کہتے اور تعظیم سے حضرت کی طرف نظر جماتے ہیں۔ "

ایک جنگ کے واقعات کو یوں تحریر فرمایا ہے:۔

"مسلمانان بھی اپنی فوج آراستہ کر کر ان کے مقابلہ میں گئے اس قدر جنگ ہوا آخر زید بن حارثہ نیزوں
کے ماروں سے زخمی ہوئے اور نشان کے تئیں جعفر بن ابی طالب نے کے جنگ پر مستعد ہوئے دونوں
لشکر جب باہم خلط ہوئے جعفر گھوڑے پر سے اُتر کر اس کے ٹاپنے مار کے جنگ شروع کیے۔ سیدھا
ہاتھ اُڑ گیا بائیں ہاتھ میں نشان لیے۔ وہ بھی کٹ گیا تو چھاتی سے لگائی آخر شہید ہوئے۔"

مصنف مرحوم کی سب سے پہلی تصنیف ریاض النسوان ہے جس کو آپ نے سنہ ۱۲۲۴ھ میں تصنیف فرمایا جب کہ آپ کی عمر
۱۶ سال کی تھی۔ یہ فقہ شافعی کی بہترین کتاب ہے جس میں عقاید و احکام طہارت و عبادت بشرح بسیط جمع کیے ہیں۔ اس کتاب نے
جس قدر عام نفع پہنچایا ہے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمام ضروری مسایل عام فہم زبان میں بیان کر دیے گئے ہیں
کہ سامنے پھر دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

"کتابان فقہ شافعی کے عربی زبان میں بہت تصنیف ہوئے ہیں لیکن عورتان اور اکثر عوام الناس
کے تئیں زبان عربی سے کچھ آشنائی نہ ہونے کے سبب سے ان کے حاصل کرنے سے قاصر رہتے
ہیں اس واسطے یہ عاجز چند مسایل فقہ کے زبان ہندی میں جمع کیا تا لوگاں مستفید ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے مختلف باب میں اپنی کتاب کو تقسیم کیا ہے اور اس کو کتاب کا نام دیا ہے مثلاً کتاب الایمان، کتاب
الطہارت، کتاب الصلوٰۃ وغیرہ اور پھر ان میں فصل مقرر کیے ہیں جن میں مختلف مسائل کو بیان کیا ہے۔ مسائل کے بیان کا طریقہ
یوں ہے:-

"اوّل رکن اسلام کا بعد از کلمہ توحید کے نماز ہے اور نماز بے طہارت کے درست نہیں اور پانی مستعمل
یعنی ٹھنڈا پانی جو ایک بار کسی فرض کام میں کیا ہے اگرچہ پاک ہے لیکن پاک کرنے والا نہیں ہے۔
فرض کام کیا مثلاً اس پانی سے غسل فرض یا وضو فرض کیا ہووے یا کوئی نجاست دور کیا ہووے۔"

آپ کی آخری تصنیف تفسیر فیض الکریم ہے جس کو آپ نے صرف سات پاروں تک ختم فرمایا تھا کہ سنہ ۱۲۸۰ھ[1]
میں پیام اجل آپہنچا۔

نفس مضمون کے پہلے آپ نے نزول قرآن اور اس کے جمع کرنے اور تفسیر و تاویل پر بحث کی ہے اور پھر سورہ فاتحہ کی
تفسیر اور اس کی فضیلت بیان کی ہے۔ آپ کی تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن کی آیت لکھتے ہیں اور اس کے معنے بیان کرنے
کے بعد اس پر بحث کرتے جاتے ہیں۔ سحر کا حکم، کسب مباح۔ ریا، شفاعت، خدا رسول اور اولی الامر کی اطاعت، خلق
آدم علی صورتہٖ جہاد کرنے والے کا مرتبہ، اجماع امت، تحریف الخیل، ذبح وغیرہ عنوانات پر کافی بحث کی ہے چونکہ مصنف
کی یہ آخری تصنیف ہے اس لیے نمونہ اس کا بھی درج کرنا بے جا نہ ہوگا۔

---

[1] تاریخ النوائط

"واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً" اور مضبوط پکڑو اللہ کی رسی سب مل کر۔ اللہ کی رسی سے مراد اللہ کا دین ہے یعنی دینِ اسلام کو اختیار کرو۔ اس کو رسی سے تعبیر کیا کیونکہ باریک تنگ راہ میں گرنے اور پیر پھسلنے کا اندیشہ ہو اور رسی جس کے دونوں طرف راہ کے دو جانب سے باندھے ہوں پکڑے تو اس کو خوف نہیں رہتا۔ حق کی راہ بھی بہت باریک تنگ ہے اکثر لوگوں کے پیر اس پر لغزش پاتے ہیں جس نے دینِ اسلام مضبوط پکڑا تو گرنے کے خوف سے نجات پایا۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد قرآن ہے کیونکہ جو اس کے احکام پر چلے گا تو اس کو نجات ہوگی۔ الخ۔

نزولِ الٰہی کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ اُترتا ہے کرکے جو آیا ہے کلام سے اللہ کی رحمت اور بندوں پر متوجہ ہونا اور اُن پر لطف اور مہربانی کرنا مراد ہے"

اس مختصر بیان سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ قاضی بدرالدولہ کی وجہ سے زبانِ اُردو نے مذہبی علوم کے دائرہ میں کہاں تک ترقی کی تھی۔

تبصرہ

دُوسرے دور کا تذکرہ ختم ہو چکا اس دور میں سرِ دست جن شعرا اور نثر نگاروں کا تعارف کیا گیا ہے ان کے کارنامے تاریخ اُردو ادب میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ ہندی والے بھی ان کو اپنی تاریخ میں نمایاں طور سے جگہ دیتے ہیں۔ ان کی خدمات ہر آئندہ قابلِ تحسین ہیں۔ اگرچہ سنہ ۱۸۵۷ء کے قبل صرف شاعری اور نثر نگاری کے سوا دُوسرے اُردو خدمات نہیں ہوئے یعنی کسی ایک اخبار، رسالہ یا انجمن کا تذکرہ نہیں ہوا ہے۔

تیسرے دور میں شاعری اور نثر نگاری کے علاوہ دُوسرے اُردو خدمات کا حال بھی قلم بند کیا جائے گا۔

(باقی آئندہ)

---

۱ قاضی بدرالدولہ کی تمام کتابیں شایع ہو گئی ہیں اور ریاض الصنوان کے ترکی کی اڈیشن شایع ہوئے ہیں۔ ابھی حال میں یہ دونوں کتابیں حیدرآباد سے شائع کی گئی ہیں۔

حضرت آغا شاعر

محمد حبیب اللہ رشدی

حیدر آباد دکن میں ۱۹۳۲ء کا غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ایک روز میں، میرے محترم بزرگ مولانا سید مختار احمد مرحوم، اپنے چھوٹے بھائی جناب سید مرغوب احمد مرحوم کے ہاں گئے۔ انھوں نے بڑی مسرت اور مباہات کے ساتھ ہمیں یہ خبر سنائی کہ —— "میرے استاد حضرت آغا شاعر قزلباش تشریف لائے ہوئے ہیں اور شہید یار جنگ کے ہاں مقیم ہیں ——" میں نے بڑے اشتیاق سے ان سے درخواست کی کہ ہمیں بھی وہاں لے چلیں۔ انھوں نے کہا —— "وہاں جانے کی ضرورت نہیں، حضرت قبلہ روز صبح ٹہلتے ہوئے یہاں تک آجاتے ہیں۔ آپ کل علی الصبح یہاں آجائیں تو ملاقات ہوجائے گی اور اطمینان سے بات چیت بھی کرسکیں گے۔" ہم نے کہا —— "بہت اچھا کل صبح ہم ضرور یہیں آجائیں گے۔"

میرے ان دونوں بزرگوں کے والد، عربی کے جید عالم، مولانا سید عبداللہ ٹونکی تھے جنھوں نے انیسویں صدی کے اواسط میں مصر کے جامعہ ازہر میں عربی کی تکمیل کی تھی، اس کے بعد کئی مرتبہ مصر آتے جاتے رہے تھے۔ عربی زبان پر انھیں اتنی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ بے تکلف شعر کہتے تھے۔ ان کے ایک بے نقط مدحیہ قصیدہ کو دیکھ کر توفیق پاشا خدیو مصر نے تعجب کا اظہار کیا تھا اور لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے نام ایک سفارشی خط دیا تھا۔ جناب سید مرغوب احمد مرحوم نے اپنے والد کے ورثہ علم و ادب میں سے اپنا حصہ رسدی بڑے بھائی سے طلب کرنا شاید خلافِ ادب سمجھا اس لیے اس سے دست بردار ہوکر اپنے لیے ایک ایسا میدانِ عمل تلاش کرلیا تھا جو نہ صرف خاندانی روایات کے لحاظ سے نیا تھا بلکہ خود شہر حیدر آباد کے لیے بھی نیا نیا تھا۔ انھوں نے اس زمانہ میں —— یعنی بیسویں صدی کے آغاز میں —— موٹر کار کی سی نئی نئی ایجاد کی مشینری سے واقفیت حاصل کی تھی اور موٹروں کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں کمال پیدا کیا تھا۔ ان کا کارخانہ جس میں موٹروں کی اور دوسری عام مشینری کی مرمت کی جاتی تھی، حیدر آباد کی ایک بارونق سڑک پر تھا۔ کارخانے سے ملا ہوا اپنے رہنے کا مکان بھی بنوا لیا تھا۔ ان کی آمدنی ہزاروں روپیہ ماہوار کی تھی۔ وہ ہمارے سامنے کئی مرتبہ اپنے استاد حضرت آغا شاعر کا ذکر کرچکے تھے۔ شاگردی کا یہ تعلق تیس سال پہلے کا تھا جبکہ حضرت آغا شاعر اپنے استاد حضرت داغ دہلوی کی زندگی میں حیدر آباد میں قیام فرما تھے۔ میں خیال کرتا تھا کہ جناب مرغوب احمد صاحب کو نوجوانی میں شاعری کا چسکا پڑا ہوگا اور اتفاقات نے حضرت آغا شاعر کے سے خوش گو شاعر کا شاگرد بننے کا موقع فراہم کردیا ہوگا۔

حضرت آغا شاعر نے ریاست جھالاپاٹن (راجپوتانہ) سے ایک ماہوار رسالہ "آفتاب" جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ میں نے حیدر آباد کے کسی کتب خانہ میں یا کسی کالج میں یا کسی اہلِ علم کے ہاں نہیں دیکھا۔ صرف جناب مرغوب احمد کے ہاں ۱۹۲۱ء میں دیکھا تھا جبکہ میں فرسٹ ایر میں زیر تعلیم تھا۔ اس وقت حضرت آغا شاعر کو حیدر آباد سے گئے ہوئے اٹھارہ انیس برس ہوچکے تھے۔ لوگ انھیں

ہو چکے تھے۔ جس انہماک اور اشتیاق سے ساؤ "آفتاب" کا مطالعہ کیا کرتا تھا اس کو دیکھ کر جناب مرغوب احمد صاحب نے اس کے بہت سے پرانے شمارے مجھے دے دیئے تھے جن کو میں نے تقسیم ہند کے وقت تک بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن حیدرآباد سے میری منتقلی کے دوران میں بہت سی کام کی کتابوں کے ساتھ ساتھ "آفتاب" کے سارے پرچے خبر نہیں کہاں ہجرت کر گئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وطن کی محبت نے انھیں میرے ساتھ ہجرت کرنے نہیں دی۔ اس وقت میری کتابوں میں صرف ایک نومبر ۱۹۱۲ء کا پرچہ رہ گیا ہے۔

جناب مرغوب احمد مرحوم کی زبانی حضرت آغا شاعر کی آمد کا میں نے جو ذکر کیا ہے اس زمانے میں حضرت جوش ملیح آبادی ہمارے مکان سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک باغ والے بنگلے میں اٹھ آئے تھے۔ اُن دنوں ہمارا یہ معمول تھا کہ میں صبح سویرے تیار ہو بیٹھتا تھا کہ حضرت جوش ملیح آبادی تشریف لاتے ہم دونوں تفریح کے لیے "باغ عامہ" جاتے جو قریب ہی تھا۔ گھنٹہ آدھا گھنٹہ گھوم پھر کر سورج نکلنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے۔

جس روز حضرت آغا شاعر سے ملاقات کا ارادہ تھا، اس روز بہت ہی سویرے سے میں اور حضرت مولانا مختار احمد صاحب تیار ہو کر باہر نکلنے ہی والے تھے کہ جناب جوش کا ڈنڈا دروازے پر برسا۔ میں فوراً باہر نکلا۔ تشویش یہ تھی کہ حضرت جوش غزل کے مخالف ہیں، اس لیے حضرت آغا شاعر کے سے قدیم غزل گو سے ملنا پسند بھی کریں گے یا نہیں۔ میں نے جناب جوش سے کہا ——— "حضرت آغا شاعر آئے ہوئے ہیں، وہ صبح سویرے مرغوب احمد صاحب کے کارخانہ تک آتے ہیں۔ اس وقت میں مولانا سید مختار احمد صاحب کے ساتھ وہیں جا رہا ہوں۔ کیا آپ بھی تشریف لے چلیں گے؟" ——— یہ میں نے کچھ ایسے مضمحل لہجے میں کہا جس کا جواب میرے نزدیک یقینی انکار تھا۔ لیکن میری توقع کے خلاف جناب جوش نے بھی حضرت آغا شاعر سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ حضرت جوش کے لیے جناب مرغوب احمد کوئی نئے آدمی نہیں تھے۔ حضرت جوش کی موٹر کار کو اکثر بیمار پڑ جانے کی عادت تھی اس کی وجہ سے یہ دونوں مدت سے ایک دوسرے سے متعارف تھے۔

غرض ہم تینوں جناب مرغوب احمد کے ہاں پہنچے۔ وہ اپنے کارخانے کے پھاٹک کے سامنے کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا ——— "حضرت قبلہ بس اب آتے ہی ہوں گے" ——— پھر یہ کہا ——— "یہاں انتظار کرنے کے بجائے کیوں نہ ہم خود اُدھر چلے چلیں؟" ——— ہم لوگ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ دور سے حضرت آغا شاعر آتے دکھائی دیے۔ جناب مرغوب احمد صاحب نے کہا ——— "دیکھیے وہ تشریف لا رہے ہیں" ——— انھوں نے آغا صاحب سے ہمارا تعارف کرایا۔ اب ہم سب آغا صاحب کے ساتھ کارخانے کی طرف چلے۔ وہاں پہنچنے سے پہلے جناب مرغوب احمد صاحب نے آغا صاحب سے کہا ——— "حضرت آپ کو حیدرآبادی نہاری کھائے بہت زمانہ ہو گیا ہوگا، یہاں قریب ہی ایک نیا ہوٹل کھلا ہے اس میں نہاری کا بھی انتظام ہے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو نہاری کھائی جائے" ——— آغا صاحب نے کہا ——— "ہاں ہاں چلو" ———

یہ صحبت دیر تک رہی۔ گفتگو میں جناب مرغوب احمد اور جناب جوش ہی زیادہ حصہ لیتے رہے۔ . . . .

. . . . کبھی کبھی حضرت مولانا مختار احمد بھی ایک آدھ فقرہ فرما دیتے تھے۔ میں خاموش تماشائی بنا ر

اس افسانوی ہستی کی باتیں سُنتا رہا جس کا برسوں سے ذکر سُن چکا تھا۔ میرے لڑکپن میں حیدر آباد دکن میں ایک غزل بہت گائی جاتی تھی جس کا مطلع ہے:

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ صورت کیوں بنی غم کی
تمھارے دشمنوں کو کیا پڑی ہے میرے ماتم کی

ادبی شعور پیدا ہونے کے برسوں بعد مجھے یہ معلوم ہُوا کہ یہ غزل حضرت آغا شاعر کی تھی۔ میرے لڑکپن میں حیدر آباد میں حضرت داغ کا بڑا چرچا تھا۔ انھیں انتقال کیے چند ہی سال ہوئے تھے۔ شہر میں اُن کے کئی شاگرد موجود تھے جو اُستاد مانے جاتے تھے۔ ایک شاگرد حضرت نادان تھے جو حضرت داغ سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ ایک صاحب ضیاء الدین ضیا گورگانی تھے جن کی بیوی حضرت داغ کی اہلیہ کی قریبی عزیزہ تھیں۔ اس لحاظ سے وہ گویا حضرت داغ کے داماد تھے۔ غالباً حضرت داغ ہی کے تعلق سے حیدر آباد آئے تھے اور سرکاری ملازم ہو گئے تھے۔ یہ مُغلیہ شہزادے تھے۔ "صاحب عالم" پکارے جاتے تھے۔ غزل کے معاملے میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اُنھوں نے طویل عُمر پائی۔ تقسیم ہند سے سال دو سال پہلے مجھے ایک مرتبہ اُن سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا تھا اور چند غزلیں اُن کی زبان سے سُنی تھیں۔ (اُس وقت اُن کی عمر اسّی پچاسی سال کی تھی) ایک طوائف بھی بقیدِ حیات تھیں جو حضرت داغ کی ملازمت میں رہ چکی تھیں۔ اکثر شاگردانِ داغ اس معمر خاتون کی بڑی عزت و تعظیم کیا کرتے تھے۔ بعض شاگرد مشاعرے میں جانے سے پہلے اُن کو اپنی غزل سُنانا باعثِ برکت سمجھتے تھے اس لیے انھیں غزل سُنائے بغیر مشاعرے میں نہیں جاتے تھے۔ ایک حضرت بارق تھے جن کا اسی زمانے میں انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے ایک عزیز میرے ہم محلہ اور لڑکپن کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔ مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ ہم لوگوں کو اپنی غزل سُنا کر رُعب جماتے تھے۔ بعض واقف کار کہتے تھے کہ ـــــ "اس کے ہاں حضرت بارق کا کلام ہے۔ اُنھیں کی غزلیں ہیں جو یہ اپنے نام سے سُناتا ہے۔ اس کو تو ایک مصرع بھی موزوں کرنا نہیں آتا"

غرض، ۱۹۳۳ء میں حضرت آغا شاعر کے سامنے بیٹھ کر اُن کی باتیں سُنتے ہوئے لڑکپن کی ساری باتیں حافظے میں اُبھر آئیں۔ داغ پرستی کا زمانہ گزر چکا تھا۔ یونیورسٹی سے ہر سال بیسیوں گریجویٹ نکل رہے تھے۔ مولانا سید وحید الدین سلیم پانی پتی اُردو کے پروفیسر تھے۔ غزل دشمنی اُن کی حیثیت کا جزوِ ایمان تھی۔ اُن کی تلقین اور تبلیغ سے بہت سے شاگرد غزل اور غزل گوئی کے خلاف ہو کر کالج سے نکلتے تھے جن کے نزدیک داغ اور امیر شاعر ہی نہیں تھے۔ ہاں خوب یاد آیا ـــــ ایک مرتبہ حضرت سلیم کے مکان پر ہم چند طالب علم بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا حسبِ عادت، غزل کے خلاف تشنیع اور تضحیک کے تیر چلا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ داغ بھی زیرِ بحث آ گئے۔ میرا ادبی شعور داغ پرستی کی فضا میں بیدار ہُوا تھا، مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا اُس کا مفہوم کچھ اس قسم کا تھا کہ کچھ ہی ہو، داغ کا شاعرانہ مرتبہ بڑا ہے۔ اس پر حضرت سلیم بپھر گئے۔ کہنے لگے ـــــ "اچھا داغ کا کوئی ایسا شعر سُناؤ جسے تم واقعی شعر سمجھتے ہو" ـــــ حضرت سلیم نے اس تیقن کے ساتھ یہ فقرہ فرمایا تھا کہ میں جو بھی شعر سُناؤں گا اُس میں وہ تضحیک کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیں گے۔ کچھ غور کے بعد مجھے داغ مرحوم کا یہ شعر یاد آیا:

ہم مرمٹے تو پرسشِ نام و نشاں ہے اب　　اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

خدا بخشے، مولانا بسمل کی بہت سی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ حق ناشناس نہیں تھے۔ مجھ سے یہ شعر سُن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ تغزل کے ایک پہلو کا کوئی پہلو نظر آیا۔ دھیمے لہجے میں یہ فرمایا ——— بھئی، کہتے کہتے غزل کے ایک آدھ اچھا شعر بھی سرزد ہو جاتا ہے ——— میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا! ——— غرض حضرت آغا شاعر کی سحر آگیں گفتگو کی وجہ سے وہ صحبت دیر تک جمی رہی۔ رخصت کے وقت حضرت آغا سے آئندہ ملاقات کے وقت و قیام کا تعین کر کے ہم لوگ گھر واپس ہوئے۔

اس کے بعد حضرت آغا شاعر سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ رفتہ رفتہ مجھ پر بڑی نظرِ عنایت فرمانے لگے تھے۔ ان ملاقاتوں میں مجھے جو باتوں کا علم ہوا ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اُنھوں نے تھیٹروں کے لیے کئی ڈرامے بھی لکھے تھے جو تھیٹر کمپنیوں کے مالکوں کو فروخت کر دیے گئے اور کھیلے بھی گئے۔ حضرت آغا شاعر سے جب حشر کاشمیری کا ربط ضبط بڑھا تو ایک مرتبہ آغا حشر نے کہا ——— تمھارے نام کے ساتھ یہ آغا کا لفظ بہت اچھا لگتا ہے۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں بھی اپنے تخلص کے ساتھ یہ لفظ استعمال کروں۔ ——— آغا شاعر نے فرمایا ——— اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ ضرور یہ لفظ استعمال کیجیے۔ ——— آغا صاحب نے بڑی صاف دلی کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ ——— ڈرامے کے معاملے میں آغا حشر کے ڈراموں کی قدر میرے ڈراموں سے زیادہ تھی۔ اُنھیں اپنے ڈرامے کے دو ہزار روپیہ ملتے تھے اور مجھے صرف ایک ہزار۔[1]

آغا صاحب کو اپنے منظوم ترجمہ قرآن مجید کی طباعت کی بڑی فکر تھی۔ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد دکن آنے کا ایک بڑا مقصد یہی تھا۔ منجملہ اور باتوں کے ہماری گفتگو کا موضوع زیادہ تر اسی مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں پیروی اور تدبیر کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ مسلمانوں کے قومی زوال کے اسباب میں اس خاص سبب پر بہت کم غور کیا جاتا ہے کہ حقیقی خادمانِ علم و ادب کے ساتھ ہمارے صاحبانِ اقتدار کس درجہ مجرمانہ تغافل سے کام لیتے ہیں۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں صرف چند والیانِ ریاست اور اُمرا نے ادبی سرپرستی کے فرض کو پہچانا۔ ایسی ریاستوں میں حیدرآباد کی ریاست کو شاید پہلا درجہ حاصل تھا اور ریاست کے امرا میں مہاراجہ کشن پرشاد کا نام سرِ فہرست تھا۔ افسوس ہے کہ حیدرآباد میں حضرت آغا شاعر نے جن صاحبانِ اقتدار کی سرپرستی پر بھروسا کیا اُنھوں نے اس فرض کو نہ پہچانا۔ آغا صاحب کی بزرگی، اُن کی زبان دانی اور شعر گوئی میں اُن کے وسیع تجربے وغیرہ کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا، ورنہ منظوم ترجمۂ قرآن مجید کی طباعت کے اخراجات کی منظوری اور آغا صاحب کا ایک معقول وظیفۂ علمی کا جاری ہونا کچھ مشکل بات نہیں تھی۔ ڈھائی مہینے کی تگ و دو کرنے کے بعد آغا صاحب کو مایوس ہونا پڑا۔

(۲)

مولانا سید مختار احمد مرحوم کے کتب خانہ میں ماہوار رسالہ "زبان" کے ایک سال کے پرچے مجلد تھے۔ یہ رسالہ دہلی کے ایک بندۂ رحمٰن نکالتے تھے۔ میں نے حضرت آغا شاعر کا نام اس میں دیکھا تھا۔ میں نے بڑے شوق سے اُس کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر اب مجھے یاد نہیں کہ

---

[1] ورجیشور پرشاد مائل دہلوی۔

رسالہ "زبان" کی وہ جلد کس سنہ کی تھی البتہ اتنا یاد ہے کہ اس کے ایک شمارے میں حکیم محمود خاں دہلوی کی وفات کا تذکرہ تھا۔ پرچہ کے مالک نے اپنی والدہ کی علالت کا حال بیان کر کے یہ بتایا تھا کہ حکیم صاحب مرحوم نے کیسا عجیب علاج کیا تھا۔ حکیم محمود خاں دہلوی کی وفات ۱۸۹۱ء میں ہوئی اس لیے رسالہ "زبان" کی وہ جلد بھی اُسی سنہ کی ہو گی۔

حضرت داغ دہلوی ۱۸۹۱ء سے پہلے حیدرآباد دکن آ چکے تھے اور امیدوار ملازمت تھے۔ فروری ۱۸۹۱ء میں مرحوم حضور نظام میر محبوب علی خاں نے اپنی غزلوں کی اصلاح اُن کے ذمّہ کی۔ تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہوار منظور ہوئی۔ بعض لوگ بارہ سو اور بعض پندرہ سو بھی بتاتے ہیں۔ میرے قدیم کرم فرما مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں دو ہزار بتائی ہے غرض اس سال سے حضرت داغ کو ذریعۂ معاش سے اطمینان حاصل ہوا۔ داغ کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی۔ وہ پہلے دربار رام پور سے وابستہ تھے۔ نواب کلب علی خاں مرحوم کی وفات کے بعد رام پور میں نہ رہ سکے۔

شاہ دکن میر محبوب علی خاں کے اُستاد بن جانے کے بعد حضرت داغ حیدرآباد کے رؤسا اور شرفاء سے بھی روشناس ہوئے اور شعراء سے بھی۔ حیدرآباد میں اُن کے بہت سے شاگرد تھے۔ ڈاک کی سہولتوں کے عام ہو جانے کی وجہ سے سارے ہندوستان سے اصلاح کے لیے غزلیں آنے لگیں۔ حضرت علامہ اقبال نے بھی چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجی تھیں۔

قیاس یہ ہے کہ حضرت آغا شاعر بھی اپنی غزلیں اصلاح کے لیے بذریعہ ڈاک حیدرآباد بھیجنے لگے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسالہ "زبان" سے آغا صاحب کا تعلق منقطع ہونے کے بعد اُنھوں نے حیدرآباد آنے کا ارادہ کیا ہو اور اُستاد سے مشورہ کر کے حیدرآباد کا رُخ کیا ہو اور دہلی سے اپنی روانگی کی اطلاع بھی کر دی ہو۔ لیکن دُوسرا قیاس یہ ہے کہ آغا صاحب کے کوئی بزرگ جو پہلے سے حیدرآباد میں مقیم تھے اور حضرت داغ سے ربط رکھتے تھے وہی اُستاد شاگرد کے درمیان متوسّل رہے ہوں۔ یہ قیاس اس بنا پر قائم ہوتا ہے کہ آغا صاحب نے "بزمِ داغ کے چشم دید نقوش" کے عنوان سے جو سلسلۂ مضامین لکھا ہے اُس میں اپنے خلاف شاگردانِ داغ کی ایک سازش کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ——— "مجھ سے یہ ساری کہانی چچا صاحب مرحوم نے نقل کی تھی" ——— بہرحال حیدرآباد میں اُستاد شاگرد کی پہلی ملاقات ایک دلچسپ لطیفہ ہے جو یہاں پیش کرتا ہوں۔

حضور نظام میر محبوب علی خاں مرحوم کے زمانے تک حیدرآباد کے امرا قدیم مغلیہ دربار کے امرا کا نمونہ تھے۔ ایک نواب خانان خاناں تھے جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ شہنشاہ اکبر کے مشہور سپہ سالار عبدالرحیم خان خاناں کی اولاد سے تھے۔ ایک مہاراجہ کشن پرشاد تھے جن کے خاندان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ راجہ ٹوڈرمل کی نسل سے ہے۔ ایک راجہ شیوراج رائے رایاں تھے جو کایستھ قوم کے تھے اور مشہور تھا کہ اُن کے جدِ اعلیٰ بانیٔ سلطنت آصفیہ نظام الملک آصف جاہ اوّل کے محاسب اعلیٰ یا جدید اصطلاح میں وزیرِ فینانس تھے اور اُنھیں کے ساتھ دہلی سے دکن آئے تھے۔ ان کے علاوہ امرائے پائیگاہ اور دُوسرے بڑے بڑے جاگیردار بھی تھے جو سلطنت آصفیہ کے رُکن رکین تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد، حضور نظام میر محبوب علی خاں کے ساتھ کھیلے تھے۔ ریاست کا ایک قدیم عہدہ "پیشکاری" (یعنی پرسنل سیکرٹری کا) تھا جو مہاراجہ کا موروثی عہدہ بن گیا تھا۔ یہ عہدہ اگرچہ نام کا عہدہ رہ گیا تھا اور کوئی فرائض اس سے متعلق نہیں تھے مگر ریاست

سے اس کی [illegible] ... حضور نظام مرحوم نے آئینی جدید طرز کی حکومت یعنی مجلس عاملہ (کیبنٹ) میں پہلے پہل آپ کو وزیر اعظم بنایا تھا اور بعد میں "دیوانی" یعنی وزیر اعظم بنا دیا تھا۔ وہ اس عہدہ پر مرحوم حکمراں کی وفات تک کام کرتے رہے۔ موجودہ نظام میر عثمان علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد انہیں وزارت عظمیٰ سے ہٹا دیا اور سر سالار جنگ اوّل کے پوتے نواب یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث کو وزیر اعظم بنایا تھا۔ علم و ہنر کی قدر دانی اور شعرا نوازی میں مہاراجہ کشن پرشاد کے برابر کوئی دوسرا امیر نہیں تھا۔

جس زمانے میں حضرت آغا شاعر حیدرآباد گئے ہیں، مہاراجہ کشن پرشاد جوان تھے، شعر و شاعری سے بڑا شغف رکھتے تھے، مشاعروں کی خود صدارت کرتے تھے۔ آغا صاحب کے بیان سے تو یہ اطلاع ملتی ہے کہ اکثر "چندو لعل کی بارہ دری" میں بزمِ شاعر منعقد ہوتی تھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد دیوان چندو لعل شاداں کے پرنواسے اور اُن کی جاگیر، املاک اور عہدۂ پیشکاری کے وارث تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشاعرے انہیں کے ایما سے ہوتے تھے اور سرکاری مشاعرے کہے جاتے تھے۔

آغا صاحب جب حیدرآباد پہنچے تو اُنھوں نے محلّہ دار الشفا میں اپنے ایک دوست سید حسن مرزا صاحب دہلوی ادیب کے ہاں قیام کیا لیکن یا تو ریل ہی میں بیمار ہو گئے تھے یا شہر میں داخل ہوتے ہی مرض نے حملہ کیا۔ مرض کچھ اس قسم کا تھا کہ معالجہ کے لیے اُن کا ہسپتال میں داخل ہونا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ حیدرآباد کے صدر ہسپتال میں جو "دواخانۂ افضل گنج" کہلاتا تھا، داخل ہو گئے۔ کئی روز زیرِ علاج رہنے کے بعد اُن کی طبیعت ٹھیک ہوئی اور ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ شفاخانے سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ آج ہی شام کو سرکاری مشاعرہ ہے۔ مصرعِ طرح پر ایک پھڑکتی ہوئی غزل کہی اور شام کو مشاعرے میں جا پہنچے۔ مہاراجہ کشن پرشاد صدرِ مشاعرہ تھے۔ ان کے قریب حضرت داغ تشریف فرما تھے۔ آس پاس اُس عہد کے نامور شعراء اور رؤسا جمع تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ جب شمع آغا صاحب کے سامنے آئی تو آغا صاحب نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ——— "میرا قاعدہ یہ ہے کہ میں اپنا ناچیز کلام سنانے سے پہلے تبرکاً اپنے استاد کا کچھ کلام سناتا ہوں۔ اس وقت میں اپنے اُستاد کے دو شعر پیش کرتا ہوں" ——— یہ کہہ کر آغا صاحب نے اپنے اُستاد کا نام لیے بغیر دو اشعار سنائے۔ اشعار سن کر شاگردانِ داغ اور خود حضرت داغ سناٹے میں آ گئے کہ یہ کون شخص ہے جو میرے اشعار کو اپنے اُستاد کے بتا کر سنا رہا ہے۔ حضرت داغ نے پوچھا ——— "آپ کے اُستاد کون ہیں ذرا ان کا نام بتا دیجیے" ——— آغا صاحب نے بلند آواز سے کہا ——— "میرے اُستاد ہیں حضرت فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی" ——— مہاراجہ بہادر نے چپکے سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟" اُستاد داغ نے فرمایا ——— "میں نہیں جانتا، آج پہلی مرتبہ یہ صورت دیکھی ہے" ——— پھر اُستاد داغ نے پوچھا ——— "آپ کون صاحب ہیں، ذرا اپنا نام بتائیے" ——— آغا صاحب نے کہا ——— "جی میں آغا شاعر ہوں" ——— داغ نے کہا ——— "اوہ بھئی آغا تم کب آئے؟ مجھ سے کیوں نہیں ملے؟ ذرا یہاں آؤ" ——— آغا صاحب قریب گئے۔ اُستاد نے گلے سے لگایا۔ پھر پوچھا ——— "تم مجھ سے ملے کیوں نہیں" ——— آغا صاحب نے کہا ——— "بتا کیسے، آتے ہی بیمار پڑ گیا، ہسپتال میں داخل ہوا۔ اتنے دن ہسپتال میں رہا لیکن آپ نے خبر تک نہ لی"

اُستاد سے مل ملا کر اپنی جگہ جا بیٹھے جو غالباً نومشق شعرا میں تھی۔ صدرِ مشاعرہ مہاراجہ کشن پرشاد نے کہا ——— "آغا صاحب ذرا قریب آ جایئے" ——— آغا صاحب کھسک کر کچھ آگے بڑھے۔ مہاراجہ نے کہا ——— "اور آگے آیئے" ——— آغا صاحب

اور آگے بڑھ کر مہاراجہ کے قریب پہنچ گئے۔ مہاراجہ نے کہا —— "اور آگے آئیے" —— اس سے آگے بڑھنے میں ادب مانع تھا۔ آغا صاحب نے جھلا کر کہا —— "تو کیا حضور کی گود میں آ بیٹھوں؟" —— آغا صاحب کی اس جھلاہٹ پر مہاراجہ زیر لب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ آغا صاحب نے غزل سنائی اور خوب خوب داد پائی۔ یہ تھی شاگرد کی اُستاد سے پہلی ملاقات!

۱۹۲۱ء میں آغا صاحب نے اپنے رسالہ "آفتاب" میں ایک نہایت دلچسپ سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا —— "بزم داغ کے چشم دید نقوش" —— اس سلسلہ کا غالباً پہلا مضمون یہی واقعہ تھا جس کو میں پڑھ چکا تھا۔

۱۹۳۶ء میں آغا صاحب سے جو ملاقاتیں رہیں اُن میں ایک روز میں نے اس واقعہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ آغا صاحب نے تفصیل کے ساتھ سارا واقعہ سنایا۔ رسالۂ آفتاب میں جو کچھ چھپا تھا وہ بہت مختصر تھا۔ خود آغا صاحب کی زبان سے اس واقعہ کو سن کر جو مزا آیا وہ چھپے ہوئے مضمون سے کہیں زیادہ تھا۔

افسوس ہے کہ میں اُن سے یہ نہ پوچھ سکا کہ وہ پہلی مرتبہ کس سنہ میں حیدر آباد تشریف لائے تھے۔ کچھ تو اُن کی بزرگی کا رعب اور کچھ میری عقیدت، اِن دونوں نے میرے لبوں پر مُہر سی لگا دی تھی۔ وہ جو کچھ فرماتے اُسے سُن لینا ہی اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔ اپنی طرف سے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ صرف حضرت جوش ہی ایسے آدمی تھے جو اپنے شوخ ظریفانہ فقروں سے اُن مرحوم کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جناب جوش کے ہاں (اسی باغ والی کوٹھی میں) حضرت آغا شاعر تشریف فرما تھے' میں بھی موجود تھا۔ جناب جوش نے نہایت اصرار کے ساتھ کہا —— "حضرت آپ میرے یہاں قیام فرمائیے" —— آغا صاحب نے اپنے عادتی حزنیہ لہجہ میں جواب دیا —— "نہیں جوش، تمہیں بڑی زحمت ہو گی۔ مجھے صبح سویرے ہی وضو کے لیے گرم پانی درکار ہوتا ہے" —— وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ جناب جوش نے بات کاٹتے ہوئے ڈرامائی لہجہ میں کہا —— "کیا حضرت آپ وضو، طہارت وغیرہ یہ سب حرکتیں کرتے ہیں؟" —— جناب جوش نے یہ فقرہ کچھ اس انداز سے کہا کہ آغا صاحب ہنس پڑے اور اپنے اسی لہجہ میں جواب دیا —— "جوش کبھی میں بھی جوان تھا" —— میں نے کہا یہ نادر اتفاق ہے کہ "جوان جوش" اور "بوڑھا جوش" دونوں یکجا ہیں۔

(۳)

آغا صاحب پہلی مرتبہ کس سال حیدر آباد دکن گئے؟ کتنی مدت وہاں قیام کیا؟ ان کا ذریعۂ معاش وہاں کیا رہا؟ —— یہ تین سوالات ایسے تھے جن کا جواب مجھے حیدر آباد میں کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں مجھے حیدر آباد میں آغا صاحب سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ اب ۱۹۶۲ء میں اس ملاقات کو چھبیس۲۶ سال ہوتے ہیں۔ اتنی مدت کے بعد یہاں کراچی میں چند ہی روز قبل ان سوالات کا جواب ملا ہے۔ آغا صاحب کے فرزند جناب سرخوش کی عنایت سے مجھے رسالہ "کنول" کا مارچ ۱۹۲۹ء والا نمبر دیکھنے کا موقع ملا جس میں آغا صاحب کا ایک مضمون —— "فقیر کی پہلی پھیری" —— شائع ہوا ہے۔ اس مضمون سے نہ صرف ان سوالوں کا جواب ملتا ہے بلکہ حیدر آباد کے دور کی ایک جھلک بھی نظر آ جاتی ہے جو میری آنکھوں کے سامنے شمع سحری کی طرح جھلملا کر ختم ہو گیا۔

آغا صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ حیدر آباد گئے اور محلہ "دارالشفا" میں اپنے ایک دوست سید حسن مرحوم کے

دہلوی[1] اقامت جہاں پر قیام کیا۔ چند ہی روز کے بعد وہ راجہ رائے رایاں بہادر،[1] انتظامی امورِ جاہی کی بارگاہ میں پہنچ دیے گئے۔ راجہ صاحب کے یہ سب خاندانی خطابات ہیں۔ آغا صاحب نے جس ہستی کا ذکر فرمایا ہے ان کا نام "کشن پرشاد" تھا۔ ان کے صاحبزادے راجہ شام راج بہادر تقسیم ہند سے پہلے حکومت حیدرآباد کے وزیر رہ چکے ہیں اور غالباً حیات ہیں یہ خاندان حیدرآباد کے امرائے عظام میں شمار کیا جاتا ہے۔ آغا صاحب شہسوار بھی تھے۔ فرماتے ہیں:-

"شرگیا جب راجہ رائے رایاں بہادر کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں صرف قلم ہی کا مرد نہیں ہوں، بلکہ اچھا خاصا شہسوار بھی ہوں، پھر تو راجہ صاحب کے اصطبل سے گزر کر سرِ عام راجہ بہادر (کشن پرشاد) کے اصطبل تک رسائی ہوگئی۔ یعنی رستم، کیوترس جیسے قیمتی گھوڑے صبح و شام میری سواری کے لیے مخصوص ہوگئے۔"

اس زمانے میں حیدرآباد کے اُمرا کو شاعری سے کتنی دلچسپی تھی۔ آغا صاحب کے اس بیان سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

"اسی زمانے میں راجہ رائے رایاں بہادر کو بھی شاعری سے کچھ ایسی دلچسپی ہوئی کہ ایک خاص مشاعرہ بھی قائم ہوگیا جس میں مکرمی میر نادر علی برتر اور مرحوم منشی منتخب الدین تجلی، سکرٹری و نائب سکرٹری ہوئے۔ یہ فقیر بھی ان مشاعروں کا جزو لاینفک بن گیا۔ غرض خوب خوب صحبتیں ہوئیں . . . . القصہ، یہ اکثر مشاعرے ہیں رُوح رواں مشاعرہ قرار دیا جانے لگا۔ خدا غریقِ رحمت کرے، اس وقت حضرت فصیح الملک بہادر مرزا داغ مرحوم بھی زندہ تھے۔ پھر تو مولانا ضیاء، گرامی، ترکی، حسامی، رسوا، اچھے اچھے کہنے والوں سے صحبتیں رہیں۔ اللہ اللہ! اس وقت کا حیدرآباد کچھ جہان آباد[2] سے کم نہ تھا۔"

میر نادر علی برتر فارزی بہاری حضرت نصیر دہلوی کے شاگرد تھے اور حضرت ظہیر غالب کے شاگرد تھے۔ حضرت برتر کی ایک غزل میری طالب علمی کے زمانے میں بچہ بچہ گاتا پھرتا تھا۔ یہ غزل سارے ہندوستان میں مقبول ہوئی۔ حقانی محفلوں میں قوال اسے برسوں گاتے رہے۔ گراموفون ریکارڈوں میں بھی بھری گئی تھی۔ حضرت برتر کے ایک شاگرد، حیدرآباد کے ایک سیمین خاندان کے فرد، جناب عبدالکریم داکانی المتخلص بہ "تہذیب" سے میری ملاقات یہاں کراچی میں ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ حضرت برتر کے حالات مجھے "تہذیب" مرحوم سے معلوم ہوئے جن میں ایک بات یہ تھی کہ حضرت برتر شاعری میں راجہ رائے رایاں کے اُستاد تھے۔ حضرت خواجہ شمس الدین (مدفون اورنگ آباد، دکن) کے مرید ہوئے۔ بیعت کے بعد اُنھوں نے وہ غزل کہی تھی جو اتنی مقبول عام ہوئی۔ مجھے پوری غزل یاد نہیں تھی۔ "تہذیب" مرحوم نے مجھے اس کے پانچ شعر سنائے تھے جو یہاں درج کرتا ہوں

---

[2] دلی۔ شاہجہان آباد

ن :

جانے کیا ساقی کی آنکھوں نے اشارا کر دیا
نذرِ ساغر آج ہم نے زہد و تقویٰ کر دیا

دل کو آزارِ محبت کے مزے آنے لگے
اُس کے میں قربان جس نے درد پیدا کر دیا

میکدے میں کل تو تھا میں خشک ساحل کی طرح
آج ساقی نے مجھے قطرے سے دریا کر دیا

کعبہ والوں سے جو پوچھی میں نے منزل یار کی
بتکدے کی سمت چپکے سے اشارا کر دیا

ہم بُرے سے تھے بُرے بر تر خدا کا شکر ہے
اک نگاہِ شمس نے اچھے سے اچھا کر دیا

حضرت نادر علی برتر ۱۹۲۱ء تک بقیدِ حیات تھے۔ آغا صاحب نے اپنے رسالہ "آفتاب" کے نومبر ۱۹۲۱ء کے پرچے میں اُن کی ایک غزل شائع فرمائی ہے جس کا مطلع ہے :

پھر بہار آئی جنونِ فتنہ ساماں بڑھ گیا
تا بدامن پھر مرا چاکِ گریباں بڑھ گیا

مُنشی منتجب الدین تجلّی مرحوم کے صاحبزادے تمکین کاظمی میرے قدیم کرم فرما تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک بار میں گلبرگہ میں تمکین کاظمی صاحب سے ملنے کے لیے اُن کے مکان پر گیا تو حضرت تجلّی کی زیارت بھی نصیب ہوئی تھی۔ اس کے دو تین سال . . . بعد انھوں نے وفات پائی۔ تمکین کاظمی صاحب نے بے شمار مضامین اور دو تین کتابیں لکھیں۔ ۱۹۶۱ء میں رسالہ نگار کراچی کے جوش نمبر کے لیے انھوں نے ایک مضمون حیدر آباد دکن سے بھیجا تھا افسوس ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت سے پہلے ہمیں کاظمی صاحب کی وفات کی خبر آئی۔

ضیا مُفتی نور الضیاء الدین، ضیا یار جنگ، اورنگ آباد کے ایک جاگیر دار خاندان کے جانشین تھے۔ حیدر آباد میں کئی سال تک مُفتی عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) رہے اور بعد میں ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے۔ مولانا گرامی کی طرح فارسی ہی میں شعر کہتے تھے اور استاد مانے جاتے تھے۔ شاعری کے علاوہ شطرنج اور اپنی قانونی بصیرت میں بہت مشہور تھے۔ موجودہ حضور نظام کے دربار میں ایک زمانہ میں بڑا رسوخ اور وقار رکھتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے گہرے دوست تھے۔ قدیم حیدر آبادی شرافت اور روایات برقرار رکھنے میں اپنی آپ نظیر تھے۔

اس مضمون میں آغا صاحب نے راجہ رائے رایاں بہادر کو کئی جگہ "آفتاب" نام از لکھا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً

مہاراجہ صاحب کی سرکار میں بہ سلسلۂ ملازمت منسلک رہے ہوں گے۔

ایک جگہ سر عبدالقادر مرحوم کے حیدرآباد تشریف لانے اور آغا صاحب کے مولانا شبلی اور عبدالحلیم شرر لکھنوی سے متعارف کرانے کا بھی ذکر فرمایا ہے:

> اسی اثنا میں علامہ شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم جو حسنِ اتفاق سے حیدرآباد کے کسی علمی ادارے میں کام کر رہے تھے میرے محبوب ترین دوست محبی سر عبدالقادر ہی کی وساطت سے ان حضرات کی بھی دید وا دید ہو گئی۔ مولانا شبلی مرحوم تو مجھ ناچیز کے کلام اور طرزِ خواندگی کے اس قدر دلدادہ و شیدا ہوئے کہ بار بار تشریف لاتے اور ناچیز کی عزت بڑھاتے۔ دو چار دفعہ مولوی صاحب نے مجھے اپنے دولت کدہ پر طلب فرمایا اور اس شد و مد سے میرے ناچیز کلام کو پڑھوایا کہ میں پہلے ہی دیوانہ تھا اور رہے سہے حواس کھو بیٹھا۔"

آغا صاحب جب حیدرآباد گئے تھے تو پنڈت رتن ناتھ سرشار مصنف فسانۂ آزاد وغیرہ بقیدِ حیات تھے۔ جناب سرشار کو غالباً مہاراجہ کشن پرشاد نے خود حیدرآباد بلوایا تھا اور اپنے ہاں رکھا تھا۔ ان کی ہر ضرورت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ سرشار ہی کے مشورے اور اصلاح سے مہاراجہ بہادر نے دو تین ناول لکھے تھے جو شائع ہو چکے ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی سرپرستی میں ایک رسالہ "دبدبۂ آصفی" شائع ہوتا تھا۔ اس کی ادارت مہاراجہ بہادر نے سرشار کے سپرد کر دی تھی۔ میں نے حیدرآباد کے ثقہ لوگوں سے یہ سنا تھا کہ آخری زمانے میں جناب سرشار کا توازن دماغی غالباً کثرتِ مے نوشی سے بگڑ گیا تھا۔ اس حالت میں وہ کاغذ کی پرچیوں پر ناول کے سے دو ایک مکالمے لکھتے اور کسی شاگرد پیشہ کو دے کر کہتے کہ مہاراجہ بہادر کو دے آؤ۔ وہ حکم کی تعمیل کرتا۔ شروع شروع میں تو مہاراجہ بہادر نے ان پرچیوں کو دیکھا ہوگا۔ بعد میں جب سب کو یقین ہو گیا کہ ان کا دماغی توازن قائم نہیں ہے تو خود شاگرد پیشہ ان کی ایسی پرچیاں کو اِدھر اُدھر کہیں ڈال دیتے تھے مہاراجہ کے ملاحظہ میں پیش نہیں کرتے تھے۔

۱۹۰۲ء میں جناب سرشار نے وفات پائی۔ ان کی وفات کا دردناک واقعہ آغا صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے جو ان کے مجموعۂ مضامین "نگارستان" میں شائع ہوا ہے۔ وہ ایک مشاعرہ کا حال بیان کرتے ہیں جو شہر کے باہر چندو لعل کی بارہ دری میں منعقد ہوا تھا:

> ..... جب گرامی مرحوم پڑھ چکے تو بارہ بج چکے تھے۔ ان کے بعد حسامی نے دو تین رباعیاں پڑھی تھیں جو رام رنگی کے متوالے ہمارے ملک کے نامور ادیب پنڈت رتن ناتھ سرشار ڈگمگاتے ہوئے شمع کے سامنے خود آ بیٹھے اور کہا ——— اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔

مشاعرے کے ختم ہو جانے کے بعد کے حالات لکھتے ہیں:

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے، پنڈت رتن ناتھ سرشار جو آج ضرورت سے زیادہ پُرکیف تھے، وہ آج شہر نہ جا سکے اور اپنے ایک رفیق سفر شاید مُنشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی کے ہمراہ اسی بارہ دری میں شب باش ہونا پڑا۔ یہ دونوں صاحب چونکہ حضور وزیر صاحب سر مہاراجہ بہادر کے مہمان تھے اس لیے یہاں بارہ دری میں بھی اُن کے لیے ایک خاص کمرہ مخصوص تھا۔ دونوں صاحب وہیں اپنے اپنے بستروں پر جا لیٹے۔ یہ کمرہ بارہا دیکھا بھالا تھا، مگر اس میں لکڑی کی گھڑونچیوں پر آب دار خانہ تھا جس پر پانی کے مٹکے، گگریں، صراحیاں اور گلاس بھرے ہوئے تھے اور دُوسری طرف ویسی ہی گھڑونچیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر دُھلی ہوئی نواڑ کی پٹیاں تہ بہ تہ اُدھر اُوپر چھت تک چُنی ہوئی تھیں۔ اب قسمت کی بات اس کا کسی کو دھیان بھی نہیں رہا کہ پانی کی گھڑونچیاں کس طرف ہیں اور نواڑ کی پٹیاں کدھر ہیں۔ اتفاق سے اسی رات پنڈت جی کو پیاس کی شدت اور خمار کی تونس نے یکایک چونکا دیا۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ آپ دیوانہ وار بستر سے اُٹھ کر پانی کی تلاش میں چلے۔ اس شدتِ اضطراب میں اپنی دانست میں یہی سمجھے کہ آب دار خانہ اُوپر ہی ہے۔ آہ، آہ، مگر وہ موت کا دھوکا تھا، قضا اس غریب کو ان گھڑونچیوں کی طرف لے گئی جن پر نواڑ چنی ہوئی تھی اور وہ اُسی گھبراہٹ میں ٹٹولتے ہوئے، اُنھیں گھڑونچیوں پر جا چڑھے۔ ستم یہ ہوا کہ پانی کا وہاں نشان نہ پا کر جو عالمِ بدحواسی میں ہاتھ پاؤں مارے تو اس غریب کا پاؤں پھسل گیا اور وہ اوندھے مُنہ اس گھڑونچی کے حلقے میں جا گرے۔ ان کے گرتے ہی اُوپر سے اُدھر رکھی ہوئی نواڑ کی پٹیاں دھڑا دھڑ اُنھیں پر آ پڑیں جس کے صدمے سے ان کی جان نکل گئی۔

آہ، آہ، دُوسری صبح کو یہ ہولناک خبر مقامی اخباروں میں تھی۔ بس جو پڑھتا تھا سر پکڑ کر رہ جاتا تھا۔

آغا صاحب نے سرشار کی موت پر ایک مرثیہ بھی کہا تھا۔ اس کے متعلق اپنے مضمون "عمر کی پہلی پہری" میں لکھتے ہیں:

> اسی زمانے میں مشہور و معروف فسانہ نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کا افسوس ناک حادثہ ہو گیا۔ میں نے بھی متاثر ہو کر ایک نظم کہی جو راجہ رائے رایاں بہادر کو بہت پسند آئی۔ سرشار مرحوم مہاراجہ بہادر کے مہمان تھے اور مجھ پر کرم فرماتے تھے۔ میری نظم ان کا مرثیہ تھی۔ ایک دن راجہ رایاں بہادر نے مجھے اپنے ہم رکاب لیا اور سر مہاراجہ بہادر کے حضور میں لے جا کر وہی نظم مہاراجہ کو سنوائی۔ اس طرح حضرت شاد باتقا تک بھی رسائی ہو گئی۔ اب دق چمک گیا۔

جنوری ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات ہوئی اور ان کے سب سے بڑے لڑکے ایڈورڈ ہفتم جو پرنس آف ویلز تھے تخت نشین ہوئے۔ انگلستان میں ان کا دربار تاج پوشی ۱۹۰۲ء کے غالباً ابتدائی مہینوں میں ہونے والا تھا۔ لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے تھے انھوں نے ہندوستان میں بھی باہتمام دہلی جشن تاج پوشی منعقد کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ تمام والیانِ ریاست کو اس دربار میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ لارڈ کرزن کے پیشِ نظر ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ تمام والیانِ ریاست کے سامنے انگریزی فوج کی شان و شوکت کا مظاہرہ کر کے انھیں اور عام ہندوستانیوں کو مرعوب کیا جائے۔ اس سلسلے میں آغا صاحب اپنے اسی مضمون ——— فقیر کی پہلی پھیری ——— میں لکھتے ہیں:

> غرض میں انھیں رنگ رلیوں میں تھا کہ یکایک ۱۹۰۲ء کا دلی دربار زبان زدِ خلائق ہو گیا۔ .... تمام راجہ مہاراجہ طلب ہوئے یہاں تک کہ خود خلد آشیان، نواب میر محبوب علی خاں، اعلیٰ اللہ مقامہٗ، آصف سادس بھی مع اپنے تمام خدم و حشم، جاگیرداروں اور امرائے شان کے دلی جانے پر تیار ہو گئے۔ اعلیٰ حضرت خلد آشیاں کا ایما پاتے ہی ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے بھی پا تراب کر لیا۔ انھیں کے ساتھ ساتھ تمام روسائے دکن کی بھی عنانِ توجہ اُدھر ہی تھی۔ مرحوم راجہ رائے رایاں بہادر، امانت ونت، آصف جاہی کا سکھ ہیش خیمہ بر آمد ہوا۔ ان کی طرف سے دلی کیمپ کا انتظام کرنے کے لیے مرزا علی احمد صاحب سب سے پہلے دلی جانے کو آمادہ ہو گئے۔ قسمت کی بات ابھی میں کہ ہمراہی حضرات اپنے اپنے انتظامات میں پھنسے کہ سب سے پہلے ——— قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند ——— کے موافق، میں بدبخت جو ڈیڑھ سال سے دلی جانے پر اُدھار کھائے تھا، فوراً ایک پیش قرار رقم لے کر پہلے سے پہلے انتظام کرنے کو چل پڑا۔
>
> یہ خبر شدہ شدہ نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ مرحوم کو بھی پہنچی کہ آغا شاعر انتظام کے لیے دلی جا رہا ہے۔ آہ! وہ مر گئے ہیں، اور مجھے مرنا ہے، انھوں نے مجھے فوراً بلوایا اور ہر چند ڈرایا، دھمکایا کہ یہ کیا حماقت ہے بھئی ——— بھلا؟ آغا شاعر اور انتظام؟ جو لوگ تمھیں وہاں خدمت پر وہاں بھیج رہے ہیں وہ یا تو تمھارے سخت دشمن ہیں یا ان کے حواس بجا نہیں۔ دیکھو آغا شاعر! حیدرآباد نہ چھوڑو۔
>
> مگر میں کب سنتا تھا۔ میں نے ان کی منتیں بھی کیں کہ آپ یہ بجا کہتے ہیں لیکن

ہیں وہ حضرت! میں خود ڈیڑھ برس سے وطن جانے کو ترس رہا تھا۔ اب قدرت نے یہ غیب سے سامان پیدا کر دیا ہے۔ خدا کے لیے آپ اس چلتی گاڑی میں روڑا نہ اٹکائیے۔

آخر وہ بشتی بھی مجھے اتنا بضد دیکھ کر خاموش ہو گئے اور میں ۱۹۰۳ء میں دہلی واپس آ گیا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت آغا صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ کیمپ بنوانے کے لیے انھیں مہاراجہ کشن پرشاد نے دس ہزار روپے دے کر بھجوایا تھا۔ حضرت داغ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ آغا صاحب نے جب اس مخالفت کا گلہ شکوہ کیا تو حضرت داغ نے کہا ...یہ یقین ہے کہ تم پھر حیدرآباد نہیں آؤ گے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن آغا صاحب بضد ہوئے تو ...وش ہو رہے۔ ممکن ہے میرا حافظہ غلطی کر رہا ہو اس لیے میں نے آغا صاحب ہی کا بیان یہاں نقل کر دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ...صاحب ۱۹۰۲ء کے آخری مہینوں میں حیدرآباد سے گئے ہوں گے۔ لندن میں جشن تاج پوشی ایڈورڈ ہفتم کی اچانک بیماری کی وجہ ...کئی ماہ ملتوی کرنا پڑا تھا۔ ان کا اپنی ڈی سائٹس کا اپریشن ہوا اور کئی ماہ کی علالت کے بعد اگست ۱۹۰۲ء کو وہ رسم تاج پوشی کے ...لیے۔ ہندوستان میں یہ دربار جنوری ۱۹۰۳ء میں منعقد کیا گیا۔ ظاہر ہے کیمپ وغیرہ کے انتظامات کے لیے لوگوں کو کئی ماہ پہلے ...ی جانا پڑا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۹ء تک آغا صاحب مختلف مقامات میں مختلف مشاغل میں مصروف رہے۔ ڈرامہ نویسی کا یہی ...دور ہوگا۔ ممکن ہے کہ آغا حشر کاشمیری سے اسی دور میں ملاقات ہوئی ہو۔ انھیں نے آغا شاعر کو ڈرامہ لکھنے کی ترغیب دی ہو ...اور انھیں کی کوششوں سے تھیٹروں کے مالکوں تک رسائی اور ڈراموں کی فروخت کے مراحل طے ہوئے ہوں۔ ڈراما نویسی کے ...سلسلے میں آغا صاحب نے کلکتہ اور بمبئی کا سفر بھی کیا ہوگا اور ممکن ہے کچھ مدت ان شہروں میں مقیم بھی رہے ہوں۔

۱۹۱۹ء کے لگ بھگ آغا صاحب کا ریاست جھالاواڑ سے تعلق قائم ہوا ہوگا۔ یہ قیاس ہم نے اس بنا پر قائم کیا ہے کہ ...میرے ہاں رسالہ "آفتاب" کا جو شمارہ ہے وہ نومبر ۱۹۲۶ء کا ہے۔ اس پر جلد ۷ اور نمبر ۱۱ درج ہے گویا ۱۹۲۶ء کے ختم تک ...رسالہ "آفتاب" کو جاری ہوئے سات برس گزر چکے تھے۔

ریاست جھالاواڑ کے حکمران "رانا سر بھوانی سنگھ" آغا صاحب پر بہت مہربان تھے۔ جھالاواڑ کے دس بارہ سال کے قیام میں آغا صاحب نے بڑے اطمینان اور فراغت سے زندگی بسر کی۔ وہاں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ جھالاواڑ سے آغا صاحب کا تعلق منقطع ہو گیا ہوگا۔ اپنے اس خط میں جو جنوری ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا ہے آغا صاحب فرماتے ہیں:

.... میں کیا اور میرا کلام کیا؟ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہوں جو اب یقیناً گل ہو جائے گا۔ کیونکہ آج ۶۰ برس سے ۱۶ سو میل کے دھاوے کر رہا ہوں اور کہیں پاؤں نہیں ٹکتا......

بعض [illegible] جاتا ہے کہ چھ سات برس پہلے یعنی ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ ریاست جھالاواڑ سے آغا صاحب کا تعلق ٹوٹ گیا تھا۔ ظاہر ہے اسی وقت سے رسالہ "آفتاب" کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہوگی۔ ریاست سے قطع تعلق کی وجہ غالباً مہاراجہ سکھ والی ریاست کی وفات ہوگی۔ نئے والی ریاست نے آغا صاحب سے تغافل برتا ہوگا۔ آغا صاحب وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔

ریاست جھالاواڑ کے قیام کے آخری سال دو سال میں یا ریاست سے تعلق ختم ہو جانے کے بعد آغا صاحب عشرۂ محرم ریاست خیرپور میں پڑھا کرتے تھے۔ وہاں سے انہیں چار سو روپیہ (سالانہ) ملتے تھے۔ ذی قعدہ ۱۳۵۰ھ (مارچ ۱۹۳۲ء) کے آخری دنوں میں آغا صاحب نواب شہید یار جنگ کی طلبی پر حیدرآباد آ گئے تھے۔ جمادی الاول ۱۳۵۱ھ (اکتوبر ۱۹۳۲ء) میں شہید صاحب نے پھر آغا صاحب کو حیدرآباد بلایا۔ ڈھائی ماہ کے قیام کے بعد ماہ شعبان ۱۳۵۱ھ (دسمبر ۱۹۳۲ء) میں دہلی واپس آ گئے۔ اس کے بعد پھر کبھی حیدرآباد نہیں آئے۔

آغا صاحب کے جاننے والوں میں شاید دو ہی ایک کو بھی ان کا اصلی نام معلوم نہ ہوگا۔ مجھے بھی یہاں کراچی میں جناب سرخوش سے معلوم ہوا کہ نام "ظفر علی" ہے جو تاریخی نام ہے اس سے ۱۲۹۰ھ کے اعداد نکلتے ہیں اور ۱۸۷۳ء اس سے مطابقت رکھتا ہے۔ سڑسٹھ (۶۷) برس کی عمر پا کر ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء میں آغا صاحب نے رحلت فرمائی۔

الفرڈ نوبل

ضیاالدین احمد برنی

ڈائنامیٹ جیسی دھماکہ پیدا کرنے والی چیز کی آمدنی سے نوبل انعامات کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور اب بھی جب جب انعامات کا اعلان ہوتا ہے دُنیا کے علمی طبقوں میں ایک بہت بڑا دھماکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

آج سے ۱۶۱ سال قبل (۱۸۳۲ء میں) ۲۱ اکتوبر کی صبح کو سویڈن کے پایۂ تخت اسٹاک ہام (Stock holm) کے ایک امیر گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ایلفرڈ برنارڈ نوبل رکھا گیا۔ یہی وہ بچہ ہے جس نے بڑے ہو کر ڈائنامیٹ ایجاد کیا اور اس کے ذریعے جو کروڑوں روپے کمائے اُس کا بہت بڑا حصہ مرتے دم ایسے انعامات کے لیے وقف کر دیا جو سب سے بڑے بین الاقوامی علمی اعزازات سمجھے جاتے ہیں اور ان کے پانے والے نہ صرف عالمگیر اور دوامی شہرت حاصل کر لیتے ہیں بلکہ عمر بھر کے لیے مالی مشکلات سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں۔

ایلفرڈ نوبل چھوٹے سے قد کا اور معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ اس کی صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ وہ بڑا محنتی اور جدوجہد کرنے والا انسان تھا۔ مالدار اور مشہور ہونے کے باوجود اُس کی زندگی بڑی سادہ تھی، اس میں غرور اور بڑائی کا احساس نام کو نہ تھا۔ وہ تقریباً اپنا سارا وقت اپنی تجربہ گاہ میں گزارتا، اور اس سے جو وقت بچتا اپنی ماں کی خدمت میں صرف کرتا۔ اُس نے شادی نہیں کی۔ اُس کی ساری محبتوں کا مرکز اُس کی ماں تھی۔

نوبل کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو صبح کے وقت ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ نوبل ایک عجیب و غریب خبط میں مبتلا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ زندہ نہ دفن ہو جائے اور اس لیے اس نے نصیحت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کی لاش جلا دی جائے۔ چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی۔ مرنے سے کچھ پہلے اس نے ایک پھٹے ہوئے کاغذ پر اپنی مشہور زمانہ وصیت لکھی جس میں درج تھا کہ

رشتے داروں کو تھوڑی سی رقم دینے کے بعد میری ساری دولت (۱¾ ملین پونڈ) ایک انعامی فنڈ کے قیام میں صرف کی جائے جس کا سالانہ منافع برابر کے ۵ انعاموں میں تقسیم کر کے ایک انعام اس شخص کو دیا جائے جس نے فزیکل سائنس (طبیعات) میں نہایت اہم کام کیا ہو، دُوسرا انعام کیمسٹری (علم کیمیا)، تیسرا انعام فزیالوجی (علم الادویہ) میں اہم دریافت کرنے والے اشخاص کو دیا جائے۔ چوتھا انعام اس مصنف کو دیا جائے

جس نے تخلیق و تحقیق کی کوئی کتاب لکھی ہو اور پانچواں انعام اس شخص کو دیا جائے جس
نے اقوامِ عالم کے باہمی امن پیدا کرنے کے سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔ میں
تاکید کرتا ہوں کہ یہ انعامات بلا امتیاز مذہب و قومیت صرف مستحق لوگوں کو دیے
جائیں۔"

ایلفرڈ نوبل بہت مالدار شخص تھا۔ وہ پندرہ فیکٹریوں اور ۲۳ تیل بردار جہازوں کا مالک تھا۔ ڈائنامیٹ ایجاد کرنے کے
علاوہ اس نے ۳۵۵ اور چیزیں بھی پیٹنٹ کرائیں جن میں بغیر دھوئیں کی بارود، مصنوعی ربڑ، چمڑا، پارچہ اور ایک قسم کا [illegible]
ہیں۔ یہ انعامات ۱۹۰۱ سے دیے جاتے ہیں۔

نوبل کے انتقال سے اب تک تقریباً ڈھائی کروڑ روپیہ انعامات کی شکل میں تقسیم ہو چکا ہے۔ سب سے زیادہ نوبل
پرائز پانے والے اہلِ جرمنی ہیں۔ اس کے بعد انگلستان کی، پھر فرانس کی، پھر امریکہ کی باری آتی ہے۔ سویڈن اور ناروے کے لوگوں
نے بھی ۲۶ انعامات حاصل کیے ہیں۔ برصغیر ہند و پاکستان کے صرف دو آدمیوں ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور (۱۹۱۳) اور سر سی۔ وی
رامن (۱۹۳۰) کو انعام ملا ہے۔ روس کے کسی شخص کو آج تک انعام نہیں دیا گیا حالانکہ نوبل کی وصیت میں یہ چیز خاص طور پر لکھی
ہے کہ انعامات کی تقسیم میں قومیت و مذہب کا ذرا سا بھی لحاظ نہ رکھا جائے۔ ہند و پاکستان میں اقبال اور گاندھی اور روس
میں چیخوف اور ٹالسٹائی اس قابل تھے کہ انہیں انعامات دیے جاتے مگر یہ سب نظرانداز ہو گئے۔

ہر سال اسٹاک ہام میں ۱۰ دسمبر کو ایلفرڈ نوبل کی برسی کے موقع پر بڑی پُرشکوہ تقریب منعقد ہوتی ہے جس میں سویڈن
کے بادشاہ بنفسِ نفیس انعامات تقسیم کرتے ہیں۔ مشہور امریکی مصنفہ پرل بک نے اس تقریب کا حال یوں بیان کیا ہے:

"میں ۹ دسمبر کو اسٹاک ہام کے ہوائی اڈے پر پہنچی اور مجھے ایک زبردست استقبالیہ کمیٹی نے
خوش آمدید کہا جس میں مقیم سویڈن امریکی سفیر کے علاوہ نوبل کمیٹی کے افراد اور سویڈن کے محکمۂ خارجہ
کے ممبر شامل تھے۔ مجھے فوراً گرانڈ ہوٹل پہنچا دیا گیا جہاں مخصوص شاہی کمرے میں میرے قیام کا انتظام
کیا گیا تھا۔ دوسرے دن (۱۰ دسمبر) صبح کو حکومت کے نمائندے میرے پاس آئے جنہوں نے شام کی
رسومات کے بارے میں ساری تفصیلات بتانے کے بعد یہ درخواست کی کہ بادشاہ کے ہاتھ
سے انعام لینے کے بعد میں اُلٹے پاؤں اپنی کرسی تک واپس آنے کی کوشش کروں کیونکہ اس
سے پہلے دو انعام لینے والوں نے بادشاہ کی طرف پیٹھ کر دی تھی جس کا سویڈن کی رعایا نے
بہت برا مانا تھا۔ چنانچہ شام کو میں وقت پر اُس آراستہ پیراستہ ہال میں جا پہنچی۔ ٹھیک ۵ بجے
ایک سویڈش سپاہی اور ایک سویڈش نوجوان نے بگل بجا کر شاہی آمد کا اعلان کیا۔ بادشاہ کے
بیٹھ جانے کے بعد نوبل کمیٹی کے ممبر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ان کی آمد پر بادشاہ تعظیماً
کھڑے ہو گئے۔ یہی وہ واحد موقع ہے جبکہ بادشاہ اپنی رعایا کے کسی ممبر کی آمد پر [illegible]

جوتے ہیں۔

میرے برابر کی کرسی پر ایک اور نوبل پرائز جیتنے والے اطالوی ڈاکٹر ایزیکو فرنی بیٹھے ہوئے تھے۔ سویڈش زبان میں تقریریں ہوئیں جن کو میں مطلق نہیں سمجھ سکی۔ اس کے بعد میرا تعارف ہوا اور میں انعام لینے کے لیے بادشاہ کے سامنے جا پہنچی۔ بادشاہ نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک سونے کا تمغہ دیا جو چمڑے کے بکس میں رکھا ہوا تھا جس کے ایک طرف نوبل کی تصویر اور دوسری طرف اس کا نام کندہ تھا۔ ایک لفافہ میں انعام کا وہ حکم نامہ تھا جس کو بعد میں چیک کی صورت میں بدل دیا جاتا تھا اس رسم کے بعد اُلٹے پیروں لوٹنے کی مصیبت درپیش تھی۔ ایک تو میں اُونچی ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے تھی جن کی ایڑیاں مشرقی بیش قیمت قالینوں میں دھنسی جاتی تھیں۔ دوسرے میرے زریں فراک کے پیچھے کا حصّہ فرش پر لٹکا ہوا تھا۔ میں بہت سنبھل سنبھل کر ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی۔ میری اس مشکل کو دیکھ کر لوگوں نے ہمدردی میں تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ میں نے قالین کے ڈیزائن کو ذہن نشین کر لیا تھا ورنہ ممکن تھا کہ میں اپنے برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کی گود میں جا پڑتی۔ اگلے روز اسٹاک ہام کے اخبارات نے بڑی بڑی سُرخیوں میں یہ خبر چھاپی: "پرل بک بڑی تمکنت سے پیچھے کو لوٹیں۔"

نوبل پرائز پانے والے کے لیے ضروری ہے کہ چاہے وہ دُنیا کے کسی حصّہ میں ہو خود ایک سال کے اندر اندر اسٹاک ہام پہنچ کر نوبل پرائز حاصل کرے ورنہ انعام ضبط ہو جاتا ہے اور نوبل فنڈ میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ میں جرمنی کے مشہور ڈاکٹر Gerhard Domagk کو سلفا نامائیڈ معلوم کرنے پر نوبل پرائز ملا۔ لیکن ہٹلر نے سارل جرمنی کو نوبل پرائز لینے سے منع کر دیا تھا اور اس کی جگہ نیشنل اسٹیٹ پرائز نکالا تھا اس لیے جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۴۷ میں اس ڈاکٹر نے اپنا انعام طلب کیا۔ اسے رقم تو ملی نہیں، البتہ تمغہ اور سند مل گئی۔

نوبل پرائز کی رقم اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اب تک کسی شخص نے اس کے لینے سے انکار نہیں کیا سوائے جارج برنارڈ شا کے۔ جب شا کو سویڈن کے سفیر نے انعام ملنے کی خوشخبری سُنائی تو بڈھے میاں نے زور سے چلّا کر کہا کہ "میں اس روپیہ کا کیا کروں گا؟" سفیر نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ "سوچ سمجھ کر تحریری جواب دیجیے گا۔" ایک ہفتہ بعد شا کا غصّہ ٹھنڈا ہو گیا اور انھوں نے انعام کی رقم سے ایک ایسی سوسائٹی قائم کرنے میں لگا دیا جو سویڈن اور انگلینڈ کے درمیان ادبی اور ثقافتی تعلقات بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔

نوبل پرائز پانے والوں کی کیا عمر ہونی چاہیے؟ کیا نوبل کا مقصد یہ تھا کہ یہ انعام ان لوگوں کو دیے جائیں جو ایک عرصے سے سائنس، طب، ادب اور امن کے بارے میں عظیم شہرت کے مالک رہے ہیں یا ان انعامات سے ایسے ذہین اور جدّت پسند نوجوانوں کو بھی نوازا جائے جو اپنے کارناموں سے دنیا میں اپنے لیے اعلیٰ جگہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف

رہتے ہیں، لیکن عموماً انعام پانے والے بہت زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔ رڈیارڈ کپلنگ سب سے زیادہ کم عمر تھا جسے نوبل پرائز ملا۔ انعام پانے کے وقت اس کی عمر صرف ۴۲ سال تھی۔ بقول برنارڈ شا:

"نوبل پرائز ایک ایسی بچاؤ پیٹی ہے جو تیراک کی حفاظت کے لیے اس وقت سمندر میں پھینکی جاتی ہے جبکہ وہ تقریباً کنارے پر پہنچ چکا ہے۔"

غالباً نوبل پرائز بانٹنے والوں کو نوبل کی یہ بات یاد ہوگی کہ

"میں کسی آدمی کو ایک پیسہ بھی دینا نہیں چاہتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں جدوجہد کرنے کی رغبت ہی نہ رہے۔"

یہ ہے مختصر سی داستان سویڈن کے ایک باشندے کی جو انسانیت کی تاریخ میں ایک سنگ میل ہے۔

جرمن افسانہ اور اس کا ارتقا

علی ناظم

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے جرمن قوم میں جو شکست و ریخت اور تعمیر و تشکیل کا عمل نظر آتا ہے اس کی خارجی صورت تو دو [...]جنگیں ہیں لیکن اس کے ساتھ پوری تہذیبی و ادبی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان میں بھی جرمن قوم کی انفرادیت نمایاں نظر آتی [...] وثوق سے تجزیہ نہیں کیا جا سکتا کہ جرمنی کو ان منازل تک لانے کے لیے تنہا اس کی جغرافیائی حیثیت، معاشی نظام یا بسمارک کی [...] بصیرت کو دخل ہے یا تنہا ان افکار کا نتیجہ ہیں جن میں کانٹ کی انتقادیت، ہیگل کی تصوریت، شوپنہار کی قنوطیت، نطشے کی [...] پسند روحانیت یا اس کی قوم کی سائنسی مادیت شامل ہے، یا پھر اس کے قومی خصائل ہی تنہا اس کے عوامل رہے ہیں۔ اسباب کچھ [...]وں نہ ہوں یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ پچھلے تیس برس میں جرمنی جن سیاسی، سماجی اور شعوری حوادث سے دوچار ہوا ہے اس [...] کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔ یوں تو گزشتہ جنگِ عظیم سے دنیا کے اور بہت سے ممالک بھی شدت سے متاثر ہوئے لیکن ان ممالک [...] بلا کا دور گزر جانے کے بعد حالات معمول پر آ گئے اور کوئی شے دائمی انقلاب کی محرک نہ بن سکی لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۹۳۳ء میں [...]ے برسرِ اقتدار آنے کے بعد جرمن قوم جس انقلاب آفریں دور میں داخل ہوئی تھی آج بھی منقسم برلن اور مغربی و مشرقی محاذ کی شدید [...]ش کی موجودگی میں وہ دور ختم کر چکی ہے۔ آج کی جرمن قومی زندگی میں جو سیاسی بے یقینی کا ماحول پیدا ہو چکا ہے اس کے اثرات [...] بین الاقوامی سیاست تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اس کی صدائے بازگشت زندگی کے ہر شعبہ میں سنی جا سکتی ہے۔ آج کا جرمن [...]ب اس کی ایک واضح مثال پیش کرتا ہے۔

یہاں ہم اس قوم کے ادب کا مطالعہ کر رہے ہیں کہ جنگ اور ما بعد کے اثرات کی ذہنی کیفیت کا ایک سلسلہ دیکھ سکیں اور اس [...] ہمہ گیریت کے ساتھ افسانوی ادب ہمارے پیش نظر ہے کہ یہ زندگی کا براہِ راست مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا زمانہ اگرچہ جنگ یا [...]ے آس پاس کا زمانہ ہے لیکن آج کے جرمن افسانوی ادب کا جائزہ لینے سے پیشتر ہمیں مجموعی حیثیت سے ان تمام مسائل کو [...] بحث لانا ہے جو جدید جرمن افسانہ کی تشکیل، اس کے نشو و نما اور اس کے تدریجی ارتقاء کا موجب بنے ہیں۔ ان عوامل کے بغیر آج [...] جرمن افسانہ کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس سلسلہ کے بنیادی حقائق مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ جرمن ادب میں افسانہ کی حیثیت کا تعین اور اس کا تاریخی ارتقا۔

۲۔ جنگ سے پہلے کا افسانوی ادب۔

۳۔ انقلابی [illegible]۔

۴۔ موجودہ افسانوی ادب کا جائزہ۔

جرمن کہانی بھی دوسری زبانوں کی مانند تین بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

جرمن فکشن



Der Roman	**Die Novelle**	**Die Erzählung** or **Die Kurzgeschichte**
(ناول)	نویلے (طویل قصّے)	افسانہ (مختصر کہانی)

یہاں ناول اور اس کی تکنیک سے قطع نظر صرف "نویلے" اور "مختصر کہانی" ہی کا زیر بحث ہیں۔ آج کا جرمن افسانہ نویلے کی ایک ذیلی صنف سمجھا جاتا ہے لہذا افسانہ کا جائزہ لینے سے قبل نویلے کا تفصیلی مطالعہ ناگزیر ہے۔

نویلے کی تعریف کا مسئلہ نزاعی نوعیت رکھتا ہے۔ اس بارے میں نقادوں کی آرا میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ اب تک کئی کتابیں اس مخصوص تکنیک کی تشریح و توضیح میں لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں اختلافات سے بچتے ہوئے صرف انہی تعریفوں کو زیر بحث لانا مقصود ہے جن سے نویلے کا مفہوم بآسانی سمجھا جا سکے۔

نویلے (Novelle) دراصل اطالوی زبان کے لفظ 'Novella' سے ماخوذ ہے جس کے معنی جرمن زبان میں Neuigkeit یا "خبر" ہوتے ہیں۔ ادب میں یہ لفظ نثر کی اس صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں کسی واقعہ یا شخصیت کا بیان مخصوص اور غیر معمولی انداز میں کیا جائے۔ یہاں اس واقعہ یا شخصیت کا اہم یا غیر اہم ہونا چنداں ضروری نہیں البتہ اس کو پیش کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا ہے وہ بالکل انوکھا اور کسی قدر غیر متوقع ہوتا ہے۔ گوئٹے نے نویلے کی مختصر لیکن جامع تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

'Was ist eine Novelle sonders als eine sich ereignete unhorte begebenheit ?'

ترجمہ: نویلے کیا ہے؟ صرف یہی کہ یہ ایک ان سنی لیکن آپ بیتی واردات کا بیان ــــ

گویا بیان کا مخصوص انداز میں پیش کیا جانا ہی نویلے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جدید جرمن نقاد جارج فان لیوکاچ[1] اپنی تنقیدات کی مشہور کتاب "ذہن اور ہیئت"[2] میں نویلے کی ایک پُرشکوہ تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"Das Wesen der Novelleform ist kurzgefasst ein Menschenleben durch die endliche Kraft einer Schicksalsstunde gedruckt"----

---

1. George von Lukais.
2. 'Die Seele und die Formen'.

ترجمہ : نویلے کی تخلیق وہی ہے جس میں انسانی زندگی قسمت کے کسی ازلی لمحہ کے ہاتھوں ناقابلِ بیان قوت کے ساتھ منضبط ہوجائے۔

نویلے کی ہیئت میں سب سے اہم شے اس کا انوکھا انداز ہے جس کو "نثری آرٹ میں تخلیق اور ہیئت"[1] کے مصنف پیٹش[2] نے
بار "غیر معمولی" (ungewöhnlich) اور "انوکھا" (neues) کہا ہے۔ اس کے نزدیک نویلے میں یہ غیر معمولی
موڑ کے نقاط نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور بیان کیا جانے والا زندگی کا جز محض اکائی کی حیثیت سے بیان ہوتا ہے جس کی
سے شدت برقرار رہتی ہے۔ یہی شدت اور ارتکاز بیان کو انوکھا، غیر معمولی اور غیر متوقع بنا دیتی ہے چنانچہ انگریزی میں
یلے کی ایک بہت ہی مختصر تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

Novelle——a description of intense maturity.

ترجمہ : نویلے، کمال شدت کا ایک بھرپور بیان۔

یہاں نویلے کا مفہوم اور اس کی طوالت اس کو دیگر مروجہ اصناف سے ممیز نہیں کرتے بلکہ اس کی پیش کش کا عجیب و غریب انداز
میں شدت اور تاثر کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں اس کو مختلف اصنافِ سخن سے ممتاز بنا دیتا ہے تھیوڈور شٹورم[3] کا مشہور
ہے "باسی گلاب"[4] صرف چند صفحات پر مشتمل ہے اس کے برخلاف لڈوک ٹیک[5] کی تخلیق "جوان بڑھئی"[6] پورے چار سو صفحات پر
ے ہونے کے باوجود نویلے ہی ہے۔

نویلے، ناول یا کہانی سے طوالت اور کینویس کے سائز ہی میں مختلف نہیں ہوتا بلکہ موضوع اور نوع کے اعتبار سے بھی اس
بالکل جداگانہ حیثیت ہوتی ہے۔ نویلے اور ناول کا ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ناول میں پھیلاؤ کی آزادی ہوتی ہے چنانچہ واقعات یکے
دیگرے وجود میں آتے رہتے ہیں جن سے شخصیت کے تمام پہلوؤں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے اور آخرکار یہی ارتقا ہیرو کا انجام بن
ہے برخلاف اس کے نویلے کا پورا زور صرف کسی ایک پہلو پر رہتا ہے اور باقی پہلو محض ضمنی نوعیت سے بیان کیے جاتے
۔ اسی طرح افسانہ میں جہاں ایک نقطہ سے دوسرے نقطے تک عموماً براہِ راست رسائی ہوتی ہے ضمنی اجزا بڑی اہمیت رکھتے
لیکن نویلے ہمیشہ مرکزی دلچسپی کے نقطہ (centre of interest) سے وابستہ رہتا ہے۔ وہ اطراف کا
رہ ضرور کرتا ہے لیکن ہمیشہ مرکز کے رشتے سے۔ ہولس ہوف[7] کا ایک طویل نویلے "یہودی کی کتاب"[8] اپنے ہیرو فریڈرش میرگل[9]

1. 'Wesen u. Formen der Erzahlkunst.'
2. R. Petsch
3. Theodor Storm
4. 'Spate Rosen'
5. Ludwig Tieck
6. 'Der junge Tischlermeister'
7. Hulshoff
8. 'Die Judenbuche
9. Friedrich Mergel

کو پوری زندگی اس [illegible] کے برعکس کر مدت تک بیان کرتا ہے لیکن نویلے کا صرف ایک مرکزی واقعہ [illegible]
کے ضمن میں بیان ہوتی [illegible] میں 'بیہودگی' کا قتل ہے۔

انگریز نقادوں میں کیمبرج کے پروفیسر بینیٹ[1] نے خصوصیت کے ساتھ نویلے کی صنف پر جو تحقیق کی ہے اُنھوں نے نویلے کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

A Novelle is a narrative in prose, usually shorter than a novel, dealing with [o]ne particular situation, conflict, event or an aspect of a personality, it narrates [so]mthing 'new' in the sense of somthing 'striking'.

ترجمہ: نویلے ایک نثری بیان ہے جس کی طوالت عام طور پر ناول سے کم ہوتی ہے۔ یہ کسی شخصیت کے کسی مخصوص پہلو، تنا[زع] واقعہ سے متعلق ہوتا ہے اور ہمیشہ کسی 'نئی' بات کو بیان کرتا ہے جسے 'نیا' اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی قدر چ[ونکا] دینے والی ہوتی ہے۔

ان مختلف تعریفوں کی روشنی میں نویلے کا مفہوم بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی ادب میں یہ یا اسی کے آس پاس کی صن[ف] مختلف ناموں کے ساتھ رائج ہے چنانچہ انگریزی کا طویل مختصر افسانہ (Long short story) یا فرانسیسی کا نو[ویلا] (Novelle) کم و بیش جرمن نویلے ہی کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔ پچھلی دو صدیوں میں دنیا کے بہت سے نامور اد[یبوں] نے اسی صنف کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس سلسلہ میں روسی ادب سے پشکن، گوگول، ٹالسٹائی، ترگنیف، چیخوف، فرانسیسی سے مرپیاں، ہسپانوی ادب سے الارکون[2] اور اطالوی ادب سے پیرن ڈیلو[3] کے نام بطورِ مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

جرمن ادب میں نویلے اٹھارویں صدی کے آخر میں آیا اور بہت جلد ادب کی ایک مقبول صنف بن گیا۔ جرمن مزاج کی شدت پسندی اس صنف کی مقبولیت کا سبب بنا ہوا تھی چنانچہ اس کو 'قومی صنفِ ادب' کی حیثیت سے اپنایا گیا۔ کلاسیکی عہد سے کر آج تک جرمن نثر کی سب سے مقبول صنف یہی نویلے رہا ہے۔ اگر اس دور میں ہم 'جرمن افسانہ' کی تاریخ اور اس کے ارتقا کا جا[ئزہ لیں] تو ہمیں 'افسانہ' کی جگہ 'نویلے' ہی نظر آتا ہے۔ گوئٹے کے عہد سے کر موجودہ دور تک جرمن ادب میں لاتعداد نویلے لکھے گئے جو زندگی کے مختلف شعبوں پر محیط ہیں۔ اسی بنا پر مضامین کے اعتبار سے ان کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ نویلے کے خا[ص] مکتبے یہ ہیں:

۱۔ کلاسیکی نویلے۔

۲۔ ابعد الطبیعاتی نویلے۔

---

1. E.K. Bennett
2. Alatcon
3. Pirandello

۳۔ رومانی نویلے۔ ۵۔ شاعرانہ یا حقیقی نویلے

۴۔ بیانیہ نویلے۔ ۶۔ نفسیاتی نویلے۔

جرمن ادب میں نویلے نویسی کی تاریخ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں گوئٹے کے[1] "جرمن آوارہ گردوں کی گفتگو" سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دور رومانیت پسندی کا تھا جس میں کچھ ہی عرصہ بعد داخلیت کی شدت ہو گئی اور تقریباً پوری انیسویں صدی تک یہی رنگ چھایا رہا۔ اس انداز نے بالآخر اپنی انتہا پر پہونچ کر ہیئت کے مروجہ اصولوں سے انحراف کیا اور کلائسٹ[2] نے مابعدالطبیعاتی مسائل کو بھی نویلے کی صنف میں داخل کر دیا اس کے ساتھ ہی اس نے تاریخی و شخصی نویلے لکھ کر اس ٹیکنیک میں بالکل نئے تجربے کیے۔

خالص رومانی مضامین[3] کی فضا لڈوگ ٹیک، آئشن ڈورف، آرنم اور ہوف من نے پیدا کی۔ خاص طور پر ہوف من نے فنی نویلے (Künstlernovelle) لکھ کر اس صنف میں بڑا حسن پیدا کیا۔ حقیقت پسندانہ اور تخیلی تجربوں کی ابتدا گوٹ ہیلف[4] اور آئرباخ کے ہاتھوں ہوئی اس دور کے نویلے (Dorf novelle) کہلاتے ہیں۔ اس دور تک جرمن نویلے فنی طور پر انتہائی پختہ اور تخیلی دولت سے مالا مال ہو چکا تھا اس کی وسعت بھی بے اندازہ تھی چنانچہ اب عوامی ترجمانی کا کام بھی اسی صنف سے لیا جانے لگا۔ اس عہد نے اشتورم[5]، کیلر، گوٹ فرئیڈ، موریکے، رابے، اوٹو لڈوگ اور گرل پارسر جیسے فنکار پیدا کیے۔

اس دور کے اختتام پر نفسیاتی تجربوں کا آغاز ہوا چنانچہ پاول ہیزے[6] اور مائر نے نفسیاتی مسائل پر کامیاب نویلے لکھے جیسے آگے چل کر تھومس من، رلکے اور ہوف من اشتال کی فنی صلاحیتوں نے معراجِ کمال پر پہونچا دیا۔ اس درمیان میں ہیئت کی بے قاعدگی جو ایک عرصہ سے چلی آتی تھی ولیم شیفر[7] اور پاؤل ارنسٹ[8] کے ہاتھوں دور ہوئی۔

نویلے نویسی کی ابتدا سے لے کر موجودہ عہد تک کی تاریخ یہیں پر ختم ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب کی یہ نسبی اور روایتی صنف عہدِ جدید کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکتی ہے یا نہیں؟ تاریخی شہادت کی روشنی میں اس کا جواب نفی میں ملتا ہے جبکہ بیسویں صدی کے آغاز اور اس کے ابتدائی ایام گزر جانے کے بعد بھی نویلے اپنی روایتی عظمت کھوتا نظر آتا ہے۔ اب اس میں وہ شکوہ باقی نہیں جو قدیم زمانے سے بطور ورثہ چلا آرہا تھا اور بیسویں صدی کی ایک چوتھائی گزر جانے کے بعد تو نویلے فنی اعتبار سے بالکل بے جان معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی مختصر افسانہ کا آغاز ہوتا ہے۔

نویلے کی اس عملداری کے نتیجہ میں نثر کی دیگر اصناف کو پنپنے کا موقعہ نہیں مل سکا۔ لیکن مختصر نثر نویسی کے تجربات جاری ضرور رہے چنانچہ Marchen Parabeln, Ankdote, Grotesken کے عنوانات سے اس

---

1. 'Unterhaltungen deutscher Ausgewanderten
2. Kleist
3. Ludwig Tieck, Eichendorff, Arnim, E.T.A. Hoffmann
4. Gotthelf, Aurbach
5. Storm, Keller, Gottfried, Morike, Rabe, Otto Ludwig, Grillparzer
6. Paul Heyse, C. F. Mayer, Thomas Mann, Rilke, Hoffmannstahl
7. Wilhelm Shafer
8. Paul Ernst

دور میں جو کچھ لکھا جاتا رہا وہ بڑی حد تک مختصر افسانہ سے قریب معلوم ہوتا ہے اس درمیان میں لکھی جانے والی بعض کہانیاں تو قطعاً افسانوی انداز رکھتی ہیں چنانچہ یہاں مختصر زمین کے اس دور کا مجموعی حیثیت سے تذکرہ کیا جانا ضروری ہے جو اس پرفیلے کی سرپرستی میں گزرا۔

جرمن ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کو تین بڑے تاریخی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ گوئٹے کا دور ۱۷۵۰ تا ۱۸۳۲

۲۔ حقیقت پسندی کا دور ۱۸۳۲ تا ۱۸۸۵

۳۔ فطرت پسندی سے جدید رومانیت تک ۱۸۸۵ تا موجودہ عہد۔

گوئٹے کا عہد بظاہر افسانوی ادب سے کوئی ربط نہیں رکھتا لیکن اس عہد کا تذکرہ جرمن ادب کی ہر صنف کے تذکرے کے ساتھ ناگزیر ہے کہ اس دور نے جرمن ادب پر دائمی اثرات چھوڑے ہیں۔ اسی زمانہ میں جرمن ادب کا نشاۃ ثانیہ ہوا جو تاریخ میں "طوفان و ہیجان" (Sturm und Drang) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز اگرچہ ہرڈر[1] کے عہد سے ہو چکا تھا لیکن گوئٹے اور شلر نے اس کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ اٹھارویں صدی کی اس انقلابی تحریک نے جرمن ادب میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ اس دور میں ادب کو کلاسیکی بندشوں سے آزاد کیا گیا، اس میں داخلیت کی جذبات پرستی اور انفرادیت کے عناصر کو ابھارا گیا اور فرسودہ اخلاقی و تمدنی اقدار سے اعلانیہ بغاوت کی گئی جس کے باعث جرمن قوم زندگی کی ایک نئی حرارت محسوس کرنے لگی اسی حرارت کو 'خالص جرمن رُوح' کا نام دیا جاتا ہے چنانچہ آج تک جرمن ادب میں کسی نہ کسی انداز سے یہی رُوح کارفرما نظر آتی ہے۔ ان خوبیوں سے قطع نظر اس تحریک کی بے انتہا شدت 'داخلیت اور انفرادیت کا اپنی حدود سے تجاوز ادب میں عام بے راہ روی' غیر آہنگی اور کسی قدر بے ترتیبی کا بھی موجب بنا چنانچہ بعد کے حقیقت پسند دور میں "طوفان و ہیجان" کے اس غروش کے ساتھ ہی اس کی خوبیاں اور خامیاں بڑے نمایاں طور پر محسوس کی جاتی ہیں۔

نثری ادب میں اس دور کی اہم ترین شخصیت جورج بیوشنر[2] ہے جس کی واحد کہانی "لینس" (Lenz) جرمن مختصر افسانے کی قدیم مثال کہی جا سکتی ہے۔ یہ کہانی "طوفان و ہیجان" کے آخری دنوں میں لکھی گئی ہے جس میں اس تحریک کے جمالیاتی اصولوں کو شاعرانہ حقائق کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے بیوشنر کے انفرادی خیالات (خصوصاً اس کی فلسفہ میں عینیت اور ادب میں رومانیت سے نفرت) اس کو شہرت نہ دے سکی۔ انگریزی ادب میں کیٹس کی طرح بیوشنر کی جوان موت نے جرمن ادب کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ اس دور کی ایک اور اہم مختصر کہانی ہے "بریجیٹا" (Brigita) ہے

---

1. Johann Gottfried Herder (1744-1803)
2. George Buchner

جس سے اڈلبرٹ اشٹیفٹر[1] کی فنی مہارت کے ساتھ اس کے مشاہدۂ فطرت کا احساس ہوتا ہے۔ "ٹورملن اشتھال" کی کئی مختصر کہانیاں بھی جن میں اس کی فنکاری، شاعرانہ فکر اور انداز کی جدّت نمایاں ہے اس دور کے مختصر افسانہ کی عمدہ مثالیں ہیں۔

انیسویں صدی کے آخری ایام میں حقیقت پسندی کا دور بھی ختم ہوا اور اس پر تاثریت کا غلبہ ہونے لگا اسی زمانے میں جرمن ادب نے بین الاقوامی تاثرات بھی قبول کیے خاص طور سے فلاؤبر، موپساں، دوستووفسکی، ڈابیلے انونسیو[2]، اسکر وائلڈ اور ڈی ایچ۔ لارنس کی تحریروں نے جرمن لکھنے والوں کو شدت سے متاثر کیا چنانچہ رومانیت کے اس رجحان کو اپنا لینے کے بعد سماجی برائیوں کا برملا اظہار کیا جانے لگا۔ اگرچہ اس تشہیر کا مقصد (خود فطرت پسندوں کے بقول) 'بدی' کا استیصال تھا لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۹۰۰ء کے آس پاس بدی کی یہ نشر و اشاعت بالآخر ابتذال کی حد تک پہونچ گئی۔ افسانوی ادب میں اس دور کی اہم شخصیت[3] آرتھر شنٹسلر ہے جسے خالص آسٹرین فطرتیت کا نمائندہ کہا جاتا ہے اس کا فن ترقی یافتہ ہونے کے ساتھ زندگی کی توانائی سے بھرپور ہے۔ محبت کے مسائل کو اس نے روایتی انداز کے مقابلہ میں عقل و شعور کی میزان پر جانچنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ جابجا نفسیاتی حقائق بھی بیان کر جاتا ہے اس کی فنکارانہ ذہانت موپساں سے کم نہیں تاہم اظہار کی بے باکی اور مخصوص رنگ کی اشاریت کہیں کہیں اخلاقی حدود سے متجاوز ہو جاتی ہے جہاں وہ ([illegible]) کو بھی محض "ایک بے ضرر کھیل" کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسی تحریک کے دوسرے علمبردار گیرہارٹ ہاؤپٹ من[4] کے یہاں خیالات میں تنوع کے ساتھ زندگی سے ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی تخلیقات مختلف متنوع عناصر کا مرکب ہیں جن میں زندگی کے مسائل کی تشریح کے ساتھ ان کا حل ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی اس کا انداز بڑا پختہ اور بھرپور ہے۔ ہاؤپٹ من کی سب سے بڑی خوبی اس کی ہمہ گیری ہے یہی وجہ ہے کہ فطرتیت کے دور سے اگر اس شخصیت کو نکال دیا جائے تو یہ دور بالکل بے رنگ نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ یورپ میں عام نفسیاتی تحریک کا زمانہ ہے۔ اس دور میں فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل، پرادسٹ اور جوئس کا تجزیاتی اسلوب ہر یوروپی فنکار کے ذہن پر مسلط تھا۔ دوسری طرف فرانسیسی اہل قلم موضوع، ہیئت اور اسلوب میں نت نئے تجربے کر رہے تھے اس سلسلہ میں فلاؤبر کا انداز خصوصیت کے ساتھ جرمن لکھنے والوں کو متاثر کر رہا تھا۔ انہی محرکات نے جرمن ادب میں ایک ایسی شخصیت کو جنم دیا جو آج بھی نہ صرف جرمن بلکہ بین الاقوامی ادب میں پائے کی شخصیت سمجھی جاتی ہے۔ یہ شخصیت ٹھومس مَن[5] ہے جس نے پرانی قدروں کا زوال اور نئی قدروں کا عروج خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور آج بھی وہ ان دونوں کے درمیان ثابت قدمی سے کھڑا نظر آتا ہے اس دور کے ٹھومس من کا افسانوی سرمایہ اگرچہ قلیل ہے لیکن اس میں بھی فنکارانہ صلاحیتوں کا غیر معمولی اظہار پایا جاتا ہے۔ "ابتری اور ابتدائی آلام"[6] میں اس نے خیالات و جذبات کو دانشورانہ خطوط پر پیش کرنے کے کامیاب تجربے کیے ہیں۔ بعض کہانیاں

---

1. Adelbert Stifter
2. Gabriele d Annunzio
3. Aurther Schnitzler
4. Gehart Hauptmann
5. Thomas Mann
6. 'Disorder & Early Sorrows'

اس کے ترقی یافتہ [illegible] نمایاں ہیں۔ وہ ایک عظیم فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا مصلح بھی ہے لہٰذا زندگی کی بے قاعدگیوں
اور بے اعتدالیوں سے [illegible] پوشی نہیں کرتا بلکہ ان کی اصلاح چاہتا ہے اس کے یہاں محاسبہ کا سب سے بڑا معیار نفسیات ہے جس کی
صداقتوں سے وہ کبھی روگردانی نہیں کرتا۔ نوعِ انسانی کے تحفظ اور اس کی سلامتی کا خواہاں ہونے کی حیثیت سے وہ عوامی قدروں
کا پورا پورا احترام کرتا ہے۔ آنے والے دور میں اس کو انہی خیالات کے جرم میں معتوب کیا گیا۔ نازی غلبہ کے زمانہ میں اس نے
وطن کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا اور امریکہ کی شہریت قبول کر لی۔ برلن یونیورسٹی کے اعزازی گریجویٹوں کی فہرست سے اپنا نام خارج
کیے جانے پر اس نے یونیورسٹی کے ڈین سے مراسلت میں اپنے نظریات کی فاضلانہ توجیہات دی ہیں افسانوی ادب کے علاوہ فکشن
کے دوسرے شعبوں پر بھی تھوس من کی شخصیت چھائی نظر آتی ہے۔ اس کا اثر و نفوذ آج کے جرمن ادب میں بھی سرایت کیے
ہوئے معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۱۴ء میں جرمنی کی پہلی سیاسی موت واقع ہوئی جس سے ادب شدت کے ساتھ متاثر ہوا۔ جنگ کے خاتمہ پر فاتح اقوام
اپنی تمدنی زندگی کی از سرِنو تعمیر میں مصروف ہو گئیں لیکن جرمنی اس سے محروم رہا۔ شکست اور پھر صلح، دونوں سے جرمنی پسماندگی کا شکار
ہو گیا اور مدت تک اس کو اپنے حریفوں کا دستِ نگر رہنا پڑا اس طرح قومی زندگی میں شکست خوردگی اور درماندگی کی فضا پیدا ہو گئی۔
عوام برسرِاقتدار طبقہ کے خلاف عام بیزاری کا اظہار کرنے لگے یہی رجحان تاریخ میں "منکریت" (NIHILISM) کے نام سے موسوم
ہے جس میں اشپنگلر[1] نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "زوالِ مغرب" (Untergang des Abendlandes) لکھ کر یورپی
تمدن کے انہدام کا اعلان کیا۔

اس شکستگی، افسردگی اور بیچارگی کے ماحول نے فنکاروں کو کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش کے لیے مجبور کیا۔ یہی پناہ گاہ ادب میں
اظہاریت کی تحریک تھی۔ یہ لفظ اگرچہ ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ ہی جرمن ادب میں متعارف ہو چکا تھا تاہم اس وقت تک اس کو محض
تاثریت کے مخالف نظریہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اظہاریت پسندوں نے نپولین عہد کے رومانیت پسندوں کی فنکارانہ
روش اور ان کی رائج کردہ اخلاقی و فلسفیانہ قدروں کو یکسر بدل ڈالا۔ انھوں نے حقیقت پسندوں کے اس نظریہ کا بھی بطلان
کیا کہ محض معروضات صداقت کو پیش کرنا فن ہے۔ ایک طویل عرصہ تک یہی اظہاریت کی تحریک جرمن ادب پر چھائی رہی جس کا سلسلہ
کم و بیش وائمر جمہوریہ[2] کے آغاز تک جاری رہا۔ یہاں پہنچ کر اس تحریک نے ایک ایسا موڑ لیا جو آگے چل کر خود ایک ہنگامہ خیز
تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ ماورائیت کی تحریک تھی۔ جرمن ادب اس نئی تحریک سے جس حد تک متاثر ہوا اس کا اندازہ آج کی تخلیقات سے
بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اسی ضمن میں جرمن ادب میں ایک ایسی شخصیت کا نام لیا جاتا ہے جس نے نہ صرف جرمن بلکہ بیسویں
صدی کے فکشن پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں آج کے جرمن افسانے میں جابجا اسی کی صدائے بازگشت سنی جاتی ہے۔ یہ

---

1. Oswald Spengler (1880-1936)
2. 'Weimar Repoblik'

نیست فرانس کا کافکا ہے جو جرمن ادب میں ماورائیت کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ کافکا کا فن اور اس کی تخلیقات کلیتہً اسی تحریک سے وابستہ ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے لیے اس تحریک کا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

بیسویں صدی کے ادب کی یہ انقلابی تحریک فرانس سے شروع ہوئی اور بہت جلد یورپ و امریکہ کے ممالک تک پہنچ گئی۔ ادب کے ساتھ آرٹ کے دیگر شعبوں پر بھی اس سے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ہمسایہ ملک ہونے کی حیثیت سے جرمنی نے ان اثرات کو شدت سے قبول کیا۔

بیسویں صدی کے فرانسیسی ادب پر برگساں کے وجدانی فلسفے نے گہرا اثر ڈالا جس نے مصوری میں تاثریت اور بعد میں پکاسو کے فن 'مکعبیت' (cubism) کی صورتیں اختیار کیں۔ اسی زمانہ میں فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل نے لاشعور کی پراسرار گہرائیوں سے آگاہی دے کر یورپی ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا چنانچہ فرانسیسی شاعری میں اپولی نیئر کی شخصیت میں یہی دو عناصر ہم آہنگ نظر آتے ہیں اسی شخص نے سب سے پہلے 'ماورائیت' کا لفظ بھی استعمال کیا جو آنے والے دور میں ایک عظیم ادبی تحریک کا نام بنا۔ اپولی نیئر نے خارجی صداقتوں سے ہٹ کر ماورائی حقیقتوں کو اپنا موضوع بنایا اس کے ساتھ ہی اس نے ہئیت کے مروجہ اصولوں سے انحراف کا آغاز کیا جس نے پہلے دادیت (Dadaism) اور بعد میں ماورائیت (surrealism) کی صورتیں اختیار کیں۔

'دادائیت' کا آغاز ۱۹۱۶ء میں سوئٹزرلینڈ میں ترسٹین تسارا اور اس کے معاصرین نے کیا۔ یہ لوگ اپولی نیئر کے تتبع میں 'خالص شاعری' کے قائل تھے جس میں خارجیت ایک بے معنی لفظ تھا۔ اس شاعری کا مقصد (خود اس نظریے کے بانیوں کے بیان کے مطابق) محض تحت الشعور سے آنے والے پیغامات کی ترسیل تھا، جس کے لیے اوزان بحور اور ردیف و قافیہ کی پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس تحریک نے اپنے وقت کے تمام اخلاقی و ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر آرٹ میں بے راہ روی کو جائز قرار دے لیا۔

دادائیت کے اس منفی رجحان اور اس کی بے اعتدالیوں کے باعث اس کے بہت سے حامی اس سے الگ ہو گئے جنھوں نے ایک نئے مکتبۂ فکر کی بنیاد ڈالی۔ یہی مکتبۂ فکر ماورائیت کہلاتا ہے جس کا بانی آندرے بریتوں تھا۔ اس تحریک کے ماننے والوں کا کہنا تھا کہ عالم محسوسات کے علاوہ ایک اور عالم بھی اپنا وجود رکھتا ہے جو اس ظاہری اور حسی عالم سے بالکل مختلف ہے۔ اس عالم تک رسائی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ لاشعور ہے جس کو استعمال کرنے کے لیے انسان کو عقل و منطق سے کنارہ کش ہو جانا ضروری ہے چنانچہ ماورائیت میں خارجی اور معروضی حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی اس کی جگہ لاشعور کی داخلی حقیقت سب پر مقدم ہوتی ہے۔ ماورائی فنکار حقیقت کو خارجی اشیاء میں تلاش نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے وہ لاشعور کی مدد سے خود اپنے وجود کی گہرائیوں میں اتر جاتا

---

1. Guillaume Apollinaire
2. Tristan Tzara
3. Andre Breton

ہے یعنی عقل و ادراک کا تابع نہیں چنانچہ اڈشمٹ نے اس عمل کو 'خالص نفسیاتی خود حرکیت' (Psychic
automatism) کا نام دیا ہے۔ حقیقت کی اس لاشعوری تلاش میں 'مادی انسانیت' کا ماورا سے خود بخود رشتہ قائم
ہو جاتا ہے جس کی کوئی منطقی توضیح نہیں کی جا سکتی۔ ایڈشمٹ کازیمر نے اپنی شاعری 'اظہاریت' میں اس رشتہ کی سب سے بڑی خو
بی یہ بتائی ہے کہ یہ ہر قسم کی عقلی و منطقی توجیہات سے بالاتر ہے۔ ماورائیت پسندوں کی دلیل ہمیشہ یہ رہی کہ موضوع اور معروض
کے تضاد کی موجودگی میں انسان اپنی حقیقت کو نہیں پا سکتا کہ خالص معروض فریب نظر یا خالی خولی بے حقیقت صداقت ہے
اس کے لیے انسان کو باطنی وجدان سے کام لینا چاہیے جو لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں وجود اور حقیقت کے اسرار منکشف کر
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماورائیت میں لاشعور کو 'مطلق حقیقت' (Absolute Reality) کی حیثیت دی جاتی ہے

ماورائی فنکاروں نے اظہار کے لیے بالواسطہ (Symbolism) کا طریقہ اختیار کیا ہے جس میں ہیئت اور زبان
کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ رمزیت کا ہر ہر لفظ کسی نہ کسی ذہنی کشمکش کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس سے لاشعور میں د
ہوئی یادوں کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ رمزیت کے کسی لفظ کا مفہوم خارجی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر نہیں نکالا جا سکتا کیونکہ
محض کسی ذہنی کیفیت کی جانب ایک اشارہ کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات رمزیت محض الفاظ کا ایک چیستان بن
ہوتی ہے۔ ملارمے کہتا ہے 'نظم تو ایک معمہ ہے جس کا حل پڑھنے والوں کو نکالنا چاہیے۔'

جرمنی میں واگنر[3] کی موسیقی رمزیت کی فضا کے لیے بہت ساز گار ثابت ہوئی اور فن کاروں نے جا بجا اس سے استفادہ
... کیا۔ اس موسیقی کی عنصر نے یادوں کا ایک طلسمات پیدا کرتی ہے جس کے ذریعہ انسان لاشعور کی پُراسرار اتھاہ گہرائیوں میں
جاتا ہے۔ اس پُراسرار دھندلکے میں بھٹکنے سے انسانی شعور خود بخود منتشر قوتوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ رمزیت کا یہی انداز ماو
فنکاروں میں قبولیت کا باعث بنا۔

کہا جاتا ہے کہ ماورائیت کی تحریک محض داداازم کے رد عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوئی جس کا خود اپنا کوئی بڑا محرک نہیں تھا۔ تا
کی روشنی میں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ بین الاقوامی طور پر ماورائیت کا ر
اس وقت سے بہت پہلے ہی سے محسوس کیا جا رہا تھا جس کے بنیادی عوامل میں فرائڈ کی لاشعور کی بصیرت، ہیگل کے تصوراتی نظ
اور مارکس کے سیاسی افکار شامل تھے جن کا زمانہ داداازم سے پہلے کا ہے۔ خصوصاً فرائڈ کا پیش کردہ نظریہ لاشعور[4] انا، فوق ا
اصول حقیقت کا نظریہ اس تحریک کا سب سے بڑا محرک کہا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ انسان نے پہلی مرتبہ مافوق الفطرت عناصر سے چھٹکا
پا کر لاشعور کے ذریعے خود اپنے وجود کی حقیقت اور زندگی کے آلام کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کہاں تک

---

1. Edschmid Kasimer
2. 'Über den Expressionismus in der Literatur & die neue Dichtung.
3. Richard Wagner (1813-1883)
4. Freud: 'Unbewusstsein, ich, uberich & Princip der Wirklichkeit.

یاب ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے البتہ اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس تجربہ سے انسان نے ایک ایسی حقیقت ضرور پالی جو مسرت
ماورا تھی۔ یہ حقیقت خود اس کی اپنی آگاہی تھی

اسی حقیقت کی تلاش بودلیئر، مالارمے اور رین بو کی گہری رمزیت میں پوشیدہ ہے اور اسی منزل تک پہنچنے کے لیے پُر کو پُراسرار
تی فضا کے جنگلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ کافکا اسی دنیا کا ایک ہیبت ناک کارس ہے۔

جرمن ادب میں نظم میں میرنک[1] اور نثر میں کافکا[2] اس روایت کے اوّلین علمبردار کہے جاتے ہیں۔ کافکا کی اہمیت کا سبب اس کا
عمرانی انداز، اس کے تخیل کی ساخت اور اس کا عجیب غریب احساس ہے۔ اس کا فن ثبوتیت اور سائنس کے دور میں بھی پُراسرار عناصر
ایت کو سموتا ہے۔ ماورائی فنکار ہونے کی حیثیت اس کے یہاں بھی ہیئت کی عام بے قاعدگیاں پائی جاتی ہیں جہاں وہ خارجیت کے
دھنوں سے آزاد ہو کر محض لاشعور کی دھندلی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتا ہے اور اس دنیا کے عجیب غریب اور منتشر تلازمات کی جانب
ماراتی وعلامتی میں اشارے دیتا ہے۔ وجود اور حقیقت کا انکشاف اس کے فن میں کسی قدر خوف کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ "تغیر[3]"
انسانی وجود کا مجہول ہو کر ایک بھیانک حشراتی مخلوق میں تبدیل ہو جانا اسی خوف کی علامت ہے جہاں زندگی پر خارجی قوتوں کی یورشیں
ے بے بس کیے دیتی ہیں۔ تمدن کی پیچیدہ ساخت اور اس کے ان مانے اصول و قواعد میں جکڑ جانے کے بعد انسان کرب محسوس کرنے
لگتا ہے یہاں کافکا اپنی حسی گرفت میں ان پُراسرار ما فوق طاقتوں کو بھی محسوس کرتا ہے جو غیر مرئی طور پر انسان کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔ یہی احساس
سزائی بستی[4] میں شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے جو جرم و سزا کی ایک پُراسرار لیکن انتہائی ہولناک داستان ہے۔ اسٹیفن اسپینڈر نے کیا خوب
ہا ہے کہ اس منزل پر کافکا آنے والے دور کا پیغمبر نظر آتا ہے کہ 'بے جرم سزا' کا جو میکانی انداز کافکا کے تخیل نے ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ
محسوس کر لیا تھا صرف بیس سال کے اندر ہی اندر آؤشوٹس[5] اور دیگر بتیس نازی مقتل گاہوں میں اس کی عملی تشکیل بھی دیکھ لی گئی۔ اسی طرح
شہری ڈاکٹر[6] "خواب[7]" اور بعد کے مختصر نثری مجموعہ (Die Erzähulngen) کی ایک ایک کہانی اس کے عظیم فن کی نمائندگی
کرتی ہے۔ کافکا کا احساس قاری کو تخیل کی ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں کرب ہوتے ہوئے بھی اس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اس
حد میں وہ جابجا واہمہ کی مدد لیتا ہے لیکن اس واہمہ پر حقیقت کا دھوکہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس اجنبی احساس میں حقیقتیں بھی واہمہ معلوم
ہونے لگتی ہیں۔ اس کی تخلیقات بولتے جاگتے انسان کا خواب ہیں جو خواب ہونے کے باوجود بیدار حقیقتیں نظر آتی ہیں۔

کافکا کے فن پر اس کی دائم المریض شخصیت، باپ سے اس کے ذہنی تصادم (Father complex) اور
ہنگامی معاشرے" میں اس کی یہودی نسلیت نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہی تمام عناصر اس کو زندگی سے خوف دلانے کا بھی محرک ہوئے
یہی وجہ ہے کہ بعض حلقوں میں اس پر شخصیت سے انحراف کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے لیکن کافکا کا فن ایک ایسی دنیا کی نمائندگی کرتا

---

1. Mernik
2. Franz Kafka
3. 'Die Verwondlung'
4. 'In der Straf Colonie'
5. 'Auschwitz'-the concentration camp.
6. 'Der Landarzt'
7. 'Der Traum'

جوہر شخصیت کی ماورائیت سے عبارت ہے۔ ایک نقاد نے اس عظیم فنکار کی شخصیت اور اس کے فن کو "منجمد سمندر" سے تعبیر کیا ہے۔ ایسا سمندر جو اپنے اندر لامحدود وسعت اور بے پناہ عمق کو لیے ہوئے منجمد ہو جائے، اس کی بے پایاں وسعت اور گہرائی کے راز اسی وقت دیکھے جا سکتے ہیں جب یہ پگھل جائے۔

کافکا کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ ۱۹۳۰ء کے آس پاس کا زمانہ جدید جرمن افسانہ کی تشکیل کا زمانہ ہے جسے ہم "خالص جرمن افسانہ" (Deutsche Erzählung) کہہ سکتے ہیں خواہ وہ قصے کے ارتقا سے وجود میں آیا ہو یا قدیم کہانی (Ankdot) کی ترقی یافتہ شکل ہو۔ جیسا کہ مضمون کے ابتدائی حصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ جرمن ادب میں قصے کچھ اس طرح رچ بس چکا ہے کہ عام طور پر (Short Story) کی جگہ غلطی سے قصے ہی کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ تکنیک کے اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق ہے جس کی وضاحت پہلے ہی پیش کی جا چکی ہے۔

اس ضمن میں افسانہ کا نام آتے ہی ہمارے ذہنوں میں فوراً موپساں، چیخوف یا پو کے مثالی افسانوں کا خاکہ ابھرتا ہے جس میں بقول پو "وحدت تاثر" ایک لازمی شرط ہے اور واقعات کی مناسب و محدود ترتیب محض تاثر کی شدت میں اضافہ کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ یہاں دیگر پہلوؤں سے عمداً گریز کیا جاتا ہے برخلاف اس کے جرمن افسانوں میں عموماً مضمون کے مطابق کسی جزو کو اکائی مان کر اس کو مکمل حیثیت سے بیان کرنے کے تجربے پائے جاتے ہیں جس سے افسانہ (Short Story) کی تکنیک سے ہٹ جاتا ہے اور اس پر پھیلی ہوئی کہانی (Extended Anecdote) کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ قصے عام طور پر مختصر افسانے کے مقابلہ میں زیادہ طویل ہوتے ہیں۔ لیکن اس صورت کا ہر جرمن افسانہ پر اطلاق ضروری نہیں۔ آج کے جرمن افسانے عام طور پر "وحدت تاثر" کی نہج پر ہی لکھے جاتے ہیں جو مختصر افسانہ کا بین الاقوامی معیار ہے۔

جدید جرمن افسانہ کی تشکیل کا زمانہ بدقسمتی سے جرمنی کی تاریخ کا انتہائی ہیجانی زمانہ ہے جسے پتا اور اُجڑا ہوا ([illegible]) زمانہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب جرمنی میں معاشی حالات انتہائی ابتر ہو چکے تھے سارے ملک میں اقتصادی بدحالی، سیاسی عدم استحکام اور سازشوں کا دور دورہ تھا۔ "قومیت" کا دیوانہ وار پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا اور ہر پارٹی ہر ممکن طریقے سے پارلیمنٹ (Reichstag) میں اکثریت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ بالآخر یہ افراتفری کا دور ختم ہوا اور جرمنی میں مکمل طور سے ڈکٹیٹر شپ قائم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس ملک کا وہ انقلابی دور شروع ہوتا ہے جس کے سنگین نتائج آج بھی جرمن دنیا بھگت رہی ہے۔ اس انقلاب نے زندگی کے مفہوم کو سرے سے بدل ڈالا جس کا براہ راست اثر ادب پر بھی ہوا۔ اس دور کے بیشتر فنکار اسی ہنگامہ سے متعلق رہے ہیں اور ان کی زیادہ تر تخلیقات میں یہی انقلاب سرایت کیے ہوئے ہے لہٰذا ان مصنفین اور ان کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے اس انقلاب کا پس منظر اور اس کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ جرمن ادب پر اس کے اثرات دائمی نوعیت رکھتے ہیں۔

جرمنی کی تاریخ کا یہ بھیانک دور ۱۹۳۳ء میں نیشنل سوشلسٹ تحریک کی کامیابی سے شروع ہوا اور مسلسل بارہ برس تک انتہائی ڈرامائی انداز میں جاری رہ کر ۱۹۴۵ء میں برلن میں ہٹلر کی خودکشی پر ختم ہو گیا لیکن اس کے دوررس اثرات جرمن زندگی پر آج اور آئندہ بھی محسوس کیے جاتے رہیں گے جنگ کے خاتمہ پر جرمنی کی سیاسی حیثیت یکسر بدل گئی۔ اس کو بشمول آسٹریا چار فوجی منطقوں میں بانٹ دیا گیا۔ اس وقت ملک کی اقتصادی حالت مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھی۔ جنگ کے بعد کے تین سال تک یہی اقتصادی بحران جاری رہا جس کا خاتمہ ۱۹۴۸ء کی کرنسی اصلاحات پر ہوا اور ملک کی معیشت رفتہ رفتہ پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آنے لگی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد امریکی، برطانوی، اور فرانسیسی منطقے ملا کر 'وفاقی جمہوریہ جرمنی' (Bundes Republic Deutchland) کی تشکیل کی گئی اور روسی علاقہ میں جداگانہ طور پر ڈیموکریٹک ریپبلک (Deutche Domokratische Republik) کی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں اتحادی قوتوں نے باضابطہ طور پر جرمنی سے اپنے سیاسی و فوجی دستبرداری کا اعلان کیا جس کے ساتھ ہی آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کی روایتی سیاسی غیر جانبداری حاصل ہو گئی۔ جرمنی کا سب سے بڑا شہر اور دارالخلافہ برلن اتحادیوں اور روس کے درمیان سیاسی اکھاڑہ ثابت ہوا۔ یہ شہر اطراف سے روسی منطقہ سے گھرا ہونے کے باوجود زبردست جنگی اہمیت رکھتا تھا لہذا دونوں حریفوں میں سے کوئی بھی اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوا۔ اس طرح برلن کی تقسیم عمل میں آئی۔ مشرقی برلن روسی علاقہ تسلیم کیا گیا اور مغربی برلن میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس تینوں طاقتوں کے لیے فوجی منطقے قائم ہو گئے۔ ابتدا میں برلن کی تقسیم محض خاردار تاروں کے ذریعہ عمل میں آئی لیکن بعد میں سیاسی پیچیدگیوں کے باعث پختہ دیوار تعمیر کر دی گئی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوار دو علاقوں کے درمیان خط فاصل ہے یا خط متارکہ جنگ جبکہ آج بھی اس کے ہر دو طرف موجودہ سیاسی طاقتوں کا زبردست جنگی محاذ قائم ہے۔

جنگ شروع ہوتے ہی ادب میں بھی غیر صحتمندانہ ماحول پیدا ہو گیا۔ جذباتیت کی شدت نے ادب کی اعلیٰ کلاسیکی قدروں کو 'کمتر' اور 'غیر مفید' بنا دیا۔ اس ہیجانی دور کا ادب کس حد تک 'ادبی' کہا جا سکتا ہے اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں دشمن سے اندھی نفرت کے مقابلہ میں 'سچی حب الوطنی' کے عناصر کا بھی فقدان ہے۔ ہل یونیورسٹی کے پروفیسر واٹر ہاؤس[1] نے اس جنگی ادبی سرمایہ کی قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ریاضی کا ایک کلیہ دریافت کیا ہے:

Quality of litrature & its moral justification

ان کا کہنا ہے کہ اس دور کے ادبی اوصاف اپنے اخلاقی محاسبے سے نسبت رکھتے ہیں۔ یعنی اخلاقی محاسبہ جتنا سخت کیا جائے گا ادب کی قیمت اتنی ہی کمتر دکھائی دے گی۔ اس معیار پر ادب کے اس دور کو بدترین دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ دوسری جانب اس عہد کے انتہا پسندانہ نظریات اور خطرناک سیاسی رجحانات نے عام ادب کی ترقی اور اس کے ارتقا کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔

جرمن ادب کی تاریخ میں نازی عہد سے زیادہ سنگین اور مستبد دور آج تک نہیں گزرا۔ اس عہد میں زندگی کے دیگر شعبوں کی مانند ادب پر بھی کڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ہر اس ادبی تخلیق کو "ناپسندیدہ" قرار دیا گیا جس میں "خالص آریائی روح" نہیں پائی

---

1. Prof. Water House

جاتی تھی اسے [illegible] شیر پایا گیا جس کا فن اس جوہر سے خالی تھا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس دور کے لکھنے والوں کی جینات میں جو میں سے اکثر یہودی تھے جبکہ یہودی ہونا نازی حکما ناقابلِ معافی جرم تھا۔ چنانچہ تمام یہودی ادیب بالخصوص معتوب کیے گئے ان کے علاوہ وہ تمام ادیب بھی جو غیر یہودی ہونے کے باوجود نیشنل سوشلزم پر یقین نہ رکھتے تھے نازی عتاب کا شکار ہوئے۔ ان میں سے بیشتر کو ملک بدر کر دیا گیا اور وہ ادیب جنہوں نے جرمنی کے حدود میں رہتے ہوئے نازیت کے خلاف آواز اٹھائی زندگی کے بدترین [illegible] میں مبتلا کر دیے گئے۔ مئی ۱۹۳۳ء میں نازی حکام نے باضابطہ طور پر ایسی تمام تصانیف نذرِ آتش کر دیں جو ان کے نزدیک 'قومی مفاد' کے منافی تھیں اور آئندہ کے لیے ایسی تصانیف کو جرم قرار دے دیا۔

نازی آمریت کے نزدیک صرف وہی ادیب پسندیدہ تھے جو "آریائی فخر" کے ترانے گا سکیں یا پھر 'خاک و خون' کے ولولہ انگیز نعرے سے اکر قوم کو جنگ کے جہنم میں دھکیل سکیں تاکہ Sieg. Heil! Saig. Heil (فتح مرحبا، فتح مرحبا) کے فلک شگاف نعروں کی عملی تکمیل کی جا سکے۔ اس قسم کے ادیبوں کو اس دور میں بھی تصنیف و تالیف کی مکمل آزادی رہی ان خوش نصیبوں میں کولبن ہیر[1]، یوسٹ، بلنک اور گرم وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ البتہ بدقسمتوں کی فہرست کا شمار مشکل ہے جنہیں "خاموش" رہنے سے لے کر موت تک کی سزائیں دی گئیں اس سلسلہ میں مشہور ناول نویس جارج ہرمن[2] کی ہولناک موت عبرت ناک واقعہ ہے جسے ۱۹۴۳ء میں آؤشوٹس کے نازی کیمپ میں محض صیہونیت کے مسئلہ پر اظہارِ خیال کے جرم میں مع تصانیف زندہ جلا دیا گیا۔ یہاں تمام متاثرہ ادیبوں کا تذکرہ ممکن نہیں صرف افسانوی ادب سے متعلقہ وہ شخصیتیں پیشِ نظر ہیں جن کا تذکرہ مضمون میں شامل ہے۔ یہ وہ ادیب تھے جنہیں بہرحال جرمنی کے حدود میں رہنے کی اجازت حاصل رہی لیکن ان کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

کازیمیر[3]، ارنسٹ ینگر، برگن گرین، ہاؤس من اور الزبتھ لینگسر کو "خاموش" رہنے کی سزا دی گئی اور تا حکمِ ثانی تصنیف و تالیف سے روک دیا گیا۔[4] یہی نہیں بلکہ الزبتھ سے جنگ کے دوران فیکٹری میں جبریہ محنت بھی کروائی گئی اور اس کی بڑی لڑکی کو آؤشوٹس کے کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ الزے آئشنگر[5] کے بہت سے اعزا پولینڈ کے جنگی کیمپوں میں قتل کر دیے گئے۔ اسی طرح وولف گانگ بورشرٹ[6] کو ہٹلر کی حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات رکھنے کے جرم میں دو مرتبہ قید کی سزا بھگتنی پڑی۔ تیسری مرتبہ اسی جرم کے ارتکاب میں اس کو موت کی سزا بھی سنا دی گئی جو بعد میں جبراً روسی محاذ پر بھیجے کی صورت میں تبدیل کر دی گئی۔

جرمن ترک وطن کی سزا پانے والے ادیبوں میں سے کچھ نے پہلے قرب و جوار کے یورپی ممالک مثلاً آسٹریا، سوئٹزرلینڈ، اٹلی،

---

1. Kolbenheyer
   Jost
   Blunk
   Grimm
2. George Hermann
3. Kasimir
   Ernest Junger
   Bergengruen
   Hausmann
   Elisabeth Langgasser
4. Schreib Verbot
5. Ilse Aichinger
6. Wolfgang Borchert

یا فرانس میں پناہ گزیں ہو گئے، لیکن نازی تسلط کے بعد یہ لوگ یورپ چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ان میں ٹامس من، برٹولٹ بریشٹ، اسٹیفن سوائگ، آرنولڈ سوائیگ، اسٹیفن انڈرس، فرانس ورفل، جورج کائزر، کارل سوگمائر اور ارنسٹ گلیسر جیسے ادیبوں کے نام شامل ہیں۔ ان ادیبوں نے جلاوطنی کے زمانہ میں جو کچھ لکھا وہ تاریخ میں "پناہ گزیں ادب" (Emigrantenliteratur) کہلاتا ہے۔ پناہ گزیں ادب میں اس دور کے ہنگامی اثرات کے ساتھ ان ممالک کا مقامی رنگ بھی شامل ہو گیا۔ اس کے علاوہ ایک طویل عرصہ تک ملکی اور پناہ گزیں ادیبوں کے درمیان کوئی ادبی رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں ملکی ماحول سے ہم آہنگی باقی نہ رہ سکی۔ جنگ کے بعد جب ان پناہ گزینوں کو جرمنی واپس آنے کا موقع ملا تو انھیں خود بھی مقامی ماحول بالکل اجنبی محسوس ہونے لگا جس کا اثر ان کی تخلیقات پر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

اس پس منظر سے اس پُرہول فضا کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جو جرمن ادب پر پراگندگی، دہشت اور بے یقینی کا باعث بنی۔ جنگ کے بعد بلکہ آج بھی جرمن تخلیقات پر جنگ کا یہی دہشت ناک کابوس مسلط نظر آتا ہے۔ موجودہ دور کے تقریباً تمام بڑے لکھنے والے اسی آشوب عہد کی صدائے بازگشت ہیں۔ مولر فان دین بُرک[2] نے اپنی کتاب "(Das Dritte Reich)" میں اس جابر عہد کو "تیسری حکومت" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ وہ قرونِ وسطیٰ کے جرمنی کو "پہلی حکومت" اور بسمارک کے جرمنی کو "دوسری حکومت" کہنے کے بعد نیشنل سوشلزم کی عملداری کو "تیسری حکومت" کہتا ہے۔ آج جرمن زبان میں مشرقی جرمنی کے لیے بھی لفظ "تیسری حکومت" طنزیہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے مضمون کا یہ حصہ بڑی حد تک "تیسری حکومت" ہی سے متعلق ہے۔

یہ افسانوی دور جنگ سے پیشتر کے عہد سے شروع ہو کر موجودہ عہد تک پھیلا ہوا ہے جس میں بے شمار ادبی شخصیتیں شامل ہیں۔ ان تمام کا تذکرہ مضمون کو کتاب بنا دینے کے مترادف ہوگا لہٰذا صرف ان شخصیتوں اور ان کی تخلیقات کے مختصر بیان پر اکتفا کی گئی ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے افسانوی عہد کی ممتاز شخصیتیں ہیں اور جدید جرمن افسانہ کی تشکیل میں ان کے تجربات کا نمایاں حصہ ہے۔ ان لوگوں کا محض افسانہ نگار ہونا چنداں ضروری نہیں جب کہ بہت سے ادیبوں کے ساتھ یہی معاملہ درپیش ہے۔ یہ لوگ بحیثیت شاعر، ناول نویس یا ڈرامہ نگار ادب میں جانے جاتے ہیں لیکن ان کی افسانوی تخلیقات (خواہ وہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہوں) جرمن افسانہ کی تاریخ میں غیر معمولی اضافہ ہیں۔

یہاں جرمن سے مراد صرف جرمنی ہی کے اہلِ قلم نہیں بلکہ اس کا دائرہ ان تمام ممالک تک وسیع ہے جہاں جرمن ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کی جاتی ہے ان میں وسطی اور مشرقی یورپ کے بہت سے ملکوں کے نام آتے ہیں جہاں اور زبانوں کے

---

1. Thomas Mann
   Bertolt Brecht.
   Stefan Zweig
   Arnold Zweig
   Stefan Andres
   Franz Werfel
   George Kaiser
   Karl Zuckrneyer
   Ernst Glaser
2. Moller van den Bruck

علاوہ ازیں ان کی حیثیت سے جرمن ہی مستقل ہے۔ اس سلسلے کی سب سے بڑی مثال کافکا ہے جس نے چیک (Czech) ہونے کے باوجود تمام تصانیف جرمن میں چھوڑی ہیں یا آرتھر کوسٹلر و برشٹ کا شمار ہے جنکا پیشہ جرمن میں لکھنا ہے۔ سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا کے ادیب تو جرمن کو ادبی حیثیت ہی سے استعمال کرتے ہیں کہ یہ ان کی قومی زبان بھی ہے۔

جیسا کہ اب تک بیان کیا جا چکا ہے جنگ سے قبل کے جرمن ادب پر اظہاریت ہی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ نیشنل ازم کے رجحان نے اس تحریک کے ماننے والوں میں قومی احساسات کو شدید تر بنا دیا چنانچہ برتولٹ بریشٹ کے یہاں ہی اجتماعی احساس اور انقلابی شعور کیساتھ ظاہر ہوا۔ وائمار جمہوریہ کے آغاز ہی میں اس نے بحیثیت ڈرامہ نگار بڑے جرأت مندانہ تجربات کیے۔ اسی کے یہاں بیزارگی کا احساس غالب تھا جس کی وجہ سے لہجہ میں تلخی اور جا بجا طنز کے پہلو سے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ 'کلینڈر کی کہانیاں' میں اگرچہ اس کا اسلوب بہت سادہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی انقلابی رجحان کی جھلک ملتی ہے۔ اس کا یہی فکری انداز آگے چل کر اشتراکی مسلک سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ بریشٹ کی تخلیق 'بزرگ عورت' موجودہ جرمن افسانہ کی ایک نمائندہ مثال کہی جا سکتی ہے۔

ہرمن ہیسے سوئٹزرلینڈ کا باشندہ ہے لیکن اس کا انداز خالص جرمن نمونہ کا ہے۔ افسانہ کے علاوہ اس کو ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ادب کا نوبل پرائز حاصل کرنے کے بعد اس کی شہرت بین الاقوامی حلقوں تک پہونچ چکی ہے۔ ہیسے کا اسلوب معقدیت سے بھرپور رکھنے کے ساتھ ہی بڑا پراسرار اور اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ اس کے یہاں وقت کا کوئی خاص تعین نہیں۔ وہ جبریت کا قائل ہے اور زندگی کے ناقابل حل مسائل کو انسان کا مقدر جانتا ہے۔ اپنے فن کے بارے میں اس نے ایک جگہ خود ہی کہا ہے

'میں جانتا ہوں میں کوئی ادیب نہیں۔ ہم آج کے لکھنے والے اسٹائل کو آلے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کی سرے سے کوئی ہستی نہیں۔'

ہیسے مسیحیت کے ایک قدیم مسلک پیٹ ازم (Pietism) کا پیرو ہے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت میں روحانیت کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔ اسی فرقہ کی ایک خاتون کیتنبرگ اٹھارویں صدی میں گوئٹے کے خیالات پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ مسیحی مبلغ کی حیثیت سے اس کو جوانی میں ہندوستان جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں سے اس نے قدیم ہندو ویدانت اور بدھ فلسفہ کا گہرا اثر قبول کیا جسے اس کی تخلیق 'سدھارتا' میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی بیشتر تخلیقات میں مشرق و مغرب پہلو بہ پہلو ہی نظر آتے ہیں۔ ابتدائی افسانوی مجموعہ 'اس طرف' کا انداز کسی قدر رقت طبی ہے لیکن بعد کی تخلیقات میں اس کی متنوع شخصیت کے تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس انداز میں وہ بہت کچھ قدیم جرمن انشا پرداز واسرمن سے ہم آہنگ ہے۔

---

1. Aurther Koertler
2. Bertdt Berecht
3. Weimar Repablik
4. 'Kallendergeschichten'
5. 'Die Unwurdige Greisen'
6. Hermann Hesse
7. Frau Ketenberg
8. 'Sidharta'
9. 'Diesseits'
10. Wassermann

جنگ کے بعد کی ناسازگار فضا میں لکھنے والوں میں ایمل اشتراؤس[1]، ولیم شیفر، ویشرت، فرانس ورفل، جورج ہیم، اور گوٹ فرِڈ بِن پائے کے ادیب سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں فطری حقیقت نگاری میں سماجی شعور بھی نمایاں ہے۔

ایمل اشتراؤس جنوب مغربی خطے سے تعلق رکھتا ہے۔ ادب میں اس کا سرمایہ اپنے ہمعصروں کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن اس نے بدلتی ہوئی قدروں کو نئے زاویوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے اس کے مقابلہ میں شیفر کا ادبی سرمایہ بہت زیادہ ہے۔ اسلوب میں وہ اگرچہ قدیم اساتذۂ فن کلائسٹ، کیلر اور ہیبل کا تتبع کرتا ہے لیکن اس کا طرزِ فکر ان سے بالکل مختلف ہے۔ "قصے"[2]، "گلوبند کی کہانی"[3] اور "ہولڈرلن کی اقامت گاہ"[4] اس کے جدید اور ترقی یافتہ فن کی عمدہ مثالیں ہیں جن میں خارجیت نمایاں ہے۔ ویشرت کے یہاں حقائق کا تلخ اظہار ہے۔ وہ انسانیت کا ہمدرد اور اس کی فلاح کا خواہاں ہے چنانچہ آمرانہ عناصر کے خلاف اس کا لہجہ ہمیشہ سخت رہا ہے۔ تیسری حکومت کی طرفداری اس کے نزدیک قوت کے عدم توازن کی بدترین مثال ہے۔ ویشرت کا مجموعہ "سفید بیل"[5] شروع سے آخر تک سیاسی شعور کا آئینہ دار ہے۔

ورفل کے فن میں سچائی اور حقیقت نمایاں ہے۔ غنائی شاعر ہونے کی حیثیت سے نثر میں بھی اس کا لہجہ بہت شیریں اور دل آویز معلوم ہوتا ہے۔ جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی کے علاوہ شعوری مسائل کی بھی بہتات نظر آتی ہے۔ نازیت کا ہدف بننے کے بعد وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ چنانچہ پناہ گزیں ادب میں بھی ورفل کا بڑا حصہ ہے۔

اس عہد کے چند نامور شعرا مثلاً جورج ہیم، ارنسٹ شٹڈلر[6] اور ٹراکل وغیرہ نے بھی خال خال مختصر نثری تجربے کیے ہیں جو فنی اعتبار سے اتنے اہم نہیں جتنا ان کا کلام وقیع سمجھا جاتا ہے۔ ہیم اظہاریت پسند شاعر ہے نثر میں بھی اس کا انداز معتبرانہ خوبیاں رکھتا ہے۔ بین شاعر ہے کی گہرائی بعض اوقات الہام تک پہنچ جاتی ہے۔ گوٹ فرِڈ بین ہمعصروں میں سب سے الگ ہے کہ منکریت (Nihilism) کے دور میں کسی قدر چونکا دینے والی آواز ہے اس کے یہاں ذہن اور آرٹ دونوں میں نظم و ضبط پایا جاتا ہے اس کی شخصیت میں کسی حد تک رواقی فلسفہ کا پرتو بھی ہے، ایک زمانہ تک اس نے نازیت کی طرفداری بھی کی لیکن اس کی تحریروں میں پروپیگنڈائی رنگ نہیں آسکا البتہ فکر کی گہرائی اور فن کی سطح کم ہو گئی۔

رابرٹ والزر[7] کو سوئزر ([illegible]) ہونے پر بھی جرمنی کے چوٹی کے لکھنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ناول نویس ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے بہت سی مختصر نیز طویل کہانیاں لکھی ہیں جو اسلوب کی جدت کے ساتھ زبان میں والزر کی مہارت کا نمونہ ہیں۔ زبان میں وہ ہمیشہ اپنی مخصوص جدتوں سے کام لیتا ہے جو مترجمین کے لیے دشواریوں کا سبب بنتی ہیں۔

---

1. Emil Strauss
   Wilhelm Shafer
   Wiechert
   Franz Werfel
   George Heym
   Gottfried Benn
2. 'Anakdoten'
3. 'Halsbandgeschichte
4. 'Holderlins Einkehr
5. Der Weisse Buffel
6. Ernst Stadler
   George Trakl
7. Robert Walser

اسٹیفن سوائیگ[1] آسٹریا کے اس حلقے سے تعلق رکھتا ہے جو جدید رومانیت کے عہد کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس کی تحریریں اپنے دور
کے سماجی و نفسیاتی حقائق سے مملو دکھائی دیتی ہیں۔ ایک ماہر فطرت شناس فنکار ہونے کی حیثیت سے اس نے انتہا پسندی کے دور کا
بغور مشاہدہ کیا تھا اور وہ اس کے انجام سے بھی واقف تھا لیکن حالات کا رُخ پھیر دینا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ اس احساس نے اس کی
فنی یاسیت کے عنصر کو نمایاں کر دیا۔ یہی یاسیت اس کی موت کا بھی باعث ہوئی۔ جبری ترکِ وطن کے بعد سوائیگ نے برازیل میں خود اپنی
خودکشی کر لی۔ مرحوم نثر لکھنے والوں میں اس کی تخلیقات کو وقیع نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں نے ایک مرتبہ جرمن قوم پر جنگ کے صحیح مفہوم کو واضح کر دیا اور یہی جنگ دنیا کے فنکاروں کے غور و فکر
کی جگہ دہشت ناک آسیب کی طرح ذہنوں پر چھا گئی جس کے سلسلہ میں خوفناک 'جنگ، پیاس، ہنگامہ، قتل و غارتگری، آہ و بکا' اور فرار
سب کچھ دکھائی دینے لگا۔ دوسری جانب اظہاریت نے نثر کا انداز بھی بدل ڈالا اور اب حقیقت کے ساتھ اسلوب پر بھی خصوصی توجہ دی جانے
لگی۔ اس کی انتہائی کامیاب اور ترقی یافتہ صورت ایڈشمڈ کاشمیر[2] کے یہاں ملتی ہے۔ اس کا انداز توانا اور حقیقت آفریں ہے جس میں ذاتی
مشاہدات نے اعتماد کی فضا پیدا کی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے نفسیاتی تقاضوں سے وہ پوری طرح باخبر نظر آتا ہے۔

ارنسٹ گلیسر[3] سیاسی خلفشار سے بے حد متاثر ہے وہ اس کو تمدن کی غارت گری کہہ کر احتجاج کرتا ہے اس کے برعکس ہرمن کسٹن[4]
کے یہاں احتجاج کی یہی شدت نظر نہیں آتی وہ زندگی سے حد درجہ خائف ہو چکا ہے اور ہر شے کو بے یقینی کے عالم میں دیکھتا ہے اس کے لئے
فضا آفرینی کی ہے جس کے لہجہ میں شدت نہ ہونے کے باوجود تلخی کا احساس غالب ہے۔ 'تیسری حکومت' کے مظالم نے اس کے فن کو بھی شدت سے
متاثر کیا ہے۔ بالکل یہی احوال ولی بریڈیل[6] کے یہاں ملتا ہے اس کا افسانوی سرمایہ کافی ہے جس کا بیشتر حصہ 'تیسری حکومت' ہی سے
متعلق ہے۔

کارل زک مائر[7] کا انداز کسی قدر شگفتہ ہے وہ اس ہلاکت آفریں دور میں بھی زندگی کے خوش آئند پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ طنز
لطیف مزاح سے اس نے جابجا زندگی کی لغزشوں اور کوتاہیوں کا احساس دلایا ہے۔ ابتدا میں وہ محض ڈرامہ نگار ہی کی حیثیت سے
جانا جاتا تھا۔ لیکن بعد کی مختصر کہانیوں نے اس کو مختصر افسانہ کی فہرست میں شامل کر دیا۔

اس ماحول کی ایک منفرد آواز الفریڈ پولگار[8] ہے جس کے یہاں حالات کا جائزہ واضح، مربوط اور حقیقت پسندانہ تجزیہ ملتا ہے۔ اس
کی تخلیقات جو شعبۂ وقت کی انسائیکلوپیڈیا ہیں جن کو دیکھ کر اس دور کے مسائل کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کو زبان پر حیرت انگیز قدرت
حاصل ہے جس سے انداز میں شوخی، جدت، طنز اور استعارات کی خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ابتدائی کہانیوں میں 'آج اور کل'...

1. Stefan Zweig
2. Edschmid Kashmir
3. Ernst Glaser — 'Gestern u. Heute'
4. Hermann Kesten — 'Ich bin Zeuge'
5. Anna Segher — 'Schwarz auf weiss'.
6. Willi Bredel
7. Karl Zuckmayer
8. Alfred Polgar

...ے سیاہ" اور "چمکتی شعاعوں میں"[1] "دوسری طرف" اور "شفق میں ملاقات" میری مختصر نثر کے بہترین مجموعے ہیں۔ جوزف ہوف ملر[2] نے
...تخلیقات کو آنے والے دور کے کلاسیک سے تعبیر کیا ہے۔

آسٹریا کے کیتھولک حلقے سے مادیت کی خلاف بارہا آواز اٹھائی گئی ہے انہی میں ایک آواز میل ماکس[3] بھی ہے۔ وہ روحانی قدروں
...بردار ہے اور شعور کی تمام کاوشوں کو مذہب کے تابع کر دینا چاہتا ہے اسی سے ملتا جلتا رجحان آرنولڈ[4] سوائیگ کا ہے جو انسانیت کی
...کے لیے سچی ہمدردی کا احساس پیدا کرنا ——— ضروری سمجھتا ہے۔

ہنگری سے آرتھر کوسٹلر[5] کی شخصیت غیر معمولی صلاحیتوں کی مظہر ہے اس کی بیشتر تخلیقات میں سیاسی عنصر غالب ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی
...سے لے کر جنگ عظیم تک کے بین الاقوامی بحران نے کوسٹلر کو سیاسی بصیرت دی ہے۔ گزشتہ سالوں میں خود ہنگری کے انقلاب سے اس کی
...ریں نمایاں طور پر متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے ہی تجربات کا واشگافانہ اظہار فان ڈیر ویرنگ[6] کے یہاں ملتا ہے البتہ اس کے یہاں فرانسیسی
...از کی تنقید موجودہ جرمن روایت کے برعکس نظر آتی ہے۔

ارنسٹ ینگر[7] اس دور کی اہم ترین شخصیتوں میں شامل ہے۔ اس کی شخصیت ادب کے مختلف شعبوں پر حاوی ہے۔ اس عہد
...سیاسی و نفسیاتی الجھنوں کو اس نے اپنا موضوع قرار دیا ہے۔ کہیں کہیں ماحول کا عمیق مشاہدہ اس کو قنوطی بھی بنا دیتا ہے اور ایک
...حریت کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔ برتری کا احساس اس کے یہاں بھی ہے لیکن فسطائی فلسفہ کے ساتھ نہیں۔ ینگر کی
...یقات پر مادیت کا [illegible] نمایاں ہے خصوصاً جدید اشاریت [illegible] اس کو حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔

جنگ سے کچھ سال پیشتر یا اس کے دوران ادب پر سیاست جس انداز سے اثر انداز ہوئی اس کے نتیجہ میں انتہا پسند گروہ نے
...ادب کو بھی سیاسی تحریک بنا دیا ان لوگوں نے اپنا مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نیشنل سوشلزم کو مختلف صورتوں کے ساتھ ذہنوں
...منتقل کرنے کی جد و جہد کی اور مبالغہ آمیز طریقے سے قومی جذبات کو مشتعل کیا۔ کولبن ہیر، بلنک، گرم، زیلش وغیرہ[8] اسی گروہ سے تعلق رکھتے
تھے۔ ان کے نظریات کا محرک خود جرمنی کا اپنا ماضی تھا جس کی تاریخ میں پسماندگی اور بیچارگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں
نے ان خطرات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا جو مستقبل میں اس قوم کا مقدر بننے والے تھے چنانچہ فسطائی فلسفے کے بموجب اپنے آئیڈیل
...حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا خواہ اس کا انجام ہلاکت ہی کیوں نہ ہو، ان کے ذہنوں پر بھی مسلط تھا۔ اس انتہا درجہ کی جذباتیت نے
ادب کو خالص پروپیگنڈا بنا دیا۔ بلنک کا مجموعہ "کہر میں آگ"[9] اسی رنگ کی ایک عمدہ مثال ہے۔

---

1. 'Anderseits'
   'Begegnung im Zwie licht.
2. Jaseph Hofmiller
3. Mell Max
4. Arnold Zwaig
5. Aurther Koestler
6. Von der Viring
7. Ernst Junger
8. Kolbenheyer
   Blunck
   Grimm
   Zellich
9. 'Feuer im Nebel.'

زندگی کے [illegible] کو فلسفیانہ بصیرت سے پرکھنے کا انداز گزشتہ کے عہد سے جرمن ادب میں رائج ہے۔ ہنس کاروسا[1] کے یہاں بھی بصیرت اور انسانی اقدار [illegible] ملتی ہے۔ وہ بظاہر تمدن کی پرانی قدروں کا پابند ہے لیکن حقائق کو ہمیشہ نئے زاویوں سے پیش کرتا ہے حقیقت کو اشاریت کے پردے میں کہنا اس کی سب سے بڑی فنکاری ہے جس میں جابجا فاؤسٹ کا تتبع ملتا ہے۔ اس کے برعکس ہرمن کلاڈیس[2] کے یہاں فلسفیانہ مباحث کی کوئی اہمیت نہیں وہ روزمرہ کے مسائل ہی کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے۔ ہنس فرانک[3] کی تخلیقات زبان و بیان کی خوبیوں سے مزین ہوتی ہیں وہ خیالات کی ترجمانی کے لیے ہمیشہ دلچسپ پیرایہ ڈھونڈتا ہے۔ من فریڈ ہاؤس من[4] کا انداز ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح تمدن کی مختلف دنیاؤں کی سیر کرتا ہے، بنیادی حیثیت سے وہ روایت پسند ہے اور قدیم المانی زندگی کو دلکش انداز سے پیش کرتا ہے۔

ولہیم لے من[5] کے یہاں صنفی محبت اور ماورائی کی ترجمانی ہے اسی طرح زیریں جرمنی کے مقبول افسانہ نگار ارنسٹ پیٹر[6] کے یہاں بھی کئی مسائل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ کارل ہنس اشٹروبل[7] نے جدید مختصر افسانہ کی ترقی یافتہ ٹیکنیک استعمال کی ہے جس میں مشاہدے کی شدت کے ساتھ تخیل کی سطح بھی بلند ہے۔ بشوف فریڈرش[8] نے زندگی کے اہم مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ قدیم روایت کا منکر ہے اور اس کو ذہنی ناآسودگی کا سبب بتاتا ہے۔ اس کا موضوع جدید روایت ہے جس میں اس کے خیال کے مطابق تخیل حقیقت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

آسٹریا سے قنوطی انداز کی ایک آواز ہائنرش واگریل[9] ہے جس کے اسلوب پر دوستوفسکی کا فنی اثر انداز ہوا ہے۔ اس انداز دور میں اینا زیڈل[10] کا تشفی آمیز لہجہ واقعی تشفی کا موجب ہوتا ہے۔ فن کی انتہائی پختگی کے ساتھ وہ زندگی کے شدائد پر مادرانہ شفقت کے ساتھ تسلی دیتی ہے۔ سب کچھ ہو جانے کے باوجود اس کو یقین ہے کہ بھٹکی ہوئی روحیں سکون پا جائیں گی اور اس دن دنیا کے سارے دکھ درد مٹ جائیں گے۔ خود اسی کے الفاظ میں۔

"ایک دن ایسا ضرور آنے والا ہے جب ماؤں کے آنسو اتنی مقدار میں جمع ہو جائیں گے کہ جنگ کا غضبناک شعلہ خود بخود بجھ جائے گا۔"

تسلی کا ایک بڑا ذریعہ مذہب بھی ہے چنانچہ لیفورٹ[11] کے یہاں خالص روحانی فضا ہے جس میں روایتی اور دیومالائی حکایتیں بھی کیتھولک تصوف میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح اشٹیفن اینڈرس[12] کی تخلیقات میں خود اس کی کلیسائی تربیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی اور گزشتہ جنگِ عظیم کے تجربات نے اس کے فن کو بھی شدت سے متاثر کیا ہے۔ اس کی تخلیقات میں جوش و ولولہ کا بھی عنصر غالب ہے۔ زبان کی صحت اور تخیل کی جدت کے لحاظ سے اس کو آج کے جرمن افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

---

1. Hans Carossa
2. Hermann Cladius
3. Hans Frank
4. Manfried Hausmann
5. Wilhelm Lehmenn
6. Ernst Peter
7. Karl Hans Strobl
8. Bischoff Friedrich
9. Heinrich Waggrel
10. Ina Siedel
11. Gertude von Lefort
12. Stefan Anders

سنجیدہ مزاج کے مضمون کو ارنسٹ[1] پینزولڈ نے بڑی عمدگی سے نبھایا ہے اس کا انداز بہت کچھ ہر من ہیسے سے ملتا جلتا ہے
طنز کے ساتھ نفاست اور حسنِ بیان کی خوبیاں برٹنگ[2] جورج کے یہاں ملتی ہیں وہ حقیقت پسند تحریک کا نمائندہ ہے اور عام انسانی
کمزوریوں پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ مقصدیت سے بھرپور تجربات ولف[3] گانگ مُلر نے کیے ہیں۔ البرشٹ[4] گوز کی تحریریں تلخ حقائق
سے پُر نظر آتی ہیں۔ وہ تیسری حکومت کی بد اعمالیوں پر سفاکانہ انداز میں تبصرہ کرتا ہے اس کے ساتھ ہی آنے والے دور سے
پُر اُمید بھی ہے لیکن والٹر[5] ینس اور ہرمن[6] لینس نے ساری خطاؤں کا سزاوار دُوسروں ہی کو گردانا ہے۔ اس دور میں اُن کی یہ قنوطیت
بڑی حد تک سیاسی حالات کا تقاضا کہی جا سکتی ہے۔ والٹر کے یہاں سراسیمگی کا احساس بھی غالب ہے لیکن لینس کی تحریروں میں
تلخی کے ساتھ ندامت بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک ہنگاموں سے زیادہ اہم ان کے اندر پوشیدہ عوامل ہیں جن کو وُہ
بڑی سنجیدگی سے پرکھتا ہے اس لحاظ سے اس کا اسلوب اوروں سے کچھ مختلف ہے۔

روڈولف[7] بورشارڈ کو ایک عرصہ تک ڈرامہ نویس اور مضمون نگار کی حیثیت سے ہی جانا جاتا تھا لیکن بعد کے افسانوی
مجموعہ نے اس کو صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں شامل کر دیا۔ زندگی کے تمام ادھورے اور اُلجھے مسائل پر قلم اُٹھاتے ہوئے وُہ
زبان کے اعجاز سے عجیب و غریب تاثرات پیدا کرتا ہے۔

پچھلی نصف صدی سے جرمن ادب میں برگنگرین[8] کی کثیر اور مختلف النوع تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس
نے جرمن افسانہ کو بھی نئی ٹیکنیک سے روشناس کیا ہے اس کا مکتبۂ فکر بہت وسیع نظر آتا ہے جس میں نفسیات و روحانیت کے مضامین
خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ کیتھولک عقیدہ کی پابندی سے وہ عام انسانی قدروں کو سب پر ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کو نازی
دور میں تصنیف و تالیف کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ برگنگرین کے ابتدائی مجموعہ "ریوال میں موت[9]" کا رنگ عموماً مزاحیانہ ہے لیکن بعد کے
مجموعے "آخری شہسوار[10]" اور "آخری شہسوارہ[11]" اس کے فن کی بہترین مثالیں ہیں۔ مختلف حلقوں کی مخالفت کے باوجود اس کو
آج کے صفِ اوّل کے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جنگ کے بعد جرمن افسانہ کو نئی ٹیکنیک سے پیش کرنے میں پُرانے فن کاروں کے ساتھ نئی نسل نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا
ہے جس کی وجہ سے پچھلے پندرہ برس میں جرمن افسانہ نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اور آج وہ ہر اعتبار سے بین الاقوامی سطح پر نظر
آتا ہے۔ اس دور کو جرمن افسانے کی نشاۃ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ویڈسن[12] کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں "خالص جرمن افسانہ" کا دور
یہ زمانہ ہے۔ اس دور کے بیشتر فنکاروں کی تخلیقات جرمن رواج کے مطابق ریڈیو کے ذریعہ سامعین تک پہونچیں اور بعد میں

---

1. Ernst Penzoldt
2. Britting George
3. Wolfgang Muller
4. Abrecht Goes
5. Walter Jens
6. Hermann Lenz
7. Rudolf Borcherdt
8. Bergengruen
9. 'Der Tod von Reval
10. 'Der letzte Rittmeister'
11. 'Die letzte Rittmeisterin
12. Prof. W. Waidson

زندگی [illegible] کو فنیانہ بصیرت سے پرکھنے کا انداز گزشتہ کے عہد سے جرمن ادب میں رائج ہے۔ ہنس کاروسا[1] کے یہاں یہ بصیرت اساطیری انداز [illegible] جاتی ہے۔ وہ بظاہر تمدن کی پرانی قدروں کا پابند ہے لیکن حقائق کو ہمیشہ نئے زاویوں سے پیش کرتا ہے حقیقت کو اشاریت کے پردے میں کہنا اس کی سب سے بڑی فنکاری ہے جس میں جا بجا گوئٹے کا تتبع ملتا ہے۔ اس کے برعکس ہرمن کلاڈیس[2] کے یہاں فلسفیانہ مباحث کی کوئی اہمیت نہیں وہ روزمرہ کے مسائل ہی کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے۔ ہنس فرانک[3] کی تخلیقات زبان و بیان کی خوبیوں سے مزین ہوتی ہیں وہ خیالات کی ترجمانی کے لیے ہمیشہ دلچسپ پیرایہ ڈھونڈتا ہے۔ من فریڈ ہاؤس مین[4] کا انداز ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح قاری کو مختلف دنیاؤں کی سیر کراتا ہے۔ بنیادی حیثیت سے وہ روایت پسند ہے اور قدیم المانی زندگی کو دلکش انداز سے پیش کرتا ہے۔

ولہیلم لے من[5] کے یہاں حسن بھی ماورائیت کی ترجمانی ہے اسی طرح زیریں جرمنی کے مقبول افسانہ نگار ارنسٹ پیٹر[6] کے یہاں بھی نجی مسائل کی بہتات دکھائی دیتی ہے۔ کارل ہنس اشتروبل[7] نے جدید مختصر افسانہ کی ترقی یافتہ تکنیک استعمال کی ہے جس میں مشاہدے کی شدت کے ساتھ تخیل کی سطح بھی بلند ہے۔ بشوف فریڈرش[8] نے زندگی کے اہم مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ قدیم رومانیت کا مخالف ہے اور اس کو ذہنی ناآسودگی کا سبب بتاتا ہے۔ اس کا موضوع جدید رومانیت ہے جس میں اس کے خیال کے مطابق تخیل حقیقت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

آسٹریا سے قنوطی انداز کی ایک آواز ہنرش واگریل[9] ہے جس کے اسلوب پر دوستوفسکی کا فنی اثر انداز ہوتا ہے۔ اس افسانوی دور میں اینا زیڈل[10] کا تشفی آمیز لہجہ واقعی تشفی کا موجب ہوتا ہے۔ فن کی انتہائی پختگی کے ساتھ وہ زندگی کے شدائد پر اداس شفقت کے ساتھ تسلی دیتی ہے۔ سب کچھ ہو جانے کے باوجود اس کو یقین ہے کہ بھٹکی ہوئی روحیں سکون پا جائیں گی اور اس دن دنیا کے سارے دکھ درد مٹ جائیں گے۔ خود اسی کے الفاظ میں۔

"ایک دن ایسا ضرور آنے والا ہے جب ماؤں کے آنسو اتنی مقدار میں جمع ہو جائیں گے کہ جنگ کا غضبناک شعلہ خود بخود بجھ جائے گا۔"

تسلی کا ایک بڑا ذریعہ مذہب بھی ہے چنانچہ لیفورت[11] کے یہاں خالص روحانی فضا ہے جس میں روایتی اور دیومالائی حکایتیں بھی کیتھولک تصوف میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح اشٹیفن اینڈرس[12] کی تخلیقات میں خود اس کی کلیسا کی تربیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی اور گزشتہ جنگ عظیم کے تجربات نے اس کے فن کو بھی شدت سے متاثر کیا ہے۔ اس کی تخلیقات میں جوش و ولولہ کا بھی عنصر غالب ہے۔ زبان کی صحت اور تخیل کی جدت کے لحاظ سے اس کو آج کے جرمن افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

---

1. Hans Carossa
2. Hermann Cladius
3. Hans Frank
4. Manfried Hausmann
5. Wilhelm Lehmann
6. Ernst Peter
7. Karl Hans Strobl
8. Bischoff Friedrich
9. Heinrich Waggrel
10. Ina Siedel
11. Gertude von Lefort
12. Stefan Anders

سنجیدہ مزاج کے مضمون کو ارنسٹ پینزولڈ[1] نے بڑی عمدگی سے نبھایا ہے اس کا انداز بہت کچھ ہرمن ہیسے سے ملتا جلتا ہے طنز کے ساتھ نفاست اور حسنِ بیان کی خوبیاں برٹنگ جورج[2] کے یہاں ملتی ہیں وہ حقیقت پسند تحریک کا نمائندہ ہے اور عام انسانی کمزوریوں پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ مقصدیت سے بھرپور تجربات ولف گانگ ملر[3] نے کیے ہیں۔ البرشٹ گوز[4] کی تحریریں تلخ حقائق سے پُر نظر آتی ہیں۔ وہ تیسری حکومت کی بد اعمالیوں پر سفاکانہ انداز میں تبصرہ کرتا ہے اس کے ساتھ ہی آنے والے دور سے پُرامید بھی ہے لیکن والٹر ینس[5] اور ہرمن لینس[6] نے ساری خطاؤں کا سزاوار دوسروں ہی کو گردانا ہے۔ اس دور میں اُن کی یہ قنوطیت بڑی حد تک سیاسی حالات کا تقاضا کہی جا سکتی ہے۔ والٹر کے یہاں سراسیمگی کا احساس بھی غالب ہے لیکن لینس کی تحریروں میں تلخی کے ساتھ ندامت بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک ہنگاموں سے زیادہ اہم ان کے اندر پوشیدہ عوامل ہیں جن کو وہ بڑی سنجیدگی سے پرکھتا ہے اس لحاظ سے اس کا اسلوب اوروں سے کچھ مختلف ہے۔

روڈولف بورشارڈ[7] کو ایک عرصہ تک نثریے نویس اور مضمون نگار کی حیثیت سے ہی جانا جاتا تھا لیکن بعد کے افسانوی مجموعے نے اس کو صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں شامل کر دیا۔ زندگی کے عام اور جانے بوجھے مسائل پر قلم اٹھاتے ہوئے وہ زبان کے اعجاز سے عجیب و غریب تاثرات پیدا کرتا ہے۔

پچھلی نصف صدی سے جرمن ادب میں برگنگرین[8] کی کثیر اور مختلف النوع تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس نے جرمن افسانہ کو بھی نئی ٹیکنیک سے روشناس کیا ہے اس کا مکتبۂ فکر بہت وسیع نظر آتا ہے جس میں نفسیات اور رومانیت کے مضامین ملموسیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ کیتھولک عقیدہ کی پابندی سے وہ عام انسانی قدروں کو سب پر ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کو نازی عملداری میں تصنیف و تالیف کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ برگنگرین کے ابتدائی مجموعے "ریوال میں موت[9]" کا رنگ عموماً مزاحیانہ ہے لیکن بعد کے مجموعے "آخری شہسوار[10]" اور "آخری شہسوارہ[11]" اس کے فن کی بہترین مثالیں ہیں۔ مختلف حلقوں کی مخالفت کے باوجود اس کو آج کے صفِ اوّل کے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جنگ کے بعد جرمن افسانہ کو نئی ٹیکنیک سے پیش کرنے میں پرانے فن کاروں کے ساتھ نئی نسل نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا ہے جس کی وجہ سے پچھلے پندرہ برس میں جرمن افسانے نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اور آج وہ ہر اعتبار سے بین الاقوامی سطح پر نظر آتا ہے۔ اس دور کو جرمن افسانے کی نشاۃ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ویڈسن[12] کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں "خالص جرمن افسانہ" کا دور یہی زمانہ ہے۔ اس دور کے بیشتر فنکاروں کی تخلیقات جرمن رواج کے مطابق ریڈیو کے ذریعہ سامعین تک پہونچیں اور بعد میں

---

1. Ernst Penzoldt
2. Britting George
3. Wolfgang Muller
4. Abrecht Goes
5. Walter Jens
6. Hermann Lenz
7. Rudolf Borcherdt
8. Bergengruen
9. 'Der Tod von Reval'
10. 'Der letzte Rittmeister'
11. 'Die letzte Rittmeisterin
12. Prof. W. Waidson

مستقل تصانیف کی صورت میں آئیں۔

گیرڈ گائزر[1] کا نام جنگ کے بعد کی فضا کی عکاسی کے لیے مشہور ہے۔ اس نے جنگ سے واپس ہونے والے فوجیوں کی زندگی پر فنکارانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے جس کی تہ میں ایک عظیم ہنگامہ پوشیدہ نظر آتا ہے۔ ہائنس ہوبر[2] کا انداز بڑی حد تک روایتی اسلوب کا کہا جا سکتا ہے۔ افسانے کے مقابلہ میں رپورتاژ میں زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔

ہنس ایرش نوساک[3] بنیادی طور پر ڈرامہ نگار ہے۔ افسانوی ادب میں اس کا سرمایہ جنگ کے بعد کا ہے۔ وہ آج کے جرمنی کو درپیش مسائل پر گہری بصیرت رکھتا ہے۔ روایت سے متعلق نہ ہونے کے باوجود اس کی باریک بینی اور مخصوص اشاریت کہیں کہیں پراسرار انداز اختیار کر لیتی ہے۔ "نیکیا"[4]، "موت سے انٹرویو"[5] اور خاص "ریہرسل" اس کی دانشورانہ بصیرت کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ہلڈے شائمر[6] کی تحریر پڑھ کر دیکھیے کہ اس ہولناک دور کی یاد تازہ ہوتی ہے جب جرمنی خاک و خون اور کھنڈرات کا ملک بن گیا تھا۔ جنگ کا خوفناک آسیب اس کی تخلیقات پر بھی چھایا نظر آتا ہے۔ اسی ہنگامے نے اس کو وطن سے دور کر دیا۔ جنگ کے بعد اس کو نورمبرگ کی عدالت میں بھی پیش ہونا پڑا جہاں اس نے نازی جنگی مجرموں کے مترجم کے فرائض انجام دیے۔ اس کی تحریروں میں انہی حوادث کا اثر غالب ہے۔

الزبیتھ لینگسر[7] جنگ سے قبل غنائی شاعرہ اور ناول نویس کی شہرت رکھتی تھی۔ نازی عہد کی "جبری خاموشی" کے بعد ۱۹۴۵ء سے اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ اس مرتبہ اس کی توجہ کا مرکز خصوصیت کے ساتھ مختصر افسانہ رہا۔ چنانچہ اٹھارہ کہانیوں کے مجموعہ "ٹورسو"[8] سے اس کو افسانہ نگاروں میں بھی صفِ اول کی فنکارہ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ تمام کہانیاں جنگ کے دوران یا اس کے فوراً بعد کی لکھی ہوئی ہیں۔
اس کی تصانیف بڑی پر معنی اور اشاراتی انداز کی ہوتی ہیں جن میں جا بجا خود کلامی کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے یہاں خارجی عمل کے مقابلہ میں نفسیاتی تحلیل پر زور دیا جاتا ہے۔ وہ جرمنی کے متوسط طبقہ کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ اس کے فن پر بھی جنگ اور صیہونیوں پر نازی آمریت کے اثرات نمایاں ہیں۔

ہرمن کازک[9] حقیقت کو تخیل سے ادا کرتا ہے۔ زندگی کے عملی و نظری پہلوؤں پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ وہ انسانی استقامت کا قائل ہے۔ "تمثیلی افسانوں"[10] کے تند و تیز لہجے میں اس نے اس اندھی تقلید کے خلاف اعلانیہ بغاوت کی جو قومی شعور کو ہلاک کر رہی تھی۔ وہ تمدن کی میکانی ساخت سے بیزار ہے اور تباہ شہروں کے ملبے پر کھڑا ہو کر خواب کی پناہ گاہیں تلاش کرتا ہے۔ اس رمزیت میں جا بجا کافکا کا اثر و نفوذ سرایت کیے نظر آتا ہے۔ اس کا فن حال کی ساری ناامیدیوں اور مایوسیوں کا آئینہ دار ہونے کے باوجود ایک خوش آئند مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

---

1. Gerd Gaiser
2. Heinz Hober
3. Hans Erich Nossack
4. 'Nekyia'
5. 'Interview mit dem Tode
6. Wolfgang Hildesheimer
7. Elisabeth Langgaser
8. 'Der Torso'
9. Hermann Kasack
10. 'Der Webstuhl'

کورٹ کوزنبرگ[1] اپنے رنگ کا واحد لکھنے والا ہے جس نے معقولات کی ساری حد بندیاں توڑ کر مہملات و توہم کی فوقیت کو منوانے کی کوشش کی ہے۔ وہ زندگی کی یکسانیت اور بے کیفی سے اُکتا کر تخیل و مبالغہ کی دنیا میں جا بستا ہے۔ معقولیت کے خود ساختہ اور مصنوعی ضابطوں پر اس نے طنز کے حربے استعمال کیے ہیں اس عجیب و غریب انداز میں کہیں کہیں ہوف فن کے روایتی انداز کا بھی پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ آج کے جرمن افسانہ نگاروں میں کوزنبرگ صفِ اول کا فنکار شمار ہوتا ہے۔ اب تک اس کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "نیلا خواب"[2] "سورج مکھی کے پھول"[3] "زندگی کی شراب"[4] اور "لا بوتیلا"[5] خاصی شہرت رکھتے ہیں۔

ہائنس رِیسے[6] کے یہاں اخلاقی و مابعد الطبیعاتی اقدار کا پورا پورا احترام ہے۔ وہ فرد اور جماعت کے باہمی رشتہ پر فلسفیانہ مباحث سے گریز کرتا ہے لیکن فرد کو معاشرے میں اس کے صحیح مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ معاشرے کی مروجہ قدروں سے مکمل بغاوت نہیں کرتا لیکن اس کے کمزور پہلوؤں پر طنز کے بھرپور حملے کرتا ہے۔ "بے راہ رو"[7] "جنیوا میں سانپ"[8] اور "خود اپنا انعام"[9] اپنے طنزیہ انداز، سادگی اور واقعیت کی بنا پر جدید جرمن افسانوں کے عمدہ مجموعے خیال کیے جاتے ہیں۔

ہائنرش بول[10] موجودہ جرمن افسانہ نگاروں میں چوٹی کا فنکار سمجھا جاتا ہے۔ جنگ کے باقیات کا اثر اس پر بھی نمایاں ہے لیکن وہ ان مسائل پر مابعد الطبیعاتی بصیرت سے دیکھتا ہے۔ روزمرہ کی جرمن زندگی پر بھی اس کا مشاہدہ بہت عمیق ہے۔ روحانیت پر کامل اعتقاد اس کے نزدیک سب مصائب کا مداوا ہے۔ حقیقت کو موثر بنانے کے لیے بول جا بجا تمثیل کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ "نہ صرف کرسمس کے لیے"[11] "ابتدائی برسوں کی روٹی"[12] "پل پر"[13] یا "چاقو پھینکنے والا"[14] اس ضمن میں اس کی بہترین مختصر کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔

وولف گانگ بورشیرٹ[15] کی شہرت کا سبب اس کی معرکۃ الآرا ڈرامائی تخلیق "دروازے کے باہر"[16] ہے لیکن بعد کے "مکمل مجموعہ" نے اس کو شاعر، افسانہ نگار اور رپورتاژ نویس کی حیثیت سے بھی منوا لیا۔ بورشیرٹ کی افسانوی تخلیقات اگرچہ مروجہ پلاٹ کی پابند نہیں ہوتیں لیکن ان کا دلچسپ اور موثر انداز بیان قاری کو متاثر کرتا ہے۔ اکثر موقعوں پر وہ محض وقتی اور لمحاتی تاثرات کو بھی فنکاری کے ساتھ کینوس پر پھیلا دیتا ہے۔ اس کی تخلیقات اپنے وقت کے ہنگاموں کی جیتی جاگتی داستانیں ہیں جن میں زندگی کی خواہش بھی ہے اور موت سے خوف بھی۔ ان شدائد کے خلاف بورشیرٹ کی آواز ایک والہانہ لیکن شدید احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ نثر میں وہ عظیم جرمن انشاپرداز جورج بیوشنر سے متاثر ہوا ہے لیکن ہیئت کی جدید تشکیل میں اس کے تجربے انفرادی نوعیت رکھتے ہیں جس کی مثالیں "اسی منگل کو"[17] اور "سنگ گل" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

---

1. 'Kunt Kusenberg
2. 'Der blaue Traum'
3. 'Die Sonnenblumen'
4. 'Wein anf Lobenzeit'
5. 'La Botella'
6. Heinz Risse
7. 'Irrfahrer'
8. 'Schlangen in Genf'
9. 'Belohne dich Selbst'
10. Heinrich Boll
11. 'Nichtnur zur Weinachzeit
12. 'Das Brot d. Fruhen Jahre'
13. 'Uber die Brucke'
14. 'Der Man mit dem Messern'
15. Wolfgang Borchert
16. 'Draussen vor der Tur.'
17. 'An diesem Dienstag'

الزے ایشنگر[1] جرمنی کے جدید ادبا میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ فنکار ہے۔ اس کا اسلوب مروجہ انداز سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ روایتی افسانہ کی تشکیل میں الزے کا سلیقہ بہت نمایاں ہے۔ اس کی تخلیقات میں انسانی جذبات و محسوسات ایک آفاق گیر انداز میں پیش ہوتے ہیں۔ ماورائیت میں وہ براہ راست کافکا اسکول کا تتبع کرتی ہے چنانچہ اس کے یہاں بھی حقائق، اساطیر، علائم اور اسرار و رموز کی بھول بھلیاں قاری کے لیے خواب کی تشبیہوں کا کام کرتی ہیں جن میں گم ہو کر زمانی و مکانی احساسات ختم ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والا تصورات کی دنیا ہی کو حقیقی دنیا سمجھنے لگتا ہے۔ الزے کا ابتدائی افسانوی مجموعہ "بندھا انسان"[2] کے نام سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا جس کو اب تک یورپ کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے حال ہی میں فشر لاگ نے اس کی نثری تخلیقات کا ایک اور مجموعہ "معدوم لمحہ"[3] کے نام سے شائع کیا ہے جس میں ماورائیت کی جدید تکنیک استعمال کی گئی ہے۔

الزے کے بیان پر جدید جرمن افسانہ کا جائزہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں ابتدا سے لے کر موجودہ عہد تک کے تمام نامور فنکار شامل ہیں لیکن ان لکھنے والوں کے علاوہ بھی نئی نسل کے اور بہت سے قلم کار ہیں جن کی تخلیقات جرمن اخبارات و رسائل میں چھپتی رہتی ہیں۔ دور حاضر میں یہ لوگ بھی جرمن افسانہ کی ترقی میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں ان کی تخلیقات کا محور آج کی جرمن زندگی ہے جو ناقابل حل مسائل سے دوچار ہے اس ضمن میں جنگ کے باقیات، جرمنی پر یورپ و امریکہ کی یلغار، مختلف معاشروں کا تصادم، سیاسی و نظریاتی کشمکش، برلن کا بحران، ایٹمی خطرات اور سب سے بڑھ کر آنے والی جنگ کا خوف موجودہ لکھنے والوں پر اثر انداز ہے۔ ان فن کاروں میں انڈریش الفریڈ[4]، بیہائم شوارسباخ[5]، بینڈر ہاؤس، ہربرٹ آئزن رائش، ولی فیزے، ہوگو ہارٹنگ، مائنراڈ انگلن، ولی کرامپ، فرانس نابل، گیبارٹ پول، لوئزے رنسر، ارنسٹ شنابل اور ہاؤس شوماخر جیسے قلم کار شامل ہیں ——

۱۸۲۰ء میں گوئٹے نے ادب کی دائمی قدروں کے بارے میں کہا تھا۔
"ادب کی دنیا اپنا ایک وجود رکھتی ہے جسے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ آرٹ کی اس دنیا سے اس جیسی یا اور دوسری نئی دنیائیں پیدا ہوتی رہیں گی۔ اس دنیا میں ابدی زندگی سانس لیتی ہے جو ہمیشہ سے بوڑھی، جوان اور

---

1. Ilse Airhinger
2. Der Gefesselte
3. Zu keiner Stunde
4. Andreach Alfred
5. Beheim Schwarzbach
   Bemler Haus
   Herbet Eisenreich
   Willi Fehse
   Hugo Harting
   Meinrad Inglin
   Willi Kramp
   Franz Nabl
   Gehart Pohl
   Luise Rinser
   Ernst Schnabl
   Hous Schumacher

بجھ رہی ہے۔ آنے والے حوادث اس کی اس ازلی حیثیت کو نہیں بدل سکیں گے اور اس دُنیا میں بسنے والے فن کی ساحروں سے یوں ہی فیضیاب ہوتے رہیں گے جن کا عام آدمی احساس بھی نہیں کر سکتا۔"

صرف چار سال گزرے تھے کہ حالات کے تغیر نے کاروُلینے[1] شیلگل کے دل میں خدشات پیدا کر دیے۔ ۱۸۰۱ء میں اُس نے آنے والے خطرات سے متاثر ہو کر ولہیم[2] شیلگل کے نام ایک خط میں لکھا۔

"میرے دوست، مسلسل دوہرائے جا۔ یہ زندگی کس قدر مختصر ہے لیکن پھر بھی کتنی عظیم! بالکل آرٹ کی دُنیا کی مانند۔ نقاد گھٹتے رہیں گے، توانا نسلیں پرانی ہوتی رہیں گی، نظام بدل جائیں گے اور جب یہ دُنیا کاغذ کے ایک حقیر پرزے کی طرح جلے گی تو یاد رکھو آرٹ کا یہ سارا مال و متاع اس بھیانک شعلہ کی آخری لپک ثابت ہوگا اور پھر اندھیرا چھا جائے گا۔"

نہیں کہا جا سکتا آج کی جرمن دُنیا کیا محسوس کر رہی ہے؟ آیا وہ گوئٹے کی اس 'یقین دہانی' سے مطمئن ہے یا شیلگل والے خطرات سے خائف —— ؟؟

---

1. Karoline Schlege
2. Wilhelm Schlegel

۸۰ برس کے بعد

ادارۂ نقوش

مکاتیب نمبر

کی صورت میں

خطوط کا دوسرا غیر مطبوعہ اور نایاب سرمایہ

اردو ادب

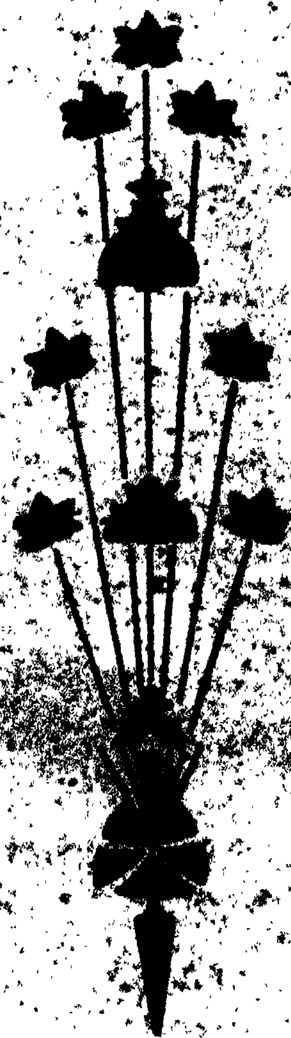
کے حوالے کرنے کا اہتمام کر رہا ہے

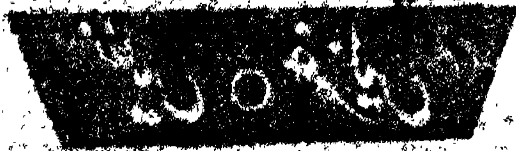
اگر آپ بھی اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکتے ہوں
تو اس سے دریغ نہ فرمائیں تاکہ ادب کا مکاتیبی باب
ابدیت کی حدوں کو چھو لے

ترقی میں دوش بدوش

... گیا ہے! روشنی اور توانائی۔ روشنی اور توانائی ترقی و خوشحالی کا منبع ہیں
توانائی کو عظیم قوت میں تبدیل کرنے اور دور دور تک روشنی پہنچانے کے لئے
بند تعمیر کئے جاتے ہیں۔ وارسک بند پاکستان کی زبردست ترقی کا مظہر ہے اسے
وجود میں لانے کے لئے برما شیل کے تیل سے چلنے والی مشینیں دن رات
مصروف رہیں۔ اور اب وارسک کے بعد منگلا بند کی تعمیر شروع ہو گئی ہے
اس عظیم بند کی تعمیر کے لئے بھی برما شیل ہی تیل فراہم کر رہا ہے
برما شیل کو بجا طور پر فخر ہے کہ وہ ترقی و خوشحالی کے ان عظیم
منصوبوں میں پاکستانی عوام کے دوش بدوش ہے۔

ہر دور کے قابل ۔ برما شیل





برقِ جہندہ

جوش ملیح آبادی

چرخ ملک شورِ لن ترانی سے
ہائے کیا مدبھری جوانی ہے

شوخ، بےباک، چلبلی، مضطر
نتھ میں طوفاں، انیٹوں میں بھنور

انکھڑیوں میں غزل سرا کاجل
گرمیِ تن سے کھولتی ہیکل،

انکھڑیوں میں نہیں یہ نیند کا بھاؤ
جوئے صہبا میں چل رہی ہے ناؤ

یوں جوانی کی زد پہ بانکپن
جوں ہوا میں حریر کا دامن

کم سنی و شباب کا سنگم
رُخ پر اک جھٹپٹے کا ہے عالم

موجِ گل نے، بدن کو ڈھالا ہے
سایۂ شاخِ گل نے پالا ہے

شوخیوں سے ہیں خال و خد روشن
موتیوں پہ دمک رہی ہے کرن

"جوگیا" کی لٹک تکلم میں
بھیرویں کی لچک تبسم میں

چال میں گھومتا ہے یوں کولا
جیسے جھولے دھناسری جھولا

روئے تاباں پہ ولولے ایسے
قصرِ مرمر پہ چاندنی جیسے

یوں اُبلتا ہے جسم سے کندن
موجِ زر ہے تمام پیراہن

زیرِ پوشاک شعلۂ دل جو
جیسے پلو میں پرفشاں جگنو

زلف کی چھاؤں میں طرب گاہیں
تار زر کی بنی ہوئی بانہیں

الاماں! تابِ رخ میں لاکھوں طور
وَقِنا ربّنا عذابَ النور

الھڑ

جوش ملیح آبادی

الھڑ، چنچل، شوخ، دِوانی
بات ہلالی، لہجہ کتانی
اپنے سے خود جھینپ تانی
لٹ میں لرزاں پیت کہانی
جیسے کھنچتی بال کمانی
آہاہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

گاہ سراب و گاہ جیحوں
گاہ ہے لیلیٰ، گاہ ہے مجنوں
دن کو "آہا" شب کو "اوں ہوں"
وقتِ ایفا، رشکِ قاروں
وقتِ پیماں، حاتمِ ثانی
آہاہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

تن میں بجتا رم جھم ساون
من میں چلتی پُروا سَن سَن
پھنکتا پنڈا، تپتا جوبن
گاہے چُٹکیں، گاہے اَن بَن
پل میں شُوم، اور پل میں دانی
آہاہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

دور رہو تو یار خنداں
پاس جو آؤ تیغِ عریاں
خلوت کفر و جلوت ایماں
پاؤں پڑو تو شاداں فرحاں
ہاتھ بڑھے تو آنا کانی
آہاہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

دیکھا مجھ کو ندیا نارے
پلو ڈھلکا، مچلے دھارے
پلکیں جھپکیں، ٹوٹے تارے
آنکھ جھکا لی، ڈر کے مارے
بھولی ساری آنی بانی
آہاہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

ایک لٹک میں سو ہلکورے
نیناں جیسے پھول کٹورے
کہتے ہیں یہ پاپی ڈورے
گال نہ چھونا سیّاں مورے

نیَں تو ہوں گی اور دوانی
آہا ہا چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

بائیں چمپا، داہنے بیلا
جوہی لونڈی، گیندا چیلا
رنگوں کا وہ مکھ پر ریلا
سندر بن میں جیسے میلا

میلا، جیسے بھور سہانی
آہا ہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

ابلی گھلی، الھڑ، اچپل
جھکتی پلکیں، چبھتا کاجل
گھور بھنور کی تن میں ہلچل
گھٹ میں آندھی، لٹ میں بادل

مہکے بر میں رات کی رانی
آہا ہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

تال کے بریں، جھل جھل زیور
لے میں، ترچھی موج کوثر
سر کے سر پر آڑا جھومر
پل ہے دھنک کا دہن کے اوپر
بول گلابی، تانیں دھانی
آہا ہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھن گھور جوانی

آبی آنچل، سرخ شلوکا
نیناں بھرے، مکھڑا لوکا
رنگ سنہرا، انگ بھبھوکا
بال کھلے تو جنگل کوکا
بات جو کی تو برسا پانی
آہا ہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھن گھور جوانی

فراق گورکھپوری

فرزانگی بڑھی تو سراسر خوشی گھٹی
اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

میری خطاؤں پر بھی نہیں لطف میں کمی
یعنی تمہاری اب وہ محبت نہیں رہی

تھی تیری چشمِ ناز میں یا میرے دل میں تھی
وہ مے کہ جام ہی میں رہی اور چھلک گئی

اس بزمِ ناز میں جو کسی تھی نہ اَن سُنی
عشقِ زباں دراز نے وہ اَن کہی کہی

وہ دادِ غم وہ میری زباں پر رُکی رُکی
ہونٹوں پہ تیرے موجِ تبسم تھمی تھمی

شاعر سے کہہ رہی ہے یہ ہونٹوں کی پنکھڑی
سو خوش بیانیوں کا جواب ایک خامشی

غم پر مرے وہ ضبطِ تبسم نہ ہو کہیں
ہونٹوں کی اوٹ میں وہ کرن سی دبی دبی

آزردگیٔ حسن کے صدقے کہ ہونٹ پر
اک مسکراہٹ اور یہ آنکھیں بھری بھری

اے طالبِ بقائے محبت یہ جان لے
ہر چیز آنی جانی ہے ہر شے ہے رفتنی

یہ تو نہیں کہ عشق پہ دائم رہے عتاب
تو مہرباں ضرور ہو لیکن کبھی کبھی

ساقی ترے نثار دیا ارغوانِ نشاط
لیکن لہو بھی کچھ رگِ پیمانہ دے گئی

یہ سحر کاریاں تری آنکھوں کو وقف ہیں
موسیٰ کے معجزے ہیں نہ جادوئے سامری

بیداریاں بھی منتظرِ انگڑائیوں کی ہیں
"اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی"

ہم دیکھتے ہی رہ گئے اندازِ چشمِ ناز
"دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی"

میری فسردگی کو مٹا سکے تو میں کہوں
یوں تو تری نگاہ ہے پیغامِ زندگی

ہم شاعروں کو چھوڑ کے تھی جن کی دھوم دھام
دنیا کو یاد آ نہ سکے ان کے نام بھی

میں نے سکوتِ حسن کو دیکھا جو غور سے
وہ درد تھا کہ روحِ محبت تڑپ گئی

آئی تھی شاعری سے گلے ملنے روحِ عصر
کہہ کر "تجھے فراق کو سونپا" گزر گئی

سید عابد علی عابد

بے سبب آپ کا وہ بر سرِ احساں ہونا   ناگہاں عقدۂ دشوار کا آساں ہونا

دوستو! دولتِ کونین کہاں ملتی ہے؟   در بدر خاک بسر چاک گریباں ہونا

دل ہی میں تری جانب سے کمی کوئی نہ تھی   میری قسمت میں ہے درماندہ و حیراں ہونا

قفسِ باغ میں وہ شورشِ آہنگِ طیور   وہ مرا فصلِ بہاراں میں غزل خواں ہونا

ناصحا! تجھ کو بہ ایں دشمنیٔ اہلِ نیاز   زیب دیتا تھا درِ ناز کا درباں ہونا

ہمدمو! وقت یہ کہتا ہے کہ اب لازم ہے   رہروِ قتل گہِ کوچۂ جاناں ہونا

اے حیا! انجمنِ ناز میں ایسا کوئی آئے   لبِ لعلیں کی جگہ چشمِ سخن داں ہونا

غمِ دنیا مجھے رکھتا ہے پریشاں خاطر   کاش دیکھوں ترے گیسو کا پریشاں ہونا

مرے جانے کی تمنا میں جئے جاتے ہیں   چارہ گر! دیکھ لیا درد کا درماں ہونا

کیا تماشا ہے کہ شہروں کو جلائے عابد

آتشِ لالہ کا صحرا میں فروزاں ہونا

صدائے بے صدا

احمد ندیم قاسمی

اظہارِ مدعا کی اجازت کا شکریہ
لیکن مری زبان تو واپس دلائیے
الفاظ سے صدا کی صفت کس نے چھین لی
اس رہزنی کا کھوج تو پہلے لگائیے

جب مل گیا مجھے مری آواز کا سراغ
جنباں رہیں گے کنجِ لحد میں بھی میرے لب
یوں بولنے کو بول تو دوں آج بھی، مگر
تاروں کے ٹوٹنے سے نہ ٹوٹا سکوتِ شب



احمد ندیم قاسمی

آج کی شب تم نہ آپائے، مگر اچھا ہوا
چاندنی روئی ہوئی ہے، چاند ہے ٹوٹا ہوا

شام کا جادو تھا یا شدت تمھاری یاد کی
وقت کیا، مجھ کو تو دریا بھی لگا ٹھہرا ہوا

جان و تن جلتے ہیں لیکن ایک کیفیت کے ساتھ
حسن اک شعلہ تو ہوتا ہے، مگر پگھلا ہوا

ہجر کا احساس تنہائی ہے بے قیدِ مقام
مجھ کو تو صحنِ چمن بھی دامنِ صحرا ہوا

جذبۂ تخلیق نے ماتم کی مہلت ہی نہ دی
ہر لُٹے منظر سے اک منظر نیا پیدا ہوا

وقت کی اپنی طبیعت، عشق کا اپنا مزاج
زندگی پر چھا گیا ہے ایک پل گزرا ہوا

آدمی اک تھا، مگر اس کے ہزاروں رُوپ تھے
وہ کبھی بندہ، کبھی آقا، کبھی مولا ہوا

کیا سوائے موت، کچھ بھی دستِ قدرت میں نہیں؟
یہ تماشا تو ہے صدیوں سے مرا دیکھا ہوا

دشمن

قتیل شفائی

میں اور وہ جب ملتے ہیں تنہائی میں
بند کواڑوں پر لہرانے والے کچھ پردوں کے سوا
کوئی اور نہیں ہوتا

میرے ہونٹوں کے پیچھے
اور اس کے دل کی دھڑکن میں
کہرام سا مچنے لگتا ہے
میں سوچتا ہوں
سب کچھ کہہ دوں
وہ چاہتی ہے
سب کچھ سُن لے
ہر بار مگر
کچھ کہنے سننے سے پہلے
اک انجانا سا شخص کوئی
معلوم نہیں کس رستے سے
ان بند کواڑوں کے اندر آ جاتا ہے
تب میرے ہونٹوں کے پیچھے
اور اس کے دل کی دھڑکن میں
کہرام مچاتا رہتا تو اک

اور تو
میں بے کھٹکے
سب کچھ کہہ دوں
وہ بن سہمے
سب کچھ سُن لے

نیند کے گہرے سمندر میں جہاں غرقاب تھا — ایک میں ساحل پہ تھا سو ماہیٔ بے آب

کیا بتاؤں دوستو، ان کے خیال آنے کا حال — جھلملاتی جھیل میں لرزاں کوئی مہتاب تھا

بہہ گئے آنکھوں سے جب آنسو تو یاد آیا مجھے — اِک جہانِ آرزو آباد زیرِ آب تھا

بے [illegible] ہے میرے گریباں میں کسی ہاتھوں کی باس — کون کہتا ہے خلوصِ دوستاں نایاب تھا

مجھ سے [illegible] کچھ اس لیے بھی منزلیں — ہمسفر میرا خلوصِ رشتۂ [illegible] تھا

محفل میں سبھی کو مل گیا اعزازِ جام — ایک دیوانہ تہی پیمانہ [illegible] تھا

نور ہو گیا اک جلوۂ خورشید سے — [illegible]

یاد آتا ہوں آنکھیں بند کر کے رات دن — میں نے دیکھا جو کبھی [illegible]

میری [illegible] کے لیے آغوش پھیلائے تھے [illegible]

یا خدا کی ذات تھی یا حلقۂ گرداب تھا

دشمن

قتیل شفائی

میں اور وہ جب ملتے ہیں تنہائی میں
بند کواڑوں پر لہرانے والے کچھ پردوں کے سوا
کوئی اور نہیں ہوتا

میرے ہونٹوں کے پیچھے
اور اس کے دل کی دھڑکن میں
کہرام سا مچنے لگتا ہے
میں سوچتا ہوں
سب کچھ کہہ دوں
وہ چاہتی ہے
سب کچھ سن لے
ہر بار مگر
کچھ کہنے سننے سے پہلے
اک انجانا سا شخص کوئی
معلوم نہیں کس رستے سے
ان بند کواڑوں کے اندر آجاتا ہے
تب میرے ہونٹوں کے پیچھے
اور اس کے دل کی دھڑکن میں
کہرام مچاتی باتوں کا
اک مدفن سا بن جاتا ہے
تھرّاتے لب سل جاتے ہیں
گاتی دھڑکن رُک جاتی ہے
اس بار مگر
جی چاہتا ہے
اک سازش کریں ہم دونوں
جب بند کواڑوں کے اندر
مجبور پرانی عادت سے
وہ شخص اگر پھر آجائے
اس شخص کی روشن آنکھوں کو
ہم داغیں گرم سلاخوں سے
اس شخص کے سنتے کانوں میں
ہم پگھلا ہوا سیسہ بھر دیں
پھر کھول کے بند کواڑوں کو
اور نوچ کے بوجھل پردوں کو
میں بے کھٹکے
سب کچھ کہہ دوں
وہ بن سہمے
سب کچھ سن لے



قتیل شفائی

نیند کے گہرے سمندر میں جہاں غرقاب تھا — ایک میں ساحل پہ تھا سو ماہیٔ بے آب تھا

کیا بتاؤں دوستو! ان کے خیال آنے کا حال — جھلملاتی جھیل میں لرزاں کوئی مہتاب تھا ×

بہہ گئے آنکھوں سے جب آنسو تو یاد آیا مجھے — اِک جہانِ آرزو آباد، زیرِ آب تھا

اب بھی ہے میرے گریباں میں کئی ہاتھوں کی باس — کون کہتا ہے خلوصِ دوستاں نایاب تھا ×

دور مجھ سے ہو گئیں کچھ اس لیے بھی منزلیں — ہمسفر میرا غلامِ ریشم و کمخواب تھا

بر سرِ محفل سبھی کو مل گیا اعزازِ جام — ایک دیوانہ ذرا بیگانۂ آداب تھا

دل منور ہو گیا اک جلوۂ خورشید سے — ورنہ میں اب تک فدائے کرمکِ شب تاب تھا

سوچتا رہتا ہوں آنکھیں بند کر کے رات دن — میں نے دیکھا جو کھلی آنکھوں وہ کیسا خواب تھا

میری کشتی کے لیے آغوش پھیلائے قتیل

یا خدا کی ذات تھی یا حلقۂ گرداب تھا

ایکٹرس کا کنٹریکٹ

مجید امجد

مرا وجود، مری زندگی کا بھید ہے، دیکھ
یہ ایک ہونٹ کے شعلے پہ برگِ گل سے خراش
یہ ایک جسم کے کندن میں گدگدی سے گداز
یہ ایک روح، بھینچے بازوؤں میں کھیلتی لہر

ذرا قریب تو آ، دیکھ تیرے سامنے ہیں
یہ سرخ رس بھرے لب، تن کی اک جھلک کے لیے
کبھی قبیلوں کے دل جوشنوں میں دھڑکے تھے
جو تو کہے، تو یہی ہونٹ، سرخ رس بھرے ہونٹ
ترے لہو میں شگوفے کھلا بھی سکتے ہیں

قریب آ، یہ بدن، میری زندگی کا طلسم
تری نگاہ کی چنگاریوں کا پیاسا ہے
جو تو کہے، تو یہی نرم، لہریا، آنچل
یہی نقاب، مری چٹکیوں میں اٹکی ہوئی
یہی ادا، مری انگڑائیوں سے مسکی ہوئی
یہ آبشار، ڈھلانوں سے گر بھی سکتی ہے
بس ایک شرط! یہ گوہر سطور دستاویز
ذرا کوئی یہ وثیقہ رقم کرے تو سہی
اکائیوں کے اِدھر، جتنے دائرے ہوں گے
اِدھر بھی اتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے



میکش اکبرآبادی

جنگ میں بھی اک صلح کا پہلو، صلح میں بھی اک جنگ کی آن
اِن گھاتوں کے نام ہیں کیا کیا ان باتوں کو کیا کہتے ہیں

بات ہوائی جیسے بادل، آنکھ جھپکتی جیسے بجلی
جسم مہکتا جیسے گلشن چال لچکتی جیسے لہریں

جسم پہ یوں پوشاک سجی ہے جیسے شبنم پھولوں پر
رنگ سنہری گل گالوں پر جیسے مانک کندن میں

اُس کی زلفیں جیسے ناگن بل کھائے بجلی لہرائے
اور نہ جانے کیسی ہیں وہ چھو کر کس نے دیکھی ہیں

اُس کی آنکھیں؟ اُس کی آنکھیں! کیسی ہیں کیا بتلاؤں
ٹھیرئیے مجھ کو سوچنے دیجئے اُس کی آنکھیں اُسکی آنکھیں



شاد عارفی

قدم سنبھل کے بڑھاؤ کہ روشنی کم ہے
اگر یہ بھول نہ جاؤ کہ روشنی کم ہے

گھروں کو آگ لگاؤ کہ روشنی کم ہے
یہیں سے بات بناؤ کہ روشنی کم ہے

جواب یہ کہ کوئی رہنمائے قوم ہیں آپ
اگر کسی کو بتاؤ کہ روشنی کم ہے

سحر کو شام سمجھنا جو بس کی بات نہیں
یہی سوال اُٹھاؤ کہ روشنی کم ہے

"شریکِ بزمِ سیاست" ہیں کچھ بڑے چہرے
ذرا قریب تو آؤ کہ روشنی کم ہے

صدا لگاؤ کہ "آنکھیں عجیب نعمت ہیں"
انھیں یقین دلاؤ کہ روشنی کم ہے

جھپٹ پڑیں نہ کہیں دن میں مشعلیں لے کر
عوام کو نہ سُجھاؤ کہ روشنی کم ہے

روا نہیں کہ کسی ڈوبتے ستارے کو
چراغِ راہ بناؤ کہ روشنی کم ہے

ذرا پہنچ کے تو دیکھو سوادِ منزل تک
تم اس خبر پہ نہ جاؤ کہ روشنی کم ہے

یہ شاعرانِ غلط 'ہیں' کہیں گے اک دن شادؔ
ہمیں چراغ دکھاؤ کہ روشنی کم ہے



صوفی تبسم

جن پہ ہیں تیری نظر کے سائے
اُن بہاروں پہ خزاں کیوں آئے
دُور ہیں اہلِ وفا کے مسکن
دل کی آواز کہاں تک جائے
تیری یادوں کی کڑی دیواریں
کون اس شہر سے باہر جائے
آج ہر بات سے جی گھبرایا!
آج ہر بات پہ وہ یاد آئے
کل تھی جس بات سے دل کو تسکین
آج اس بات سے جی گھبرائے
دلِ غمگیں میں امیدوں کا ہجوم
ڈوبتی شام کے لمبے سائے
کھو کے دنیا کو تجھے پایا ہے
تجھ کو کھو دے تو کوئی کیا پائے
ایسے تیور نہ بدلنا اے دوست
دیکھ کر تجھ کو نظر پچتائے
کتنی شیریں ہے ترے غم کی کسک
لب پہ آئے تو تبسم بن جائے

احسان دانش

تھی کس کو خبر اوج پہ قسمت نہ رہے گی — راتوں کو خوشی دن کو مسرت نہ رہے گی

یہ علم کہاں تھا مرے پندارِ جنوں کو — آنکھیں بھی اُٹھانے کی جسارت نہ رہے گی

پابندِ وفا عشق بھی ملتا ہے بمشکل — اس دین میں یہ شرطِ عبادت نہ رہے گی

شکوہ تو محبت کے بھروسے پہ کیا تھا — یہ کس کو خبر تھی کہ محبت نہ رہے گی

تقدیر تھی یہ عرضِ تمنا کا نتیجہ — معروضِ تمنا کی اجازت نہ رہے گی

بارِ غمِ دنیا تو میسر ہی کسے ہے — بارِ غمِ ہستی کی بھی ہمت نہ رہے گی

آجاؤ کہ آثارِ زمانہ سے ہے ظاہر — اب بھی جو ہے ملنے میں سہولت نہ رہے گی

یہ دن تھا خیالات و تصور سے بھی باہر — ہم سے تمھیں ملنے کی بھی فرصت نہ رہے گی

چل دوگے کہیں چھوڑ کے تنہا مجھے اک دن — تم سے بھی کبھی خط و کتابت نہ رہے گی

در پیش ہیں کچھ میرے جنوں کو وہ مراحل — اب تم کو نہیں ہجر مجھے فرصت نہ رہے گی

راتوں کی کمیں گہ سے وہ نکلیں گے ستارے — صبحوں کی جبیں پر یہ صباحت نہ رہے گی

دانش یہ زمانے کے [illegible]

[illegible]

...بات

...ل الرحمٰن اعظمی

جو مجھ پہ بیتی ہے

اس کی تفصیل میں کسی سے نہ کہہ سکوں گا

جو دُکھ اٹھائے ہیں

جن گناہوں کا بوجھ سینے میں لے کے پھرتا ہوں

اُن کو کہنے کا مجھ میں یارا نہیں ہے

میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں

داستاں اپنی ڈھونڈتا ہوں

جہاں جہاں سرگذشت میری ہے

ایسی سطروں کو میں مٹاتا ہوں

روشنائی سے کاٹ دیتا ہوں

مجھ کو لگتا ہے لوگ اس کو اگر پڑھیں گے

تو راہ چلتے [illegible] پوچھیں گے



ناصر کاظمی

کہاں گئے وہ سخنور جو میرِ محفل تھے
ہمارا کیا ہے بھلا ہم کہاں کے کامل تھے

بھلا ہوا کہ ہمیں یوں بھی کوئی کام نہ تھا
جو ہاتھ ٹوٹ گئے ٹوٹنے کے قابل تھے

حرام ہے جو صراحی کو منہ لگایا ہو
یہ اور بات کہ ہم بھی شریکِ محفل تھے

اب اُن سے آنکھ ملانے کو جی ترستا ہے
کبھی جو لوگ مرے رتجگوں میں شامل تھے

شناوروں کو ترے ڈوبنا ہی تھا منظور
قدم قدم پہ وگرنہ ہزار ساحل تھے



فضا ابن فیضی

د تو خیر ہیں جیون بیری خوار ہوئے معتوب ہوئے — ان سے پوچھے کوئی آخر کیوں اتنے محبوب ہوئے

یرے گیسو کی موجوں سے خوشبو خوشبو راہ گزر — تیرے عارض کے افسانے پھولوں سے منسوب ہوئے

ن وحشت کی یہ تعریفیں اپنی سمجھ سے باہر ہیں — ہم خود اپنے طالب ٹھہرے خود اپنے مطلوب ہوئے

ے زیادہ معصومی بھی وجہِ سزا بن جاتی ہے — کانٹوں سے دامن کو بچایا، پھولوں کے معتوب ہوئے

ملحتِ ایام نہ تھی، یہ مجبوری حالات کی تھی — ہم ہاتھوں میں پتھر لے کر شیشے سے مرعوب ہوئے

ب طرح کی شہرت ٹھہری عشق میں یہ رسوائی بھی — جس کی تم نے بات نہ پوچھی اس کے چرچے خوب ہوئے

ب آتا ہے موسمِ گل تو اس کی خبر لے آتا ہے — گویا ہنستے پھول چمن کے سب اس کے مکتوب ہوئے

ہی ہے اک رسمِ زمانہ، کیسی ہار اور کیسی جیت — طوفاں کا رخ پھیرنے والے تنکوں سے مغلوب ہوئے

ے نہ جانے عشق میں کیسے دکھ کا رونا روتے ہیں — وہ غم کتنے شیریں نکلے جو تجھ سے منسوب ہوئے

ب جو کچھ ہو، موسمِ گل کے پہلے یہ تیور تو نہ تھے — کتنے نازک غنچے اپنی شاخوں پر مصلوب ہوئے

ر دانش و فن کی پونجی ماٹے ماٹے پھرتے ہیں — ہم فنکار کہاں بن بیٹھے، کیوں نہ کوئی مجذوب ہوئے

تیری راہ نگر سے ہٹ کر چلنا اب مشکل ہے فضا
تو نے جو اسلوب نکالے وہ سب کے اسلوب ہوئے



جمیل ملک

زیرِ زمیں ملا، نہ تہہِ آسماں ملا
ہم جس پہ مر مٹے ہیں وہ پیکر کہاں ملا

تم ڈھونڈنے چلے ہو کسے چاند رات میں
اب چاند کو بھی منزلِ شب کا نشاں ملا

ہر اک سے پوچھتا ہوں سرِ رہگزارِ شوق
کیا تم کو راستے میں کوئی ہم زباں ملا

جب زندگی پہ ختم ہوئی شامِ زندگی
وہ مہرباں ملا بھی ہمیں تو کہاں ملا!

پھر اُس کے بعد دل پہ جو گزری گزر گئی
اک شخص زندگی میں ہمیں ناگہاں ملا

ہم آئینہ بھی جس کے مقابل نہ لائے تھے
وہ جب ملا تو ہم سے بہت بدگماں ملا

مرنے کا مرحلہ ہو کہ جینے کی قید ہو
جو کچھ جمیلؔ غمِ جاوداں ملا



شاعر لکھنوی

پیار کی خوشبو پھیل گئی تو ہوتی ہے رسوائی بھی
محفل سے گھبرانے والے مہکے گی تنہائی بھی

جن آنکھوں کو خشک سمجھ کر تم نے نظر انداز کیا
اُن آنکھوں میں ڈوب گئی ہے دریا کی گہرائی بھی

آئی تھی کیا کیا ارماں لے کر، مل نہ سکی دیوانے سے
خالی در پہ دستک دے کر لوٹ گئی تنہائی بھی

عشق کی راہ میں چلنے والے اپنے کو تنہا نہ سمجھ
شہرت بن کر ساتھ چلے گی صدیوں کی رسوائی بھی

کس گل کو سینے سے لگائیں کس گل کا دیدار کریں
راہِ بہاراں تکتے تکتے خون ہوئی بینائی بھی

زعم تھا کتنا حسنِ بیاں پر اُن سے مگر کچھ کہہ نہ سکے
اپنی طلب کی آگ میں جل کر خاک ہوئی گویائی بھی

شاعر لکھنوی

اک اک پل، اک ایک برس ہے، دیکھے اُن کے جانے سے
ہم لمحوں کو ناپ رہے ہیں صدیوں کے پیمانے سے

الجھے الجھے، کھوئے کھوئے، بیگانے بیگانے سے
پاس کھڑے ہیں، وہ سوچ رہے ہیں، کیا پوچھیں دیوانے سے

رخ پہ پسینہ، تیز تنفس، نادم سا احساسِ وفا
ہم پر کیا کچھ بیت گئی ہے، ایک ترے شرمانے سے

دل ہے جیسے کھویا کھویا، آنکھیں جیسے خواب میں ہیں
کتنی دوری بڑھ جاتی ہے اُس کے قریب آ جانے سے

کارِ جنوں پہ رسوائی کی تہمت رکھنا سہل نہیں
جرأت ہو تو آنکھ ملا کر بات کرو دیوانے سے

دل میں جو تھی اک بوند لہو کی اشکوں میں تبدیل ہوئی
آج حقیقت بھیس بدل کر گزری ہے افسانے سے

پھول بھی نم دیدہ ہیں شاعر، کلیوں کی بھی آنکھ ہے نم
گلشن پر کیا اوس پڑی ہے موسمِ گل کے آنے سے



مظہر امام

اپنے رستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں
[illegible] آیا ہوں

تشنگی حد سے سوا تو نہ تھی مے خواروں کی
جانے کیوں جام اٹھاتے ہوئے تھرایا ہوں

کام آئی ہے وہی زلف، جو میری نہ ہوئی
وقت کی دھوپ میں جب وقت میں کملایا ہوں

خیریت پوچھنے والے ہیں بہت سنجیدہ
جرم اتنا ہے کہ اُس شوخ کا ہمسایہ ہوں

صبح ہو جائے تو اُس پھول کو دیکھوں کہ جسے
میں شبستانِ بہاراں سے اُٹھا لایا ہوں

عصرِ نو! مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

نکہتِ آسودہ

شاذ تمکنت

لمس کی آنچ سے ہر پور میں مہکار سی ہے
گردشِ خوں ہے کہ شریانوں میں جھنکار سی ہے

آنکھیں جھکتی ہیں بہ اندازِ حجابِ دوشیں
شب کے پارے ہوئے کاجل کی چمک مدھم ہے
سخن زیرِ لب و قوسِ تبسم موہوم
احتیاط اتنی کہ کنگن کی کھنک مدھم ہے
چمپئی چھوٹ سی چھنتی ہوئی گھونگھٹ کے تلے
تیز ہے شعلۂ رخ ، دل کی کسک مدھم ہے
گل کترتی ہوئی انگڑائی کی محراب دو نیم
شاخِ ہر عضو کے غنچوں کی چٹک مدھم ہے

کون جاگا ہے دمِ صبح سرِ بالشِ ناز
زلفِ پُرپیچ و لباسِ شکن آلودہ لیے
موجِ انفاس میں اک نکہتِ آسودہ لیے

فارغ بخاری

...شت

...سال پکارا ہے تجھے
...نے کئی گوشوں سے
...آواز کا جادو لیکن
...بے رحم سماعت پہ کبھی چل نہ سکا
...بستا رہا
...ن غمزدہ آواز کی گونج

ہمہ اوست

سحر سے لہر اٹھی
شوخ، نشیلی، چنچل
لہر اٹھی — تڑپی، اڑی
اڑ کے بنی — سطح فلک پر بادل

جھانک کر غرفۂ گردوں سے زمیں کو دیکھا
اپنی ہم جنسوں سے جب آنکھ ملی
شرم سے ہوگئی پانی پانی

ناخلف

پیڑ کا خون پی کے شاخیں
پھیلتی بڑھتی رہیں
پھولتی پھلتی رہیں
رفعتوں کے بام کو چھوتی رہیں
بارور ہو کر بیا
سارے جہاں کو فیض یاب
لیکن اپنے پیڑ سے ہیں بے نیاز

نفرت

فارغ بخاری

یہ مسجد یہ مندر یہ دیر و حرم
ہمیشہ ہمیشہ نمایاں رہے جن کی چتون کے خم
یہ اندھی محبت کی قربان گاہیں
حسیں زندگی کی حرارت نگلتی ہوئی سرد راہیں
مکمل کفر و ایماں کی یہ منڈیاں
وفا و محبت کا نیلام اکثر رہا ہے جہاں
اور ان میں یہ پھیلی ہوئی دور تک
ایک کالی سڑک
خلوص آزماؤں کو بہکا رہی ہے
افق تا افق پھیلتی جا رہی ہے
مٹے کے جو اس نور کی بے پناہی
سے بھی چھٹ نہ پائی یہ غازۂ سیاہی
ہزاروں طرحدار ابھرتے رہے دہر کا خونِ ناحق
بھی ہو یا نہ سیلِ تباہی
ہمیشہ اسی طور قائم رہا
اس کا سرمایۂ گمرہی
اور اب تو ازل سے ابد تک
یہ کالی سڑک
دلوں کے بیاباں میں پھیلی ہوئی دور تک
بھیانک سموم کا سمندر بنی ہے

گناہوں کی ندی

شاد امرتسری

آبنوسی رنگ تیکھے خال و خط
جسم کے اندر کہیں پوشیدہ روحِ بے سکوں
روح اسے پیتی ہوئی آلودگی
آبنوسی رنگ اب تک یاد ہے

سنگِ اسود کی چٹانوں کے قریں
ریشم و اطلس کی ڈھلوانوں کے خم کے وسط میں
مخملیں کیفیتوں کی لہلہاتی جوئے بار
تیز اور بدمست آنکھوں میں گنہ کی چاشنی
جیسے کوئی دیوداسی خواہشوں کی راہ میں
دیوتاؤں کے بھجن کو تیاگ کر
مندروں کے پروہتوں سے بھاگ کر
اک منش کے جسم کی چاہت کرے کرتی رہے
اور گناہوں کی ندی بہتی رہے .....

آبنوسی رنگ اب تک یاد ہے



شکیب جلالی

جلتے صحراؤں میں پھیلا ہوتا — کاش میں پیڑوں کا سایا ہوتا

تو جو اس راہ سے گزرا ہوتا — تیرا ملبوس بھی کالا ہوتا

میں گھٹا ہوں نہ پون ہوں نہ چراغ — ہمنشیں میرا کوئی کیا ہوتا

زخمِ عریاں تو نہ دیکھے گا کوئی — میں نے کچھ بھیس ہی بدلا ہوتا

کیوں سفینے میں چھپاتا دریا — گر مجھے پار اترنا ہوتا

بن میں بھی ساتھ گئے ہیں سائے — میں کسی جا تو اکیلا ہوتا

مجھ سے شفاف ہے سینہ کس کا — چاند اس جھیل میں اترا ہوتا

اور بھی ٹوٹ کے آتی تری یاد — میں جو کچھ دن تجھے بھولا ہوتا

راکھ کر دیتے جلا کر شعلے — یہ دھواں دل میں نہ پھیلا ہوتا

کچھ تو آتا مری باتوں کا جواب — یہ کنواں اور جو گہرا ہوتا

نہ بکھرتا جو فضا میں نغمہ — سینۂ نے میں تڑپتا ہوتا

تھی مقدر میں خزاں ہی تو شکیب
میں کسی دشت میں مہکا ہوتا

پاداش

شکیب جلالی

کبھی اس سبک رَو ندی کے کنارے گئے ہی نہیں ہو
تمھیں کیا خبر ہے
وہاں ان گنت کھردرے پتھروں کو
سجل پانیوں نے
ملائم رسیلے، مدھر گیت گا کر
امٹ چکنی گولائیوں کو ادا سونپ دی ہے

وہ پتھر نہیں تھا
جسے تم نے بے ڈول، اَن گھڑ سمجھ کر
پرانی چٹانوں سے ٹکرا کے توڑا
اب اس کے سلگتے تراشے
اگر پاؤں میں چبھ گئے ہیں
تو کیوں چیختے ہو؟!



شفقت کاظمی

شکوہ تو کوئی تیرے جہاں سے نہ تھا مجھے
یہ اور بات ہے کہ نہ راس آسکا مجھے

اس طرح میں کسی کی جفا سے ہوں مطمئن
جیسے نہ ہو کسی کی شکایت روا مجھے

قسمت سے وہ نگاہ بھی تیور بدل گئی
لے دے کے جس نگاہ کا تھا آسرا مجھے

منزل پہ آگیا ہوں مگر کچھ نہ پوچھیے
کن سخت مرحلوں سے گذرنا پڑا مجھے

آباد کس دیار میں ہیں اب خبر نہیں
یارانِ رفتہ دے نہ گئے کچھ پتا مجھے

شفقت پھر اُس دیار کی جانب چلا ہوں میں
آئی تھی جس کی خاک سے بوئے وفا مجھے



بشیر بدر

کتابِ دل دکانوں پر بکے گی
زمانے کی نظر تجھ پر پڑے گی

بتاؤ کون ہے جو روک لے گا
محبت جب ہمیں آواز دے گی

ہمارے پاؤں تھک جائیں گے لیکن
گلی تیری سدا چلتی رہے گی

جگاتا ہے مجھے یہ وہم شب بھر
یہ دنیا اب نہ سو کر اٹھ سکے گی

ذرا ٹھہرے ہوئے پانی میں دیکھو
کوئی تصویر ہے جو بول دے گی

شبِ تاریک کے کاندھے سلامت
ستاروں کی یونہی ڈولی اٹھے گی

بنیں بوڑھے مہ و ماہ لیکن
یہ مٹی، مٹی میں آخر ملے گی

یہی ہے دل کی بستی کا طریقہ
ابھی سوئی، ابھی پھر جاگ اٹھے گی

کہیں جاؤں، زمیں کہ آسماں ہو
یہ تنہائی مرا پیچھا کرے گی

نہ جانے دل پہ کس کی بد دعا ہے
یہ بستی ہر برس اجڑا کرے گی



رفعت سلطان

بہار آئی ہے اُس شوخ گلبدن کی طرح
مہک اُٹھا ہے چمن جس کے پیرہن کی طرح

ہمیں بھی ہے کسی شیریں ادا سے عشق مگر
ہمیں پسند نہیں موت کوہکن کی طرح

اُسی نے کی ہے عطا دلکشی زمانے کو
وہ اک نظر کہ ہے تاروں کے بانکپن کی طرح

طلوعِ صبح کی مانند یہ حقیقت ہے
کہ لازوال ہے وہ حسن میرے فن کی طرح

نہ پوچھ مجھ سے کہ میں کیوں ہنسا زمانہ میں
اُلجھ گیا ہوں تری زلف پُرشکن کی طرح

ہزار بار سرِ شامِ دشتِ غربت میں
وہ یاد آئے ہیں بے ساختہ وطن کی طرح

نہ بے رُخی سے مجھے اس طرح مخاطب کر
کہ میرا دل بھی ہے نازک ترے بدن کی طرح

ہوائے دہر سے بکھرا ہے مثلِ برگِ خزاں
وہ چہرہ جو کبھی شاداب تھا چمن کی طرح

کہیں سے تم نے وہ آواز کیف بار کہ دل
خموش ہے کسی ویران انجمن کی طرح

خلوصِ اہلِ وطن کو یہ کیا ہوا کہ مجھے
وطن بھی اب نظر آتا نہیں وطن کی طرح

وہ جس کا اسمِ گرامی بھی ہم نہ پوچھ سکے
چلا گیا ہے کہیں بوئے یاسمن کی طرح

اُسے نہ چاند کہوں میں تو کیا کہوں رفعتؔ
اُتر گیا ہے مرے دل میں جو کرن کی طرح

وقت کا دھارا

صدیق کلیم

روشنی تیز کرو
درد کی لے تیز کرو
کس کے ہاتھوں میں ہے تقدیر کا ساز؟

آؤ گاؤ کوئی نغمہ
کہ اب اظہار کا وقت آیا ہے
جل اٹھے ساز کے تار
پھر کوئی رقص کرو
صبح جب خواب سے اٹھو تو ہنسی رخ پہ نمایاں ہو جائے

صبح جب دھوپ کی چھاؤں میں چلو
کبھی اس جسم سے لپٹی ہوئی زنجیر
کبھی افکار کی بوجھل حرکت
آپ ہی آپ سبک ہو جائے

صبح کی پہلی کرن دوست ہے
کس لیے وقت کی مقدار کو کم کرتے ہو؟
وقت کو دھیان کی لہروں میں بہہ جانے دو
آج پھر وقت کی تمییز کو مٹ جانے دو

شہر میں اجنبی

صدیق کلیم

ترا سواگت نہیں کریں گے
جو سارے احباب مل کے بیٹھیں
وہ دل لگی سی ۔ وہ قہقہے سے
جو موجۂ مے میں سرخ لہریں بنیں گے یکسر
تجھے وہ لیکن بتا تو دیں گے
ترا سواگت نہیں کریں گے

جو فرق ہو ان میں ہم میں کہہ دیں گے
وہ دولت بام ہی جب سے شامل ہوا ہوں میں بھی
لہو کی رنگت مہک کا ساماں بنی ہوئی ہے
سفید چاندی حسین لہروں میں گھل رہی ہے
بہار کا یہ سماں ہے گویا!
یہ ساری چیزیں ہیں اُن کا تحفہ — گراں بہا ہیں!!
یہ تیرے منہ میں زباں، ترے ہاتھ میں قلم ہے
تجھے وہ لیکن بتا تو دیں گے
ترا سواگت نہیں کریں گے

یہ کیسی باتیں سنا رہا ہے؟
یہ بیتے دن کے سرور میں ہیں
یہ چڑھتے دن کا مزاج پرکھیں
کہ تجھ کو جانیں کہ خود کو جانیں
یہ ساز کیا ہے؟ ارے او مورکھ! جیا...
الگ الگ ہے سبھی کی دنیا۔
یہ دائروں کی طرح ہے اُن کا بس ایک مرکز
جہاں سے چل کر
سمندروں کی طرح بڑھی ہیں ۔ عجیب صورت

ترا جہاں بھی ہے ایک محفل
فقط ہو ہے تری رگوں کا
تجھے وہ لیکن بتا تو دیں گے
ترا سواگت نہیں کریں گے



اختر ہوشیارپوری

دولتِ قرار آئے نکہتِ نگار آئے
آنا ہے تو یوں اب کے موسمِ بہار آئے

زندگی کے صحرا میں گونجتا تھا سناٹا
کیسی کیسی منزل تھی ہم جہاں پکار آئے

پھول کھلتے جاتے ہیں کانٹے چھتے جاتے ہیں
کیا خبر کسے اب کے وقت سازگار آئے

مینہ کے بعد دھرتی کی کیا بھڑاس نکلی ہے
کاش میری بستی میں ابر بار بار آئے

کارواں میں گُل بھی ہیں گرد بھی ہے کنکر بھی
دیکھیے کہ منزل سے کون کامگار آئے

باغ کے ہوا خواہو جنگلوں میں آ بیٹھو
شاید اس طرف سے ہی دولتِ بہار آئے

کھڑکیاں کھُلی رکھیے شب کو جاگتے رہیے
جانے کب ہواؤں سے لُٹنے زلفِ یار آئے

آندھیوں سے دروازے ساری رات بجتے ہیں
کوئی چارہ ساز آئے کوئی غمگسار آئے

یہ ہے بات اور اختر کوئی بھی نہ کچھ بولے
ورنہ اُن کی محفل سے سب ہی شرمسار آئے



انوار انجم

جہان بھر سے نہ یوں میرا تذکرہ کیجے
میں دل کا راز ہوں دل سے مرا گلہ کیجے

یہ کیا یقیں کہ سمجھے گا ہر اشارہ وہ
لبوں کا قرض نگاہوں سے کیوں ادا کیجے

نصیب میں جو کبھی صبح کا اجالا ہوا
تو مل ہی جائے گا ہر رات کیا دعا کیجے

خلوص کو بھی یہاں مصلحت کہیں گے لوگ
بھلا یہی ہے کسی سے نہ جو بھلا کیجے

در ہوس پہ ہے ہر لحظہ اک نئی دستک
جو خود سے چھپتے نہ پھریے تو اور کیا کیجے

یہ جی میں ہے کہ ترا بت تراش کر پہروں
ترے حضور کھڑے عرض مدعا کیجے

تمہارے حال سے ہم بے خبر نہیں انجم
پر اب بتاؤ کہ کیا رنج کے سوا کیجے

شاعرِ ابہام سے

آغا صادق

اے شاعرِ ابہام یہ ہے طرزِ ادا کیا
لائے گا ترا شعر، تاثر کی فضا کیا

ہر بات جب اسرار کے پردوں میں چھپی ہو
حاصل ہو بموہوم سی جدت کے سوا کیا

تبلیغِ حقائق کا ذریعہ ہے تکلم
ہو خونِ حقائق تو تکلم کی ادا کیا

تقریر کے وہ نکتے جو خموشی سے ملے ہیں
اظہار سے انسان ہو پھر عقدہ برا کیا

یہ جنبشِ لب بھی تو عجب جنبشِ لب ہے
معلوم کسی کو نہ ہوا تو نے کہا کیا

مسرور مخاطب کہ کہی بات انوکھی
حیران مخاطب کہ مگر اس نے کہا کیا

جب ہو گیا کہنا بھی نہ کہنے کے برابر
کہیے کہ اس انداز میں کہنے کا مزا کیا

جب نطق خموشی کی طرح مہر بلب ہو
پھر نطق کو سمجھے کوئی انعامِ خدا کیا

یہ شعر ہے یا لغز، سخن ہے کہ معما
سمجھیں نہ اگر، قاری و سامع کی خطا کیا

الفاظ میں ہوتا ہے معانی کا ذخیرہ
معنی نہ رہے ان میں تو پھر ان میں رہا کیا

مانا کہ اشارات میں بھی لطفِ سخن ہے
جب حد سے بڑھے رمز تو پھر لطفِ ادا کیا

جب شعر کا مطلب رہے شاعر کے شکم میں
ارشاد ہو ارشاد سے محفل کو ملا کیا

کیا شمع کہ جو بن نہ سکے کرنِ محفل
جو راہ نہ دکھلائے وہ نقشِ کفِ پا کیا

لب پر کبھی آئیں تو دلوں میں بھی اتر جائیں
سینے میں رہے گھٹ کے تو وہ آہ رسا کیا

غالب کی طرح خوش ہے کہ سمجھے نہ کوئی بات
منظور ہوئی تجھ کو سماعت پہ جفا کیا

مقصودِ سخن یہ ہے کہ دل تک ہو رسائی
پہنچے نہ دلوں تک وہ صدا کیا وہ نوا کیا



ضمیر اظہر

کوئی چارہ گر جو ملتا دل و جاں لہو نہ کرتے
کبھی درد بھول جاتے کبھی ہاؤ ہو نہ کرتے

گریبانِ چاک ہی ہے ہم وحشیوں کا درماں
ہمیں گر خبر یہ ہوتی گریباں رفو نہ کرتے

غمِ زندگی سے بڑھ کر غمِ آرزو نے مارا
غمِ آرزو نہ ہوتا تو غمِ نمو نہ کرتے

تری بے رخی سے اکثر یہ خیال دل میں گزرا
تری آرزو نہ ہوتی، تری آرزو نہ کرتے

ہمیں یاد تھے کسی کے کوئی یار تھا نہ اپنا
رہ و رسم ہم سے کیسے بھلا پھر عدو نہ کرتے

کھلا کاوشِ طلب سے یہی راز ہم پہ ظاہر
کوئی جستجو نہ ہوتی، کوئی جستجو نہ کرتے



کسریٰ منہاس

خاک ہونا ولیِ ہستی ہے — کس بلندی پر اپنی پستی ہے

کاوشِ عشق دل کی ہستی ہے — جان دے کر ملے تو سستی ہے

میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے — زندگی موت کو ترستی ہے

کوئی سمجھا نہ آج تک یہ راز — ہر نفس اک فریبِ ہستی ہے

پھر بھی ساحل پہ جا کے دم لیں گے — گو تلاطم میں بحرِ ہستی ہے

یاد آتا ہے کوئی مستِ شباب — جب گھٹا جھوم کر برستی ہے

ہوش آیا تو ہم بھی دیکھیں گے — ان کی آنکھوں میں کتنی مستی ہے

کوچۂ عشق میں یہ راز کھلا — زندگی کیا ہے؟ غم پرستی ہے

حسن مغرور، عشق محوِ نیاز — اک بلندی ہے ایک پستی ہے

شعر کہتا ہے ہر کس و ناکس — ہائے یہ جنس کتنی سستی ہے

جس کو کہتے ہیں زندگی کسریٰ!
رنج و غم کی وہ ایک بستی ہے



رضا زیدی

پھیکا ہے کائنات کا ہر نقشِ رنگ و بو
تم کس قدر حسین ہو تم کتنے خوب رُو

با وصفِ پاسداریِ خاطر نہ کچھ ملا
رسوا ہے اس دیار میں چاہت کی آبرو

اس پیکرِ حسین کی شعاعیں تھیں الاماں!
ہم اس کو دیکھ بھی نہ سکے اس کے رو برو

گو ہم کبھی یقیں کی حدوں تک نہ جا سکے
لیکن تمام عمر رہی تیری جستجو!

حسن ایک معجزہ ہے، مگر دیرپا نہیں
ادراکِ عشق میں ہے بڑی قوتِ نمو

یہ وحشتِ جنوں ہے کہ تہذیبِ عشق ہے
اٹھی جدھر نگاہ نظر آیا ہے تو ہی تو

میں کس طرح بدل کے چلوں جادۂ وفا
تم مقصدِ حیات ہو تم جانِ آرزو

دیکھی ہے ہم نے چہرۂ مہتاب میں رضاؔ
اپنے تخیلات کی تصویر ہو بہو

حُسنِ گریزاں

شاعر ندیم

کہنا بھی جو چاہوں تو نہ کہہ پاؤں کہ کیا ہے
وہ حسنِ گریزاں کہ بہت ہوش رُبا ہے

ہنگامِ حیا ہاتھوں سے آنکھوں کو چھپانا
کچھ شوخی سی ہے شوخی ادا سی کچھ ادا ہے

اس ڈر سے پکڑ لینا ڈھلکتا ہوا آنچل
اُبھرے نہ کہیں راز جو سینے میں چھپا ہے

بیٹھی ہو اگر سامنے اُٹھنے میں تکلف
اُٹھ جائے اگر بیٹھنا پھر مرحلہ سا ہے

دو گام بھی چلتی ہے تو بہکی سی روش سے
شاید مری نظروں ہی سے وہ لغزشِ پا ہے

ٹوٹے ہوئے لفظوں میں لبوں پر ہے شکایت
نظروں کا مری اس کو بھی احساس رہا ہے

اقرار میں پوشیدہ ہیں انکار کے انداز
انکار میں اقرار کا پہلو بھی چھپا ہے

میرے لیے ہنگامے ہیں اُس دل میں بھی روشن
وہ لاکھ چھپائے مجھے اس کا بھی پتا ہے

وابستہ خوشی سے مری ہے اُس کی خوشی بھی
میں روٹھ گیا ہوں تو اُسے دکھ بھی ہوا ہے

اُٹھنے جو لگوں میں تو ہیں رکنے کے تقاضے
رخصت پہ اُن آنکھوں نے مرا پیچھا کیا ہے

وہ میری نگاہوں سے کہیں پردہ نہ کر لے
ڈرتا ہوں یہ کہتے ہوئے تو میری خدا ہے



شمیم حنفی

ہم ہیں پریت نگر کے باسی ہم سے رسمِ وفا نکلی
ایک ہمارے دم سے یارو دنیا کی دنیا نکلی

ہم کو گماں تھا چاند کے پیالے میں ہوگی صہبائے خلوص
پی جو چکے تو اپنے منہ سے پھوٹے جور و جفا نکلی

دنیا والو اوپر دیکھو عرش تلک آ پہنچے ہم
ایک کرن سوزِ الفت کی اپنی راہ نما نکلی

قرب میں دوری کا عالم تھا ہم کس درجہ پریشاں تھے
جس کو ہم دیوار سمجھتے تھے وہ تیری حیا نکلی

اے دل روپ نگر کی گلیوں میں کیا سناٹا ہے
کل جو بستی صحنِ چمن تھی آج اک ویرانہ نکلی

رات نے اپنے بال سمیٹے سورج نے انگڑائی لی
ننھی ننھی کلیوں کا دل خوش کرنے کو صبا نکلی

دونوں عالم تجھ پہ قرباں جذبۂ دل واں آ جذبۂ دل
دل نے اس کو یاد کیا ہی تھا کہ وہ پگلی آ نکلی

ہم نے وفا کے راگ الاپے کوئی نہ اس سے مست ہوا
اپنی صدا بھی اس بستی میں آوازِ صحرا نکلی

اے غمِ جاناں اے غمِ جاناں تجھ سے بچ کے کدھر جائیے
دنیا بھی اپنی نظروں میں تیری ایک ادا نکلی

لب ذرا سی جنبش سب پر چونک اٹھی ساری دنیا
ہونٹوں تک جو بات نہ آئی جانے کیا سے کیا نکلی

کاسۂ چاند کا لے کر فطرت مانگ رہی حسن کی بھیک
وہ بھولی بھالی سی لڑکی بھی دل کی دریا نکلی



ظہیر صدیقی

شورشِ دہر سے ہے ارض و سما کی قیمت
خندۂ گل سے ہے جس طرح صبا کی قیمت

وہ تو ہم ہی تھے کہ جس نے اسے برتر سمجھا
ورنہ کیا ہوتی خدا جانے خدا کی قیمت

اس کے رگ رگ میں مچلتے ہیں ہزاروں شعلے
ورنہ پھر کیا ہے اس اک برگِ حنا کی قیمت

خون باقی ہے ابھی قلب و جگر میں میرے
دے تو سکتا ہوں ترے ناز و ادا کی قیمت

دل کا ہر قطرۂ خوں وقف تری مژگاں کو
میں تو ہوں مشتاقِ جفا، دوں گا جفا کی قیمت

چاکِ دامانی و رسوائی و تشنہ کامی!
اور کیا چاہیے اب اپنی وفا کی قیمت

رشکِ فرزانہ ہے یہ حال پریشاں ہوں میں
دے سکا کون مری چاکِ قبا کی قیمت

اے ظہیرؔ! آج طلب میری ہوئی مقتل میں
ہاں ملی آج مری آہِ رسا کی قیمت



حزیں لدھیانوی

وقت ایسا اے حزیں کبھی ہم پہ پڑا نہ تھا
سب آشنا تھے، پھر بھی کوئی آشنا نہ تھا

بارِ الم سے اپنے ہی زانو پہ جھک گیا
جو سر کبھی کسی کے بھی آگے جھکا نہ تھا

وہ جس کو حادثات کی صرصر بجھا گئی
دیر و حرم کی شمع تھی دل کا دیا نہ تھا

ہم ہی نے جاگ جاگ کے کاٹی شبِ حیات
ہر شخص کے نصیب میں یہ رتجگا نہ تھا

جینے کو جی لیے مگر اس بے کسی کے ساتھ
جیسے بھرے جہاں میں ہمارا خدا نہ تھا

میں گلشنِ حیات میں نغمہ سرا رہا
گو بجلیوں کی زد میں مرا آشیانہ تھا

رسوائیوں کی آگ میں جلتے نہ کس طرح
دن کو بھی تیرے درد کا سورج چھپا نہ تھا

گونجے گی اب صدائے شکستِ قفس ضرور
قیدِ قفس، قفس کا فقط آب و دانہ تھا

میری نگاہ اُٹھی تو پاتال تک گئی
ہر ذرہ اے حزیں مجھے آئینہ خانہ تھا



شارق میرٹھی

ان کو جب دیکھا ہوا اپنا یہ حال
جیسے دل سے مٹ گیا ہر اک ملال

تبصرے کرتی رہی دنیا مگر
کس نے جانا کون سمجھا دل کا حال

پھر بھی دنیا ہے خراب آرزو
جانتی ہے آرزوؤں کا مآل

ہر نظر اس کی اٹھی کہتی ہوئی
دیکھنے والے ذرا خود کو سنبھال

یوں کہیں ہر ایک کو ملتا ہے یہ
مل گیا جس کو ملا اس کا ملال

آہ شارقؔ حال اس دل کا نہ پوچھ
ماورائے حال ہے اب اس کا حال

سوئمبر

شاہد شیدائی

جب مجھے کوئی جواں جسم نظر آتا ہے
میری ہر سانس تری یاد میں ڈھل جاتی ہے
لمحہ بھر کے لیے رک جاتی ہے نبضِ ہجراں
لمحہ بھر کے لیے تُو پاس چلی آتی ہے!

اس کے ماتھے میں دمکتا ہوا سورج ایسے
تیری بھولی ہوئی صورت کا پتہ دیتا ہے
جیسے عاشق کو جدائی میں چمکتا ہوا چاند
اپنے محبوب کی تصویر دکھا دیتا ہے!

اور جب سرخیِ عارض کے شرارے بکھیر
میرے جذبات میں یوں آگ لگا دیتے ہیں
جیسے اخبار کی جلتی ہوئی سرخی کے حروف
آتشِ وقت کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

ہم گئے تھے جو کبھی - آج وہ غم پھر چھلکے
مل گئی سرد تمنا کو حرارت، پھر سے!
اور مئے زیست کی تلخی میں گھڑی بھر کیلئے
گھل گئی شہد سے ہونٹوں کی حلاوت، پھر سے!

آج پھر ایک حسینہ کے لبِ خنداں نے
مونا لیزا کے تبسم کو بھی شرمایا ہے
سیلِ خواہش پہ دکھا کے مجھے پھر آس کی جب
چند روز اور مجھے جینے پہ [illegible]

یوں مرا ذہن ترے جسم کی موجوں میں گھرا
جیسے طوفان کی زد میں ہو سمندر کوئی!
اور گردابِ حوادث سے اچانک بچ کر
میری خوش بختی نے جیتا ہو سوئمبر کوئی



نجیب اسلم

ادھر کچھ اُجالے، اُدھر چند سائے
کوئی سوچتا ہے کہاں بیٹھ جائے

وہ انسان ہے یا کہ رستے کا پتھر
جسے، جو بھی گزرے وہ ٹھوکر لگائے

جنھیں خونِ دل دے کے سینچا تھا میں نے
وہی پھول میری نظر تک نہ آئے

غمِ زیست کی تند آندھی میں کوئی
کہاں تک چراغِ تمنا جلائے

سرِ شام کس موڑ پر آگیا ہوں
جہاں سب نظر آرہے ہیں پرائے

درِ دل پہ پھر دستکیں دے رہی ہے
کوئی یاد دامن میں آنسو چھپائے

سرِ منزلِ آرزو تیرگی ہے
کسی سے کہو، دل کی شمع جلائے

مجھے رہِ دل سے مٹا دینے والے
تجھے بھی اگر کوئی دل سے مٹائے؟

نجیب اس مسافر کی حالت نہ پوچھو
جسے، چاندنی بھی نہ رستہ دکھائے



مظفر حنفی

چونکہ میں "منجملۂ ساماں میخانہ" نہیں
اس لیے پہچان کر بھی اُس نے پہچانا نہیں

آدمی "اونچی اڑانیں" لے رہا ہے آج کل
آدمیت ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں

مسکرا کر جب شگوفوں نے کہی "خوش آمدید"
ہاتھ پھولوں نے ہلائے "اس طرف آنا نہیں"

بدظنی پھیلا رہا ہے میرے اس کے دل کا چور
میں بھی دیوانہ نہیں ہوں وہ بھی دیوانہ نہیں

بزم میں "پروانہ ہائے راہداری" شرط ہیں
شمع اس غم میں سلگتی ہے کہ پروانہ نہیں

مجھ کو یہ اصرار "پھولوں کی جھلک" دکھلائیے
آپ کو یہ ضد کہ "گلشن ہے یہ ویرانہ نہیں"

اے مظفرؔ طنزیہ غزلوں کے دشمن ہیں بہت
اور میرا رشمیں غزلوں سے یارانہ نہیں!

سندباد جہازی کا سفرِ آخرت

(صوتی تمثیل)

ابو سعید قریشی

(ملاحوں کا نغمہ اور سمندر کا شور آہستہ آہستہ ابھریں
اور پھر عقب میں چلے جائیں)

سندباد: یہ کیسا نغمہ ہے؟
کیسے سائے ہیں؟
یہ نغمے؟

(ہوا کا شور)

یہ بادبانوں سے اُڑتے بادل
دریدہ دامن

(ہوا کا شور اور ساحل سے ٹکراتی لہریں)

مری رگوں میں
لہو کی لہریں
جلوسِ سینہ زناں کی مانند
گونجتی ہیں
سیہ چٹانوں پہ جیسے کشتی
ہجومِ موجِ بلا کے آگے
کرے جھکائے
سکونِ ساحل کی آرزو میں سفینہ کوئی ۔ فگار سینہ
صدائے گریہ پہ ڈولتا ہو

(طوفان اور چیخ و پکار)

یہ کیسا ہنگامۂ ہاؤ ہو ہے؟

(طوفان تھم جائے اور پھر چند ساعت کی مکمل
خاموشی کے بعد)

مری نگاہوں میں دھند کے یہ دبیز پردے
کبھی اُجالے کبھی اندھیرے کی چلمنوں پر محیط ہیں جو
یہ پگھلے سیسے یہ سرمئی سا مہیب گنبد
افق افق سمت و سُو سے عاری
نشانِ منزل کہیں نہ ساحل
نہ روزِ روشن نہ جلوۂ شب
نگارِ شمس و قمر کہیں پر —
نہ رقصِ زہرہ!
عجیب صحرائے بے کراں ہے
رمِ غزالاں کہیں نہ محمل
ہوسِ لالہ کہیں نہ شبنم
سراب ہے نے صبا و صرصر
رباطِ راہگزاں نہ صوتِ نفیرو شہنا
عجیب دریائے بیکراں ہے
فسوں زدہ
گنگ

عجب ساماں
نوید دم ازدہے نے کہیں نوائے پیامِ طوفاں
کہ یہ آوازِ کرب دریا
فغانِ غولِ ہیولیٰ برپا
صدائے صور و ہجومِ حشر آشیاں

یہ کیا ہے؟
میرے سینے پہ شور و شیون

یہ التجا میں؟

(طوفان اپنے پورے عروج پر ہے اور ناخدا کی دعا
کے دوران اس کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے)

خدا: خدائے آدم و داؤد و یونس و یعقوب
ترے اشارے سے گلزار نارِ ابراہیم
خدائے موسیٰ و ہارون حکم سے تیرے
رہ دے نیل بنی اسرائیل!
ترے ارادے سے صحرا میں چشمۂ زمزم
خدائے برتر و قدوس و ربِ اسمٰعیل
خدائے رحمتِ کونین
خدائے احمدِ مرسل
ترا نفس تنِ مردہ میں زندگی کا لہو
ترے اشارے سے شق القمر — شہادتِ حق
ترے کرم سے سفینے کئی کنارے لگے
ترا کرم ہو تو یہ کشتی جبر بھی آج
بچا کے حلقۂ گرداب سے نکل جائے

(طوفان)

سندباد: میرے اللہ
یہ موجِ جنوں خیز و فلک بوس و زمیں دوز
یہ دیدۂ گرداب
منزل ہے کہ انجام کا آغاز

(طوفان تھم جاتے)

یہ ساحلِ صد پارہ و کف زا
یہ خواب ہے یا خواب کی تعبیر

صدف!
کنارا!
قطارِ نخل و دشت و جبل
عروسِ تاک و خمار ہوائے توبہ شکن
ہجومِ وردِ گل
روحِ عطر و عہدِ شباب
رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی شادابی
فسانۂ شبِ رفتہ
فسونِ زہد گداز

(دور سے قوالی کی آواز میں —)

خیز و در کاسۂ زر آبِ طربناک انداز
پیش تر زانکہ شود کاسۂ سر خاک انداز

سندباد: ایک آواز کی لہر جانے کیا کیا خوشبوئیں
لیے آتی ہے

دلِ خوں گشتہ کے لاکھوں ارماں
مئے دیرینہ و معشوقِ جواں
طلبِ لالہ رخاں
نغمۂ ناہید گلو
لیلِ زلفِ محبوب
ہوسِ عشرتِ نایاب

لذتِ لمسِ لبِ ماہوشاں
عقدۂ بندِ قبا
گرمیٔ آغوشِ بتاں
ساقیٔ سیمیں کا فسوں
رقصِ جنوں
ناز و نیاز
نغمہ و سازِ صدائے صدفِ گوہر تاب

یہ کوئی ساحل ہے
میں کہاں ہوں
مرا سفینہ
ابھی یہاں تھا
ابھی نہیں ہے
ہر سفر کا یہی تھا حاصل
سوال یہ کہ مری نگاہوں میں زندگی پھر ابھر رہی ہے
نئے جزیرے
نئے نشیمن
نئی نئی امتحاں کی راہیں
(لہریں ابھر کر دور ہوتی جاتی ہیں)

سند باد : اے مردِ پیر کون ہے تو

پیرِ تسمہ پا : ملک التجار
میرا نام
مگر میری کہانی
اک قصۂ طولانی ہے
الف لیلہ کی طرح
بات سے بات نکل آئے
یوں
شمعوں کی لوئیں
بھڑک کر بجھ جائیں
مگر قصہ میرا ختم نہ ہو
امتحاں ایک سے ایک
حسرت و شوقِ سفر کے عنواں
بحرِ زخار
سفینے
طوفان
شہرِ بغداد کی گلیوں میں سنانے کے لیے
شاہزادی کے شبستاں کے طلسم
مگر ... میری نقاہت
میری آواز
حلق میں کانٹا ہوئی جاتی ہے
مجھ کو اس چشمے پہ لے چل میرے دوست
میرے پاؤں
سنگریزوں کی چبھن سے میرے زخمی پاؤں
مجھ میں اب چلنے کی طاقت بھی نہیں
آہ!
ایسے نہیں
جس طرح
شہرِ بغداد کے حمال
اپنے کاندھے پہ اٹھائے ہیں کوئی بوجھ
اٹھا

سند باد : شہرِ بغداد کے حمال
تو انھیں جانتا ہے

میرے قصّوں کے وہ رسیا ہیں
شریکِ محفل
وہ مجھے جانتے ہیں

پیرِ تسمہ پا : ایک محفل ہی کیا تو بھی مجھے جانتا ہے
تو کون ہے
میں کون
کیا ہے یہ کہانی

یہ سحر ہے
عقدہ ہے
طلسمات ہے
احساس ہے یا سایۂ احساس
یہ کردہ گناہوں کی سزا ہے
کہ ستم
ناکام تمناؤں کا
احساس زیاں کا
تو کون ہے
میں کون ہوں
اس چشمے کے آئینے میں پہچان
(سندباد کی چیخ پر پیرِ تسمہ پا کے قہقہے)

سندباد : اُف یہ عفریت
میرا ہی عکس نظر آتا ہے
میری ہی مسخ شدہ صورت ہے
میرے کندھوں سے اُتر
میرے سینے پہ تیرے پاؤں کی چینی
مری شہ رگ پہ ترا ہاتھ
اُف میرا سانس — میرا سانس (ہانپتا ہے)

پیرِ تسمہ پا : (قہقہہ) میں کون ہوں
تو کون ہے
لے جان گیا اب (قہقہہ)

سندباد : (ہانپتے ہوئے) شیطان! (بوڑھے کا قہقہہ)

پیرِ تسمہ پا : شیطان کہ فرشتہ ہوں کہ انسان
میں تجھ سے ہوں
تو مجھ سے ہے

نادان
غمِ ہستی کا نہیں کوئی بجز مرگ علاج

سندباد : بادۂ تاک مگر
ذلتِ زیست
ستم رانیِ احساس کا ہے یہ بھی علاج
آگہی ایک اذیت ہے مگر
مگر

زہر ہی زہر کا تریاق ہوا کرتا ہے
بے خودی بادہ انگور میں ڈھل جائے گی
میرے عفریت کو آج
سایۂ تاک نگل جائے گا

(پیتا ہے — ہنستا ہے)

پیرِ تسمہ پا : اے — تو یہ کیا پیتا ہے

سندباد : یہ بھی ایک راز ہے
سربستہ و محفوظ

پیرِ تسمہ پا : بتا

سندباد : آہ
مگر میرا گلا
میری شہ رگ پہ تیرا ہاتھ ہے

بولیں کیسے

پیرِ تسمہ پا: لے
چھوڑ دیا

اب بول
تو یہ کیا چیتا ہے

سند باد: نسخۂ عمرِ جواں
آبِ بقا
مرگِ پیری کا علاج
نسخۂ عہدِ شباب

پیرِ تسمہ پا: مرگِ پیری کا علاج
نسخۂ عہدِ شباب
راحت و عیشِ دوام

سند باد: خضر و الیکس کا سربستہ و محفوظ طلسم

پیرِ تسمہ پا: آہ یہ آتشِ سیال
میری رگ رگ میں جوانی کی اُمنگ
بادباں بن کے مجھے
کسی انجانے جزیرے میں لیے جاتی ہے

سند باد: ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
یہ گرمیٔ جذبات سے گدرائے ہوئے جسم
ہے کاشی کا مندر کہ یہ جمنا کا کنارا
ہے شامِ سراندیپ کہ یہ صبحِ بنارس
یہ لعبتِ بغداد ہے یا دخترِ بابل
رقاصۂ افلاک کی پازیب سے اُڑتے ہوئے جگنو

(رقص کی موسیقی جس میں ذیل کی غزل تحلیل ہو جائے

نسوانی آوازیں)

غزل

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
رونقِ شہرِ غزالاں ہے قریب آجاؤ
میری بانہوں میں امیدوں کے کنول کھِلتے ہیں
دعوتِ موجِ بہاراں ہے قریب آجاؤ
آرزو صاعقہ ساماں ہے قریب آجاؤ
جنتِ پہلوئے جاناں ہے قریب آجاؤ
قریب آجاؤ
قریب ـــ اور قریب

(موسیقی ڈوب کر پس منظر میں چلی جاتی ہے)

سند باد: مگر پاس آکر بھی تم دور کیوں ہو
تمھارے تنفس کی آواز
اک سرد شعلہ ہے
حدت سے عاری
جلاتے نہیں ہیں شرارے تمھارے لبوں کو
تمھیں پاس پاکر بھی آغوش خالی ہے میری
تمھارے بدن کی تمازت کہاں کھو گئی ہے
بتاؤ
بتاؤ
تمھاری گھٹاؤں سی زلفوں میں آسودگی کیوں نہیں ہے
تمھاری نگاہوں میں یہ فاصلے
دور سے دور تر کیوں چلے جا رہے ہیں
کنارے پہ ملاح کو چھوڑ کر جیسے کشتی رواں ہو

عورت: نہیں تو
تمھیں چھوڑ کر میں کہاں جا رہی ہوں
یہیں ہوں

یہیں تھی
تنفس کی سرگوشیوں کی طرح
بوئے گل کی طرح

سندباد : ان کہی جیسے کوئی
ادھوری کہانی
مگر کون ہو تم؟

عورت : تیرا خواب
تصویر
تخیل، بھٹکا ہوا کا
کرشمہ، تصور کی تخلیق
تیری تمنا کا
خواہش کی جادوگری کا ہیولیٰ

(لہریں - طوفان)

سندباد : جانے اب کونسا ساحل مری تقدیر میں ہے
کونسا تیر ابھی حلقۂ تقدیر میں ہے
جانے کس کشورِ گم گشتہ پہ لے جائے گی
مجھ کو یہ موجِ بلا
سفر کب میرا ختم بھی ہوگا کبھی

(آوازیں)

آواز۱ : یہ محل کیسا ہے
کیسا گنبد ہے
جبلا سا درونِ صحرا
نہ در، نہ دربان

م۲ : نہیں نہیں
یہ نہیں ہے گنبد
تو پھر یہ کیا ہے

م۳ : کسی حسینہ کا مقبرہ ہے
کسی کے قلبِ حزیں کی دھڑکن
میانِ دشتِ جفا
وفا کا نشان روشن

م۱ : نہیں نہیں
یہ کسی جفا جو جہاں گزیدہ کی خانقہ ہے

م۴ نہ محل ہے یہ
نہ خانقہ ہے
نہ مقبرہ ہے

م۱ : تو پھر یہ کیا ہے

م۴ : سبا کے آثار
یہ خزانہ ہے
شہرِ بلقیس اور سلیمان کا
یہ ریگ صحرا نے جس کو صدیوں سے ڈھانپ رکھا تھا
جستجو میں ہزاروں سیاح جس کی نذرِ اجل ہوئے ہیں

م۱ : ہماری قسمت چمک اٹھی ہے
تو آؤ اب اس کو مل کے ڈھائیں (ہماہمی)

سندباد : ٹھہر جاؤ
جس کو دفینہ سمجھتے ہو تم
وہ دفینہ نہیں ہے
یہ پتھر نہیں ہے
یہ چونا نہیں ہے
نہیں ہے کوئی سنگ اور خشت کی کوئی تعمیر
کہ جس پہ گماں ہو عمارت کا تم کو

م۳ : مگر کچھ تو ہے یا فقط واہمہ ہے
تمہارے فسانوں کی مانند (قہقہے)

سندباد : روایت ہے سوداگروں کی زبانی
کہ صحرا میں رخ نام
اک طائرِ دیو پیکر بھی ہوتا ہے
مجھے یوں نظر آ رہا ہے کہ
یہ بیضۂ رخ ہے
اس کو نہ چھیڑو
مبادا کوئی ابتلا ہم پہ نازل ہو اس سے

ٹ : ہشاو میاں ایسے قصے
ہزاروں سنے ہیں
حکایت تمہارے سفر کی تو صد داستاں ہے
مگر اس کو حمّال ہی مان سکتا ہے
ہم نام تیرا (قہقہہ)

سندباد : مگر جلد بازی کا انجام اچھا نہ ہوگا۔

ٹ ہشاؤ میاں
ہم تو آج اس بیضے کو حاصل کریں گے
رہے تم
سو تم
اس کے سائے میں ستاؤ
آہیں بھرو (قہقہے)
اور اگر
کوئی خطرہ ہو
(قہقہے - بیضہ رخ کو توڑنے کی کوشش - ہاہمی)

اسے یہ
یہ اندھیرا سا کیوں چھا گیا ہے
یہ بادل سے کیا ہیں
(رخ کے پروں کا شور)

سندباد : یہ رُخ ہیں بھائی۔
بچاؤ جانیں
وگرنہ آج ایک ایک ہم سے
اجل رسیدہ ہے
چند لمحوں کا مہماں ہے
(بھگدڑ - خوفزدہ - ہجوم - پرندوں کی چیخیں
- پرندوں کی سرسراہٹ جیسے آندھی)
مقدر میں میرے خرابی لکھی ہے
مجھے چھوڑ کر چل دیے میرے ساتھی
گناہوں کا ان کے نتیجہ
مجھی کو بھگتنا پڑے گا
عجب قاعدہ ہے
عجب کھیل ہے یہ سزا و جزا کا
مگر یہ پرندے
چٹانیں لیے اپنے پنجوں میں
کشتی کی جانب
کہاں جا رہے ہیں
(دور سے چیخ پکار اور سمندر میں چٹانیں گرنے کی آواز)
سفینہ ٹوٹ گیا
اور سب میرے ساتھی!
قضا و قدر کے راز آدمی کو کیا معلوم
رہائی کا اس دشتِ بے درسے امکان کیا ہے
نہیں، کچھ نہیں سوجھتا
مجھے سایۂ موت میں زندگی دینے والے
وسیلہ رہائی کا میری
سوائے تیرے

اور کوئی نہیں ہے
مگر یہ صنوبر سا کیا ہے
ستون سا

یہی تو نہیں ہے
نکلنے کا اس دشت بے در سے زینہ
خدا کے پیڑوں پہ چڑھتے ہیں طرح جیسے
اسی طور
میں بھی
چمٹ جاؤں گا پانے رُخ سے
بنے گا یہی میرا شہ پر
رہائی کا اس دشت بے در سے رستہ

آدمی حسرتِ پرواز پہ دم دیتا ہے
آج وہ طاقتِ پرواز میسر ہے مجھے
گوئے چوگان کی طرح مجھ کو نظر آتا ہے یہ کرۂ ارض
اس کے سب کوہ و کمر
دشت و جبل
بحرِ پرشور نہیں جن سے سفینوں کو مفر
کسی سائل کی ہتھیلی کی طرح
خطِ تقدیر کی مانند نظر آتے ہیں
کاخ و کو اس کے سبھی ، سوچتا ہوں
برف کے گالوں کے مانند بکھر جائیں گے
سوچتا ہوں کہ خلاؤں سے خلاؤں سے پرے
کتنی دنیائیں ابھی ابن آدم کی نگاہوں سے
تصور سے نہاں
نیلگوں گنبدِ افلاک میں پوشیدہ ہیں

کتنے پیکر ابھی اس پردۂ تصویر میں نادید
سوچتا ہوں کہ مہ و مہر کی روشن قندیل
گوشۂ منبعِ انوار کی شرمندہ ہے
کہکشاں کون سے افلاک کی ہے را
کون ہے کس کے ارادے سے ہیں
یہ ستاروں کے مدار
گردشِ شمس و قمر کون سی پرکار پہ ہے
حیرتی کس کے ہیں یہ لیل و نہار
سوچتا ہوں
کہ نہاں خانۂ ادراک کی بے راہ روی
شوقِ بے حد کا جنوں
زیست اور زیست کی دریوزہ گری
فکرِ فردا و غمِ دوش و ستم رانیٔ امر
سوچتا ہوں کہ میرے عشق کا انجام ہی
مجھ سے پہلے میرے اندیشۂ بیباک سے
میری تخلیق سے
تخریب سے پہلے کیا تھا
اس کے انکار

مری لغزشِ پا سے پہلے
آدم و حوا کی تشہیر سے رسوائی سے
شجرِ ممنوعہ تھا کیا ، سوچتا ہوں
کیا کوئی راز تھا ، سربستہ و محفوظ
جس کو وا کرنے کی پاداش میں ت
عیشِ امروز ہوا مجھ پہ حرام
یہ مری سوچ مگر
مجھ سے کہتی ہے کہ ہے

مری افتاد زباں کا ہی ایام کا راز
اک وہی راز کہ سربستہ بھی ہے عام بھی ہے
وائے بے صرفیٔ ایام و ستم رانیٔ تدبیر مری
کس خرابے میں مجھے لے گئی تقدیر مری
پیکرِ خاک تھا میں
کرۂ خاک ہوا مجھ کو نصیب
مری پرواز مگر ٹوٹ رہی ہے شاید
قعرِ دریا میں اترتی ہوئی کشتی کی طرح
... مرا ڈوب رہا ہے ہر آن
جانے وہ کون سے افلاک تھے روزن تھے
دریچے تھے مرے پیشِ نظر
کون سے خواب کی سوغات تھے
... لوٹے انجم
... واسطے
... غبار اب تو ہے تا حدِ نظر
پھر وہی دشت و جبل
... ہے یہ
سوچتا ہوں شہپرِ غیر کی پرواز کا انجام یہی ہونا تھا

... میں ہوں
... گردشِ ایام بھی ہے
پھر وہی دانہ وہی دام بھی ہے
... ب مجھے اک وادیٔ آلام میں لے آیا ہے
... نہیں جس میں گذرگاہِ خیال
جس کے غاروں میں نہاں مارِ سیاہ
جس کے سایوں میں پڑے سوتے ہیں

شعلہ فگن
اژدھے
نیشِ عقرب سے سوا جس کی چٹانوں کی چبھن
ایسی وادی کہ جسے
سحر و افسوں و طلسمات کی وادی کہیے
دیو آسا ہیں کھڑے جس کے پہاڑ
حاتم طے کے فسانوں کی فضا ہو جیسے
اک طلسمات کا عالم ہے مرے پیشِ نظر
ان گنت لعل و گہر - نیلم و یاقوت کئی
چاند کا جن پہ گماں ہو وہ زمرد کے شجر
وہ جواہر کہ اندھیروں میں اجالا ہو جائے
رقصِ طاؤس کا ہر سمت گماں ہوتا ہے
... لعلِ بدخشان ...
دُرِ ناسفتہ و نایاب ... کئی
مضطرب ہیں کہ انھیں زینتِ دستار کروں
اس نہاں خانۂ کوہسار کے اسرار
مگر مثلِ کہسار
واہمے بن کے مری راہ میں حائل ہیں
نہیں جن سے مفر
سوچتا ہوں
یہ جواہر نہیں انگارے ہیں
اک طلسمات کی دنیا کے شرارے ہیں جنھیں
کسی ساحر نے فسوں گر نے سُلا رکھا ہے
ان کے چھوتے ہی کئی مارِ سیاہ
اژدرِ خوابیدہ کئی
جاگ اٹھیں گے جلا دیں گے مجھے

یا مرے آقا کہ تجھ سے کھل جائیں گے یہ لعل و گہر
وہ جو گیا ہے ابھر وہ وہی غار کے پاس
پھر مری گھات میں شاید ہے وہی مارِ حسیں
مری رسوائی کا ساماں جو بنا
آج پھر دشمنِ دیرینہ مرا
ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا ہے اس طور
جیسے کہتا ہو

شیطان : مقدر کے دھنی

دیکھ میں تجھ کو کہاں لایا ہوں - میرے جنت کے رفیق
تجھ کو بھی یاد ہے وہ باغِ جناں
جس کے سایوں کا خمار
آج بھی تجھ کو لیے پھرتا ہے یوں خاک بسر
بحر و بر جس کے لیے
ایک کیے ہیں تو نے
تجھ کو تو یاد ہی ہوگا لیکن
باغِ جنت میں بھی یہ لعل و گہر
تو نے دیکھے تھے کبھی
سچ تو یہ ہے کہ وہاں اور بھی کیا رکھا تھا
بس شب و روز ثنا خوانی و تسبیح و درود
ایسی یکسانیِ اوقات کہ جی جل جائے
کوئی ہنگامہ نہ شورش
نہ تگا پوئے جہانِ گذراں
دردِ ہجراں نہ کہیں راحتِ وصل
کہیں طوفاں نہ کنارہ نہ امیدِ ساحل
آرزو کوئی نہ جستجو [illegible]

نسلِ انساں کا نشاں بھی کہیں پر ہوتا
ایک تو اس کے سوا
تیرا ہم جنس بھی واں کوئی نہ تھا
تھا بھی کوئی؟
وہی بے عزم ملائکہ
وہی بے جاں حوریں
ان سے بنتی بھی تو کیسے بنتی

خیر — اس ذکر کو اب جانے دو
آج ان ساکن و بے کیف فضاؤں کی جگہ
ایک دنیا ہے تری تجربہ گاہ
آج تدبیر تری تابعِ تقدیر نہیں
کسی مشّاق صنم گر کی طرح
خود ترا ہاتھ ہے خلّاق ترا
ایک ہی پل میں ہزاروں پیکر
منتظر ہیں تری صنّاعی کے
میں تو کیا
میں تو خادم ہوں ترا
روزِ ازل کا مدّاح
خود خداوند بھی قائل ہے ترا
تری ایجاد کا فن کاری کا مدّاح ہے وہ
تو اگر خود کو خدا بھی کہہ دے
پھر بھی زیبا ہے تجھے
اور یہ لعل و گہر
یہ ترا بخت رسا ہے کہ تجھے
آج وہ دولتِ نایاب ملی ہے کہ
سلاطینِ زمن

ہوں ترے در کے غلام
اور حسینانِ جہاں
فرودیتی و قلوپطرہ تائیس و سلومی اک ایک
خلوتِ خاص کی ہوں تیری رفیق

سندباد : ملکۂ حسن فرودیتی و قتالۂ مصر
نازشِ شہرِ سکندر ——— تائیس
اور وہ رنگولۂ بابل ——— سلمے

ابلیس : عشرتِ شمعِ شبستانِ خیال
لذتِ شہرِ تمنائے وصال
ایک سے ایک حسین
ان جواہر کے تصدق تیرے مقدور میں ہے
ہیں تصرف میں ترے
رعبِ شہی
جاہ و جلال
عظمت و شہرتِ جاوید
کنیزیں ہیں تری
بے خطر ہاتھ بڑھا
ہیچ اندیشۂ فردا ہے
عبث فکرِ زیاں
گر حقیقت ہے تو بس ایک ——— یہی ساعتِ امروز

سندباد : مگر یہ کیا ہے۔
یہ کون گذرا ہے اس گلی سے
یہ کس کے پاؤں کا خون رس رس کے سنگریزوں
پہ جم گیا ہے
مرا گریباں چٹک رہا ہے
مرے لبوں پہ لہو کی بوندیں
[illegible] آرزوؤں [illegible]

پیاس بن کر مرے گلے میں
ہزار خواہش سلگ رہی ہے
مرے رگ و پے میں پھانس بن کر سرک رہی ہے
میرے سینے پہ بوجھ کیسا ہے
یہ کیسا کرگس ہے
جس کا سایہ
سیہ تعفن کا اک بگولا سا
میرے لاشے کو لے کے دکھ کی وادی سے
جانے کس سمت جا رہا ہے
(ڈھول اور ڈگوں کا شور جیسے ہانکا۔ بھریں)
نہ جانے کس سمت جا رہا ہے مرا سفینہ
کوئی بتاؤ
مرے سفینے کے ناخداؤ
مگر یہ کیا ہے
تمہارے چہروں پہ خوف کیوں ہے
تمہارے ہونٹوں پہ کپکپی بن کے بات کوئی
صدا کو جیسے ترس رہی ہو
تمہارے ہونٹوں پہ پپڑیاں بن کے جم رہی ہیں
تمہاری آہیں
تمہارے سانسوں میں سوکھے پتوں کی سرسراہٹ ہے
سرد سایوں کی سنسنی سی
تمہاری آنکھوں سے جھانکتی ہے
بتاؤ
بولو
یہ بات کیا ہے
عجب معما ہے

کچھ تو بولو
تمھارے نفسوں
تمھاری زندہ دلی کو کیا ہو گیا ہے ـــ لوگو
اسے کوئی بات بھی ہو آخر
ہوا موافق ہے
ناؤ سالم ہے
دن کا سورج ہے
شب کو تارے
تو پھر یہ اُجڑے ہوئے سے چہرے
یہ خوف و وحشت
اگر معمّا نہیں تو کیا ہے
کوئی فسوں ہے کہ جس نے آخر
تمھاری عقل و خرد کو مفتوں کر دیا ہے گویا
فسوں نہیں تو تمھاری یادوں نے تم کو دیوانہ کر دیا ہے
مجھے خبر ہے مرے عزیزو
مجھے بھی یادوں سے سابقہ پڑ چکا ہے یارو
مگر تأسّف ہے ان کا حاصل
جو یوں نہ ہوتا تو یہ نہ ہوتا
یہی ہے یادوں کا تانا بانا
مگر کہاں تک ـــ میں پوچھتا ہوں
ہزار امکاں میں ابنِ آدم گھرا ہوا ہے
ہزار ساعت رواں دواں ہے
ہزار حسرت، ہزار خواہش
ہزار ارماں
ہزار جلوہ و چار سُو ہے
تو پھر کہاں تک

غمِ زمانہ کو بھول جاؤ
سنو کہ ہر سانس موجِ دریا ہے جو پلٹ کر کبھی نہ آ[illegible]
کسے خبر ہے وہ موج ملتی بھی
اگر یہی ہے مآلِ ہستی
تو پھر یہ غم کیوں
مری کنیزیں کہاں ہیں ـــ جاؤ
انھیں بلاؤ
بلاؤ ناہید و مشتری کو
ہماری محفل میں یادِ ماضی و فکرِ فردا کا ذکر کیا
اُٹھاؤ بربط
مرا سفینہ رواں دواں ہے
نہ کل کوئی تھی نہ کوئی ہو گی
جو سانس جاتی ہے پھر نہ آئے گی
گاؤ جشنِ طرب مناؤ
(رقص ـــ داد و تحسین کا شور)
مگر وہ کیا ہے!
اُفق کی جانب ـ وہ سوئے مغرب!
میانِ دریا سیاہ جنگل
سراب ہے یا کوئی جزیرہ ہے جس کی تم کو خبر نہیں
تھی مرے سفینے کے ناخدا
ناخدا: یہی وہ ساحل ہے جس کا سایہ
ہمارے چہروں پر خوف بن کر اُبھر رہا تھا
اسی کے قصّے ہمارے ہونٹوں پہ منجمد تھے
اسی کی وحشت سے سوکھے پتّوں کی سرسراہٹ
ہمارے سانسوں
بس رہی تھی

یہی وہ جنگل ہے جس کے سایوں میں وہ کشش ہے
کہ اس سے بچ کے کوئی نہ اب تک نکل سکا ہے
یہی ذخیرہ ہے جس کی شاخوں میں ابنِ آدم کے
اب وجد

عروجِ انساں پہ ہنس رہے ہیں
(بندروں کے خوخیانے کی آوازیں ۔ عورتوں کی
چیخیں ـــــ دہشت زدہ لوگوں کا شور)

سندباد : اُف خدایا یہ وحوش
مری تہذیب و تمدن کے یہ آئینۂ صنعت ۔ چہرہ نما
اُف یہ ہمزاد میرے
جانے کشتی کو مری لے کے کہاں جائیں گے

مرا سامانِ سفر
میری تا منّ و سلویٰ
میرے آلاتِ طرب
میرے خُمْ
میرے سبو
سب کے سب
اب مرے ہمزاد لیے جاتے ہیں
اے وائے

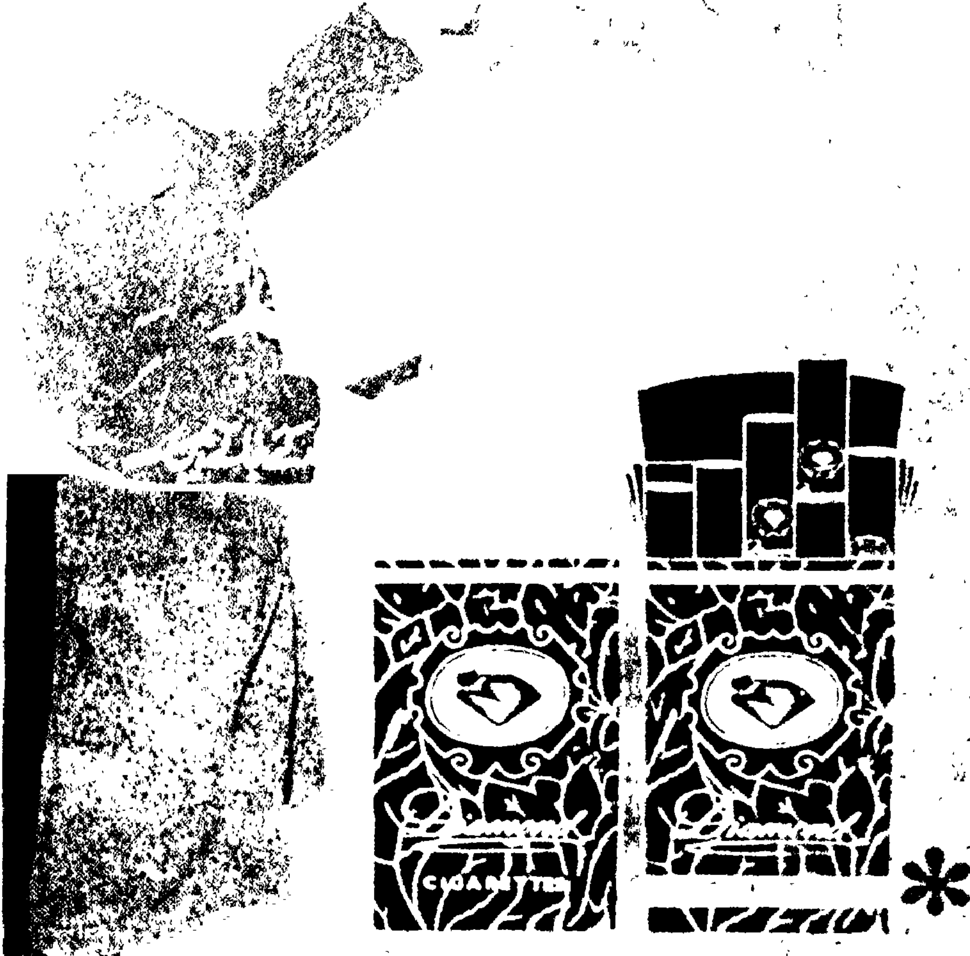
(چیخ و پکار ـ مردوں کا شور)

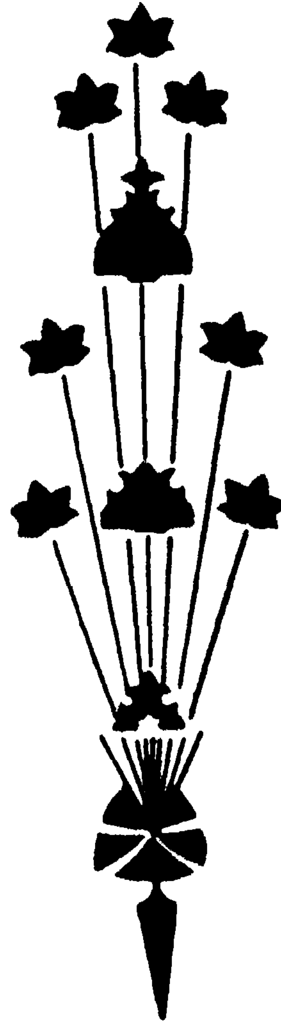
سندباد : آج پھر عزمِ سفر دل میں مرے
مثلِ امواج بدلتا پہلو
کسی انجانے جزیرے کی خبر دیتا ہے
آج پھر موجِ ہوا
پردۂ محملِ لیلیٰ سے اُڑا لائی ہے
خندۂ سحر و چمن

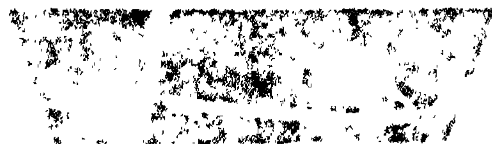
گوشۂ چشمِ آہو!
مجھ کو اب میرا جنوں
جانے کس قلزمِ بے جادہ پہ لے جائے گا؟
ہر سبک رو پہ مجھے خضر و الیاس کا گذرا ہے گماں
مجھ کو ہر راہ سے منزل کی ہوا آئی ہے
میں نے فرعون کو موسیٰ سمجھا
میری کوتاہ نگاہی کے سبب
یدِ بیضا لیے آیا ہے نظر
مجھ کو ہر شعبدہ گر
میں نے ہر بت کو خدا مانا ہے
ہر صنم خانے کے ناقوس کی دلگیر صدا
پاسنے کو باں سُنے لیے
حلقۂ زنجیر بنی
نقش ہر پا پہ مرا ذوقِ سجود
قصۂ زیست کا عنوان بنا
ہر قدم دوریٔ منزل کی خبر لایا ۔۔۔ مگر
آبِ حیواں کے بہانے ہر بار
تیرہ ظلمات میں ہر خضر مجھے چھوڑ گیا
جادہ پیمائی مری پھر بھی مگر کم نہ ہوئی
قلزم آشام مرا ذوقِ سفر
آج پھر مجھ کو بلاتا ہے کہ آؤ!
پھر کسی ناقۂ نادیدہ سے آوازِ جرس
پھر کوئی منزلِ موعود بلاتی ہے مجھے
مجھ کو ہر موج پہ محمل کا گماں ہوتا ہے
ناخدا ہی کے نظر آتی ہے ہر موجِ سراب
فرد ھمیاں کے سوا ـــــ سوچتا ہوں

زادِ اعمال مرا
کچھ بھی نہیں
ہے یہی رختِ سفر — دامنِ صد چاک مرا
اور یہ تختۂ غسّال کی مانند نرالی ناؤ
بادباں جس کے ہیں
پتوار
نہ مستول کوئی
جانے کس ساحلِ گم گشتہ پہ لے جائے گی
کون جانے مری منزل ہے کہاں!
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک"

———


CIGARETTES





پیاسا

کرشن چندر

نواب بڑا اتریل اور زنانی بولی بولتا تھا۔ زرینہ کو اس لیے پسند تھا کہ وہ زرینہ کے ہاتھوں سے پٹ کر اور رو دھو کر صبر کر لیتا تھا۔
دوسرے نوکروں کی طرح بوریہ بستر باندھ کر رخصت نہیں ہو جاتا تھا۔

اس کے گندمی رنگ چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور وہ بہت ڈبلا تھا اور بہت کھاتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو وہ کھاتا ہے وہ کہاں جاتا ہے۔ اس کی آواز میں ایک ہلکی سی تتلاہٹ تھی۔ جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو کبھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی پرانے کسی دروازے سے لگ کر نیم دراز حالت میں یوں کھڑا ہوتا تھا کہ پاؤں فرش پر گھسٹ رہے ہیں سر بائیں طرف کو لٹکا ہوا ہے اور دائیں طرف کو نکلا ہوا ہے ایک ہاتھ ملتے رہے تو دوسرے سے پیٹ کھجا رہے ہیں۔ نواب کو عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ انہی کی طرح وہ فقروں کو چبا کے یا چپا کر کے یا ربڑ کی طرح کھینچ کھینچ کے بولتا تھا۔ مگر باہر کے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ اس لیے اپنی تمام مضحکہ خیز اداؤں اور نخروں کے باوجود قابل برداشت تھا۔ گھر کا باورچی تین دن سے غائب تھا اور نواب کو کچن میں کام کرنا پڑ رہا تھا۔ نواب کو اسے صرف اوپر کے کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ زرینہ لڑکیوں کے کالج میں پڑھانے جاتی تھی، میں اپنے دفتر جاتا تھا اس لیے اگر اب کھانا پکائے تو کون پکائے اور اس سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ باورچی کون ڈھونڈے اور کب؟ یہاں کسی کو فرصت ہی میسر نہ تھی۔

نواب کو جب تین دن کچن میں بینگن بگھارنا پڑے اور بیسن کی چٹنی پیس کر قیمے مصالے کا قورمہ تیار کرنا پڑا تو اس کی ساری تتلاہٹ اور نسائیت ختم ہو گئی۔ مردوں کی طرح بڑے کرخت اور جھنجھلائے ہوئے لہجہ میں بول پڑا۔ صاحب ہم سے نہیں ہوتا ہم کو ایک دن کی چھٹی دو، ہم آپ کے لیے ایک باورچی ڈھونڈ کے لائے گا۔

"کوئی باورچی ہے تمہاری نظر میں؟" زرینہ نے اس کی جھنجھلاہٹ پر مسکرا کے پوچھا۔

کچن سے باہر آکر نواب کو جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگے تو اس کے مزاج کی نسائیت پھر ابھرنے لگی۔ اس پر اسے زرینہ کی مسکراہٹ جو ملی تو اور بھی پھیل گئے۔ آپ نے ایک کندھا اوپر اچکایا، دوسرا نیچے کیا، بائیں کولہے کو اندر کی طرف جھکایا، دائیں والے کو ذرا سا باہر نکالا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑی ادا سے ملتے ہوئے بولے۔

"اب ملیں گے کہیں نہ کہیں سے آپ کے لیے باورچی۔" نواب نے اپنے دیدے گھماتے ہوئے باورچی کے مسئلہ کو ایک پُراسرار سا راز کی طرح ہمارے سامنے کچھ اس طرح پیش کیا کہ جی جل کے کباب ہو گیا۔ جی چاہا سالے کو دو دو جھانپڑ دوں اور اس کی ساری اتراہٹ نکال دوں۔ مگر ضرورت باورچی کی تھی اور باورچی ڈھونڈنے کی فرصت مجھے تھی نہ زرینہ کو۔ اس لیے نواب کو ایک دن کی چھٹی دینا پڑی۔

ایک دو دن کے بعد اتوار تھا میں اپنے کمرہ میں بیزار بیٹھا ہوا کھڑکی سے صبح کی نیلی نیلی روشنی میں اپنا سر خود ہی سہلائے دبا رہا تھا۔ کبھی

کبھی مجھے اپنا سر [illegible] چھپکلی کی دُم کی طرح معلوم ہوتا تھا جب تک دباؤ نہیں کچھ نکلتا نہیں تھا۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نواب دونوں ہاتھوں سے دروازہ کی چق کو تھامے گردن ایک طرف کو نکالے نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

"نہیں، نہیں! ..... "وہ ہنس کر بولے۔ "ہم باورچی لے آئے۔"

"کدھر ہے؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

نواب خائف ہو کر ذرا سیدھے ہوئے۔ اپنے دونوں بازو دروازہ کی چق سے اُتار کر اپنی کمر پر رکھ لیے پھر ذرا پیچھے ہٹ کر کسی اور کو راستہ دے کر بولے۔

"اندر چلے آؤ۔"

کالا، دُبلا پتلا، گہری آنکھوں والا ایک آدمی اندر آیا۔ عمر کوئی پینتیس برس کی ہوگی۔ چھوٹے چھوٹے کالے کالے ہونٹ، چھوٹی چھوٹی گہری آنکھیں، [illegible] اُڑتا بال، اُبلے ہوئے گال، اندر دھنسے ہوئے دانتوں کی ریخوں میں پان کا بھورا میل نمایاں، شیو کے باوجود ٹھوڑی پر کہیں کہیں بال رہ گئے تھے۔ عجب کراہت سی محسوس ہوئی۔

"تم باورچی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جی۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"اوم پرکاش۔"

میں نے اُسے سر سے پیر تک دیکھا پھر نواب سے کہا۔ "اسے بیگم صاحب کے پاس لے جاؤ وہ دیکھ لیں اور چاہیں تو رکھ لیں۔"

دوپہر کے کھانے میں شاہجہانی قورمہ تھا، ورشملہ مرچ میں بھرا ہوا قیمہ تھا اور دم کیے آلو تھے۔ مٹر پلاؤ اور رائتہ اور [illegible] کا میٹھا۔ شاہی ٹکڑے اور دودھی حلوا۔ ہر چیز عمدہ اور نفیس تھی، صحیح ذائقہ والی۔

میں نے خوش ہو کر کہا: "اوم پرکاش کھانا تو تم ٹھیک پکا لیتے ہو۔"

"اوم پرکاش؟" [illegible] میری طرف حیرت سے دیکھ کر بولیں۔ "مگر اس کا نام تو اشتیاق ہے؟"

میں نے باورچی کی طرف دیکھا جو ایک کونے میں اپنے دونوں ہاتھ اپنی ناف پر رکھے کھڑا تھا اور مجھے دیکھنے کی بجائے [illegible] دیکھ رہا تھا۔

"کیوں بے۔ تم نے مجھے اپنا نام غلط کیوں بتایا؟" میں نے باورچی سے پوچھا۔

بولا۔ "صاحب جب میں آپ کے کمرہ میں آیا اور آپ کو دیکھا تو دیکھا کہ شاید آپ ہندو ہیں تو میں نے آپ کو اپنا نام اوم پرکاش بتایا۔ پھر میں بیگم صاحب کے کمرہ میں گیا تو محسوس کر لیا کہ جیسے وہ مسلمان ہیں تو میں نے ان کو اپنا نام اشتیاق بتا دیا۔"

"مگر بے وقوف۔ تم ایک کمرہ میں اوم پرکاش اور دوسرے کمرہ میں اشتیاق کیسے ہو سکتے ہو؟"

دلی میں ایسا کرنا پڑتا ہے صاحب۔ ایک گھر میں اوم پرکاش تو دوسرے گھر میں اشتیاق بتانا پڑتا ہے...... پیٹ روٹی مانگتا ہے صاحب!" اس نے کسی قدر شکایت کے لہجے میں کہا اور اس کے لہجے سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا جیسے اس کو شکایت اس امر کی نہیں ہے کہ اسے اپنا نام غلط کیوں بتانا پڑا بلکہ اس بات کی ہے کہ پیٹ روٹی کیوں مانگتا ہے؟

گرمیوں کے دن تھے۔ دوپہر میں جب حبس بڑھنے لگا تو میں گھبرا کر دوبارہ نہانے کے لیے باتھ روم میں گھسا۔ ٹونٹی گھما کر معلوم ہوا پانی غائب ہو چکا ہے۔ نواب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے بالوں میں تیل چڑھا رہا ہے۔ اشتیاق بنا گانا گاتا آیا۔ میں نے اس سے کہا

"چوک میں جا کر منشی سنگھ نمبر کرو۔ واش شاور خراب ہے۔"

"میں ٹھیک کیے دیتا ہوں۔" اشتیاق بولا۔

وہ سر جھکا کر بڑی عاجزی سے بولا۔ "جی میں پلمبنگ کا کام بھی جانتا ہوں۔"

پانچ منٹ میں اس نے شاور ٹھیک کر دیا۔

شام کو بجلی کا پیڈسٹل پنکھا جو صحن میں چلتا تھا خراب ہو گیا۔ ذرہ بسنے نواب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی دوپہر کی نیند سے نہیں جاگا ہے۔ لہذا اشتیاق کو بلایا گیا اور اس سے کہا گیا کہ وہ چوک میں پنکھے والے کے پاس چلا جائے اور اپنے سامنے ٹھیک کرا کے لائے۔ بہت گرمی ہے آج تو رات کو صحن میں پنکھا چلے گا۔ اشتیاق نے گہری نظروں سے پنکھے کا معائنہ کیا۔ معائنے کے بعد اس نے اپنے دونوں بازو اپنی ناف پر رکھ لیے۔ بولا: "حضور میں پنکھا ٹھیک کر سکتا ہوں۔"

"کیا تم پنکھے کا کام بھی جانتے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

سر جھکا کر بولا۔ "جی! بجلی کا کام بھی جانتا ہوں پنکھا فٹ کر لیتا ہوں، ٹی وی سیٹ دیکھتا ہوں۔"

ڈیڑھ گھنٹے میں پیڈسٹل فین فر فر چلنے لگا۔ میں نے اشتیاق کو تحسینی نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ شرمایا کچھ مسکرایا آخر میں کچھ سکڑ کر دامن کو کچھ ڈھک کر کچن میں چلا گیا۔

رات کے کھانے میں رامپوری مچھی تھا۔ چکن کا قورمہ تو منہ پر پانی آتا ہے۔ بریانی بنائی تو اور بھی بات نرالی۔ چکن چاٹ کھا لو۔ زبان کا ذائقہ بدلتا ہے بادام اور کشمش کے ساتھ۔ عجیب عجوبہ بیان قسم کی ڈش تھی کھر کھری اور مزیدار۔ میں نے ایک روپیہ انعام دیا۔ اشتیاق نے سات بار کورنش بجا لاتے ہوئے بولے۔

"آپ نے دیا ہے انعام۔ بڑے ہمارے پیارا۔"

"ارے!" میرے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں۔" سر جھکا کر بولے۔ "میں شاعر بھی ہوں۔ میرا تخلص تنہائی ہے۔"

میری طبیعت شاعروں سے بہت الجھتی ہے۔ سنا ہے یہ وقت بے وقت شعر سناتے رہتے ہیں اور شعر کہتے رہتے ہیں۔ پہلے ہی یہ بلا

کو جواب دے دوں۔ چونکہ ہمیں روز ہی معلوم ہوتا کہ حیرت ہیں، ایسی قسم کے دُوسرے پیشے بھی جانتے ہیں۔ کرسیاں بُن دیتے ہیں مرمت ٹھیک کر دیتے ہیں گھڑی کا ٹوٹا پھوٹا سامان ٹھیک کر دیتے ہیں کیونکہ بڑھئی کا کام بھی کیا ہے۔ سینما کے گیٹ کیپر بھی رہ چکے ہیں اکنڈ یریلیو میں جہازی کے ہاں کام کیا ہے جلد کمپنی ہے کھدر فون کی فیکٹری میں کام کیا ہے۔ تمام یہ رہ چکے ہیں۔ سلائی سے لے کر کپڑوں کی دُھلائی کے سب مراحل کو یہ پیشہ ور حیثیت سے پرکھ چکے ہیں۔ بڑے عمدہ باورچی ہیں۔ سرکس کے استاد ہیں ان میلے بھی ہیں۔ چاٹ بنا ... ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ انتہائی کم خوراک ہے۔ زرینہ کو ان کی یہ عادت بہت بھا گئی۔ کیونکہ وہ نواب کی اشتہا سے عاجز رہتی تھی اس لیے اُس نے دھیرے دھیرے گھر کا سارا کام اشتیاق کو سونپ دیا۔

دو ماہ میں اشتیاق کا سکہ سارے گھر پر جم گیا۔ اس طرح بھاگ بھاگ کے کام کرتا تھا کہ نواب اور بھی کاہل اور ناکارہ ہوتا گیا اور میں نے دیکھا کہ اشتیاق بھی یہی کچھ چاہتا ہے۔ عمر میں نواب اشتیاق سے سترہ اٹھارہ برس چھوٹا ہوگا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ میں نواب اشتیاق سے ایسا سلوک کرنے لگا جیسے وہ مالک ہو اور اشتیاق اس کا غلام ہو۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ سب کچھ جذبۂ احسان مندی میں ہو رہا ہے میں خیال یہ ممکن ہے اشتیاق نواب پر عاشق ہو گیا ہو حالانکہ نواب پر عاشق ہونا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عاشق کی آنکھوں کی بینائی بے حد کمزور ہو، حس سامعہ تقریباً نہ ہو اور کوئی لطیف جذبہ دل میں نہ ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرا یہ خیال بھی صحیح نہ تھا۔ اشتیاق نہ نواب کو اپنا محسن سمجھتا تھا نہ اس پر فریفتہ تھا۔ بس اُسے دُوسروں کو کھلانے کا مرض تھا اور دُوسروں کو کھلا کے دل ایک عجیب سی خوشی محسوس کرتا تھا چونکہ وہ خود کم کھاتا تھا اس لیے وہ اپنے حصّے کی خوراک بھی نواب کو منتقل کر دیتا۔ ہمارے بعد اُس کے سال کا بہترین حصّہ مخصوص کر دیتا۔ پہلے اُسے کھلاتا پھر خود کھاتا۔ جوں جوں نواب نے کام میں دلچسپی لینا بالکل ختم کر دیا۔ کسی بڑی بی کی ایک کھٹیا پر پڑا کراہتا رہتا اور میں نے دیکھا کہ اشتیاق اُس کی فرضی بیماری کو بڑھا چڑھا کے بیان کرنے میں بڑا مزا لیتا اور اسے کھٹیا پر آرام کرنے کا مشورہ دیتا۔ اس کے لیے بازار سے دوا لاتا اور پھل سگریٹ بیڑی کے پیسے بھی خود دیتا۔ کبھی کبھی ایک آدھ قمیض اور پاجامہ یا سلیپر بھی سلا دیتا۔ جوں جوں اشتیاق کی تنخواہ کا بیشتر حصّہ نواب پر خرچ ہونے لگا اور نواب اپنی تنخواہ کی کل رقم بچا کے اپنی ماں کو علی گڑھ بھیجنے لگا۔

زرینہ نے کئی بار اشتیاق کو سمجھایا۔ اُسے اپنی تنخواہ جمع کرنے کے فائدے بتلائے مگر اشتیاق پر اُس کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مُسکرا کر بولا۔

"بیگم صاحب۔ بچہ ہے کھا لیتا ہے تو کیا کرتا ہے۔"

"ارے تو اپنے لیے بھی تو کچھ کرے کمبخت" زرینہ چڑ کر اُس سے کہتی۔ "دُوسروں کے لیے کیوں مرتا ہے۔"

"میرا آگے پیچھے کون ہے بیگم صاحب"۔ اشتیاق گردن جھکا کر جواب دیتا۔ "بھائی نہیں بہن نہیں ماں نہیں باپ نہیں بھرت پور کے فسادوں میں مارے گئے۔ میرا سینہ ہر وقت خالی خالی سا رہتا ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد نواب کی ماں کا خط علی گڑھ سے آیا اُس نے نواب کے لیے ایک لڑکی ٹھیک کر لی تھی دو ماہ بعد شادی تھی۔ اُسے واپس بلا رہی تھی۔ عنبر راسائیکل والا جس کے ہاں دہلی آنے سے پہلے نواب کام کرتا تھا وہ اب پھر اُسے کام دینے کے لیے تیار

...لیے نواب واپس ——— جانے کے لیے تیار ہو گیا ہم بھی اندر سے بہت خوش تھے کیونکہ نواب اب تو تقریباً مفت کی کھاتا تھا۔ وہ
...ارا کام تو اشتیاق نے سنبھال لیا تھا۔ زرینہ نے بھی طے کر لیا تھا کہ نواب کے جانے کے بعد دوپہر کے کام کے لیے کسی کو نہ رکھے
... اشتیاق کی موجودگی میں کسی دُوسرے نوکر کی ضرورت نہ تھی۔

زرینہ بولی۔ "دیکھ نواب کی شادی ہو رہی ہے اب تو بھی شادی کر لے اشتیاق میں تیری بیوی کو رکھ لوں گی مجھے ایک ملازمہ
کی ضرورت ہے"

شادی کے نام پر میں نے دیکھا کہ اشتیاق کچھ چڑ سا گیا ہے۔ اس کی بھنویں تن گئیں۔ تنگ ماتھے پر بالوں کی لٹیں ڈولنے لگیں اور
اس کے غصے سے ہونٹ پھڑکنے لگے مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ سر جھکا کر کھانے کے کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد نواب
کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی کھانے کی میز کے قریب آ کر بڑی رازداری سے بولا۔

"اے صاحب۔ یہ کیا شادی کرے گا اس کی بیوی تو شادی کے دُوسرے دن ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں بیگم صاحب" نواب بولا۔ "یہ کچھ بتاتا تو ہے نہیں"

چند منٹ کے بعد جب ہم لوگ کھانا کھا کے صحن میں ہاتھ دھونے کے لیے آئے تو دیکھا کہ اشتیاق کچن میں میلے برتن اور راکھ کا
ڈھیر اپنے سامنے رکھے خلا میں گھور رہا ہے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی نامعلوم جذبہ سے جھلک کر تارا سی چمک رہی ہیں۔

مجھے پہلی بار اشتیاق میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

آٹھ دس روز کے بعد نواب نے علی گڑھ واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اس کے جانے پر اشتیاق چپکے چپکے بہت رویا اس کی
آنکھیں سُرخ تھیں اور ہونٹوں کے کونے بے طرح پھڑکتے تھے مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے نواب کے لیے سفری ناشتہ تیار
کیا حالانکہ صرف ڈھائی گھنٹے کا سفر تھا مگر قیمے کے پراٹھے اور سُرخ مرچوں کا اچار اور آلو کا بھرتہ اور بیسنی روٹی اور مکھن کی ایک ٹکیا۔ وہ
نواب کی بھوک سے واقف تھا۔ خود اپنے خرچ سے اس نے نواب کا ناشتہ تیار کیا تھا اس لیے ہم شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے وہ خود نواب
کے لیے سکوٹر لے کر آیا اس کا سامان سکوٹر میں رکھا اور اُسے پرانی دلی کے سٹیشن پر گاڑی میں سوار کرا کے واپس آیا۔

دو دن تک اسی طرح مضطرب اور بے چین پھرتا رہا جیسے اس کا گھر لُٹ گیا ہو اور وہ کسی اجاڑ ویرانے میں گھوم رہا ہو کھانے
اسے ایک سم گر گیا تھا۔ قورمہ اس کے جذبہ کی طرح تُرش تھا اور قلیہ اتنا پتلا جیسے کسی نے اس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ہو۔ چپاتیاں
بے ڈول اور سب کا ٹکی اطراف پر جگہ جگہ مایوسی کی راکھ لگی ہوئی۔ دو دن تک تو ہم نے کسی نہ کسی طرح صبر کر کے کھانا زہر مار کیا اور یہ سوچ
لیا کہ اگر معاملہ یونہی چلتا رہا تو اشتیاق کو جواب دینا پڑے گا۔

مگر دو دن کے بعد اشتیاق سنبھل گیا۔ کہیں سے وہ ایک بلی کا بچہ اٹھا لایا اور اب وہ بلی کا بچہ اشتیاق کی توجہ کا مرکز بن گیا
گھر کا کام کرنے کے بعد وہ اپنا سارا وقت جو اس سے پہلے وہ نواب کو دیتا تھا اب بلی کے بچے پر صرف کرنے لگا۔ اور اپنی تنخواہ کا کافی
حصہ بلی کے لیے دودھ اور گوشت پر خرچ کرنے لگا اور یوں دیکھا جائے تو بلی کا بچہ نواب سے کچھ کم نہیں کھاتا تھا۔ اس کے حشر

اور نقوش بھی غائب ... جاتا ہی تر یا تھا اور ویسی ہی ادائیں دکھاتا تھا۔ وہ یکی دن میں اشتیاق سنبھل گیا اور کھانے کا معیار بھی ٹھیک ہوتے ہوتے پھر اپنی پہلی اور اصلی حالت پر آ گیا اور ہم لوگوں نے چین کا سانس لیا۔

اشتیاق کسی کام کو کرنے سے انکار نہ کرتا تھا کیونکہ وہ اپنی دانست میں سب کچھ جانتا تھا۔ یہ کسی شیخی خورے کی عادت نہ تھی، اس شدت جس قدر یہ احساس کہ مجھے یہ کام بھی کر کے دکھا دینا چاہیے۔ اُسے اپنے ذاتی وقار کے تحفظ کا بہت خیال تھا اور ایک عجیب سی لگن تھی جو اس کے دل میں ہر اُس کام کو پورا کرنے کے لیے اُکساتی تھی۔ چاہے وہ اسے جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ کئی دنوں سے ریڈیو خراب تھا اور میں چونکہ ریڈیو کا کام بھی تھوڑا جانتا ہوں اس لیے زرینہ نے مجھے کئی بار ریڈیو ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔ مگر دفتر کی طویل تھکا دینے والی جھک جھک کے بعد ذہن اور جسم دونوں اس قدر تھک جاتے ہیں کہ ریڈیو کو کھولنے اور ٹھیک کرنے کی ہمت کہاں سے لائیں؟ میں اس کام کو آج اور کل پر ٹال رہا تھا۔

ایک دن دفتر سے جو آیا تو دیکھا کہ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں پورا ریڈیو کھلا پڑا ہے اور اشتیاق عجب گھبرائی ہوئی حالت میں اُسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور زرینہ قریب کھڑی ہوئی روکھی ہو رہی ہے۔ میں نے آنکھوں کے اشارے ہی اشارے میں پوچھا کہ کیا بات ہے؟

زرینہ بولی: "اشتیاق نے کہا تھا میں ریڈیو بھی ٹھیک کر لیتا ہوں اور تمھیں کئی دن سے فرصت نہیں مل رہی ہے اسی لیے ہم نے اشتیاق کو اس کام پر لگا دیا۔ دو ڈھائی گھنٹے سے ریڈیو پر کام کر رہے ہیں حالانکہ تم نے بتایا تھا کہ معمولی سا نقص ہے!"

میں معاملے کی نزاکت سمجھ گیا۔ اشتیاق اپنے چہرے سے ماتھے پر بال گرائے مجھ سے آنکھیں چرائے ریڈیو پر کام کر رہے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ریڈیو کھول تو لیا ہے مگر اب جوڑنا نہیں آتا۔ چہرے سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ میں نے زرینہ کو باہر بھیج دیا اور خود اشتیاق کے ساتھ کام کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر میں نے اشتیاق کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ اُسے یہ کام نہیں آتا۔ بلکہ میں نے اس طریقے پر کام کو آگے بڑھایا جیسے ہر کام اشتیاق کی مرضی سے ہو رہا ہے۔

گھنٹہ بھر میں ریڈیو ٹھیک ہو گیا۔ زرینہ بہت خوش ہوئی اُس نے اشتیاق کو دو روپے انعام میں دیے۔ مگر چند دنوں کے بعد پھر اشتیاق کی شامت آئی۔ زرینہ نے کہیں اُس سے پوچھ لیا۔ "کیا تم رس گلے بنا سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔" اشتیاق فوراً بولے

"ایک دن بنا کے دکھاؤ۔"

"آج رات ہی کر جاؤں گا۔"

رات کے کھانے کے بعد دیر تک اشتیاق کچن میں کچھ کھٹ پٹ کرتا رہا۔ انگیٹھی سے دیر تک دھواں نکلتا رہا، منہ میں بیڑی دبی رہی، ماتھے کے بال اُلجھتے رہے اور کچن کی زرد روشنی دیر تک کچن میں اپنا سر پٹختی رہی۔ کوئی ایک بجے کے قریب کچن کی بتی بجھی اور اشتیاق نے دوسرے دن صبح ناشتے میں برف میں ٹھنڈے کیے گئے رس گلے تازے اور میٹھے اور گلاب کی خوشبو سے مہکتے ہوئے پیش کیے۔

"یہ رس گلے تم نے بنائے ہیں؟" زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جی۔ ابھی خاکسار نے۔" اشتیاق دروازہ سے لگ کر نظریں جھکا کر پاؤں سے فرش کو کُریدنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"بالکل بازار کے سے معلوم ہوتے ہیں!" زرینہ تعریف کرتے ہوئے بولی۔

"یہی تو ان کی خوبی ہے۔" میں نے کہا۔ "سیدھے بازار سے لائے گئے ہیں۔"

"جی نہیں۔" اشتیاق نے زور سے احتجاج کیا۔

اُس کے احتجاج کی شدت دیکھ کر زرینہ کا شبہ اور بڑھ گیا۔ بولی۔ "تو آج رات کو میرے سامنے رس گلے بناؤ۔ میں خود دیکھوں گی۔"

"جی بہت اچھا۔"

اشتیاق نے رس گلوں کے سلسلے میں چند چیزوں کی فہرست پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ دوپہر میں بہت دیر تک اشتیاق بازار میں رہے۔ سرِ شام زرینہ نے اُن کے حجرے کی تلاشی لی کہ کہیں وہ رس گلے بازار سے نہ لے آئے ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد اشتیاق نے بڑے اہتمام سے رس گلے بنانے کا کاروبار کچن میں پھیلا دیا۔ زرینہ نے گھر کو اندر سے بند کر کے تالا لگا دیا تھا اور ہر پندرہ منٹ کے بعد کچن میں جھانک لیتی تھی۔ کوئی دو بجے کے قریب جب نیند کا غلبہ شدید ہونے لگا تو رس گلے تیار ہو گئے۔ اشتیاق ایک ڈش میں رس گلے لے کر آئے۔ کھانڈ کے متعفن شیرے میں فینائل کی گولیوں سے بھی دو تہائی کم کے حجم کی سفید سفید گولیاں سی تیر رہی تھیں۔ زرینہ چیخی!

"ارے یہ رس گلے ہیں، بکری کی مینگنی کے برابر؟"

"ابھی چھوٹے ہیں! دیکھیے بیگم صاحب۔ یہ رس گلے ابھی چھوٹے ہیں مگر رات بھر شیرا پئیں گے صبح کو پھول کر پورا رس گلہ ہو جائیں گے۔"

اشتیاق نے سمجھایا۔

زرینہ کو یقین آیا نہ مجھے مگر نیند کا غلبہ شدید تھا اس لیے ہم سو گئے۔ صبح اُٹھے تو ناشتہ پر پورے حجم کے بڑی گولائی کے سفید رس گلے [illegible]۔ کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ رات کو کونین کی گولیوں کے برابر حجم والے رس گلے پھول کر اس قدر بڑے ہو گئے تھے۔ مگر رات بھر کون جاگے؟ اور کون چوکیداری کرے؟ اشتیاق منہ اندھیرے بازار سے رس گلے خرید لائے ہوں گے اور رات کی گولیوں کو انھوں نے نالی میں بہا دیا ہو گا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو شخص اپنے ذاتی وقار کی خاطر رات بھر جاگ سکتا ہے اور اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے دوسروں کو رس گلے کھلا سکتا ہے محض اپنی ذات کی اہمیت جتانے کے لیے۔ اُس سے اُلجھنا بے کار ہے۔

جُوں جُوں بلی کا بچہ بڑا ہوتا گیا اشتیاق کا جذب دروں بڑھتا گیا چند۔ اِدھر ہمارے سامنے ایک خوبصورت بلی صحن میں گھوم رہی تھی جس کے بال ریشم کی طرح ملائم تھے جو انتہائی میٹھی سرگوشی میں خُر خُر کرتی تھی اور جب گردن ٹیڑھا کر کے آنکھیں جھپکا کے اشتیاق کی طرف دیکھتی تھی تو وہ بے چارہ دل تھام کے رہ جاتا۔ تھی بھی قیامت کی طرار۔ موٹی گول ترشی سی۔ کبھی دھیرے دھیرے مٹک مٹک کر چلتی کبھی ایک دم چنچل ہو کر چھلانگ لگاتی اور اشتیاق کے کندھے پر جا کے بیٹھ جاتی اور پیار سے اُس کی گردن چاٹنے لگتی۔ کبھی اُدن

سالگرہ بنی ہوئی پائنتی پر بیٹھ کر کبھی پاؤں دبا دیتی کبھی اس کی باہنوں میں پڑ کر پھیل کر لیٹ جاتی۔ عورت کی مکمل سپردگی کے ہر انداز میں کر
شریر لگاوٹ ادا سے ایک مست انگڑائی لیتی اور جب اشتیاق اسے پکڑنا چاہتا تو بدن چرا کر بھاگ نکلتی اور اشتیاق ایک عجب مسرت ا
حسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اشتیاق نے اس کا نام گلشن رکھا تھا مگر پیار کی حیرت میں اسے صرف گلو کہہ کر پکارتا تھا۔

ایک دن میری غیر حاضری میں اشتیاق نے زرینہ کے بیڈ روم پر دستک دی۔

سردیوں کے دن آ چلے تھے اس لیے زرینہ حمام ختم ہونے کے باوجود اپنے نائٹ گاؤن میں ملبوس ایک سویٹر بُن رہی تھی۔

"کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"میں ہوں اشتیاق۔"

"اندر آ جاؤ۔" زرینہ بولی۔

کاغذ پنسل لیے ہوئے اشتیاق جھجکتے جھجکتے انتہائی مؤدب انداز میں دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے پیچھے سے کا
اور پنسل آگے بڑھا دیا اور بولا لکھیے۔

زرینہ بولی۔ کیا کل کا حساب ہے، ابھی نہیں بعد میں دیکھ لوں گی۔"

"حساب نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"آپ لکھیے تو۔" اشتیاق بار بار کاغذ اور پنسل آگے بڑھا رہے تھے زرینہ نے کاغذ اور پنسل تھام کر ذرا سختی سے پوچھا۔

"آخر ہے کیا؟"

"ایک غزل کے تین شعر ہوئے ہیں۔"

زرینہ چند لمحوں کے لیے ہونق سی رہ گئی پھر اس کے دل میں ہنسی پھوٹنے لگی مسکرا کر بولی۔

"تم خود نہیں لکھ سکتے؟"

"جی نہیں۔ میں نہ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔"

"مگر شعر کہہ سکتے ہو۔" زرینہ نے فقرہ مکمل کیا۔

"جی ہاں جی بالکل کہہ سکتا ہوں۔ آپ لکھیے میں بولتا ہوں۔"

"لکھیے۔" زرینہ نے زچ ہو کر کہا۔

اشتیاق نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک عجب کیفیت کے عالم میں بولا۔

تنہائی میرا کام ہے گلشن تیرا نام ہے جو ہو سو ہو۔

ہم مرتے ہیں تجھ پر تو ڈرتی ہے مجھ سے۔ جو ہو سو ہو۔

"مگر اس کی بحر کیا ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"پھر؟" اشتیاق نے حیرت سے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ "بہرحال غزل تو غزل ہے۔"

"مگر اس کا وزن؟" زرینہ نے پھر توجہ دلائی۔

"بڑی وزنی غزل ہے بیگم صاحب۔ آپ سنیے تو۔" اشتیاق نے کمال دلجمعی سے کہا۔

بڑی مشکل سے زرینہ نے اپنی ہنسی روکی۔ بولی: "آگے چلیے۔"

اشتیاق نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور گہرے مراقبے میں جا کر بولے۔

تیری جدائی میں جئے ہم مست فگار جو ہو سو ہو۔
کہتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو ہو سو ہو۔

زرینہ نے پوچھا۔ "کہتا ہے تنہائی؟ مگر تنہائی تو مونث ہے!"

"مگر تنہائی تو میرا تخلص ہے اور میں مونث نہیں ہوں۔" اشتیاق نے سمجھایا۔

اس کے چہرے پر کچھ ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کہنا چاہتا ہو "اجی بیگم صاحب۔ یہ شعر و شاعری ہے آپ کیا جانیں۔"

"اور یہ مست فگار۔ کہاں کی ترکیب ہے تنہائی صاحب۔" زرینہ نے پھر پوچھا۔

"ہمارے مراد آباد میں ایسا ہی بولتے ہیں!" اشتیاق نے جواب دیا۔

زرینہ نے ایک دم کاغذ پنسل بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ گرج کر بولی۔ "اشتیاق اگر آج کے بعد تو نے کبھی مجھے اناپ شناپ شعر سنایا تو کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دوں گی۔" اشتیاق نے کھسیا کر سر جھکایا، پھر سر کھجانے لگے۔ بے حد مجوب اور شرمندہ دکھائی دے رہے تھے۔ زرینہ کو اس پر رحم آ گیا۔ نرم لہجہ میں مسکرا کر کہنے لگی۔

"میرے خیال میں اگر آپ شعر و شاعری چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔"

ذرا سر اٹھا کر بولے۔ "ایک ناول بھی تیار کر رہا ہوں۔"

"کیا نام ہے اس ناول کا؟" زرینہ نے پوچھا۔

"وائف اینڈ کک۔" اشتیاق انگریزی میں بولے۔

اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پرانے زمانے میں ان باورچیوں کی ہوا کرتی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کرتے تھے یا آج کے ان مزدوروں کی جو ان پڑھ ہونے کے باوجود ٹیکنیکل دھندوں میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم گرامر کی محتاج نہیں ہوتی مگر اپنا مفہوم ادا کرنے میں اس انگریزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے جسے آج کل کے طالب علم میٹرک تک پڑھتے ہیں۔

ایک دن جب اشتیاق میرے سر کی چمپی سے فارغ ہو چکا تو میں نے اس سے کہا۔ "تم اتنے ڈھیر سارے دھندے جانتے ہو لیکن اگر تم کسی ایک دھندے کو پکڑ کر بیٹھ جاتے تو غالباً بہت ترقی کر جاتے۔"

"صاحب! میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک جی نہیں لگتا۔" اشتیاق ایک میلے سے تولیہ سے اپنے ہاتھ صاف کرتا

ہوئے بولا: [illegible] دوسرے میں چلا گیا اس میں زندگی کے چیتے چیتے ہر جگہ رکھ دیے ہیں۔ آپ بھی ایسی ہی ہو جائے گی:

"تو تم کسی ایک دھندے میں بھی کیوں نہیں لگ جاتے۔" میں نے پوچھا!

"جی نہیں لگتا۔" اشتیاق سر جھکا کر کسی اقبالی مجرم کی طرح شرمندہ ہو کے کہا۔

"میرا سینہ ہر وقت خالی خالی سا رہتا ہے۔"

"میاؤں۔"

دروازہ پر گڑو تشریف لائیں اور وہ منہ اٹھا کے بڑی بڑی آنکھوں سے اشتیاق کی طرف دیکھنے لگی۔ اشتیاق نے اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کے بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "گڑو تمہارے لیے دودھ لے آؤں؟"

"میاؤں۔"

اشتیاق پر کبھی کبھی ذہنی غشی کے لمبے لمبے دورے پڑتے تھے، جبکہ وہ گھنٹوں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کچن میں غائب بیٹھا رہتا۔ جانے کیا سوچتا ہے۔ گردن کا منکا ٹوٹ سا جاتا ہے، خود ہی گھورتا ہے خود ہی سنکنے لگتا ہے، کبھی کبھی منہ میں بڑبڑانے لگتا ہے۔ کیسے گزرتی ہے اس پر وہ کون سا کرب ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے۔ کون جانے، کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔ کبھی کبھی نشہ ہوتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ جب دل کی گھٹن اور سینے کا سناٹا حد سے گزرنے لگتا ہے تو کوئی نشہ ضرور کرتا ہے۔ کیونکہ مہینے میں ایک دو دن ایسے آتے ہیں جب اشتیاق کوئی کام نہیں کر سکتا۔ سارا دن تقریباً نیم غشی کی حالت میں اپنی چارپائی پر پڑا رہتا ہے اور اس کا سینہ دھونکنی سا رہتا ہے اور دو دن کے بعد جب وہ ہوش میں آجاتا ہے تو اصرار کرتا ہے کہ دونوں دن وہ ایسے ہی تھا، نہ اس نے کوئی نشہ کیا ہے اور ہم بھی اس لیے چپ رہتے ہیں کہ اپنا کام بہت اچھا کرتا ہے۔ ماہر ہی نہیں آرٹسٹ ہے اپنے کام کا اور فنکار کے دماغ کی ایک چول تو ڈھیلی ہوتی ہی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔

اس لیے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ اس سے کہا حیدرآبادی بیگن بنائے اور وہ لے آیا کچھ عجیب سی ڈش ـ جس میں شوربہ پانی کی طرح پتلا تھا اور اس کے اندر بیگن کے کالے کالے ٹکڑے مرے ہوئے چوہوں کی طرح تیر رہے تھے۔

"یہ حیدرآبادی بیگن ہیں؟" زرینہ چلا کر پوچھتی ہے۔

"جی نہیں یہ چائنا ڈش ہے۔" اشتیاق کہتا ہے۔ "بالکل نئی ڈش ہے چکھ کے دیکھیے۔ بیگم چکھیے، بالکل نیا مزہ ہے۔"

"اٹھا کے لے جا ابھی ابھی یہاں سے ورنہ تیرے سر پہ دے ماروں گا!" میں گرج کر کہتا ہوں کیونکہ مجھے تو اس ڈش کو دیکھ کر ہی متلی ہونے لگی تھی۔

اس وقت تو اشتیاق ڈش اٹھا کے لے گیا مگر بعد میں اس نے زرینہ سے کہا۔ "صاحب بھی کیسی ناانصافی کرتے ہیں، چکھے بغیر پاس کر دیتے ہیں کھانے کو۔"

اشتیاق مرغ قیمہ بہت عمدہ پکاتا ہے۔ ایک دفعہ گھر پر مخصوص مہمانوں کی دعوت تھی۔ اشتیاق سے مرغ قیمہ پکانے کو ک

گئی، جب دسترخوان بچھا تو منجملہ دوسری چیزوں کے ایک نہایت بدبودار اور سڑی ہوئی ڈش سامنے آئی۔

"یہ مرغ قلیہ ہے؟" زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں" اشتیاق فوراً بولے "یہ پیسٹ ہے۔"

"پیسٹ کیا؟ تمہیں تو مرغ قلیہ تیار کرنے کو کہا تھا، کہا تھا کہ نہیں؟" زرینہ خفا ہو کے بولی۔

"جی۔ مرغ قلیہ بگڑ گیا۔ اس لیے میں نے نئی ڈش تیار کر دی۔" اشتیاق کی یہ عادت اب ہمیں معلوم ہو چکی ہے کہ جب کوئی سالن بگڑ جاتا ہے وہ فوراً اُسے کوئی نیا نام دے کر دسترخوان پر پیش کر دیتے ہیں اور ڈش کے بگڑنے کا یوں تذکرہ کرتے ہیں جیسے کسی ہی خاندان کا فرد خود بخود بگڑ جائے اور اس کے بگاڑنے میں اُن کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔

اب کیا کہیں۔ چند ایسے مہمانوں کی دعوت تھی جن کے سامنے میں بے تکلف نہ ہو سکتا تھا ورنہ آج میرا ارادہ اشتیاق سے بے تکلف ہونے کا تھا۔ مگر مہمان موجود تھے اور دوسرے سالن بے حد عمدہ تھے اس لیے خاموش رہ جانا پڑا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم اپنے مہمانوں کو لے کر میٹنی شو دیکھنے چلے گئے اور چلتے چلتے زرینہ نے اشتیاق کو رات کے کھانے کے متعلق ہدایات دے دیں۔ میٹنی شو دیکھ کر جب ہم شام کو واپس آئے تو دیکھا کہ گھر کے باہر فائر بریگیڈ کھڑا ہے۔ بہت سے لوگ جمع ہیں اور کچن کی چمنی اور چھت اور کھڑکیوں سے دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے ہیں۔

"آگ، آگ میرا گھر بچاؤ۔" سینٹ لارڈ زور زور سے چیخ رہا تھا۔

"اشتیاق کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا معلوم؟" سینٹ لارڈ اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے بولا۔ "ایک گھنٹے سے چیخ رہا ہوں دروازہ ہی نہیں کھولتا اندر کچن میں شاید نشہ کر کے بے ہوش پڑا ہے۔"

میں نے اور زرینہ نے۔ دونوں نے چلا چلا کر اشتیاق سے دروازہ کھلوایا۔

اشتیاق بے حد حیرت زدہ کچن سے نکلے اور دھواں دیکھ کر پلٹے اور کچن کی دونوں انگیٹھیوں پر پانی ڈال کر بجھانے لگے۔ دونوں انگیٹھیوں کے سالن جل چکے تھے۔ مگر خدا جانے ان میں اُس نے کون سا مسالہ ڈالا تھا کہ دھوئیں کے گہرے سیاہ بادل اب تک ان پتیلیوں سے اُٹھ رہے تھے۔

"آگ، آگ" سینٹ لارڈ غصے سے چیخ رہا تھا۔

"کدھر ہے آگ؟" اشتیاق حیرت سے پوچھنے لگے۔

زرینہ بولی۔ "یہ بے چارے ایک گھنٹے سے چیخ رہے ہیں دروازہ پیٹ رہے ہیں اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ فائر بریگیڈ تک آ گیا اور تم کچن کا دروازہ بند کیے غافل بیٹھے ہو۔"

اشتیاق سب لوگوں کو متوجہ دیکھ کر کچھ جھینپے۔ شرمندہ ہو کر سر کھجانے لگے۔ ایک اُنگلی اپنی کھوپڑی پر رکھ کر بولے "مجھے پتا ہی نہ تھی۔"

"کیسی بحث؟ [illegible] پڑھ رہے تھے؟ تم تو یہاں اکیلے بیٹھے ہو۔"

"کمرہ شہر میں مقدمہ تھا۔"

"کیسا مقدمہ؟"

"آبائی مکان کا مقدمہ تھا میرے اور چچا زاد بھائی لطیف کے درمیان، وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی میں بحث ہو رہی تھی۔"

"کدھر ہے وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی؟" زرینہ کے غصے کا پارہ چڑھنے لگا۔ "میں خود دونوں طرف سے وکیل ہوں، خود ہی کورٹ ہوں، خود ہی مدعی، خود ہی مدعا علیہ، خود ہی بحث کرتا تھا، خود ہی جواب دیتا تھا۔" اشتیاق نے بتایا۔

"مگر کہاں بحث چل رہی تھی؟" زرینہ نے دانت پیس کر پوچھا۔

"یہاں۔" اشتیاق نے اپنی کھوپڑی پر انگلی رکھ کر کہا اور سر جھکا لیا۔

زرینہ کا دل اشتیاق سے پھٹنے لگا۔ میرا بھی! حد ہو گئی ہونے کے باوجود اس کی خامیاں اب جاں لیوا ثابت ہونے لگیں۔ ادھر اشتیاق سے زیادہ اس کی بلی گلشن نے مجھے عاجز کر دیا۔ میں دراصل اشتیاق کی وجہ سے اس سے بے اعتنائی تو برتتا تھا کیونکہ اشتیاق نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا اس کی بلی پر توجہ دے۔ مگر غالباً گلشن کو یہ بات پسند نہ تھی وہ مجھے بھی اپنے مداحوں کی فہرست میں شامل کرنے پر مُصر تھی۔ وہ ایک بار وہ میرے کمرے میں اٹھلاتی ہوئی آئیں مگر میں نے شش کہہ کر بھگا دیا۔ پھر میری غیر حاضری میں ایک بار وہ میرے بستر پر چڑھ کے سو گئیں۔ دراصل سوئی نہیں سونے کا بہانہ کر رہی تھیں۔ وقت بھی بی گلشن نے وہ چنا تھا جو میرے دفتر سے آنے کا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ دیکھو ہم تو تمہارے بستر پر چڑھ کے سوئیں گے اور اگر تم یہ برداشت کر گئے تو دوسری بار تمہارے سینے پر چڑھ کے سوئیں گے۔ یعنی جس شدت میں بے اعتنائی دکھاتا تھا اسی قدر وہ مجھے اپنے قریب لانے پر مُصر تھیں۔ اس وقت میں نے جو انہیں بستر پر سوتے ہوئے دیکھا تو غصے میں آکر انہیں دُم سے پکڑا اور بستر سے نیچے پھینک دیا۔ بے حد خفا ہو کر غرائیں اور بھاگ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ مگر اس کا بدلہ گلشن نے یوں لیا کہ دوسرے دن دفتر سے جو آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے میں کمبل کی ریشمی گدی کے دونوں تکیے اُدھڑے پڑے ہیں اور گلشن انہیں پنجے مار مار کر نوچ رہی ہے اور کمبل کو بھی اُڑا رہی ہے۔

میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ جھپٹا مارنے کے لیے آگے جو بڑھا تو گلشن چھلانگ لگا کر دروازے سے باہر۔ اور بلی چیخنے لگی: "میاؤں! میاؤں!" مگر آج میں نے بھی قسم کھائی تھی۔ آج میں اس حرافہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے صحن کا دروازہ بند کر دیا اور ڈرائنگ روم سے بیڈ روم اور ڈائننگ روم سے ہوتے ہوئے صحن سے باتھ روم تک گلشن کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آخر میں نے اُسے پکڑ لیا اور دونوں ہاتھوں سے دبا کر اُسے گھر سے باہر لے چلا۔ اشتیاق سہما ہوا میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا مگر میرے غصے کو دیکھ کر مُنہ سے کچھ بول نہیں رہا تھا۔ صرف اُس کے ہونٹوں کے کونے پھڑک رہے تھے۔

بڑی سڑک پر آ کر میں ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اس سڑک پر کئی کوڑے اور گڑھے تھے اور اس پر ہر وقت وزنی ٹرک گھُوں گھُوں کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ میں نے ایک ٹرک کو قریب آتے ہوئے دیکھ کر بی گلشن کو زور سے جھلایا اور نشانہ باندھ کر گزرتے ہوئے ٹرک کے نیچے پھینک دیا۔ اشتیاق کے گلے سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔

ٹرک سڑک پر سے گزر گیا چند لمحوں تک ایسا محسوس ہوا جیسے گلشن سڑک پر پس کر بچھ گئی ہے ۔ پھر یکایک وہ چونک کر کھڑی ہو گئیں
بجلی کی سرعت سے چھلانگ لگا کر سڑک کو پار کرتی ہوئی مخالف سمت چلی گئیں ۔ دو ایک بار اُس نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا مگر
ہمارے گھر کی طرف آنے کی بجائے وہ مخالف سمت ہی دوڑتی چلی گئی اور پھر کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔

تین دن تک اشتیاق نے انتظار کیا مگر گلشن کہیں نظر نہیں آئی۔ چوتھے دن اُس نے سامان باندھ لیا اور بولا ۔ "صاحب میرا حساب
دیجیے میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں۔ تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے" ۔ زرینہ نے پوچھا!

اشتیاق نے مجھ سے آنکھیں چرا کے زرینہ سے کہا ۔ "بیگم صاحب جس طرح صاحب نے میری بلی کے ساتھ سلوک کیا ہے وہ
برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اور وہ جو تمہاری بلی نے میرے چالیس روپے کے دو قیمتی تکیے پھاڑ ڈالے ہیں اس کا ہرجانہ کون دے گا؟" میں نے غصے سے
آواز میں کہا۔

زرینہ معاملے کو سلجھانے کے خیال سے بولی۔ "ارے ایک بلی کی وجہ سے لگی لگائی نوکری چھوڑتا ہے۔ میں تجھے ایسی ایسی دس
لا دوں گی۔"

"نہیں۔ وہ تو میری گلشن تھی" ۔ اشتیاق کی آواز کمزور ہو کر لرزنے لگی جیسے وہ ابھی رو دے گا۔

"ارے گلشن تھی کر زعفران کر کے بس جو نام چاہے رکھ لینا۔" میں نے بھی اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "سینکڑوں
گھومتی ہیں اس علاقہ میں۔"

اشتیاق نے پھر نظریں چرا کر مجھ سے رُخ موڑ کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ بولا!

"مجھے صاحب سے ڈر لگتا ہے اب تو۔"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"جب صاحب نے گلشن کو اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تو مجھے ان کا چہرہ بالکل اپنے باپ کی طرح نظر آیا۔"

"اپنے باپ کی طرح؟ کیا بکتے ہو؟" زرینہ غصے سے بولی۔

اشتیاق نے ایک دو لمحے توقف کیا پھر گمبھیر لہجہ میں کہنے لگا۔ "اسی طرح میرے باپ نے ایک دن نشہ کی حالت میں مجھے گھر سے
باہر سڑک پر پھینک دیا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف چار سال کی تھی۔ میں یقیناً مر جاتا اگر سڑک پر جہاں میں گرا اس پر ایک بڑا سا
گڑھا تھا اور میں اس گڑھے سے باہر نہیں نکل سکا اور رات کا وقت تھا اور دو ایک ٹرک پاس سے پرے گزر گئے پھر شاید میں
بے ہوش ہو گیا میری ماں دوڑ کر چیخنے لگی۔ یکایک میرے باپ کو ہوش آگیا اور وہ بھاگا بھاگا آیا اور سڑک کے گڑھے سے مجھے اٹھا
کے اپنے سینے سے لگا کے گھر لے گیا اور وہ میرا منہ چومتا تھا اور زور زور سے روتا تھا اور کبھی میری ماں مجھے اُس سے چھین کر اپنے
سینے سے لگا لیتی تھی اور کبھی میرا باپ مجھے میری ماں سے لے کر اپنی چھاتی سے لگا لیتا تھا مگر میں اس کا وہ چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا جب

اس نے مجھے فٹ پاتھ سے ہاتھوں سے اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تھا۔ اصل میں ایسا ہی ہوتا تھا اس وقت صاحب کا۔ اس لیے میں صاحب
میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

اشتیاق میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے لگا۔ جیسے اپنی گستاخی کی مجھ سے معافی مانگ رہا ہو۔

زرینہ نے اس کا حساب کر دیا۔

تین سال کے بعد جب ہمارا تبادلہ بمبئی میں ہو گیا تو وہ ہمیں بمبئی میں ملا۔ ہمیں ایک گھر کی تلاش تھی اور اشتیاق ایک ہاؤس ا
تھا اور اس کا نام اب واکرانی تھا۔ اور وہ سندھی تھا اور سندھی زبان وہ بہت فراٹے سے بولتا تھا۔ وہ کھدر کا پاجامہ اور
ایک لمبا کرتہ پہنتا تھا۔ اور پہلی نظر میں کسی متوسط کمپنی کا کلرک یا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا۔

"یہ کیا ڈھنگ ہیں تمہارے یہاں پر؟" زرینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس سے پوچھا۔

"ادھر ——— بمبئی میں بزنس کا اکثا دھندا سندھی لوگ کے پاس ہے اس لیے ہم بھی سندھی بن گیا ہے بیگم صاحب
کریں پیٹ روٹی اٹھاتا ہے۔"

"کوئی بیوی بال بچے ہے ادھر بھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ شرمندہ سا ہو گیا آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "صاحب ادھر بمبئی میں جگہ رہنا بھی مشکل ہے — ایک ایرانی
کے مالک نے ترس کھا کر میرا ٹرنک اور بستر اپنے باورچی خانہ میں رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ رات کو اس کی دوکان کے سا
پڑ رہتا ہوں۔ صبح گیارہ بجے تک اس کی دوکان میں سموسے بناتا ہوں۔ پھر رام داس ماکی جانی کے دفتر میں جاتا ہوں۔"

"یہ ماکی جانی کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"اصل میں ہاؤس ایجنٹ تو وہی ہے۔ میں اس کا دوسرا اسسٹنٹ ہوں۔"

"تم کو کیا ملتا ہے؟"

"کمیشن ملتا ہے۔"

"کتنا؟"

"ماکی جانی کو ٹوٹل فائیو پرسنٹ ملتا ہے۔ پہلے اسسٹنٹ کو فائیو پرسنٹ ملتا ہے۔" اشتیاق انگریزی بگھارنے لگے:
"ون پرسنٹ!"

"ون پرسنٹ؟" زرینہ نے پوچھا۔ "ون پرسنٹ آف واٹ! [illegible]"

اشتیاق بولے۔ "ون پرسنٹ آف دی فائیو پرسنٹ آف دی ٹوٹل فائیو پرسنٹ آف دی ہنڈرڈ پرسنٹ!"

زرینہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اشتیاق خود بھی بے حد محظوظ ہوئے۔ آخر جب زرینہ نے کسی طرح سے اپنی ہنسی
پر قابو پایا تو بولے۔

"آپ کو ایک فلیٹ دے سکتا ہوں۔"

"کیسا ہے وہ فلیٹ؟"

اشتیاق انگلی پر کمرے گنواتے ہوئے بولے: "ون بیڈ روم، ون باتھ روم، ون بیڈ روم مود، ون کچن، ون ہال اینڈ پریمیس۔"

"یہ [illegible] and Separated کیا بلا ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"یس اینڈ سپریمیس!" اشتیاق نے اس طرح حیرت سے زرینہ کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ ایم اے کرنے کے باوجود اتنی معمولی سی انگریزی نہیں سمجھ سکتیں آپ؟

"اینڈ سپریمیس؟" مجیم صاحب اشتیاق نے پھر سمجھایا۔

زرینہ نے یکایک سمجھ کر کہا۔ "اچھا تمہارا مطلب ہے آل separated rooms یعنی ہر کمرہ دوسرے سے الگ الگ ہے۔"

"یس اینڈ سپریمیس۔" اشتیاق کے چہرہ پر احساسِ برتری کی ایسی جھلک آئی گویا کہہ رہا ہو۔ اُف کتنی دیر سے بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے۔

زرینہ پھر ہنسنے لگی۔ میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا "اور بھی کچھ کام کرتے ہو؟"

"جی ہاں۔ ایک ٹوتھ پیسٹ تیار کیا ہے۔ میری ٹوتھ پیسٹ۔"

"یہ میری کون ہے۔" زرینہ نے چونک کر پوچھا۔

شرما کر بولے۔ "ایک چھوکری ہے!"

"تمہاری منگیتر؟"

جی نہیں: سر جھکا کر بولے "ہمارے ہوٹل میں ایک عیسائی بڑھیا کام کرتی ہے اُس کی چھوکری ہے۔ کوکن کے گاؤں میں اُس بڈھی نے میری کی شادی بنائی ہے۔"

"تمہارے سنگ؟" زرینہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ کسی عیسائی چھوکرے کے سنگ۔ ایلفرڈ اس کا نام ہے وہ بھی اُدھر کوکن کے گاؤں میں رہتا ہے مگر بڈھی بہت غریب ہے اس کے پاس پیسے نہیں ہے اس لیے ہم نے میری ٹوتھ پیسٹ نکالا ہے اور اس کو شام کے ٹائم میں بیچتا ہے اور اس کا پیسہ اُس بڈھیا کو جمع کر دیتا ہے۔"

"تاکہ اپنی چھوکری کی شادی تمہارے سوا کہیں اور کر سکے؟" زرینہ نے بے ساختہ ہو کر پوچھا۔

یکایک اشتیاق سٹپٹا گیا اُس کی آنکھوں کی پتلیاں جلدی جلدی گھومنے لگیں اس کے ہونٹوں کے کونے تیزی سے پھڑکنے لگے۔ گال اور بھی اندر کو دھنسے لگے اور اس کا چہرہ ایک ایسی کالی کھوپڑی کی طرح نظر آنے لگا جس پر صرف کھال ہی کھال منڈھی ہو۔

مجھے اس کو دیکھ کر بہت رحم آیا اور اس وقت تو زرینہ سے نظریں چرا کر میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہوں،
گھر گیا ہوں اور اس سے بچ نکلنے کا کہیں کوئی راستہ نہ ہو۔

میں نے جلدی سے بات کا رُخ پھیرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"شعر و شاعری جاری ہے؟"

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو ایک فلمی کہانی لکھ رہا ہوں۔" اشتیاق نے بڑے فخر سے اعلان کیا وہ اب اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔

"ہیرو کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اشتیاق!" اپنا نام لے کر بولے۔ "ڈبل رول ہے اشتیاق کا اس پکچر میں۔"

"اور ولن کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"شاید دلیپ کمار بنا جائے!" اشتیاق سوچ سوچ کر بولے۔ "ولین کا رول بہت مشکل ہے۔"

زرینہ نے ہنسی روکنے کے لیے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

"اور ہیروئن؟" میں نے پوچھا۔

"فلم انڈسٹری میں تو کوئی ہے نہیں۔" اشتیاق سنجیدہ ہو کر بولے۔ "باہر دیکھ رہا ہوں۔"

"فلم انڈسٹری میں کوئی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا جیسے اُس کا انگریزی کا فقرہ میں نے دُہرا کر پوچھا۔

even one percent of the five percent of the twenty
ive percent of the hundred percent. ؟"

"نو سر۔" اشتیاق نے سر ہلا کر کہا۔

"تو اس فلم کے گانے کون لکھے گا؟ تم نے تو شاعری ترک کر دی ہے۔"

"جی!" اشتیاق اپنے ہاتھ کے ایک ناخن کو دوسرے ناخن سے کریدتے ہوئے بولے۔ "شاعری تو چھوڑ دی ہے مگر اس فلم کے گانے تو میں ہی لکھوں گا۔ ایک گانا لکھا ہے . . . ."

"کیا؟"

نگاہیں نیچی کیے آنکھوں کے کونوں سے ڈرتے ڈرتے چور نگاہوں سے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "صاحب
بات یہ ہے کہ غزل سے نسیم صاحب نے ہم کو بہت ڈرا دیا تھا کہ اس کا وزن بہت بڑا ہوتا ہے اس لیے ہم نے غزل کو چھوڑ دیا مگر
اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا وزن چھوٹا ہو گیا ہے۔ کیا مطلب کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں اور بیچ بیچ میں میوزک ہوتا ہے۔
ہم نے ایک فلمی گیت شروع کیا ہے۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے والا۔

"تو سناؤ!" میں نے بے چین ہو کر کہا۔
اشتیاق نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔
ادھنم! ادھنم!
میں نے لیا۔
اُلّو کا جنم۔
ادھنم۔
تیرے لیے۔

زرینہ کی بُری حالت تھی مُنہ میں دوپٹہ ٹھونستے ہوئے اس کا چہرہ لال ہوتا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی روکی اور اس سے پوچھا۔

"مگر اُلّو کا جنم کیوں اشتیاق؟" روکنے کے باوجود میری ہنسی میرے سوال سے باہر چھلکی پڑتی تھی۔

"اُلّو کا جنم اس لیے صاحب۔" اشتیاق نے گہری سنجیدگی سے کہا کہ اشتیاق کو یعنی فلم کے ہیرو کو رات میں نیند نہیں آتی ہے ہیروئن کے فراق میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہیروئن کے فراق میں رات رات بھر جاگتا ہے اور اُلّو بھی رات کو جاگتا ہے اس لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بات کو سمجھیے نا ــــ ذرا سوچیے۔ کیا گہری حقیقت بیان کیا ہوں۔"

"ارے اُلّو کے پٹھے!" زرینہ نے دوپٹہ مُنہ سے نکال کر یکایک چیخ کر کہا۔ "بھاگ جا یہاں سے ورنہ اپنی چپل اُتار کر اتنے اتنے ماروں گی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

زرینہ چپل اُتارنے لگی۔
اشتیاق بھاگ کھڑا ہوا۔

اشتیاق کا کاروبار ایرانی ہوٹل والے کے ہاں خوب چمک گیا پہلے وہ صرف سموسے بناتا تھا پھر اُس نے ایرانی ہوٹل کے مالک کو انڈے پر لگا کر سے شاہی ٹکڑے بیچنے کی ترغیب دی۔

"بہت سستے میں بن جاتے ہیں سیٹھ تمہارے اِدھر ڈبل روٹی کا کتنا ٹکڑا بے کار میں پھینکتا ہے۔ ہم اس کو کام میں لائے گا۔ مالی شکر کا خرچ ہے اور تھوڑی سی بالائی۔" اشتیاق نے اُسے سمجھایا اور تمہارے پاس تین تین ریفریجریٹر ہے۔ ایک ریفریجریٹر میں شاہی ٹکڑے رکھے گا۔ گاہک کو ٹھنڈا ٹھنڈا سرو ([illegible]) کرے گا۔" ایرانی مان گیا کیونکہ خرچ بہت کم تھا اس مٹھائی کا پہلے دن اشتیاق نے جو شاہی ٹکڑا بنایا تو وہ دو آنے فی ٹکڑے کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ایسی عمدہ ڈش جس سے پیٹ بھی بھرے اور مٹھائی کی مٹھاس بھی معلوم ہو ایرانی ہوٹل میں بیٹھنے والوں نے آج تک کاہے کو کھائی تھی۔ اب تو یہ حالت ہو گئی کہ اشتیاق دن میں دو دو بار شاہی ٹکڑے تیار کرنے پڑتے اور بِکری کو بڑھتے دیکھ کر ایرانی ہوٹل کے مالک نے اشتیاق کو اپنے کچن کا ہیڈ کک مقرر

دیا [illegible] صاحب اشتیاق کو استاد جی کے نام سے پکارتے تھے اور ہوٹل کا مالک اشتیاق کو شاہی محلّے کی مناسبت سے بیچارے دل کا [illegible] تھا۔

اگر میں نے کبھی اشتیاق کے جسم اور تندرستی پر بہار آتے ہوئے دیکھی ہے تو وہ یہی دن تھے...... اس کے گال بھر گئے اور کالے تُند خدوں پر سستی کا اور اپنی جھلک تھی۔ اور وہ کشتیاں اس کی پتلیوں کی جو اس کی آنکھوں میں ہر وقت بے چین اور مضطرب ہو کر تیرتی سی رہتی تھیں اب بمبئی کے ساحل پر لنگر ڈالتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جہاں اشتیاق نے ہمیں مکان دلوایا تھا اس کے قریب کوئی ایک فرلانگ کے فاصلہ پر وہ ایرانی کا ہوٹل تھا۔ چوک کے نکڑ پر سامنے ٹیکسیوں کا اڈّہ تھا اور قریب ہی ایک نئی مارکیٹ کھل گئی تھی اس لیے صبح سے شام تک اس ایرانی ہوٹل میں بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ بوٹ پالش کرنے والے اور پان بیچنے والے اور بھیل پوری کی چاٹ بیچنے والے اور آس پاس کے گھروں اور بنگلوں کے ڈرائیور اور کاموں کے ڈھونڈنے والے اور کام کی تلاش میں گھومنے والے بے کار اور آوارہ گرد رنڈیوں کے دلال کے لڑکوں سے زیادہ ٹیڈی کا معلوم ہوتے تھے ان سب کا جمگھٹا اس ہوٹل کے اندر اور باہر رہتا تھا۔ اور اس ہوٹل میں اشتیاق بہت پاپولر ہو گیا تھا۔ آتے جاتے میں اسے دیکھتا تھا۔ سہ پہر تک تو وہ اپنے میلے کپڑوں میں کبھی کرسی کے اندر کبھی کسی کے باہر بڑی مستعدی سے کام کرتا دکھائی دیتا۔ کوئی چار بجے کے قریب وہ نہا دھو کر گیروے رنگ کا بنگالی کرتا اور اس کے نیچے کھلے پائنچوں والا پاجامہ اور چپل پہن کر ایرانی ہوٹل کے باہر آ کھڑا ہوتا۔ اس وقت اسے کام کی تلاش میں آنے والے ادھر ادھر سے بہت سے رنڈی گھیر لیتے تو وہ ادھر ادھر کے بنگلوں اور فلیٹوں میں ان لوگوں کو نوکر کرا دیتا کیونکہ وہ اس ایجنٹ کا اسسٹنٹ ہونے کی وجہ سے آس پاس کی بلڈنگوں میں اس کی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ جن لونڈوں کو وہ نوکری نہ دلوا سکتا انہیں دوسرے دن آنے کا مشورہ دے کر چلا کرتا پھر بیڑی سلگا کر ٹیک لانڈری کے مالک سے باتیں کرتا جو اس کا ہم وطن تھا یعنی مراد آباد کا رہنے والا تھا اور جس کے لیے وہ ایک نہایت ہی عمدہ اور نہایت ہی سستی قسم کا دیسی صابن بنایا کرتا تھا جس میں خرچ بہت کم ہو اور کپڑے بھی بہت عمدہ دُھل جائیں مگر اشتیاق ابھی اپنی ایجاد میں کامیاب نہ ہوا تھا۔

ٹیک لانڈری سے فارغ ہو کر وہ اپنے ہاؤس ایجنٹ کے ہاں چلا جاتا یا نئے گاہکوں کو لے کر مکان دکھانے کے لیے چلا جاتا۔ رات کو دس بجے فارغ ہو کر ایرانی ہوٹل میں کھانا کھاتا پھر ایک کپ چائے پی کر اور پھر بیڑی سلگا کر اور پان کھا کر وہ سنتو بادرچی کے جھونپڑے میں جا کر سو رہتا کیونکہ اب وہ بڑا آدمی ہو گیا تھا۔ وہ اب ایرانی ہوٹل کے باہر نہیں سو سکتا تھا۔ سنتو بادرچی کا جھونپڑا بارھویں نمبر کی سڑک کے پیچھے ایک پہاڑ کے خالی ڈھلوان پر تھا اور اس کی بیوی چونکہ اپنے بچے کی پیدائش کے لیے گڑھوال کے کسی گاؤں میں گئی ہوئی تھی اور کہیں چار ماہ کے بعد واپس آنے والی تھی، تب تک اشتیاق سنتو کے جھونپڑے میں رہ سکتا ہے سنتو نے استاد جی سے کہا تھا۔

شاہی محلّے والوں کی روز افزوں بہتری کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا تھا کہ اب اشتیاق کے قدم یہاں جم جائیں گے۔ اس لیے دو ... کے بعد مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ایرانی ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ اس نے اشتیاق کو نکال دیا ہے۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی غبن کیا؟"

"نہیں۔ آج تک ایک پیسہ کا غبن نہیں کیا۔" ایرانی ہوٹل کا مالک بولا۔

"پھر کیا کام میں گڑبڑ کرتا تھا؟"

"نہیں۔ کام تو اشتیاق بہت اچھا کرتا تھا۔"

"پھر؟"

ایرانی ہوٹل کے مالک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر جلدی سے بند کر لیا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ "اس کا بھیجا پھر گیا ہے ہم اس کو شروع میں پگار دیتا تھا وہ پگار بھی اس نے خرچ کر دیا اوپر سے پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائس کا بل ہو گیا۔"

"پانسو کپ چائے اور دو سو سلائس؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اشتیاق تو اتنا پیٹو کبھی نہ تھا وہ تو بہت ہی کم خوراک کھاتا تھا۔"

"ہم جانتا ہے اس لیے تو ہم بولتا ہے۔" ایرانی ہوٹل کا مالک خفا ہو کے بولا "وہ خود پانسو کیا سات سو کپ چائے پیتا تو ہم اس کو منع نہیں کرتا تھا مگر وہ خود نہیں پیتا تھا۔ ادھر ادھر کے بے کار اور لنگے لونڈا لوگ کو جو ادھر آجاتا جو کی بلڈنگوں میں نوکری بنانے کے واسطے آتا ہے وہ ان کو بھوکے پیٹ دیکھ کر چائے پلاتا تھا۔ جب ہم منع کرتا تھا تو بولتا تھا میرے حساب میں لکھ لو۔ اب پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائس کا بل ہو گیا۔ اس کو کس کے حساب میں لکھے گا؟ اس لیے ہم نے اس کو نکال دیا۔"

"بہت اچھا کیا۔" میں نے ایرانی سے کہا اور پیسے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک ڈبیہ کیونڈر کی دو!"

"عجب سنکی پھر گیا ہے اس کا۔" ایرانی نے میرے پیسے گنتے ہوئے کہا۔ "دو پیسہ کم ہے۔"

"سوری" کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے دو پیسے اور دیے اور کیونڈر کی ڈبیا لے کر اس سے پوچھا۔ "تو آج کل وہ کہاں پر ہے؟"

"جیل میں ہے۔"

"جیل میں؟" میں حیرت سے ایرانی کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم نے اس بے چارے کو جیل بھجوا دیا۔"

"ہم نے کہاں بھجوایا ہے صاحب۔ وہ تو اپنی کرنی سے گیا ہے۔ شراب کی سمگلنگ کے دھندے میں۔"

"اچھا۔ یہ دھندا بھی اس نے شروع کر دیا تھا۔"

"وہ تو یہ دھندا نہیں کرتا صاحب۔ مگر ہمارا باورچی سنتو اپنے کھالی ٹائم میں یہ دھندا کرتا تھا اور ادھر ادھر کی بلڈنگوں میں بوتل پہنچاتا تھا۔" ایرانی بولا۔ "پھر ایک رات پولیس نے اس کے جھونپڑا پر چھاپہ مارا جو مال پکڑا گیا تو اشتیاق بولا کہ سنتو کا نہیں ہے۔ میں نے یہ بوتل شراب کا ادھر رکھا تھا اس واسطے اشتیاق کو تین مہینے کی سزا ہو گئی ہے۔"

"اس نے ایسا کیوں بولا؟"

"وہ بولا۔ ہمارا کیا ہے ہم اکیلا آدمی ہے تین مہینے کا جیل جلدی کاٹ لے گا۔ مگر جب سنتو کا گھر والا اپنے بچے سنتو کے بغیر تین مہینے کیسی جھونپڑا کا حال دیکھ کر رہے گی؟"

ایرانی ہوٹل کا مالک اپنے سر پر انگلی رکھ کے بولا: "بھیجا پھر گیا ہے اس کا۔"

زرینہ کو خیال تھا کہ جیل سے رہا ہوتے ہی اشتیاق ہمارے گھر آئے گا۔ لیکن جب تین ماہ سے اوپر کئی دن گزر گئے اور اشتیاق نہ آیا تو مجھے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ مایوسی بلکہ بے بسی بھی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ اشتیاق اگر ہمارے گھر نہیں آسکتا تو ممکن ہے ادھر ادھر ایرانی ہوٹل کے باہر ضرور دکھائی دے گا۔ پر ادھر بھی نہیں۔ سنتو بابو جی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ان کے ہاں بھی نہیں آیا۔ پھر ہم نے سوچا ممکن ہے اشتیاق شرم کے مارے یہ علاقہ ہی چھوڑ گیا ہو یا بمبئی سے کہیں باہر چلا گیا ہو۔ جب دو ڈھائی ماہ اور گزر گئے اشتیاق نہ آیا تو ہمارا یہ خیال پکا ہو گیا۔

پھر ایک روز۔ ہم نے یکایک اُسے ایک دعوت میں دیکھا۔ سردار زور آور خان کے ہاں ہماری دعوت تھی جن کی بیوی نصرت خانم میری بیوی کی خاص سہیلی تھی۔ ہم تو کھانے کے شروع کے دو لقمے کھاتے ہی سمجھ گئے کہ یہ کس کا شاہکار ہے۔ پہلا لقمہ کھاتے ہی میں نے زرینہ کی طرف اور زرینہ نے میری طرف چونک کر دیکھا مگر ہم دونوں چپ رہے۔ کھانے کے بعد جب دعوت ختم ہونے لگی تو کچن سے خراماں خراماں اشتیاق برآمد ہوئے۔ کالی پتلون کے اوپر لال بش شرٹ اور لال بش شرٹ کے اوپر بھورے رنگ کا ایک میلا ایپرن پہنے ہوئے اور سر جھکا کر کورنش بجا لاتے ہوئے شاعروں کے انداز میں داد وصول کرنے لگے۔

نہ میں نے نہ زرینہ نے اُس وقت انہیں پہچاننا مناسب سمجھا۔ اشتیاق نے بھی اس وقت ہمارا رویہ دیکھ کر مکمل اجنبیت اختیار کی۔

بعد میں نصرت نے زرینہ کو الگ لے جاکے بتایا۔ بہت اچھا کک مل گیا ہے مجھے۔ اشتیاق احمد خان نام ہے اس کا۔ طرف کا ہے قاضی خیل کا۔ پشتو بہت اچھی بول لیتا ہے حالانکہ بچپن ہی سے ادھر رہا ہے پھر کھانا تو غضب کا پکاتا ہے۔ کچن میں بڑی بچت سے کام لیتا ہے۔ جب سے یہ آیا ہے میرے کچن کا خرچ ڈھائی سو روپے کم ہو گیا ہے۔ پورے ڈھائی سو روپے۔ سنتی ہو! اس کو صرف ستر دیتی ہوں حالانکہ سو بھی دوں تو سستا رہے گا۔

زرینہ انجان بن کر بولی۔ "آدمی تو شریف معلوم ہوتا ہے۔"

"ارے شریف ایسا شریف!" نصرت اشتیاق کی تعریف کرتے ہوئے بولیں۔ "میرے بچوں پر تو جان چھڑکتا ہے اور سب سے چھوٹے بچے کو تو دل و جان سے چاہتا ہے۔ کوئی سگی ماں بھی کیا خدمت کرے گی جیسی وہ بچے کی کرتا ہے۔ ابھی چار دن کی بات ہے بچہ موٹر مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا لا دوں گی۔ میں ٹال رہی تھی کیونکہ گھر میں دو کھلونے موٹروں کے پہلے سے پڑے ہیں پرانے ہو گئے ہیں ذرا تو کیا ہوا۔" نصرت زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے بولی۔ "یہ مردا اشتیاق دس روپے کی موٹر میرے بچے کے لے آیا تو میں نے غصے سے جھلا کر کہا "میں تو اس موٹر کے پیسے نہیں دوں گی تم مرو جاؤ۔" دیکھیے بیگم صاحب میں تو اپنے پیسوں کی موٹر لایا ہوں بچے کے لیے۔" اس پر وہ غصے سے گرجا کر بولے۔ "تو تم سے کس نے کہا تھا بچے کے لیے موٹر لانے کو؟" تو اشتیاق چپکے تو اُن کی گرج سن کر سہم گیا جیسے سر اٹھا کر بولا۔ "صاحب میں بچے کا کہنا نہیں ٹال سکتا۔ وہ جو کہیں گے میں ضرور لے کر آؤں گا۔"

اس نے ایسے مضبوط لہجے میں ان سے بات کی کہ اُن کا سارا غصہ اتر گیا۔ مسکراتے ہوئے ایک طرف کو سرک گئے میں

"بی کیا بولتی بہن" چُپ ہو کر سروتے سے سپاری کاٹنے لگی۔

زرینہ خاموشی سے مُسکرا مُسکرا کر نصرت کی باتیں سُنتی رہی مگر اُس نے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اشتیاق کو جانتی ہے۔ نہ اگلے ایک سال میں اشتیاق نے ایک بار بھی بتایا کہ وہ ہم لوگوں کو پہلے سے جانتا ہے۔ ہم نے سوچا بے چارہ جہاں لگا ہے لگا رہے اس کی خامیاں جتانے سے کیا فائدہ؟ ادھر یہاں دور دور خان صاحب کے ہاں رہ کر اشتیاق بہت ٹھیک ہو چلا تھا بال اُلجھے ہوئے نہیں لگتے تھے۔ ذہنی طور پر بہت کم غائب رہتا تھا کپڑے صاف ستھرے پہنتا تھا۔ شعر و شاعری ترک کر دی تھی۔ دن بھر یا تو کچن میں رہتا یا خان صاحب کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا حالانکہ اُن کی دیکھ بھال کے لیے دو آیائیں الگ سے مقرر تھیں مگر بچے جس قدر اشتیاق سے مانوس ہو گئے تھے اتنے گھر کے کسی دوسرے ملازم سے نہ تھے۔ میں نے اور زرینہ نے شکر کا سانس لیا۔ "چلو۔ یہ اشتیاق نارمل تو ہوا۔"

ایک رات زور کی گھنٹی بجی کوئی تین بجے کا وقت تھا میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا باہر سردار زور آور خان کا ڈرائیور رحمان کھڑا تھا۔

"حضور جلدی چلیے۔ بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔"

"کیا بات ہے رحمان؟" میں نے پوچھا۔

"اشتیاق نے زہر کھا لیا ہے!"

"اَرے" میرے مُنہ سے نکلا

"ہاں صاحب۔ اشتیاق نے زہر کھا لیا ہے اور خان صاحب پونا میں ہیں گھر پر بیگم صاحب کے دو بھائی ہیں مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ ڈاکٹر مقصود کو ٹیلیفون کیا تھا بیگم صاحب نے مگر وہ بولے یہ پولیس کیس ہے۔ میں نہیں آ سکتا۔ اور اشتیاق مر رہا ہے۔"

زرینہ میرے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لرزتے ہوئے لہجہ میں بولی۔ "تم جلدی سے چلے جاؤ بے چاری نصرت سخت پریشان ہو گی۔"

خان صاحب کے ڈرائنگ روم کے عین مرکز میں فرش پر سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ایک لاش رکھی تھی اور نصرت اور اُن کے بھائی بہن اور گھر کے دوسرے ملازم حیرت سے گم سُم کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا مر گیا؟" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"جی نہیں ابھی تو زندہ ہے!" ایک آیا آہستہ سے سسکتے ہوئے بولی۔

میں نے جھک کر نبض دیکھی سینے کے زیر و بم میں زخرے کی گھر گھراہٹ تھی اور نبض ڈوب رہی تھی۔ نصرت ایک بھدی شال اوڑھے زیادہ پریشان چہرہ لیے بیٹھی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"کب اس نے زہر کھایا؟" میں نے نصرت سے پوچھا۔

نصرت کچھ نہیں بولی۔ جیسے اس نے میرا سوال سُنا تک نہ ہو۔

[illegible] پھر سناٹا چھا گیا ہوا۔ کوئی دو بجے کے قریب میں نے اپنے بستر کے قریب کسی کی آواز سنی۔ کوئی آہستہ آہستہ سے مجھے
جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا۔ جب جاگا تو معلوم ہوا اشتیاق ہے۔ وہ اندر چوکھٹ سے رینگتا ہوا میرے کمرے میں پہنچا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا
"مجھے بچائیے میں نے زہر کھا لیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کون سا زہر؟"

"ہوں۔ ٹیک ٹو۔"

"کتنا پیا؟"

"کم تو ہے ٹیک ٹو۔" اس کی زبان زہر سے موٹی ہو چکی تھی اور آواز میں لکنت تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا ٹیک ٹوئنٹی لیکن اس کے منہ سے نکلتا تھا صرف ٹک ٹو۔ پھر وہ میری چارپائی سے لگ کر قے کرنے لگا۔ میں نے مزید داستان سننا بیکار سمجھ کر فوراً کہا۔ "اسے اٹھا کر نیچے کار میں ڈالو۔ ہسپتال لے جائیں گے۔"

"مگر پولیس۔" نصرت کانپ کر بولی۔

"پولیس کو وہیں سے اطلاع کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "نزدیک کا ہسپتال کون سا ہے؟"

"[illegible]"

"یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"کوئی چار میل۔"

"جلدی چلو۔"

جس وقت چار آدمیوں نے مل کر اشتیاق کو پہلی منزل سے نیچے اتارا اس وقت ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے کے روشنی کے قمقمے پانی میں بھیگے ہوئے یوں سر جھکائے کھڑے تھے جیسے اپنی زرد زرد زندگی پر رو رہے ہوں۔ بھیگی ہوئی سڑک پر کہیں کہیں روشنی کے چھینٹے سے نظر آتے پھر اندھیرا انھیں کھا جاتا پھر ٹیکسی ویران گڑھوں کی ماری ہوئی ایک سڑک پر کلابازیاں کھا کر چلنے لگی جیسے ایک عورت اپنی عصمت لٹا کر رات کی اوٹ میں اپنے گھر کی طرف بھاگ رہی ہو۔

ایمرجنسی وارڈ میں!
اسے فارم بھرو!
یہ فارم بھرو!
سبھی فارم بھرو!
زندگی بھر یہی کرو!!

اشتیاق کا سر بھورے رنگ کے کمبل [illegible] کسی گہرے گڑھے میں جا گرے ہیں ایسا لگا

زن گھُوں گھُوں کرتا ہوا چل رہا ہے۔

پچھتر روپیہ ایڈوانس دو۔

یہ رسید لو۔

وھیل۔ مریض کو کمرہ ۸ میں لے جاؤ اُوپر۔ لفٹ سے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو تمھاری کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔

باہر سے کوئی ٹرک گزرتا ہے۔

گھُوں گھُوں۔

اشتیاق کا سینہ ہونکتا ہے۔

ہُوں ہوُں۔

آہنی کلائی کا مُڑا بستر اپنے پایوں میں لگی ہوئی ربڑ کی چرخیوں کے ذریعہ لفٹ کی جانب حرکت کرنے لگتا ہے۔ لفٹ اُوپر کی ... پر جا کے رُک جاتی ہے۔ بستر برآمدے میں سے گزر رہا ہے کمرہ نمبر سات کے اندر جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں۔ ... سترے کا پردہ گرا دیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں اور ہم باہر بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

ہسپتال ... بیڈ وارڈ میں بے آواز نرسیں خاموشی سے گھوم رہی ہیں۔ اردلی نیند کی غنودگی سے بیزار ٹہل رہے ہیں۔ کہیں کوئی ہولے ہولے کراہتا ... ت رونی دھیرے دھیرے سسکتا ہے۔

"اشتیاق نے زہر کیوں کھایا؟" میں پُوچھتا ہوں۔

"نہیں کیا ہوگا۔" نصرت کا چھوٹا بھائی اندازہ لگا کے کہتا ہے۔

"بہن نے ہوتے ہوئے گھر کا سارا خرچہ اشتیاق کے سپرد کر دیا تھا۔ ہر وقت چار پانسو روپے اشتیاق کی جیب میں رہتے تھے۔ ... نے اشتیاق سے حساب دینے کو کہا تھا۔ آج اُس نے زہر کھا لیا۔ میرا خیال ہے کہ . . . ."

"تمھارا خیال غلط ہے۔" نصرت کا دُوسرا بھائی بولا۔ "اشتیاق میں دس برائیاں ہوں گی مگر وہ چور نہیں ہے۔ آج تک اُس نے ایک دھیلے ... میرے خیال میں پچھلے ہفتے جو مُرادآباد سے اُسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے آبائی مکان والے مقدمہ کا فیصلہ اُس کے خلاف ہوا ... ت سو ہو گیا ہے اس کا غم اُسے بہت ہوا ہے۔"

"ایسی نہیں۔" بڑا ماما اپنی گھنی بھنوؤں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "اشتیاق کو مکان دوکان روپے پیسے سے کبھی محبت نہیں۔ ... سب میں ... اور نصرت۔ گلشن کا؟"

"گلشن؟" میرے کان کھڑے ہو گئے۔ گلشن کون ہے؟ میرے ذہن میں ایک بتی کوندنے لگی . . . . .

"... یار کی ہے صاحب بڑی بدصورت لونڈیا ہے مگر سولہ سترہ برس کی ہے۔ بھاگ بھاگ کر کام کرتی ہے۔ اس کا نام گلشن ہے ... ہم نے سنا ہے کہ اشتیاق کی پہلی بیوی کا نام بھی گلشن تھا۔"

... سے۔ میں چونک گیا۔

[illegible] سے اس [illegible]

اور تم کہاں کہاں سے گولی کھاؤ گے [illegible] ہو۔ اگر کسی طرح سے یہ ظاہر ہو جائے [illegible] پہلے تم نے [illegible]

ایک [illegible] کو دم سے باندھ کر اس میں لٹکا دیا۔ پھر [illegible] ہے کہ تم نے اس [illegible] میں آگ لگا دی اور [illegible]

[illegible] ہو۔ تم میری [illegible] چیٹ جاتے ہو اور خود [illegible] گھر [illegible] دوسروں کے [illegible] اپنے بچوں کی [illegible]

[illegible] سے محبت کرتے رہے مگر تم گلشن کو کبھی بھلا دو گے۔ اور کسی طرح یہ [illegible] ہو سکا۔ گلشن گلشن تم [illegible]

جو ایک [illegible] سے دوسرے [illegible] کو [illegible] ہو گئے ہو۔ [illegible] تم اس [illegible] مرد ایک عورت کی محبت [illegible] ہے...

چلے!

نرس اندر آگئی۔

میں نے ایک [illegible] اشتیاق کے [illegible] خاموش [illegible] ہوئے [illegible] چہرے کو دیکھا [illegible] کو [illegible] سے [illegible]

[illegible] ہوئے [illegible] اور [illegible] پہنچتے ہونے چلے گئے..... میں کمرہ سے باہر نکل آیا۔

نسیم منزل

شوکت تھانوی

——— شکور میاں خود ہی بڑبڑا رہا ہے ———

شکور: (خود ہی بڑبڑاتے ہوئے) واہ جی واہ۔ بڈھے ہوگئے شکور میاں تم بھی اسی ڈیوڑھی پر۔ اپنی بات تو پوری کر دکھائی۔ جب نوکری کرنے آئے تھے تو یہی کہا تھا کہ اب جنازہ ہی اٹھے گا اس گھر سے اپنا۔ تو اب جنازہ اٹھنے میں کسر ہی کیا رہ گئی ہے۔ اس عمر میں تو موت سر ہی پر منڈلاتی رہتی ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ مگر اتنے ہی دنوں میں کیا کچھ نہیں دیکھا تم نے شکور میاں۔ من برستا دیکھا اس گھر پر۔ گھوڑے کھولے جاں دیکھے۔ پھر جوانوں کے کرتوت دیکھے۔ دونوں ہاتھوں سے دولت اڑائی گئی۔ بڑے صاحبزادے نے پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھا۔ ایسے جو قاروں کا خزانہ ہو تو وہ بھی خرچ ہو جائے۔ آخر یہ حال ہو گیا کہ مکان کرائے پر اٹھ رہا ہے۔ کرایہ پر نہ اٹھے گا تو بک جائے گا۔ اب بڑے بھائی کہتے ہیں۔ پگڑی لو۔ سال بھر کا کرایہ پیشگی لو۔ چھوٹے بھائی کہتے ہیں کہ یہ ڈکیتی ہے مگر کوئی پوچھے شکور میاں تم کون۔ تین میں نہ تیرہ میں نہ سُتلی کی گرہ میں ———

نسیم: (آواز آتی ہے) شکور۔ شکور بابا۔

شکور: (بلند آواز سے) حاضر سرکار۔ آرہا ہوں۔ (پھر بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے) شکور کو بیٹھنے نہ دینا دو گھڑی۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں اس بڈھے کو کر سیدگی نہ ہو جائے اگر اس کی تھکن دور ہو گئی تو ایک روٹی نہ کھلے۔ یہ پیٹ بھی اندھیرے منہ اٹھو اور پھر آدھی رات تک آپ لوٹتے جاؤ بے لوٹے ...... (بلند آواز سے) مجھے بلایا تھا میاں؟

شمیم: جی ہاں۔ کلیم میاں سے کہیے کہ ذرا میرے کمرے میں آئیں۔

شکور: بہت اچھا (جاتا ہے) کوئی پوچھے یہی آواز کلیم میاں کو بھی دے سکتے تھے جو شکور کو دی گئی ہے۔ مگر کلیم میاں کو آواز دیں ان کے دشمن جب ان کو دوڑانے کے لیے شکور موجود ہے تو اس سے کام کیوں نہ لیں۔ دو وقت کی روٹی اور بیس روپے مہینہ مفت ہی تھوڑی دیے جاتے ہیں۔ ان داموں [illegible] اسی لیے تو باندھا جاتا ہے کہ وہ بس چلتا رہے چلتا رہے اور چلتے چلتے گھس کر رہ جائے۔ پھر تو کبھی ایسا ہو کہ جنازہ ہی جائے گا اس گھر سے چھوٹے میاں۔

کلیم: کیا بات ہے شکور بابا۔

شکور : [illegible] نے کہا، کہ نہیں فرمایا ہے کہ آپ اُن کے کمرے میں آجائیں۔ آجائیں نہیں تشریف لے آئیں۔
کلیم : [illegible]۔ میرے لیے آپ اس تکلف کی تکلیف نہ فرمایا کریں۔ شاید آپ بھول جاتے ہیں کہ آپ نے مجھے گودوں کا
بستر ہے میں جا رہا ہوں۔
شکور : تو پھر میں بھول جاؤں گا ان کو گودوں کھلانا۔ تو یہی رہتا ہے تاکہ کہیں یہ نہ بھول گئے ہوں۔ بابو کرکا کیا ہے
نوکری کر کے سب چھوٹا بن جاتا ہے۔ شکرا دو تو بہتر ہو تو دیتا۔ اماں تمہاری بھی کیا باتیں ہیں شکور میاں۔ سٹھیا
ہو۔ دنیا کون سمجھتا ہے، نوکر بس نوکر ہی ہوتا ہے، سویرے سے یہ وقت آیا تم نے لوجو تختہ تھوڑا تک ہو
اگر ہم جل نہ گئی ہو تو شاید تختہ نصیب ہو جائے نہیں تو پھر سے بھر دو اور جب ہم تھکے تو پھر آواز دے شکور۔ تم
میاں شکور تم پر بھی ہو۔ تم آدمی تھوڑی ہو کو بھے کے بیل ہو۔
علیم : مجھے بُو یا تھا بھائی جان آپ نے۔
شمیم : بھئی وہ کیا ہے ہوا اُن صاحب سے جو مکان دیکھنے آئے تھے؟
کلیم : اُن کو مکان پسند ہے کرایہ نامہ بھی لکھنے کو تیار ہیں۔ آدمی بھی شریف معلوم ہوتے ہیں۔
شمیم : صاحب اُن کی شرافت کو لے کر کیا ہمیں چاٹنا ہے۔ تم کونسی اُن سے رشتہ داری جوڑ رہے ہیں کہ آپ اُن کا حسب
نسب لے کر بیٹھ گئے۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ سال بھر کا پیشگی کرایہ اور کرایہ کے علاوہ دو ڈھائی ہزار دینے پر آمادہ
ہیں یا نہیں۔
کلیم : یہ بات میں نے اُن سے نہیں پوچھی۔
شمیم : پھر آپ نے پوچھا ہی کیا؟ صرف ان کے خاندانی حالات؟ جواب نہیں ہے آپ کا بھی کلیم میاں۔ پوچھنے اور [illegible]
کی جو باتیں تھیں وہی آپ چھوڑ گئے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ باتیں آپ نے کیوں نہیں پوچھیں؟
کلیم : اس لیے کہ میں ان باتوں کو جائز نہیں سمجھتا۔
شمیم : کیا مطلب؟ کمال کرتے ہیں بخدا آپ بھی۔ بھائی میرے آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مکانوں کی اتنی قلت ہے اور کرایہ داروں
کی اتنی کثرت کہ ہم جو مطالبہ بھی اُن کے سامنے رکھیں وہ ہاتھ جوڑ کر اس کو منظور کریں گے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ یہ
عنایت کیا کم ہے کہ ہم ان کو رہنے کے لیے مکان مہیا کر رہے ہیں جس کا وہ خواب بھی نہ دیکھ سکتے۔ اب آپ چاہتے
ہیں کہ ہم صرف ایک مہینے کا کرایہ لے کر مکان اُن کے حوالے کر دیں۔
کلیم : ہونا تو یہی چاہیے اور جائز طریقہ تو یہی ہے۔ مگر آپ ضرورت مندوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اُن کا خون چوسنا
چاہتے ہیں۔ میں اس کو غلط سمجھتا ہوں۔ پگڑی کا ناجائز مطالبہ کم سے کم مجھ سے ممکن نہیں ہے۔
شمیم : بھئی حد کر دی آپ نے بھی۔ میرے بھائی صرف یہی طریقہ ہے کہ ہم مکان کی فوراً مرمت بھی کرا سکتے ہیں۔ اور [illegible]
بھی ادا کر سکتے ہیں۔ ارے بھئی ڈھائی ہزار نہ سہی ڈیڑھ ہزار سہی مگر کچھ نہ کچھ تو لینا ہی چاہیے۔

کلیم : بہرحال یہ تو اصولی اختلاف ہے۔ میں اس کو اصولاً زیادتی بلکہ مجرمانہ زیادتی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک تو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار جو کرایہ مقرر کیا گیا ہے وہی بہت زیادہ ہے اس زیادتی کے بعد یہ زیادتیاں جو آپ فرما رہے ہیں اصولاً یا قانوناً کسی حیثیت سے بھی جائز نہیں۔

شمیم : موقع سے فائدہ نہ اُٹھانا میرے نزدیک حماقت ہے۔ اس وقت سب ہی یہ کر رہے ہیں۔ ہمارے پڑوسی میر صاحب ہی ہیں اپنے دو مکان پگڑی پر اُٹھا کر تیسرا مکان بنوا رہے ہیں یا نہیں۔ جب سب ہی پگڑی لے رہے ہیں تو آپ کو کیا پس و پیش ہے۔

کلیم : پس و پیش صرف یہی ہے کہ یہ جرم ہے اور جرم بھی ایسا کہ میری طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی۔

شمیم : بہتر ہے۔ آپ یہ قصہ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں یہ مکان بھی اُٹھائے دیتا ہوں کرایہ پر اور پیشگی اتنی رقم بھی لیے لیتا ہوں کہ بغیر کسی انتظار کے فوراً ہی اس کی مرمت بھی شروع ہو جائے اور اس کا حلیہ بھی بدل جائے۔

کلیم : میری رائے یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ ابا جان سے مشورہ کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خود اس طریقے کو پسند نہ فرمائیں گے۔

شمیم : پھر وہی ابا جان۔ صاحب ہزار مرتبہ آپ سے کہا ہے کہ ابا جان کو آپ ہر معاملے میں نہ لایا کریں ان کو بیٹھا رہنے دیجیے اپنے گوشۂ عافیت میں۔ وہ کیا جانیں کہ ہوا کا رخ کیا ہے انھیں کیا معلوم کہ دنیا ان کے زمانے سے کس قدر مختلف ہو چکی ہے۔ اس دنیا سے نمٹنا اب ہمارا کام ہے ان کا نہیں۔

کلیم : جب میرے اور آپ کے درمیان اتنا واضح اصولی اختلاف موجود ہے تو فیصلہ ابا جان ہی کر سکتے ہیں۔

شمیم : چھوڑیے بھی چلیے وہاں سے اصول اور اختلاف سے کہ جائیے بھائیوں میں کہیں اختلاف ہوتے ہیں۔ جب ہزاروں روپے کے نوٹ ہاتھ میں پھڑپھڑائیں گے یہ سب اختلاف ختم ہو جائے گا۔

کلیم : آپ غلط سمجھ رہے ہیں بھائی جان نوٹوں کی اس سے وزنی گڈی ہی فرار ڈال کر مل سکتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ وزنی گڈی قتل کر کے مل سکتی ہے اگر جرم ہی کرنا ہے تو نوٹوں کی گڈیوں کے لیے کرنا ہے تو۔ ایک جرم ہی کیوں کیا جائے کوئی بڑا ہاتھ مارنے میں کیا مضائقہ ہے۔

شمیم : آپ کے خیال میں اپنے مکان کو پگڑی پر اُٹھانا اور اپنے مکان کا پیشگی کرایہ لینا گویا ڈکیتی اور قتل قسم کے جرائم کی صف میں آ گیا ہے۔ کمال ہے صاحب بھائی میرے روپے کی ہم سب کو شدید ضرورت ہے ورنہ ڈھل جائیں گے۔ سچ پوچھو تو میں اسی ایک ترتیب کی وجہ سے مکان کرایہ پر اُٹھانے کے خیال سے متفق ہو گیا ورنہ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار بھی بھلا کوئی رقم ہے۔

کلیم : سو باتوں کی ایک بات یہ ہے بھائی جان کہ اگر آپ کو یہ مکان پگڑی پر اُٹھانا ہے یا اس کا سال دو سال کا کرایہ پیشگی لینا ہے تو میں نہایت ادب کے ساتھ معافی چاہتا ہوں میں اس میں شریک نہ ہوں گا۔

شمیم : بہتر ہے نہ پڑیے آپ بیچ میں اور اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ ابا جان ہی کو اس سلسلے میں فیصلہ کرنا چاہیے تو بہ رضا مجبوری

میں بیمار ہوں ورنہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابا جان کو خواہ مخواہ یہ زحمت دی جائے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہم بھائیوں میں آ[پس میں]
اتفاق نہیں ہے۔

کلیم : اگر اتفاق اسی طرح نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں باہم سازشیں نہیں کر سکتے تو بہت مبارک ہے یہ اختلاف۔

شمیم : خیر میں آپ سے یہ حکیمانہ پند و نصائح سننا نہیں چاہتا۔ آپ بے شک ابا جان سے کہہ دیں کہ میں پیشگی کرایہ وصول کرنے کی تائید میں ہوں اور کچھ مزید روپیہ بھی چاہتا ہوں بلکہ آپ یہ زحمت کیوں فرمائیں میں خود بات کیے لیتا ہوں (جا[تا] ہے۔)

شکور : (بڑبڑاتا ہے) کچھ نہیں رہا ہے اب لے دے کر یہ ایک کھنڈر رہ گیا ہے اب اس پر دانتا کل کل ہو رہی ہے۔ بڑے صاحبزادے کا بس چلے تو کمبل ڈال کر لوٹ لیں ہر ایک کو سے اور چھوٹے میاں کے بس میں ہو تو ساری دنیا کو سمیٹ لیں گھر میں کہ گھر میں ملتا ہے تو دیہ ہے مگر شکور میاں سچ پوچھو تو دونوں ہی کا جواب نہیں پر تم کون شکور میاں۔ تین میں نہ تیرہ میں سُتلی کی گرہ میں۔ تم یہ باتیں سوچتے ہی کیوں ہو دیکھا شکر کرو نمک کھانے کا بی بی جی بی بی جو حید آئی۔ بی بی جو نہیں کرم آئی تو تجھ سے کیا۔ مُردار تیرے لیے تو وہی پاؤ بھر کی روٹی اور چولہے کا ساگ ہے۔

شمیم : (دور سے آواز دیتا ہے) شکور۔ شکور۔ !!

شکور : حاضر ہوا میاں۔

شمیم : (آواز دے کر) چھوٹے میاں کو بھیج ابا جان یاد فرماتے ہیں۔

شکور : (جند آ مانے) بہت اچھا (پھر بڑبڑاتا ہے) یاد فرماتے ہیں مطلب یہ کہ جوتے ہیں چھوٹے میاں بھی کوئی سبق ہیں کہ ان کو یاد فرمایا جائے۔ آدمیوں کی طرح یہ نہیں کہتا ابا جان بلاتے ہیں اس زبان کو تو شکور ہی سمجھتا ہے کوئی نیا نوکر ہے تو خود یاد کر رہ جائے ان باتوں کا مطلب۔ ارے میں نے کہا چھوٹے میاں حضور یاد فرماتے ہیں آپ کو۔

کلیم : کون ابا جان؟ میں اسی طرف جا رہا تھا۔

شکور : (پھر بڑبڑاتا ہے) اب سے کریں گے باوا جان کو کون ٹھیک کہتا ہے۔ میں ہوتا ان کی جگہ تو اس ٹھیکرے کو بیچ باچ کر سب کا حصہ دے دیتا اور خود الگ بیٹھ کر کرتا اللہ اللہ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بڑا بیٹا تو اڑائے گل چھرے اور چھوٹا رہ جائے منہ دیکھتا۔ پر تجھے کیا شکور میاں تم تین میں نہ تیرہ میں ستلی کی گرہ میں (دروازے پر دستک)

مولوی صاحب : تشریف لائیے۔ بیٹھے رہیے کلیم میاں۔ بیٹھ جائیے اپنے بھائی جان کے برابر۔ مجھے ابھی شمیم میاں سے معلوم ہوا کہ آپ کرایہ دار رکھنے کے سلسلے میں اب کچھ پس و پیش کر رہے ہیں۔

کلیم : جی نہیں تو۔ یہ تو میری ہی تجویز تھی میں پس و پیش کس طرح کر سکتا ہوں۔ البتہ بھائی جان کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ کرایے کے علاوہ کرایہ دار سے ایک معقول رقم پگڑی کے طور پر بھی لی جائے اور کرایہ بھی کم سے کم ایک سال کا پیشگی وصول کیا جائے۔

مرزا صاحب: پگڑی؟ یہ خیال آپ کو کیسے آیا شمیم میاں۔ میرے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ اس حد تک آپ کا ذہن رسا پہونچ سکتا ہے۔

شمیم: ابا جان میں خود پگڑی اور پیشگی کرایہ کی تائید میں نہیں ہوں مگر خیال صرف یہی تھا کہ اس طرح ہم مکان کی فوراً مرمت کرا سکتے ہیں۔ اور کرایہ دار سے جو کرایہ وصول کر رہے ہیں مکان اس کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ پگڑی کی تائید میں نہیں ہیں۔ تو ایک سال کا کرایہ ہی پیشگی مل جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

مرزا: آپ کے نزدیک یہ بجائے خود ایک قسم کی پگڑی نہیں ہے؟

شمیم: ابا جان آج کل عموماً یہی ہو رہا ہے۔ اور مکان کے متلاشی اس سے زیر بار نہیں ہوتے بلکہ ان کو خوشی ہوتی ہے کہ نہ صرف مکان مل گیا بلکہ اس استحکام کے ساتھ ملا ہے کہ اب گویا سال بھر تک ان کو مالک مکان بے دخل نہیں کر سکتا۔

مرزا صاحب: ان کو جس قسم کی مسرت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ آپ ان کی جگہ پر ہوں جب ہی کر سکتے ہیں۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں کہ تقریباً دو ہزار روپیہ یکمشت آپ کو دے کر کوئی خوش ہو سکتا ہے۔

شمیم: ابا جان یہ پیش کش خود حکیم صاحب کی طرف سے ہوئی ہے کہ ہم سال بھر کا پیشگی کرایہ لے کر مکان اُن کی مرضی کے مطابق بنا دیں۔

مرزا صاحب: یہ غلط ہے میں مکان کرایہ پر دے رہا ہوں اپنی مرضی کرائے پر نہیں دے رہا ہوں۔ اس مکان کی مرمت میری مرضی کے مطابق ہوگی۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ سال بھر کا پیشگی کرایہ لے کر ہم سال بھر کے لیے کرایہ دار کی مرضی کے غلام بن جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ جو شخص یکمشت اتنی بڑی رقم دے گا اس کے مطالبات کس قدر سخت ہوں گے۔ دو ہزار کی رقم پر تو آپ ریجھ گئے مگر یہ اندازہ نہ کیا کہ اس کے بعد کرایہ دار کی فرمائشوں کی تعمیل سال بھر کا کتنا شدید اور مسلسل عذاب ہوگا کہ آج غسل خانوں میں فیش کا اہتمام کر دیجیے۔ آج باورچی خانے میں پنکھا لگا دیجیے۔ اس کمرے کا رنگ فیروزی ہو۔ اور اُس کمرے کا شہابی۔

شمیم: ابا جان ان میں سے کوئی مطالبہ ان کی طرف سے نہیں ہے وہ تو صرف معمولی مرمت اور قلعی چاہتے ہیں۔

مرزا صاحب: جی ہاں میں جانتا ہوں ابھی کوئی مطالبہ اس لیے نہیں ہے کہ ان کو صرف مکان کی ضرورت ہے مگر جب مکان مل جائے گا تو ان کو زیب و زینت نئی آسائشوں اور آرائشوں کی ضرورت بھی ہوگی اس کے علاوہ جس سے ہم اتنی بڑی رقم یکمشت لیں اس کے لیے اہتمام کرنا بھی ہمارا فرض ہو جاتا ہے۔ پھر آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ سال بھر کا کرایہ تو آپ یکمشت لے کر خرچ کر دیں گے اس کے بعد کیا ہوگا۔ سال بھر تک ضروری مرمت کہاں سے ہوگی۔ ہم کو یقیناً یہی محسوس ہوگا کہ ہم نے آدھا مکان بھی کرایہ پر اُٹھا دیا اور اب خود اپنی گرہ سے اس کی دیکھ بھال پر روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے یہاں ضرورت کے لیے روپیہ پس انداز کرنے کا نہ طریقہ ہے نہ سلیقہ لہذا میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ آپ سال بھر کا کرایہ پیشگی وصول کر کے اپنے مصائب میں اور بھی اضافہ کر بیٹھیں۔

شمیم : [illegible]

کلیم : میری [illegible] کہ حکیم صاحب یا جو کرایہ دار بھی آنا چاہے اس سے ہم پیسے کرلیں کہ سال بھر میں ایک مہینے کا کرایہ اس مکان کی مرمت پر صرف ہوا کرے گا۔

[illegible] : ہونا تو یہی چاہیے مگر چونکہ مکان کافی مرمت طلب ہے لہٰذا فی الحال بجائے ایک مہینے کے دو مہینے کا کرایہ مرمت پر صرف ہوگا مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ دو مہینے کا کرایہ پیشگی لیا جائے۔ اصولاً ہم صرف ایک مہینے کا کرایہ پیشگی لے سکتے ہیں اسی طریقے پر عمل کیا جائے آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔

شکور : (بڑبڑاتے ہوئے) چلو چھٹی ہوئی۔ وہ سمجھ بیٹھے تھے کہ آنے کی ایک موٹی سی رقم اور ملتے جائیں گے کچھ دن جشن۔ مجھے گی تاشوں کی پھلجھڑیوں گے پر بار وہ بڑے میاں نے سارا قصہ ہی مسمار کر دیا۔ بس ایک مہینے کا کرایہ لو اور لگا دو مکان پہ نہ باسی پیسے نہ کھانے مگر شکور میاں تمہارا تو فائدہ اسی میں تھا کہ چلتے یہ تاش پتے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تم کو بھی چلو نہ سہی۔ اللہ اللہ ہے اپنا بھی۔ تم کیوں اس غم میں گھلو تم سے کیا تم تو تین میں نہ تیرہ میں دستی کی گرہ میں لو یہ تماشہ بھی دیکھو تو بڑے بھائی شاید کچھ رُو ٹھ گئے ہیں چھوٹے بھائی سے۔

کلیم : (شمیم کا تعاقب کرتے ہوئے) بھائی جان۔ بات تو سنیئے۔ ٹھہریئے تو سہی۔

شمیم : میں میں کچھ سننا نہیں چاہتا جو آپ کا جی چاہے کیجیے۔ میری بلا سے آپ ایک مہینے کا کرایہ بھی نہ لیں بلکہ کرایہ دار کو اپنے گھر میں رکھنے کا معاوضہ خود اپنی گرہ سے دیں۔ میں اب اس گھر کے کسی معاملے میں دخل دینا ہی نہیں چاہتا آپ جانیں اور آپ کا کام۔

کلیم : میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اب آپ حکیم صاحب سے خود بات کریں گے یا۔

شمیم : میں کسی سے کوئی بات وات نہیں کروں گا۔ آپ کا گھر ہے آپ مالک و مختار ہیں آپ کے اشاروں پر اس گھر کا نظام چل رہا ہے۔ میں ہوتا کون ہوں کسی سے کوئی بات کرنے والا۔ مجھ سے اب کوئی مطلب نہیں۔

کلیم : آپ اس وقت تو ناراض ہو رہے ہیں۔ مگر بعد میں آپ ہی کو معلوم ہوگا کہ پگڑی لینے کے جرم سے بچ کر آپ نے اپنے احساس کو کس قدر سبک رکھا ہے اور پیشگی کرایہ نہ لے کر اپنی ذمہ داریوں کو کس قدر کم کیا ہے۔

شمیم : مجھے آپ کے ان حکیمانہ مشوروں کی ضرورت نہیں آپ اپنے سبک احساس اور اپنی ذمہ داریوں کی سبک روی کے ساتھ جو چاہیں کریں مگر مجھ کو بخش دیں میں ان معاملات میں پڑنا ہی نہیں چاہتا میرا بلا سے بوم بہے یا بنا سے۔

(جاتا ہے۔)

شکور : (بڑبڑاتے ہوئے) لو شکور میاں بس۔ وہ تو بالکل ہی رُوٹھ گئے۔ اگر سچ پوچھو تو بہے ہی رُوٹھنے کی بات آگئی بڑی قسمت آتی نظر آرہی تھی۔ نہ جانے کیا کیا منصوبے بن رہے تھے۔ سب خاک میں مل کر رہ گئے۔ جب سے سال بھر کچھ ہوتا چار دن کی چاندنی تو رہی جاتی پیسے دو ایک مرتبہ پھر جھلک دکھا ہی جاتے۔ مگر ان چھوٹے میاں نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ پر ہم سے کیا نہ کرو نہ تین میں نہ تیرہ میں نہ دستی کی گرہ میں۔

خزانے کا سانپ

علی عباس حسینی

مادھو کا مکان سید پور میں سب سے اونچے ٹیلے پر تھا۔ وہ گاؤں کا سب سے بڑا کسان اور بھوم دھر تھا۔ چاول کی کھیتی تھی اور سیکڑوں من کی پیداوار۔ اتنا ڈھیر سا نقد اور کھانے والے تین! ایک وہ، ایک اس کی بیوی دھیا اور ایک ان کی محبت یا رفاقت جو سمجھیے اس کا پھل کھٹو۔ باپ بیٹے کی صورت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مادھو پانچ فیٹ کا موٹا، توندیل، چندیا بھی صاف اور داڑھی مونچھ بھی۔ دیسی گاڑھا، اور اسی کپڑے کی اونچی دھوتی پہنے، ننگے پاؤں، ننگے سر، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے غلاف چڑھا ہوا بہت ہی پرانا جو بورا کا طبل ہے!

کھٹو سترہ برس کا نوجوان تھا۔ سبزہ آغاز، چھریرا بدن، ساڑھے پانچ فیٹ سے نکلتا ہوا قد، متناسب اعضا، کھلتی رنگت۔ کپڑے تو ویسے اس کے بھی موٹے تھے اور اکثر پھٹے بھی، مگر جوانی خود ایک حسن ہے اسے کون چھپا سکتا ہے! یہ دلکشی اسے باپ کی جگہ ماں سے ملی تھی۔ دھیا کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت شکل کی اچھی رہی ہوگی۔ وہ اب بھی مرجھایا یا کملایا پھول تھی۔ جسم کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں، ناک نقشہ غائب ہو گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، نینوں کے بان نہ چلاتی تھیں۔ وہ تیر غلافی پلکوں کے کونے کی کیچڑ میں پھنس کر رہ جاتے تھے۔ مادھو کی کنجوسی نہ کھانے دیتی تھی نہ پہننے۔ مرلی دھر کی ساری اسی وقت اترتی جب وہ میلی چکٹ ہو جاتی۔ گہنوں میں سے صرف ہاتھ میں چاندی کے کڑے سے تھے۔ چلتی تھی تو سوکھی تیلیوں والی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی۔ باتیں کرتی تو معلوم ہوتا کبھی گرتی تھی یا آگلی بہر سوچ کر تول کر بولنا پڑتا ہے۔ لفظیں مشکل سے ملتے ہیں اور دقت سے منہ سے نکلتے ہیں۔ ہر وقت خیال رہتا کہیں کوئی ایسی بات منہ سے نکل جائے کہ شوہر بگڑ جائے، لیکن اس سوکھی گڑیا میں کھٹو کی حیات کے موقعہ پر کبھی نیل کا جوار بھاٹا آجاتا۔ اس وقت وہ گویا چھلک پڑتی۔ اکلوتا بیٹا جوان، ہاتھ پاؤں سے سجل، ناک نقشے کا درست، پھر بے زبان ایسا کہ بچپنے میں ہٹ کی، نہ جوان ہو کر کسی بات پر اڑا۔ جو باپ نے کھلایا کھایا، جو پہنایا پہنا۔ دیکھتا تھا کہ گھر پر چاول کی کھیتی ہے، سیکڑوں من غلہ پیدا ہوتا ہے، ہزاروں کا فائدہ ہے، مگر نہ گیہوں کھانے کو ملتا ہے، نہ باسمتی چاول۔ بس جوار اور چنا، جیسے قسمت میں لکھ گئے تھے۔ مگر یہ بھی دیکھتا تھا کہ جو اس سب کا مالک تھا، جس کے سب کچھ اختیار میں تھا، وہ خود بھی ان موٹے جھوٹے کپڑے میں اور اسی روکھے سوکھے کھانے پر گزر کرتا تھا، پھر کھٹو کیا کہتا، کیا کرتا! وہ کیسے کوئی چیز اپنے لیے الگ سے مانگتا۔

مگر یہ الجھن ضرور تھی۔ اب اس طرح ننگے بھوکے رہنے کی غرض کیا ہے؟ زندگی کا کوئی مقصد تو ہوتا ہی ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ پاتا تھا کہ محض روپیہ کمانا، اسے کما کر، اسے جوڑ جوڑ کر رکھنا بھی منزل و مقصد حیات بن سکتا ہے اور اس کا شوہر مادھو اسی کو سب سے بڑی منزل سمجھتا ہے۔ منزل کا انسانی خواہشوں، منصوبوں اور ولولوں کی طرح کسی سمت کنارہ نہیں ہوتا! پہلے ایک قریب

کی منزل دکھائی دیتی تھی۔ اور وہاں پہنچا، تو آگے سڑک پر جا کر اس کے آگے ایک اور دور بیت تھا، آگے اور اس کا
پتا جب اس نے کما سکی پھل کی وہ اس سے زیادہ بہت کچھ پچھلے میں دکھائی دیتے تھے۔ جب جا کے پاؤں کو کٹا کر اس سودے کا
دکھا تو اس کے دینے ایک اور الاؤ میں کا کل کھڑا کر دیا۔ غرض یہ راہ ہر منزل پر کھلنے کی بجائے بڑھتی جاتی ہے!

ادھو کے دینے کے ساتھ ساتھ اس کا لالچ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ جیسے جیسے اس کا کھیت میں وہ بیج سے کھیتی تر دیتا،
بتا وہ اس کے حصے کر اور بھی بڑھانے کے خواب دیکھنے لگا۔ اور وہ دل میں اس طرح خوش ہو جاتا، کھویا کہ اسے بیٹے کی جو یاں
دیتی اور منہ لیا، ذرا دکھائی پڑتی۔ وہ کہتی۔ "آنے دن کی بیزاری بیماری لگی رہتی ہے، اب بوڑھے ہو، گھر کا کام سنبھالے۔ کھیت اب
جوان ہو، دیکھتے نہیں، اس کا کام ہی اب دیا ہی نہیں تھا۔ صبح شام ادھر ادھر چکر لگاتا رہتا، جانا، کہتا اچھا ہے کوئی ایسی دلہن
ہو گئی تو بیٹے بٹھائے گھر ہنسائی ہو جائے گی۔"

ادھو اپنی توند پر ہاتھ مار کر کہتا۔ "تم تو مفت میں ہلکان ہوتی ہو اور پریشان کرتی ہو بیٹے کو پاس دھرا ہی کیا ہے کہ ایک اور
کمانے والا اس گھر میں سے آ دیں۔ پھر گھو بڑا نیک اور سیدھا ہے۔ رہی کبھی کبھی کھانا تاک، تو وہ ہم بھی اس کے بچپن میں کر لیا کرتے
تھے، تھا، ہی!" اور وہ مونچھوں کو بھی بیوی کر آنکھ مار کر قہقہہ لگاتا۔ یہ مردانہ وار قہقہہ نہ ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ بات
اتنی فضول خرچ کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ اس لیے بات بدل کر بات ہی ہو جاتا۔ بیوی مکتی کھلے جوسے پھول کی جگہ اوہ غصہ
کھلا دی گئی۔

مگر اب کے اپریل سے ادھو بہت خوش تھا۔ گیہوں کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ سرکار سے کنٹرول بھی اٹھ گیا تھا۔ زیادہ
نفع خریدا نہ جا سکتا تھا۔ اس لیے خواہ مخواہ سستے بھاؤ اسے بیچنا پڑا تھا۔ پار سال تو اس نے صرف پانچ سو من گیہوں کٹنے میں بیچا
تھا اور جب بھاؤ چار سیر کی جگہ ڈھائی سیر پہنچا تو اسے بیچا۔ اب کے اس نے طے کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ اپنا تین ہزار من گیہوں
اس وقت تک نہ نکالے گا جب تک بھلے سے دگنا نفع نہ بکنے لگے۔ اس نے گھر کے بڑے صحن کو پچیس فیٹ گہرا کھدوا دیا، اس
تہہ میں بھوسا بھروا دیا اور گیہوں کی بڑی بڑی بوریاں اس پر تلے اوپر رکھوا دیں۔ اغل بغل میں اور بھوسا ٹھونس کر اس نے صحن کو
ڈال کر برابر کر دیا۔ یہ مٹی اس نے ڈھیلی اور پولی نہ رہنے دی۔ اس نے دو دن چار چار مزدور لگا کر دُرمٹ سے اسے پکی
سڑک کی طرح کٹوا دیا اور اسے ہر طرح مضبوط بنا دیا۔

اب ادھو بے فکر تھا۔ بڑے بڑے آڑھتیے اور باہر کا نپور، کلکتے سے آتے، گیہوں خریدنے پر اصرار کرتے مگر ادھو
کے سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا سب کو پھنکاریاں مار مار کر بھگا دیتا۔ وہ کہتا۔ "جب ہی نکلے گا جب کہیں ضلع بھر میں گیہوں ڈھونڈے
میں نہ بکے گا۔ چھوٹے کسان زائد پیداوار بازاروں میں بیچ چکیں گے اور دکانوں اور گوداموں میں بھی، کہیں ایک دانہ دکھا
دے گا۔"

ادھو کے، گول مول، بھدے سے اکثر لوگ دھوکہ کھا جاتے تھے۔ سمجھتے تھے اس ڈھول میں خول ہی خول ہوگا۔ ایسی صورت
سے عقل سے کیا واسطہ؟ مگر وہ بلا کا ہوشیار اور مستقل مزاج تھا۔ آج ضلع بھر میں سب سے بڑی کاشتکاری اور سب سے اونچی حیثیت

۔۔ کا ثبوت تھی۔ باپ مرا تھا تو اُس نے دو بیگھے کھیت، دو لاغر بیل اور ایک کچا مکان چھوڑا تھا۔ ادھوسے اپنی محنت، اپنی کنجوسی، اپنی
۔۔ رجے سے پیسے پیسے کو دانت سے پکڑ کر گاؤں کا سب سے شاندار مکان بھی بنوایا۔ وہ چار ہل کی کھیتی بھی کرنے لگا اور پچاس بیگھے زمین کا
۔۔ دھ بھی بن گیا۔ مکان کی نیو ٹیلے پر بڑی گہری ڈالی گئی تھی۔ اسے اس کا خیال تھا کہ سیدپور گھاگھرا کے کنارے ہے اور دریا اس کے گھر
۔۔ دو میل کے فاصلے پر بہتا ہے۔ لیکن ایسے معاملات میں "آگم کا سوچ" اس کا اصول تھا۔

اس لیے اب وہ گھر کی طرف سے بے فکر اور کھیتی کی طرف سے مطمئن ہو کر بسکٹ پر بیٹھا زیل گڑگڑاتا اور اس کی آواز میں ایک
۔۔ تی اور اس کے دھوئیں میں ایک رقص کی کیفیت محسوس کرتا۔ اسے معلوم ہوتا جیسے کبھی دیوی گنگا جل میں غوطہ لگا کر سطح آب سے
۔۔ تے ہوئے اپنے کولھوں کے جلسے سے بھی زیادہ باریک ساری میں لپٹتی جاتی ہیں اور ناچتی جاتی ہیں اور ان کے گھنگروں کی جھنکار اتنی
۔۔ دلفریب، اتنی ہی شریلی، اتنی ہی رسیلی تھی جتنی کر تھال میں گرتے اور بہتے ہوئے زرد سپید سکوں کی۔ وہ یک بارگی اُٹھ کر زیل کر
۔۔ کرنے سے لگا دیتا، جھومنے لگتا، سوچنے لگتا، گنگنانے لگتا اور اس طرح مسکرا پڑتا جیسے بلی چوہے کو کھا کر مسکراتی ہے، جیسے
۔۔ اکٹر پرپی پتی کا آپریشن کر کے مسکراتا ہے، جیسے گدھ میدانِ جنگ کو لاشوں سے بھرا ہوا دیکھ کر مسکراتا ہے۔

مہینے گزرتے گئے۔ رُت بدلی، موسم بدلا، جون کا مہینہ آیا، بادل کے ہجوم آنے۔ انھوں نے کچھ دنوں تو آسمان پر چہل قدمی
۔۔ پھر ذرا تیز کیے، دوڑنے بھاگنے لگے اور آخر میں تھک کر جگہ جگہ پر دم لینے کے لیے ٹھہرنے لگے۔ گاؤں والوں نے پہلی
۔۔ بارش کو سینتنا شروع کیا۔ کھلیانوں میں پڑا ہوا اناج، بھوسا، اپلے، پتیاں، چھلکے، اپلوں کے گرد، سوکھی لکڑیوں کے ٹھنے کاٹ
۔۔ کر چھپروں، کوٹھڑیوں میں رکھنے لگے۔ جہاں پانی روکنے اور دھان لگانے کے لیے دس بیس کھیتوں کی مینڈیں اونچی کرتے،
۔۔ پاس گھاگھرا کے بڑھتے تیور بھی ضرور دیکھ آتے۔ سیدپور بلندی پر ضرور تھا مگر گھاگھرا کا کیا اعتبار، کس وقت کروٹ بدل دے
۔۔ وہ ہمیشہ برسات میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اتنا بڑا دریا چھوٹی ہانڈی میں بدل جاتا ہے۔ ادھر اُبلا اُدھر بڑھا۔ اس کنارے
۔۔ قصبے کو بے ڈوبا۔ کہتے ہیں: "دیوانہ را ہمین بس است" اس دریا کے لیے برساتی ہوا کا ایک جھونکا ہی کافی سے زیادہ
۔۔ اس کی قطع ایک بدمست ہاتھی کی طرح ہو جاتی ہے۔ اس باغ کے درخت نوچے، اس سبزہ زار کو روندا، فیل خانے کی دیواریں پاش
۔۔ اور مالک کے محل کا پھاٹک سونڈ سے کھینچ کھینچ کر توڑ پھینکا۔ اخبار والے، ریڈیو والے بھی برابر خبردار کر رہے تھے۔ اب کی برسات
۔۔ ہے۔ پچھلے برسوں کی سی جانی پہچانی نہیں ہے۔ چینک میں گرانے والے بموں اور سائبیریا میں کانٹے کرنے والے ۔۔۔ نے
۔۔ جانے کتنی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ رُوسی اسپتنکوں اور امریکی راکٹوں نے پوری ہوائی فضا میں ہلچل ڈال دی ہے۔ پانی کس قیامت کا
۔۔ ۔۔ لے سکتے، پھر بھی پڑھیں لیکن کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

ادھو ایسی ہستی، اُن سنی کر دیتا۔ اسے یقین تھا، اس کا مکان، اس کا کھیت، سب دریا سے کئی فرلانگ کے فاصلے پر ہیں۔ نہ گھبرانے
۔۔ ذات، نہ فلسفے کی کوئی وجہ۔ گیہوں کے ساتھ گھن پسے گا۔ جب ہی تو موقع ہے جب اس طرح کی آفتیں آئیں۔ ہزاروں اپنا اپنا بوریا بستر لے کر
۔۔ لے۔ ہزاروں خاندان برباد ہوں گے۔ مجبوروں کے جمع خرچ میں، قحط کے جب آثار ہوں، ایسے ہی سمے میں منہ مانگے دام
۔۔ ملیں گے۔

برسنے لگا۔ ایک ہفتہ تک متواتر دیہات برسا۔ بادل پھول کے برسا، بجلی تڑپ تڑپ کے برسا، کڑک کڑک کر برسا اور
گرج گرج کر برسا۔ کچی دیواریں اور چھتیں بیٹھ گئیں، چھپروں کی تختیاں اور کھپے ٹوٹیں کے ڈھانے لگے، ڈھیر ہو گئے۔ کچھ مویشی سب
کچھ لوگ زخمی ہوئے، کچھ بچ کر نکل گئے، کچھ بھیگ کر نمونیہ اور ملیریا میں گرفتار ہو گئے۔ ادھر دریا نے ہاتھ پاؤں نکالے، پہلے
تو دونوں کناروں کو بھرا، پھر چھلک کر پھیلا اور بڑھا اور اس پچھم، اس قریہ اور اس بستی سے چلا، تیز بھاگا اور دوڑنے لگا
کرخت کالے رنگ کی لہروں اچھل کرتا اور گرجتے، وادیاں پل کے پل میں پکڑتا اور پکڑ کر گراتا، سڑکوں کو پامال کرتا، بستیاں
توڑتا، جنگلوں کو اکھاڑتا، ادھیڑ کر ڈبوتا، نکل جاتا۔ میدان پر کی بلندیوں کو چاٹتا، ٹھوکریں مارتا اور کاٹنا شروع کر دیا۔ ایک دو
دریا سے قریب والے گھروں میں شور تھا "پانی دیواروں کو توڑ کر اندر گھس رہا ہے۔" لوگ مویشیوں کو ہانکتے، بچے بجائے
تھوڑا سا سامان کندھوں، سروں پر رکھ کر اور بہت کچھ گھروں میں چھوڑ کر نکل بھاگے۔ حکام ضلع کی طرف سے بھی کچھ لوگ آئے تھے
کی رہنمائی اور ان کی ہدایت پر عمل کر کے دوسری شام تک سارا گاؤں دوسرے دیہات میں پناہ لینے چلا گیا۔

مگر مادھو اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ مثل ہے: "جان ہے تو جہان ہے" یہاں تو گھر ہی جان تھا اور گھر ہی جہان۔ اس نے
کی طرح اس نے اپنے گھر میں مضبوط جڑیں گاڑ لی تھیں۔ اس نے اس دن کا پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ کیوں جاتا؟ پانی
بڑھتا ہے تو بڑھنے دو۔ بھوکے بھی تو بڑھیں گے۔ اسی روز سیاہ میں تو اس کی تقدیر چمکنے والی تھی۔ اسی اندھیرے میں تو اس کی
امید کے چراغ جگ مگ جگ مگ کریں گے۔

جب بیوی نے فریاد کی اور بیٹے نے بھی ڈرتے ڈرتے، کم سخن ہونے پر بھی، داویلا مچایا تو مادھو کڑک کر بولا: "تم
دونوں بھی جاؤ اور مویشیوں کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔" بیا نے بھی گڑگڑا کر منتیں کیں، گری، برسی، تڑپی مگر وہ
ناچار اپنی بات سے ڈٹا اور گھر سے قدم نکالنے پر تیار نہ ہوا۔ بیا ہار گئی مگر شوہر پرست ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ماں
بھی تو تھی۔ اس نے لکھو کو سمجھا بجھا کر مویشیوں کو محفوظ جگہ لے جانے کے بہانے دوسرے گاؤں بھیج دیا۔

لکھو کا سارا دن اسی کام میں گزرا۔ جانوروں کے لیے چارے کا بندوبست کرنے میں رات ہو گئی۔ پانی بھی جیسے
دھندلکے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس طرح تڑپ کے ساتھ آیا کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ سمٹ کر بیٹھ گیا اور "رام رام" کرنے لگا۔ کسی
میں باہر نکلنے کی ہمت نہ تھی۔ لکھو بھی بھیگ کر چوہا ہو گیا تھا۔ گاؤں کے پناہ گزینوں نے اسے زبردستی پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا
اسے ایک سوکھی دھوتی دے کر کپڑے بدلوائے اور آگ کے پاس بٹھایا۔ اسے اپنے بھنے چنے میں شریک کیا اور اسے اس کالی ڈراؤنی
بھیانک رات میں کسی طرح نیند پوری نہ ہونے دیا۔ صبح تڑکے ہی کووں کی پہلی ہی کائیں کائیں کے ساتھ وہ اٹھ کر میدان پر کو دوڑا
بھاگا۔ گاؤں سے ذرا تک بھر ادھر ہی اس نے دیکھا سامنے میں جل تھل ہے، صرف مادھو کا گھر جزیرہ بنا بیچ میں کھڑا ہے۔
ہی سے کھڑے کھڑے اس نے "پتا جی، پتا جی" کہہ کر پکارا۔ مادھو نے چھت پر آ کر آواز دی۔ "کشتی اور بھاؤڑا لے کر آؤ
نہیں، یہاں سب ٹھیک ہے۔"

بوکھلایا ہوا لکھو کشتی ڈھونڈنے لگا۔ پاسے پولیس والے مل گئے۔ داروغہ جی نے کشتی بھی دلوائی، بھاؤڑا بھی۔

دو غوث خاں ایک سپاہی کو بھی ساتھ لے گیا۔ وہ جوان بھی تھا، ہمت والا بھی تھا اور پیراکی کا ماہر بھی۔ دونوں کشتی میں چلے لیکن پانی کے بہاؤ سے زیادہ دو خطرے تھے۔ ایک تو ڈوبے مکانوں کے "ڈینوتھیر" دوسرے بہتے ہوئے درختوں کے "ڈائنوسر"۔ یہ موجوں سے لڑتے، دھارے کو کاٹتے، نیچے اوپر کی بلاؤں سے بچتے، جب دونوں کنارے پر پہنچے تو مادھو اپنے دالان میں کھڑا نہ ملا۔ اس نے جھٹ کر کشتی سے پھاوڑا اٹھایا اور اندر گھس گیا۔ لکھو "ماں، ماں" پکارتا پیچھے دوڑا۔ زنان خانے کے کمرے سے کراہنے کی آواز آئی۔ جا کر دیکھا تو ماں چھت سے گرے ملبے کے نیچے دبی پڑی ہے اور کمزور ہاتھوں سے مٹی اور ملبہ ہٹانے کی کوشش کر رہی ہے اور مادھو، زخمی بیوی کو نکالنے کی بجائے آنگن کی زمین کھود رہا ہے۔ لکھو کے پکارنے پر غوث بھی دالان کے پیچھے میں کشتی باندھ کر اندر آ گیا۔ دونوں نے مٹی، پلاسٹر کا ڈھیر ہاتھوں سے ہٹایا اور بے ہوش ماں کو نکالا۔ لکھو اسے گود میں اٹھا کر کشتی میں لایا۔ وہاں اپنے زانو پر ماں کا سر رکھ کر اس کے چہرے سے خاک و خون پاک کیا۔ "ماں، ماں" پکارا اور جواب نہ پانے پر اس کے منہ پر منہ رکھ کر رونے لگا۔

دوسرے کنارے سے گاؤں والوں نے شور کیا۔ "ارے لکھو! جلدی کر جلدی! خبر آئی ہے تاڑ بھر اونچا پانی بس کوس بھر ادھر ہے۔ جلدی سب کو لے آ، بھاگ! بھاگ!" غوث خاں نے پکارا۔ "مادھو! مادھو! جلدی کر، جی جلدی!" اور جواب نہ ملنے پر لکھو کو مردہ ماں پر روتا چھوڑ کر پھر اندر گھسا۔

مٹی کے صحن کو پانی نے جگہ جگہ سے کاٹ دیا تھا۔ کھتے کا حلقہ صاف ابھر آیا تھا اور دالانوں کی جگہ تیزی سے کھتے میں جا رہا تھا۔ مادھو نے دیوانہ وار آس پاس کی مٹی پھاوڑے سے کاٹ کر دراڑوں میں بھرنا شروع کر دی تھی۔ نہ جانے کہاں کی اس میں قوت اور پھرتی آ گئی تھی۔ وہ دوڑا جاتا تھا اور سوراخوں کو، خالی جگہوں کو بھرتا جاتا تھا۔ پھاوڑے سے مٹی رکھ کر دباتا، پاؤں سے کوٹتا اور کہتا— "کھتے میں گھسے گا! نہیں جانتا، مادھو کا ہے! مادھو موجود ہے۔ ہونہہ، دیکھیں اب کیسے جاتا ہے۔"

غوث دور ہی سے چیخا۔ "ارے چھوڑ اسے، بھاگ چل! سارا گھر گرنے والا ہے۔" مادھو نے اسے ایسی حقارت سے دیکھا "تو جان بچا اپنی۔ میں تو جیتے جی اپنا کھتا برباد نہ ہونے دوں گا!" غوث لپکا کہ زبردستی پکڑ لے چلے۔ مادھو پھاوڑا ہاتھ میں تول کر کھڑا ہو گیا "اب قدم بھی آگے بڑھایا تو سر توڑ دوں گا۔" غوث نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مادھو چیخنے لگا۔ "تجھ کو کس نے یہاں بلایا؟ جاتا کیوں نہیں؟ جا یہاں سے! چل!" اور وہ وار کرنے والے انداز سے سپاہی کی طرف بڑھنے لگا۔

دفعتاً زمین ہلنے لگی۔ پھر تڑخنے کی آواز ہوئی۔ ایک بہتے ہوئے شیشم کے درخت نے مادھو کی دیوار کو ٹکر ماری۔ پانی کی چھینٹیں پٹ سلوں سے اُڑ کر، چھت پر گریں، صحن میں آ کر پاش پاش ہو گئیں۔ مادھو نے قہقہہ لگایا۔ لال لال آنکھیں کر کے غوث کی طرف بڑھا۔ ڈگمگایا اور پھاوڑا ہاتھ سے پھسل کر غوث کی طرف چلا۔ سپاہی چیخ کر بھاگا، کشتی میں اچک کر آ گیا۔ ساتھ ہی تاڑ سے اونچی موج مادھو کے مکان سے آ کر ٹکرائی۔ موجوں نے کشتی کو دور پھینک دیا۔ ایک چادر آب پھیلی جس میں نہ مکان تھا، نہ کھتا اور نہ اسے جان سے عزیز رکھنے والا مادھو!

لکھو دیوانہ وار چیخا۔ "تباہی! تباہی!" غوث پولیس والوں کے خیر ہمدردانہ لہجے میں بولا: "ارے جانے بھی دے کمبخت! خونخوار سانپ تھا پاگل!"

آپا

اپنے ایک افسانہ کا تجزیہ

ممتاز مفتی

میری نظروں میں آپا محض افسانہ تھا ایک [illegible] [illegible] یعنی نقطہ نظر پر کہانی رہی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔

پہلی وجہ یہ تھی کہ یہ کہانی کسی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ فرمائش کرنے والے لوگ میرے محسن تھے۔ مجھے ان کے احسان کا بدلہ چکانا تھا۔ ایک اخلاقی فرض پورا کرنا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اخلاقی فرض پورا کرنے کی خواہش چاہے کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو پھر بھی اس سے جذبہ پیدا ہونا چاہیے جو لکھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ آپا میں نے اپنے جذبے کی وجہ سے نہیں لکھی تھی۔ اور اگر فرمائش نہ ہوتی تو شاید میں آپا پر کبھی افسانہ نہ لکھتا۔

دوسری وجہ کا تعلق شہرت سے ہے؛

میں ان لکھنے والوں میں سے ہوں جنہیں شہرت پہلے ہی سے چھپی طور پر مل گئی۔ اور بعد میں افسانہ نویسی سیکھنا پڑی۔ عام طور سے ہوتا یوں ہے کہ لوگ پہلے لکھتے ہیں بار بار لکھتے ہیں۔ پھر چھپتے ہیں۔ بار بار چھپتے ہیں پھر کہیں شہرت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ ضرور شہرت حاصل ہو جائے۔

میں نے پہلی چیز بھی فرمائش پر لکھی۔ جذبے سے نہیں ویسے ہی لکھ دی۔ جان چھڑانے کے لیے۔ وہ چیز چھپ گئی نہ صرف چھپی بلکہ بڑے دھوم دھڑلے سے چھپی۔ یوں بیٹھے بٹھائے ان جانے میں شہرت حاصل ہو جانے کے بعد یہ مشکل آپڑی کہ سنجیدگی سے سوچنا پڑا کہ کیا لکھوں۔ کیسے لکھوں۔ سوچا سوچا کر میں نے یہ طے کیا کہ افسانے کا موضوع اچھوتا ہونا چاہیے۔ کوئی عظیم حقیقت۔ عام حقیقت نہیں۔ دل کی تہوں میں چھپی ہوئی کوئی بات۔ جتنی دور کی کوڑی ہو اتنا ہی اچھا۔

اس زمانے میں آپا ایک عام کردار تھا۔ ہر گھر میں پردے کے قریب چوکی یا پیڑھے پر ایک نہ ایک آپا بیٹھی ہوتی تھی جو نگاہیں جھکائے رکھتی۔ چپ کی اوٹ میں مسکاتی اور دھیمی آواز میں بات کرتی۔ اس زمانے میں سبھی آپا کی تعریف کرتے تھے لیکن کوئی بھی اسے دل سے نہ چاہتا تھا البتہ ان دنوں ساجو باجی عام نہ تھی۔ بڑے بوڑھے اس کو دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھتے۔ بڑی بوڑھیاں منہ میں انگلیاں دبا لیتیں۔ نوجوان ساجو باجی کو دیکھتے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ باچھیں کھل جاتیں۔

آج کل تو سڑکوں پر بازاروں میں دکانوں پر بسوں میں روشوں پر گلیوں میں ہر جگہ ساجو باجیوں کی بھیڑ لگی ہے آج کل تو آپائیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں لیکن اس زمانے میں آپا ایک عام چیز تھی بے حد عام۔ ایک ایسے افسانہ نویس کے لیے جسے چھپی شہرت مل چکی تھی آپا سے عام موضوع پر قلم اٹھانا بھلا کوئی بات تھی ——— ان دو وجوہ کی بنا پر میری نگاہ میں آپا کی حیثیت [illegible] افسانے سے زیادہ نہ تھی۔

اب فرمائش کی تفصیلات بھی سن لیجیے۔ یعنی آپا لکھنے کی فرمائش کرنے والے لوگ کون تھے۔ کن حالات میں فرمائش کی گئی اور میں اس فرمائش کو پورا کرنے پر کیوں مجبور تھا۔

یہ ۱۹۴۰ کی بات ہے ان دنوں میں ایک ہائی سکول میں ٹیچر تھا۔ تنخواہ نہایت قلیل تھی۔ کھانے والے تعداد میں زیادہ تھے۔ اگرچہ میں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ ٹیوشن نہیں کروں گا لیکن حالات نے مجبور کر دیا۔ میں نے اپنے ایک بزرگ اور صاحب رسوخ دوست سے کہا کہ اگر ہو سکے تو کوئی ٹیوشن دلا دیں۔ ایک روز میرے دوست میرے ہاں آئے بولے ٹیوشن کرو گے؟ ارادہ بدل تو نہیں گیا۔ میں نے کہا ضرور کروں گا ارادہ اور بھی پکا ہو گیا ہے۔ وہ مجھے شہر کے ایک رئیس کے گھر لے گئے۔ تعارف کرایا۔ معزز رئیس نے میرا جائزہ لیا۔ پھر کہنے لگے آؤ میں تمہیں تمہارے شاگردوں سے ملا دوں۔ معزز رئیس میرا تعارف کرا کر چلے گئے تو میں نے آزادانہ نظر اٹھا کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں میرے رو برو بیٹھی ہیں۔ آپا اور ساجو باجی۔ آپا بڑی تھی سانولی تھی۔ نظریں جھکائے ہوئے تھی کبھی کبھار کنکھیوں سے دیکھتی اور پلو کی اوٹ میں مسکاتی۔

ساجو چھوٹی تھی گوری تھی چنچل تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی۔ مسکرائے جاتی اور لگاتار باتیں کیے جاتی۔ کچھ دیر تک وہ دونوں میرا جائزہ لیتی رہیں آپا جھکی جھکی آنکھوں سے ساجو علانیہ طور پر۔ ساجو نے منہ بنایا۔ بات بدلنے کے لیے میں نے پوچھا کیا پڑھو گی۔ ساجو پیچھے سے اٹھی اور حساب اور الجبرے کی کتابیں اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیں ——————

—————— حساب اور الجبرا میں نے صرف میٹرک تک پڑھے تھے۔ میٹرک کے امتحان میں حساب اور الجبرے کے پرچے میں میں نے ۱۰۰ میں سے صرف ۴۱ نمبر حاصل کیے تھے۔ حساب الجبرا اپنے بس کی بات نہ تھی۔ دراصل میرا خیال تھا کہ ٹیوشن انگریزی کی ہو گی اور انگریزی میں میں اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھتا تھا۔ حساب کو دیکھ کر ہی اپنی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ ساجو بات کو بھانپ گئی۔ اور اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی۔ جھٹ اپنا رومال نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے کہا اس رومال سے کیا بنے گا۔ گھر سے کوئی تھان اٹھا لاؤ۔ بس اس جملے نے مجھے قائم کر دیا۔ ابتدائی جائزے کے تاثرات گویا معدوم ہو گئے۔

میں نے کہا ہٹاؤ اس مضمون کو۔ ہم جنیوں کا مضمون نہیں پڑھاتے۔ انگریزی پڑھو۔ مضمون ہوا نا۔ ساجو بولی انگریزی کیوں پڑھیں اس میں تو ہم آپ واقف فائق ہیں۔ اس پر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل سے پڑھانے نہیں آؤں گا۔ لہٰذا ادھر ادھر کی گپ میں وقت گزار دیا۔

اس کے بعد میں انہیں پڑھانے نہ گیا۔ تیسرے روز وہ رئیس بزرگ سکول ہی آ گئے بولے میاں تم نے کمال کر دیا ایک روز آنے اس کے بعد رسید ہی بند کر دی۔ میں نے صاف کہہ دیا جناب عالی حساب پڑھانا اپنے بس کا روگ نہیں۔ بولے میاں کسر نفسی کی ضرورت ہے کوئی۔ لڑکیاں تو کہتی ہیں کہ حساب میں تم سے زیادہ واقف اتالیق کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور مجھے بزرگ نامعلوم گھر لے گئے۔

میں پہنچا تو وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔ ساجو کی مسکراہٹ میں سکندر اعظم کی جھلک تھی۔ میں نے بے تکلفی سے کہا کیوں مجھے حساب کے جھنجھٹ میں ڈال رہی ہو تم۔ ایک سوال حل کرنے میں اپنا چلتا ہم خون خشک ہوتا ہے۔

اس پر ساجو نے اٹھا کر میرے سامنے دو حل کیے ہوئے پرچے رکھ دیے۔ یہ تو انہی امتحان کے حساب کے پرچے تھے۔ آ[illegible]

نے سویٹ سے سویٹ تھے اور ساجدہ نے سویٹ سے ہ ہ ۔ میں حیران رہ گیا۔ ساجدہ بولی آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئے۔ میں نے کہا
پھر خاموشی کا کیا مطلب۔ ساجدہ بولی۔ پڑھ پڑھ کر تھک جاؤ تو کوفت بھی تو شانی ہوتی ہے۔

پورے دو ماہ ہم تینوں کوفت مٹاتے رہے۔ کتابیں سامنے چھوڑ کر گپیں مارتے رہے۔ سچ ہے کہ آنکھوں سے جب آپ
تھا کہ میں ماجرا جتنا ہوں۔ اور وہ حاجت روائی کر رہی تھیں۔ جب ساجدہ مجھا بھار ساد ... دیتی تھی کہ آپ تو ... یہ بھی
حرام کی کمائی ہے۔ اس پر وہ بحث کرتی۔ حلال کی کمائی سے کیسی کوئی کرتا ہوں ہے کیا؟

دو مہینے کے بعد میرا تبادلہ ہو گیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے ازراہ مذاق کہا کاش کہ میں کوئی خدمت کر سکتا۔ اس پر آپا
ساجدہ کو اشارہ کیا۔ ساجدہ بولی۔ کر سکتے ہیں آپ۔ میں نے پوچھا وہ کیسے بولی۔ آپ ہم پر ایک کہانی لکھ سکتے ہیں۔ ان دو ماہ کے دوران
انہیں علم ہو چکا تھا کہ میں افسانے لکھتا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت آپا نے دبی زبان سے کہا۔ کہانی ضرور لکھیے گا۔ آپا کی وہ سرگوشی
ابھی تک فضا میں تیر رہی ہے۔

آپا چھپی تو گویا سلگتی پر تیل پڑ گیا۔ چھلی شہرت منسوب ہو گئی اس کے باوجود میں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ
حقیقتیں کس قدر غیر اثر ہوتی ہیں۔ اور حقیقت کو چھپانے کے لیے واہیت کا پردہ دبیز ترین پردہ ہے۔ آج تک یہ حقیقت
میرے دل کی گہرائیوں میں نہیں بیٹھ سکی۔ اور آج تک میں افسانے کے لیے انوکھے موضوع ڈھونڈتا ہوں۔

آپا چھپی تو مشہور نقاد اور افسانہ نویس حسن عسکری نے مجھے پہلی مرتبہ خط لکھا۔ لکھا تھا۔ "آپا بہت پسند آئی۔ بہن از
کرم کسی ساجدہ باجی کا پتہ لکھ بھیجیے۔" میرے اس افسانے پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہو سکتی تھی۔ حسن عسکری کے اس ایک جملے میں [illegible]
کی بہتر [illegible] ہوئی تھی۔ آج بھی جبکہ ساجدہ باجیاں گھر گھر موجود ہیں اور ساجدہ باجی کا پتہ پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آج بھی حسن
کا وہ جملہ اسی طرح بامعنی ہے۔

انگریزی میں ایک کہاوت عام ہے۔

"Gentlemen prefer blondes but they marry brunettes."

میرا افسانہ آپا اس کہاوت کی ضد تھا۔ میں نے اس افسانے میں یہ کہا کہ شرفا آپا کے مداح ہوتے ہیں لیکن ساجدہ سے
کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ لیکن اب مجھے شک ہونے لگا ہے جس تیز رفتاری سے ساجدہ باجیاں عام ہوتی جا رہی ہیں اسے دیکھ کر خیال
ہوتا ہے کہ شاید جلد ہی ایسے اس افسانے کو پڑھ کر لوگ یہ محسوس کرنے لگیں یا کوئی نقاد مجھے خط میں لکھے کہ ساجدہ باجی بہت
آئی۔ کسی آپا کا پتہ بتائیے۔

حالات کا رخ دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید مستقبل قریب میں آپا ایک خیالی کردار کی حیثیت اختیار کرے۔
آپا کی محبت کی تفصیلات انہیں کی باتیں معلوم ہونے لگیں۔ اور حسن عسکری کا وہ جملہ اپنی آفاقیت کھو بیٹھے ——— ہو
سکتا ہے کہ کبھی ایک بار ساجدہ باجیاں ذہن کے کسی خطے پر ٹڈیوں کی طرح آ گئیں۔ ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہوئیں۔ لیکن ہمیشہ یہ
آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے کسی ان جانے اصول کے مطابق صدیوں کے بعد

ین کا دور آتا ہے اور موت تک رہتا ہے جتنی دیر ستارہ ٹوٹتا ہے۔ آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور پھر صدیوں آپا میں راج کرتی
ی۔ جتنی تک انہیں بے حد پسند کرتے ہیں لیکن ساجو باجی کا پتہ پوچھتے پھرتے ہیں۔

ساجو باجی الٹا محبوب ہے اور قدرت ساجو باجی کو شاید اس لیے عام نہیں ہونے دیتی کہ مبادا وہ اپنی محبوبیت کھو
ے اور عورت کی کشش عام ہو کر ختم ہو جائے۔ نہیں حسن عسکری کا وہ جملہ اپنی آفاقیت نہیں کھو سکتا۔

میں نے محبت کے موضوع پر کئی ایک افسانے لکھے ہیں۔ میں نے بار بار یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ کئی ایک ڈھکے چھپے
بات محبت کا بہروپ دھار لیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک مرتبہ ایک بھڑ بھن بھن کرتا ہوا پروانوں کی شکل میں آ دھمکا بھن بھن
ے بعد میں بھی پروانہ ہی کہوں ——— اسی طرح کبھی نفرت کا بنیادی جذبہ بھن بھن کرکے کہتا ہے میں محبت ہوں۔ کبھی انتقام کا جذبہ اپنی
لیے محبت کا روپ دھار لیتا ہے۔ کبھی حالات ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ محبت کا سوانگ بھرنے کے بغیر چارہ نہیں
تا۔ کبھی مروت محبت ایجاد کر لیتی ہے۔ کبھی پڑوس کی شرارت محبت کی شکل میں پھوٹ نکلتی ہے۔

ان میں نے محبت پر کئی افسانے لکھے۔ دور دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی۔ ان جانی باتیں کہنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ خیال
یار عام محبت کی بات کروں۔ میں کوئی چھوٹا موٹا لکھاری تھوڑے ہی تھا کہ عام محبت پر افسانہ لکھتا۔ اور کسی عام کردار کو پیش کرتا۔ آپا
یک عام کردار تھا۔ اور اس افسانے میں محبت کی عام تفصیلات درج ہیں۔ یقیناً اگر فرمائش نہ ہوتی تو میں کبھی یہ افسانہ نہ لکھتا
——— لیکن قاری نے "آپا" پڑھ کر تالیاں بجائیں اور میرے محبت کے دوسرے افسانوں کو نظر انداز کر دیا۔ یہ دیکھ
ر میرے دل میں الٹی ضد پیدا ہوئی۔ اگر عام پڑھنے والے ایسے عام افسانے پسند کرتے ہیں تو کیا کریں ہیں کیا عام آدمیوں کے
یے لکھتا ہوں؟

اور پھر آپا۔ آپا کا افسانہ تو خلوص سے خالی ہے۔ بکھیر خالی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں جو آپا کا مصنف ہوں'
خالق ہوں' میں نے لوگوں کی نگاہیں آپا کی طرف منعطف کیں۔ یہ دیکھیے۔ یہ آب دار موتی دیکھیے۔ اس کی آب و تاب دیکھیے۔
س کی منزلت کا اندازہ کیجیے ——— لیکن لوگوں کی توجہ آپا کی طرف منعطف کرکے میں خود ساجو باجی کا پتہ پوچھتا پھرا۔ کسی ساجو باجی
ا پتہ بتائیے۔ چند کسی ساجو کا پتہ بتائے۔ اور پڑھنے والوں نے افسانہ پڑھ کر کہا۔ آپا خوب ہے بے حد خوب ہے۔ لیکن کسی
ساجو باجی کا پتہ بتائیے۔

عنوان کا مسئلہ

کنہیا لال کپور

شاعر بیچارا کتنی مصیبت ہے! واللہ ہم اس بات کا شکوہ نہیں کر رہے کہ شعرا کو داد واہ کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ تو ازل سے ہی اُن کی قسمت میں لکھا ہے کہ وہ خوبصورت اشعار کی تخلیق کریں لیکن اُن کے لیے انہیں معاوضہ نہ دیا جائے یا اتنا کم دیا جائے جس سے اُن کی گزر نہ ہو سکے۔ جب ملٹن ایسے شہرۂ آفاق شاعر کو اس کے لافانی شاہکار "پیراڈائز لاسٹ" کے لیے صرف پانچ پونڈ پیش کیے گئے تو باقی شعرا کس کھیت کی مولی ہیں۔ آپ کہیں گے شاید ہم اس بات کی شکایت کر رہے ہیں کہ شعرا کو مشاعروں میں "ہوٹ" کیا جاتا ہے۔ آپ پھر غلط سمجھے۔ شاعر تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مشاعروں میں شرکت کرتا ہے وہ کبھی اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کے اشعار کا خیر مقدم "سبحان اللہ" "مرحبا" "بہت خوب" کے نعروں سے کیا جائے گا یا اُسے مطلع کے بعد ہی مقطع پڑھنے کو کہا جائے گا۔ ہم تو صاحب اس سخت مقام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو شاعر کی راہ میں سنگ گراں کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی اپنی نظم کے لیے مناسب عنوان تجویز کرنا۔ آپ فرمائیں گے: بھلا یہ کون سی افتاد ہے۔ آخر شاعر جس موضوع پر نظم لکھتا ہے۔ وہی اس کا عنوان ہو سکتا ہے: آپ نے بجا فرمایا لیکن اگر آپ جدید شاعری کے لوازم پیش نظر رکھیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عنوان کا مسئلہ خاصا حد تک پریشان کن ثابت ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ ہماری اس نظم کو لیجیے جو ہم نے "آل انڈیا مشاعرہ لکھنؤ" میں پڑھی اور جس کا عنوان ہم آج تک طے نہیں کر سکے۔

جھیل میں مینڈک بھی ہیں کچھوے بھی ہیں
آسماں میں دیکھ کر قوس قزح
آ گیا کیوں مجھ کو پھر تیرا خیال
دیکھتا ہوں جب میں سطح آب پر مرغابیاں
سوچتا ہوں کاش اڑ سکتا میں شکرے کی طرح
مجھ سے تو اچھے ہیں مینڈک اور یہ مرغابیاں
جھیل ہی گہوارہ ہے کا جھیل ہی جن کا مزار
کوئی کچھوا دیکھ کر مجھ کو اداس
مجھ سے ہمدردی جتانے کے لیے

پانی سے باہر بھلا نکلے گا کیوں ؟
تم تو ہو مجھ سے ہزاروں کوس دُور
حالِ دل تم کو سُنانا ہے محال
قرضخواہ کو آج کیا دُوں گا جواب
کل بڑی مُشکل سے ٹالا تھا اُسے
کاش میں ہوتا ہی مینا دہر میں
ٹائیں ٹائیں کرتا رہتا شاخ پہ بیٹھا ہوا
دیکھتا واں سے کہ بیٹھ کر سامنے جو جھیل ہے
اُس میں کچھوؤں کے علاوہ چار سو مینڈک بھی ہیں۔

آپ ہی فرمایئے اس نظم کا کیا عنوان ہو سکتا ہے۔ آپ کہیں گے: "کچھوے اور مینڈک"۔ ہم عرض کریں گے اس میں مُرغابیوں اور ...ے کا بھی تو ذکر ہے۔ اس لیے "جھینگا اور مُرغابیاں" کیوں نہیں۔ اور آپ قوسِ قزح، کوسوں دُور بیٹھی محبوبہ اور قرضخواہ کو کیوں بھول ... اور پھر آپ نے اُن داخلی واردات کے بارے میں کیا سوچا ہے جو اس نظم کی جان ہیں۔

چلتے چلتے آپ کو ایک نقّاد کا قصّہ بھی سُنا دیں جن کی خدمت میں ہم اس لیے حاضر ہوئے کہ وہ اس نظم کا کوئی مناسب عنوان تجویز ... نظم سُننے کے بعد ہم سے پوچھنے لگے: "آپ کو مرگی یا خفقان کے دورے تو نہیں پڑتے؟" ہم نے حیران ہو کر جواب دیا "نہیں ... آپ کو کیسے وہم ہو گیا کہ ہم ان نامُراد امراض میں مبتلا ہیں؟" انھوں نے دوبارہ سوال کیا "کیا آپ بھنگ یا چرس کے زیرِ اثر ... رہتے ہیں کہتے؟" ہم نے جب اس سوال کا جواب نفی میں دیا تو بڑی شفقت کے ساتھ فرمایا: "آپ دماغی بیماریوں کے کسی لائق ... سے فوراً رجوع کیجیے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کا دماغ چل گیا ہے یا چل جانے کی تیاری کر رہا ہے۔" ہمیں اُس نقّاد ... سے بڑی خاصی مایوسی ہوئی۔ گھر پہنچ کر ہم نے ایک اور نظم لکھی جو آپ کی تفریحِ طبع کے لیے پیش کرتے ہیں۔

جتنے نقّاد ہیں زمانے میں
یعنی قدرت کے کارخانے میں
ان سے مل کر خوشی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی
ان سے مل کر اُداس رہتا ہوں
وقفِ حرمان و یاس رہتا ہوں
رات آتی ہے اوڑھ کر کمبل
مسکراکر ہے کہتی شام سے

کبھی یہ شکل آہ و زاری ہے
زندگی موت سے پیاری ہے
اُلٹا کر دُنیا ہے منظر تیری
ہر طرف بج رہے ہیں نقارے
باغ میں شور ہے عنادل کا
پاسکے تو بھی سراغ منزل کا
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ایسے ہیں وہ اگر یہاں آئے
زندگی میں بہار آ جائے
یہ مگر محض ہے جنوں میرا
پی کے قطرہ اٹک گیا ہوں میں
کتنا کڑوا مزا ہے قطرے کا
روتے رہتے ہیں رات بھر کتے
اُن کی شب کی سحر نہیں ہوتی

نظم لکھنے کو تو لکھ لی لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی اس کا عنوان کیا ہونا چاہیے۔ درجنوں عنوانات قائم کیے مگر کوئی بھی پسند نہ آیا۔ آخر ایک پروفیسر صاحب سے کہ جن کی لیاقت کی دھوم تھی مشورہ کیا۔ وہ نظم پڑھنے کے بعد کہنے لگے: ساری نظم میں صرف دو کام کے مصرعے ہیں اور وہ غالب سے چرائے گئے ہیں۔ اس لیے نظم کا عنوان ہونا چاہیے "غالب کے ہاں ڈاکہ"۔ ہمیں اُن کا مشورہ ناگوار گزرا۔ ہم اُن کی لیاقت کے علاوہ اُن کی نیت پر بھی شک کرنے لگے۔

اُنھی دنوں ایک مشہور ادبی رسالہ کے ایڈیٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نظم سننے کے بعد اُن پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ جب ذرا ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے تو فرمایا: اس میں کوئی شک آپ اس نظم میں کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کیا کہنا چاہتے ہیں اس کا اتا پتا نہیں لگ سکا۔ بات تو آپ نے نقاروں سے چلائی۔ اس کے بعد رات کا قصہ لے بیٹھے۔ اور پھر نہ جانے کیوں آپ کو فضا میں نقارے بجتے سنائی دیے۔ نقاروں سے یک لخت آپ کا تخیل عنادل تک جا پہنچا۔ پھر آپ کو غالب کا شعر یاد آیا۔ خاتمہ آپ نے کتوں کے رونے پر کیا۔ اب آپ کی نظم کا مرکزی خیال کیا ہے۔۔ کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میری مانیے تو عنوان رکھیے۔ "پی کے قطرہ اٹک گیا ہوں میں"۔ ہم نے برہم ہو کر کہا: "واللہ! ایسی خوبصورت نظم کا اتنا بے ہودہ عنوان"۔ ایڈیٹر صاحب نے فرمایا: "چلیے اس نظم کو ہم اپنے رسالہ میں بغیر کسی عنوان

چھاپ دیتے ہیں اور قارئین سے عنوان تجویز کرنے کے لیے کہتے ہیں"۔ ہم نے اُن کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے جواب دیا: ہمیں منظور ہے۔ چنانچہ نظم چھاپ دی گئی۔ ہماری توقع کے خلاف قارئین نے عجیب و غریب عنوانات تجویز کیے۔ مثلاً "گورکھ دھندا"۔ "بھول بھلیاں"۔ "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ"۔ "بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ"۔ "اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" وغیرہ وغیرہ۔

ہمیں یہ عنوانات پڑھ کر قارئین کی عقل پر رونا آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے سخن فہمی کا دیوالہ پٹ چکا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا خود ہی اس نظم کا عنوان سوچیں گے۔ چنانچہ آج سہ پہر سے مغز پچی کر رہے ہیں۔ لیکن ہماری مشکل حل ہوتی نظر نہیں آتی۔ آپ نے بھی تو یہ نظم ملاحظہ فرمائی۔ آپ ہی کچھ دستگیری کیجیے۔ ہاں ذرا سوچ کر بتائیے کہ اس نظم کا کیا عنوان ہونا چاہیے۔

احتیاطِ عشق

حجاب امتیاز علی

میں اوپر کی منزل میں عرشہ پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی نیچے پائیں باغ مرتیا کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

اتنے میں باہر کے صدر دروازے پر کسی نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ "کیا واہیات ہے" میں نے اپنے دل سے کہا۔ کتاب کا یہ ورق کتنا دلچسپ تھا۔ تحریر میں روانی کے ساتھ گمق تھا۔ لوگ واقعی بہت ستاتے ہیں۔ کم از کم یہ صفحہ ختم کر لینے دیتے۔ مجھے چاہیے دو ایک ضبیث کتے پال لوں تاکہ بے وقوف دوستوں سے نجات ملے۔"

بڑبڑاتے ہوئے میں نے کتاب بالکنی کی دیوار پر رکھی نیچے باغ کی طرف جھانک کر دیکھا۔ نجانے میں نے کتنی ہی کتابیں دوستوں کی مداخلت بے جا کی وجہ سے بالکنی پر رکھیں اور بھول گئی یا ہوا کا جھونکا انہیں اڑا لے گیا۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو اچھا خاصا چھوٹا سا کتب خانہ بن جائے۔ اور یہ سب دوستوں کی وجہ سے! ہاں —— تو میں نے کتاب حسب معمول و عادت بالکنی کی دیوار پر رکھی اور نیچے باغ میں جھانک کر آنے والے کو دیکھنے لگی۔ دیکھا تو میری پیاری اور ہمراز ساتھی ایلیزا اوپر چلی آ رہی تھی۔ میرا غصہ خوشی سے اور اکتاہٹ مسکراہٹ سے بدل گئی۔ ہم مذاق دوست آئے تو دل کی کلی کھل جاتی ہے۔

"آؤ آؤ۔ چلی آؤ۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم تھیں۔" میں نے چلا کر کہا۔

"سنو" وہ زینے دوڑ کر طے کرتے کرتے بولی: "میں تم کو ایک بے حد پیاری بات سنانے آئی ہوں۔"

"ہائے جلدی سناؤ۔"

"آج رات منیر آ رہا ہے۔" وہ ہانپتے ہانپتے بولی۔

"منیر!!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ ہنس پڑی: "تم بھلے وہ منیر۔ پانچ دن کی چھٹی پر آ رہا ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اس سے میری ملاقات کراچی کی بندرگاہ پر ہوئی تھی۔ میں نے یکایک اپنے دل میں اس کی گہری محبت محسوس کی تھی۔ اور اس کے بعد ہا سے عہد و پیماں ہوئے۔" یہ کہہ کر اس نے جھک کر دیوار پر سے عشق پیچاں کا ایک پھول توڑ لیا اور اسے سونگھنے لگی۔

"لیکن ایلیزا۔ تم نے محبت میں عجلت تو نہیں کی؟" میں نے صبح کے مہکتے آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بس رہنے دو تم اپنی احتیاطِ عشق" رہنے دو۔ تم دوسروں کو بزدلی سکھاتی پھرتی ہو۔" میں نے پہلی ہی نظر میں دل کھو دیا تھا

کی پرستش شروع کردو گے۔ بات یہ ہے۔ اس کے صندلی رنگ اور اُس کی دیوقامتی کی میں شیدائی ہوں۔ آنکھوں میں گہرائی ہے اور مسکراہٹ میں جادو کی اظہاریت۔"

میں اپنی کتابیں سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے اور اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اچھا اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تم میرے پاس کس غرض سے آئی ہو؟"

ایفو مرشہ چمن کی ایک نیچی سی دیوار پر بیٹھی ٹانگیں ہلا رہی تھی مسکرا کر بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ اسے بجائے کسی ہوٹل یا ریستوران میں مدعو کرنے کے ——— تمہارے سنگِ مرمر کے شہ نشین میں رات کے کھانے پر مدعو کروں۔ وہ محبت کے خواب دیکھنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ سُرخ گلاب گردن اُٹھا اُٹھا کر نیلے آسمانوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اور تاروں بھری رات کا سناٹا اس شہ نشین کے قریب دبے پاؤں گزر جاتا ہے۔"

جب آدمی محبت کرنے لگتا ہے تو نجانے اس کا لہجہ شاعرانہ کیوں ہو جاتا ہے اس کے احساسات شبنم کی بوند کی طرح نازک اور شفاف کیوں بن جاتے ہیں اور اس کی احساسِ کمتری پر لگا کر کیسے اُڑ جاتی ہے۔

میں نے ایفو کی شاعری سنی پھر بولی: "مجھے کوئی انکار نہیں ایفو۔ تم شوق سے میرے شہ نشین کو اپنی محبت کی آماجگاہ بناؤ۔"

اس نے جھک کر مجھے پیار کیا بولی: "لیکن کھانے پر تمہیں بھی موجود ہونا چاہیے روحی۔"

"شکریہ تمہارا۔ میں ضرور کھانے پر موجود ہوں گی۔ بلکہ شہ نشین کے عقب میں جو رات کی رانی کی جھاڑی لگی ہے اس میں ٹیپ ریکارڈر رکھ کر عشقیہ غزلیں بھی بجاؤں گی۔"

"کیا بات ہے تمہاری روحی۔ واقعی مجھے تو اس کا خیال بھی نہ آیا ہوتا۔ ٹیپ ریکارڈر۔ موسیقی محبت میں چار چاند لگا دیتی ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آئندہ مہینے ہماری شادی بھی ہو رہی ہے۔ تم آج رات اس کی رعنائی کی قائل ہو جاؤ گی۔"

"میں اب بھی قائل ہوں۔ تمہاری زبانی سن چکی ہوں۔"

"لیکن دیکھنے کی اور بات ہوتی ہے روحی۔ تھیوری پڑھنے اور عملاً کام کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ چھریرا جسم۔ آنکھوں میں ملتی مسکراہٹ میں جادو کی اظہاریت۔ جیسے مونالیزا کی مسکراہٹ!"

"لیکن ایفو مجھے کلاسیکی مسکراہٹیں ناپسند ہیں گویا پتے کھانے کی سی مسکراہٹ؟"

"تم ہر وقت اعتراض کرتی رہتی ہو یہ عادت تمہاری بری ہے روحی۔ آج رات تم اس کی مسکراہٹوں کی قائل ہو جاؤ گی۔" ایفو بولی۔ وہ دیوار پر سے کود پڑی اور فرطِ جذبات سے بے چین ہو کر میرے سیامی بلے کو زور زور سے تھپکنے اور اس کے کان کھینچنے لگی۔

مجھے ہنسی آئی اور عجیب سا لگا۔ لیکن میں ضبط کر گئی۔ پھر کچھ یاد کر کے بولی: "چاہے تم پہلے انہیں میرا مہمان مگر۔ چند دنوں کی تو بات ہے۔"

وہ مسرت سے مجھ سے چمٹ گئی۔ "کمال کی صندوقچی۔ ایسی خوبصورت تو ایک ہار نشاط جیسی ہی رکھ سکتی ہے"
میں بولی۔ "بات یہ ہے میں نے ابھی ابھی گلستان کی چوٹی پر ایک گلابی رنگ کا گھر دیکھا ہے۔ ایک آسمانی رنگ کا بیا
اس میں بنت کی ہے۔ وہ نیچے پر کچھ کاسنی جال کے پھٹے لگے ہیں۔ چاہو تو تم اپنے گلابی کی پیکر کو اس قوس و قزح میں ٹھہرا
سکتی ہو۔"

"وہ اسی قابل ہے کہ اسے قوس و قزح میں ٹھہرایا جائے۔" وہ شدت مسرت سے چیخ پڑی۔

دعوت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں جلدی میں اپنے بستے میں چھوڑ کر کنگ پارک چکسٹ میں جا کر کو جہنی۔ اور ہدایات دینے لگی۔ باورچی کو تاکید کی کہ بریانی کا گوشت بالکل چھوٹا ہو جائے۔ یعنی اتنا نرم کہ چڑیا بھی کھا سکے۔ اور ہر سالن میں زعفران کی افراط ہو۔ میٹھے میں مٹھاس کی انتہا ہو۔ اور نمک مرچ بہت احتیاط سے استعمال کرے۔ میں نے کھانوں کی فہرست دیکھی تو نیچے سیٹ چاہو دیتے۔ ال کپل علیحدہ اور کھانا میرے اس سے علیحدہ۔ اس کے بعد عالی وہ ہے کہ سگریٹ پیش کیے جائیں کے خیال سے تمام کو سب میں نمک کے میز کے سرے پر رکھنے کو بھی کہہ دیا تھا۔ پھر باغ کے دروازے میں بیٹھ کر کافی پینے علیحدہ انتظام تھا۔ کافی کے ساتھ ٹیمپل بادام تھے۔

بوڑھا باورچی گہری سوچ میں مبتلا سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ ممکن ہے سوچ رہا ہو کہ میں شاہزادیوں کی دعوت کر رہی ہوں۔

جہاز آٹھ بجے آنے والا تھا۔ مگر ہم نے وہ دوپہر چھوٹوں صدیوں جیسی باغ کی ایک روش پر بیٹھ کر شطرنج کھیلتے ہوئے بسر کر ڈالی۔ کیونکہ انتظار کی گھڑیاں صدیوں میں کٹتی ہیں۔ ہم دونوں ہی کھیل میں ہارتے رہے۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ کھیل رہے ہیں۔ گہرے گلابی رنگ کی ایشیائی دوپہر تھی۔ آسمان پگھلے ہوئے نیلم کی طرح دمک رہا تھا۔ کاسنی ٹہنیوں پر سبز رنگ کے بیٹھے درد محبت کے نغمے الاپ رہے تھے۔ وہ دوپہر ہم نے بڑے اضطراب میں کاٹی۔

میں پہلے کہہ چکی ہوں جہاز آٹھ بجے آنے والا تھا۔ ملکہ نیلم شام کے چھ بجے ہی سے زرق برق لباس میں بن ٹھن کر تیار رکھی تھی۔ اس نے ایک ہلکے گلابی رنگ کی چادر جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ جس کا عطر لگا رکھا تھا اور حسین آدمی سے ملاقات کے لیے تیار تھی۔

"ایک مہینے بعد ہماری شادی ہو جائے گی روحی۔ میرے ابا نے پانچ مہینے پہلے عروسی لباس کا آرڈر دے دیا تھا تاکہ شادی میں درزی کی وجہ سے خلل نہ پڑے۔"

"بڑے دور اندیش ہیں۔ بڑا اچھا کیا۔" میں نے تعریف کی پھر بولی۔ "تم نے اس سلسلے میں ہر بات کا انتظام کر دیا ہے۔ پھر بھی تم نے جست کی۔ مجھے بھی عروسی لباس دکھا لیا۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ اسی کو کہتے ہیں ڈیئر۔"

"ورنہ اور کیا کرتی؟ میں تم جیسی سست نہیں ہوں کہ ایک بات پر گھنٹوں سوچتی رہ جاؤں۔ اور ایک اخر پر سالوں جو رکی رہوں۔" انہوں نے شرارت سے مسکراہٹیں بکھیر کر جائیں۔

میں بولی: "میں تم کو تیزی کہاں سے لاؤں! یہ تو فطرت ہے۔"

ایفو مسکرا کر کہنے لگی: "لیکن تم منیر کو دیکھو گی تو انگشت بہ دنداں رہ جاؤ گی اور میری تیزی پھرتی کا رونا دوبارہ نہ روؤ گی۔
پھریلا جسم۔ آنکھوں میں چمک۔ مسکراہٹ میں بلا کی اطہاریت۔"

بہار کی اس ہوشربا حسین رات میں جب ہم منیر کو لینے ہوائی اڈے پر پہونچیں تو معطر ہوائیں ہمارے رخساروں کو مس کرنے لگیں۔ ایفو بات بات پر بلاوجہ قہقہے لگا رہی تھی اور میں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایفو کہنے لگی۔ "میں نے تم کو بتایا نہیں۔ اب منیر فوج میں شریک ہو گیا ہے۔ پہلے محض شاعر تھا۔ اب ری باقاعدگی نے اسے اور دلکش بنا دیا ہوگا۔" وہ ہنسے جا رہی تھی۔

"فوجی باقاعدگی؟" میں نے کہا۔ "مگر اس سے تو انفرادیت ماری جاتی ہے۔"

"ماری جاتی ہے تو ماری جانے دو۔ بانکپن تو پیدا ہو جاتا ہے۔" ایفو نے جھلا کر کہا۔

"ضرور۔" میں نے جواب دیا۔

وہ اپریل کی تاروں بھری رات تھی۔ —— اتنے میں اچانک تاروں کے نیچے ایک دم دار تارہ ابھرا۔ وہ ہوائی جہاز ہ۔ پھر وہ زمین پر لڑکھڑاتا یوں اترا کہ میں نے سمجھا کوئی شہاب ثاقب ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔

مسافر اترنے لگے۔ ہم دونوں دور کھڑی ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھیں۔ زمین پر اتنی روشنی نہ تھی کہ ہم مسافروں کی شکلیں دیکھ سکتے۔ آخر بمشکل ہمیں ایک دراز قد آدمی ہاتھ میں بیگ لیے اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔

ایفو چیخ پڑی۔ "وہ رہا —— وہ —— ہنس کی طرح چلتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ چلا آ رہا ہے ——"

میں بھی اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

"منیر!" شدت جذبات سے پست آواز میں ایفو چیخی۔

"ایفو!" منیر چلایا۔

جب ہم تینوں مسافروں کے اژدہام اور اندھیرے کے سیلاب سے باہر روشنی میں نکل آئے تو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک ... یکہ فربہ اندام آدمی جس کی آنکھوں میں وحشت تھی جس کی رنگت تقریباً سیاہ تھی جس کے بھدے پن نے اسے احمق سا بنا رکھا تھا ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر اس راز کا بھی انکشاف ہوا کہ اس کے ہونٹوں کے گرد مونچھوں کی کمان گئی ہے۔

"ہائے —— میں" ایفو اچانک زور سے چیخ پڑی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہائے —— یہ —— یہ نہیں ہو سکتا۔"

مرد نے پلٹ کر دیکھا، مسکرا کر بولا۔ "کیوں نہیں ہو سکتا! اسے ایفو پیاری۔ سال بھر میں تم مجھے بھول گئیں؟ میں منیر ہوں۔"

مجھے ہنسی سی آ گئی جسے میں نے بڑی احتیاط سے روکنے کی کوشش کی۔ فوجی تربیت نے اس میں بانکپن پیدا کر دیا ہوگا۔

ایلز کے [illegible] آوازوں میں گونجنے لگے۔

ایلز کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں سوال کر رہی تھی۔ "تم؟"

"تمہیں شبہ ہے ایلز؟" کہنے والا [illegible] انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"کاش کہ شبہ ہوتا۔ یقین نہ ہوتا ——" ایلز بے حد پریشان لہجے میں بولی۔ "خیر باہر تو نکلو۔ کار کھڑی ہے۔"

ہم تینوں کار میں جا بیٹھے۔ دو تین منٹ موت کی سی خاموشی طاری رہی۔ چشم زدن میں تختہ اُلٹتے دیکھ کر میں خود حیران تھی۔ ایلز پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ دائیں بائیں میں اور ایلز تھیں۔ درمیان میں وہ اکڑا بیٹھا تھا۔ مجھے زور کی ہنسی آ رہی تھی جو میں سر دوپٹے سے باندھے رومال سے اپنا منہ بند کر رہی تھی۔ جعلسازی اور جگت کی ایسی عبرتناک سزا کسی کو پاتے ہوئے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ایلز بدحواس اور غمگین بیٹھی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس نے منیر پر ایک سرسری نظر ڈال کر پوچھا: "آخر بتاؤ تم کو ہو کیا گیا۔ کیا افتاد پڑی؟ اتنے بدل کیسے گئے؟"

"میں بدل سکتا ہوں ایلز؟ وہی دل ہے وہی جذبات!"

"مگر —— تم وہ نہیں رہے ——! سال بھر میں درخت بھی اتنے بدل نہیں جاتے جتنے تم بدل گئے ہو؟"

"کس طرح پر بدلا ہوں؟" مہمان عزیز نے معصومیت سے سوال کیا۔

شاید اس کے لہجے کی معصومیت کا احساس ایلز کو بھی ہو گیا: "مرا مطلب ہے۔ بس۔ یہی —— تم زندہ رہے —— اچھا یہ دیکھو —— یہ آ گیا ہوٹل گلستان۔ تمہارے لیے سب سے اعلیٰ درجے کا کمرہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔"

میں حیران ہو کر ایلز کو دیکھنے لگی بولی۔ "یہاں؟"

ایلز ذرا تلخی سے بولی۔ "ہاں ہاں یہاں۔ یہاں یہ زیادہ آرام سے رہیں گے۔" پھر وہ منیر کی طرف مڑ کر بولی: "اگر نائٹ کوچ سے میں آج چلی نہ گئی تو کل صبح تم سے ملاقات ہو سکے گی۔ خدا حافظ۔ فی امان اللہ ——!"

منیر خاموشی سے اُتر کر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم اپنے گھر پہنچے تو باورچی خانے کی طرف سے گرم کافی کی معطر لپٹیں اور بریانی کے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی جو سب میں پھیلی ہوئی تھی مگر ایلز کی اشتہا غائب تھی اور وہ گہری سوچ میں تھی اور میں بے احتیاطی عشق پر غور کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ بولی: "زوجی۔ آج کی نائٹ کوچ سے میں بڑی دُور جا رہی ہوں۔ پھر کبھی تم سے ملاقات ہوگی۔" وہ باغ کے زینے طے کر کے باہر نکل گئی۔

ایک واقعہ ہے۔ مگر سچا۔ کاش آپ اسے کہانی سمجھیں۔

کوڑیوں کے مول



تحریر : بمل مترا

ترجمہ : احمد سعدی

مختصر حالاتِ زندگی

میں ۱۸ مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتہ کے ایک متوسط طبقے کے بنگالی گھرانے میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بنگالی زبان میں ایم اے کیا۔ پھر انڈین ریلوے میں ملازمت کر لی اور مختلف عہدوں پر کام کرتا رہا۔ [illegible] ہی ریلوے افسر [illegible] کی حیثیت سے [illegible]

دوران ملازمت مجھے ہندوستان کے [illegible] اور ملک میں بسنے والے مختلف طبقے اور [illegible] کے لوگوں کے مسائل اور حالات جاننے کا بھی موقع ملا۔ ۱۹۵۶ء میں نے ملازمت چھوڑ دی اور مستقل طور پر تحریر و تصنیف کو ذریعہ معاش بنا لیا۔

میں اب تک کوئی [illegible] ناول اور [illegible] لکھ چکا ہوں۔ ان میں "صاحب بیوی غلام" [illegible] زیادہ [illegible] ناول کے [illegible]

میرے دو ناول "صاحب بیوی غلام"، "کوڑیوں کے مول" اور "اکائی دہائی سینکڑہ" [illegible] (ہندوستان میں [illegible]) [illegible] ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء (جب چین نے ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد پر حملہ کیا تھا) کے زمانہ [illegible] لکھے گئے ہیں۔

میرا تازہ ناول [illegible] جو کلکتہ کے ایک بنگالی ہفتہ وار "دیش" میں قسط وار چھپ رہا ہے۔

میری تصانیف کے بیشتر حصے کا تمام ہندوستانی زبانوں و دیگر غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔

"کوڑیوں کے مول" کا ترجمہ انگریزی اور [illegible] میں ہو چکا ہے [illegible] اردو اور ملیالم میں ہو رہا ہے۔

بمل مترا

بمل مترا کی [illegible] کے حالات زندگی [illegible] — (ادارہ)

کوڑیوں کے مول

دوسری قسط

بمل مترا

ترجمہ: احمد سعدی

لیکن دُوسرے دن شام ہی کو دیپنکر دھر لیا گیا۔

بہت سارے راستے، بہت سارے فاصلے طے کرنے کے بعد دیپنکر کو احساس ہوا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ... دُوسرے لوگوں کی طرح دیپنکر بھی تو عام اور سادہ سی زندگی گزار سکتا تھا! جیسی زندگی اجینکر، رام مورتی اور سوم گزار رہے تھے! ... ملازمت کر رہے ہیں! ملازمت میں ترقی پائی ہے، شادی کی ہے، ان کے بچے ہیں، صبح کو دفتر جاتے ہیں اور شام کو گھر واپس ... دنیاداری کرتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں! ان لوگوں کو تو کوئی کمی نہیں ہے، پھر دیپنکر کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ وُہ بھی ایک ... میں بھرتی ہوا تھا! دُوسرے پانچ آدمیوں کے ساتھ جو کچھ پیش نہیں آتا، اس کے ساتھ پیش آیا تھا، ملازمت میں خلاف ... ترقی ہی تھی! لوگ سب سین صاحب کہتے تھے، لیکن سین صاحب بن کر بھی کیا ہوا! سین صاحب بننے کے بعد بھی بار بار ... کے دل میں یہ احساس جاگا تھا کہ خود اُس کے وجود کے اندر جیسے اس کے وجود کی کوئی انتہا نہ تھی! پھر باہر کی روشنی اور ہوا کے ... باہر کے دانہ اور پانی کے ساتھ ایسا گہرا رشتہ کیسے قائم ہو گیا! کیوں اس دن اُس نے امرا کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر کھڑکی میں ... رہا تھا! کرن سی کشش تھی! اتنی چھوٹی سی عمر میں اس کے اندر ایسی کوئی کشش تو نہیں رہنا چاہیے تھی!

واقعی، دُوسرے ہی دن شام کو دیپنکر دھر لیا گیا۔

کرن اس روز بھی اسکول آیا تھا، اسکول کے بعد دیپنکر نے پوچھا —— "اے آج اس سادھو کے پاس نہیں جاؤ گے؟"

"سادھو کے پاس تو شام کو جائیں گے۔" کرن نے جواب دیا —— "چلو سہ پہر کو میٹنگ میں تقریر سن آئیں۔"

"کہاں؟"

"برٹش پارک میں۔"

برٹش پارک میں اس روز ایک بہت بڑی میٹنگ تھی، پولیس سے میدان بھرا ہوا تھا، دیپنکر کو پہلے پہل بہت خوف محسوس ... پھر بھی بہت بڑا مجمع لگا ہوا تھا۔

کرن اس طرف روزانہ جیسے آتا تھا، اُسے کوئی خوف نہیں تھا۔

اُس نے کہا —— "آؤ، اندر آؤ۔"

اندر بہت سارے لوگ زمین پر بیٹھے تھے، کانگریس کی میٹنگ تھی، دو چھوٹی چھوٹی میزیں پڑی تھیں، ایک گیس بتی رکھی ... اندھیرا ہونے پر جلائی جائے گی، دو معزز کرسی پر بیٹھے تھے۔ نصف پارک میں لوگ بھرے ہوئے تھے، قریب ہی دو تین کرسیاں ... رکھی تھیں، اخبار کے رپورٹر اور پولیس کے آدمی کاغذ پنسل لیے ہوئے بیٹھے تھے۔

دیپنکر کو یاد ہے، وہ کسی کا نام نہیں جانتا تھا، پتا کہ یہ بانسے کون ہے، گنگا نیوگی کون ہے —— اور سبھاش

بوس کون ہے، وہ کچھ بھی نہ جانتا تھا۔

دینکر نے پوچھا ـــــ "سبھاش بوس کون ہے؟"

کرن نے جواب دیا ـــــ "سبھاش بوس نہیں آتے ہیں، گیانجن نیوگی آتے ہیں، دیکھنا، ایسی تقریر کریں گے کہ تم دو دن ... وشین بائیسکوپ بھی دکھایا جائے گا۔"

صرف تقریر ہی نہیں تھی اس کے ساتھ میجک لینٹرن بھی تھا ایک سفید پردے پر عکس پڑنے لگا۔ جیسے غیر متحرک بائیسکوپ ہو۔ غیر متحرک عکس تقریر کا سب کچھ آسانی سے سمجھ میں آجاتا تھا۔ فرنگی سپاہیوں نے آکر کس طرح ہندوستان پر قبضہ کیا، انگریزوں نے کس طرح صنعت گروں کی انگلیاں کاٹ ڈالیں، مزدوروں پر ڈھائے جانے والے مظالم، نیل کے کھیتوں پر بے رحمانہ مظالم، یہ سب سبھی کچھ دکھایا جا رہا تھا اور گیانجن نیوگی تقریر کر رہے تھے۔ کیا تقریر تھی، تمام لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ سیکڑوں ... سو ظلم ڈھا کر انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا، انگریز کتنے وحشی، بدمعاش اور ظالم تھے، عکسی تصویر ... دکھایا جا رہا تھا۔

گیانجن نیوگی نے کہا ـــــ "ہم لوگ انسان ہیں یا جانور؟ ہم لوگ درخت ہیں یا پتھر؟ ہم لوگ کیا ہیں؟ ہم لوگ انسان نہیں ... بھی نہیں ہیں، جانور ہوتے تو بھی ہم لوگ بلبلاتے، احتجاج کرتے، بدلہ لیتے، ان لوگوں نے ہمیں گولیوں سے ہلاک کیا ہے اور ... لوگوں نے کیا کیا ہے؟ آپ لوگ بتائیے ہم لوگوں نے کیا کیا ہے؟"

ایک آدمی نے جواب دیا ـــــ "ہم لوگوں نے ان کی خوشامدیں کی ہیں ـــــ"

گیانجن نیوگی نے کہا ـــــ "نہیں، ہم لوگوں نے انگریزوں کے پاؤں چاٹے ہیں۔"

قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہا ـــــ "ٹھیک، ٹھیک ـــــ"

گیانجن نیوگی کی تقریر جاری تھی ـــــ "اس کا مہینہ تھا، مداری پور کے راستے سے مسٹر کیٹل جا رہے تھے۔ ... جوائنٹ مجسٹریٹ تھے، ان کے قریب سے ایک کالج کا طالب علم چھتری سر پر تانے ہوئے چلا جا رہا تھا، یہ دیکھ کر صاحب کا غصہ ... اندر کھول اٹھا، اتنی ہمت! صاحب کے سامنے سر پر چھتری تان کر چلے گا! سیاہ نیٹو، اس کی یہ ہمت؟

صاحب نے کہا ـــــ "چھتری بند کرو!"

لڑکے نے حیران ہوکر پوچھا ـــــ "کیوں، چھتری کیوں بند کروں؟"

صاحب نے کہا ـــــ "میرا حکم ـــــ"

لڑکے نے پوچھا ـــــ "تم کون ہو جو تمہارا حکم مانوں؟"

صاحب نے کہا ـــــ "دیکھو گے میں کون ہوں؟ یہ دیکھو ـــــ"

اتنا کہہ کر کوڑے کرپٹنے لگے، لڑکا نیم جان ہوکر وہیں پڑا رہا اور صاحب چلا گیا۔

معاملہ عدالت تک پہنچا، مقدمہ ہوا، فیصلہ ہوا اور جج نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا ـــــ قصور لڑکے کا ...

صاحب کو غصّہ دلا دیا تھا، کپٹل صاحب کا کوئی قصور نہیں! اس کے بعد اسپیشل صاحب خود تحقیقات کرنے آئے۔ انھوں نے اپنے بیٹے ہی کہا ——— اننت موہن داس اور اس کے تینوں ساتھیوں کو مجسٹریٹ کے سامنے لا کر تیس تیس بید لگائے جائیں، دوستو! اگر ہم انسان ہوتے تو ان بیدوں کے نشانات ہماری پیٹھ پر بھی پڑتے! ہم لوگ پیڑ اور پتھر ہیں، اسی لیے ان انگریزوں کے پاؤں چاٹتے ہیں اور لوگ جو میرے قریب بیٹھے ہوئے ایشیم رود کے لیے رپورٹیں تیار کر رہے ہیں ——— ان لوگوں کو کیا نام دوں ———

اتنا کہہ کر انھوں نے جوتے سمیت اپنا پاؤں زمین پر دے مارا۔

یکایک پولیس باہر سے دوڑتی ہوئی آئی اور لاٹھی چلانے لگی، مجمع میں ہنگامہ پیدا ہو گیا اور جو لوگ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے تقریر سن رہے تھے، اٹھ کر بھاگنے لگے۔

یکایک کرن نے کہا ——— بھاگ چلو دینو، جلدی بھاگ چلو ———

اس کے بعد کہاں گیا کرن، کہاں گیا دینکر، اور کہاں گیا برٹش پارک، ابھی تک اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ گلی کے اندر ہی اندر وہ کہاں سے کہاں جا نکلا، ایلجھم ہاجرہ روڈ پر پہنچ گیا، وہاں سے چند ہی قدم کے فاصلے پر حاجی قاسم کا مکان تھا، بہت بڑی بلڈنگ تھی، وہاں سے گزر کر رام دھنی کی پان کی دکان کے قریب سے گزر کر وہ ایکدم حاجی قاسم کے بازار میں جا پہنچا، ٹیپو سلطان کی بلڈنگ کے سامنے ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ تھا، وہاں سے برگد کے پیڑ کے پیچھے سے ہوتا ہوا وہ سیدھا اگن کاری کے تالاب کا چکر لگا کر ایشور گنگولی لین میں شیلا کے قریب آپہنچا، اس وقت تک دینکر کی حالت سکون سے سوچنے کے قابل ہو چکی تھی، اس طرف کوئی گھما گھمی نہیں تھی، یہاں پہنچ کر دینکر نے اچھی طرح نگاہ دوڑا کر دیکھا، آس پاس، دائیں بائیں، آگے پیچھے کہیں کوئی پولیس نہیں تھی، دوڑتے دوڑتے وہ بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ اتنی دیر میں اب اس کی سانس درست ہوتی تھی، کرن کہاں گیا؟ اس کے ساتھ سادھو کے پاس جانے کی بات تھی، وہ بھی پوری نہیں ہوئی۔ دینکر آہستہ آہستہ ایشور گنگولی لین کی طرف چلنے لگا، بنکو کی دکان میں بگینی اور آلو چاپ کے خریداروں کی بھیڑ لگنا شروع ہی ہوئی تھی اور مدھوسودن کی دہلیز پر اس وقت تک اڈہ جما ہوا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے پکارا ——— "ماں" ———

ماں نے اسے دیکھتے ہی کہا ——— "تم اتنی دیر تک کہاں تھے کھوکا؟ میں یہاں بیٹھی بیٹھی فکر میں گھل رہی تھی۔"

شام کو ماں موڑھی رکھ دیا کرتی تھی، صبح شام قسمت میں موڑھی ہی لکھی تھی، اور گڑ بھی کسی کسی دن پتا بھات۔ اس کے بعد وہ باہر نہیں نکلتا تھا، شام کے بعد ہی وہ پڑھنے بیٹھ جاتا، لیکن پڑھتے وقت بھی اس کا دھیان دوسری طرف رہتا، کرن اس وقت کیا کر رہا ہوگا، ممکن ہے پولیس کی لاٹھی کھا کر راستے میں پڑا ہو، ہو ممکن ہے لوگ اسے ہسپتال لے گئے ہوں، ایسی ہی بہت ساری باتیں وہ سوچتا رہتا!

ماں کہتی ——— "کتابیں سامنے رکھ کر بیٹھا بیٹھا کیا سوچ رہا ہے رے؟"

تھوڑی دیر بعد ہی ماں باورچی خانے میں چلی جاتی، چولہے پر ہانڈی چڑھاتی اور وہ "اگھمہ" دادو کے صندوق سے ٹیک لگا کر پڑھنے لگتا۔

...میں وہ چھپ رہا تھا، یکایک سے ویسا شور سنا تھا جیسے دوم جھم دم جھوم کی آواز پیدا کرتے ہوئے گھنگرو بج اٹھے ہوں ... کی طرح جیسے کوئی ناچ رہا تھا۔ حیرت سے اس نے سوچا تھا کہ وہ کون ہو سکتی ہے، بھلا شہر میں کیسے آسکے گا اور گھنگرو کیسے بجے گا۔ بھلا یہاں کوئی پاگل ہے؟ لیکن اس کی لڑکی ناچ رہی ہے؟ بنتی دیدی تو کبھی نہیں ناچتی۔ آس پاس کے مکانوں میں تو کوئی بھی نہیں ناچتا۔ حالانکہ کتنے ہی مکانوں میں کتنی لڑکیاں رہتی ہیں۔ ایشور گنگولی میں، نیپال بھٹاچاریہ، اشرف شیخ، کالی گھاٹ روڈ، شاہ گنج روڈ اور شاہ نگر میں کتنے ہی لوگ بستے ہیں، کوئی بھی تو نہیں ناچتا۔ یہ لوگ دیکھنے میں شریف ہیں، شریف قسم کے لوگ ہیں، اس سے پہلے بھی تو کتنے ہی لوگ آتے تھے جو اس طرح تو کوئی بھی نہیں ناچتا تھا۔ اگر ناچتے تو ضرور معلوم ہو جاتا۔ اتنی بڑی لڑکی بھلا کیسے ناچتی ہے؟ شرم نہیں آتی۔

دیپکر باورچی خانے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ماں اس وقت بہت مصروف تھی، چولہے پر سالن کی کڑھائی چڑھا کر چاول کی چھال صاف کر رہی تھی۔

"ماں!" اس نے پکارا۔

ماں جھنجھلا اٹھی، بولی ـــ "پڑھنا لکھنا چھوڑ کر تو یہاں کیوں آیا بیٹا؟ تیرا پڑھنا لکھنا کیا چولہے میں گیا؟ اسی طرح تو بڑا آدمی بنے گا؟ اسی طرح تو انسان بنے گا ـــ"

وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس نے سوچا تھا وہ ماں سے دریافت کرے گا ـــ وہ لوگ کیا ہم سے شریف ہیں؟ وہ لوگ جو ناچتے ہیں، وہ لوگ کیا ہم لوگوں سے مختلف ہیں؟ ہم جیسے نہیں ہیں؟ وہ لوگ ہماری ہی طرح بنگالی ہیں، ہماری ہی طرح کپڑے پہنتے ہیں، بھات کھاتے ہیں۔ پھر ہم لوگوں سے مختلف کیوں دکھائی دیتے ہیں؟ وہ لوگ تو دوسروں کا کھانا نہیں پکاتے، ان لوگوں پر تو کوئی نہیں بگڑتا۔

دیپکر کو یاد ہے، اس وقت دیپکر نے سمجھا تھا کہ تمام کالی گھاٹ کے لوگ ایک ذات ہیں اور اس کرایہ دار کی ذات دوسری ہے۔ اسی لیے ان کے اندر اتنی کشش محسوس ہوتی تھی۔ آس پاس کے تمام لوگ جو اس محلے یا اس علاقے میں رہتے ہیں، وہ لوگ تو اتنے قیمتی پلنگ پر نہیں سوتے، اتنی عمدہ الماری ان لوگوں کے پاس تو نہیں ہے۔ کوئی بہت امیر آدمی جیسے ... گراتیس ایک بی، ایشور گنگولی جیسا کوئی ... مکان میں آگیا تھا۔ ان کے لڑکا چھوٹی بابو کوں جیسا تھا۔ ان کا ملازم بھی سر جھاڑتا تھا، سر کے بال سنوارتا تھا۔ یہ لوگ بڑی شان سے رہتے تو سمجھا، بیرسٹر یا ... کا لڑکا ... اسی طرف رہتا تھا۔ لیکن یہ لوگ اس جگہ بستے ہوئے یکایک متوسط طبقے کے لوگوں کے درمیان کیوں آگئے۔ یہ جگہ کرن کی بستی تھی، یہ جگہ دیپکر کی بستی تھی، یہ جگہ چھنو کی، مدھو سودن اور پران متھ بابو کی بستی تھی، اگھور دادا کے چیلے، پھونٹا اور بنتی دیدی کی بستی تھی، بھگوتی پکوڑی کی دکان کے لیے موزوں تھی۔

دیپکر کو مدھو سودن ہی سے خبر ملی۔

مدھو سودن ہی نے پہلی بار اس سے کہا تھا ـــ "تمہارے مکان میں کون کرایہ دار آیا ہے رے دیپو؟"

دیپکر نے کہا تھا ـــ "کیوں؟ مجھے تو نہیں معلوم ـــ"

مدھو سودن نے کہا تھا ـــ "ہاں رے، میں نے آتے وقت دیکھ کر جو آرہا ہوں، بڑے بڑے جسم، پلنگ اور الماریاں تمہارے گھر کے سامنے اتر رہی تھیں اور گوشت چبانے والے آدمی سب ٹیکسی سے اتر رہے تھے ـــ"

قد سے رُک کر مدھوسودن نے پھر کہا تھا ــــ "سبھی لوگ گورے ہیں، ایکدم میم صاحب لوگوں کی طرح ــــ"

مدھوسودن کی دہلیز پر بھی ان کے بارے میں تبصرے ہونے لگے۔

دونی کا کہنا تھا ــــ "کون آیا ہے رے، اگھور بھٹاچارج کے مکان میں، نیا کرایہ دار معلوم ہوتا ہے؟"

مدھوسودن کے بڑے بھائی نے کہا تھا ــــ "اس محلّے میں ایسے لوگ آئے ہیں، معاملہ کیا ہے، یہ تو جیسے ہنسوں کی ٹولی میں بگلا ہو! ــــ"

محلّے بھر میں خبر پھیل گئی تھی، اس محلّے میں تو ایسا کرایہ دار کبھی نہیں آیا تھا۔ اس محلّے کے لوگ پوئی ساگ کے خریدار تھے، تھوڑا سا پیاز اگر ہو تو گُڑ مسالے کی ضرورت نہیں پڑتی، کبھی مکان کے سامنے ٹیکسی آکر کھڑی ہوتی، تو یہ لوگ حیران رہ جاتے، پتہ لگاتے، کون آیا ہے، کس نے بلایا ہے؟ یہ لوگ دوسرے کو دھوتی پہنے ہوتے دیکھ کر ہاتھ سے ٹٹول کر جانچتے ہیں اور اس کی قیمت کا اندازہ کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے بھوانی پور نہیں ہے، شیام بازار نہیں ہے، یہ قدیم کلکتہ کے پرانے خاندان کا شہر ہے، باون مقدس مقامات میں سے ایک مقدس مقام ہے۔ یہاں تو ایسے کرایہ دار کے آنے کی بات نہیں تھی۔ اس طرف ہریش مکھرجی روڈ، اس طرف لینڈس ڈاؤن روڈ اور اس طرف ایگن روڈ، شمبھوناتھ پنڈت اسٹریٹ ــــ وہ سب متمول لوگوں کا علاقہ تھا۔ اگھور داد کے سبھی بھائی اسی طرف بستے تھے، ایسا شخص انیس ایک بی، ایشور گنگولی لین میں آگیا تھا۔

اُس نے پھر ایک بار آواز دی ــــ "لال!" ــــ

لیکن پوچھتے پوچھتے بھی دینکر کچھ نہ پوچھ سکا۔ اس وقت دال گھونٹ رہی تھی۔

دینکر نگھی پار کر کے سونے کے کمرے میں آرہا تھا کہ اتنے میں اُسے چھم چھم کی آواز سنائی دی۔ دینکر کے قدم رک گئے! پھر آہستہ آہستہ اندھیرے میں چلا گیا اور دامڑ کے پیچھے چھپ کر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا! بڑے آدمیوں کا چہرہ ہی مختلف ہوتا ہے! یہ لوگ اس محلّے میں کیوں آگئے، ان کے گھر میں بھی اسی کا ہم عمر کوئی لڑکا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا، اس کے ساتھ ایک ہی کلاس میں وہ پڑھتا! یہ لوگ اس محلّے میں کیوں آگئے؟

یکایک اُسے محسوس ہوا جیسے گھنگھرو کی آواز رک گئی ہو۔

آواز کیوں رک گئی؟

دینکر اسی کھڑکی کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے کھڑکی کا پٹ کھولا اور اس کے بعد اندر جھانک کر دیکھا۔

"کون ہے؟ کون چھپا ہے وہاں پر؟"

چونک کر وہ بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ ایک آدمی نے آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دینکر نے اندھیرے میں بھی پہچان لیا، یہ وہی ملازم تھا۔

ملازم اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کھڑکی کے دروازے سے اندر کمرے میں لے گیا، دینکر نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ــــ "مجھے تم نے کیوں پکڑ رکھا ہے؟ واہ رے! میں نے کیا کیا ہے؟"

ملازم پہلے اندر جاتے ہی کہا —— چلو، چلو، روز روز جھانک کر دیکھتے ہو ——

دلیپ نے کہا —— واہ رے، میں کیا روز دیکھتا ہوں، یہی رگھو کی آواز سن کر آیا تھا ——

اندر سے کسی کی آواز سنائی دی —— رگھو! پکڑ کر لے آیا؟ اس کو میرے پاس لے آؤ تو ذرا میں اُسے خود پہچانوں۔

دلیپ کو بے حد خوف محسوس ہوا، اُس نے ملازم کا ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن ملازم کے جسم میں بلا کی طاقت تھی، اس نے دونوں ہاتھوں سے اُسے پکڑ رکھا تھا۔

اس نے کہا —— روز روز جھانک کر دیکھا جاتا ہے۔ یہ دیکھو دیدی مونی یہ جانا نہیں چاہتا۔"

اندر سے دیدی مونی کی آواز آئی —— پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔

ملازم نے دلیپ کا ہاتھ کھینچا، عقب میں چھوٹا سا صحن تھا اس کے بعد دو زینے تھے، زینے کے بعد دہلیز تھی، دہلیز پر چڑھنے کے بعد سامنے ہی کمرہ تھا، کمرے کے اندر تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی، ایک کھڑکی پر پردہ لٹکا ہوا تھا، کمرے میں چاروں طرف قیمتی پردے لٹک رہے تھے، ہاتھ پکڑے ہوئے ملازم جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکی نے کہا۔

"ارے تو یہی ہے وہ، یہ تو ننھا منا سا ہے —— کہاں رہتے ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

دلیپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے —— میں نے کچھ بھی نہیں کیا، مجھے خواہ مخواہ پکڑ کر لے آیا ہے۔"

دلیپ نے غور سے اُس لڑکی کو غور سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں شاید کاجل کی دھاریاں تھیں۔ اس وقت کھڑکی سے اُسے یہ سب نظر نہیں آیا تھا، نہانے کے بعد اُس نے سلک کی ساڑی کو بڑی خوبصورتی سے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور دونوں کانوں میں دو ہیرے جگمگا رہے تھے۔

لڑکی اس کے اور بھی قریب آگئی —— "کیا نام ہے تمہارا؟"

دلیپ نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور چہرے سے یہ اندازہ کرنا چاہا کہ اُسے کیا سزا مل سکتی ہے، لیکن اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، اُسے تسلی بھی نہیں ہو رہی تھی اور خوف بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔

لڑکی نے پوچھا —— بتاؤ، تم اپنا نام بتاؤ، جلدی بتاؤ؟"

دلیپ نے کہا —— اگر تم میری ماں سے کہہ دو ——

لڑکی مسکرا دی، اس کے دانت کتنے خوبصورت تھے! اُسے مسکراتے دیکھ کر کچھ تسلی ہوئی۔

"میری ماں کو معلوم ہوگا تو میری ماں بہت خفا ہوگی۔" دلیپ نے کہا —— میں اب ایسا نہیں کروں گا، مجھے چھوڑ دو ——

"ہاں میں تمہیں چھوڑ دیتی ہوں، رگھو تم باہر جاؤ تو۔"

رگھو باہر چلا گیا، اب کمرے میں لڑکی اور دلیپ رہ گئے۔

لڑکی نے کہا —— "بتاؤ، تمہاری ماں سے نہیں کہوں گی، تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں رہتے ہو؟ جھانک کر کیا دیکھ رہے تھے

دینکر نے لڑکی کے چہرے کو گھورتے ہوئے جواب دیا —— "میں سچ کہتا ہوں، میں تم کو دیکھ رہا تھا اور کسی کو نہیں دیکھا۔"

لڑکی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی —— "واہ، بالشت بھر کے چھوکرے کا شوق بھی خوب ہے، مجھے دیکھ رہے تھے، میرے اندر دیکھنے کی کیا بات ہے؟ مجھے کیوں دیکھ رہے تھے، میں شیر ہوں یا بھالو ——"

دینکر نے کہا —— "میں نے خواب دیکھا تھا، اسی لیے ——"

"خواب؟ کیسا خواب؟ میرا خواب دیکھ رہے تھے؟"

دینکر کو اب تک یاد ہے، اس دن کی باتیں یاد کر کے اسے ہنسی آتی تھی۔ بچپن میں دینکر واقعی بہت بے وقوف تھا، اس کے علاوہ اوقات میں للی دیدی کی ایسی لڑکی تو اس وقت تک اس نے نہیں دیکھی تھی۔ ایشور گنگولی لین کے آس پاس جتنی لڑکیاں بھی رہتی تھیں ان میں سے ایک بھی للی دیدی جیسی نہیں تھی۔ دوسری لڑکیاں جس طرح کپڑے پہنتی تھیں، للی دیدی اس طرح کپڑے نہیں پہنتی تھی، وہ ایک طرح سے گھما پھرا کر ساڑی کو جسم کے گرد یوں لپیٹتی تھی کہ نظر میں بہت بھلی لگتی تھی!

للی دیدی نے پوچھا —— "تمہارا گھر کہاں ہے؟"

دینکر نے جواب دیا —— "یہی اگھور دادا کے مکان میں رہتا ہوں —— پرسوں میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ کوئی پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر ناچ رہا ہے، اس کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا تو ایک بھالو پاؤں میں گھنگھرو باندھے ناچ رہا تھا ——"

"اتنی چیزیں رہتے ہوئے تم نے بھالو کو خواب میں کیوں دیکھا؟ میں بھالو ہوں؟"

اتنا کہہ کر للی دیدی ہنسنے لگی۔

دینکر نے کہا —— "نہیں، پران متھر بابو نے کہا تھا، بڑے ہو کر جب تم لوگ کتابیں پڑھو گے تو سب کچھ تمہاری سمجھ میں آجائے گا، خواب کے بھی بہت سے معنی ہوتے ہیں۔"

"یہ پران متھر بابو کون ہیں؟"

دینکر نے کہا —— "ہمارے دھرم داس ٹرسٹ ماڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں، انھوں نے کہا تھا، جو لڑکے بچے ہوتے ہیں، ان لوگوں کے خواب سچ ہوتے ہیں، میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خواب بھی سچا ہے یا نہیں۔"

اس کے بعد قصہ ترک کر دو —— "مجھے چھوڑ دو، میں پھر کبھی ایسا نہیں کروں گا۔"

للی دیدی نے کہا —— "میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گی ——"

اس کے بعد آواز دی —— "رگھو ——"

رگھو کے آتے ہی للی دیدی نے کہا —— "دیکھو تو رگھو، کاکا بابو دفتر سے آئے ہیں یا نہیں؟"

کاکا بابو کون ہیں، کاکا بابو کیسے آدمی ہیں اس وقت دینکر کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا، لیکن اس وقت اسے ایسا لگا جیسے وہ لڑکی کاکا بابو سے مار کھلوانا چاہتی ہے۔

... تمہارے پاؤں پڑتا ہوں، پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا، میری ماں کو معلوم ہوگا تو وہ خفا ہوگی
... ایک ـــ "کاکا بابو آ گئے ہیں، چائے پی رہے ہیں۔"
لڑکی نے کہا ـــ "چلو، چلو، اندر چلو۔"
ڈینگر نے کہا ـــ "میری ماں خفا ہوگی۔"
لڑکی نے کہا ـــ "تم ڈرو مت، تمہارے ساتھ کیا کرتی ہوں ـــ ابھی دکھاتی ہوں۔"
اتنا کہہ کر اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے اندر کو دہلیز سے ہو کر زینے طے کرتی ہوئی وہ چلی گئی، اوپر کا برآمدہ قریب سے
ہوا تھا، برآمدے کے سامنے ایک پردہ جھول رہا تھا۔
لڑکی نے دور ہی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا ـــ "کاکا بابو۔"
اندر سے آواز آئی ـــ "کیا ہوا ممی ـــ کیا ہوا؟"
لڑکی نے کہا ـــ "یہ دیکھیے کاکا بابو، چور کو پکڑ لائی ہوں، یہ دیکھیے ـــ"
اتنا کہہ کر لڑکی ڈینگر کو کھینچ کر کمرے کے اندر لے گئی۔
بولی ـــ "یہ دیکھیے، جسم میں بہت طاقت ہے، یہ دیکھیے ـــ"
اتنا کہہ کر اس کو زبردستی گھسیٹ کر کاکا بابو کے سامنے لے گئی۔
ڈینگر نے دیکھا ـــ ایک صاحب میز کے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ان کے قریب ہی ایک خاتون بیٹھی
تھیں۔
کاکا بابو نے کہا ـــ "چھوڑ دو، چھوڑ دو، چھوڑ دو ممی ـــ آہا، اس کو تکلیف ہوگی ـــ"
ممی دیدی نے چھوڑ دیا، بولی ـــ "کتنا بدمعاش لڑکا ہے، جانتے ہیں کاکا بابو، مجھے بھابی کہہ رہا تھا۔"
کاکا بابو نے کہا ـــ "یہ کیا، تم اُسے بھابی کہہ رہے تھے؟ ممی دیدی کو تم نے بھابی کہا ہے؟"
خاتون بولیں ـــ "ارے ہاں، کیا ہوگا، میں نے اسی وقت تم سے کہا تھا، اتنا بڑا شہر ہوتے ہوئے تم نے
محلے میں کرایہ کا مکان لیا ـــ"
کاکا بابو نے ڈینگر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــ "تم نے ممی کو بھابی کہا ہے؟"
"میں نے بھابی نہیں کہا ہے۔" ڈینگر نے جواب دیا ـــ "میں نے کب تم کو بھابی کہا ہے، واہ رے"
کاکا بابو نے کہا ـــ "پھر تم جھانک کر کیا دیکھ رہے تھے؟"
اتنی دیر میں ممی دیدی ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئی، ڈینگر نے چاروں طرف تعجب سے دیکھا، کتنی خوبصورتی سے سجا
ہوا کمرہ تھا، اس سے پہلے جو کرایہ دار رہتے تھے، وہ کبھی اس طرح کمرے کو سجا کر نہیں رکھتے تھے!
ممی دیدی نے کہا ـــ "میں نے کل ہی گھر سے کہہ دیا تھا کاکا بابو کہ آج وہ بالکل تیار رہے ـــ اور جیسے

ی سوچا تھا ـــــ کہ پھر پہنچ گیا۔"

کاکا بابو کا چہرہ دیکھ کر دیپکر کو قدرے تسلی ہوئی، وہ صورت سے نیک دکھائی دے رہے تھے۔

کاکا بابو کی بیوی کبھی چائے پی رہی تھیں، بولیں ـــــ "میں نے اسی وقت کہہ دیا تھا، اس محلے میں مکان مت لو ـــــ

و میری بات نہیں مانی ـــــ"

دیپکر نے کہا ـــــ "مجھے چھوڑ دیجیے، میں پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔"

کاکا بابو نے کہا ـــــ "واہ رے، میں تمھیں پیٹ رہا ہوں یا تمھیں پکڑ رکھا ہے جو تم اس طرح کر رہے ہو؟ تمھارا

ہے؟"

"میرا نام دیپکر سین ہے۔" دیپکر نے جواب دیا ـــــ "میں اگھور داد کے اسی مکان میں رہتا ہوں۔"

"او، اگھور بھٹّاچاریہ صاحب، وہ تمھارے کون ہوتے ہیں؟"

"میرے کوئی نہیں لگتے، وہ ہمارے ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں، انھوں نے ہی مجھے اور میری ماں کو رہنے

کے اپنے گھر میں جگہ دی ہے، مجھے کھانے پہننے کو وہی دیتے ہیں، مجھے بے حد مانتے ہیں۔"

کاکا بابو نے کہا ـــــ "بہت اچھی بات ہے، میں نے سنا تھا بہت کنجوس آدمی ہیں، خیر جو بھی ہو، تم ہر روز کیوں

سکر دیکھتے تھے؟"

دیپکر نے کہا ـــــ "میں نے پرسوں ایک خواب دیکھا تھا کہ میرے گھر کے پاس کوئی ناچ رہا ہے، چھم چھم چھم چھم گھنگرو

ہے، اس کے بعد کل جب اسکول گیا تو پران منتھ بابو، ہمارے ہیڈ ماسٹر نے پوچھا، کس نے کون سا خواب دیکھا ہے، میں

خواب دیکھا تھا وہ ان کو سنا دیا ـــــ"

"اس کے بعد؟ رُک کیوں گئے، بولو؟"

"وہ خواب سناؤں گا تو آپ لوگ خفا ہوں گے۔"

کاکا بابو نے کہا ـــــ "نہیں، خفا کیوں ہوں گا، بولو کیا خواب دیکھا تھا؟"

دیپکر نے کہا ـــــ "گھنگرو کی آواز سن کر میرا جی چاہا کر جا کر دیکھ آؤں، کون ناچ رہا ہے، اس کے بعد میں گھر

ر کر نکل پڑا، آنگن پار کر کے آپ کے مکان کے سامنے آیا، وہاں آ کر دیکھا کہ بالائی منزل کے ایک کمرے سے گھنگرو کی

سنائی دے رہی ہے، میرا جی چاہا کر جھانک کر دیکھوں، کون ناچ رہا ہے، اس کے بعد آہستہ آہستہ کھڑکی کا پٹ کھول کر

دیکھا ـــــ"

"بولو، رُک کیوں گئے، پھر کیا دیکھا؟"

دیپکر نے کہا ـــــ "میں نے دیکھا کہ ایک بھالو ـــــ"

"بھالو؟ بھالو ناچ رہا ہے؟"

کاکا بابو زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ وہ خاتون بھی یکایک ہنس پڑیں۔

کاکا بابو نے کہا — "کیا کہتے ہو؟ ممی تمہیں بھالو نظر آتی ہیں؟"

خاتون بھی ہنستے ہنستے بولیں — "ارے! کیا ہوگا ایسا خوبصورت چہرہ اور اُسے بھالو لگتا ہے۔"

دیپنکر نے کہا — "وہ تو خواب تھا، خواب کیا سچ ہوتا ہے؟ خواب سچے ہوتے ہیں یا نہیں یہی دیکھنے کے لیے تو۔۔۔ جانک کر دیکھ رہا تھا، دیکھا کہ میرا خواب سچ نہیں تھا۔ پہاں تک بابو جی نے کہا ہے — جو عظیم انسان ہیں ان کے خواب سچے ہوتے ہیں۔ تو غریب آدمی کا لڑکا ہوں، میرے خواب کس طرح سچے ہوں گے؟"

کاکا بابو نے کہا — "دل لگا کر پڑھو۔ بچے! اس مرتبہ کلاس میں کیا ہوئے تھے؟"

"میں ہر مرتبہ فرسٹ ہوتا ہوں۔" دیپنکر نے جواب دیا۔

"واہ، ویری گڈ! کون پڑھاتا ہے تمہیں؟"

"میں خود پڑھتا ہوں۔" دیپنکر نے جواب دیا — "حساب کرن کے بابا سمجھا دیتے ہیں، کرن کے بابا بہت۔۔۔ جانتے ہیں —"

"وہ تم ممی سے حساب اور انگریزی پڑھ سکتے ہو — بچے! ممی تمہیں بہت اچھی انگریزی سکھا دے گی، ممی بہت اچھی جانتی ہے۔"

ممی دیدی نے کہا — "واہ رے، کاکا بابو، آپ بھی کیا اچھے آدمی ہیں، میرے پاس وقت کہاں ہے، مجھے تو خود۔۔۔ پڑھنے کے لیے وقت نہیں ملتا، اس کے علاوہ سوشل ہے، رقص ہے —"

"کوئی بات نہیں،" کاکا بابو نے کہا — "غریب لڑکا ہے، ذرا سا بتا دو گی تو کیا ہوا۔"

دیپنکر کی یکایک ہمت بڑھ گئی، اُس نے کہا — "گاؤں میں پہلے ہم لوگوں کی حالت بہت اچھی تھی، میرے بابو جی کو۔۔۔ نے قتل کر دیا تھا، اسی وقت سے میری ماں مجھے لے کر کلکتہ چلی آئی تھی، ماں اگھور دادو کا کھانا پکاتی ہے، اگر اگھور دادو نہ اُن کو پناہ نہ دیتے تو ہم سب مر گئے ہوتے۔"

کاکا بابو نے کہا — "ٹھیک ہے، تم آجایا کرو، ممی تمہیں پڑھا دیا کرے گی۔"

ممی دیدی نے کہا — "لیکن میری اپنی پڑھائی نہیں ہو سکے گی کاکا بابو۔"

اُنھوں نے کہا — "ستی تو کلکتہ آ ہی رہی ہے، ستی کے آنے کے بعد اُسے بھی تو تمہیں پڑھانا ہوگا، اسی کے ساتھ اسے بھی پڑھا دو گی —"

دیپنکر نے کہا — "انگریزی ہی مشکل ہے، حساب میں کرن کے بابا سے سیکھ لوں گا۔"

اُنھوں نے کہا — "انگریزی، حساب اور بنگالی، سب کچھ تمہیں ممی پڑھا دیا کرے گی، ممی بہت اچھی انگریزی جانتی ہے، وہ تمہیں بھی پڑھا سکتی ہے — کیوں ممی؟ اس کو اس مرتبہ دس روپیہ اسکالرشپ ملا ہے — تمہیں معلوم ہے کم۔۔۔"

تمہارے بابا تمہارے ریزلٹ کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے ہیں، اُنھوں نے لکھا ہے دوستی کو بھی یہیں بھیج رہے ہیں، دونوں بہنیں ایک ساتھ پڑھیں گی۔"

ٹمی دیدی نے کہا ——— "ایک ساتھ رہ کر جو پڑھائی ہوگی وہ میں جانتی ہوں، ستی کو تو آپ نے دیکھا نہیں ہے کاکا بابو۔"

خاتون نے کہا ——— "مجھے یاد ہے، میں نے ستی کو چھوٹی سی عمر میں دیکھا تھا، تمھاری ہی طرح گوری تھی، ہے نا؟"

ٹمی دیدی نے کہا ——— "وہی ستی اب ایسی ہوگئی ہے نا کہ دیکھ کر آپ پہچان نہ سکیں گی کاکی ماں ——— اسی عمر میں میرے برابر ہوگئی ہے۔"

اتنے میں ایک ملازم دروازے پر آکر کھڑا ہوگیا۔

کاکی ماں نے پوچھا ——— "کیا ہے ٹھاکر؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کھانا تیار ہے ماں"، ٹھاکر نے جواب دیا ——— "نکال دوں؟"

کاکی ماں نے کہا ——— "کیا کہتے ہو ٹھاکر، ابھی تو چائے پی ہے، ابھی کھاؤں گی؟ تم تو دیکھتے ہو، بات ختم کرکے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہو، تھوڑی دیر بعد تمھیں خبر دوں گی۔"

دیپنکر نے کہا ——— "ماں کو فکر لگی ہوگی، میں جاتا ہوں۔"

کاکا بابو نے کہا ——— "جاؤ، رات بڑھ رہی ہے، پڑھو لکھو جاکر ———"

دیپنکر کو عجیب سا احساس ہوا، یکایک احساسِ ممنونیت سے اُس کا دل بھر آیا، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایسا پیار، ایسی محبت، ایسی ہمدردی اُسے زندگی میں کسی سے نہ ملی ہو، اچانک وہ کاکا بابو کے قدموں میں جھک گیا اور اُن کے دونوں پاؤں کو چھو کر اُن کے قدموں کی خاک سر پر رکھ لی، پھر اُس نے کاکی ماں کو بھی پرنام کیا۔

اتنے دنوں کے بعد اب جب کبھی اُسے بیتے دنوں کی یاد آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے، ان لوگوں کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہ تھا، ان کے ساتھ کبھی کوئی سروکار بھی نہیں رہا تھا، اس نے کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس روز وہ دیپنکر کو اپنوں جیسے لگے تھے، دیپنکر کو بڑی مسرت محسوس ہوئی تھی، وہ صرف اچھے ہی نہیں لگے تھے، صرف پیار کی پناہ ہی نہیں دی تھی، بلکہ اس دن اسی معمولی سے واقعہ کو مرکز بنا کر ان کے ساتھ وہ متعارف ہوا تھا، جب دوسروں کے رحم و کرم پر اس کی زندگی کا دارو مدار تھا، اس وقت اُنھوں نے اس طرح پیار و محبت کیوں جتائی تھی کون جانے، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ اس طرح زندگی کا روپ دیکھ سکتا؟ اس طرح دُنیا کو سمجھ سکتا؟ کیا وہ اس طرح حقیقت معلوم کرسکتا کہ زندگی صرف زندگی ہی نہیں ہے، دُکھ صرف دُکھ ہی نہیں ہے، خوشی صرف خوشی نہیں ہے، زندگی کے بھی دُوسرے معنی ہوتے ہیں، دُکھ کی بھی ایک الگ تشریح ہے اور خوشی کا بھی ایک دُوسرا مقصد ہے!

اور ٹمی دیدی؟

واقعی ٹمی دیدی آئی تھی اسی لیے تو ستی بھی آئی تھی!

اور ستی آئی تھی اسی لیے تو دیپنکر اس حقیقت کو جان سکا تھا کہ زندگی کے بھی دُوسرے معنی ہوتے ہیں، دُکھ کی بھی ایک الگ

لگنے لگے کاکا بابو زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ وہ خاتون بھی یکایک ہنس پڑیں۔
کاکا بابو نے کہا ——— "کیا کہتے ہو؟ لکھی تمہیں بھاؤ نظر آتی ہے؟"
خاتون بھی ہنستے ہنستے بولیں ——— "ارماں، کیا ہوگا، ایسا خوبصورت چہرہ اور اُسے بھاؤ لگتا ہے۔"
دیپنکر نے کہا ——— "وہ تو خواب تھا، خواب کیا سچ ہوتا ہے! خواب سچے ہوتے ہیں یا نہیں یہی دیکھنے کے لیے تو آج میں یہاں تک دیکھ رہا تھا، دیکھا کہ میرا خواب سچ نہیں تھا، یہاں سلٹا بابو نے کہا ہے ——— جو عظیم انسان ہیں ان کے خواب سچے ہوتے ہیں، میں تو غریب آدمی کا لڑکا ہوں، میرے خواب کس طرح سچے ہوں گے؟"
کاکا بابو نے کہا ——— "دل لگا کر پڑھو۔ یہ بتاؤ اس مرتبہ کلاس میں کیا ہوئے تھے؟"
"میں ہر مرتبہ فرسٹ ہوتا ہوں۔" دیپنکر نے جواب دیا۔
"واہ، ویری گڈ، کون پڑھاتا ہے تمہیں؟"
"میں خود پڑھتا ہوں۔" دیپنکر نے جواب دیا ——— "حساب کرن کے بابا سمجھا دیتے ہیں، کرن کے بابا بہت اچھا حساب جانتے ہیں ———"
"وہ تم لکھی سے حساب اور انگریزی پڑھ سکتے ہو ——— یہ لکھی تمہیں بہت اچھی انگریزی سکھا دے گی، لکھی بہت اچھی انگریزی جانتی ہے۔"
لکھی دیدی نے کہا ——— "واہ رے، کاکا بابو آپ بھی کیا اچھے آدمی ہیں، میرے پاس وقت کہاں ہے، مجھے تو خود اپنے پڑھنے کے لیے وقت نہیں ملتا، اس کے علاوہ سلائی ہے، رقص ہے ———"
"کوئی بات نہیں۔" کاکا بابو نے کہا ——— "غریب لڑکا ہے، ذرا سا بتا دو گی تو کیا ہوا۔"
دیپنکر کی یکایک ہمت بڑھ گئی، اُس نے کہا ——— "گاؤں میں پہلے ہم لوگوں کی حالت بہت اچھی تھی، میرے بابا کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا اسی وقت سے میری ماں مجھے لے کر کلکتہ چلی آئی تھی، ماں اگھور دادو کا کھانا پکاتی ہے، اگر اگھور دادو ہم لوگوں کو پناہ نہ دیتے تو سب کب کے مر گئے ہوتے۔"
کاکا بابو نے کہا ——— "ٹھیک ہے، تم آ جایا کرو لکھی تمہیں پڑھا دیا کرے گی۔"
لکھی دیدی نے کہا ——— "مگر میری اپنی پڑھائی نہیں ہو سکے گی کاکا بابو۔"
اُنھوں نے کہا ——— "ستی تو کلکتہ آ ہی رہی ہے، ستی کے آنے کے بعد اُسے بھی تو تمہیں پڑھانا ہوگا، اسی کے ساتھ اسے بھی پڑھا دو گی۔"
دیپنکر نے کہا ——— "انگریزی ہی مشکل ہے، حساب میں کرن کے بابا سے سیکھ لوں گا۔"
اُنھوں نے کہا ——— "انگریزی، حساب اور بنگالی، سب کچھ تمہیں لکھی پڑھا دیا کرے گی، لکھی بہت اچھی اسٹوڈنٹ ہے، جانتے ہو، وہ مجھے بھی پڑھا سکتی ہے ——— کیوں لکھی؟ اس کو اس مرتبہ دس روپیہ اسکالرشپ ملا ہے ——— تمہیں معلوم ہے لکھی،

مارے بابا ... دیپک کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے ہیں، انھوں نے لکھا ہے وہ ستی کو بھی یہیں بھیج رہے ہیں، دونوں بہنیں ایک ساتھ پڑھیں گی۔"

ممی دیدی نے کہا — "ایک ساتھ رہ کر جو پڑھائی ہوگی وہ میں جانتی ہوں، ستی کو تو آپ نے دیکھا نہیں ہے کاکا بابو۔"

کاکا بابو نے کہا — "مجھے یاد ہے، میں نے ستی کو چھوٹی سی عمر میں دیکھا تھا، تمھاری ہی طرح گوری تھی، ہے نا؟"

ممی دیدی نے کہا — "وہی ستی اب ایسی ہو گئی ہے کہ دیکھ کر آپ پہچان نہ سکیں گی کاکی ماں — اسی عمر میں میرے برابر ہو گئی ہے۔"

اتنے میں ایک ملازم دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔

کاکی ماں نے پوچھا — "کیا ہے ٹھاکر؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کھانا تیار ہے ماں۔" ٹھاکر نے جواب دیا — "نکال دوں؟"

کاکی ماں نے کہا — "کیا کہتے ہو ٹھاکر، ابھی تو چائے پی ہے، ابھی کھاؤں گی؟ تم تو دیکھتی ہوں بات ٹال کر کے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہو، تھوڑی دیر بعد تمھیں خبر دوں گی۔"

دیپنکر نے کہا — "ماں کو فکر لگی ہوگی، میں جاتا ہوں۔"

کاکا بابو نے کہا — "جاؤ، رات بڑھ رہی ہے، پڑھو لکھو جا کر —"

دیپنکر کو عجیب سا احساس ہوا، یکایک احساسِ ممنونیت سے اس کا دل بھر آیا، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایسا پیار، ایسی محبت، ایسی ہمدردی اسے زندگی میں کسی سے نہ ملی ہو، اچانک وہ کاکا بابو کے قدموں میں جھک گیا اور ان کے دونوں پاؤں کو چھو کر ان کے قدموں کی خاک سر پر رکھ لی، پھر اس نے کاکی ماں کو بھی پرنام کیا۔

اتنے دنوں کے بعد اب جب کبھی اسے بیتے دنوں کی یاد آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے، ان لوگوں کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہ تھا، ان کے ساتھ کبھی کوئی سروکار بھی نہیں رہا تھا، اس نے کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس روز وہ دیپنکر کو اپنوں جیسے لگے تھے، دیپنکر کو بڑی مسرت محسوس ہوئی تھی، وہ صرف اچھے ہی نہیں لگے تھے، صرف پیار کی پناہ ہی نہیں دی تھی، بلکہ اس دن اسی معمولی سے واقعہ کو مرکز بنا کر ان کے ساتھ وہ متعارف ہوا تھا، جب دوسروں کے رحم و کرم پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا، اس وقت انھوں نے اس طرح یگانگت کیوں جتائی تھی کون جانے؟ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ اس طرح زندگی کا روپ دیکھ سکتا؟ اس طرح دنیا کو سمجھ سکتا؟ کیا وہ اس طرح حقیقت معلوم کر سکتا کہ زندگی صرف زندگی ہی نہیں ہے، دکھ صرف دکھ ہی نہیں ہے، خوشی صرف خوشی نہیں ہے، زندگی کے بھی دوسرے معنی ہوتے ہیں، دکھ کی بھی ایک الگ تشریح ہے اور خوشی کا بھی ایک دوسرا مقصد ہے!

اور ممی دیدی؟

واقعی ممی دیدی آئی تھی اسی لیے تو ستی بھی آئی تھی!

اور ستی آئی تھی اسی لیے تو دیپنکر اس حقیقت کو جان سکا تھا کہ زندگی کے بھی دوسرے معنی ہوتے ہیں، دکھ کی بھی ایک الگ

...یج ہے اور خوش [illegible] سا ہے
کمرے سے نکل کر دینکر زینے سے نیچے اُتر رہا تھا، پیچ پیچ نئے کرایہ دار کے آنے کے بعد دینکر دیکھ رہا تھا کہ مکان کا نقشہ ہی
...دیا تھا، اندر جو اتنی ساری تبدیلیاں ہوئی تھیں باہر سے اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا، ان لوگوں نے ایک ہی رات میں اگموڈ واندے کے مکان کا
...کتنا بدل دیا تھا، پھولوں کا گملا انھوں نے جنگلے کے کنارے قرینے سے سجا دیا تھا، ہر دروازے پر ایک پردہ لٹکا ہوا تھا، کرسی،
...کوچ، صوفہ، الماری اور آئینہ، کمرے میں کہیں پر جگہ نہ تھی، دینکر آہستہ آہستہ زینے سے نیچے اُتر گیا؛ ماں شاید پریشان ہو رہی
...ل، شاید ڈھونڈ بھی رہی ہو کر دینو کہاں چلا گیا۔

زینے سے نیچے اُترتے ہی کسی نے اُسے پکارا۔

"اے چھوکرا سُن۔"

دینکر نے پلٹ کر دیکھا، وہی لڑکی تھی الکھی!

اُس نے پوچھا ——— "مجھے بلا رہی ہو؟"

لڑکی زینہ پھلانگتی ہوئی تیزی سے نیچے آئی اور اُس کے جسم سے سٹ کر کھڑی ہو گئی

دینکر لڑکی کی آنکھیں دیکھ کر چونک اُٹھا، اتنی دیر تک اُس کی آنکھوں کا رنگ ایسا تو نہ تھا۔

اُس نے پوچھا ——— "مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

لڑکی نے کہا ——— "اگر پھر کبھی تم میرے یہاں آئے تو تمھاری ٹانگ توڑ دوں گی۔"

"واہ رے، میں نے کیا کیا ہے؟"

یکایک لڑکی نے اس کا کان پکڑ کر کھینچا ——— "بحث کرتے ہو؟"

اُس نے خوب زور سے کان کھینچ دیا۔

دینکر نے کہا ——— "میں بحث تو نہیں کرتا۔"

"پھر بحث، تم اس مکان میں نہیں آسکتے، میں نے کہہ دیا۔"

دینکر نے کہا ——— "تمکین کا کا بابو نے جو آنے کو کہا ہے۔"

"کا کا بابو کو کہنے دو، میں کہتی ہوں تم نہیں آؤ گے۔"

دینکر لڑکی کے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔

اُس نے کہا ——— "اچھا، نہیں آؤں گا۔"

"ہاں، نہیں آؤ گے!"

اتنا کہہ کر اُس نے دینکر کو دھکیل دیا اور دینکر دھکا کھا کر زینے کے نیچے گر پڑا۔ گرتے ہی اُسے سر میں چوٹ لگی، وہ اُٹھ کر کھڑا
...ہو گیا، دیکھا وہ لڑکی اُس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا ـــــ "میں نہیں آؤں گا، میں وعدہ کرتا ہوں ممی دیدی، پھر کبھی نہیں آؤں گا۔"
لڑکی یکایک مسکرانے لگی، پھر قریب آکر اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔
بولی ـــــ "چوٹ لگی ہے؟ زور سے لگ گیا کیا رے؟"
وینکر نے کہا ـــــ "تم نے مجھے کیوں دھکیل دیا، میں نے تمہارا کیا کیا تھا جو تم نے مجھے دھکیل دیا؟"
لڑکی نے جواب دیا ـــــ "یونہی، میں دیکھ رہی تھی کہ تم ڈرتے ہو یا نہیں۔"
وینکر نے کہا ـــــ "اب میں تمہارے یہاں نہیں آؤں گا، کاکا بابو کہیں گے تو بھی نہیں آؤں گا، مجھے چھوڑ دو۔"
لڑکی یکایک اُسے پیار کرنے لگی، بولی ـــــ "نہیں رے، میں دیکھ رہی تھی، تم ڈرتے ہو یا نہیں، تم کل پھر آنا، سمجھے
آؤ گے نا؟ ضرور آنا۔"
اتنا کہہ کر ممی دیدی چلی گئی اور وینکر حیرت سے بڑی دیر تک خاموش کھڑا ٹکٹکی لگائے اسی طرف دیکھتا رہا، اس کے بعد آہستہ آہستہ کھڑکی کے دروازے کے راستے آنگن میں آگیا، اُس کا سر ابھی تک درد کر رہا تھا۔

کرشن نے پوچھا ـــــ "اس کے بعد کل تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں دیر تک ڈھونڈتا رہا ـــــ"
"میں حاجی قاسم کے بازار کی طرف بھاگ گیا تھا" ـــــ وینکر نے جواب دیا ـــــ "اس کے بعد آگن کماری تالاب کا چکر لگا کر ٹیپو سلطان کی عمارت کے قریب سے ہوتے ہوئے شیشیلا تلا کے راستے گھر چلا گیا تھا۔"
واقعی ان دنوں کا بالی گنج اب پہچانا نہیں جاتا، اس وقت راس بہاری ایونیو کے موڑ پر حاجی قاسم کا بازار تھا، اس کے بعد اس موڑ کے جنوبی مشرقی کونے پر ٹیپو سلطان کی قدیم عمارت تھی، اب قطار در قطار دکانیں بن گئی ہیں۔ دن رات ٹرامیں اور بسیں بھاگتی دوڑتی رہتی ہیں، لیکن اُس وقت؟ اس وقت کالی گھاٹ ایسا نہیں تھا، بالی گنج بھی آج کے ایسا نہیں تھا، ٹیپو سلطان کی عظیم الشان عمارت اس موڑ سے لے کر آگن کماری تالاب تک پھیلی ہوئی بھوتوں کے مسکن کی طرح دکھائی دیتی۔ عمارت کے سامنے ہی بڑے بڑے برگد کے پیڑ اُگ آئے تھے جس سے وہ جگہ دن کے وقت بھی اُجاڑ اُجاڑ سی دکھائی دیتی۔ وہاں پر جاتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا، یکایک دوپہر کے وقت ہوا کے جھونکے کھا کر برگد کے پتے جھوم اُٹھتے اور چاروں طرف پُر اسرار سی آواز پھیل جاتی اور کبھی کبھی کوئی خطرناک سانپ زور زور سے پھنکارتا اور اس وقت سارے محلے میں ایک عجیب سا خوف طاری ہو جاتا، اس موڑ کے مغربی جنوبی کونے پر تکیہ پڑا تھا، تکیہ بنانے والے راستے ہی پر بیٹھے [illegible] کے تختوں پر تکیہ سکھانے کے لیے رکھ دیتے، اس کے شمالی جانب آشو کالو کی سرسوں کے تیل کی دکان تھی۔ دوپہر کے وقت کتنی ہی بار ماں نے اُس دکان سے تیل خریدنے کے لیے اُسے بھیجا تھا، وینکر وہاں جاکر کولھو پر بیٹھ جاتا تھا، گھومتا رہتا، کولھو میں بندھے ہوئے بیل کی آنکھوں پر پٹی بندھی رہتی اور وہ دن رات مسلسل کولھو کے گرد چکر کاٹتا رہتا، وینکر دو دو تین تین گھنٹے تک کولھو پر بیٹھا رہتا تھا، اُس وقت تک اُسے یاد بھی نہیں رہتا کہ اُسے سرسوں کا تیل خریدنا ہے اور جب وہ تیل لے کر گھر آتا تو اُسے ماں کی کتنی ہی ڈانٹ کھانی پڑتی، اور اسی آشو کالو کی دکان کی شمالی جانب حاجی قاسم کی بڑی سی عمارت تھی اور اس عمارت

کے پیچھے ایک بہت بڑا باغ تھا۔ دیپکر نے کتنی ہی بار باغ کے اندر جھانک کر دیکھا تھا۔ باغ میں بہت سارے سانپ [illegible] بہت ساری چڑیاں تھیں، وہ سب کہاں چلے گئے؟ جب اس باغ کو کاٹ کر سارا سندر دو ڈیا بنایا گیا تو وہ باغ ختم ہو گیا۔ اس باغ میں پکے مکان ہو گئے اور محلے کی ہیئت ہی بدل گئی۔ اُس طرف، اُس کنارے پر آگن کاری تالاب سے بھی آگے دھان کے کھیت تھے، ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ دھان کی بالیاں جھومتی لہراتی رہتیں اور دیپکر کو یکایک یہ احساس ہوتا کہ وہ ایشور گنگولی سے بہت دور نکل آیا ہے۔ ان دنوں کیا صرف دھان کا کھیت ہی تھا؟ صرف ٹیپو سلطان کی عمارت ہی تھی؟ صرف ٹیپو پاٹھ، صرف اشٹو کالی کی دکان ہی تھی؟ اُس وقت دیپکر کی کتنی بڑی دنیا تھی! اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے جوان ہوتے ہوتے دنیا سمٹ کر چھوٹی ہو گئی ہو۔ اب وہ اٹھائیس نمبر باغ کہاں چلا گیا؟ کرن کے ساتھ کتنی ہی بار وہ اس باغ میں جا چکا تھا۔ وہ کس کا باغ تھا، اس کا کون مالک تھا، وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ اس باغ کے درمیان ایک تالاب تھا اور تالاب کے کنارے ایک SIRR APPLE کا پیڑ تھا، جس پر بڑے بڑے پھل لگتے تھے، سیندور کی طرح لال لال منہ اور گڑ کے ایسا میٹھا ہوتا تھا۔ اس باغ کے بعد ہی ہمارا ج سورج کانتا کا باغ تھا۔ اس باغ میں ایک لیچی کا پیڑ تھا۔ بڑی بڑی لیچی لپک کر جھومتی رہتی۔ کتنی ہی بار اس نے لیچی کے پیڑ پر چڑھ کر لیچی کھاتے ہوئے دور تک نظر دوڑا کر دیکھا تھا، کہیں سے ریل گاڑی کی آواز سنائی دیتی ——— کو او——— او——— او——— چھک چھک چھک چھک! وہ آواز بھری دوپہر میں کتنی میٹھی معلوم ہوتی تھی، پکے ہوئے جھرو دار اور پکی ہوئی لیچی سے بھی زیادہ وہ آواز میٹھی معلوم ہوتی۔ اُس وقت اُسے کیا معلوم تھا کہ ایک روز اس کی زندگی بھی ریل ہی سے وابستہ ہو جائے گی اور اسی ریل کی ایک ہیول کراسنگ پر اس کی زندگی کی ریل گاڑی اس طرح دندناتی ہوئی آجائے گی اور یہی ریل گاڑی ایک دن اس کی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرے گی ———

ایک روز دیپکر کالی گھاٹ اسکول کے ان فینٹ کلاس میں بھرتی ہوا تھا۔

یہ اسکول میں اس کا پہلا داخلہ تھا، زندگی میں پہلی بار وہ اسی سکول میں گیا تھا اور ایک روز نارنگی اور مٹھائی لے کر وہ اس اسکول سے چلا آیا تھا۔ سینے پر پرنیو جیک لگا کر دوسرے اسکول میں چلا گیا تھا۔ اُسے بہت دنوں تک یہ واقعہ یاد رہا تھا، وہ لکھن چندر سرکار، وہ چارو چندر دھر، وہ بھان چاند متر اور وہ کرن کار چٹو پادھیائے، وہ نرمل پالت! اور وہ دیپکر سین جس کا رول نمبر اٹھائیس تھا، یہ سبھی کالی گھاٹ اسکول میں پڑھتے تھے، اس کے بعد تھوڑے دنوں کے بعد ہی دھرم داس ٹرسٹ ماڈل اسکول نیپال بھٹاری اسٹریٹ میں قائم ہو گیا۔

ماں نے کہا ——— "وہ اسکول بہت دور ہے، تجھے میں قریبی اسکول میں داخل کر دوں گی۔"

دھرم داس ٹرسٹ ماڈل اسکول میں جانے ہوئے دیپکر کو ایسا بُرا نہیں لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کرن بھی نئے اسکول میں آگیا تھا، اچھا ہی ہوا کہ لکھن چندر سرکار پرانے ہی اسکول میں رہ گیا۔ وہ نئے اسکول میں نہیں آیا تھا، راستے میں لکھن کو دیکھتے ہی اُسے خوف محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بات چیت کیے بغیر دیپکر کو دیکھتے ہی لکھن اس کے سر پر چپت لگا دیتا۔

کبھی ایسا ہوتا کہ دیپکر راستے پر چلا جا رہا ہے کہ یکایک مخالف سمت سے لکھن آتا ہوا دکھائی دیتا۔

لکھن کی لات سے بچنے کے لیے دیپکر رستے کے بالکل کنارے سے چلتا تھا لیکن اتنی ہی دیر میں لکھن اس کے بالکل قریب پہنچ جاتا۔

کہتے ہوئے کہتا —— "کیا رے، کہاں جا رہا ہے؟"

اور کہتے کہتے اس کے سر پر ایک چپت رسید کر دیتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔

کبھی کبھی دیپکر رو دیتا تھا، اتنے لڑکوں کے رہتے ہوئے وہ اسی کے سر پر چپت کیوں مارتا تھا! دیپکر نے کیا کیا تھا؟ ہزار سوچنے کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ لکھن اس سے اتنا خفا کیوں تھا؟ کتنی ہی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے، لیکن وہ رو بھی نہیں سکتا تھا، ماں اگر دریافت کرے کہ اسے کس نے مارا ہے، کیوں مارا ہے؟ تو دیپکر کیا جواب دے گا؟ کبھی کبھی اس کے جی میں آتا کہ شاید اس کے سر کے بال ترشے ہوئے نہیں ہیں اسی لیے لکھن اسے چپت مارتا ہے یا پھر میلے کپڑوں کی وجہ سے مارتا ہے، لیکن نہیں، جب اس کے بال ترشے ہوئے ہوتے، جب بھی لکھن چپت مارتا، دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتا، جب بھی لکھن چپت لگاتا، بعد میں اس نے سوچا تھا شاید اس کے سر پر چپت مار کر لکھن کو خوشی ہوتی ہے، وہ کسی خطا یا قصور کی بنا پر اس کے سر پر چپت نہیں لگاتا، اس کے بعد وہ اسکول سے نکل کر کالج میں داخل ہوا تھا، کالج سے نکل کر ملازمت کی تھی لیکن پھر بھی اسے لکھن سے کبھی رہائی نہ مل سکی، جیسے ساری دنیا میں اس ایک لکھن نے بہت سارے لکھن کا روپ دھار لیا ہو اور مختلف شکلوں میں پھیل گئے ہوں، جیسے لکھن کے ہاتھ سے انسان کو نجات حاصل کرنا مشکل تھا۔

اس روز خیال بھٹیارن لین کے نکڑ پر آتے ہی دیپکر نے دیکھا، مخالف سمت سے لکھن آ رہا تھا، سہ پہر ہو چکی تھی اور اس وقت راستے پر نلکے سے پانی چھڑکا جا رہا تھا، لکھن کو دیکھتے ہی دیپکر کا دل خوف سے دھڑکنے لگا، اگر آج بھی لکھن اس کو
دے!

دیپکر ایک طرف سرک گیا، لیکن پتہ نہیں لکھن کو کیا شرارت سوجھی کہ وہ اس کے مقابل آ گیا۔

سامنے آتے ہی لکھن نے کہا —— "کیا رے، تو نے میرا اسکول کیوں چھوڑ دیا؟ میرے ڈر سے؟"

دیپکر نے کوئی جواب نہیں دیا، سہمی سہمی نظروں سے لکھن کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔

لکھن کا دھیان اسی طرف تھا، اس نے اپنی بات ختم کرتے ہی اس کے سر پر چپت رسید کر دی۔

روزانہ چپت کھا کھا کر دیپکر قدرے ڈھیٹ ہو گیا تھا۔

اس نے کہا —— "تو مجھے ہر روز کیوں مارتا ہے رے؟ تو مجھے ہر روز کیوں مارتا ہے؟ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے، بول تو؟"

لکھن کو دیپکر سے اس احتجاج کی توقع نہ تھی، وہ غصہ سے تلملا اٹھا۔

بولا —— "میں مار دوں گا، میری خوشی، ماروں گا، یہ لو پھر مارتا ہوں، تو کیا کرے گا؟"

اتنا کہہ کر اس نے سچ مچ پھر ایک چپت جڑ دی، اس مرتبہ اس نے اور زور سے مارا۔

دیکر [illegible] پھر بھی سخت چوٹ لگی، اسے محسوس ہوا کہ اس کا سر جھنجھنا اُٹھا۔
اُس نے کہا ——— "میں کچھ نہیں کرتا اس لیے!"
لکھن اُس کے اور بھی قریب آگیا ——— "دیکھتا ہوں تیری ہمت بہت بڑھ گئی ہے، ہمت ہو گئی ہے نا ——
اتنا کہہ کر اس نے پھر ایک چپت لگا دی اور اُس کے بعد سر کے بال پکڑ کر جھٹکا دینے لگا۔
"ایک گھونسہ اور کر تیری ناک توڑ دوں گا، ساری شیخی نکال دوں گا۔"
"واہ رے، میں نے تیرے ساتھ کب شیخی کی ہے! پہلے تُو نے ہی تو مجھے مارا ہے!"
اب لکھن نے اس کے سر پر گھونسے برسانے شروع کر دیے۔
"پھر، پھر شیخی! پھر شیخی کرو گے؟ پھر؟"
لکھن ایک جگہ بیٹا اور ایک گھونسہ مارتا! دیکر کو سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہیں مل رہا تھا، دائیں، بائیں، سامنے، پیچھے اور منہ پر وہ متواتر مارے جا رہا تھا! دیکر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، اس کا سر چکرانے لگا۔
وہ مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا ——— "شیخی بگھارتے ہو تو؟ تجھے اس شیخی کا مزہ بھی چکھاتا ہوں۔"
اپنا سر بچانے کے لیے وہ جوں ہی پلٹا اس کا توازن بگڑ گیا اور دھڑام سے سڑک پر گر پڑا، اب لکھن کو اور بھی آسانی ہو گئی، وہ دیکر کے کان پر، منہ پر، سر پر متواتر گھونسے، تھپڑ اور ٹھونکے لگانے لگے، دیکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اب وہ زندہ نہیں بچے گا، جیسے لکھن اُسے جان سے مار ڈالے گا، اس کی جان لے کر ہی چھوڑے گا اور اگر اس دن لکھن کے ظلم سے اس کی جان نکل جاتی تو دُنیا کی بہت ساری باتیں وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکتا شاید اُسے بہت سارے رُوح فرسا تجربات سے بھی نجات مل جاتی، بہت ساری تکلیفوں کے جھیلنے سے بچ جاتا! اگر ایسا ہوتا تو ستی کو کیسے دیکھ سکتا اور اگر ستی کو نہ دیکھ پاتا تو اس کی زندگی رائیگاں ہو جاتی!
لکھن کی مار کھاتے کھاتے جب دیکر بے دم ہو گیا تھا تو یکایک ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔
اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔
اُس نے کسی طرح نظر اُٹھا کر دیکھا، سامنے لکھی دیدی کھڑی تھی۔
اسکول کی گاڑی سے اُتر کر لکھی دیدی گلی کے اندر جا رہی تھی کہ اس کی نظر ان دونوں پر پڑ گئی تھی، اُس نے آتے ہی لکھن کے سر کے بال پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور اس کے ساتھ ہی بغیر کچھ کہے سنے ایک زنّاٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا تھا۔
لکھن ایک دم گھبرا سا گیا تھا، تھپڑ کھاتے ہی وہ زمین پر لڑھک گیا لیکن لکھی دیدی پھر بھی چھوڑنے والی نہیں تھی، وہ لکھن کے کان پر، سر پر، پیٹھ پر دمادم تھپڑ مارنے لگی۔
"ارے ستیا ناس، تو اُسے کیوں مار رہا تھا؟ تُو نے اُسے کیوں مارا؟"
اس کے بعد پھر تھپڑ اور گھونسے سے اس کی مرمت کرنے لگی، لکھی دیدی بڑی طاقتور تھی، اس نے اپنی کمر پر

سڑک پر ڈال دیں اور اس کے بعد اچھی طرح لکھن کی مرمت کر دی، لکھن کی اس وقت عجیب حالت تھی، وہ نہ تو لکھی دیدی کو مار سکتا تھا اور بھاگ سکتا تھا، خلاف توقع مار کھا کر جیسے وہ بوکھلا گیا تھا، اتنی دیر میں وینکر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دُور سے اس حادثہ کو دیکھنے لگا اس سپاہی ٹھیک ہوا، اچھا ہوا، اتنے دنوں کے بعد آج لکھن کی شکست ہوئی تھی، آج پہلی بار لکھن زیر ہوا تھا، جیسا اس کو مارتا تھا یسا ہی پٹ رہا ہے۔

وینکر اس کی مرمت کرنے کے بعد لکھی دیدی نے کہا ——— "اگر اب کبھی تُو نے اُسے مارا تو تیری آنکھ نکال لُوں گی، بھاگ، بھاگ یہاں سے ——— جا۔"

اتنی دیر میں وینکر کی ہمت کافی بڑھ گئی۔

لکھن سہما سہما اُٹھا اور جسم پر پٹی ہوئی دھول جھاڑتا ہوا سیدھا مخالف سمت چلا گیا۔

اس کے بعد لکھی دیدی نے راستے پر پڑی ہوئی اپنی کتابیں اُٹھالیں۔

وینکر نے قریب جا کر کہا ——— "وہ مجھے ہر روز مارتا ہے لکھی دیدی، روز مجھے اسی طرح مارتا ہے، میں اُس کا کچھ ں نہیں بگاڑتا پھر بھی بلاوجہ مجھے مارتا ہے۔"

لکھی دیدی کا چہرہ غصّہ سے تمتایا ہوا تھا۔

وینکر نے کہا ——— "لکھی دیدی تم نے اچھا کیا جو اسے پیٹ دیا، مجھے بلاوجہ ہر روز مارتا ہے۔"

لکھی دیدی نے یکایک اُس کا کان پکڑ کر اس کے سر پر کئی تھپڑ لگائے۔

"اسٹوپڈ کہیں کا، وہ تجھے ہر روز مارتا ہے اور تُو چپکے سے مار کھا لیتا ہے؟ تُو اُسے پیٹ نہیں سکتا؟ تیرے بدن میں اقت نہیں؟ اسٹوپڈ گدھا کہیں کا، احمق کی طرح مجھ سے کہتا ہے کہ وہ مجھے روز مارتا ہے ——— میں تجھے بھی پیٹوں گی۔"

اتنا کہہ کر لکھی دیدی نے اُسے پھر مارنا شروع کیا۔

وینکر کی آنکھوں سے سچ مچ آنسو بہ نکلے، اتنی دیر تک لکھن سے مار کھا کر جو کچھ نہیں ہوا تھا لکھی دیدی کے ہاتھ سے مار کر وینکر کو اس سے زیادہ تکلیف ہوئی۔

وینکر نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر کہا ——— "اب مت مارو لکھی دیدی، اب ایسا نہیں کروں گا، اب ایسا یں کروں گا۔"

لکھی دیدی اس وقت اپنے آپے میں نہیں تھی، وہ اور بھی زور زور سے اس کے سر پر مارنے لگی ——— "میں تمہارا ر پھوڑ دوں گی اسٹوپڈ کہیں کا، دُوسروں کی مار کھا کر تمہیں صرف رونا آتا ہے، روتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی ——— ر رو رہا ہے ———"

اس کے بعد مکان کے قریب آ کر لکھی دیدی بولی ——— "جاؤ، گھر جاؤ، پھر کبھی نہیں روؤ گے سمجھے، پھر مرد سے ہو کس لیے ———"

اتنا کہہ کر اس نے [illegible] کو دھکیل دیا اور چٹکیاں بھرتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔

رات کے وقت جب وہ پڑھنے کے لیے بیٹھا تو اس کا دل پڑھائی میں بالکل ہی نہیں لگا، وکٹوریہ داد و کے صندوق سے ٹیک لگا کر تاریخ کی کتاب سامنے رکھے ہوئے وہ بڑی دیر تک پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن اس کی دونوں آنکھیں نیند سے بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے سوچا، یہ لوگ اس مکان میں کیوں آ گئے ہیں؟ یہ کرایہ دار یہاں کیوں آ گئے! یہ لڑکی تو آئے دن ناچتی رہتی ہے، اس سے پہلے جو کرایہ دار تھے وہ تو اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے، چنونی ان لوگوں کو گالی دیتی تھی، اچھا کرتی تھی، ان لوگوں کو بھی گالی دیتی تو اچھا ہوتا! یہ لوگ بھی اس مکان میں نہیں رہتے، یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے جاتے! چلے ہی جائیں تو اچھا ہے، بڑی ناچنے والی ہیں! اس طرح تو خود دینکر بھی ناچ سکتا ہے، آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس طرح ٹھمک ٹھمک ہر کوئی ناچ سکتا ہے، اس کا خواب ہی ٹھیک تھا ـــــ بھالو کا خواب ہی صحیح تھا، یہ بھی بھالو ہی کی طرح ناچتی ہے۔ پتھر گٹی میں بہت سے مداری بھالو ناچ دکھانے آتے ہیں، مداری ڈگڈگی بجاتا ہے اور بھالو ناچتا ہے۔ اور چہرہ؟ چہرہ بھی کون بہت اچھا ہے، اس سے خوبصورت ہے، اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تو بنتی دیدی کا ہے، لیکن بنتی دیدی تو کبھی اس کو کچھ نہیں کہتی اور دیا پڑھنا لکھنا کس کو نہیں آتا، دس روپیہ اسکالرشپ ملا ہے، اگر میم صاحب کے اسکول میں بنتی دیدی پڑھتی تو اسے بھی اسکالرشپ ملتا۔

ماں کسی کام سے کمرے میں آئی تھی۔

دینکر نے پکارا ـــــ "ماں!"

ماں نے کہا ـــــ "کیا کہتے ہو؟ ـــــ"

دینکر بولا ـــــ "چنونی آج کل گالی کیوں نہیں بکتی ہے؟"

ماں شاید بے حد مشغول تھی، اس کی بات سن کر بیزار سی ہو گئی، بولی ـــــ "تمھاری ساری باتیں عجیب ہوتی ہیں، وہ کیوں گالی بکے گی، کس کو گالی دے گی؟"

دینکر نے کہا ـــــ "یہ جو نئے کرایہ دار آئے ہیں، چنونی ان کو گالی کیوں نہیں دیتی؟ گالی دیتی تو یہ لوگ بھی یہاں سے چلے جاتے ـــــ"

"میں تمھارے ساتھ بک بک نہیں کر سکتی بابو۔"

اتنا کہہ کر ماں چلی گئی، دینکر پھر تاریخ کی کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کہیں کا ایک سکندر کہیں کے ایک پورس کو گرفتار کر کے لے گیا تھا، اس کی کہانی پڑھنے سے کیا فائدہ ہوگا کون جانے! اس دن کوئی بھی ششانک بابو کی کلاس میں سبق نہ بتا سکا تھا، ششانک بابو بڑی سنجیدہ طبیعت کے آدمی تھے وہ پران متھ بابو جیسے نہیں تھے، دینکر کا سب سے زیادہ پران متھ بابو کی کلاس میں دل لگتا۔

پران متھ بابو کلاس کرتے ہوئے بہت ساری کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

اس روز پران متھ بابو نے کلاس میں آتے ہی پوچھا ـــــ "آج تم لوگوں کو کہاں سے پڑھنا ہے؟"

مائیڑ دیکھ کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سکندر اور پورس سر" اس نے جواب دیا۔

پران متھ بابو نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی، پوچھا ــــــ "پورس کون تھا؟"

پھلک نے جواب دیا ــــــ "ایک راجہ تھا سر"

پران متھ بابو نے کہا ــــــ "خوب، خوب، لیکن راجہ کے معنی کیا ہیں؟ تم بتا سکتے ہو؟"

انھوں نے کرن کی طرف انگلی سے اشارا کیا۔

"تم؟ تم؟ تم؟"

یکے بعد دیگرے انھوں نے کئی لڑکوں سے پوچھا مگر کوئی جواب دے سکا، راجہ کے معنی راجہ! راجہ کے معنی اور کیا ہوا؟ اس روز کوئی بھی اس آسان سوال کا جواب دے سکا، سبھی پران متھ بابو کی طرف منہ کھولے تکتے رہے۔

پران متھ بابو نے کہا ــــــ "راجہ کے معنی تم لوگ نہیں جانتے تو اس میں شرمانے کی ایسی کوئی بات نہیں، راجہ کے معنی بہت سے لوگ نہیں جانتے، بہت سے راجہ بھی نہیں جانتے ــــــ تو پھر سنو ــــــ"

اس کے بعد ڈبے سے پان نکال کر منہ میں رکھ لیا اور بولے ــــــ "ایک وقت ایسا تھا جب دنیا میں کوئی راجہ نہیں تھا راجہ بھی نہیں تھا، سزا بھی نہیں تھی، سزا دینے والے بھی نہیں تھے! جس کے معنی یہ ہوئے کہ سبھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے! جب سبھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں تو نہ سزا کی ضرورت رہتی ہے نہ سزا دینے والے کی، لیکن یہ حالت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی، آہستہ آہستہ کشش نے جنم لیا ــــــ یعنی آہستہ آہستہ مذہب دنیا سے غائب ہونے لگا، مذہب ناپید ہونے ہی والا تھا کہ دیوتاؤں کو خوف محسوس ہوا، کوئی پوجا نہیں کرے گا، اگ نہیں دے گا اور یگ میں آہوتی نہیں دی جائے گی تو دیوتا کھائیں گے کیا؟ سبھی دیوتا برہما کے پاس گئے اور برہما کے پاس جا کر بولے کہ اب کون سی تدبیر کی جائے؟ تب برہما نے رشیوں سے کہہ کر ایک راجہ تیار کرایا، راجہ کا نام پرتھو پڑا اور یہ پرتھوی دنیا کے راجہ ہو گئے، وہ وشنو کے اوتار تھے، ان کے راجہ ہونے کے بعد پھر پوجا ہونے لگی، یگ دیا جانے لگا اور مذہب پھر لوٹ آیا، وہ اپنی رعایا کو خوش رکھتے تھے اسی لیے چاروں طرف ان کی تعریف ہونے لگی، وہ رعایا کو رنجن کرتے یعنی خوش رکھتے تھے، اسی لیے لفظ رنجن سے راجہ کا نام تخلیق ہوا۔"

اس کے بعد سنبھل کر بیٹھتے ہوئے انھوں نے پوچھا ــــــ "اب تو سمجھ گئے، راجہ کس کو کہتے ہیں؟"

تمام لڑکے یک زبان ہو کر بولے ــــــ "سمجھ گئے سر۔"

"لیکن سبھی راجہ پرتھو راجہ کی طرح اچھے راجہ نہیں ہوتے، ایسے راجہ بھی ہیں جو رعایا کو خوش نہیں رکھتے، رعایا کو کھانے پینے کی سہولتیں نہیں دیتے، ہمارے دیش کے شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کا نام تم لوگوں نے سنا ہے!"

سبھی خاموشی سے پران متھ بابو کو تکتے رہے۔

کرن یکایک درمیان میں بول اٹھا ــــــ "سر، سی۔ آر۔ داس جب راجہ ہوں گے تو بہت اچھے راجہ ثابت ہوں گے۔"

"سی۔ آر۔ داس مہاراج چھوٹیں گے ؟"

پران ناتھ بابو نے حیرت سے کرن کی طرف دیکھا۔

اُنھوں نے پوچھا —— "تم سے کس نے کہا ؟"

کرن نے جواب دیا —— "ایک سادھو مہاراج نے سر۔"

"کون سادھو ہے ؟"

"اصلی سادھو ہے سر، اصلی ہمالیہ کا سادھو، کہتا ہے کہ جب ملک آزاد ہوگا تو سی۔ آر۔ داس مہاراج چھوٹیں گے اور میرے بابا کی بیماری اچھی ہو جائے گی اور ہمارے ملک میں سبھوں کی حالت بہتر ہو جائے گی اور ہم لوگ عمدہ عمدہ چیز کھائیں گے، دہی، رابڑی، سندیش، ساگ بھوگ۔"

پران ناتھ بابو مسکرائے، ان کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

انھوں نے کہا —— "ملک آزاد ہونے کے بعد ملک کے لوگوں کی حالت سدھر جائے گی یہ بات سادھو کے بتلانے کی نہیں، پھر جانے دو، میں کہہ رہا تھا کہ رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "راجہ رانی"۔ بڑے ہونے کے بعد تم لوگ وہ کتاب ضرور پڑھو، رابندر ناتھ ٹیگور ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں، تم لوگ دیکھو گے، ایک روز ان کی تصویر ہر گھر میں لٹکائی جائے گی، لیکن تم لوگوں نے تو ان کا نام بھی نہیں سنا ہے ؟"

دیپنکر یکایک اٹھ کر کھڑا ہو گیا، بولا —— "میں نے روبی ٹھاکر کو دیکھا ہے سر۔"

"تم نے انھیں دیکھا ہے ؟ کہاں دیکھا ہے ؟"

دیپنکر نے جواب دیا —— "کالی مندر میں سر۔"

"کالی مندر میں ؟"

"ہاں سر۔ مندر میں بکرے کی قربانی دیتے وقت ——"

اُسے آج بھی یاد تھا، وہ ہر روز محلے محلے سے پھول چن کر مندر میں دے آتا تھا، کنڈو پکھر کے کنارے سے جا کر ماں کالی، بھوبنیشور، گنیش اور دوسرے مندروں کے دیوتاؤں کے لیے پھول دے آتا تھا، کبھی کبھی ماں بھی اس کے ساتھ ہوتی، ماں پرنام کرتی، ماں کی دیکھا دیکھی دیپنکر بھی پرنام کرتا، پرنام کر کے اُسے کیا فائدہ اور کیا نقصان ہوا اُسے یاد نہیں تھا لیکن ان دنوں پرنام کرنا اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔

ایک روز ماں نے اس سے پوچھا تھا —— "وہ دیکھو، وہ کون ہیں بتاؤ تو ؟"

دیپنکر نے دیکھا تھا ایک معمر شخص جس کی لمبی لمبی سفید داڑھی تھی، ماں کے مندر اور ناٹو مندر کے درمیان راستے پر کھڑے ہوئے ٹکٹکی لگائے پرتیما کو دیکھ رہے تھے، انھوں نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھ رکھے تھے، اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"وہ کون ہے ماں؟"

وہ گرد و پیش سے بے خبر کھڑے تھے، ان کے ساتھ چند لڑکے اور لڑکیاں تھیں، وہ سب بھی دیوتا کی طرف دیکھ رہے
ں کے چہرے کتنے خوبصورت تھے، ان کے لباس کتنے خوبصورت تھے، وہ سب مورتیوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

ماں اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

"وہ کون ہے ماں؟"

ماں نے جواب دیا ——— "ان کا نام روبی ٹھاکر ہے۔"

"روبی ٹھاکر کون ہے ماں؟"

"بہت اچھی اچھی نظمیں لکھتے ہیں۔"

صبح کا وقت تھا، اس وقت مندر میں بھیڑ نہیں تھی، اس روز رابندر ناتھ کو وہاں کسی نے بھی نہیں پہچانا تھا، لیکن ماں پہچان
ی، ماں بہت عقلمند تھی، اگر بابا مارے نہ گئے ہوتے تو ماں اور بھی بہت کچھ بن سکتی، پھر ماں کو اگھور داد کا کھانا پکانا نہ پڑتا اور
ن ماں کے ساتھ وہ بھی اسی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"دیپو بابو!"

یکایک اپنا نام سن کر دیپنکر چونک اٹھا، تاریخ کی کتاب بند کر کے جب وہ کمرے سے باہر آیا تو حیران رہ گیا، رگھو،
لکھی دیدی کا ملازم رگھو کھڑا تھا!

رگھو نے کہا ——— "تمہیں کاکا بابو بلا رہے ہیں دیپو بابو۔"

دیپنکر کی آنکھوں کے حلقے حیرت سے پھیل گئے۔

اس نے پوچھا ——— "مجھے؟ مجھے کیوں بلا رہے ہیں؟"

رگھو نے جواب دیا ——— "کاکا بابو ابھی دفتر سے لوٹے ہیں، لکھی دیدی بولیں کہ سامنے کے گھر سے دیپو بابو کو بلا کر
لاؤ ———"

دیپنکر کچھ سوچنے لگا۔ اسے پھر کیوں بلا رہی ہے! پھر مارے گی کیا! اس نے کیا قصور کیا ہے! لکھی دیدی ہی کا تو قصور ہے!
ی دیدی ہی نے تو اسے مارا ہے، لگاتار دو دن مارا ہے، پھر بھی دیپنکر کچھ نہیں بولا ہے اور نہ کبھی بولے گا، چودہ سال تک دیپنکر
نہیں بولے گا، کسی سے کچھ نہیں کہے گا! چودہ سال تک اور چودہ سال میں سے ایک سال تو گزر ہی چکا ہے۔

پران متھ بابو نے کہا تھا ——— "اگر چودہ سال تک تم لوگ سچ بولوگے تو ایک دن تمہاری زبان سے جو بات بھی نکلے گی وہ
ہو جائے گی، جو بولوگے وہی ہوگا ———"

مدھو سودن نے پوچھا تھا ——— "سر، اگر میں کہوں کہ میں راجہ بنوں گا؟"

"وہی ہوگا۔" پران متھ بابو نے جواب دیا تھا ——— "راجہ ہی بنو گے، لیکن چودہ سال تک مسلسل، متواتر، لگاتار سچ بولنا پڑے گا،"

ایک بات بھی جھوٹ نہیں بولنا پڑے گا۔"

کرن نے پوچھا تھا ——— "مگر اگر میں کہوں کہ میرے بابا کی بیماری اچھی ہو جائے گی؟"

"ہاں، وہی ہوگا!"

"اگر میں کہوں کہ میں بہت بڑی عمارت کا مالک بن جاؤں؟"

"وہی ہوگا، جو چاہو گے وہی ہوگا ———"

اور اسی دن سے کرن اور دینکر نے طے کیا تھا کہ وہ دونوں چودہ سال تک سچ بولیں گے، ایک بات بھی جھوٹ نہیں بولیں گے۔ لیکن کرن اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکا تھا، اس نے بھیک کے پیسے چوری کر کے ہلکو کی دکان سے آلو چاپ اور بیگنی خرید کر کھایا تھا اور گھر میں نہیں کہا تھا۔

رگھو نے کہا ——— "چلو دینو بابو ——"

دینکر سوچ رہا تھا کہ وہ ایکبار ماں سے پوچھ لے، آنگن سے ہوتے ہوئے وہ باورچی خانے کی طرف جاتے جاتے رک گیا، ضرورت نہیں، ماں اس سے بہت ساری باتیں پوچھنے لگے گی اس سے بہتر ہے کہ وہ واپس آکر ہی سب کچھ بتا دے گا۔

دینکر نے پوچھا ——— "کیوں بلایا ہے، تجھے کچھ معلوم ہے؟"

رگھو نے جواب دیا ——— "میں نہیں جانتا ——"

آنگن طے کر کے باہر کے راستے سے ان کے مکان میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔ رگھو آگے آگے چل رہا تھا اور دینکر اس کے پیچھے تھا۔ ان لوگوں کے صحن کی دہلیز پر چڑھتے ہی زینہ شروع ہو جاتا تھا، زینے سے اوپر چڑھتے ہی دائیں طرف بیٹھک خانہ تھا، کمرے میں ایک طرف کاکا بابو بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی کھمی دیدی تھی اور مخالف سمت میں کاکی ماں تھیں۔

"کیوں دینو بابو، آج راستے میں تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

دینکر نے ایک بار کھمی دیدی کی طرف دیکھا، کھمی دیدی ہونٹ دبائے مسکرا رہی تھی۔

"بیٹھو، پہلے تم اس کرسی پر بیٹھو! اب بتاؤ تو کیا ہوا تھا! سچ بولو گے، ایک بات بھی جھوٹ نہیں بولو گے۔"

دینکر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ——— "میں جھوٹ نہیں بولتا، ایک سال ہے میں نے سچ کے سوا کبھی جھوٹ نہیں بولا ——"

"ایک سال سے سچ بولتے آ رہے ہو؟ جھوٹ بالکل ہی نہیں بولے؟"

"نہیں، میں اور بھی تیرہ سال تک مسلسل سچ بولوں گا!"

اس کی بات سن کر کاکا بابو حیران ہو گئے، کاکی ماں نے بھی مسکراتے ہوئے کاکا بابو کی طرف دیکھا۔ بولیں ——— "او ماں، خوب لڑکا ہے!"

کھمی دیدی نے اسے چھیڑا ——— "ایسے بارے ستو بادی جو دھشٹر مہاویر ——"

کاکا بابو نے لکھی دیدی کو منع کیا۔
"بیٹے ——— تم چپ رہو لکھی، اب بتاؤ تو تیرہ سال تک کیوں سچ بولوگے ؟"
دینکر نے جواب دیا ——— "میرے ہیڈ ماسٹر کہتے ہیں کہ اگر چودہ سال تک کوئی مسلسل سچ بولے تو اس کے بعد اس کی زبان سے جو بات نکلے گی، سچ ہو جائے گی۔"
اس کی بات سن کر کاکا بابو ہنسنے لگے، کاکی ماں ہنسنے لگیں اور لکھی دیدی بھی ہنس پڑی۔
کاکا بابو نے کہا ——— "اور تم نے اسے سچ سمجھ کر یقین کر لیا ؟"
ان دنوں وہ کتنا نیک، کتنا سیدھا اور کتنا معصوم تھا، کبھی کبھی دینکر کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ زمانہ اچھا تھا، جو کوئی اس سے جو کچھ کہتا وہ یقین کر لیتا تھا، اس نے یقین کر لیا تھا کہ کران کے بابا کی بیماری اچھی ہو جائے گی، یقین کر لیا تھا کہ کوڑی سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے، یقین کر لیا تھا کہ کسی آدمی کو ایک دن راجہ ہوں گے اور اس نے یہ بھی یقین کر لیا تھا کہ اگر چودہ سال تک سچ بولا جائے تو جو بات بھی زبان سے نکلے گی وہ سچ ہو جائے گی ——— اس کے علاوہ بھی بہت ساری باتیں تھیں جنھیں دینکر نے یقین کر لیا تھا! آج اتنے دنوں بعد اب اسے احساس ہوا تھا کہ دُنیا کا یقین کر لینا ہی بہتر ہے، تو کیا یقین کر کے آخر کار اُسے کچھ بھی نہیں ملا ؟ اور اُس نے یقین کر لیا تھا اسی لیے کیا اس کا سب کچھ کھو گیا ؟
کاکا بابو نے پوچھا ——— "راستے میں جو لڑکا تمھیں مارتا ہے، وہ کون ہے ؟"
"وہ پہلے میرے ہی اسکول میں پڑھتا تھا۔" دینکر نے جواب دیا۔
"تمھیں کیوں مارتا ہے ؟"
"یہ میں نہیں جانتا، میرے ہاتھ میں جو کچھ ہوگا وہ چھین لے گا اور کچھ نہ بولنے پر بھی مارتا ہے۔"
"اسی لیے آج میں نے اسے خوب پیٹا ہے کاکا بابو۔" لکھی دیدی بولی ——— "یہ خاموشی سے مار کیوں کھائے ؟ یہ نہیں مار سکتا ؟ اس کے بدن میں طاقت نہیں ہے ؟"
دینکر نے کہا ——— "ابھی وہ جتنا چاہے مجھے مار لے، ایک دن میں اس کا بدلہ چکا دوں گا کاکا بابو۔"
کاکا بابو نے پوچھا ——— "وہ کیسے ؟"
"میں غریب ہوں اس لیے وہ مجھے مارتا ہے۔" دینکر نے جواب دیا ——— "میں جب بڑا آدمی بن جاؤں گا تو وہ نہیں مارے گا، جب میرے پاس بہت سا روپیہ ہو جائے گا تو وہ مجھے نہیں مارے گا۔"
"کیوں ؟"
دینکر نے کہا ——— "اگھور دادو کہتے ہیں کہ روپے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے، روپے سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔"
کاکی ماں نے کہا ——— "لڑکے تو بہت عقل مند ہے !"

ڈیکی نے کہا — "انگور دادا نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میرے پاس روپیہ ہو تو میں اپنی پسند کی ہر چیز خرید سکتا ہوں اور اس وقت یہ کمسن بھی میری خوشامد کرے گا۔"

کاکا بابو اتنی دیر تک چپ بیٹھے تھے، بولے — "یہ سب غلط ہے ڈیکی بابو! انگور دادا نے تمہیں غلط سکھایا ہے، روپے سے ہر چیز خریدی نہیں جا سکتی، جب تم بڑے ہو گے تو سمجھو گے، دنیا میں روپیہ ہی بڑی چیز نہیں ہے۔"

"لیکن انگور دادا نے جو کہا ہے؟ انگور دادا بھی تو بہت بڑے آدمی ہیں —"

کاکا بابو نے کہا — "بڑے ہونے ہی سے کیا سبھی بڑے ہوتے ہیں؟ بہت سے لوگ بڑھاپے میں بھی بچے ہی رہتے ہیں، تمہارے انگور دادا بھی شاید اسی قسم کے ہیں، ملازمت کرنے سے پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ بھوبنیشور بابو ہی کو دیکھ کے!! بھوبنیشور بابو نے مجھے بتایا تھا کہ ایک روز وہ برما کی سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے، جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا، کوئی شناسا بھی نہ تھا، وہ گھر سے اپنی قسمت سنوارنے نکلے تھے —"

یہ کہانی بعد میں ڈیکی نے تفصیل سے سنی تھی۔

ستی نے ایک روز بتایا تھا — ہوڑہ ضلع کے ایک دور افتادہ گاؤں کا ایک لڑکا، جس کا نام بھوبنیشور متر تھا اور جو وہاں کا اکلوتا لڑکا تھا اور جس کی تعلیم روپے کی کمی کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی ایک روز گھر سے فرار ہو گیا تھا، فرار ہو کر وہ کہاں چلا گیا، یہ کسی کو معلوم نہ تھا، اس کے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہ تھا، ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی، ان دنوں خضر پور میں جیٹی بن رہی تھی، جیٹی میں جہاز اور اسٹیمر کی بھیڑ لگی رہتی، وہیں کسی خلاصی سے دوستی کر کے وہ سیدھا جاوا چلا گیا تھا یعنی گوروں کے ملک میں جا پہنچا تھا۔

کاکا بابو نے کہا — "میں نے جب پہلی بار ملازمت اختیار کی، میرے لیے وہ جگہ بالکل نئی تھی، میں زندگی میں کبھی وہاں نہیں گیا تھا، کسی ایک بنگالی کا چہرہ بھی دیکھنے کو ترس گیا تھا، یکایک میری ملاقات بھوبنیشور بابو سے ہو گئی — میں نے دیکھا، شہر سے سات میل دور جنگل میں ایک لکڑی کا گودام تھا، بڑے بڑے آرے چلتے رہتے، ہر وقت کام ہوتا رہتا، برمی قلی دن رات کام میں جتے رہتے، میں نے سوچا کسی انگریز کی کمپنی ہو گی، انگریز نہ ہو تو کوئی پنجابی یا مدراسی وغیرہ ہو گا، لیکن سائن بورڈ پر نگاہ پڑتے ہی میں حیران رہ گیا، میں نے دیکھا، جلی حرفوں میں لکھا تھا، پروپرائٹر بی. مترا — بنگالی اور وہ بھی اتنی دور!

اس وقت تک بھوبنیشور بابو سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، بنگالی دیکھ کر ان سے ملاقات کرنے کی خواہش ہوئی۔

مجھے دیکھ کر انہیں بھی سخت حیرت ہوئی اور انہیں دیکھ کر مجھے بھی!

بھوبنیشور بابو نے کہا — "شادی کر لیجیے جناب، وطن چھوڑ کر اتنی دور چلے آئے ہیں تو بیوی کو بھی ساتھ لانا چاہیے تھا —"

میں نے کہا — "پندرہ روپیہ میری تنخواہ ہے، پانچ روپے اوورسیز الاؤنس ہے، اتنے روپے میں خانہ داری کیسے چلے گی؟"

بھوبنیشور بابو نے کہا — "اس کے ساتھ رشوت کے روپے جوڑ دیجیے، دیکھیے کا بڑے آرام سے بسر ہو گی"

اس کے بعد میں تمھاری کاکی ماں کو بھی لے گیا۔

ممی دیدی نے پوچھا ——— "میں اس وقت پیدا ہو چکی تھی کاکا بابو؟"

کاکا بابو نے جواب دیا ——— "اس وقت تو تم ذرا سی بچی تھی، میں تمھیں گود میں لے کر گھومتا رہتا تھا ———"

"اور ستی؟"

"ستی اس وقت کہاں تھی، وہ تو ابھی اسی دن پیدا ہوئی تھی، برسات کا موسم تھا، رم جھم رم جھم بارش ہو رہی تھی، میں دفتر کا کام ختم کر کے گھر لوٹا تھا اور اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے، بتی گل کر کے سویا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی، ایک ہزاری کرتے کرتے اس دن اتنی رات ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا، اتنی رات گئے کون ٹیلیفون کر سکتا ہے، رسیور کان سے لگانے کے بعد معلوم ہوا، بھوبنیشور بابو تھے ———"

میں نے پوچھا ——— "کیا معاملہ ہے، اچانک کیا ہوا دادا؟"

ادھر سے بھوبنیشور کی آواز آئی ——— "تمھیں ایک خوش خبری سنانی ہے، میرے یہاں بچی پیدا ہوئی ہے۔"

میں تو جیسے اچھل پڑا، پوچھا ——— "کب؟"

"یہی ابھی ——— !"

میں نے کہا ——— "پھر سندیش کھلائیے دادا، ایک نہیں اب دو بچیاں ہو گئیں، اس کا نام ستی رکھیے، بڑی کا نام لکھی ہے اور چھوٹی کا نام ستی ہے، دونوں مل کر ستی لکھی بن کر رہیں گی۔"

کاکی ماں کو مخاطب کر کے کاکا بابو نے پوچھا ——— "اے جی، تمھیں یاد ہیں وہ سب باتیں؟"

کاکی ماں نے جواب دیا ——— "یاد کیسے نہ رہے گا بھلا؟ تم اتنی رات ہی کو پھر چلے گئے تھے۔"

کاکا بابو نے کہا ——— "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ملازمت کرنے سے پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ روپے سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے، لیکن بھوبنیشور سے ملاقات ہونے کے بعد میرا یہ خیال بدل گیا۔ ان دنوں تمھاری کاکی ماں کو ساتھ لے کر گیا ہی تھا کہ یکایک دھرن کی بیماری پھیلی اور میں اس کی لپیٹ میں آ گیا، بڑی خطرناک بیماری تھی، گھر کے تمام نوکر چاکر بھاگ کھڑے ہوئے، ایک آدمی بھی تیمارداری کے لیے نہ تھا، تمھاری کاکی ماں بھی بالکل اجنبی تھی، کسی کو پہچانتی تک نہ تھی، میں تو بے ہوشی کے عالم میں بے سدھ پڑا ہوا موت کی گھڑیاں گن رہا تھا، سوچا، زندگی کا سفر اسی غیر ملک کی زمین پر تمام ہو گا۔

"لیکن نہ جانے کہاں سے رہنے والے بھوبنیشور بابو، جن سے سات پشت تک میری کوئی رشتہ داری نہ تھی، لکھ پتی آدمی، یہ خبر کے پاتے ہی دوڑے ہوئے میرے پاس آئے اور اس کے بعد ڈاکٹر اور دوا کی فکر سے میں آزاد ہو گیا، جس دن وہ میرے پاس آئے تھے اس دن سے لے کر اس وقت تک، جب تک میں بالکل صحت یاب نہ ہو گیا، وہ میرے ہی پاس رہے، وہ لکھ پتی آدمی اپنا تمام کاروبار چھوڑ کر صرف میری ہی تیمارداری کرتا رہا! ایسا کون کرتا ہے؟ مجھے صحت یاب کرنے میں ان کی کونسی غرض پوشیدہ تھی؟ ان کے ساتھ میرا کون سا رشتہ تھا! میں ان کا کون تھا جس کے لیے انھوں نے اتنا کچھ کیا؟ اپنا روپیہ، اپنا وقت اور اپنے آدمی

سے کر انھوں نے مجھے صحت یاب کیا ——— انھوں نے ہی یہ کیوں کیا ؟"

اس کے بعد وینکر کی طرف دیکھ کر بولے ——— "اچھے بُرے روپے سے دُنیا میں بہت کچھ بکتا ہے لیکن بابو شیو بابو کی وفاداری، وہ دیکھ بھال کیا روپے سے پرکھنے کی چیز ہے ؟"

کملی دیدی نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ کاکی ماں بھی کچھ نہ بولیں، اور وینکر بھی خاموش رہا۔

کاکا بابو نے کہا ——— "اور جیسا بیٹا ہے ویسی ہی لڑکی بھی ہے، میں نے جمشید بابو کو سمجھایا تھا کہ لڑکیاں ہر میں تو کیا ہوا، انھیں کو اگر اچھی تعلیم دی جائے تو یہی لڑکیاں لڑکوں سے بہتر ثابت ہوں گی۔ جمشید بابو نے کہا ہے کہ بیٹی، تمہارے رزلٹ سے بے حد خوش ہیں، انھوں نے کہا ہے کرسٹی کو بھی یہیں بھیج دیں گے، وہاں اس کی تعلیم اچھی نہیں ہو رہی ہے۔

"اور ہاں، ایک بات کہنا میں بھول گیا تھا، شانتا کرسے کہہ دو کہ کل میں صبح سویرے ہی باہر جاؤں گا۔"

کاکی ماں نے پوچھا ——— "کل صبح صبح کیوں ؟"

"نوکری کا معاملہ ہے، پریشان کر رکھا ہے، یہی دیکھو نا جب تک برما میں تھا بڑے آرام سے تھا مستا لک تھا اچانک آرڈر ملا کر تبادلہ ہو گیا ہے اور اتنی پرانی جگہ کو چھوڑ کر مجھے یہاں چلا آنا پڑا، حکم کی تعمیل کرنے کا نام ہی نوکری ہے، اب نہ ہو تو پھر غلامی کس کو کہتے ہیں ! پھر کسی روز ممکن ہے پٹنہ تبادلہ کرنے کے حکم کی دیر ہے۔"

وینکر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کاکا بابو بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے ——— "میں نے جو کچھ کہا ہے تمہیں یاد رہے گا نا وینو بابو! لکھو اگر پھر کبھی تمہیں مارے تو ہرگز برداشت نہ کرنا، تم بھی اسے مار دینا، مار کا بدلہ مار ہی ہے، اس دُنیا میں آنسو کی قیمت کوئی نہیں دیتا، اس دُنیا میں خودداری کی قیمت بھی کوئی نہیں دیتا ———"

"لیکن وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے !"

کاکا بابو نے کہا ——— "پھر تم آکر مجھ سے کہنا۔"

کملی دیدی نے کہا ——— "اب شاید اُسے مارنے کی ہمت نہ ہوگی کاکا بابو، میں نے اس لڑکے کی اچھی طرح مرمت کر دی ہے۔"

کاکا بابو نے کہا ——— "اچھا کیا ہے ——— اس دُنیا میں مار کا بدلہ مار ہی ہے، گاندھی خواہ کچھ بھی کہیں ———"

اس روز وینکر زیادہ دیر وہاں نہیں رُکا تھا، ممکن ہے ماں سوچ رہی ہو کہ پتہ نہیں کھوکا کہاں چلا گیا ! لیکن اس دن کاکا بابو کی بات سن کر وہ عجیب تذبذب میں پڑ گیا تھا ——— کس کی بات صحیح ہے ؟ انگور دادو کی یا کاکا بابو کی ! یا پران متھ بابو کی یا پھر کسان کی زبانی سنے ہوئے، سونار کاتک کے گھاٹ پر بیٹھے ہوئے اس ہمالیہ کے سادھو کی ! کس کی بات زیادہ سچ ہے :

افسوس ہوا جیسے کاکا بابو کی بات ہی سچی ہے ! اس روز روپیہ پیسہ ہوتے ہوئے بھی کاکا بابو طاعون کی بیماری میں مر رہے تھے ——— ہو بنشیور بابو نے کیوں انھیں بچا لیا ؟ کیوں ، کس لالچ سے انھوں نے کاکا بابو کو صحت یاب بنا دیا ! پھر اس نے سوچا ، اگر یہ ہوتا تو اب تک کرونے کے بابھی صحت یاب ہو گئے ہوتے ، بہت دنوں پہلے ہی صحت یاب ہو کر وہ پھر کسی اسکول میں ریاضی ماسٹر ہو گئے ہوتے ! لیکن کاکا بابو کی عمر بھی تو اب زیادہ ہو چکی ہے ، کاکا بابو نے بھی تو بہت کچھ دیکھا ہے ! تو کیا کاکا بابو نے جو ت حاصل کیے ہیں جو کچھ دیکھا ہے وہ سب غلط ہے !

وہ ہر روز دیکھتا کہ کاکا بابو سوٹ پہن کر دفتر چلے جاتے تھے ، ایشور گنگولی لین سے نکل کر وہ سیدھے کنڈولیا گھر کی سمت ے جاتے ، وہاں سے بس یا ٹرام پر سوار ہو کر دفتر چلے جاتے ، ایشور گنگولی لین کے بہت سارے لوگ دفتر جاتے تھے ——— ی کاکا بابو کے دفتر جانے کا وقت ان سے علیحدہ تھا ، ان کے جانے کا کوئی مقرر وقت نہیں تھا ، کسی کسی روز وہ صبح سویرے کل جانے اور بڑی رات گئے واپس آتے تھے ، اس وقت مکان کا صدر دروازہ بند ہو جاتا تھا ، کیوڑا تلا کی طرف سے "ہری ل" کی آواز اور بھی صاف سنائی دیتی تھی اور حاجی قاسم کے باغ کی پرلی طرف سے بہت سے گیدڑوں کے ایک ساتھ چیخنے کی واز آتی رہتی ، اس وقت سبھی لوگ سو جاتے تھے ، کالی گھاٹ میں ، مندر میں ، پتھر پٹی میں اور نیپال بھٹاچارج اسٹریٹ میں کوئی ی جاگا ہوا نہ ہوتا ، اگھور داد بھی شاید اس وقت برتن اور گھڑوں کی ڈھیری کے قریب ہی کہیں پڑا ہک کر کچھ دیر کے لیے ے خبر ہو جاتے تھے ، لیکن ان کے یہاں ——— اس لکھی دیدی کے مکان میں کبھی کبھی اس وقت تک روشنی ہوتی رہتی ، اس وقت ے نوکر چاکر کی آواز سنائی دیتی ، شاید اسی وقت کاکا بابو دفتر سے لوٹتے تھے ، کیسا دفتر تھا ! جہاں اتنی رات تک کام ہوتا تھا وہ یسا آفس تھا ! کاکا بابو کس دفتر میں کام کرتے تھے ؟ کیا کام تھا ؟

لیکن یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ جب سے وہ لوگ آئے تھے چنونی بھی جیسے بالکل خاموش ہو گئی تھی ، وہ چیختی چلاتی اب بھی تھی لیکن اب اس کی آواز میں وہ تیزی نہیں رہی تھی ، شاید ان کے یہاں جا کر اس نے مراسم پیدا کر لیے تھے ، ابھی اسی دن وہ کھپا سے چھپا کر ایک تھالی بھات لے کر آ رہی تھی ———

اور آنگن میں آتے ہی یکایک اس نے شروع کر دیا تھا ——— " آہ ، مرجا ، تیرے منہ میں آگ ، نا وقت بھی کھانے بیٹھتی ہوں تو تجھ سے برداشت نہیں ہوتا ——— "

دیپنکر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تھا ——— " کس کو گالی دے رہی ہو چنونی ؟ "

" یہ دیکھو نہ بھیا ، اس بیٹی کی حرکت دیکھ ، مٹک شو مٹک شو کر چلی آئی ہے ۔ "

دیپنکر نے دیکھا ، چنونی کی دو پالتو بلیاں تھیں جو سر اٹھائے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں ۔

دیپنکر نے پوچھا ——— " تم ان لوگوں کو گالی کیوں نہیں دیتیں چنونی ؟ یہ جو نئے کرایہ دار آئے ہیں ؟ ان کو چھنال کہہ کر الی نہیں دے سکتیں ؟ اس گھر کی ایک لڑکی مجھے بہت مارتی ہے ——— "

چنونی نے جواب دیا ——— " آہا ، بغیر ماں کی بچی ہے ، باپ کو چھوڑ کر پردیس آ گئی ہے ، اس کو کیسے گالی دے سکتی

ہوں بیٹا؟ ــــ [illegible] سمجھتے ہوئے گناہ نہ ہوگا؟

اس وقت چھونی ایک تھالی میں کپڑے سے چھپائے ہوئے باریک چاول کا بھات لیے ہوئے تھی، مچھلی کے دو ٹکڑے تھے اور دال ترکاری بھی تھی، چھونی اب پہلے جیسی چھونی نہیں تھی، ان لوگوں نے جیسے چھونی کو کوڑی کے مول خرید لیا ہو، چھونی جیسے ان کی خریدی ہوئی باندی ہو گئی تھی، اکھورواد کی بات ہو چکی تھی! اکھورواد کی بات ہو گئی تھی! روپے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے! روپے سے مکھی کو بھی خریدا جا سکتا ہے، دینکر کے پاس اگر روپیہ ہو جائے تو مکھی بھی اسے نہیں مارے گا۔

اوپر سے اتر کر کوٹھڑی کے دروازے کے قریب آتے ہی یکایک پیچھے سے کسی نے اسے آواز دی۔

"اے سنو ـــــ"

دبی ہوئی آواز تھی، دینکر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی متعجب ہو اٹھا۔

مکھی دیدی! وہ جگہ تاریک تھی، امرا کے پیڑ کے بالکل نیچے ٹھیک کوٹھڑی کے دروازہ کی چوکھٹ پر مکھی دیدی دینکر سے جسم سے سٹ کر کھڑی ہو گئی۔

بولی ـــــ "اچھے بھائی دینو، میرا ایک کام کر دو گے؟"

دینکر کی حیرانی کی انتہا نہ رہی، مکھی دیدی اس کے ساتھ اتنے پیار سے بات کر رہی تھی!

اس نے پوچھا ـــــ "کون سا کام؟"

"یہ خط ایک آدمی کو دے آؤ گے؟"

مکھی دیدی کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

دینکر نے پوچھا ـــــ "کس کو؟"

"پہلے بتاؤ، ٹھیک دے آؤ گے نا؟"

"ٹھیک دے آؤں گا، دے کر دیکھو ـــــ"

"کسی سے کہو گے تو نہیں؟"

مکھی دیدی نے اس کے ساتھ کبھی اس طرح بات نہیں کی تھی، مکھی دیدی اتنی ہی دیر میں پسینے سے تر ہو گئی تھی۔

"نہیں، کسی سے نہیں کہوں گا، تم خط دے دو۔ دے کر دیکھو میں دیتا ہوں یا نہیں ـــــ"

"تو پھر ایک کام کرو ـــــ"

اتنا کہہ کر مکھی دیدی نے لفافہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

بولی ـــــ "کوئی دیکھے گا تو نہیں؟ تمھاری ماں تو نہیں دیکھے گی؟"

دینکر نے کہا ـــــ "میں چھپا کر رکھوں گا، تم سے وعدہ کرتا ہوں کسی کو نہیں دکھاؤں گا ـــــ کس کو دینا ہوگا بتاؤ؟"

لکھی دیدی نے دبی ہوئی آواز میں کہا —— "کنڈوپکھر کے کنارے، ٹھیک مندر کے پچھم جو دروازہ ہے وہیں پر وہ کھڑا ہوگا —— اس کے ہاتھ میں دے دینا ——"

"لیکن اس کی شکل کیسی ہے؟"

"سفید قمیص، سفید پتلون اور سفید جوتا ہوگا اور زرد رنگ کا کوٹ ہوگا اور کوٹ کے بٹن ہول میں ایک گلاب کا پھول ہوگا ٹھیک پہچان لوگے نا؟"

"کب دینا ہے؟"

لکھی دیدی نے کہا —— "کل ٹھیک سات بجے صبح ——"

دینکر نے کہا —— "ٹھیک ہے، اس وقت تو میں ہر روز مندر میں پھول دینے جاتا ہوں، تم کچھ فکر مت کرو، میں دے دوں گا، کچھ کہنا ہوگا؟"

لکھی دیدی نے کہا —— "نہیں ——"

اس کے بعد دینکر چلا آرہا تھا، لیکن لکھی دیدی نے پھر آواز دی۔

بولی —— "سنو، ادھر آؤ ——"

دینکر کے قریب جاتے ہی لکھی دیدی نے کہا —— "یہ لو، تم کھاؤ گے ——"

اندھیرے میں بھی دینکر نے دیکھ لیا، مٹھی بھر چاکلیٹ تھا، لکھی دیدی نے اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ ٹھونس دیا، چاکلیٹ دے کر لکھی چلی گئی اور دینکر کھڑکی کا دروازہ بند کر کے آنگن میں آکر کھڑا ہوگیا، اس کے بعد اس نے ہاتھ کی بند مٹھی کھول کر ایک بار دیکھا، بہت سارے چاکلیٹ تھے، منہاری کی دوکان میں جیسے چاکلیٹ شیشے کے مرتبان میں رہتے تھے یہ بھی ویسے ہی تھے بلکہ اس سے بھی عمدہ تھے، چمکی میں لپٹے ہوئے چوکور چوکور چاکلیٹ تھے، اس کا جی چاہا کہ ایک اسی وقت چکھ کر دیکھے، لیکن پھر اس نے سوچا —— بعد میں کھاؤں گا!

اس وقت تک صبح کی روشنی نہیں پھیلی تھی، ماں نے اس سے پہلے ہی اسے جگا دیا تھا، دینکر نے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور جھٹ پٹ کپڑے پہن کر تیار ہوگیا، اس کے بعد لکھی دیدی کا خط جیب میں ڈال لیا، اسے حاجی قاسم کے مکان کے پاس پھول چننے کے لیے جانا تھا، باغ کی دیوار ایک طرف سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ اسی راستے سے اندر چلا جاتا تھا، اندر بہت سارے پھول تھے، گندھراج، چینی گلاب، گل سوسن اور دوسری بہت سی اقسام کے پھول تھے، کبھی کبھی بھنوروں کی ٹوکری پھولوں سے بھر جاتی تھی، یہی پھول وہ مندروں میں جاکر دے آتا تھا، پہلے ماں کالی کے مندر میں، اس کے بعد مدھوسودن کے مندر میں، اس کے بعد رادھا گوبند، گنیش، جگن ناتھ، شوشنکر اس کے بعد سب سے آخر میں نو کوشیشر راؤ اور سونار کا تک کے مندر میں —— اسے ہر مندر میں سے تھوڑے پھول دینے پڑتے تھے اور اسی لیے دینکر کو سبھی پجاری پہچانتے تھے۔ اس کے جاتے ہی سبھی اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے۔

کہتے ——— [illegible]' اس طرف دھت"

پھول دینے کے بعد دینکر دیتا کو ایک بار پرنام کر لیا۔
ماں نے سمجھا دیا تھا کہ پرنام کرتے وقت کہو گے' ٹھاکر میں اچھی طرح تعلیم حاصل کروں' خوشی حاصل کروں اور ترقی کر سکوں ———

اور بہت دنوں کے بعد جب دینکر پڑھ لکھ کر ڈی۔ ٹی۔ آئی ہو گیا تھا تو ایک دن گڑیا ہٹ نیپال کا سنگھ کے گیٹ مین بھوشن نے اس کے قدموں پر سر رکھ کر کسی بات کو کہا تھا ———

"حضور آپ میرے ماں باپ ہیں' آپ کا بھلا ہوگا حضور' بھگوان آپ کو بہت دے گا حضور۔"

اس دن دینکر کو ہنسی آئی تھی۔ بہت سے لوگ ہی تو اس کو دعائیں دیتے تھے' پہلے لائن میں سبھی نیک خواہشیں کہتے تھے' سبھی یک زبان ہو کر اسے سین صاحب کہتے تھے' بالی گنج اسٹیشن کے وہ مزدور' بابر' ساؤتھ کیبن کے کرالی بابو' کون تھا جو اس کی بھلائی نہیں چاہتا تھا اور نرمل کا چپراسی ودو پدمک اسے جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا' اس کی عزت کرتا تھا' وہ جب بھی اپنے دیش سے کوئی بھی چیز لاتا تھا تو پہلے سین صاحب کو دیتا تھا پھر خود کھاتا تھا' اس سے کیا ہوا! اس سے اس کا کیا فائدہ ہوا! اور وہ چاکلیٹ: جو چاکلیٹ لکھی دیدی نے اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا تھا' وہ بھی ایک قسم کی رشوت تھی! رشوت دے کر ہی لکھی دیدی نے دینکر کو خرید لینا چاہا تھا! کوڑی دے کر ہی دینکر کا منہ بند کر دینا چاہا تھا' لیکن اس سے کیا وہ بات چھپی رہی! وہ کیا چھپی رہنے والی بات تھی!

"اے ———"

دینکر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی حیران رہ گیا تھا' اتنے سویرے لکھی دیدی بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے دروازہ میں آکر کھڑی ہوئی تھی۔

اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا ——— "چاکلیٹ لیا ہے نا؟ بھولو گے نہیں؟"

دینکر نے کہا ——— "نہیں' یہ دیکھو نا' میری جیب میں ہے ———"

"رہنے دو' دیکھنے کی ضرورت نہیں' تم نے اپنی ماں کو تو نہیں دکھایا؟"

"نہیں ———"

"سچ کہتے ہو ———؟"

دینکر نے کہا ——— "میں جھوٹ نہیں بولتا' چودہ سال تک جھوٹ بولوں گا بھی نہیں۔"

لکھی دیدی نے پھر پوچھا ——— "شکل یاد ہے نا؟ سفید قمیص' سفید پتلون' سفید جوتا اور زرد رنگ کا کوٹ' کوٹ کے بٹن ہول میں گلاب کا ایک پھول ———؟"

"یاد ہے ———"

اتنا کہہ کر دیپنکر پھولوں والی ٹوکری لیے ہوئے باہر چلا گیا۔

واقعی کالی گھاٹ میں جتنے لوگ تھے ان سب کا کاکا بابو بالکل ہی مختلف تھے، دیپنکر نے کتنے ہی مکانات دیکھے تھے، بچپن میں ...تے ہی مکانوں کے زنان خانے میں جا چکا تھا، مکان کا اندرونی حصہ دیکھ چکا تھا، کرن کا مکان بھی دیکھ چکا تھا، لکھن کا مکان بھی ...دیکھ چکا تھا، بھان، پھٹک اور رالکھال، سبھوں کے مکانات دیکھ چکا تھا، لیکن کاکا بابو کے مکان اور ان کے مکان میں کوئی مماثلت نہیں ...تھی۔ کالی گھاٹ میں ان دونوں کسی کے یہاں نوکر اور باورچی نہ تھے، کرن کے گھر کا خرچ تو بھیک کے پیسے ہی سے چلتا تھا، جینو فروخت ...کرنے سے اس کے گھر میں چاول، دال اور آلو آتا تھا اور صرف یہی نہیں ——— مدھو سودن ...کے مکان میں جا کر اس نے دیکھا تھا، مدھو سودن کے تمام بھائی بہن مل کر بیٹھے بھات کھا رہے ہوتے۔ ایک بڑی سی تھالی میں مدھو سودن ...کی ماں ڈھیروں بھات اور دال نکال کر رکھ دیتی اور وہ تمام بھائی بہن دائرہ بنا کر تھالی کے گرد بیٹھ جاتے اور اکیلی مدھو سودن کی ماں نوالے ...بنا کر سب کو کھلاتی رہتی! پھٹک بیہترپٹی کی گلی میں رہتا تھا، پھٹک کی ماں بوڑھی ہو گئی تھی اور بوڑھی ہو کر راستے کی دکانوں میں سے ...پیسے مانگتی اور اسی پیسے سے اس کے گھر کا خرچ چلتا تھا، ایشور گنگولی لین سے ہوتے ہوئے آگے جانے کے بعد کالی لین میں الدار کا گھر تھا، ...ان کے گھر میں بھگوان سب آتے رہتے، کماری پوجا ہوتا، بھوگ آتا، پرشاد آتا، وہ کالی پوجا کے موقع پر ماں کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا، اس ...کے لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھا تھا، اس گھر کی شکل بھی ایسی نہ تھی اور اگھور دادو! اگھور دادو کے پاس بھی تو بہت سارا روپیہ تھا، ...اگھور دادو کے پاس کتنا روپیہ تھا اس کی تعداد خود اگھور دادو کو بھی معلوم نہ تھی، پھر بھی اگھور دادو کا مکان بے رونق اور بدصورت ...تھا۔ اگھور دادو کو دیکھ کر پیچ پچ جنتری کے بوڑھے کی تصویر اس کی نگاہوں میں پھر جاتی تھی، گھر بھر میں صرف لکشمی دیدی ہی ایسی ...تھی جو خوبصورت کہی جا سکتی تھی۔

دن بھر لکشمی دیدی کی آواز گھر میں سنائی نہ دیتی۔

ماں کہتی ——— "یہ کیا کپڑا پہن رکھا ہے تم نے بیٹی، کوئی اچھی سی ساڑی پہن لو، آج سال کا پہلا دن ہے ———"

لکشمی دیدی منہ چھپا کر ہنسنے لگتی۔

ماں کہتی ——— "کیوں کپڑا نہیں ہے شاید؟ اتنی ساری لال کنارے کی ساڑی کیا ہوئی کیا سب بابا کے خوانچے پر چلی ...گئی ہے؟ بابا کی عقل کیسی ہے بھلا تو؟"

لکشمی دیدی خوف سے سہم جاتی۔

کہتی ——— "تم دادو سے مت کہہ دینا، دادو سمجھیں گے کہ میں نے ہی تم سے کہا ہے۔"

ماں کہتی ——— "تمہاری بھی عجب تقدیر ہے بیٹی، ورنہ تمہاری قسمت اس طرح کیوں پھوٹتی؟"

اس روز اگھور دادو کے لوٹتے ہی ماں نے گھیر لیا۔

بولی ——— "بابا، آپ سے ایک بات کہنی تھی ———"

روپیہ!

اگمبر داد کے ایک ہاتھ میں تھیلا یا بیٹھی ہوئی ایک پڑیا تھی اور دوسرے ہاتھ میں لاٹھی تھی، پیشانی پر قشقہ لگا ہوا، سر گنجا، پسینے کے چشموں کی دو لکیریں پڑی تھیں، پاؤں میں کھڑاؤں تھا، کچھ دیر پہلے ہی رکشا والے سے کرایہ کے لیے جھگڑ چکے تھے، یکایک گھر کے اندر داخل ہوتے ہی جیسے وہ ڈھیر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے، یہاں بھی روپیہ!

بولے ——— روپیہ؟ منہ جلی لڑکی میرے پاس روپیہ کہاں سے آیا؟ تم نے کیا میرے پاس روپے کا پیڑ دیکھ لیا ہے!"

ماں نے کہا ——— میں آپ سے روپے کی بات نہیں کہہ رہی ہوں، آپ کا روپیہ آپ ہی کے پاس رہے گا، لیکن لڑکی کی شادی تو کریں گے ——— یا نہیں کریں گے؟"

اگمبر داد کو اتنی دیر بعد ذرا اطمینان ہوا

بولے ——— شادی! لیکن منہ جلی کی شادی میں بھی روپیہ خرچ ہوگا! روپیہ میں کہاں سے لاؤں گا، سنوں تو سہی؟"

"تو روپیہ خرچ ہوگا اس لیے آپ نہیں کریں گے؟ کیسے نانا ہیں آپ؟ اتنا دھرم کرم کرتے ہیں یہ بھی تو دھرم کا کام ہے! عاقبت میں اس کے لیے تو آپ ہی کو جواب دینا پڑے گا اور اگر آپ سے یہ نہیں ہو سکتا تو اس کے گلے میں کلسی باندھ کر گنگا میں بہا دیجیے، سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔"

اگمبر داد تھوڑی دیر تک خاموش کھڑے رہے۔

ماں نے کہا ——— لڑکی کی طرف آپ تو ایک بار نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، لڑکی کی عمر بڑھ رہی ہے، وہ تو آپ کے نہیں ہیں، آپ نہیں دیکھیں گے تو کون دیکھے گا؟"

اب کے اگمبر داد چیخ اٹھے۔

بولے ——— میں! میں کیوں دیکھوں گا اس منہ جلی کو، میں کون ہوں؟ منہ جلی نے ماں کو کھا لیا، منہ جلی نے باپ کو کھا لیا ——— کیا منہ جلی مجھے کھانا چاہتی ہے؟ مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا ———

"آپ سے نہیں ہوگا تو کس سے ہوگا؟"

"وہ میں کیا جانوں منہ جلی، میں اس کا کیا لگتا ہوں، میں کیا اس کا باپ ہوں، میں کیا اس کی ماں ہوں؟ میں کوئی بھی نہیں ہوں۔"

اتنا کہہ کر اگمبر داد کھٹ پٹ کرتے ہوئے زینہ طے کر کے اوپر چلے گئے، اوپر جانے کے بعد ان کے بڑبڑانے کی آواز آتی رہی ——— منہ جلی نے میرا روپیہ دیکھ لیا ہے، میرا روپیہ دیکھ لیا ہے منہ جلی نے، میں منہ جلی کو گھر سے نکال دوں گا، نکل، نکل منہ جلی، نکل جا، بھاگ جا ———"

انگور داؤد کی بک بک جھک جھک ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔
انگور داؤد کے جانے کے بعد بنتی دیدی اپنی جگہ سے باہر نکل آئی اور ماں کے قریب آکر خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔

"دیدی ___"

ماں نے کہا ___ "تو ٹھہر تو بیٹی، اتنا ڈرنے سے کام نہیں چلے گا، عورت بن کر پیدا ہوئی ہو تو برداشت کرنا نہیں پڑے گا؟ برداشت نہیں کرو گی تو خود ہی دُکھ اٹھاؤ گی۔ کوئی تمہارے لیے کچھ نہیں کرے گا ___ تم ذرا ہمت سے کام لو ___"

ماں کہنے لگی ___ "میں نے یہ سب بہت دیکھا ہے، ایک کپڑے میں ایک ماہ کے بچے کو لے کر میں گاؤں چھوڑ کر بھاگ آئی تھی، مجھے بھی رشتہ داروں نے کتنا خوف دلایا تھا لیکن تمہاری طرح میں نے کیا خوف کھایا تھا؟ خوف کرتی تو اس لڑکے کی پرورش نہ کر سکتی ___"

سچ مچ ماں کتنی مصیبتیں اٹھا کر اس کی پرورش کر رہی تھی، دوسرے کے گھر کا تمام کام کر کے بھی ماں چاروں طرف کتنا بھاگتی دوڑتی رہتی تھی۔ ماں نے ہی اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے کہہ کر اسکول کی فیس معاف کروا دی تھی۔ ماں ہی اسے اپنے ساتھ چڑیا گھر لے گئی تھی اور وہاں شیر، چیتا اور ہاتھی دکھایا تھا۔ بندر کو چنا کھلایا تھا۔ ماں ہی نے اسے بہت سی باتیں سمجھائی تھیں، ماں ہی نے اسے کالی گھاٹ میں ورزش کلب میں داخل کرا دیا تھا۔ آج اگر ماں زندہ ہوتی! دینکر کبھی کبھی سوچنے لگتا، اگر ماں زندہ ہوتی تو کیا اسے دیکھ کر خوش ہوتی، ماں کیا اس کا مرتبہ اس کا عہدہ دیکھ کر خوش ہوتی! ماں نے کیا اسے صرف بیمن صاحب بنانا چاہا تھا۔ ماں نے تو اپنے لڑکے کو انسان بنانا چاہا تھا! لیکن کیا وہ انسان بن سکا؟ کیا اسی کو انسان بننا کہتے ہیں؟ یہ ملازمت کی ترقی! یہ ڈی۔ ٹی۔ آئی؟ یہ ڈی۔ ٹی۔ ایس؟

اُسے یاد ہے، ایک مرتبہ ایک واقعہ ہوا تھا۔ اُس وقت وہ کالی گھاٹ اسکول کا طالب علم تھا، کالی گھاٹ اسکول کا فری اسٹوڈنٹ۔ بچوں کا ڈرامہ ہو رہا تھا۔ دینکر ماں سے کہہ گیا تھا کہ اس کی واپسی میں دیر ہوگی۔ وہ زیادہ رات گئے گھر لوٹے گا۔ ڈرامہ کا نام "سیاگ" تھا۔ شام کے چھ بجے ہی اسکول لڑکوں سے بھر گیا۔ دینکر سامنے جا کر بیٹھا تھا۔ کرن بھی اس کے ساتھ تھا۔ اونچے درجوں میں پڑھنے والے لڑکے ڈرامہ میں کردار ادا کر رہے تھے۔ ٹن سے گھنٹہ بجنے کے ساتھ ہی سامنے کا پردہ اُٹھ گیا۔ اُف وہ بھی کیا دُنیا تھی، دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے وہ کہاں کتنی دور پہنچ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وہاں موجود نہ ہو، اس روشنی سے، اس اجتماع سے، اس گھنٹے کی آواز سے، اُس کالی گھاٹ سے بہت دور کسی اور ہی دُنیا میں پہنچ گیا ہو۔

کرن رہ رہ کر تالی بجا رہا تھا۔

لیکن دینکر کا خیال اس طرف نہیں تھا، اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے پران منو بابو ایک دن کلاس میں اسی دُنیا کی بات کر رہے تھے۔ ایک وقت تھا جب دُنیا میں کوئی راجہ نہیں تھا، ریاست بھی نہیں تھی، سزا بھی نہیں تھی، سزا دینے والے بھی نہیں تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ کشش نے جنم لیا اور مذہب دُنیا سے ختم ہونے لگا۔ تمام دیوتا ڈر گئے، سب برہما کے پاس دوڑ پڑے ___

دینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دور پھر لوٹ آیا ہے۔ جیسے راجاؤں نے دُنیا پر پھر ظلم کرنا شروع کر دیا ہو۔ یہ راجہ

ناانصافی کرتا ہے، یہ راجہ ظلم کرتا ہے، یہ راجہ خون کرتا ہے، لیکن اس مرتبہ اس کا تدارک کون کرے گا! اس وقت اس کا تدارک کرنے والے کہاں ہیں؟ اس وقت دیوتا سب کہاں ہیں؟ برہما کے پاس کون جائے گا؟ پرمتما راجہ کی شکایت کون کرسکتا ہے، وہ وشنو کا اوتار کہاں ہے؟

ڈرامہ دیکھتے دیکھتے دیپکر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، رگھوپتی کے ساتھ دیپکر بھی رونے لگا ——

ماں تم نے غریبوں کی دولت چھین لی! راجہ اگر چوری کرے،
میں نے سُنا ہے کہ دُنیا کا بھی ایک راجہ ہے —— تم اگر چوری
کرو، تمھارا انصاف کون کرے گا!

واقعی تو، کون انصاف کرے گا! راجہ اگر ظلم کرے، کس سے انصاف کی درخواست کی جائے؟ کہاں ہے وہ دُنیا کا راجہ، جنتی دیدی کی شادی اگر اگھور داوہ نہ کرے تو کون کرے گا؟ کرن کے بابا کی بیماری اگر اچھی نہ ہو تو وہ کس سے اس کا تدارک کرنے کہے گا؟ اس دُنیا کا راجہ کہاں ہے؟ اسے کس طرح دیکھا جاسکتا ہے، وہ کہاں، کس ریاست میں رہتا ہے؟

ماں نے کہا تھا —— ماں کالی کو اگر دل سے پکارا جائے تو ماں سن لیتی ہے اور صرف ماں کالی ہی نہیں گنیش، شنو، شکتی، برہما اور مدھوسودن، جتنے دیوتا ہیں کالی گھاٹ میں، سبھی سُن لیتے ہیں۔ لیکن ان دیوتاؤں کے چہرے دیپکر کو بڑے عجیب لگتے، ان کی شکل دیکھنے میں بالکل اچھی نہیں لگتیں، بہت دنوں پہلے کالی گھاٹ میں ایک سادھو آیا تھا، وہ کوئی بہت بڑا سادھو تھا اور مادر زاد برہنہ تھا، اس کے ساتھ ایک سو آدمی، پچاس گھوڑے اور تیس ہاتھی بھی آئے تھے، پورا کالی گھاٹ سادھو کو دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑا تھا، ماں کے ساتھ دیپکر بھی دیکھنے گیا تھا، بابا کے مندر کے چبوترہ کے سامنے، ٹھیک ناٹو مندر کے جنوب میں جہاں پر ایک لکڑی باندی رکھی ہوئی ہے، وہ سادھو آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

ایک ایک کرکے بکرے لائے جا رہے تھے اور لکڑی کی باندی میں جلا کر قربانی دی جا رہی تھی۔ کتنے ہی لوگ لکڑی کی باندی پر سر رکھ کر پرنام کر رہے تھے اور نیچے کی مٹی کو انگلی سے مس کرکے زبان سے چاٹ لیتے تھے۔

ایک بکرے کو لاکر جوں ہی لوہار نے اس کی قربانی کرنی چاہی، سادھو نے ہاتھ اٹھا کر اُسے روک دیا، سادھو منہ سے بات نہیں کرتا تھا، اس کے بعد اس نے لکڑی کی باندی میں اپنی گردن رکھ دی اور کچھ اشارہ کیا۔

عجیب منظر تھا! ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں، دیپکر ڈر گیا، کہیں ایسا نہ ہو کہ لوہار سچ مچ سادھو کی گردن کاٹ دے کہیں سادھو جی کی قربانی نہ دے دے! اتنے میں پتہ نہیں کہاں سے پولیس آگئی، داروغہ آگیا، آنے کے بعد وہ لوگ کیا باتیں کرنے لگے، کچھ سمجھ میں نہیں آیا، شور و غل میں اُن کی آواز بھی سُنائی نہ دی، چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، مجمع تتر بتر ہو گئے اور اس ہنگامے میں سختی سے دیپکر کا ہاتھ تھامے ہوئے ماں کھڑی رہی۔

دیپکر نے ماں سے پوچھا تھا —— "پولیس کیا کہہ رہی تھی ماں؟"

"پولیس بکرے کی قربانی بند کرے گی" —— ماں نے جواب دیا تھا۔

"کیوں ——؟"

ماں نے کہا تھا —— "ان کی بھی تو جان ہوتی ہے، ان کو بھی تو تکلیف ہوتی ہے۔"

"لیکن ماں کالی جو بکرے کا خون پیتی ہے پھر وہ کیا کھائے گی؟"

ماں نے کہا تھا —— "ماں کالی تو دیوی ہیں، دیوی دیوتا بغیر کھائے پیئے بھی زندہ رہ سکتے ہیں ——"

ماں کو اس وقت معلوم نہیں تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ جو لوگ دیوتا کے نام پر ٹھگتے ہیں وہ ضرورت پڑنے پر دیوتا کا نام بیچے بغیر بھی ٹھگ سکتے ہیں، جو لوگ ظلم کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کو موقعے کی کمی نہیں ہوتی، اس کے علاوہ کوئی —— دیوتا کا نام لے کر ناانصافی کرتا ہے، کوئی راجہ کا نام لے کر ناانصافی کرتا ہے اور کوئی ملک کے نام پر ناانصافی کرتا ہے، بات ایک ہی ہے، دیوتا ہو، راجہ ہو یا ملک ہو، اصل میں یہ ایک بہانہ ہی ہوتا ہے، بکرا بے زبان جانور ہے اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتا، لیکن کیا انسان بھی بے زبان ہے؟ اگھورداود دیوتا کے نام پر ججمان کو ٹھگتے ہیں لیکن کسی ججمان نے بھی تو کبھی احتجاج نہیں کیا!

ایک روز دیپنکر نے اگھورداود سے پوچھا تھا —— "اچھا، اگھورداود تم جو اپنے ججمانوں کو ٹھگتے ہو تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہتے؟"

اگھورداود کو شاید اس روز بہت زیادہ سلامی ملی تھی۔ اس روز وہ بہت خوش تھے۔

بولے —— "دُور منہ جلا، کہیں گے کیا، وہ لوگ بھی تو دُوسروں کو ٹھگتے ہیں!"

"وہ لوگ کس کو ٹھگتے ہیں، دیویوں کو؟"

"دُور، دُور، میرے وکیل ججمان موکل کو ٹھگتے ہیں، ڈاکٹر ججمان مریضوں کو ٹھگتے ہیں۔"

"اور موکل کس کو ٹھگتے ہیں؟ مریض کس کو ٹھگتے ہیں؟"

اگھورداود کی ذہانت دیکھ کر اس روز دیپنکر حیران ہو گیا تھا، اگھورداود کو سب کچھ معلوم تھا، ان کی معلومات ماں سے بھی زیادہ تھیں، کاکا بابو سے بھی زیادہ تھیں، شاید ان کی معلومات پران منتو بابو سے بھی زیادہ تھیں، اگھورداود کی بینائی کمزور تھی، کان بھی کم سنتے تھے، لیکن حیرت ہے، ان کی معلومات کتنی زیادہ تھیں!

دیپنکر نے پوچھا تھا —— "گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دُنیا میں سبھی ایک دُوسرے کو ٹھگتے ہیں؟"

اگھورداود نے جواب دیا تھا —— "ہاں رے ہاں منہ جلا، سبھی ایک دُوسرے کو ٹھگتے ہیں، میں بیٹی کو ٹھگتا ہوں، بیٹی بیٹے کو ٹھگتی ہے اور بیٹے پھوپھا کو ٹھگتا ہے ——"

دیپنکر نے کہا تھا —— "لیکن میں کسی کو فریب نہیں دوں گا اگھورداود، دیکھ لینا ——"

اگھورداود نے کہا تھا —— "کیوں رے منہ جلا، تو اپنی ماں کو فریب دے گا اور تیری ماں مجھے فریب دے گی۔"

دیپنکر نے جواب دیا تھا —— "نہیں اگھورداود، میں کبھی کسی کو فریب نہیں دوں گا۔ کبھی نہیں، تم دیکھ لینا ——"

اگر دادو [illegible] تھے، برستے تھے ——— تو پھر جاکر برو منہ بیٹھے، نہیں لگے گے تو خود روئے گے، خود تکلیف اٹھاؤ
میرا کیا ہے! میری بلا سے، میری جوتی سے ———

لیکن حیرت ہے، اگر دادو کی باتیں اتنی سچی ثابت ہوں گی، اگر دادو نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ دینکر کی زندگی میں پیش آئے گا، یہ کس نے سوچا تھا! لکھن نے کیا کبھی بھی اس پر مظالم ڈھائے تھے! لکھن نے کیا تنہا اس سے تاج محل کی نارنگی اور [illegible] چھین لی تھی، لکھن کیا اس دنیا میں تنہا تھا! دینکر اس دنیا میں جتنے دنوں سے رہ رہا تھا اور جتنے دنوں سے اتنا کچھ دیکھتے [illegible] بعد جب وہ گریجویٹ ہو کر [illegible] پر آیا تھا تو وہاں کیا صرف لکھن ہی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی!

ایک روز ستی نے اُس سے کہا تھا ——— "تم انسان نہیں ہو دینو، تم اگر انسان ہوتے . . . . "

دینکر نے جواب دیا تھا ——— "لیکن میں دیوتا بھی تو نہیں ہوں ستی ——"

ستی نے پوچھا تھا ——— "پھر تم کیا ہو؟"

دینکر نے جواب دیا تھا ——— "میں کیا جانوں، تم ہی بتا دو؟"

ستی نے کہا تھا ——— "تم حیوان ہو، تم ایک جانور ہو دینو، تمہارا چہرہ دیکھنا بھی گناہ ہے، تم اور زیادہ مجھے [illegible] تم یہاں سے چلے جاؤ، نکل جاؤ۔"

اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور اس روز دینکر ستی کو تسلی بھی نہ دے سکا تھا، اس کی ڈھارس بھی [illegible] سکا تھا، وہ ستی کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا تھا۔

اور یہی ستی جب پہلی بار کلکتہ آئی تھی تو اس کے ساتھ کیسی حادثاتی ملاقات ہوئی تھی، وہ کتنا معصوم تھا۔ پھر بھی وہ [illegible] وہ کتنی خوبصورت لگی تھی، گھونگھریالے بال کتنے دراز تھے! ستی جوڑا نہیں باندھتی تھی، اس کے گھونگھریالے دراز گیسو اس کے شانوں پر لہراتے رہتے، ساری شانوں سے اتر کر پشت پر جھولتی رہتی اور وہ بہت حسین دکھائی دیتی! اسی طرح بالوں کو لہراتی ہوئی وہ اسکول [illegible] اور اس کے بعد جب وہ کالج میں پڑھنے لگی تھی تو انھیں جھومتے لہراتے بالوں کو دینکر دیر تک کھڑا کھڑا دیکھتا رہتا، زلفیں بھی اتنی [illegible] ہوتی ہیں، اس سے قبل دینکر کو معلوم نہیں تھا، لکھی دیدی کی تو زلفیں ہی نہیں تھیں، کبھی کبھی ماں اُس کے جوڑے لپیٹ دیا کرتی تھی، ستی کی تمام خوبصورتی اُس کی زلفوں میں سمٹ آئی تھی، لیکن لکھی دیدی تو ستی کی بہن تھی، ایک ہی ماں کے بطن سے دونوں [illegible] مگر لکھی دیدی کے بال بھی اتنے دراز نہیں تھے، دونوں کا چہرہ ایک ہی جیسا تھا، فرق صرف زلفوں ہی کا تھا۔

لکھی دیدی نے ایک روز تنہائی میں اُسے جو بھیجا تھا، اس روز اسکول میں تعطیل تھی اور وہ برآمدہ کے [illegible] پر بیٹھا ہوا ایک [illegible] دیر سے کام کر رہا تھا

یکایک اس طرف نگاہ اٹھتے ہی اس نے دیکھا لکھی دیدی کھڑی تھی، پہلی منزل کی کھڑکی کے دروازہ پر کھڑی ہوئی ہاتھ سے اُسے بلا رہی تھی

دینکر دوڑ کر قریب چلا گیا۔

لکھی دیدی نے کہا ——" آؤ، اندر آؤ ——"

اندر جاتے ہی لکھی دیدی نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ لکھی دیدی نے اس روز اپنے بالوں میں کوئی خوشبودار تیل لگایا تھا جس کی بھینی ...اڑ رہی تھی۔ دینکر نے لکھی دیدی کے چہرہ کی طرف دیکھا، اس سے کوئی خطا تو سرزد نہیں ہوئی ہے، آخر لکھی دیدی کا چہرہ اتنا ...ں ہے!

لکھی دیدی نے پوچھا ——" ارے، تو نے کل خط نہیں دیا تھا ——"

"کیوں؟"

دینکر کو حیرت ہوئی، نہیں دیا کیا مطلب؟ ٹھیک اسی آدمی کے ہاتھ میں تو وہ خط دے آیا تھا۔

اس نے کہا ——" کیوں؟ ہر روز جس کو خط دے کر آتا ہوں، اُسی کو تو دے آیا ہوں، اُسے نہیں ملا؟"

لکھی دیدی نے کہا ——" پھر اُسے میرا خط ملا کیوں نہیں، اُس نے مجھے لکھا ہے!"

دینکر نے کہا ——" واہ رے، اتنے دنوں سے تمہارا ہر خط اُس کو دے آتا ہوں اور کل کا خط کیوں نہیں دوں ...خوب ہو۔"

"پھر اُسے ملا کیوں نہیں، تو نے وہ خط کیا کیا، بول؟"

لکھی دیدی کی آنکھوں سے غصہ جھلکنے لگا، اُس نے بہت دنوں سے لکھی دیدی کو اس طرح غصے ہوتے ہوئے نہیں ...

"بتا، وہ خط تو نے کیا کیا؟ کس کو دے دیا ہے؟ کہاں رکھا ہے، بتا؟"

دینکر نے کہا ——" واہ رے، بیکار اوپر تم فضول خفا ہو رہی ہو، میں تمہارا خط لے کر کیا کروں گا؟ اتنے سارے خط ...دے آیا ہوں پھر یہی خط کیوں نہ دیتا؟"

"تو اس نے کیا غلط لکھا ہے؟"

دینکر نے کہا ——" میں کیا جانوں؟"

"تم نہیں جانتے تو کون جانتا ہے؟ میں نے تو تمہارے ہی ہاتھ اسے خط بھیجا تھا ——"

"تو کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں تمہارا خط نگل گیا ہوں؟"

"تم نے کس کو خط دیا ہے، سچ بتاؤ ——"

لکھی دیدی یکایک اُسے پیار کرنے لگی۔

اُس نے کہا ——" میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی، ماروں گی بھی نہیں، کچھ نہیں کروں گی، بتاؤ نا خط لے کر تم نے کیا کیا؟ ...ہو گیا ہے شاید؟"

"گم کیوں ہوگا؟ میں تو ہر روز جیب میں رکھ کر لے جاتا ہوں، کل بھی جیب ہی میں رکھ کر لے گیا تھا ——"

"لیکن خط کے پاؤں تو نہیں ہوتے جو اڑ جائے گا۔ معلوم ہے اس خط میں کتنی باتیں لکھی تھیں۔ اگر کسی کے ہاتھ میں پڑ جائے؟ کوئی اگر پڑھ لے؟"

ڈینکر یکایک تن کر کھڑا ہو گیا اور سر اُٹھا کر بولا

"لیکن تم ہر روز اس آدمی کو خط کیوں لکھتی ہو گھمی دیدی؟ وہ تمہارا کون ہے؟"

گھمی دیدی یکایک جیسے گم سم ہو گئی۔

ڈینکر نے کہا ـــــ "وہ ہر روز صبح کے وقت تمہارے خط کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے، وہ تمہارے گھر کیوں نہیں آتا؟ گھر میں تو سبھوں کے سامنے اُس سے کیوں باتیں نہیں کر سکتیں؟ اور ایسی کونسی باتیں ہیں جو تم ہر روز اُسے خط لکھتی ہو؟"

گھمی دیدی دیر تک خاموش رہی پھر بولی

"تم نے ضرور میرا خط پڑھ لیا ہے، کیوں؟"

ڈینکر نے کہا ـــــ "میں خواہ مخواہ تمہارا خط کیوں پڑھوں گا، تمہارا خط پڑھنے کی مجھے کیا غرض پڑی ہے، مگر وہ آدمی تمہارے گھر نہیں آ سکتا؟"

گھمی دیدی نے پوچھا ـــــ "سچ کہتے ہو؟ تم میرا خط نہیں پڑھتے؟"

"سچ کہتا ہوں گھمی دیدی، میں نے تمہارا ایک خط بھی نہیں پڑھا ہے!"

"سچ کہتے ہو؟"

"میں تو کہہ چکا ہوں کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"پھر وہ خط اُسے کیوں نہیں ملا؟"

گھمی دیدی جیسے کسی فکر میں پڑ گئی ـــــــــ جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو۔

یکایک اُس نے کہا ـــــ "پرسوں صبح کے وقت ایک اور خط دے آؤ گے؟"

ڈینکر نے کہا ـــــ "کیوں نہیں دے آؤں گا۔"

"پھر جانے سے پہلے مجھ سے خط لے لو گے، کیوں؟"

ڈینکر نے جواب دیا ـــــ "اچھا"

اتنا کہہ کر ڈینکر چلا آ رہا تھا، یکایک گھمی دیدی نے اُسے آواز دی۔

"سُنو ڈینکر"

ڈینکر رک گیا۔

گھمی دیدی نے کہا ـــــ "تم ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں" ـــــ

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے زینہ طے کرتی ہوئی اُوپر چلی گئی، تھوڑی دیر بعد پھر اسی تیزی سے زینہ پھلانگتی ہوئی نیچے آ گئی اس

ہانپنے لگی تھی۔

بولی ——— "یہ لو۔"

لکھی دیدی نے ہات بڑھاکر دینکر کو مٹھی بھر چاکلیٹ دینا چاہا۔

دینکر نے اپنا ہات کھینچ لیا۔

"کیا ہے ؟"

لکھی دیدی نے کہا ——— "اس روز جو چیز دی تھی۔"

"تمہارا یہ چاکلیٹ میں نہیں لوں گا۔"

لکھی دیدی چونک اٹھی۔

"کیوں ؟ کیوں نہیں لوگے، تم چاکلیٹ نہیں کھاتے ؟"

"کھاتا ہوں" دینکر نے جواب دیا ——— "لیکن تم سے نہیں لوں گا۔"

"کیوں ؟ میں نے کیا قصور کیا ہے ؟"

دینکر نے کہا ——— "اس دن بھی میں نے چاکلیٹ نہیں کھایا تھا، تم نے جس طرح دیا تھا اسی طرح رکھ دیا ہے، تم مجھے

ٹ نہ دیا کرو لکھی دیدی ———"

"کیوں ؟ کیا ہوا ؟"

دینکر نے کہا ——— "تم چاکلیٹ نہیں بھی دوگی تو میں تمہارا خط پہنچا دیا کروں گا، جب تک تم چاہو گی میں پہنچاتا رہوں گا

م بھی کہو گی میں کر دوں گا، لیکن تم مجھے چاکلیٹ نہ دیا کرو، میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں ———"

لکھی دیدی نے پوچھا ——— "یہ کیا ؟ کیوں، کیا ہوا بتاؤ نا ؟"

دینکر نے جواب دیا ——— "تم سمجھتی ہو کہ چاکلیٹ نہیں دوگی تو میں تمہارا خط نہیں لے جاؤں گا، کیوں ؟"

لکھی دیدی نے کہا ——— "تم خط دے آیا کرو نا، اچھا تو ہے، لیکن چاکلیٹ لینے میں کیا ہے ؟"

"نہ دے کر دیکھو نا۔" دینکر نے کہا ——— "خط پہنچاتا ہوں یا نہیں !"

لکھی دیدی ہنستی ہوئی اس کے قریب آگئی، دونوں ہاتوں سے اس کا چہرہ تھام کر اسے پیار کرنے لگی ———

"کیوں رے ؟ میرا کام کرنے سے تجھے اتنی دلچسپی کیوں ہے ؟"

دینکر نے سر جھکا کر جواب دیا ——— "یونہی ———"

"لیکن میں تجھے بار بار چیتی رہتی ہوں ؟ پھر بھی تجھے مجھ پر غصہ نہیں آتا ؟"

دینکر نے کوئی جواب نہ دیا، لکھی دیدی کے سینے میں منہ چھپا کر کھڑے رہنے میں کتنا آرام تھا، لکھی دیدی کے جسم سے

ہ لکھی تو چھوٹ رہی تھی۔

"اب میں [illegible] کی ہے ——— " کلمی دیدی نے [illegible] اسے
زبردستی ٹھونس دیا ———

"میں کہتی ہوں، چاکلیٹ تم لے لو، میں تمہارے لیے ہی تو لائی ہوں ——— کھاؤ!"

دیپنکر نے چاکلیٹ لے لیا، اب کے اس نے انکار نہیں کیا۔

"پرسوں ہاٹ کے وقت ملنے آؤ گے نا؟" کلمی دیدی نے پوچھا۔

"ملنے آؤں گا۔" دیپنکر نے جواب دیا۔

کلمی دیدی نے کہا ——— "اب تم جاؤ ———"

پھر تھوڑے توقف کے بعد بولی ——— "یاد رکھو گے، پرسوں ہاٹ کے وقت ———"

اتنا کہہ کر کلمی دیدی چلی گئی تھی اور دیپنکر کھڑکی کے دروازے سے باہر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

آنگن میں تیز دھوپ چمک رہی تھی اور کوّا اس وقت تک بلا وجہ کائیں کائیں کر رہا تھا اور ماں اس وقت تک سو رہی تھی اور دیپنکر امرود کے پیڑ کے سائے میں دیر تک کھڑا رہا تھا۔

دیپنکر دیر تک کھڑا رہا۔ گرمی کی دوپہر تھی، سبھی دروازے بند کیے سو رہے تھے، اس روز اگھور دادو بھی گھر سے باہر نہیں نکلے تھے، چھنو بھی سویرے سویرے اپنا کام کاج ختم کر کے شاید دروازہ بند کیے سو رہی تھی، بنتی دیدی پہلی منزل پر اپنے کمرے میں پتہ نہیں کیا کر رہی تھی، چھینٹے، پھوٹا بھی کھا کر اس وقت کہیں بیٹھے اڈہ مار رہے ہوں گے، شاید پتھر پٹی کی کسی طبلہ کی دکان میں یا پھر ادھر ہی دھرم بازار کی شمالی جانب کسی کمپل کے مکان میں بستی کے اندر بیٹھے ہوں گے۔ دوپہر کے وقت ایشور گنگولی لین کا اپنا ایک الگ روپ تھا، اس کنارے سے اس کنارے تک پٹ کی چھت والے مکان تھے اور دور بہت دور نیلے آسمان کی وسعتوں میں چیلیں اڑ رہی تھیں۔ اور اس کے مکان کی چھت پر ایک بانس کے سرے پر ایک پتنگ الجھ کر پھڑپھڑا رہی تھی۔ راستے پر تھوڑی دیر بعد ہی برتن بیچنے والے پیتل کا برتن ٹن ٹن بجاتے ہوئے گزریں گے، اس کے بعد آئس کریم بیچنے والا آئے گا، اس کے بعد راستے پر پانی چھڑکنے والی گاڑی آئے گی، اس کے بعد دھرم داس ٹرسٹ ماڈل اسکول میں چھٹی کا گھنٹہ بج اٹھے گا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کالی گھاٹ میں سہ پہر ہو جائے گی۔

لیکن دیپنکر دیر تک امرود کے پیڑ کے نیچے کھڑے رہنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ آج کلمی دیدی نے اسے اتنا پیار کیوں کیا؟ آج اس نے اس کی ٹھوڑی اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کتنا پیار کیا تھا۔ کلمی دیدی کے جسم سے پھوٹتی ہوئی [illegible] خوشبو اب بھی جیسے [illegible] چپکی ہوئی تھی۔ یکایک دیپنکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے آج کی دوپہر اور دنوں کی نہیں تھی، آج کی دوپہر جیسے [illegible] کی آواز بھی اور دنوں کی طرح کرخت نہیں تھی، نیلے آسمان کی وسعتوں میں جو چیلیں اڑ رہی تھیں، وہ چیلیں نہیں تھیں ——— دیپنکر کی خواہشیں تھیں جیسے آج دیپنکر کی خواہشیں پنکھ لگا کر اڑ رہی تھیں، دیپنکر کو گرمی کی یہ دوپہر بڑی حسین اور بڑی پیاری پیاری سی لگی۔ ایسا تو کبھی محسوس نہیں ہوتا، ایسا تو کبھی نہیں ہوتا، امرود کے پیڑ کے نیچے دھوپ

پاؤں میں کھٹ سے بیٹھتے ہی ڈینکر کو جیسے بجلی کی تیکھی سی ہوئی، اس کے بعد پیڑ پر نگاہ ڈالتے ہی اس نے دیکھا کہ پیڑ پر بیٹھا ہوا کوا
ے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے، اتنی دیر سے وہ مسلسل کائیں کائیں کر رہا تھا لیکن اب خاموش ہو گیا تھا اور اب اس کی طرف
یکھ کر نہ جانے دل ہی دل میں کیا سوچ رہا تھا، وہ کوا ابھی آج اسی کی طرح اکیلا تھا۔

"اے کا ۔۔۔ آ ۔۔۔ آ ۔۔۔"

ڈینکر ہاتھ بڑھا کر اسے بلانے لگا۔

کوا پہلے ذرا چوکنا ہو گیا اور اڑنے کے لیے پر تولنے لگا، لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر رک گیا اور پھر ڈینکر کی طرف غور سے
یکھنے لگا۔

ڈینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہی کوا اس روز اس کی تھالی سے جھپٹ کر بھات لے بھاگا تھا۔ یہی کوا شاید انگوڑ دادو کے گھر میں
ُس کر چاول، کیلا اور سندیش ہر روز کھا جاتا ہے۔ حاجی قاسم کے باغ کے ایک کونے میں ناریل کے کچھ درخت ہیں، شاید یہ کوا
نہیں درختوں پر رہتا ہے، اس روز یہی کوا کبوتر کے ڈربے سے انڈا لے کر بھاگ گیا تھا، یہ بہت بدمعاش کوا ہے' ڈینکر نے بہت
ن تک دیکھا تھا کہ اس کوے کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا، اس وقت تک اچھی طرح اس کے پر نہیں نکلے تھے اور وہ دیر تک منہ کھولے
ے بیٹھا رہتا اور راستے میں یہی کوا کہیں سے منہ میں کوئی چیز لاتا اور اس کے منہ میں ڈال دیتا۔ بچے کا منہ لال تھا، شاید بہت چھوٹا
تھا، اس کے بعد ایک روز جب وہ باغ میں ببول چننے گیا تو اس نے دیکھا کہ بہت سارے کوے ایک جگہ جمع ہو کر ایک ساتھ
ائیں کائیں کرتے ہوئے ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے ہیں۔ تقریباً ایک سو، دو سو اور تین سو کوے جمع ہو گئے تھے، پہلے تو ڈینکر کو
ان محسوس ہوا تھا، اتنے سارے کووں نے صبح سویرے یہ کیسی محفل جما رکھی ہے، درختوں کی نچلی شاخوں پر بیٹھے بیٹھے بڑی بے چینی
ے کائیں کائیں کر رہے تھے اور کبھی اڑ کر اس شاخ پر آ رہے تھے کبھی اس شاخ پر جا رہے تھے اور شور مچائے ہوئے تھے۔

پہلے ڈینکر کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا، اس کے بعد اس نے قریب جا کر دیکھا کہ ایک کوے کا بچہ کیچڑ میں چت مرا ہوا پڑا ہے
ر اس کے پر چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، آہا، اس بچے کو کس نے مار دیا، باز پرندہ
ر نہیں؟

اس کے بعد ڈینکر نے اس بچے کو کبھی نہیں دیکھا، اس کے بعد یہی کوا اکیلا اڑ کے پیڑ کی شاخ پر آ کر بیٹھا رہتا اور اکیلا
لا گھومتا رہتا، اکیلا ہی انگوڑ دادو کے گھر میں گھس کر چاول، کیلا اور سندیش جھپٹ کر لے جانے کی کوشش کرتا، ماں کے باورچی
نے میں جھوٹے برتن میں منہ ڈال دیتا، بھات کی تھالی اور مچھلی کے ٹکڑوں کی طرف آہستہ آہستہ کھسکتا رہتا اور ماں اسے دیکھتے ہی
اتھ اٹھا کر بھگا دیتی۔

"ہش، ہش ۔۔۔"

لیکن کوا زیادہ دور نہیں بھاگتا، پھر اڑ کے پیڑ کی شاخ پر آ کر بیٹھ جاتا اور ادھر ادھر تاک جھانک کرنے لگتا اور کبھی کبھی
پنے آپ کائیں کائیں کرنے لگتا۔

دیپک نے اسے پھر کہا

"آ ے آ — آ — آ —"

کتا اس وقت تک مشکوک تھا، وہ گردن ٹیڑھی کر کے دیکھنے لگا۔

دیپک نے تمام چاکلیٹ آنگن میں پھینک دیا —

"کھا لے، تو ہی سب کھا لے، میں نے تجھے یونہی صبح سے دیا، سب تو ہی پیٹ بھر کر کھا لے — اب کھوی دیدی جتنا چاکلیٹ بھی دے گی، تجھے دے دیا کروں گا — آ — آ —"

کتا ڈرتے ڈرتے آ کر آنگن میں آ گیا۔

"مجھے چاکلیٹ کی ضرورت نہیں ہے رے، کھوی دیدی کا خط میں یونہی دے آیا کروں گا، چاکلیٹ دینے سے بھی دے آؤں گا، دینے سے بھی دے آؤں گا، کھوی دیدی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے، یہ سب تو کھا لے، تو ہی کھا لے یہ سب —"

صبح کو اٹھتے ہی ماں نے کہا — "اتنے سویرے کیوں جا رہے ہو، آج مت جاؤ۔"

"ابھی دوڑ کر دے آؤں گا ماں۔" دیپنکر نے جواب دیا — "بس گلی کے اندر سے ایک ہی دوڑ میں جا کر دے آؤں گا۔"

"لیکن جس طرح گھر کر بادل آئے ہیں" — ماں نے کہا — "ابھی پانی برسنے لگے گا دیکھ لو گے۔"

دیپنکر نے آسمان کی طرف دیکھا، ایسا دھندلکا چھایا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا رات کے چار بجے ہیں، مندر میں گھنٹہ بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی، چنڈی بابو کے مندر میں پوجا شروع ہو چکی تھی، چنڈی بابو کے گھر میں رادھا کرشنا کی مورتی تھی، دوسرے موقعہ پر ویسی سج دھج نہیں ہوتی تھی، صرف جنم اشٹمی کے موقعہ پر بڑی دھوم دھام ہوتی تھی اور دیپنکر کتنی ہی بار جنم اشٹمی کے دن وہاں جا کر بتاشہ کھا چکے تھے، اس روز وہاں جو بھی جاتا تھا اسے بتاشہ پرشاد دیا جاتا تھا۔

جس روز کالی گھاٹ اسکول میں ڈرامہ "تیاگ" دیکھ کر وہ گھر لوٹا تھا، رات زیادہ ہو چکی تھی، بڑی رات گئے ڈرامہ ختم ہوا تھا اور ڈرامہ دیکھ کر جب وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اس چنڈی بابو کے مکان کے پاس اس نے بھوت دیکھا تھا۔

ایک دم اصلی زندہ بھوت —

دیپنکر نے بڑے ہونے کے بعد دنیا میں بہت سے بھوت دیکھے تھے لیکن اس روز جو بھوت اس نے دیکھا تھا اس کی مثال نہیں۔

اس وقت دیپنکر کے کانوں میں ڈرامہ کے مکالمے گونج رہے تھے اور اسے پران متھ بابو کی سنائی ہوئی کہانی یاد آ گئی تھی۔ ست جگ سے بھی آگے کا زمانہ تھا جب دنیا میں کوئی راجہ نہیں تھا، سزا نہیں تھی، سبھی مذہب کی پناہ میں ایک دوسرے کی بھلائی کرتے تھے، ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، اس کے بعد ایک روز کشش نے جنم لیا، لالچ نے جنم لیا اور غصہ کی

تخلیق ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کاروبار رشتے اور تعلق کی بنیاد پڑی، لوگوں کی عام عقل چھن گئی، وید ناپید ہو گیا اور لوگوں نے پوجا دینا بند
کر دیا، ان دونوں دیوتا پوجا کے نذرانے کھا کر زندہ تھے، وہ سب فاقے کرنے لگے۔

اس حالت کو دیکھ کر تمام دیوتاؤں نے برہما کے پاس جاکر دربار کیا۔

برہما نے کہا ——— "تم لوگ وشنو کے پاس جاؤ، وہ اس کا تدارک کریں گے۔"

آخرکار تمام دیوتا وشنو کے پاس گئے۔

بولے ——— "دُنیا کے لوگ اب پُوجا نہیں کرتے، وید نہیں پڑھتے، اب ہم لوگ کیا کھا کر زندہ رہیں گے، آپ اس کا
تدارک کیجیے۔"

وشنو نے جواب دیا ——— "تم لوگ اپنے گھر جاؤ، میں اس کا انتظام کرتا ہوں۔"

آخرکار اس کا انتظام ہو گیا، کیا انتظام؟ وہ یہ کہ انھوں نے دُنیا میں ایک راجہ کی تخلیق کی۔

بولے ——— "اب اور کسی فکر و تردد کی ضرورت نہیں، اب یہی راجہ تمام لوگوں پر حکومت کرے گا، جو بد ہیں انھیں سزا دے
گا، اور جو نیک ہیں ان کی پرورش کرے گا۔"

اس طرح پرتھو راجہ کی تخلیق ہوئی، دُنیا میں امن لوٹ آیا، مسرت لوٹ آئی، مذہب لوٹ آیا، سب کچھ واپس آ گیا اور دُنیا
کے لوگ پھر امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

لیکن یکایک پھر ایک حادثہ پیش آیا۔

کرن بھی ڈرامہ دیکھ کر اس کے ساتھ ہی واپس آ رہا تھا۔

اس نے کہا ——— "جانتے ہو دیپو، انگریز ہی ہمارے سب سے بڑے دشمن ہیں، ان لوگوں کے جاتے ہی دیکھو گے ہم سب بڑے
آرام سے رہیں گے، اس وقت کوئی بھی چیز خریدنے کے لیے روپے کی ضرورت نہیں رہے گی، دیکھ لینا ———"

دیپنکر نے کہا ——— "تم سے کس نے کہا؟"

"میں جلسے میں جا کر سُن آیا ہوں۔" کرن نے جواب دیا ——— "اس جلسے میں ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ ہمارے ملک میں بہت
سے سمندر ہیں، اب ہم لوگ اسی سمندر کے پانی سے نمک بنا کر کھائیں گے ——— اب نمک خریدنے کے لیے پیسہ نہیں دینا ہوگا۔"

دیپنکر نے پوچھا ——— "لیکن اتنا نمک کیا ہوگا؟"

کرن نے جواب دیا ——— "اصل چیز تو نمک ہی ہے، کسی کسی دن میں تو صرف نمک بھات کھا کر ہی اسکول جاتا ہوں، صرف
نمک اور بھات، جس دن نمک نہیں ہوتا ہے، میں بھات کھا ہی نہیں سکتا ———"

"تمھارے بابا اب تک اچھے نہیں ہوئے؟" دیپنکر نے پوچھا۔

کرن نے جواب دیا ——— "صبر کرو نا، پہلے سوراج ہوئے، اب تو زیادہ دیر بھی نہیں ———"

سوراج کس طرح آئے گا یہ کرن کو بھی معلوم نہ تھا، وہ پارک میں جا کر تقریریں سنتا اور جو کچھ سنتا آ کر دیپو سے کہہ دیتا۔ تقریر

[illegible] تھا اور وہ کئی روز تک [illegible] جتنا اس کا چہرہ
[illegible] سرخ [illegible] رنگ گورا تھا لیکن میلے کچیلے کپڑوں میں اس کی رنگت [illegible] صاف ستھرا
[illegible] ہوتا تھا تو سب سے [illegible] دکھائی دیتا تھا۔

اس روز ڈرامہ دیکھنے کے بعد تاریکی میں پٹے پٹائے راستوں پر چلتے ہوئے وہ دونوں گاؤں تک پہنچے تھے، گاؤں کے بعد [illegible] ایشور گنگولی فرسٹ مین تھا، یہاں سے کرن کو دوسری سمت جانا تھا اور دینکر کو سیدھے اپنے گھر کی طرف آنا تھا۔ راستہ بالکل سنسان تھا، کہیں بھی کسی ایک آدمی کا بھی پتہ نہیں تھا۔

کرن رُک گیا۔

بولا —— "اب تم یہاں سے چلے جاؤ گے نا؟"

"چلا جاؤں گا۔" دینکر نے جواب دیا۔

"ڈر نہیں لگے گا؟"

"نہیں، ڈر کیسا؟" دینکر نے جواب دیا۔

"اچھا تو اب میں گھر جاتا ہوں ——"

اتنا کہہ کر کرن چلا گیا تھا، دینکر نے ایک بار سامنے کی طرف دیکھا، سامنے نکڑ پر گیس بتی ٹمٹما رہی تھی، اس گیس بتی سے تھوڑی دور آگے اس کا مکان تھا، انہیں ایک ہی ایشور گنگولی لین۔ یکایک اسے پھر ڈرامہ کے مکالمے یاد آ گئے، چند لمحوں کے لیے وہ بھی اسی دنیا میں پہنچ گیا۔ اس نے کہا ——

ہاں تم نے غریبوں کی دولت چھین لی: راجہ اگر چوری کرے،
میں نے سنا ہے، اس دنیا کا بھی ایک راجہ ہے —— تم چوری
کرو تو تمہارا انصاف کون کرے گا!

ڈرامہ کے مکالمے اسے اچھی طرح یاد نہیں تھے، واقعی راجہ تو راجہ ہے، دنیا کا راجہ، وہ تمام جرم کا انصاف کرتا ہے، مجرموں کو سزائیں دیتا ہے، گناہوں کو معاف کرتا ہے! دنیا کا راجہ اگر ناانصافی کرے —— اس کا انصاف کون کرے گا؟

یکایک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چٹکی بابو کے مکان کے قریب باغ میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہو۔

کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟

وہ جگہ بالکل تاریک تھی اور باغ کے قریب تاریکی اور بھی گہری اور بھی دبیز ہو گئی تھی: وہ اب ایک دوڑ میں اپنے گھر پہنچ سکتا تھا لیکن دینکر کی چلنے کی طاقت جیسے سلب ہو گئی تھی، جیسے اس کے دونوں پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل دھڑکنے لگا ——

"کیا ہے، وہاں [illegible]؟"

اُسے ایسا لگا جیسے ایک بھوت دانت نکالے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور سر جھلا جھلا کر ہنس رہا ہے اور اس
ہوش ہنسی راستے میں گونج رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دینکر کا سارا جسم برف کی طرح سرد ہو گیا، وہ اپنی پوری طاقت
ت کر کے چیخنا چاہتا تھا، لیکن اس کی چیخ حلق میں اٹک گئی اور وہ سایہ تاریکی میں ڈوبا ہوا اور بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگا اور
ایسا لگا جیسے اس کی خاموش ہنسی کی صدائے بازگشت سے ایشور گنگولی لین میں چھایا ہوا دبیز تاریکی کا پردہ تار تار ہو گیا ہو۔

ماں جاگ رہی تھی، باہر قدموں کی چاپ سنتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔

"کون، بکھو کا تم آ گئے؟ اتنی رات ہو گئی؟"

لیکن دینکر کا چہرہ دیکھ کر ماں کو بڑی حیرت ہوئی، دینکر کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی اور اس کا سارا جسم پسینے میں
گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر ماں سے لپٹ گیا۔

"کیا ہوا، تمہیں کیا ہو گیا؟"

دینکر نے کہا — "ماں، میں نے بھوت دیکھا ہے۔"

"بھوت!"

ماں کو بے حد تعجب ہوا، دینکر کو تخت پوش پر بٹھا کر پنکھے سے ہوا کرنے لگی، ڈراما دیکھنے گیا تھا یہ ایک لڑکے کو یہ کیا

!

"تم نے ڈراما دیکھا؟" ماں نے پوچھا۔

دینکر نے ہانپتے ہوئے جواب دیا — "ڈراما دیکھ کر آ رہا تھا کہ ایک چنڈی بابو کے مکان کے کونے میں کھڑا ہوا ایک
ت دیکھ کر ہنسنے لگا ماں —"

ماں ہنسنے لگی۔

بولی — "دور، پتہ نہیں تم نے کیا دیکھ کر کیا سمجھ لیا، بھوت وھوت کا کوئی وجود نہیں، کہاں ہے بھوت؟ بھوت اصل میں کچھ بھی
نہیں، اتنی عمر ہو گئی پھر بھی بھوت سے ڈرتے ہو؟"

دینکر نے کہا — "نہیں ماں، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں، میری طرف دیکھ دیکھ کر بھوت ہنس رہا تھا، تم چلو
میں بھی دکھا دوں گا —"

"اچھا تو پھر چلو، تمہارا بھوت کہاں ہے میں بھی دیکھ لوں۔"

اس معنی کی بات میں ماں دینکر کو ساتھ لے کر نکل پڑی تھی، اس وقت رات کے بارہ یا ایک بجے ہوں گے۔ کالی گھاٹ کے
لوگ سو چکے تھے اور چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا راستے سنسان تھے، چنڈی بابو کے مکان کا تیس نمبر تھا، تیس نمبر ایشور گنگولی
لی کے اندر ہی تین منزلہ عمارت تھی، وہ جنم اشٹمی کے موقع پر میلہ دیکھنے کے لیے کتنی ہی بار چنڈی بابو کے مکان میں جا چکا تھا، بہت

[illegible] موسم بہار میں ہوتی تھی [illegible] کے اندر پچھلے [illegible]
[illegible] بازوں میں [illegible] بیٹھے اور جب [illegible] آتش بازیاں [illegible] اور کبھی [illegible] دیا [illegible]
پیٹنے کی دکان بکل جاتی اور صحن آدمیوں سے بھر جاتا اور صحن کے چاروں طرف کرشن لیلا کی مورتیاں سجائی جاتیں۔ بہت ساری
مورتیاں ہوتیں، وہ مورتیوں کو دیکھتے ہوئے مجمع کے پیچھے جا کھڑا ہو جاتا۔ ایک ڈاکٹر کے مکان کے چبوترے پر بادشاہ کی دو مورتیاں
رکھی رہتی تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو وہاں پر ایک ایک بتاشہ پرشاد ملتا۔

پچھلے دنوں چندی بابو کے مکان میں بڑی بھیڑ لگی رہتی اور اس کے بعد اس بلڈی کا [illegible] آتا۔ اس کے بعد بہت کم لوگ وہاں جاتے تھے، اس نے صحن میں اس مکان کے دو چار بچے اکا دکا کھیلتے رہتے۔ ایک مرتبہ اسی چندی بابو نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔

اس وقت اس کی عمر اور بھی کم تھی اور وہ دھرم داس ٹرسٹ ماڈل اسکول میں پڑھتا تھا۔ بھوانی پور میں [illegible] ایک [illegible] تھا شام کے چھ بجے کا وقت تھا اور وہ کسی کے ساتھ برٹش پارک سے کچھ بہت دور آگے نکل گیا تھا اور تقریباً پڑتا بازار کے قریب چلا گیا تھا وہاں پر میدان میں فٹ بال میچ ہو رہا تھا۔ وہاں سے فٹ بال میچ دیکھ کر وہ واپس آ رہا تھا اور اس وقت شام کے پانچ یا چھ بجے تھے۔ یکایک ایک دھماکہ ہوا تھا جیسے کہیں پر کوئی بم پھٹا ہو۔

اسے اپنے کان کا پردہ پھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا اور دینکر چونک اٹھا تھا۔ راستے میں جتنے لوگ تھے وہ بھی چونک اٹھے تھے اور اس کے بعد بے تحاشہ ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے۔

"بھاگ چلو —" کسی نے کہا اور اتنا کہہ کر وہ دوڑ پڑا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ دینکر بھی بھاگ کھڑا ہوا۔

راستے میں ہر طرف بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔

اس کے بعد پھر ایک دھماکہ ہوا اور اس نے دیکھا کہ ایک پولیس کا آدمی جو سائیکل پر جا رہا تھا سائیکل سے نیچے گر پڑا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی سائیکل پر سوار تھا اس کے سینے میں آ کر ایک گولی لگی اور وہ بھی زمین پر آ رہا اور دینکر کے قریب ہی ڈھیر ہو گیا۔ اس کے جسم سے لال لال خون کے فوارے چھوٹنے لگے! یہ سب دیکھ کر دونوں بدحواس ہو گئے اور پھر بے تحاشہ بھاگنے لگے!

وہ شمبھو ناتھ پنڈت اسٹریٹ سے دوڑتے ہوئے ہاجرہ روڈ کے موڑ پر آ کر تھوڑی دیر کے لیے رک گئے۔ ان کا دم پھولنے لگا اور وہ دونوں بری طرح ہانپنے لگے تھے۔ اور اس وقت ہر طرف چیخ پکار اور بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور بولا

"بسنت چیٹرجی کو مار ڈالا گیا —"

"کس نے مارا؟"

"سولجیروں نے!"

وہ دونوں اتنا ہی سُن سکے۔ بسنت چیٹرجی کون تھا؟ اُسے کس نے مارا؟ یہ سب کچھ وہ سُن نہ سکے، جس کو جدھر بھی موقع مل رہا تھا، بھاگ رہا تھا، وہ دونوں وہاں پر بھی نہ رُک سکے، پھر بھاگ کھڑے ہوئے اور دوڑتے دوڑتے ایشور گنگولی لین میں آکر دم لیا۔ اتنے میں ان دونوں نے دیکھا کہ مخالف سمت سے ایک آدمی سائیکل پر چلا آ رہا ہے، اُسے دیکھ کر دونوں گھبرا گئے —— کہیں وہ انہیں پکڑ نہ لے؟

کرن نے کہا —— "بھاگ چلو دیپو ——"

سامنے ہی چنڈی بابو کا مکان تھا، اس باڑی کا لوہا گیٹ کھلا ہوا تھا، کرن دوڑ کر اندر چلا گیا اور اس کے پیچھے پیچھے دیپنکر بھی اندر گھس گیا۔ اتنی ہی دیر میں سارے کلکتہ میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ پولیس کے ڈپٹی کمشنر بسنت چیٹرجی کو سودیشیوں نے گولی مار کر ختم کر دیا! چنڈی بابو بوڑھے آدمی تھے، وہ اس وقت ایک کُرسی پر بیٹھے ہوئے حقّہ پی رہے تھے۔

اُنھوں نے چیخ کر کہا —— "رام دھنی گیٹ بند کر دو۔"

رام دھنی کہیں دُوسری طرف تھا، وہ دوڑتا ہوا آیا اور گیٹ بند کرنے ہی جا رہا تھا کہ یہ دونوں اندر گھس پڑے۔

چنڈی بابو ان دونوں کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کر آئے اور بولے

"گیٹ آؤٹ —— گیٹ آؤٹ —— گیٹ آؤٹ ——"

اُسے آج بھی یاد ہے، اس روز چنڈی بابو کو دیکھ کر دیپنکر اور کرن شام کے اندھیرے میں غیر محفوظ حالت میں ان کی پناہ لینے کو گلی میں آ گھسے تھے، دو معصوم بچوں کو اس روز چنڈی بابو نے پناہ نہیں دی تھی۔ شاید اُنھوں نے ان دونوں کو قسمت کے ہاتھوں سونپ کر اپنا اطمینان کر لیا تھا، لیکن ان کی قسمت کے بنانے والے نے آخر کار خود اُنھیں بھی زیادہ دنوں تک زندہ رہنے نہیں دیا ——

لیکن یہ بہت دنوں بعد کا واقعہ ہے۔

اس روز بھی اُسے اسی چنڈی بابو کے مکان پر جانا تھا، راستے بالکل سنسان ہو چکے تھے، دُور دُور تک ایک آدمی کا بھی پتہ نہ تھا، ماں دیپنکر کو ساتھ لیے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ شیتلا تلہ کے بعد ایک موڑ تھا اور اس کے بعد ہی چنڈی بابو کا مکان تھا، مکان کے سامنے کی طرف ایک باغ تھا، دیپنکر کو چاروں طرف دیکھ دیکھ کر اس وقت بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔

ماں نے کہا —— "ڈرنے کی بات نہیں، میں تو تمہارے ساتھ ہوں، آؤ، کہاں ہے، تمہارا بھوت کہاں ہے؟"

دیپنکر نے جوں ہی سامنے نظر اُٹھائی، اُسے وہ چیز نظر آ گئی، ابھی تک وہاں پر اندھیرا تھا اور اندھیرے میں وہ بھوت ابھی تک اسی طرح ہنس رہا تھا، ٹھیک اُسی طرح دانت نکالے جیسے قہقہے لگا رہا تھا۔

دیپنکر نے کہا —— "وہ دیکھو، وہ رہا ——"

ماں نے بھی چند لمحوں تک غور سے دیکھا۔ اس کے بعد ادھر اُدھر نگاہ دوڑا کر اچھی طرح جائزہ لیا۔

دیپنکر نے کہا —— "دیکھ لیا، میں نے کیا کہا تھا ——"

"اچھا تم اس طرف آ جاؤ" ——— ان نے جواب دیا۔

اتنا کہہ کر ماں چندری بالبکے گیٹ کی سمت چلی گئی۔ گیٹ کے بازو میں بورہا ن کا کمرہ تھا، اس وقت وہ سو رہا تھا، صرف گیٹ کے اوپر کبھی بتی جل رہی تھی، اس کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا، سبھی لوگ گہری نیند میں تھے، اتنی رات گئے بھلا کون جاگ رہ سکتا تھا۔

ماں نے آواز دی ——— "رام دھنی، اے رام دھنی" ———

چند لمحوں کے بعد ماں نے پھر آواز دی ——— "رام دھنی، ایک بار باہر آؤ تو" ———

رام دھنی باہر نکلا اور باہر نکلتے ہی اس نے پوچھا ———

"کون؟"

ماں نے جواب دیا ——— "میں دیپو کی ماں ہوں، تم ذرا اپنے باغ کی بتی جلا دو تو، باغ کی بتی ایک بار جلاؤ گے بابا؟"

رام دھنی پرانا آدمی تھا، ماں بھی قدیم باشندہ تھی، رام دھنی نے اندھیرے میں بھی ماں کو پہچان لیا۔

پوچھا ——— "کون؟ دیپو کی ماں؟ کیا چاہیے دیپو کی ماں؟"

"تم اپنے باغ کی بتی ایک بار جلاؤ گے رام دھنی" ماں نے جواب دیا ——— "ذرا بتی جلا دو تو" ———

رام دھنی نے سوئچ دبا کر باغ کی بتی جلا دی اور دوسرے ہی لمحہ اس طرف اُجالا ہو گیا، ماں نے دیکھا اور ساتھ ہی دیپو نے بھی دیکھا، باغ میں ایک مچان کے اوپر بانس کی ایک لاٹھی گڑی تھی اور اس کے اوپر ایک ہیٹ ٹنگا ہوا تھا اور ایک مٹی کی ہنڈیا بندھی ہوئی تھی اور لاٹھی میں ایک قمیص پہنا دی گئی تھی، بندروں کو بھگانے کے لیے ایک آدمی کی مورتی بنا دی گئی تھی۔ ہوا میں آہستہ آہستہ ہیٹ ڈول رہا تھا اور قمیص کے کپڑے میں ہوا بھر کر دھاری تھی۔ واقعی کتنی حیرت کی بات تھی، دیپنکر اس راستے سے دن کے وقت کئی بار گزر چکا تھا لیکن اس نے تو اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

ماں نے رام دھنی سے کہا ——— "اب تم بتی بجھا دو رام دھنی"

اس کے بعد دیپنکر سے بولی ——— "دیکھ لیا نا، یہ کیسا بھوت ہے دیکھ لیا نا؟"

اس روز اتنی رات گئے ماں ہی نے اس بات کا زندہ ثبوت فراہم کر دیا تھا کہ دنیا میں بھوت کا کوئی وجود نہیں ہے، انسان جسے بھوت سمجھتا ہے، وہ اس کا اپنا وہم ہوتا ہے، لیکن دیپنکر جوں جوں بڑا ہوتا گیا، اسے اس بات کا یقین ہوتا گیا کہ ماں بھوت کے بارے میں پوری واقفیت نہیں رکھتی، ممکن ہے کسی زمانے میں بھوت کا کوئی وجود نہ رہا ہو، لیکن اس کے بعد بھوت وجود میں آ گیا تھا، بھوت نے دنیا میں جنم لے لیا تھا اور اس کے بعد انسان کی دنیا میں ان گنت بھوت پیدا ہوتے رہے تھے، ان کا چہرہ، ان کا لباس، پوشاک سبھی کچھ انسانوں کی طرح تھا لیکن دراصل وہ سب انسان نہیں تھے، وہ سب بھوت تھے اور ——— انسانوں کا روپ دھار کر انسانوں کے سماج میں گھومتے پھرتے رہتے تھے اور موقع بے موقع انہیں ڈراتے رہتے تھے اور جب ضرورت پڑتی، انسانوں کی نظر سے روپوش ہو جاتے تھے، دیپنکر کا یہ ایک حیرت انگیز تجربہ تھا۔

اس کے بعد حاجی قاسم کے باغ سے جلدی جلدی پھول چن کر وہ مندر کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ پہلے ماں کے مندر میں گیا تھا۔ ماں کے مندر میں چمپا گلاب کے کئی پھول دینے کے بعد اسے سیتا رام، گنیش، جگن ناتھ، شو شمبھو اور اس کے بعد بھونیشور کے مندر میں پھول دینا تھا۔

دینکر نے کہا — "پنڈت جی ذرا جلدی سے پھول لے لیجیے، بہت زور سے پانی آ رہا ہے۔"

واقعی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا، ناٹو مندر کی چھت کے اوپر سیاہ بادلوں کا اجتماع تھا، اس کے بعد چبوترے پر ستانی ٹیک کر مندر کے گرد گھوم کر گلی کے اندر سے کنڈ و پوکھر کے دروازہ تک جانے کا راستہ تھا، دوسری طرف جہاں رکھنے کی جگہ تھی، پیڑے کی دکان تھی جس کے اندر پیڑے بنتے تھے اس کے بعد پورب رخ کا دروازہ تھا۔

اس وقت تک مندر میں کافی بھیڑ لگ گئی تھی، بڑی بڑی کاریں لگی ہوئی تھیں اور کاروں سے اتر کر گوری گوری مارواڑنیں اور گورے چٹے مارواڑی مرد ننگے پاؤں مندر میں آ رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے بھکاریوں کی ٹولی لگی ہوئی تھی، ان کا لباس صاف ستھرا اور قیمتی تھا اور سرخ و سپید چہرہ! ان کے اندر بڑی بھکتی تھی، وہ پنڈے کو بہت زیادہ دان دیتے تھے اور اسی لیے پنڈے بھی ان کی بڑی خاطر و مدارات کرتے، اس کے برعکس وہ دینکر کی کوئی خاطر نہیں کرتے تھے کیونکہ دینکر انہیں ایک پیسہ بھی کبھی سلامی نہ دیتا تھا، صرف پھول دینے سے بھی کہیں ماں کالی کا پیٹ بھرتا ہے؟

یکایک بارش کی دو چار بوندیں ٹپ ٹپ اس کے جسم پر گر پڑیں۔

دینکر محراب کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا، یہاں پر اس کا سر بھیگنے سے محفوظ رہے گا اور خط بھی نہیں بھیگے گا، لکشمی دیدی کا خط اس کی جیب میں تھا، وہاں پر کھڑے ہو کر جہاں تک اس کی نگاہ جا سکتی تھی وہ متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگا، بارش ہو رہی تھی، شاید وہ بھلا آدمی بارش کی وجہ سے نہیں آ رہا ہے یا ممکن ہے کہ ابر آلود آسمان ہونے کی وجہ سے اسے وقت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا ہو، تو وہ خود آج وقت سے پہلے تو نہیں آ گیا؟ سات بج چکے ہیں کیا؟ اس طرف پیڑے کی دکان میں ایک دیوار گھڑی ہے، اس میں وقت دیکھنے سے پتہ چل جاتا!

دینکر سر کو بھیگنے سے بچاتے ہوئے دکان کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی، سات بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے، دوسرے دن کی نسبت آج دیر ہو گئی تھی، اب تک تو آ جانا چاہیے تھا، وہ بھلا آدمی اسی وقت تو آتا تھا، لیکن اس کا چہرہ بہت خوبصورت ہے۔

کبھی کبھی وہ بھلا آدمی پہلے ہی سے آ کر کھڑا رہتا تھا۔

دینکر کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔

"آ گئے کھوکا؟"

دینکر جیب سے خط نکال کر اسے دے دیتا۔

"یہ لیجیے —"

کے ہات سے لفافہ لے کر وہ چاک کر کے پڑھنے لگتا اور دینکر اس آدمی کے چہرے کو تکنے لگتا۔ وہ خط پڑھتے پڑھتے
اس آدمی کا چہرہ یکایک سُرخ ہو جاتا۔ اس کا رنگ صاف تھا اور وہ قیمتی سلک کے شرٹ میں ملبوس رہتا۔ اتنے صبر سے ہی وہ خوب
سوچ سوچ کر ٹائم تھا۔ خط پڑھتے پڑھتے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا اور ماچس جلا کر سگریٹ سُلگاتا اور ایک لمبا کش لے کر دُھواں
اُگل دیتا۔ وہ ایک ہی خط کو بار بار پڑھتا۔ ایک بار پڑھ لینے کے بعد دوبارہ پڑھتا۔ دوبارہ پڑھ لینے کے بعد سہ بارہ پڑھنے
لگتا۔ ممی ڈیڈی کی اپنے خط میں کیا کچھ لکھتی تھی کون جانے! کسی کسی دن جب دیر ہوتی تو وہ ٹیکسی پر سوار ہو کر آتا اور ٹیکسی سے اُتر
کر دوڑتا ہوا، دینکر کے پاس آکر اس سے خط لے کر پڑھنے لگتا۔ وہ دیر تک خط کو بار بار پڑھتا رہتا اور دینکر پاس ہی کھڑا
کسی ڈرے ہوئے بُت کی طرح کھڑا رہتا۔

آخری بار خط پڑھ کر وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر کہتا ——

• گڈ بوائے ——

اتنا کہہ کر وہ سیدھا تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا چلا جاتا۔

اس کے بعد دینکر آہستہ آہستہ کنڈوپوکھر کے جنوبی سمت سے ہوتا ہوا پشو ڈنگرلی لین کی طرف چل پڑتا۔ جب تک وہ
خط پڑھتا رہتا، دینکر کو بہت اچھا لگتا۔ وہ اچھی طرح بنگالی نہیں بول سکتا تھا۔ پتہ نہیں کون ذات تھا۔ لیکن کچھ مختلف قسم کا تھا۔ اس
کی شکل کسی سے بھی نہیں ملتی تھی۔ کالی گھاٹ میں ایک آدمی بھی ویسا نہ تھا۔ مدھوسودن کی دہلیز پر بیٹھ کر جو لوگ اڈہ مارتے تھے
جیسے مدھوسودن کے بڑے بھیا اور دولی کاکا وغیرہ وہ بھی اس جیسے نہیں تھے۔ دھرم داس ٹرسٹ ماڈل اسکول کے پان متھ بابو
وہ بھی بالکل ویسے نہیں تھے۔ یا پھر برنش پارک میں تقریر سُننے کے موقعہ پر جن لوگوں کو دیکھتا تھا وہ شخص ان لوگوں کی طرح بھی نہیں
تھا۔ وہ انگریزوں سے بڑی حد تک مشابہ تھا۔ ملی روڈ کے پرلی طرف چڑیا گھر کی سمت جو بڑے بڑے صاحبوں کی کوٹھیاں تھیں، وہ
ان ہی کی طرح تھا۔ چنڈی بابو بھی بڑے آدمی تھے۔ چنڈی بابو کے یہاں دربان تھا، منشی، محرر اور گماشتہ تھا۔ لیکن ان کے گھر کے
لوگوں کا چہرہ بھی ویسا نہیں تھا۔ بھوانی پور میں کچھ لوگوں کا چہرہ ایسا ضرور تھا۔ دینکر نے بڑا بازار میں فٹ بال میچ دیکھتے وقت بھی
لوگوں کو دیکھا تھا۔ جس روز پولیس کے ڈپٹی کمشنر بسنت چیٹرجی کا خون ہوا تھا، اس روز دینکر نے اسی قسم کے چہرے کے دو
آدمیوں کو دیکھا تھا۔ مگر وہ کرتہ دھوتی پہنے ہوئے نہیں تھے۔ آدمی کا کرتا پہنے ہوئے تھے۔ ان کا رنگ بھی گورا تھا۔ دُھلی ہوئی
دھوتی بھی اور ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ پہلے بعد دیگرے دو دھماکے ہوتے ہی وہ دونوں راہ کے قریب سے بھاگتے ہوئے اوپا
کی بستی کی طرف چلے گئے تھے۔

دینکر کو یاد ہے۔

اس روز وہ ممی ڈیڈی کا خط لے کر واپس آرہا تھا کہ یکایک کرن دوڑتا ہوا اُس کے پاس آیا اور ہانپتے ہوئے

بولا ——

• غضب ہو گیا دینو ——

یقیناً کرن کے بابا مرگئے ہیں، دینکر خاموشی سے کرن کا چہرہ تکنے لگا۔

"میں تمہارے ہی پاس جا رہا تھا۔" کرن نے کہا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

کرن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

دینکر نے پوچھا ــــ "تمہارے بابا مرگئے ہیں کیا؟ کب؟"

"نہیں۔" کرن نے جواب دیا ــــــ "اخبار میں خبر چھپی ہے بھائی۔ سی۔ آر۔ داس قضا کر گئے ــــ

اب کیا ہوگا؟"

سی۔ آر۔ داس قضا کر گئے؟ کیا ہوگا؟ کرن کو کتنی امیدیں تھیں، اسے امید تھی کہ سی۔ آر۔ داس راجہ ہوں گے! لیکن اب کیا ہوگا، کرن کا چہرہ کیسے مرجھا گیا تھا، کرن گونگے کی طرح دینکر کو طرف دیکھ رہا تھا۔

کرن نے کہا ــــــ سادھو نے تو کہا تھا کہ سی۔ آر۔ داس اس ملک کے راجہ ہوں گے۔"

دینکر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے، وہ بھی چپ چاپ کرن کا منہ تکنے لگا، کرن کی نگاہوں میں ساری دنیا جیسے سونی ہوگئی تھی، اگر راجہ ہی مرجائے تو لوگوں کی حالت کیسے بہتر ہوگی، کرن کے بابا کی حالت کیسے سدھرے گی، تو کیا اسے تمام عمر بیڑی بیچنا ہوگا؟ تمام عمر بھیک مانگنا پڑے گی؟ پھر اس کا مکان کیسے بنے گا؟ پھر سوراج کیسے ہوگا؟ اس روز کرن اپنے مسائل کا کوئی حل نہ پاکر جیسے ایکدم مایوس ہوگیا تھا۔

بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد دینکر نے پوچھا

"اسکول نہیں جاؤ گے؟"

"اسکول میں آج چھٹی ہے۔" کرن نے جواب دیا ــــ "کل بھی چھٹی رہے گی ــــ"

اس کے بعد قدرے رک کر بولا ــــ "کل کیوڑا تلہ میں سی۔ آر۔ داس کو لائیں گے تم دیکھنے جاؤ گے بھائی؟"

"جاؤں گا۔" دینکر نے کہا ــــــ "ہم دونوں ایک ساتھ چلیں گے۔"

کرن نے کہا ــــ "ذرا سویرے ہی چلیں گے، نہیں تو کیوڑا تلہ میں بڑی بھیڑ ہو جائے گی۔"

صبح ہوتے ہی وہ سب سے پہلے لکھی دیدی کے پاس گیا تھا۔ نیپال بھنڈاری اسٹریٹ کے موڑ پر مدھوسودن کی دہلیز پر اس وقت زبردست بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اخبار زمین پر پڑا ہوا تھا، سبھی پڑھ چکے تھے اور اب ہاتھ ہلا ہلا کر بحث کر رہے تھے۔

دینکر ایک منٹ کے لیے وہاں پر رک گیا۔ مختلف طرح کے لوگ وہاں پر جمع تھے جن میں دونی کاکا کی عمر سب سے زیادہ تھی۔

دونی کاکا کہہ رہے تھے ــــ "مرگئے تو اچھا ہی ہوا، یہ سب چرخہ وَرخہ کات کر کیا فائدہ ہوتا بھائی، چرخہ کات کر آئرلینڈ آزاد ہوتا ہے؟ یا چرخہ کات کر امریکہ آزاد ہوا ہے؟ بولو، مجھے کہو۔"

مدھوسودن کے نہرت بھیلنے کہا ــــ "گاندھی جی کو آسانی ہوگئی۔ مجھے دونی کاکا گاندھی کی بات پر پروٹسٹ کرنے والا

اب کچھ بھی نہیں رہا۔"

پنچو دا کھڑے تھے، اُنھوں نے کہا ——

"چکانز مو چپامنی کا نام نہیں ہے بچے، ایک بنگالی تھا وہ بھی چلا گیا، ابھی آپ لوگ نہیں سمجھ سکتے یہ بات۔ ان کا آپ کی سمجھ میں نہیں آنے گی، بعد میں سمجھیں گے —— دانت رہتے ہوئے تو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے ——"

پچھنے دا بھی ایک طرف کھڑے تھے، اُنھوں نے کہا ——

"اب اسی ہے۔ ایم۔ سین گپتا ہی کا بھروسہ ہے، اب ہماری وہ دولت وہی ہے ——"

پنچو دا نے اُن کی بات اُچک لی، بولے ——

"ارے رہنے دو، رہنے دو، کس کے ساتھ کس کا موازنہ کر رہے ہو! وہ جو کہتے ہیں، بُڑے بُڑے بہہ جائیں ...

موسوروں کے بُڈھے بھیّا نے ان کی بات کاٹ دی۔

"دیکھا جائے ہاں سوبھاش بوس کیا کرتا ہے ——"

مدنی کاکا کی معلومات بہت وسیع تھیں، ان کے دلائل کے سامنے بڑے بڑوں کی منطق دھری کی دھری رہ جاتی، مدنی کاکا دُنیا کو اپنے دلائل سے مات دے دینے میں اُستاد تھے، وہ صرف برٹش گورنمنٹ کے حامی تھے۔

اُنھوں نے کہا —— "جس کا نام تل چٹا اسی کا نام کُشل، وہ تمھارے سوبھاش بوس ہوں یا جے۔ ایم۔ سین گپتا، ایک ایک گرل ہو ہیں سب ٹھنڈے ہو جائیں گے ——"

ان کی باتیں دیپنکر کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں! اس قسم کے مباحثے تو ہا بر ہی ہوتے رہتے تھے، ہمیشہ ہی ہوتے رہے جب سے سی۔ آر۔ داس مر گئے تھے، کہاں، کوئی بھی تو نہیں مر رہا تھا، کرن کی طرح کوئی بھی تو بدحال اور پریشان نہیں تھا! دیپنکر اس پر ذرا سے متعجب ہوا تھا!

دیپنکر وہاں سے چلا آرہا تھا کہ اتنے میں پچھنے دا نے آواز دی۔

"اے دیپو، سُنو تو، اس طرف آکر سُن جاؤ ——"

دیپنکر کے قریب جانے پر پچھنے دا نے پُوچھا ——

"اے، تمھارے مکان میں کون کرایہ دار آیا ہے؟"

"لکھی دیدی وغیرہ۔" دیپنکر نے جواب دیا۔

"لکھی دیدی وغیرہ، جو لڑکی بس میں بیٹھ کر اسکول جاتی ہے، وہ ناٹینڈ میشنری میں پڑھتی ہے، ہم نے دیکھا ہے، وہ ... ہے، اس کے بابا کیا کرتے ہیں، پیشہ ور کیا کرتے ہیں؟"

دیپنکر نے کہا —— "پیشہ ور تو لکھی دیدی کے بابا نہیں ہیں، اس کے کاکا ہیں، اس کے بابا تو بہا میں نوکری کرتے ... ہیں، وہ لوگ بہت امیر آدمی ہیں۔"

"اچھا تو اس کے کاکا کیا کرتے ہیں، تم جانتے ہو؟"

"دفتر میں نوکری کرتے ہیں۔" دیپکر نے جواب دیا۔

پچھلے والے نے پھر پوچھا ——

"کس دفتر میں؟"

دیپکر نے جواب دیا —— "یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"

ودنی کاکا نے پچھلے والے سے پوچھا ——

"تمہیں ٹھیک معلوم ہے؟"

پچھلے والے نے جواب دیا ——

"میں نے دیکھا جو ہے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ودنی کاکا ——"

اس کے بعد سبھی مل کر آپس میں کاکا بابو کے بارے میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ دیپکر ان کی باتیں سمجھ نہ سکا۔ اس وقت وہ صرف یہ سوچ [illegible] کہ سی۔ آر۔ داس کی موت پر کوئی بھی تو غمزدہ نہیں ہے۔ سبھی لوگ تو پہلے ہی کی طرح آج بھی محفل جمائے ہوئے تھے، کوئی تبدیلی بھی تو نہیں [illegible]ئی تھی۔

دیپکر آتے ہی لکھی دیدی کے مکان میں داخل ہو گیا۔ کاکا کی ماں اس وقت برآمدے میں بیٹھی ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں۔ غسل [illegible] چکی تھیں اور بھیگے ہوئے بالوں کو پیٹھ پر پھیلا دیا تھا۔

دیپکر نے جاتے ہی پوچھا —— "کاکا کی ماں، لکھی دیدی کہاں ہے؟"

"اوپر پڑھ رہی ہے۔" کاکی ماں نے جواب دیا —— "دیکھو جاکر۔"

"آپ نے سنا ہے کاکی ماں، سی۔ آر۔ داس مر گئے؟"

"کہاں؟" کاکا کی ماں نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"دارجلنگ میں۔" دیپکر نے جواب دیا —— "کل کلکتہ میں بڑی بھیڑ ہوگی ——"

کاکی ماں جس طرح بیٹھی ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، اسی طرح بیٹھی ہوئی ترکاری کاٹتی رہیں۔ دیپکر بہت [illegible] باتیں ان سے [illegible] مگر وہ یوں چپ چاپ بیٹھی رہیں جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں! پھر کاکی ماں اٹھ کر [illegible] سے متعلق ہدایت [illegible] لگیں۔ حیرت ہے، لوگ تو اخبار [illegible] سب سنتے کہ بنگالیوں کا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے! حیرت ہے! کتنی حیرت [illegible] بات تھی! دیپکر زینے کے سہارے دوسری منزل پر چلا گیا۔ اوپر کمرے میں اپنے اسی کمرے میں کاکا بابو بیٹھے تھے، اخبار پڑھ رہے [illegible]ے۔ اخبار پڑھنے میں وہ اس قدر محو تھے کہ دیپکر کے قدموں کی چاپ بھی نہ سن سکے۔

دیپکر ان کے سامنے جا کھڑا ہو گیا، پھر آواز دی

"کاکا بابو ——"

کاکا بابو نے چہرہ اٹھا کر دیکھا، بولے ——

"ارے، دیپو بابو ——"

اتنا کہہ کر وہ پھر اخبار پڑھنے لگے۔

دینکر نے کہا —— "سی۔ آر۔ داس مر گئے، اب کیا ہوگا کاکا بابو؟"

کاکا بابو اسی طرح اخبار پڑھتے ہوئے بولے ——

"کیا کہا؟"

"سی آر۔ داس مر گئے۔" دینکر نے جواب دیا —— "اب کیا ہوگا کاکا بابو؟"

کاکا بابو نے اسی طرح اخبار پڑھتے ہوئے کہا ——

ہوگا کیا، کچھ نہیں ہوگا ——

"کچھ نہیں ہوگا؟"

کاکا بابو نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، دینکر بڑی دیر تک وہاں پر کھڑا رہا، اس نے دیکھا جلی حرفوں میں اخبار میں لکھا تھا

DESHBANDHU PASSES AWAY

A Bolt from the Blue

اور اس خبر کے چاروں طرف سیاہ لکیر کھنچی ہوئی تھی، درمیان میں دیش بندھو کی ایک تصویر تھی، دینکر دیر تک تصویر کو دیکھتا رہا۔ جسم پر ایک چادر لپٹی ہوئی تھی، کھدر کی چادر تھی اور سر کے پاس تاڑ کے پتے کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ تعجب ہے! کوئی کچھ نہیں بول رہا ہے! یہ لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ سی۔ آر۔ داس کے مر جانے سے کیا کچھ نہیں ہوگا؟ کسی کا کوئی نقصان نہ ہوگا؟ پھر یہ ان کتنا بار بار سی۔ آر۔ داس کی باتیں کیوں کرتے ہیں اور ان پھر اس طرح کیوں روتا ہے! شاید کھمی دیدی بھی اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی رو رہی ہوگی۔

دینکر نے کھمی دیدی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، وہ پڑھنے کی میز کے پاس بیٹھی ہوئی ایک تصویر دیکھ رہی تھی۔ دینکر کی طرف اس کی پشت تھی، وہ کھمی دیدی کے کمرے میں چلا گیا اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے تصویر پر نگاہ ڈالی، حیرت ہے، وہ اسی آدمی کی تصویر تھی جس آدمی کے پاس وہ ہر روز خط لے کر جاتا تھا۔

دینکر کے قدموں کی آواز سن کر کھمی دیدی چونک اٹھی اور تصویر کو جلدی سے اس نے ساڑی کی تہہ میں چھپا لیا۔ بولی

"کون دینو؟ خط دے دیا تھا؟"

دینکر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے، اس نے ڈرتے ڈرتے کہا ——

"لکھمی دیدی، تم نے سنا، سی۔ آر۔ داس مر گئے؟"
لکھمی دیدی نے حیرت سے دینکر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد بولی ——
"میں سن چکی ہوں، لیکن تم نے خط دے دیا تھا نا؟"
"ہاں دے دیا تھا۔" دینکر نے جواب دیا۔
اس کے بعد تھوڑے رک کر اس نے پوچھا
"اچھا لکھمی دیدی، یہ جو سی۔ آر۔ داس مر گئے ہیں تو اس سے کچھ نہ ہوگا؟"
"کیا ہوگا؟"
دینکر نے کہا —— "اتنے بڑے آدمی مر گئے اور کچھ بھی نہ ہوگا؟"
لکھمی دیدی نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا ——
"ہوگا کیا؟ ایک دن تو سبھی کو مرنا ہے۔"
یہ بات دینکر کو اچھی نہ لگی، سبھوں کے ساتھ سی۔ آر۔ داس کا مقابلہ! سی۔ آر۔ داس کیا دوسرے لوگوں کے ہم پلّہ تھے؟
دیدی کی بات اُسے اچھی نہیں لگی، کوئی سمجھ رہا ہے کہ کتنا بڑا نقصان ہوا ہے! پنچا دا ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دانت ہنستے ہوئے
[illegible] کی قدر نہیں کرتے۔
دینکر وہاں سے چلا آ رہا تھا کہ یکایک اُسے ایک بات یاد آ گئی۔
اُس نے کہا —— "تمہارا ایک خط ہے لکھمی دیدی۔"
"خط!" لکھمی دیدی یکایک اُچھل پڑی —— "خط ہے تو بتایا کیوں نہیں؟ لاؤ ——"
دینکر نے جیب سے خط نکال کر دے دیا۔
"میں ایک دم بھول گیا تھا ——"
لفافے کو لکھمی دیدی اُس کا ایک سرا چاک کر کے پڑھنے لگی، خط پڑھتے وقت وہ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی، جیسے
[illegible] لکھمی دیدی بے حد حسین ہو گئی ہے! غسل کر کے اُس نے ایک سُرخ ساڑی پہن رکھی تھی اور گلے میں سونے کا ایک ہار چمک رہا
[illegible] اس کا گلا کھلا ہوا تھا اور اس کے گلے کا وہ کھلا ہوا حصہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا، جتنی دیر دیدی کا گلا اس طرح کھلا نہ
[illegible] تو وہ اس حصے کو ریجی میں چھپائے رہتی تھی، لیکن لکھمی دیدی کو کچھ کھلا بازو زیادہ پسند ہونے لگی، وہ جتنی دیر تک خط پڑھنے میں محو رہی،
[illegible] خط میں آتا کیا لکھا ہوتا ہے اور لکھمی دیدی بھی ہر روز کیا کچھ لکھتی رہتی ہے اور وہ آدمی بھی سب کام چھوڑ کر ہر روز کیسے لکھ
[illegible] سے خط کے انتظار میں کیوں کھڑا رہتا ہے اور خط پڑھتے وقت اس کا چہرہ اس طرح خوشی سے کیوں کھل اُٹھتا ہے؟ اس کے
[illegible] کی دونوں کیوں سُرخ ہو جاتی ہیں اور وہ اتنا سگریٹ کیوں پیتا ہے اور سگریٹ پیتے ہوئے ایک ہی خط کو بار بار کیوں پڑھتا

[illegible] اچانک لکھی دیدی آپ ہی آپ بولی ——
"کل تو میں [illegible] جا سکوں گی۔"
دیپنکر نے پوچھا —— "کہاں نہیں جا سکو گی لکھی دیدی؟"
"نہیں، میں تم سے نہیں کہہ رہی ہوں۔"
اس کے بعد دیپنکر کی طرف دیکھ کر بولی ——
"دیکھو تو کیا مشکل آ پڑی ہے، کل تو میں نہیں جا سکوں گی۔"
"تمہیں کہیں جانے کے لیے کہا ہے لکھی دیدی؟" دیپنکر نے پوچھا۔
لکھی دیدی نے جواب دیا —— "وہ تم نہیں سمجھو گے، وہ ایک خاص جگہ ہے لیکن کل تو ستی آ رہی ہے۔"
"ستی! ستی آ رہی ہے؟"
لکھی دیدی نے کہا —— "ہاں، کل ستی کو لانے کے لیے جانا ہوگا، کل ستی آ رہی ہے نا، بابا نے خط لکھا ہے، کل صبح پانچ بجے ستی کا جہاز یہاں پہنچے گا۔"

ستی! ستی کے بارے میں دیپنکر اتنی باتیں سن چکا تھا کہ اس کے بارے میں اسے پوری واقفیت ہو چکی تھی، جیسے وہ ستی سے مل چکا ہو اور ستی کو دیکھنے کی اب کوئی ضرورت باقی نہ رہی ہو، بہت دنوں سے اس نے اپنے ذہن میں ستی کی ایک تصویر بھی بنا رکھی تھی، وہ اب تک کاکا بابو اور ماں اور لکھی دیدی کی زبانی اتنی ساری باتیں سن چکا تھا کہ ستی اب اس کے لیے اجنبی نہیں رہی تھی، جیسے لکھی دیدی کی طرح ستی بھی اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

دیپنکر نے پوچھا —— "ستی کل آ رہی ہے یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتائی۔"
"آج ہی تو بابا کا ٹیلیگرام ملا ہے۔" لکھی دیدی نے جواب دیا۔
"مگر وہ کس کے ساتھ آئے گی؟ ستی اکیلی آ سکے گی؟"
لکھی دیدی نے کہا —— "برما سے اور ایک صاحب کلکتہ آ رہے ہیں، انہیں کے ساتھ بابا نے بھیج دیا ہے، وہاں اس کی تعلیم اچھی نہیں ہو رہی ہے اسی لیے —— وہ دیکھتے نہیں، وہ بستر ستی کے لیے ہی کیا گیا ہے، ستی وہیں سوئے گی ——"

اتنی دیر بعد دیپنکر کی نظر پڑی، کمرے کے ایک طرف لکھی دیدی کا بستر تھا، اس کے دوسری طرف ایک دوسرا بستر لگا ہوا تھا۔

اس دن اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک ستی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ دیپنکر نے اس وقت تک ستی کو نہیں دیکھا تھا، لیکن اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب اسے کھیلنے کے لیے گھر میں بھی ایک ساتھی مل گیا ہو۔ لکھی دیدی بڑی تھی، جتنی دیدی بڑی تھی، چھٹے، چھوٹا سا بھی اس سے عمر میں بڑے تھے اس لیے وہ کسی کے ساتھ نہیں کھیل سکتا تھا، جب سے

سننے کی خواہش ہوتی تو چھپ کر کرن کے گھر جانا پڑتا، اب ستی آ رہی ہے، ستی تو اس کی ہم عمر ہے بستی تو عمر میں اس سے چھوٹی ہے ——

اُسے یاد ہے اس روز رات کو وہ اچھی طرح سو نہ سکا تھا، اُسے یاد ہے وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا تھا۔

اُس نے دھیرے سے ماں کو پکارا تھا۔

"ماں ——"

"کیا ہے، تم ابھی تک نہیں سوئے؟"

دیپکر نے کہا —— "اگر کل سویرے مجھے اُٹھنے میں دیر ہو تو مجھے جگا دینا ماں۔"

وہ کیوں سویرے اُٹھنا چاہتا تھا، سچ پوچھیے تو اُسے خود بھی معلوم نہ تھا، پھر بھی اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اگر اُسے جاگنے میں دیر ہو گئی تو اُس کا بہت نقصان ہو جائے گا

اور دوسرے دن دیپکر علی الصبح ہی جاگ گیا تھا، یکایک اُسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ صبح بھی اور دنوں ہی کی طرح تھی۔ اُسے حیرت ہوئی تھی، آخر یہ صبح بھی ویسی ہی کیوں ہے، کوئی بھی فرق تو نہیں، جس طرح ہمیشہ سورج مشرق کی طرف سے طلوع ہوتا تھا اور دالان کے پیڑ پر اس کی پہلی شعاعیں پڑتی تھیں، اُس روز بھی اس کی شعاعیں ویسی ہی پڑ رہی تھیں اور چنوتی بھی اور دنوں کی طرح آنگن میں جھاڑو دے رہی تھی اور کسی کو مخاطب کر کے گالیاں بک رہی تھی —— "تجھ پر غضب نازل ہو، تجھے موت آ جائے، خون کی قے کر کے مرے، مجھے چتا پر ڈال کر کیوڑا تلا میں رکھ آؤں، جتنی بیوائیں ہیں سب جمع ہو گئی ہیں، تجھے میں بھینٹ چڑھا دوں، چنڈال حرامزادے، تیرے منہ میں۔۔۔۔۔۔۔"

آنگن کے ایک کنارے پر آہستہ آہستہ منہ دھوتے ہوئے دیپکر نے سوچا —— چنوتی کو شاید معلوم نہیں ہے کہ سی۔ آر۔ داس مر گئے ہیں۔

اُس نے پوچھا ——

"چنوتی، تمہیں معلوم ہے؟ تم نے سنا؟"

"کیا سنوں گی لڑکے، مجھے ان لوگوں نے کیا سننے کے قابل رکھا ہے، ان بیواؤں نے میری ناک جلا کر رکھ دی ہے، ان چنڈالوں نے مجھے کچھ سننے کے قابل رکھا ہے لڑکے، ان ابھاگنوں کے منہ میں۔۔۔۔۔۔"

وہ صبح پتہ نہیں کیسے گزر گئی تھی، بھات کھا کر گھر سے نکلتے ہی اُس نے دیکھا تھا، بہت سارے لوگ کیوڑا تلا کی طرف جا رہے تھے، کرن کے گھر پر جا کر اُس نے باہر ہی سے آواز دی ——

"کرن، کرن ——"

اندر جانے کی ممانعت تھی، ماں نے منع کر دیا تھا، اس وقت تک پارک آدمیوں سے بھر گیا تھا، نیپال بھٹاچارج اسٹریٹ

کے اندر سے پارک میں جانے کے راستے میں بڑی بھیڑ لگ گئی تھی۔ انسانوں کے سروں سے یہ لگ بھگ بھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں ساڑھے چھ بجے سیالدہ اسٹیشن میں ٹرین پہنچنے کی بات تھی۔ اس کے بعد وہاں سے پیدل چلتے چلتے ہیرو روڈ، نکال کر گلٹ روڈ اور مال گنج روڈ پر آئیں گے۔ اس وقت تک تمام لوگ چھت پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ بچے جہاں سبھوں نے درخت کی شاخوں پر اپنی اپنی جگہ بنالی تھی۔

پھر بارہ بجے، ایک بجا۔ لیکن دور تک کسی کا پتہ نہ تھا۔

یکایک اُسے بھیڑ میں کرن نظر آگیا۔

"ارے کرن! تم یہاں! میں نے تمہارے گھر جاکر بہت آواز دی تھی ــــ"

کرن نے کہا ــــ "میں تمہارے انتظار میں بڑی دیر تک کھڑا رہا تھا۔ آخر چلا آیا کہ یہاں آکر کھڑے ہو جاؤ، یہاں سے صاف دکھائی دے گا ــــ"

آخرکار ڈھائی بجے دن کو یکایک سامنے سے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیا اور اس سمندر کی موجوں کے بہاؤ میں تمام لوگوں کی اُمیدیں، آرزوئیں، خواہشیں اور حسرتیں جیسے ایک ہی لمحہ میں بیدار ہو اٹھیں۔ جیسے انسانوں کے اس عظیم سمندر نے دلوں کی لہروں کو اور بھی تیز کر دیا ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تمام انتظار کی فکر چیخوں میں ڈھل کر رہ گئی۔ جیسے یکایک شہر سنسان ہو گیا، جیسے کہیں بھی کوئی آدمی نہ ہو، کہیں سے بھی کوئی آواز سنائی نہ دے رہی ہو اور وینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس سناٹے کی دیوار کو توڑ کر پھولوں کا ایک پہاڑ اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہو، ہر طرف پھول ہی پھول ہوں۔ اتنے پھول تھے۔ ہیں۔ وینکر کی اُس وقت نے جیسے یکایک چیخنا چاہا۔ جیسے جی بھر کر چیخ لینے سے اُسے تھوڑا سا سکون مل جائے گا۔ جیسے چیخ لینے کے بعد اُسے تھوڑی سی تسکین مل جائے گی۔

پھولوں کا پہاڑ اس کے سامنے سے گزر گیا۔ لیکن اُسے پھر بھی ہوش نہ آیا۔

کرن نے کہا ــــ "وہ دیکھو پنڈت نہرو ــــ"

ویسے ہی اُلجھے ہوئے بال، بے ترتیب کھدر کا لباس، ویسی ہی ایڑی مڑا ہوا جوتا۔ ویسے ہی وہ آج بھی پیارے سب تھے۔

کرن نے کہا ــــ "وہ دیکھو مہاتما گاندھی ــــ"

ایک ایک کرکے کرن نے سبھوں کی پہچان کرادی۔ کرن سبھوں کو پہچانتا تھا، وہ سبھوں کو تصویروں میں دیکھ چکا تھا۔

وینکر نے کہا ــــ "وہ دیکھو اگر دادو ــــ"

اگر دادو فٹ پاتھ کے ایک کنارے کھڑے تھے، ان کی بینائی کمزور تھی، پھر بھی وہ دیکھنے آئے تھے کرن جانے ہر سنہ پارلیمنٹ کے لئے نزول پاست کو بھی دیکھا گیا۔ اس کا اسکول چھوڑ کر جو ساڑھے سو روپے چلا گیا تھا، آج وہ بھی آیا تھا اور ایک طرف خاموش کھڑا تھا اور رکھوا کھڑا نازگی کا رہا تھا اور اس کے قریب ہی اس کا دربان کھڑا تھا، پڑھک بھی آیا تھا، کھیم بھی آیا تھا ــ

ٹس چندر سرکار، وہ بھی آج یہاں آیا ہوا تھا! گھر واپس جاکر اس نے سُنا تھا کہ بنتی دیدی کو ساتھ لے کر ماں بھی آ گئی تھی، دونی کاکا
بی فوج بھی پہنچ کر آ گئے تھے، چھوٹے ما، مدھو سودن کے بڑے بھیّا اور پنچا دا بھی ٹولی بنا کر آئے تھے۔

دینکر نے کہا ـــــ "وہ دیکھو چھیٹے بھی آیا ہے ـــ"

مگر وہ ادھ کا بیٹا ذرا سے چھیٹے بھی آیا تھا اور سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور دھوتی کو لنگی بنا کر پہن رکھا تھا، بڑی بھیڑ تھی، ایک
ادمی بھی ایسا باقی نہ بچا تھا جو آیا نہ ہو، صرف کاکا بابو، کاکی ماں اور رکھی دیدی نہیں آئی تھی جیسے وہ لوگ دوسری جماعت کے لوگ
ہیں جیسے وہ سب دوسروں سے علاحدہ ہوں۔

یکا یک ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔

اور اس کے ساتھ ہی سرس کے پیڑ کی ایک شاخ چڑچڑاتی ہوئی زمین پر آ رہی اور اس کے ساتھ ہی انسانوں کا ایک جھنڈ
قلابازی کھاتا ہوا نیچے آ گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، چاروں طرف شور غل مچ گیا، بولو ہری ہری بول ـــــ

صبح سے کر شام تک وہ دن سوگوار سا گزرا، جیسے سارے کلکتہ کے باشندے اپنے عزیز کی موت کا سوگ منا رہے
ہوں، لیکن اب اس روز کی بات کسی کو یاد بھی نہیں، سبھی بھول چکے ہیں، تمام باتیں کیا انسان یاد رکھ سکتا ہے! دینکر تمام رات
نہ سو سکا تھا، اس روز اس کا دل بہت خراب ہو گیا تھا، گھر لوٹنے کے بعد بھی اُسے کچھ بھی اچھا نہ لگا تھا۔

کرن نے گھر لوٹتے ہوئے کہا تھا ـــــ

"چلو دیپو، اس سادھو کے پاس چلیں، بیٹے سے دریافت کریں ـــــ"

شمشان سے لوٹ کر وہ کرن کے ساتھ ساتھ سیدھا سونار کا ٹینک کے گھاٹ پر سادھو کے پاس گیا تھا، ایسا کیوں ہوا؟
ن۔ آر۔ داس اگر مر گئے ـــ تو اس سے کیا ہوگا؟ اس کا جواب دینکر بھی کوئی نہ دے سکا تھا، دونی کاکا، چھوٹے دا، پنچا دا،
کاکا بابو، کاکی ماں اور رکھی دیدی، کوئی بھی نہ دے سکا تھا، کسی کے دل میں ذرا بھی غم کا احساس نہیں تھا، حالانکہ نظر کے سامنے
اتنا بڑا حادثہ ہو چکا تھا! سب کچھ خاک ہو کر ختم ہو گیا تھا! چتا کے دھوئیں سے آسمان سیاہ ہو گیا تھا، پھر اتنے آدمیوں کا سوگ
کیا بے مقصد تھا؟

دینکر نے پوچھا ـــ ـــ "سو بھاش بوس کیوں نہیں آئے رے کرن؟"

کرن نے کہا ـــــ "سو بھاش بوس تو جیل میں ہے، تمہیں نہیں معلوم؟"

دینکر نے پوچھا ـــــ "پھر کیا ہوگا بھائی ـــــ"

"چلو نا، سادھو سے جا کر دریافت کریں۔" کرن نے جواب دیا۔

پتھر پٹی عبور کر کے مندر کے آمنے سامنے سونار کا ٹینک گھاٹ جانے کا راستہ تھا، دونوں طرف خوانچے کی دکان تھی، پنڈول
کا مسافر خانہ تھا، پتھر بچھایا ہوا راستہ تھا، کچھ دیر پہلے بارش ہو چکی تھی، کرن اُسے کھینچتا ہوا مغرب کی سمت لے چلا، مغرب کی سمت
دکھتا تھا اور گنگا کنارے ہی سونار کا ٹینک گھاٹ تھا، کرن ایک گلی کے اندر سے بائیں طرف مڑ گیا۔

کرن نے کہا — "سادھو کے پاس جا کر اس کے قدموں کو چھو کر پرنام کرو گے، بس۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ کیوں؟ وہ اس لیے کہ سادھو خوش ہوگا۔ پرنام کرنے سے کوئی خوش نہیں ہوتا تو بھی تو انسان ہے، پرنام کرنے میں نقصان کیا ہے، اس میں تو پیسہ خرچ نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد کرن نے تھوڑے توقف کے بعد کہا ——

"پیسہ ہی اصل چیز ہے دیپو، سادھو ہو یا سادھو نہ ہو ——"

"لیکن میرے پاس تو پیسہ نہیں ہے۔"

کرن نے کہا —— "میرے پاس بھی پیسہ نہیں ہے۔ پیسہ دینا ہوتا تو سادھو کے پاس کیوں آتے۔ پیسہ نہیں دینا ہوگا اسی لیے تو سادھو کے پاس آتا ہوں ——"

"تو پھر؟ پھر وہ کھاتے کیا ہیں؟ کیا کھا کر زندہ رہتے ہیں؟"

"پیسے دینے والے بہت سے لوگ ہیں۔" کرن نے جواب دیا —— "وہ لوگ سادھو کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں اور وہ رہتے ہیں۔ لیکن یہ سادھو ویسا نہیں ہے۔ یہ برف کا بنا چیتا ہے۔ یہ ہمالیہ کا سادھو ہے نا، اور کچھ نہیں کھاتا ——"

لیکن گھاٹ کے سامنے جاتے ہی کرن ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور چند لمحوں تک خاموش رہا، پھر بولا —— "یہ دیکھو، مسہ ہوتا ہے پھر ہمالیہ پر واپس چلا گیا ——"

"اب کیا ہوگا؟"

کرن نے کہا —— "نہیں۔ ہم لوگوں کی قسمت ہی خراب ہے۔ ادھر کئی روز سے بھوانی پور جا کر جیو بیچ رہا ہوں اسی لیے اس طرف نہیں آسکا، ورنہ پتہ چل جاتا۔"

پھر وہ دونوں لوٹ آئے، پتھر چنتے ہوئے واپس آئے۔ اس کے بعد کرن نیپال بھٹاچاریہ اسٹریٹ کے اندر مڑ گیا، دیپکر سیدھا لکھی دیدی کے گھر میں داخل ہو گیا۔ ستی آئی ہے کیا! ستی کے تو آنے کی بات تھی: وہی لکھی دیدی کی بہن۔ آج ہی تو آنے کی بات تھی۔ لکھی دیدی ہی نے تو کہا تھا۔

باورچی خانے میں چولہا سلگ رہا تھا۔ شاید تب سے صحن میں آ کر ٹھہر رہا تھا اور گھر گھر میں جا کر دھواں رہا تھا۔

دیپکر زینے پر چڑھنے لگا۔

کمرے میں ایک نیا پلنگ بچھ گیا تھا۔ یہ پلنگ ستی کے لیے تھا۔ لکھی دیدی اور ستی ایک ہی کمرے میں سوئیں گی۔

زینے کے سامنے ہی لکھی دیدی سے ملاقات ہو گئی۔

لکھی دیدی نیچے آرہی تھی۔

"کہاں سے دیپو؟" دیپکر کو دیکھتے ہی لکھی دیدی نے پوچھا —— "تمہارا چہرہ ایسا کیوں ہو گیا ہے؟"

شمشان گھاٹ گیا تھا۔" دینکر نے جواب دیا ——— "سی۔ آر۔ داس مر گئے ہیں نا۔"
"او، ہم لوگ بھی تو ابھی آ رہے ہیں۔"
"کہاں سے؟"
"ستی کو لانے گئی تھی۔" لکھی دیدی نے جواب دیا۔
دینکر کا دل دھڑکنے لگا۔
"ستی آ گئی ہے کیا؟" اُس نے پوچھا ——— "کہاں ہے دیکھوں؟ دیکھنے میں کیسی لگتی ہے؟"
لکھی دیدی مسکرانے لگی۔
"نہیں رے، نہیں آئی۔ وہاں سے جہاز ہی نہیں کھلا، بڑے زور کا طوفان آ گیا تھا نا اسی لیے ———"
دینکر مایوس ہو گیا۔
پھر بھی وہ تھوڑی دیر تک کھڑا رہا، جیسے وہ بڑی اُمیدیں لے کر آیا ہو، حالانکہ یہ اُمید بیکار تھی، کس بات کی اُمید لے کر وہ آیا تھا، ستی اُس کی کون تھی، ابھی تو اسی کا ٹھیک نہیں تھا۔
لکھی دیدی زینے سے نیچے اُترنے لگی، اُس کے پیچھے پیچھے دینکر بھی اُترنے لگا۔
یکایک اُس نے پیچھے سے آواز دی۔
"اچھا لکھی دیدی ———"
"کیا ہے، کہو؟"
دینکر نے پوچھا ——— "ستی شاید دیکھنے میں تمہاری ہی طرح ہے؟"
لکھی دیدی مڑ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی
"او ماں۔ تم شاید دن رات ستی ہی کے بارے میں سوچتے رہتے ہو؟"
دینکر شرما سا گیا۔ اُس نے اپنا سر جھکا کر کہا
"نہیں تو ———"
"تو پھر؟ تم ہر وقت ستی کے بارے میں کیوں پوچھتے رہتے ہو؟"
دینکر کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ بار بار ستی کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ سوچ رہا تھا، ستی خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو مگر وہ لکھی دیدی کی طرح چھپا چھپا کر کسی کو خط نہ لکھے۔ ستی خواہ جیسی بھی ہو مگر وہ لکھی دیدی کی طرح آئینہ کے سامنے ننگی ہو کر رقص نہ کرے۔ ستی بھی لکھی دیدی کی طرح پڑھنے کی میز کے پاس بیٹھ کر کسی غیر مرد کی تصویر نہ دیکھے۔ ستی نیک اور اچھی لڑکی ہو، لکھی دیدی کی طرح نہ ہو، وہ اس سے بھی زیادہ اچھی ہو تو بہتر ہے، ستی سچ مچ ستی ہی ہو۔
اس روز رم جھم برستے ہوئے پانی میں مندر کے دروازے پر کھڑے ہو کر بھی دینکر نے یہی سوچا تھا، شاید ستی نہ آنے

کتنی بے بسی یہاں نہ آ سکے اتنی دور سے آ گیا آسان ہے! کہاں برما اور کہاں ٹولی گنج کے کٹلر ممبر فیشور بابو، ممبر فیشور متر ـــــــ ان کی پہلی رات کی شنو کیا اتنی دور دیکھنے آ سکے گی؟ اگر آئے تو وہ اس کے ذریعے اس طرح خط نہ بھیجے، وہ بھی دیپنکر کو لکھی دیدی کو اتنی تکلیف نہ دے اور اس کا خط پہنچانے کے لیے بھیج کہ وقت اُسے بارش میں بھیگنا پڑے۔

اب وہ شخص آ رہا تھا، وہی کرشن چندر والا آدمی سامنے سے آتا دکھائی دے رہا تھا۔

ایک ٹیکسی تیر کی طرح کنڈو پکر کی طرف آ رہی تھی، لیکن نہیں، وہ ٹیکسی کنڈو پکر کے کنارے سے ہوتی ہوئی ایک گلی میں مڑ گئی۔

دیپنکر پھر ایک بار پڑوسی کی دوکان میں جا کر گھڑی دیکھ آیا۔ غضب ہو گیا آٹھ بج گئے! کب وہ پڑھے گا، کب اسکول جائے گا، کب کھانا کھائے گا!

بارش اور بھی تیز ہو گئی تھی اور پانی کی بوندیں اور بھی تیزی سے پڑنے لگی تھیں۔

دیپنکر بارش ہی میں وہاں سے چل پڑا۔ اماں کالی کے مندر سے ایشور گنگولی لین تک بہت طویل فاصلہ تھا۔ اس کی قمیص بنیان پانی میں بھیگ گئے اور دوڑتے دوڑتے جب وہ لکھی دیدی کے دروازے تک پہنچا تھا پانی میں سر سے پاؤں تک بھیگ چکا تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اُسے لکھی دیدی کو اس کا خط واپس کرنا تھا، اس سے کہہ دینا ہوگا کہ وہ بھلا آدمی نہیں آیا۔ شاید لکھی دیدی خفا ہوں گی، ذرا غصہ ہوں گی، لیکن اس میں اس کا کیا قصور ہے، وہ بھلا آدمی نہ آئے تو وہ کر ہی کیا سکتا ہے۔

زینے کے نیچے باورچی خانے کی طرف سے کاکی ماں کی آواز سنائی دی۔ دیگر تخت کے نیچے بیٹھا ہوا ایک سنتھال برتن دھو رہا تھا۔

دیپنکر زینے پر چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ اوپر برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ دائیں طرف سونے اور پڑھنے کے کمرے تھے۔

دیپنکر نے اندر جھانک کر دیکھا۔

"لکھی دیدی!"

وہاں کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ دوسرے کمرے میں بھی کوئی نہ تھا۔ بالائی منزل پر ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی ایک آدمی بھی اوپر نہیں تھا۔ دیپنکر کے کپڑے بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے۔ اُس نے ہر کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ لکھی دیدی کہاں گئیں؟ کاکا بابو بھی کہاں چلے گئے۔ وہ تو ہمیشہ ہی برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھتے رہتے تھے۔ جس روز سی۔ آر۔ داس کا انتقال ہوا تھا اس روز بھی وہ اسی جگہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ لکھی دیدی کے کمرے میں ستی کا پلنگ اسی طرح بچھا ہوا تھا۔ دونوں پلنگ اسی طرح دونوں طرف دیوار سے سٹے ہوئے بچھے تھے اور صاف ستھرے بستر لگے ہوئے تھے۔ صرف چھوٹی میز پر تین عدد چائے کی خالی پیالیاں پڑی ہوئی تھیں۔

"لکھی دیدی!"

دیپنکر نے پھر پکارا۔

اس کے بعد وہ زینے پر چڑھ کر اوپر چھت پر چلا گیا۔ اوپر چھت پر صرف ایک کمرہ تھا، اس کمرے میں کاکا بابو سوتے
اس کمرے سے پورا کا پورا کالی گھاٹ تصویر کی طرح نظر آتا تھا، چھوٹے چھوٹے گھر، بستی، گھاس پھوس کی چھت، کالی کا مندر،
ر کا مکان، چنڈی بابو کے بارہ مکانوں کی چھتیں، اور بھی بہت کچھ دکھائی دیتا تھا، اور اُس طرف ٹیپو سلطان کی وہ عمارت جس میں
ان کا مسکن تھا اور اُس سے پرلی طرف آگے کھاری تالاب اور اُس سے بھی پرے دھان کے کھیت دُور تک پھیلے ہوئے تھے
دھان کے یہ کھیت جنوب کی سمت پھیل کر ریلوے لائن سے جا ملے تھے۔

اُوپر جاتے ہی دیپنکر نے کاکا بابو کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اور دنوں میں اس کمرے میں
لگا رہتا تھا، لکھی دیدی اس کمرے میں بھی نہیں تھی۔ دروازہ کا پٹ پکڑ کر اُس نے ایکبار پھر جھانک کر اندر دیکھا، پلنگ پر اخبار اُلٹا
تھا۔ جیسے کچھ دیر پہلے اس کمرے میں کوئی تھا، شیلف میں بہت ساری کتابیں سجی ہوئی تھیں اور بہت سارے کاغذات کا بنڈل
اور ایک ٹرنک تھا اور ٹرنک میں ایک چھوٹا سا تالا جھول رہا تھا۔ صبح کی دھوپ فرش پر، پلنگ کی چادر پر اور دیوار کے کنارے
ہوئی تھی۔

لکھی دیدی کہاں چلی گئی!

نیچے جاکر کاکا کی ماں سے دریافت کرنا ہوگا، اتنے سویرے کاکا بابو بھی کہاں چلے گئے اور لکھی دیدی بھی کہاں چلی گئی۔

یکایک اُس نے دیکھا، چھت کے شمال مشرقی کونے پر لکھی دیدی کھڑی تھی، دیپنکر کی طرف اُس کی پشت تھی، کاکا بابو دُور میں
بہت دُور کچھ دیکھ رہے تھے، انھوں نے بھی دیپنکر کو نہیں دیکھا۔

آہستہ آہستہ دیپنکر ان کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔

اس وقت لکھی دیدی آنکھوں سے دُور بین لگائے ہوئے کچھ دیکھ رہی تھی۔

دیپنکر نے آواز دی۔

"لکھی دیدی۔"

لکھی دیدی چونک اٹھی، اُس نے پلٹ کر دیپنکر کو حیرت سے دیکھا۔

"تم، تم کب آئے؟"

"میں بہت دیر سے آیا ہوا ہوں۔" دیپنکر نے جواب دیا ——— "میں تمھیں ہر جگہ ڈھونڈ چکا ہوں۔"

"ملا دے دیا تھا؟"

"نہیں، وہ نہیں آئے تھے!"

"نہیں آئے تھے! کیا مطلب؟ پھر تم نے خط کس کو دیا؟"

... دیپنکر نے جواب دیا — "یہ لو۔"

... نے خاموشی سے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی اور اس کے بعد لاپروائی سے کھڑکی کے باہر اچھال دیا۔

"یہ دیکھو" دیپنکر نے کہا — "خود سے کر میں اٹھا بہت انتظار کرتا رہا، پھر بھاگ کر چلا آیا —"

"تم نے کچھ دیر اور انتظار کیوں نہ کیا؟ آسمان صاف ہو جانے کا امکان تھا۔"

"میں تو بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ اس کے بعد اتنے زور کی بارش آ گئی کہ یہ دیکھو، بارش میں نہا گیا ہوں۔"

لکھی دیدی نے ایک بار اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بولی —

"بارش تو تھوڑی دیر بعد رک گئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی دھوپ نکل آئی تھی، کچھ دیر اور انتظار کر لیتے —"

"تم اس سے کہہ دو لکھی دیدی" دیپنکر نے کہا — "کہ وہ ٹھیک وقت پر آیا کرے۔ کھڑے کھڑے میرا پاؤں درد کرنے لگا ہے —"

"اسے بہت دور سے آنا پڑتا ہے نا" لکھی دیدی نے کہا — "اسی لیے دیر ہو جاتی ہے۔ خیر اب دیر نہیں ہوگی۔ میں کہہ دوں گی۔"

دیپنکر نے فوراً رک کر پوچھا —

"یہ دوربین ہے لکھی دیدی؟"

"ہاں، ہاتھ کو لو —"

"دکھائی دیتا ہے؟"

"دیکھو گے؟"

اتنا کہہ کر لکھی دیدی نے ہاتھ کر کے دیپنکر کی آنکھوں سے لگا دیا، پھر پوچھا —

"دکھائی دیتا ہے؟"

دیپنکر نے دیکھا، دور بہت دور کی چیزیں بھی پاس کے قریب دکھائی دیتی تھیں۔ اتنے قریب کہ وہ ہاتھ بڑھا کر انھیں چھو سکتا تھا، اپنی مٹھی میں بند کر سکتا تھا۔ ہاں کالی کا مندر، نیپال بھٹاچاریہ اسٹریٹ، اکرو کے مکان کی ٹین کی چھت، پتھر پٹی میں پھلکا کا مکان، مدھو سودن کا مکان، دھرم داس ٹرسٹ ماڈل اسکول، اور بھی دوسری دور دور کی چیزیں اس کے بالکل قریب آ گئی تھیں۔

پھر دیپنکر نے دوربین کا رخ لکھی دیدی کی طرف کر دیا۔ لکھی دیدی کو اتنے دنوں سے وہ اپنی آنکھوں سے اپنے قریب دیکھتا رہا تھا۔ اب دوربین سے دیکھنے میں وہ کیسی لگتی ہے، وہ یہی دیکھنا چاہتا تھا۔

"کیا تم مجھے دیکھ رہے ہو؟"

دیپنکر کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔

"تم اتنی دھندلی کیوں نظر آ رہی ہو لکھی دیدی!" اس نے پوچھا — "کچھ دکھائی نہیں دیتا؟"

"میں تمہارے قریب جو ہوں۔" نکھی دیدی نے جواب دیا۔

"قریب کا آدمی دُھندلا کیوں دکھائی دیتا ہے؟ نہیں، میں تمہیں دُور بین سے نہیں دیکھوں گا۔"

اُس نے آنکھوں کے سامنے سے دُور بین ہٹالی۔

"کیوں؟"

"نہیں، نہیں، تم بہت بُری دکھتی ہو، تم تو پہچان میں ہی نہیں آتیں۔"

"پہچان میں کیسے آؤں گی، دُور بین تو دُور سے دیکھنے کے لیے ہے، قریب کی چیز بھی کہیں دُور بین سے دیکھی جاتی ہے!"

نکھی دیدی کی بات سُن کر اس چھوٹی سی عمر میں اُسے بڑی حیرت ہوئی تھی، بات سچ تھی، نکھی دیدی تو اُس کے قریب تھی، اس کے دل کے قریب۔ اگر وہ اس کے اتنے قریب نہ ہوتی کیا کبھی اُس کے ذریعہ خط بھجواتی! اس پر اتنا بھروسہ کرتی! اس کے علاوہ قریب کے آدمی کو دُور بین سے دیکھنے میں سب کچھ اُلٹ پُلٹ ہو کر رہ جاتا ہے، قریب آتے ہی آنکھوں کے سامنے دُھندلا جاتی ہے جیسے دُور بہت دُور کی کوئی چیز ہو، حالانکہ جب نکھی دیدی دُور چلی گئی تھی —— جب اُس کی دسترس سے باہر ہوگئی تھی تو اُس وقت اُسے محسوس ہوا تھا جیسے نکھی دیدی اُس کے بالکل قریب آگئی ہے جیسے نکھی دیدی کو اُس نے بہت قریب سے دیکھا ہے، جیسے نکھی دیدی کے بارے میں وہ سب کچھ جانتا ہے!

دیپنکر نے نکھی دیدی کو دُور بین واپس دے دی۔ بولا۔۔

"تم بھی ایکبار مجھے دُور بین سے دیکھو نا نکھی دیدی۔"

"وہ کیوں؟" نکھی دیدی مسکرائی۔

"میں بھی تمہیں دُھندلا دُھندلا دکھائی دوں گا۔"

"دُھندلا نظر آئے گا تو کیسے —— نظر آئے گا، تمہیں اس سے کیا ملے گا؟"

"نہیں، اس طرح تم مجھے پہچان نہ سکوگی!"

اتنا کہہ کر وہ چلا آیا جیسے اس کے بعد۔ نکھی دیدی کے سامنے کھڑے رہنے میں اُسے شرم محسوس ہو رہی ہو، وہ تیزی سے زینہ پھلانگتا ہوا باہر راستے پر آکر کھڑا ہوگیا، اس کے بعد بغل کے دروازے سے وہ اپنے گھر میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ یکایک اس کے قدم رُک گئے۔

دیشو بر گنگولی لین کی گلی کے دہانے پر کسی کی ایک ٹیکسی آکر رُک گئی، اس گلی میں کس کے یہاں ٹیکسی آئی ہے، پھر کوئی بنا ارادہ دیکھنے لگا، ٹیکسی کے اندر ایک لڑکی تھی، اور پیچھے بہت سا سامان اسباب بندھا ہوا تھا۔

ٹیکسی سے ایک آدمی اُتر کر مکان کا نمبر دیکھنے لگا۔ پھر دیپنکر کے قریب آکر اس نے پوچھا ——

"اے، ذرا سُنو بابو، ایک بی، کون سا مکان ہے؟"

"ہم پہلے بھی کو تلاش کرتے ہیں؟"

"اکیس بی کا مکان چاہیے۔"

"ہاں، ہاں، یہی مکان ہے ——"

وہ ٹیکسی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

پچھلی سیٹ پر ایک لڑکی اور ایک عورت بیٹھی تھی۔ دیپنکر کی نگاہوں کے سامنے جیسے اچانک بجلی سی کوند گئی۔ یہ ستی تو نہیں!

"اے بھائی کسے، یہ سامان اُٹھا سکو گے؟"

اتنا کہہ کر وہ شخص ٹیکسی سے سامان اُتارنے لگا۔ وہ گرم سوٹ میں ملبوس تھا، اور کافی معتبر تھا۔

اندر بیٹھی ہوئی گوری چٹی لڑکی نے کہا ——

"اتنی جگہ ہوتے ہوئے کاکا بابو نے مکان کیسے لے رکھا ہے، اور کہیں جگہ نہیں ملی تھی ——"

اس آدمی نے دیپنکر سے پوچھا ——

"اکیس ایف بی نمبر کا مکان پہچانتے ہو تو؟"

"جی ہاں ——" دیپنکر نے جواب دیا۔

"اچھا تو پھر یہ سامان اُٹھاؤ، زیادہ بھاری نہیں ہے، ایک بستر اور ایک سوٹ کیس ہے ——"

لڑکی ٹیکسی سے نیچے اُتر آئی اور اس آدمی سے مخاطب ہو کر بولی ——

"آپ ساتھ نہ ہوتے تو مکان تلاش کرنا مشکل تھا ——"

اس کے بعد اس نے ساڑی کی شکنیں درست کیں اور جوڑے کو ٹھیک کر لیا۔ پھر وہ ادھر اُدھر نگاہ دوڑا کر مکان کا پتہ پوچھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ہر لمحہ حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

بولی —— "میں سوچ رہی ہوں ایسی جگہ میں دیدی کیسے رہتی ہے۔"

اس آدمی نے کہا —— "یہی کیا کم بڑا ہے، اتنا بڑا باغ —— اتنا بڑا مندر ——"

اس کے بعد دیپنکر سے کہا —— "اور سے، بدھو کی طرح کھڑے کیوں ہو بابا، سر پر اُٹھاؤ نا، زیادہ بھاری نہیں ہے ——"

اس کے بعد کوئی بات کہے بغیر اس نے بستر اُٹھا کر دیپنکر کے کندھے پر ڈال دیا۔

"لے جا سکو گے تو؟"

دیپنکر نے کندھے پر بستر اور ہاتھ میں سوٹ کیس لے کر جواب دیا۔

"ہاں، لے جاؤں گا۔"

"دیکھو ذرا سنبھال کے، یہ وہ پرگرشت ہی تو نہیں، کہیں پٹک مت دینا۔"
آگے آگے دیپکر، اس کے پیچھے وہ آدمی اور اُس کے پیچھے وہ لڑکی چلنے لگی۔
دیپکر کو عجیب سا احساس ہونے لگا، ایسا کیوں ہوا، ایسا کیسے ہو گیا، سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ اُسے کچھ سوچنے اور کچھ
نے کا موقع ہی نہ مل سکا۔
کاکا بابو کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔
"یہی مکان ہے؟"
دیپکر نے کندھے سے بستر اُتار کر جواب دیا۔
"ہاں۔"
لڑکی نے پوچھا ـــ "کتنے پیسے لوگے؟"
دیپکر پریشان سا ہو گیا، اس نے ایک بار لڑکی کے چہرے کو دیکھا، اسی کے بارے میں لکھی دیدی سے وہ سُنتا
تھا! کیا یہی ستی ہے! ایسا ہی چہرہ تو لکھی دیدی نے بتایا تھا، ایسی ہی سنہری رنگت! ایسے ہی گھونگھریالے

اس آدمی نے کہا ـــ "اس کو ایک آنہ دے دو۔"
دیپکر نے کہا ـــ "نہیں، پیسے دینے کی ضرورت نہیں۔"
اس آدمی نے کہا ـــ "کیوں؟ تھوڑا سا تو سامان ہے، وہ بھی بالکل ہلکا ہے، اس کے لیے ایک
بالکم ہے؟ گردن تک مٹی کھودنے سے کہیں چار پیسے ہاتھ آتے ہیں؟ بڑے نواب ہو گئے ہیں سب، یہ سامان
خود اُٹھا کر لا سکتا تھا ـــ"
لڑکی نے کہا ـــ "میں ایک آنہ سے زیادہ نہیں دوں گی، لے لو ـــ"
اور ہاتھ بڑھا کر اُسے پیسے دینے چاہے۔
"نہیں۔" دیپکر نے انکار کیا۔
اس آدمی نے کہا ـــ "اسی وجہ سے بنگالیوں کو کچھ نہیں ہوتا، ہلکا سا سامان ہے اس کے لیے
نے دینے ہوں گے، نہیں لیتا تو مت لے، میرا کیا ہے ـــ"
لڑکی نے پھر پوچھا ـــ "لوگے تو لے لو۔"
"نہیں۔" دیپکر نے جواب دیا۔
اس آدمی نے کہا ـــ "تم اور اس کی خوشامد مت کرو ستی، رہنے دو، میں بھی دیکھتا ہوں وہ چار پیسے
ملتا ہے ـــ"

ڈیکر آہستہ آہستہ آگے جھکیا۔ تھوڑی دیر وہ اور وہاں پر کھڑا رہا، پھر اس نے اپنی میلی ہوئی قمیص کی آستین سے اپنی آنکھیں صاف کر لیں۔

بلیک مین کے جسم سے کوئی چیز ٹکرائی۔ مڑ کر دیکھا تو آنے کے چار پیسے تھے، چار ملی پیسے اس کے جسم سے ٹکرا کر جھن جھن کرتے ہوئے زمین پر ادھر ادھر بکھر گئے اور ڈیکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے یکایک اس کو کسی نے چانٹا لگا دیا ہو۔ تو کیا آج بھی دوسرے لوگوں ہی کی طرح ہے! گھسیٹا نے بھی اسے چار پیسے دیا تھا۔ تو کیا آج بھی گھسیٹا ہی کی طرح ہے! نہیں نہیں! تو کیا دنیا میں ابھی اچھے لوگ رہ گئے ہیں ——!

جوتے کا خطبہ

قاضی عبد الستار

علم کے معبد کا مرکزی ایوان قمقموں، پھولوں اور چہروں سے جھلک رہا تھا۔ ادیب، دانشور، پروفیسر، طالبات، طالب علم
.. معزز مہمان سب اس صدر دروازے کو گھور رہے تھے جس کے دونوں طرف والنٹیرز مہمانِ خصوصی کے انتظار میں کھڑے
ہوئے تھے۔ آخر وہ لانبی سیاہ موٹر آ گئی، جس پر سوار ہو کر کوئی بھی سماجی بلندی کو خرید سکتا ہے۔ میزبانوں کا ہجوم چیلوں کے
...ے کی طرح موٹر پر جھپٹا اور اس پر چھا در ہوتا ہوا مہمانِ خصوصی کے طلوع کا انتظار کرنے لگا۔ پھر لباس کا تجمل دیکھتے ہی
... ایوان کھڑا ہو گیا۔ خاص مہمان کے کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہوتے ہی ادبی کانفرنس کے سیکرٹری (جو یونیورسٹی کے مشہور
...دنیسر تھے) مائکروفون پر آئے اور تعارف کے بہانے معزز مہمان کی شان میں منثور قصیدہ پڑھ دیا۔ معزز مہمان جو ... را
...شو کمپنی کے مالک تھے اور سارے ملک میں "شو کنگ" کے نام سے مشہور تھے، بڑے وقار سے زیر لب مسکراتے رہے۔ آخر
... سیکرٹری نے گزارش کی کہ صدر محترم اپنے افتتاحیہ خطبے سے ادبی کانفرنس کا آغاز فرمائیں۔ صدر محترم مغل شہنشاہ کی طرح
...ے جیسے ایک ایک قدم ایک سلطنت پر پڑ رہا ہو۔ مائیک کے سامنے کھڑے ہوتے کھنکارے، بچلے میں دھنسے ہوئے
...ون کی طرح بھرے ہوئے ہال کو تمکنت سے دیکھا، جیب سے ایک کاغذ نکالا اور تڑا تڑ بولنے لگے۔ .. یعنی
...ھنے لگے۔

"حاضرین کرام!

میں اسٹیشن میں تھا جب جنرل ایجنٹ نے کیبل کے ذریعے مطلع کیا کہ آپ نے اس ادبی کانفرنس کی صدارت کے لیے میرا
... تجویز کیا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے جس نادر خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے اس کے لیے مبارکباد پیش کرتا
ہوں۔ بظاہر ادب اور جوتے کے کاروبار میں کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا لیکن اگر دور بینی اور ژرف نگاہی سے دیکھا جائے تو
...ب کو جوتے سے الگ کر کے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ میں نے آپ کی دعوت اس لیے قبول کر لی کہ مجھے آپ کی دلجوئی اور
...ت افزائی کے علاوہ جوتے اور ادب دونوں کی خدمت مقصود ہے۔

خواتین و حضرات!

جس طرح ادب قوموں کے عروج و زوال کی داستان سناتا ہے اسی طرح جوتا بھی ملکوں کی تاریخ اور تہذیب کو آئینہ دکھلاتا
...ت۔ جوتے کا ہندوستان کے ماضی سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ بلکہ میں یہاں تک کہنے کی جسارت کروں گا کہ کئی صدیاں اسی کے
...گھومتی نظر آتی ہیں۔ ماضی بعید میں ہندوستان دو طبقوں میں تقسیم تھا۔ ایک جوتا بناتا تھا دوسرا پہنتا تھا۔ جوتا پہننے والے

جتے نے جوتا پہلے اٹھا کر حقارت سے دیکھا۔ اس کو ٹھوکر لگا اور جھٹ پٹ کو بہا دیا۔ اسی طرح اس جتا ئی نظام کی پرورش کی جس نے چپت سے ملک کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور پارہ پارہ ہندوستان کو جتوں کا تحفہ نے اپنے پیروں میں پہن لیا۔

جب تک مسلمان جوتے کی اہمیت کو تسلیم کرتے رہے بادشاہی کرتے رہے لیکن جب خانہ جنگی کے ہاتھوں جوتے کی صنعت غارت ہوگئی جیسے جیسے راجے اور نہایت امیر اور وزیر بادشاہی دسترخوان کی چپاتیوں کی طرح جاپانی جوتے پہننے لگے۔ ان کمزور جوتوں نے ان کے پیروں کو کباب کی لذت اور زمین کی حقارت سے بیگانہ کر دیا۔ اور وہ اپاہجوں کی طرح درکار پالکیوں کے منہ سے خوابوں پر آنے لگے۔ اس طرح رفتہ رفتہ پوری قوم کا معدہ خراب ہوگیا۔ صحت تباہ ہوگئی اور ایک عظیم الشان سلطنت ٹکے کی سیر کی طرح انگریزوں کے پیروں میں چلی گئی۔

آپ لوگوں نے جو کتابیں اور لطیفے اور چٹکلے پڑھے ہیں ضرور پڑھا ہوگا کہ جب انگریز لکھنؤ پر قابض ہوئے اور قیصر منزل میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ واجد علی شاہ ایک پاؤں میں جوتا پہنے مسند پر بیٹھا ہے اور ہاتھ میں ننگی تلوار چمک رہی ہے اور دوسرا جوتا دور دروازے کے پاس پڑا ہے۔ انگریزوں کو دیکھ کر نواب نے حسرت سے کہا کہ اگر میرے دوسرے پاؤں میں بھی جوتا ہوتا تو تم لکھنؤ میں داخل نہ ہو سکتے۔ آپ اس کو معمولی واقعہ سمجھتے ہوں گے لیکن اسی معمولی واقعے نے ہندوستان کی تاریخ پر سیاہی پھیر دی اور ہم انگریزوں کے صد سالہ دورِ غلامی کی جوتے بازی کا شکار ہوگئے۔

جوتے اور معاشیات میں چولی دامن کا ساتھ ہے جو صدیوں سے رہا ہے وہ آج بھی اسی پالش اور ڈیزائن کے ساتھ برقرار ہے۔ چین نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو سیاستدانوں نے جو آپ ادیبوں ہی کی طرح کند ذہن واقع ہوئے ہیں اعلان کر دیا کہ چین چنگیز اور ہٹلر کی طرح ساری دنیا کو روند ڈالنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ غلط ہے۔ اس حملے کی صحت کا راز جوتے کی معاشی اہمیت میں پوشیدہ ہے۔ آپ نے سنا ہوگا اور اگر بہت سی غیر ضروری باتوں کی طرح اسے بھی نہیں سنا ہے تو اب سنیے۔ چینی اپنے بچوں کے پاؤں کو لوہے کے تنگ جوتوں میں قید کر دیتے ہیں تاکہ ان کے پیر جسم کے دوسرے اعضا کی طرح نہ بڑھ سکیں۔ یہ حرکت ظالمانہ ہے۔ لیکن وہ اسے کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنے بچوں کے جوتوں کے مصارف سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں بلکہ ان کی کل سائز آبادی کا بڑا حصہ عمر بھر اسی سائز جوتوں میں گزر کر دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اپنے ملک کو جوتے کی قلت کے بحران سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ حال میں چینیوں نے جوتے کے قومی نشے کو عالمگیر پیمانے پر پھیلانے کا منصوبہ بنایا جس نے ہندوستان کو جنگ کی دھمکی دی ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان میں جوتے کی صنعت سب دنیا سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور چین اس سے فیض اٹھانا چاہتا ہے۔ اگر ہندوستان چین کو بیس بائیس کروڑ جوتے سالانہ دینے پر رضامند ہو جائے تو چین راہ راست پر آجائے۔ اس سلسلے میں حکومت کا فرض ہے کہ فوجی طاقت بڑھانے کے بجائے جوتے کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے پنج سالہ پلانوں کے منصوبے بنائیے۔

جوتے اور معیشت کا ایک دوسرا رخ سے بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی زرمبادلہ مرتب ہے لے کر

...تے سے بدل دیا جائے تو عموماً ساری دُنیا کے اور خصوصاً ہمارے مُلک کے اقتصادی مسائل حل ہو جائیں۔ ایک طرف چین
...ہے افلاس میں مبتلا ہو کر کراہنے لگے گا دُوسری طرف دولت کی مساویانہ تقسیم عمل میں آجائے گی۔ یہ نازک بات ہے۔ اسے
...سے سمجھئے آپ نے چور بازاری یا ذخیرہ اندوزی سے دس لاکھ روپیہ کمایا۔ اس کا سونا خرید لیا۔ زمین میں دفن کر دیا۔ یعنی
...لاکھ روپیہ جو قوم میں گردش کر کے ساری قوم کی قوت خرید میں اضافہ کرتا وہ بازار کے نقطۂ نظر سے مر گیا۔ اب فرض کیجیے آپ نے
...لاکھ روپے کے بجائے دس لاکھ جوتے کمائے ہوتے تو ان کو کہاں رکھتے۔ رکھ بھی لیتے تو حکومت سے کس طرح چھپاتے۔
...اگر چھپا بھی لیتے تو کرتے کیا؟ دُوسرے الفاظ میں آپ اتنے ہی جوتے کمانے پر مجبور ہو جاتے جتنے کی آپ کو ضرورت
...اس طرح ساری دولت یعنی سارے جوتے بازار میں چلنے پر مجبور رہیں اور معاشی ترقی یقینی ہے۔

فرائڈ نے اپنے جنسی فلسفے کی توضیح کے لیے بچے کی حرکات کا بڑی شد و مد سے بیان کیا ہے۔ میں بھی اپنے دعویٰ کی
دلیل میں اسی تکنیک پر عمل کروں گا۔ جوتے کی محبت انسان کے خمیر میں شامل ہے۔ اسی تکنیک پر آدمی طفولیت سے کھوت
...شعوری یا لاشعوری یا تحت شعوری پر جوتے سے چوکنا رہتا ہے۔ مثلاً آپ اپنا جُوتا اُتار دیں۔ بچہ فوراً اس کی طرف
...گا۔ بچے کی یہ بے اختیاری لپک میرے دعویٰ کا ثبوت ہے۔ اور آگے بڑھیے۔ عید کی چاند رات کا تصور کیجیے۔ کیسے ہی
...کپڑے کیوں نہ بنیں لیکن بچے پر وہ کیفیت طاری ہو گی جو ایک معمولی جُوتا پیدا کرے گا۔ بچہ اُسے سینے سے لگائے لیے
...سوتے وقت بھی اپنے آپ سے جدا کرنا پسند نہ کرے گا۔ یہ جوتے کی ازلی عظمت کا ثبوت ہے۔

مارکس کے مدّاح مارکس کے جوتوں کے سلسلے میں خاموش ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ مارکس کے دل کو کسی بوسیدہ جوتے
...لیں نے خون کر دیا ہوگا۔ اور اس نے اپنے پاؤں کے عزم کو اپنے تک ہی محدود نہ رکھا کر ساری دُنیا کے پیروں پر محیط کر
...آج بھی سچا مارکسی پشمینے کے کپڑے پہنے گا، کار کا فرنیچر استعمال کرے گا، اسکاچ کی بوتلیں منہ لگائے گا لیکن پیروں
...بیس آنے کی چپل پہنے نظر آئے گا۔

جوتے اور انسانیت میں بڑا گہرا تعلق ہے علمانے انسانیت کی تعریف میں بڑی بڑی باتیں بنائی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے
...جوتا ہی انسان اور حیوان میں حدِ فاصل قائم کرتا ہے۔ جو انسان جُوتا نہیں پہنے ہوتا وہ انسان سے دُور اور حیوان سے نزدیک
...ہے۔ اسی نکتے پر دُوسرے زاویے سے روشنی ڈالنے کے لیے مثال دیتا ہوں۔ آپ قیمتی سُوٹ پہنے ہوں لیکن اگر
...کے پاؤں ننگے ہیں یا ان میں پھٹے پرانے جوتے دھنسے ہوئے ہیں تو آپ کی شخصیت صفر ہو جائے گی اسی طرح آپ جیسے بھی
...کھُردرے کپڑے پہنے ہوں لیکن قیمتی جوتا آپ کی ذات کو وزن و وقار عطا کر دے گا۔ یہ بالکل سامنے کی اور سرسری
...بات ہے۔

انسان کو پیدا کی ہوئی دُنیاؤں میں ادب وہ دُنیا ہے جہاں جوتا اجام کی مقدس خدمت انجام دیتا ہے۔ رشید احمد
صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ اُردو شاعری کی اس آبرو یعنی غزل کا مطلع کیا ہے جوتے کا ایک جوڑا ہے
...بیت کی سول، قافیے کی شیپ، وزن کی ناپ، طرزِ ادا کا ڈیزائن، خیال کا چمڑا، زبان کی سیون کہیں بھی ایک ٹانکہ کا عیب...

ہو گیا کہ میں [illegible] منصف۔ پوری آزاد غزل کی پوری غزل گویا ایک گھر کے جوتوں کی الماری ہے جس میں غزل کے شعر کی طرح مختلف سائز اور رنگوں کے جوتے جگہ پاتے ہیں۔ نظم بھی اس مشابہت کی سعادت میں برابر کی شریک ہے۔ نظم کا ہر شعر ایک دوسرے سے منسلک ہوتا ہے اور پوری نظم کسی نکتہ یا خیال کو کاؤ کی شکل میں پیش کرتی ہے۔ جس طرح کسی ایک شخص کے جوتوں کی الماری اس شخص کی جیب اور ذوق کا ایک ہی نگاہ میں پول کھول دیتی ہے اسی طرح طویل نظم پورے گھر کے افراد کی ملی جلی الماری ہے جس میں مختلف کرداروں کے مختلف شائقوں کی "نشاندہی" ہوتی ہے۔

اس بے مثال تشبیہ و مشابہت کے باوجود ادیبوں نے جوتے کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو شاعروں پر بڑوں نے چاروں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ شاعر نے محبوب کے رخسار کو چاند سے اتنی مرتبہ اور اتنے پینتروں سے تشبیہ دی کہ بیچارہ چاند تک ماند ہو کر رہ گیا لیکن کسی جدید سے جدید شاعر نے جوتے کی طرف توجہ نہ کی حالانکہ زر بفت کے جوتے کو چاند اور محبوب کے رخسار دونوں سے بیک وقت تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ خدا نے رات بنائی انسان نے چراغ پیدا کر لیا۔ خدا نے پاؤں بنائے انسان نے جوتا بنایا۔ یعنی جوتا بہت آسانی سے فطرت پر انسانی فتح کی علامت ہو سکتا تھا لیکن شاعروں کے ہی تعصب نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ محبوب کے بدن پسینے اور زلف کی خوشبو سے پھول، نسیم، مشک اور عنبر سے آگے نکل گیا لیکن کسی بد ذوق کو نئے کوارے جوتے کے چکنے چمڑے سے اٹھتی ہوئی مدھم میٹھی اور زندہ مہک سے محظوظ ہونے کی [illegible] ہوئی ہو سکتا ہے کہ ان بیچارے شاعروں کو کبھی نیا جوتا ـــــ پہننے ہی کی توفیق ہی نہ ہوئی ہو۔

جس طرح جوتا زمانے کے ساتھ ساتھ نئی نئی شکلیں اختیار کرتا ہے اسی طرح ادب بھی نئی نئی صورتوں میں اجاگر ہوتا ہے۔ محل کے زر دوز بیگم شاہی جوتوں نے غالب اور آتش کی مرصع اور نگینہ ساز شاعری کو جنم دیا۔ آج موزیکوں کی طرح پتلی ڈال والے تسمہ بند جوتوں نے بیجڑی نظموں اور غزلوں کا استعمال عام کر دیا ہے۔ یہ نئے جوتے رفتار کی ایسی تربیت کرتے ہیں۔ شاعروں کی رفتِ تخلیق پر انجذیہ کرتے ہیں اور نیا ادب نمو پاتا ہے۔

ہمارا ملک یورپ نے ایسے جوتے ڈیزائن کر لیے ہیں جو سے انفرادیت کے عاشقوں کی پیٹ بھر کر تسکین ہو سکے گی۔ یعنی ان جوتوں کو پہننے کے لیے پیروں کے آپریشن کرانا پڑیں گے۔ انگلیوں اور ایڑیوں کو جڑوانا پڑے گا۔ پھر جوتے اس حد کمال میں کوئی ایسی خاص تکلیف بھی نہ ہوگی۔ مختصر سی اذیت کے بعد (جو انفرادیت کے سودے میں مہنگی نہیں سستی ہے) ایسے بے نظیر جوتے پہنے جا سکیں گے جو عام مذاق رکھنے والوں کو میسر نہیں آ سکتے۔ مجھے توقع ہے کہ ان جوتوں سے متاثر ہو کر ایسی نظمیں اور غزلیں وجود میں آئیں گی جن کے کہنے کے لیے زبان کی خاص تراش اور سننے کے لیے سماعت کی مخصوص ڈیزائن رواج پائے گی اور ادب جوتوں کے نقش قدم پر چل کر نشو و نما کر سکے گا۔

---

* عام طور پر اردو کے نقاد [illegible] شاعری بتاتے ہیں۔ راقم الحروف اس طرح کے پیوند کا تتبع کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ادب کا افرت سے کیا تعلق ہے لیکن جوتے کا ہے۔ ہماری کمپنی کی مشرقی برانچ کے مسلمان ممبر نے ایسے جوتے وضع کر لیے ہیں جنہیں پہن کر مُردے پُل صراط سے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے بخیر و خوبی گزر سکیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ ادیب اس خاص ضمن میں بھی جوتے کی ترقی سے فیض اٹھانے کی کوشش کریں۔

ابھی کہنے کو تو بہت سی باتیں باقی ہیں لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ اس ادبی اجتماع میں مزید جوتے کا ذکر چلے۔ اس لیے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے بڑے سکون اور خلوص کے ساتھ میرا خطبہ سنا۔

"ہال" دیر تک تحسین و آفرین تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونجتا رہا۔

قاتل

اشفاق احمد

یہ دُوسری بار تھی جب اُس نے عدالت کا مُنہ دیکھا۔

محمد سلیم صحت مند اور شریف نوجوان تھا اور اُس نے ایف۔ اے کا امتحان ہائی سیکنڈ ڈویژن میں کیا تھا۔ وہ یقیناً بی۔ اے بھی پاس کر لیتا اگر اُس کی ماں بیوہ نہ ہوتی اور اُن کی دس کلّے زمین چونگ میں اور مکانوں کی ایک کٹڑی اچھرے میں نہ ہوتی۔

ایف۔ اے کے بعد محمد سلیم نے کٹڑی کے بڑے دروازے میں بیٹھ کر اپنے کرایہ داروں کے ساتھ لُوڈو کھیلنا شروع کر دی۔ پھر محلے کے لڑکوں کے ساتھ دوپہر کو کوٹھڑی میں سونے لگا اور آہستہ آہستہ قبرستان کی مسجد میں جا کر نہانے اور عصر کی نماز پڑھنے لگا۔

اپنے ساتھ چوسر کھیلنے والے ہر شخص سے اس کی ایک ہی شرط ہوا کرتی کہ وہ اذان ہوتے ہی کھیل بند کر دے گا اور اس کے ساتھ مسجد میں جا کر چار رکعت فرض ادا کرے گا۔ بہت سے کھلاڑی بھاگ گئے تھے اور جو کچھ باقی رہ گئے تھے وہ کپڑے ناپاک ہونے کا بہانہ کر کے اُسے چھوڑ دیا کرتے تھے۔

محمد سلیم کی والدہ اپنے اکلوتے بچے کے لیے بیویاں تلاش کر رہی تھی۔ اب تک اُس نے تین لڑکیاں چُنی تھیں۔ ایک دولتمند تھی اور اُس کے باپ کی مرادیں اور رچیاں پچی تھیں۔ دُوسری خوبصورت تھی اور اُس سے کسی کی نظریں نہ ہٹتی تھیں۔ تیسری صحت مند چوہڑ ٹیار تھی جو نسل کشی کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کی گردن چھوٹی تھی اور کندھے چوڑے، کمر تنگ تھی اور سُرین فربہ۔ اچھا دنی جوان اُس کے کولہے پر پاؤں جما کر کوکھے میں سے جنگلی کبوتروں کے بچے نکال سکتا تھا۔ لیکن اس سے محمد سلیم کی شادی نہ ہو سکی۔ وجہ اس کی صرف اس قدر تھی کہ محمد سلیم کی بیوہ ماں یکے بعد دیگرے ان تینوں سے اپنے بچے کی شادی کرانا چاہتی تھی اور اپنی کم اولادی کی کمی پوری کرنے کی خواہش مند تھی لیکن محمد سلیم اس بات پر رضامند نہیں ہوتا تھا اور لڑکیاں ایک ایک کر کے نکلنے کے قریب تھیں۔

ان کا جدی رہائشی گھر گو کٹڑی سے بالکل باہر تھا لیکن اس کے ماتھے کی دیوار کٹڑی کی فصیل کے ساتھ لگی تھی۔ ملحقہ دیوار کے ساتھ والی کوٹھڑی میں شامون رہتی تھی جو عورتوں کے اندرونی امراض کا علاج کرتی تھی اور جس کے پاس ڈیوٹی سے فارغ ہو کر سپاہی لوگ سویا کرتے تھے۔ شامون چونکہ ذات کی [illegible] تھی۔ اس لیے ہاتھ میں کڑا پہنتی تھی۔ سر پر تیلہ دوپٹہ لیتی تھی اور پیروں میں لال رنگ کی زری کی جوتی پہنتی تھی چونکہ اکتیس سال کی تھی اس لیے آنکھوں میں سُرمہ ڈالتی تھی اور ہونٹوں پر دنداسہ ملتی تھی۔ شباب اس پر حرام تھا اس لیے وہ [illegible] اور آئی ہوئی پلٹن کی پکی ہوئی تھی شہر میں گشت کرتی تھی اور سپاہیوں کو بھی دو گھونٹ پلواتی تھی۔

تین سال کے مسلسل تقاضے کے بعد جب شامون نے محمد سلیم کو کرایہ کا ایک پیسہ بھی نہ دیا تو سلیم نے تاؤ میں آ کر اس کی کوٹھڑی

کے بالوں سے چوٹی سے پکڑ لیا اور تین جھٹکے دے کر ایک دھجیاں اس زور کا اس کے کندھے پر مارا کہ اس کی آنکھوں کا بجلا سپنولیوں کی طرح باہر نکل کر سفید ٹھنڈے اور خوشبودار گالوں پر سو گیا۔

تیسرے دن محمد سلیم پر استغاثہ زیر دفعہ ۵۰۹/۲۹۴ ہو گیا۔ وارنٹ جاری ہوا تو بیوہ ماں بچھاڑ کر گر پڑی۔ ماموں مُسلم ٹاؤن سے بھاگا آیا۔ بگڑی دوست ڈاکٹر عزیز نے ضمانت بھری۔ کٹے کوٹ والے سلطان خان نے عدالت سے استغاثے کی نقل حاصل کی تو محمد سلیم کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ مرقوم تھا:

جناب عالی۔ مستغیثہ حسب ذیل عرض پرداز ہے

مکان ہر دو فریقین ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں بلکہ ایک دیوار مشترکہ رکھتے ہیں' بوجہ موسم گرما فریقین اپنے اپنے کوٹھوں پر رات کو سوتے ہیں۔ مستغیثہ باعزت بیوہ ہے۔ ملزم صبح اُٹھ کر اپنے کوٹھے پر مستغیثہ کی جانب منہ کر کے ہر روز بہ نیت توہین شرمساری مستغیثہ برہنہ ہو کر پیشاب کرتا ہے جس سے شرمساری کی توہین ہوتی ہے۔ چنانچہ کل صبح کو ملزم مذکورہ اسی طرح پیشاب کر رہا تھا۔ مستغیثہ کے منع کرنے پر فحش گالیاں بہ نیت توہین بالقصد دینی شروع کر دیں۔ لہذا استدعا ہے کہ ملزم کو سزائے قانونی دی جائے۔

فدویہ: شامون بیوہ برپال مذہبی ساکن کٹڑی گھتیاں

پیر غازی روڈ۔ اچھرہ۔ لاہور

جب محمد سلیم حاضر عدالت ہوا تو اس کا سارا وجود پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور اس کے حلق میں ٹھنڈی قلفی کا ٹکڑا اٹکا ہوا تھا۔

لیکن اس سارے واقعے کا محمد سلیم کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں یہ محمد سلیم کی اصل کہانی نہیں۔ یہ تو اس واقعے کا مذکور ہے جب اس نے پہلی بار عدالت کا منہ دیکھا۔

محمد سلیم صحت مند اور شریف نوجوان تھا اور متوسط درجے کی امیر بیوہ کا پوت ہوتے ہوئے بھی اس کے صرف ایک عورت سے تعلقات تھے اور ان تعلقات سے دونوں فریق خوش تھے۔ محمد سلیم کو تھوڑی سی آسودگی میسر آ جاتی اور دوسرے فریق کو تھوڑی سی مالی فراغت۔ اس بات کا علم اردگرد کے کچھ لوگوں کو تھا لیکن کسی نے اس معاملے پر خصوصی توجہ نہ دی تھی۔

ایک رات کوئی ڈیڑھ بجے کا عمل ہو گا کہ اچانک محمد سلیم کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے بائیں بازو میں کچھ عجیب طرح کا درد ہو رہا تھا۔ اس نے رات کی خاموشی میں پوری توجہ بازو کی طرف دے کر ایک لمحے کے لیے رگ پٹھوں میں دھڑکن سی سُنی اور پھر یہ دھڑکن معدوم ہو گئی۔ پھر اچانک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیز دھار آلہ اس کے ہاتھ پیر کو کاٹتا ہوا کہنی کے راستے نکل گیا ہے۔ محمد سلیم نے فوراً [illegible] کے سرہانے سے کھینچ لی۔ وہ لڑکی ہڑبڑا کر اُٹھی اور پھر محمد سلیم سے چمٹ گئی۔

سلیم نے کہا: "میرے بازو میں درد ہو رہا ہے۔"

لڑکی نے بازو کی مٹھیاں بھرتے ہوئے کہا: "میں منہ کالا ہو اس پر سو رہا ہوں۔"

"نہیں۔" محمد سلیم نے کہا: "تم آج کوئی نئی حرکت کی سوچ رہی ہو۔ یہ لڑکی اور شے تھی۔ کوئی خوفناک سی شے۔"

خوفناک شے کا نام سن کر لڑکی زور سے ہنسی اور اس کے قہقہے برآمدے سے کمرے تک گونجے۔ "مجھ پر یا

ہے جی؟"

"نہیں۔" لڑکی نے اس طرح ہنستے ہوئے کہا: "تو سو جا رہ۔"

جب وہ سو گیا تو سلیم نے تھوڑی دیر بعد کہا: "اگر میرا ہاتھ بیکار ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟"

لڑکی پھر ہنسی اور کہنے لگی: "دیکھا تیرے دماغ سے گرمی نہیں نکلی۔ اس لیے تجھے بُرے بُرے خیال آتے ہیں۔" پھر اُس

نے جھک کر سلیم کے بازو میں پولے پولے دانت گڑ دیے اور سلیم اس کا سر تھپتھپانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد محمد سلیم کے دماغ کی گرمی نکل گئی اور رات ذرا سی اور خنک ہوئی تو لڑکی نے پوچھا۔ "بتاؤ اب بھی

درد ہو رہا ہے؟"

"اُوں ہوں۔" سلیم نے سر ہلا کر کہا۔

"پھر؟"

"پھر کیا۔" سلیم نے کہا: "اس میں تمہارا کیا کمال ہے۔ درد کو ختم ہونا تھا ہو گیا۔"

"واہ جی! ہمارا کوئی کمال نہیں۔" لڑکی بولی اور پھر جیسے رُوٹھ کر خاموش ہو گئی۔

صبح جب وہ تینوں چائے پینے لگے تو لڑکی نے کہا: "اشرف پتہ ہے رات سلیم کے بازو میں کتنا درد اُٹھا؟"

اشرف نے توس کھاتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ تو میں نے کوئی گھنٹہ بھر اس کی مالش کی ورنہ یہ تو کسی اور ہی وہم میں ڈوب رہے تھے۔"

اشرف ہنسا اور محبت بھری نظروں سے سلیم کو دیکھ کر بولا: "بازوؤں میں تو درد اُٹھتا ہی رہتا ہے اس میں وہم بے

وہم کی کیا بات تھی۔"

سلیم نے کہا: "کچھ نہیں بس یونہی خوف سا طاری ہو گیا تھا۔"

"اور اب؟" لڑکی نے پوچھا: "اب تو کوئی خوف نہیں کسی قسم کا؟"

"اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ میرے بازو میں درد اُٹھا بھی تھا یا نہیں۔"

وہ چائے پیتے رہے، گھر میں گھومتے رہے اور ایک ایک کر کے کپڑے بدلتے رہے۔ لڑکی نے اشرف کے جوتے پالش کیے

سلیم نے اپنے چپلوں پر برش پھیرا۔ لڑکی نے اپنے پاؤں کے ناخنوں کو نمکس سے رنگے۔

پھر اشرف دفتر چلا گیا اور سلیم اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اور لڑکی پلاسٹک کا تھیلا لے کر سبزی، چائے اور گوشت

ریسنے کے پیدا شش و رکت معاذ ہو گئی۔

لیکن اس بات کا بھی محمد سلیم کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ہے تو صرف اسی قدر کہ اس کے بازو میں پہلی مرتبہ درد اٹھا تھا۔

ایک شام محمد سلیم قبرستان کی چھوٹی مسجد میں عصر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ پہلے سجدے سے اٹھتے ہوئے اسے ذرا سی تکلیف محسوس ہوئی اور
اسرے سجدے پر وہ لاکھ کوشش کے باوجود اٹھ نہ سکا۔ بائیں پھیپھڑے میں کچھ عجب طرح کی ٹیس اٹھی اور وہ اوندھے منہ صف پر
بٹ گیا۔

جب دل کی دھڑکن قدرے نارمل ہوئی اور ماتھے پر زور کا ٹھنڈا پسینہ آیا تو سلیم نے آخری مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش کامیاب
ہی اور وہ آہستہ آہستہ چل کر مسجد کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ سب ٹھیک تھا۔ اس نے دو مرتبہ
نی ہتھیلیوں کو ملا اور چپل پہن کر مسجد سے باہر نکل گیا۔

اس کے جگری دوست ڈاکٹر عزیز نے کچھ گولیاں وٹامن کی ایک بوتل دودھیا تیل کی اور بلا ناغہ سات ٹیکے دیے۔ ان سے
یرا فاقہ ضرور ہوا لیکن نہ اس قدر کہ بیماری کا خوف اس کے دل سے دور ہو جاتا۔

محمد سلیم کو ہسپتال میں داخل ہوئے پورے پندرہ دن ہو چکے تھے اور اس کا ہر طرح کا ٹیسٹ ہو رہا تھا لیکن بازو میں درد کے اسباب
ستے تھے۔ ایک شام جب تکلیف میں بے حد اضافہ ہو گیا اور ہاؤس سرجن نے درد روکنے کو Pa the de ne e ne e کا ٹیکہ دیا تو
لیم نومولود بچے کی طرح سفید تکیے پر سر رکھ کر گھوک سو گیا۔ ہاؤس سرجن بڑی دیر تک اس کی پائنتی پر بیٹھا اس کے تنفس کا جائزہ لیتا
ا۔ اس کی چھاتی چھاج کی طرح اوپر اٹھتی تھی اور پھر اسی طرح نیچے بیٹھتی تھی۔ کوئی تین ساڑھے تین کا پھیلاؤ ہوگا۔ ہاؤس سرجن کو اس صحت مند
جوان پر بہت ہی ترس آیا۔ وہ بڑی دیر تک اس کے چہرے کے خد و خال اور اس کی شکل و شباہت کو بغور دیکھتا رہا پھر اچانک اس کے
ہن میں ایک خیال آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ سلیم کے سرہانے گیا۔ اس کے بازو کو چھو کر اپنے آپ سے کہنے لگا یہیں ہے یقیناً اسی
لہ پہ ہے۔

دوسرے دن ڈاکٹر شفیع نے ڈاکٹر عزیز کو ہسپتال بلایا اور اپنے پیارے شاگرد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا: عزیز یہ
مارا دوست ہے؟

عزیز کا چہرہ خوف سے بیرنگ ہو گیا اور اس کی آواز حلق کے اندر ہی رہ گئی۔

"لیکن خیر" ڈاکٹر شفیع نے کہا: اس سے کیا ہوتا ہے اگر یہ تمہارا دوست نہ بھی ہوتا تو بھی میری تشخیص یہی ہوتی۔"

عزیز نے کہا "سر ڈو یو سسپیکٹ ......"

" m a a a o o m a a a m o m a a m a " ڈاکٹر شفیع نے دھیرے سے کہا اور مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ
یں دکھ اور حقیقت کی تلخی جڑ نواں پتوں کی طرح گلکاریاں اور ہے تھے۔

ڈاکٹر عزیز نے کہا: تو پھر سر ... میرا مطلب ہے ... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ اس کو ہوا کیسے؟"

"[illegible] کی بات ہے" ڈاکٹر شفیع نے کہا۔ "بس ہو گیا۔ اور جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب کوئی کر بھی کیا سکتا ہے کیوں

[illegible]

"ہاں" ڈاکٹر عزیز نے سر ہلا کر کہا "ہم کیا کریں؟ کیا یہ زندہ نہیں رہ سکتا؟"

"اوہ" ڈاکٹر شفیق گھبرا کر بولے "ڈاکٹر... عزیز تمہاری ڈسپنسری پر کتنے مریض آتے ہیں ہر روز؟"

ڈاکٹر عزیز نے کہا "یہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہے اور پھر یہ میرا اکلوتا دوست ہے اور ڈاکٹر صاحب... ممکن ہے آپ کی تشخیص غلط ہو؟"

"خدا کرے.... خدا کرے..... خدا کرے" ڈاکٹر شفیق نے یوں کہا جیسے کسی نے عجائب گھر میں رکھے ہوئے کانسی کے گھڑیال پر ہاتھ مارا ہو۔

"اب یہ کیسا ہے؟" ڈاکٹر عزیز نے پوچھا۔

"کچھ نہیں افیم پر ہے۔ مارفیا کا ٹیکہ دے کر سلا دیتے ہیں" ڈاکٹر شفیق نے کہا "اور جب ٹیکے کا اثر کم ہوتا ہے تو......"

اتنے میں ایک چیخ بلند ہوئی اور کچھ گلاس فرش پر گرے اور بستر کے سرہانے تڑپے۔ ٹیکے کا اثر کم ہو گیا تھا اور محمد سلیم تڑپ رہا تھا...

جب اس شریف نوجوان کو اس طرح تڑپتے ایک مہینہ اور دس دن گزر گئے تو اس نے اپنے مسلم ٹاؤن والے ماموں کو کسی طرح منا لیا۔ وہ اس کے لیے چالیس گولیاں خواب آور دوا کی پیس کر اور پڑیا میں باندھ کر ہسپتال لے گئے اور جب سلیم نے ان کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ پڑیا لی تو وہ دیر تک ان کے دونوں ہاتھ ایک عقیدت مند مرید کی طرح چومتا اور ان کی انگلیاں نوسر بڑھیا کی طرح سے چوستا رہا۔ اور جب اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو اس کے ماموں دھاڑیں مارتے وارڈ سے باہر نکل گئے۔

اگلی صبح جب ربڑ کی نلکیاں ڈال کر اس کا معدہ دھو دیا گیا اور اسے طمانچے مار مار کر کافی پلائی گئی تو اس نے آنکھیں کھول کر عزیز کی طرف دیکھا اور کہا: "تم بھی عزیز!" اور ڈاکٹر عزیز جو واقعی اچھا خاصا ڈاکٹر تھا رو پڑا۔

ڈاکٹروں کے بورڈ نے اس کے بستر کے گرد گھیرا ڈال کر یکے بعد دیگرے یہی بات کہی کہ ہم جانتے ہیں تم تکلیف میں مبتلا ہو اور ایسی باتیں اس مرض کے مریضوں سے اکثر سرزد ہوتی ہیں لیکن ڈاکٹر جان دینے والے ہوتے ہیں لینے والے نہیں۔

محمد سلیم نے کہا: "ڈاکٹر صاحب کاش آپ نے اس بیماری کی تکلیف کو کتابوں میں نہ پڑھا ہوتا بلکہ ایک ثانیے کے لیے اس میں سے گزرے ہوتے تب آپ کو اندازہ ہوتا۔"

ڈاکٹر گھوش نے کہا۔ "ہاں ہم ڈاکٹر ہیں قاتل نہیں ہیں آخری دم تک کوشش کریں گے۔"

"کیا آپ کے پاس اس کا کوئی علاج ہے؟" ڈاکٹر عزیز نے جوش سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں" سلیم نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے مجھے کیا ہے اور جو کچھ مجھے ہے اس کا کوئی علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا"

پھر اشرف اور اس کی بیوی وارڈ میں آ گئے اور ڈاکٹر لوگ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے چل دیے

[illegible] اشرف کی بیوی کو دیکھا جس نے اپنے بیگ سے ایک شیشی کانپتے ہوئے ہاتھ سے نکالی اور اُسے [کی] طرف بڑھایا۔ نرس نے چیل کی طرح دبوچ کے ایک جھپٹا مارا اور جیسے ٹیکا کرتی ہوئی وہ شیشی لے کر دوسرے کونے میں چلی گئی۔

اس کے بعد اشرف اور اس کی بیوی کا وارڈ میں داخلہ ممنوع ہو گیا۔

سلیم کو باوجودیکہ دواہیں کئی کئی ٹیکے اور غیار کے کم ہو جاتے تھے لیکن ۔۔۔ اس کی تکلیف میں کمی نہ ہوتی تھی نہ اُسے نیند آتی تھی نہ [اُس] سے بیٹھا جاتا تھا۔ زبان کٹ کٹ کر قیمہ ہو گئی تھی۔ سر آہنی پٹیوں سے ٹکرا ٹکرا کر لہو لہان رہتا تھا۔ اس پر بھی اُسے زندہ رکھنا ضروری تھا [کیونکہ] ایک پڑھے لکھے آدمی کی جان لی نہیں جا سکتی۔ لی نہیں جانی چاہیے۔ لینے کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر ملہوترہ نے اسے آپریشن ٹیبل پر لٹا کر اس کے ماموں سے کہا۔ "ڈاکٹر کا کام زندہ رکھنا ہے ڈاکٹر کی ہر حرکت اسی کوشش پر [خت]م ہوتی ہے کہ زندگی نہ زندگی ختم نہ ہو۔ ہم لوگوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں آگے اس کی مرضی۔"

"اس کی مرضی کا ہمیں تو پتہ بھی نہیں تھا۔" ماموں نے کہا اور ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر کے دروازے بند کر لیے۔

کوئی دو بجے کے قریب تام چینی کی بالٹی میں محمد سلیم کا کٹا ہوا بازو اس کے ماموں اور اس کی ماں کے سامنے لایا گیا اور دونوں [ایک] دوسرے سے بغل گیر ہو کر دھاڑیں مارنے لگے۔

ڈاکٹر گھوش نے کہا: "اگر آپ یہ بازو ہمیں مطالعے اور معائنے کے لیے دے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"اور اگر آپ چاہیں" ڈاکٹر شفیع نے کہا: "تو آپ اسے لے جا کر دفن بھی کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کی ملکیت ہے۔"

محمد سلیم کی ماں نے روتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے کہا "تم لے لو۔ تم رکھو۔ ہمیں کیا لینا ہے اس بازو سے۔ ہمارا [بیٹا] تو بستر پر لیٹا ہے۔"

بازو کٹنے کے بعد سلیم کے چہرے پر سرخی دوڑنے لگی۔ درد غائب ہو گیا اور پندرہ دن بعد جب اس نے حجام کو بلا [کر شیو ب]نوائی تو نرس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

پورے پینتیس دن بعد جب وہ ہسپتال سے نکلا تو ڈاکٹروں نے اُسے گھیر کر کہا کہیں سلیم صاحب ڈاکٹر قاتل ہوتا ہے یا مسیحا؟ [سلی]م کا سر شرم سے جھک گیا۔ ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور تھوڑی دیر کے لیے خالق اکبر کو دل ہی دل میں مسکرا کر [یا]د کیا۔

اسی رات اشرف کی بیوی نے سلیم سے کہا: "توبہ! تمہاری چھاتی تو پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئی ہے۔"

سلیم نے کہا: "دیکھا پھر یوں ہوتے ہیں یاروں کے جٹ پٹے۔" لڑکی ہنسی اور اس کے کٹے ہوئے ٹنڈ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

لیکن محمد سلیم کی اصل کہانی یہ نہیں۔ ہاں اُس کا ایک رشتہ ضرور اصل کہانی سے بندھا ہے۔

چھ ماہ بعد جب محمد سلیم نے سعدی کنسٹرکشن بیچ کر اپنے پر لگا دی تو اس کی ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے خلاف ایک اشتہار [اخ]بار میں نکلوایا کہ محمد سلیم ولد عبدالکریم کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اُسے متوفی عبدالکریم کی جائیداد پر کسی قسم کا حق نہیں اس لیے جو [کو]ئی محمد سلیم ولد عبدالکریم سے لین دین کرے گا وہ نفع نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا۔

[illegible]

مریضے کے پیچھے خفیہ فروشوں سے خرید سکتا

ایک بار وہ ہاتھ لے کر پہنچا تو اس کے پیچھے پولیس [illegible] کر گرفتار [illegible] سامنے محلے کے لوگ آن فوراً ہی جمع ہو گئے۔ بیوہ ماں نے کہا اسے حوالات میں [illegible] اور تب [illegible] ٹنڈے کی [illegible] دل تھا نے لے گئے۔ حوالات میں تین چار تھپڑ اور سپاہیوں نے دو دو جوتے مار کر چھوڑ دیا اور وہ گھومتا گھامتا بینڈن روڈ پہنچ کر بجلی کی دوکانوں کے پھٹوں پر لیٹ رہا۔ یہی اُس کا اڈہ تھا اور یہیں وارڈ کے لوگ جانتے تھے۔ ایک ہیروئن فروش نے تین ٹیکے مُفت لگانے کی منت مانی تھی۔ اس کا بڑا لڑکا ٹائیفائیڈ سے اُٹھا تھا اور اب خطرے سے باہر تھا۔ پھٹے پر اس کو لیٹے ہوئے دیکھ کر اس نے پُوچھا: میاں طلبی ہے؟

"طلبی حضور طلبی" محمد سلیم گڑگڑا کر بولا۔

"نکال ران" خبیر آدمی نے کہا۔

محمد سلیم نے ران ننگی کر دی اور اس نے لٹھے کے پائجامے پرے جس پر پیشاب، لہو، دھات اور کیچڑ کے داغ لگے تھے سوئی اندر گھسیڑ دی اور محمد سلیم نے اس کے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیے۔

بس کچھ ایسا ہی موسم تھا۔ سردیاں آہستہ آہستہ آ رہی تھیں اور گرمیاں جا چکی تھیں۔ کچھ لوگ اندر سونے لگے تھے اور کچھ ابھی باہر سوتے تھے۔ محمد سلیم لوٹ سے تڑپ رہا تھا۔ اُسے ٹیکے لگے پُورے چار روز ہو چکے تھے اور آج پانچواں دن جا رہا تھا۔ مال میں کمی کی وجہ سے خفیہ فروشوں نے ٹیکے کے دام بہت چڑھا دیے تھے۔ محمد سلیم اپنے ٹنڈے سے ڈاڑھی کھجاتا بینسن روڈ کے چکر کاٹ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ دوکانوں کی بتیاں گل ہونے لگیں۔

بوڑھا پارسی کرسی سے ٹیک لگائے میز کی طرف پُشت کیے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کیلنڈر لٹک رہا تھا اور وہ ہوا میں انگلی لہرا لہرا کر تاریخوں کو شمار کر رہا تھا۔

محمد سلیم چیتے کی سی پھرتی سے اندر داخل ہوا اور اپنے ایک ہاتھ سے کانی دار کا ایسا کچوکا اُس کے پیٹ میں مارا کہ بڈھے نے اُسے تک نہ کی۔

پھر اُس نے ڈھلکی ہوئی گردن والی گرم لاش کی جیب سے چابیاں نکالیں اور تجوری کھول کر سو کا نوٹ لے بھاگا۔ بینسن روڈ پہنچ کر اس نے ایک ساتھ دو ٹیکے لیے اور آرام سے پھٹے پر لیٹ گیا۔

یہ دُوسری بار تھی جب اُس نے عدالت کا منہ دیکھا۔

اور عدالت نے محمد سلیم ٹنڈے کو پھانسی کی سزا دے دی۔

اے روشنیوں کے شہر

منظور الٰہی

ملک ایئرپورٹ پر جمع ہو گئے تھے، عزیز و اقارب، دوست احباب، فوجی اور سویلین، بارات بن گئی تھی، صرف دُلہا کے آنے میں دیر تھی۔ یُوں بھی آج شہر میں جگہ جگہ منقّش سائبان اور قناتیں لگی تھیں، ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے تھے، گلابی جاڑے تھے، ت سے لوگوں نے شادیاں رچائی تھیں۔

حسبِ معمول ڈھاکہ سے فلائیٹ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے آ گئی۔ . . . . وہ طیارہ جسے فضا میں دیکھ کے ۔ تالیاں بجاتے تھے آج اُس پر نظر پڑتے ہی کلیجہ منہ کو آرہا۔

جب جیٹ طیارہ ایک مہیب پرندے کی طرح چیختا ہوا ٹار میک کی سطح کے متوازی ہو گیا تو دل سے بے اختیار نکلا

ساربان آہستہ راں کآرام جان در محمل است

شمارے کے بعد جب طیارے کراچی میں نانی اماں کے مکان پر سے پرواز کرتے تو وہ ہمیشہ کہہ اُٹھتیں۔

"تمھاری خیر، سب مسافروں کی خیر،

جن ملکوں میں تم جا رہے ہو اُن کی خیر"

ان دعاؤں میں سادگی اور نیکی جھلکتی تھی، آج ایک طیارہ مشرقی پاکستان کے ذخّار دریاؤں پر سے اُڑتا ہوا اُس کے سنہرے کھیتوں کو پاٹتا ہوا اُن کے پوتے کا جسدِ خاکی لا رہا تھا (خدا کی امانت ارضِ مغرب میں سپردِ خاک کرنے کے لیے) بیوی کا لُٹا سہاگ، بہنوں کی آنکھ کا بے نور تارا، بچوں کا خاموش باپ، وہ ایک بے حد شفیق باپ تھا، ایک فیاض اور نیک دل خاوند، ایک ہنس مکھ دوست، بچوں سے گھل مل جانے والا، اُن کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں برابر کا شریک، انھیں پکنک پہ لے جانے والا. . . . . . . یہ اُس کی شفقت تھی کہ صبا اور نیلی جب اُس کے بستر میں سو جاتیں تو رات گئے، سونے سے پہلے وہ خود انھیں اپنے اپنے بستروں میں لٹاتے، پارسال جب احمد چند ہفتے کے لیے امریکہ گئے تو میں نے صفیہ سے پوچھا تھا. صبا اپنے پاپا کو بہت miss کرتی ہوگی؟ تو صفیہ نے [illegible] کبھی ضد بھی کرتی ہے۔ آج جو صبا کہتی ہے پاپا کہاں ہے تو اُس سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا۔ بیٹے تمھارے پاپا کہاں نہیں گئے، وہ اب دُوسرے جہان میں ہیں، تم انھیں کبھی نہ دیکھ پاؤ گے، وہ دُور دیس چلے گئے، بہت دُور، انسانی دسترس سے دُور. . . .

لیکن اُس کے لیے آج کا سفر ایک گام سے زیادہ نہ تھا، اُس میں تکلیف تھی نہ کشمکش، چند لمحوں میں وہ زندگی کی جہد و جہد سے آزاد ہو چکا تھا، وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات، دُنیا کے دھندے کہاں ختم ہوئے تھے، بچوں کی تعلیم ابھی نامکمل تھی، اُن کے کیریر کی پلاننگ نہ ہوئی تھی، ابھی مستقبل تنہا کرتا تھا، اُس میں رنگ کہاں بھرے تھے، لیکن اُس کی زندگی کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ آفتاب نصف النہار پہ تھا کہ گہنا

گیا وہ اپنے عروج پر تھا کامت کی نسوانی بخشش تھی۔ میرا پچھلا سکنجہ میں ہی ہو جل رہے تھے [illegible]
اپنے پیارے سب ساحل پہ رہ گئے، حیات و ممات کے درمیان ایک پل [illegible] کا [illegible] کے بچھڑ جانے کا [illegible] ازل سے
ابد تک کے SPECTRUM کو دریافت کر لیا تھا۔ ایک پھر دار شمت کے دروازے کا قیدی تھا

میں فرصت ہو کر نکلی تھی، آہ! وہ! اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، جانے سے اتنے پہلے وہ میرے بیٹے کا سہارا لیے تھی کہ جسے میں نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میرا بچہ! [illegible] کی خوشی چند منٹ میں ختم ہو جانے کا قصہ سن کے خبر کہتے ہیں [illegible] اس کے دل کی کو [illegible] سکتا تھا۔ [illegible] بہت دیر وہ سمجھ نہ سکی کہ یہ سب کچھ کیونکر ہو گیا، وہ رو رو کے ہر کسی کو ایک ہی جواب دیتی، مگر مجھ کو تو نہیں ہوا تھا، مگر مجھ کو تو نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ حسرت و یاس کی تصویر بن گئی، [illegible] تھا، روئے پیٹنے کے سبب حس کا فقدان تھا، محبت کی طرح بے حال تھی اور تصویر کی طرح خاموش، مجھے شاعر نے ٹھیک ہی تو کہا تھا

میرا ما بجا ! ہوا جٹ گڑ سے

اور میرے سر دا چھت گرے

آج وہ چھت اوپر آن رہی تھی، جیسے وہ بے آسرا ہو گئی ہو، تو تنہا، آج گھر کی کار کا راج ختم ہوا، بچوں کے لیے شفقت کے چشمے خشک ہو گئے، دنیا بھر کی نعمتیں بھی میسر ہوں تو اس خلا کو کوئی نہیں پاٹ سکتا، احساس محرومی دل پر شب خون مارتا رہے گا۔ لیکن کوئی کسی کا غم بانٹ سکتا ہے، کوئی سہارا دے سکتا ہے۔ بس عزیز دور کھڑے ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں، جسم پہ گزر جاتی ہے وہی مر مر کے جیتا اور جی جی کے مرتا ہے صبر و ایام کسک کم ہو جانے کی لیکن یہ گھاؤ ذرا بھرے گا، جب بھی کوئی غم ہوگا ——— اپنا یا پرایا ——— تو یہ زخم ہرا ہو جائے گا۔ اس طویل اندھیری رات میں روشنی کی کرنیں تو ہوں گی (زندگی کبھی تہی دامن نہیں ہوتی) لیکن پہلا سا روز روشن لوٹ کے نہ آئے گا۔

اس ماتم کدے میں میری نظریں اس ماں کی زیارت کی متمنی تھیں جس نے احمد ایسا بیٹا جنا تھا، میرا جی چاہتا تھا کہ ان سے لپٹ کے خوب روؤں۔ لیکن جب وہ آنسوؤں ...... میں نہائی ہوئی۔ میں اپنے لال کے صدقے۔ کہتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہو گئیں جہاں تابوت رکھا تھا تو میری ہمت نہیں پڑی اور میں نے ایک کونے میں جا کر دونوں ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لیے۔ ان کے غم کے سامنے میرے غم کی کیا حیثیت تھی، کیا مقابلہ تھا! جیسے چند گھنٹوں میں چند [illegible] کا منظر تھی، احمد کے بچپنے میں جب کہ بھائی اس نے بیوگی میں پالے تھے اور پرورش بھی ایسی کی کہ دنیا عش عش کر اٹھی، اس نے زندگی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے، نہ ہی ساری دنیا سے ہمدردی کی توقع کی، احمد نے بھی قدم قدم پہ سعادت مندی کا ثبوت دیا تھا، ان کا ہر حکم سر آنکھوں پر تھا۔ آج وہ ان احمد کے ساتھ وہ طویل رفاقت یاد کر رہی تھی: میرے بیٹے نے دنیا میں میرے لیے بہت تکلیفیں اٹھائیں، اس نے کبھی ماں کو احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ آج میرے بچے دوبارہ یتیم ہو گئے: یہ بات سن کے کلیجہ پھٹتا تھا لیکن وہ صبر و استقامت کا پیکر تھیں، آنسوؤں میں بھی اپنے عزم کی طرح ثابت قدم: آپ میرے بیٹے کی بخشش کی دعا کریں اور میرے لیے بھی ....

اب آخری سفر کی تیاری مکمل تھی، ہمکنی بے اختیار ہو کر اُدھر کو جھوم رہا تھا تو کوئی دیوانہ وار اُس کے نثار ہو رہا تھا، دِلوں کے آبلے پھوٹ رہے تھے، درد کی لہریں کنارے سے ٹکرا ٹکرا جاتیں لیکن اُن کا زور کم نہ ہوتا تھا، جب اُسے اُٹھا کر لے چلے تو ایک محشر بپا ہو گیا، ایک اندوہناک گلو گیر آواز نے کہا۔

"یارو کیا غضب کر رہے ہو؟ اسے کہاں لے جا رہے ہو؟" (اِس فریاد میں انسان کی بے بسی کی داستان مضمر تھی۔ روزِ ازل سے یہ فریاد گنبدِ گردوں تک جاتی ہے اور صدائے بازگشت کی طرح خالی ہاتھ لوٹ آتی ہے) اسے وہاں لے جا رہے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا، جس کا اِس دُنیا سے کوئی تعلق نہیں، آنسوؤں کا سیل رُکنے میں نہیں آتا تھا۔

نہیں بھولتا اُن کی رُخصت کا وقت

وُہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

اُس سنسان اندھیری رات میں آخری ساتھ دینے والے عزیز غم سے چُور خاموشی سے راستہ طے کر رہے تھے، کوئی اپنے خیالات کی دُنیا میں گم تھا تو کوئی کسی حرماں نصیب "درماندہ راہرو" کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ قدموں کی مدھم چاپ اس خاموشی میں مخل ہو رہی ہو!

ڈھاکہ سے فوجی بھائیوں نے پُورے اعزاز کے ساتھ رُخصت کیا تھا۔ اب اپنوں نے دل پہ پتھر رکھ کے آخری رسم کی ادائیگی شروع کی، قبر تیار تھی اور اپنے مکین کی آمد کا انتظار کر رہی تھی، مضافات کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں، قبرستان میں صرف لو تھی، تاروں کی لو اور شہر کی بتیوں کی لو۔ قدیم گھنے اشجار تھے اور پھولوں سے لدے نورستہ پودے، جب اُسے لحد میں اُتار چکے اور اینٹوں کی چُنائی شروع ہونے لگی تو عزیزوں نے اس پیکرِ اخلاص پہ آخری نظر ڈالی، اب چند منٹوں میں دروازہ بند ہوا چاہتا تھا، چند منٹوں میں آخری رشتہ منقطع ہوا چاہتا تھا۔ وُہ ازلی تنہائی جو زندگی بھر انسان کا ساتھ دیتی ہے اب مجبوری اور مہجوریاں کی حقیقت میں جلوہ گر تھی، کیفیتِ غیب و شہود سمجھنے کی ساعت آن پہنچی تھی۔

اے اجل! اے ساعتِ عشرت اثر یں

زندگی کی اے دعائے آخریں

اپنا بیگانہ نہ ہوگا جب کہ پاس

لوگ جس کو کہتے ہیں جلوے کی رات

میں کنول بن کے کھلوں گی رات میں

اپنے مالک سے ملوں گی رات میں

قدسی صفات وجود زیرِ زمیں ہو گیا، وُہ کھِلتا ہوا شفیق چہرہ محو ہو گیا، وہ سُورج جو مشرقی پنجاب میں طلوع ہوا تھا آدھی رات کے وقت مغربی پنجاب میں آ کر غروب ہوا، گُرد اسپور مشرقی پنجاب کی دعوتِ شبینہ سے ماڈل ٹاؤن کی وادیٔ خاموشاں کا سفر چوبیس گھنٹے میں طے ہو گیا تھا، مشرق سے مغرب تک کا سفر، زیست سے ممات تک کا سفر۔

[illegible] ہو جاتی ہیں [illegible]

قتل ہونے سے چند ہفتے قبل لاہور آئے تھے [illegible] شعر [illegible] کر رہے تھے۔ میں نے پایا تو دیکھ کر [illegible] ایک [illegible]
اور کہنے لگے میرا اسم ہے تو ہمیں خبر کر دو [illegible] میموریل کے پیچھے [illegible] پہاڑی [illegible]
اے روشنیوں کے شہر! تو جگمگ جگمگ کرتا رہے! تیرے چراغوں کی رونق کم نہ ہو۔ تیرے بیٹے [illegible] کم نہ ہوں، تیرے
چمن لہلہاتے رہیں۔ آج ہم ایک گرانبہا امانت تیرے ایک گوشے کے سپرد کر چلے۔

یہ بیٹے کم نہیں ہوتے، یہ رونق کم نہیں ہوتی۔ انسان بھری دنیا سے چلا جاتا ہے اور اسے جاننے والے زندگی میں ایک خلا محسوس کرتے
ہیں لیکن زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔

...... جب میں نذیر بھائی کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ اس رات بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ایکسپریس
ٹرین ٹھیک وقت پر آ کے رکی۔ لکڑی کا ایک تابوت اُتار دیا گیا جسے چند مسافروں نے خاموشی سے دیکھا۔ گاڑی تین منٹ سے زیادہ نہیں
رکی۔ گارڈ نے سیٹی دے کر ہری بتی ہوا میں لہرا دی۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں ہو گئی۔ زندگی کے بہاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور
مجھے یاد آتا ہے کہ اس رات گہرے سیاہ بادل گھر آئے تھے اور چاند بدلی کی اوٹ میں آ گیا۔ پھر جیسے ہر روز میں سڑک کی بتیاں بجھ گئی
تھیں اور ایک جگہ [illegible] کا تھا: اسے سب روشنیاں گل ہو گئیں: اس کے لیے چار اور تاریکی ہی تاریکی تھی، ایک ایسی تاریکی
جس سے مفر نہ ہو۔

ڈوبتے بھائی کی جان بچاتے ہوئے نذیر خشم سمندر کی پہنائیوں میں گم ہو گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے، جواں سال بیوی، سمندر
کے طوفانی تھپیڑوں کو [illegible] دینے والے خدا تُو نے یہ کیا کیا تھا؟ اس حادثے کو اوپر تلے کئی سال گزر گئے لیکن شاید تیغ وقت
کا زخم پوری طرح کبھی بھر نہیں پاتا۔ گزشتہ سرما میں ایک صبح جو سیر کو نکلے تو جانے کیوں نذیر بھائی کی یاد آ گئی اور زہرا کے منہ سے
بے اختیار نکلا: خدا بخشے بڑی پیاری طبیعت تھی بھائی جان کی۔ یہ بات کر کے اُس کی آنکھیں سُرخ کٹورا ہو گئیں۔ باہر گلاب کے
پیلے اداس سے جھڑ رہے تھے اور دھند میں لپٹی ہوئی یخ بستہ فضائیں دم بخود تھیں۔ وہ گلگشت شروع ہونے سے پہلے ختم ہو گئی۔
آج میں سوچتا ہوں جب چلتے رستے ویران ہو جاتے ہیں تو کشتہ [illegible] راہ نوردوں کو راستہ بتلاتے ہیں، اور وہ سڑک کی حفاظت کرنے
والے درختوں کی خنک چھاؤں اور رعنائی کہاں رہ جاتی ہے جیسے نیک لوگ یادوں کے تاج محل میں آباد ہیں، اُن کی یاد سے
بہار ہے۔

اور نیاز صاحب! ایک وسیع بنگلے میں شادی کی تقریب تھی، خوب گہما گہمی تھی، نوشہ کے شادیانے بج رہے تھے کہ ایک
دوست نے چپکے سے آ کے کان میں کچھ سنا آپ نے؟ نیاز آج صبح کار کے حادثہ میں جاں بحق ہو گئے! چشم زدن میں رشتۂ زندگی منقطع
ہو چکا تھا۔ بینڈ پر بھی دھنیں بج رہی تھیں لیکن ماحول پہ اداسی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ سہمے ہوئے سرگوشی کے انداز میں اس ٹریجیڈی کو [illegible]
کر رہے تھے جیسے بے وقت موت سے بھی خائف ہوں جیسے انسان کی بے بسی سے لرزتے ہوں۔

اس دن جب بہار پورے جوبن پر تھی، جب کچنار کے درخت کاسنی پھولوں سے بھر پور تھے اور سبز بیل سفید پھولوں سے

دگئی تھی اور جیسے پھولوں سے ہی ڈار اٹ گئی تھی اُس روز نیاز احمد مر گئے۔ نیاز احمد جو محفلوں کی جان تھا جسے ہزاروں منتخب اشعار از بر تھے جس کے چٹکلے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے اب ہم اُسے کبھی نہ دیکھ پائیں گے اور مجھے نیاز احمد کے وہ الفاظ یاد آگئے۔

"آخر ہمیں ایک روز اس جہان سے جانا ہے ورنہ ہمارے بچوں کے لیے جگہ کہاں رہے گی۔"

انھیں کیا معلوم تھا کہ چند ہفتوں میں ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے سربراہ کا جسم خاک و خوں میں غلطیدہ چلتی سڑک کے کنارے پڑا ہوگا۔ بے یار و مددگار ——— منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی۔

باغِ جناح کے اُوپر پندرھویں رات کا چاند اپنا ازلی سفر طے کر رہا تھا، خنک ہوا سبز درختوں میں سرسرا رہی تھی اور وہ گنجینۂ اشعار و لطائف تازہ مٹی کے نیچے دفن ہو چکا تھا۔

خدا بخشے وہ عجیب آدمی تھے، چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور بے تکلفی، دُنیاوی معاملات میں حق گوئی اور بے باکی۔ انسان دوستی کا یہ عالم کہ حیدر آباد چھوڑے انھیں کئی سال ہو گئے تھے لیکن مجھے کئی بار فون کیا: ہاں بھیا حیدر آباد کے فلاں کالج کے لیے کچھ کیا، میاں دیکھ لینا بڑا Deserving کیس ہے، حیدر آباد پبلک سکول کی کچھ امداد کی؟ وہاں "بھٹہ بیٹھ رہا ہے"۔ یہ سکول اُنھوں نے حیدر آباد کی کمشنری کے زمانے میں بڑے شوق سے بنوایا تھا، اس بات کو کئی سال گزر گئے لیکن امتدادِ زمانہ کے باوجود اُس علاقے سے اُنس قائم تھا۔

دوستو! جو کرنا ہے کر ڈالو، عمرِ کوتاہ فرصت نہیں دیتی، یہ گہری نیند بسا اوقات چور دروازے سے دبے پاؤں داخل ہو جاتی ہے، وہ کام دُنیا کا ہو کہ آخرت کا، کوئی حسرت نہ رہ جائے، کوئی اُدھار نہ رکھو، قبل اس کہ بانگ برآید فلاں نماند، اور میں نے بر جا لبطوں کے لیے وظائف مقرر کرنے تھے، کسی دُور اُفتادہ دوست کو پیار بھرا خط لکھنا تھا، کسی زخم پہ پھایا رکھنا تھا، تو آخر وہ کب کرنا ہے؟ عمرِ عزیز مہلت نہیں دیتی۔

کسی پارٹی میں ہم ایک ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ نیاز صاحب نے میرا کاندھا تھام کے کہا۔

"ہاں بھئی چمپئی رنگ پہ یہ شعر سن لو،

یہ جرأت کا ہی حصہ ہے . . . ."

باتیں ہماری یاد رہیں گی پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا۔

اور ہم نے سوچا تھا نیاز صاحب اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے یونہی محفلوں کو گرماتے رہیں گے، اُن کے بیساختہ قہقہے ہمیشہ گونجتے رہیں گے، یہ سلسلہ چلتا رہے گا، ہاں اور وہ جو اوزرمی لنبل جو ہیں تو رہتے ہیں کبھی ہو آئیں گے۔ عقیدت کا اظہار تو گاہے گاہے سرراہے بھی ہو جاتا ہے، ایسی بھی کیا جلدی ہے، نیاز احمد پڑوس میں ہی تو ہیں . . . .

اور احمد بھائی کے متعلق بھی ہمارے ذہنِ لاشعور میں ہوگا کہ وہ تو موجود ہیں، حسبِ مذاق کے لیے محبت جتلانے کے لیے

سدھ [illegible] تھا اُن کی پُرشکوہ [illegible] کوئی شاعر
بہک چلے تو دل نکلتا ہے ابھی ان وسعتوں کا ایک [illegible] جن کی وسعتیں [illegible] حقیقتیں
بس گئی ہیں۔

پشاور اور راولپنڈی میں متعدد بار میں صفیہ اور احمد بھائی کا مہمان رہا اور وہ ہمیشہ باعث راحت ہوتا۔ ہر بار وہی تکلیف ۲ خیال مہمان کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی سعی۔ "دفتر جاتے اپنی گاڑی بھجوا دوں؟ بیٹی کے نیچے ہو گی؟ آدمی جا کے سُوٹ استری کروا لائے؟"

۱۹۵۰ کے موسم خزاں میں پشاور میں اُن کے ہاں قیام تھا، عجب پُرسکون ماحول میں جو جذبۂ تشکر سے لبریز تھا اور صحن میں بیٹھے ہوئے میں نے اپنی ڈائری میں یہ فقرے لکھے تھے:

"معاف کر دینا حسن ہے۔

اپنی محدود "انا" سے بلند ہونا حسن ہے۔

رات کی رانی کے پیڑ تلے افسردہ خوشبو سے بوجھل فضا میں ابدی نیند سو جانا حسن ہے۔"

چھ سال بعد مجھ سے پہلے احمد جا سکے۔ میں اسے بہت سے پیار بھرے خط لکھ سکتا تھا، بہت سے تحفے بھیج سکتا تھا، چھوٹے چھوٹے تحفے یہ جتلانے کے لیے کہ میرے دل میں اُس کے لیے کتنی عزت ہے اور میں اور زبیر اب اوقات اُس کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے بیٹھتے ہیں اور اس کے "ہیرا" ہونے کا ذکر اکثر رہتا ہے۔ میں ٹرنک کال کر سکتا تھا یہ جتلانے کے لیے کہ ہم دوری کے باوجود اُسے بھولے نہیں اور اس کا کھلتا ہوا چہرہ اور معصوم مذاق یاد سے محو نہیں ہوئے، ملنے ہیں سب یادیں اور یاد ہیں سب باتیں، لیکن وہ ہمیں چھوڑ گیا۔ وہ آنا فانا اس دُنیا سے چلا گیا اور ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔ ہم انجانے طور پر دوسروں کی خوشی اپنی مٹھی میں بھینچ لیتے ہیں شاید دوستوں اور پیاروں کی زندگی میں ہم اپنی محبت اپنی عقیدت اُن پر ظاہر نہیں کر پاتے، کبھی حجاب مانع ہوتا ہے کبھی اظہار کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ ہم WE NEVER WANTED محسوس کر کے چپکے ہو رہتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے وہ خود محسوس کرے گا لیکن کسی کے متعلق حسن ظن رکھنا اور اُس کا اظہار لب پر نہ لانا اُس کے حق کو گنوانے میں بخل سے کام لینا...... ہم دُنیا کے کاموں میں اتنے اُلجھ جاتے ہیں، ہم روز مرہ کی پرابلمز میں کھو کر چھوٹی چھوٹی کدورتوں میں ٹوٹ ہو جاتے ہیں، ہم زندگی کے قفیضوں سے اتنا تھک جاتے ہیں کہ ان اہم باتوں کے لیے ہمت ہی نہیں رہتی، ہم ٹالا ٹالی کر کے کافی سمجھ لیتے ہیں، شاید ہم نادانستہ طور پر موت کی حقیقت جھٹلاتے رہتے ہیں اور پھر دوام سے کھو کر تشنہ نہیں کر پاتے۔ ہاں تین ماہ پیشتر جب میں انہیں آخری مرتبہ خدا حافظ کہنے کار تک آیا تو سچی بات میری زبان پر آگئی تھی اور میں نے کہا تھا "ہوشیار پور کے خاندان نے بس ایک "گوشہ جیتا موتی" پیدا کیا اور وہ احمد حسین ہے" اور وہ سادہ دلی سے ہنس دیا تھا۔ میں نے سچ ہی کہا تھا، اُس نے کبھی کسی کے ساتھ تلخ کلامی نہیں کی، طعن و تشنیع کے تیر نہیں چلائے، وہ انسانیت اور انسان دوستی کی زندہ مثال تھا لیکن اس نے کبھی اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا، وہ دشمنوں کو منہ پر بُرا نہیں کہتے تھے وہ شر انگیز اور مفسد لوگوں کو بے نقاب نہیں کرتے تھے "ان لوگوں سے بھی پناہ لیے جا رہا ہوں میں" باہمی رنجشوں سے دامن بچا کے نکل جانے والا جلتی پر پانی

، واقع تھی کل، وہ یا دوستاں تعلقات یا دشمنی مدارات کی زندہ تفسیر تھا اور وہ کبھی کی دلآزاری نہیں کرتا تھا۔ طنز سے اجتناب، اُس
اق میں تشکیک کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ نہ ہی اُس نے کبھی اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کوئی قریبی ہو یا غیر ہر اک کی خدمت کے
سند اُس کے عزیز اونچے عہدوں پہ فائز تھے لیکن یہ اُس کے لیے فخر و مباہات کا موجب تھا اور نہ ہی رشتہ داروں کا چھوٹی جگہ
ا باعث وہ ہی شفقت کی نظر ہر کہہ و مہ کے لیے۔

احمد کی کوئی بھاری بھرکم شخصیت نہ تھی کہ پہلی نظر میں آنکھ میں کھب جائے، اُس کی جبلّی نیکی اور شرافت چپکے سے ہم آہنگ
ہی۔ وہ انجانے طور پہ گرد و پیش ہمدردی اور خیر سگالی کے تاثرات بکھیر دیتا تھا اور آپ سوچتے تھے 'یہ شریف آدمی میرے
اتی کیوں پریشان ہو رہا ہے' یہ میرے لیے اتنا کچھ کیوں کرنا چاہتا ہے؟ اب وہ دردمند دل ہمارے لیے نہیں دھڑکے گا، وہ
کے لیے خاموش ہے اُس کی یاد حرزِ جاں ہے۔ جب ہمیں کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو حسین یادوں کے چہرے ماضی کے دریچوں سے جھانک
پریشان کرتے رہتے ہیں چاہے وہ ایک جذبے کی موت ہو یا ایک انسان کی . . . .

ہماری امیدیں، ہمارے خواب، ہمارے فیصلے ان کی کیا وقعت ہے۔ ایک مجبور و بے بس انسان کی کیا وقعت ہے؟ تقدیر
مسکراتی رہتی ہے . . . . . .

میں سوچتا ہوں۔ نذیر اکس بے پچھلے بھائی کی جان بچاتے ہوئے ڈوب گئے۔ جب اُنھیں بمشکل باہر نکالا گیا تو اُس
ت بھی چند سانس باقی تھے، اگر بر وقت طبی امداد مل جاتی تو . . . . نیاز احمد کار کے اندوہناک حادثے میں جاں بحق ہو
وہ ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوتے تو شاید بچ جاتے؟ لیکن احمد بھائی کے متعلق میں کیا سوچوں؟ خود ڈاکٹر، دو ڈاکٹر گھر میں مہمان،
یا بدن، ٹینس کا شوقین، ہر بات میں اعتدال پسند اور محتاط لیکن قلب کا پہلا دورہ جان لیوا!

احمد زندگی کا رس لے گئے، وہ ایک چرکا دے گئے، کیا ایک خاص عمر کے بعد انسان چرکے کھانے کے لیے زندہ
ہتا ہے، یونہی گھائل ہوتا رہتا ہے اور بالآخر تھک کے موت سے بھی سمجھوتہ کر لیتا ہے۔

آج میں تنہا ہوں، یہ خنک ہوا، یہ پتیوں کا جھونا، یہ ڈوبتے سورج کی ٹکیا اور پھیلتی ہوئی شفق، یہ خوبصورت درخت
اور خاموشی، مدّور لان میں زرد پتیوں کی چادر بچھ گئی ہے، اکّا دکّا درخت خزاں زدہ ہیں، مسلسل تین دن یا دو باراں کا طوفان
رہا، غروبِ آفتاب کے بعد میری نظر یکایک اُوپر اُٹھ گئی تو دیکھتا ہوں کہ آسمان کا ایک حصہ شفق میں نہا گیا ہے، جیسے آگ کے
شعلے آہستہ آہستہ سرد ہو رہے ہوں، ہلکے نیلے آسمان کا منہ دُھل گیا ہے۔ بے گرد و غبار سرد سہی آسمان کی طرف سر اُٹھائے ہوئے
ل کی پتیوں میں سے چاندی کا چمکتا نیا چاند نظر آ رہا ہے اور اُس کے عین اوپر ایک روشن ستارا، شندرتا میری آنکھ میں اُتر آتی
ی، بلا شرکتِ غیرے، ہوا میں خنکی آ چلی ہے، اکتوبر کی دوپہر بہ لطافت گزر گئی، نومبر کے گلابی جاڑے رخصت ہونے، اب
ری رات داستان کی اُداس چاندنی چھن چھن کے دریچوں میں سے آتی ہے، سارا دن رات رُوح کو یخ کر دینے والی سرد ہوائیں
چلتی ہیں، درختوں سے زرد پتے گر گر کے لڑکھڑاتے ہیں۔

کبھی یادیں شبنم امروز سے بھاگ اٹھتی ہیں
گرتے پتّوں سے بہاروں کا خیال آتا ہے

یہ کرسمس کارڈ کا موسم ہے، کرسمس کارڈ جن پہ سپید داغ برف پڑی کا ہوتی ہے اور جن میں ڈوبتے سورج کا عکس پڑنے سے حاشیے ہو جاتے ہیں، رینڈیر بے پیتے کی برفانی گاڑی کھینچتے ہیں، وہ کرسمس کارڈ جو احمد لاکھپن سے بھیجتے کرتے ہیں، وہ کارڈ جن کا انتظار رہا کرتا تھا، اب نہیں آئیں گے۔

بشاہراہ وفا انتظار داشتے

"شیخ علی حزیں نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر، جب اس کا دل نشتر خوردہ تھا، ایک شب اصفہان کی کسی صحبت میں، جو باغ میں تھی، سارنگی نے ساز درست کر کے ایک شعر سنایا۔ صبح تک وہی نغمہ تھا۔ وہ اس شعر کو گاتا، چپ ہو جاتا۔ پھر گاتا، پھر چپ ہو جاتا۔ حزیں کہتے ہیں کہ معلوم نہیں کتنی مرتبہ مشتاق روحوں نے قالب خالی کیا تھا۔" (بحوالہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی)

نہ جانے شیخ تصوف کے کس مقام پر تھے۔ ورنہ روح ایک بار مسافر ہونے کے بعد کہاں لوٹتی ہے۔ وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتی ہے اور قربِ حضوری کے لیے بیتاب؛ جیسے تھکا ہوا راہرو بے ساختہ "مکان" کی طرف مڑ جاتا ہے!

مٹی کا ادراک

جوگندر پال

نیچے باغ میں کھانا کھانے کے بعد ہم نے اجنتا کیوز کی پہاڑی کی جانب دیکھا۔

"پہلے ذرا سستا لیا جائے۔" رام ناتھ نے مشورہ دیا۔ "پھر اُوپر جا کے کیوز دیکھیں گے۔"

"ہاں بھئی۔" ایرانی نے ڈکار لے کر کہا۔ "بھابی کا کھانا اتنا لذیذ تھا کہ کھا کھا کے اب اپنا بوجھ بھی نہیں اُٹھایا جاتا۔"

"آپ لوگ سستاؤ:" کیپٹن تیجا سنگھ کہنے لگا۔ "آؤ ڈارلنگ، ہم اُوپر چلیں۔" اُس نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا ——— "اور تم

——— تم اور محبوبی یہ سارے برتن دھو کر واپس لاری میں چھوڑ آؤ ——— آؤ ڈارلنگ!"

ڈارلنگ اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو جی۔"

"چلو تم بھی اُٹھو۔" رام ناتھ نے اپنی بیوی سے کہا۔ "اب فوجی حکم سے آگے کس کی پیش چلے گی؟"

میں نے ایرانی کے ساتھ ساتھ چلنا چاہا لیکن وہ قدم بڑھا کر مسز رام ناتھ کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ "بھابی، تمہارا کھانا ———"

"اوئے بھائی ایرانی۔" کیپٹن تیجا سنگھ نے گویا یکایک یاد آنے پر کہا۔ "آپ نے تو بولا تھا کہ کوئی گائیڈ وائیڈ لے کے

ں سے جائے گا۔"

"میں یہاں ہوں سرکار۔" ایک سفید ریش آدمی قریب ہی ایک بنچ سے اُٹھ کر ہمارے پاس آ گیا۔

"تو چلو مولوی صاب، لے چلو ہم سب کو۔" کیپٹن تیجا سنگھ نے گویا اپنی فوج کا جھنڈا اُسے سونپ کر آگے چلنے کا حکم دیا۔ "آؤ

لنگ ——— اوئے پروفیسر، تو کیوں لیٹا ہوا ہے بھائی، اُٹھ نا ———"

"آپ چلیے، ہم آتے ہیں۔" اُس نے اپنی نئی نویلی دُلہن کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے ہوئے کیپٹن تیجا سنگھ کو

واب دیا۔

"اچھا اچھا، سمجھ گیا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "مجے کرو بھائی ——— آؤ ڈارلنگ۔"

ہم سب گائیڈ کے پیچھے پیچھے پہاڑی کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"یہ کیوز ایک انگریز نے دریافت کیے تھے۔" گائیڈ رام ناتھ کو بتا رہا تھا جو اپنی بیوی کو پیچھے ایرانی کے ساتھ چھوڑ کر اس کے

اس چلا آیا تھا۔ "وہ یہیں کہیں شکار کے لیے آیا ہوا تھا۔ جب وہ اُس پہاڑی پر پہنچا۔" وہ رُک کر ایک پہاڑی کی چوٹی کی جانب

شارہ کرنے لگا۔ "تو اچانک ادھر دیکھ کر ٹھٹک گیا، اور پھر ———"

"کی ہوا ڈارلنگ؟" کیپٹن تیجا سنگھ کی بیوی اپنی تین چار سالہ لڑکی کو مجبور کرنے کے لیے ٹھہر گئی تو اُس کا شوہر مڑ کر اس کے

پاس بیٹھ کر ... بچّی ہیں۔" (اسے بچّی لگتی ہو۔) اُس نے اپنی بیٹی کو بائیں بازو پر بٹھالیا: "تے اے دوجی جان نکالن کے رکیا ہ
ای۔" (نکلنے جان سے لگا کے رکھا ہوا ہے) اُس نے اپنی بیوی کے پیٹ کی طرف دیکھ کر کہا اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بچّہ
اوپر اٹھاتے ہوئے مسکرانے لگا۔

اُس کی بیوی نے پیٹ پر دوپٹہ ڈال لیا۔

"شرم نہیں آوندی؟" (شرم نہیں آتی؟)

ہم اُوپر چڑھ کر کیوز کے سامنے آ کھڑے ہوئے تو پروفیسر کا سالا مجھ سے پُوچھنے لگا۔ "کیا ہم گھنٹہ بھر میں واپس چل پڑیں
گے؟"

"اسے بھئی، ابھی تو آئے ہو، جانے کی بھی سوچ رہے ہیں گے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں۔" اُس نے کہا۔ "شام کو سات بجے اورنگ آباد پہنچ کر مجھے دُکان کھولنا ہے۔"

بوڑھا گائیڈ رام ناتھ کے ساتھ ایک غار کے دروازے پر کھڑا ہم سب کا انتظار کرنے لگا۔

"پروفیسر ابھی وہاں سے اُٹھا ہے۔" کیپٹن تیجا سنگھ پہاڑی کے نیچے باغ کی طرف دیکھنے لگا۔ "یا وہیں بیٹھا اپنی کتاب
پڑھ رہا ہے؟"

"ہم آ گئے سردار جی۔" پروفیسر کی آواز سیڑھیوں سے سُنائی دی۔

کیپٹن تیجا سنگھ سیڑھیوں کی طرف سر جھکا کر ہنسنے لگا۔ "مجال ہے کبھی اپنی کتاب کو نیچے پرے ہونے دے۔" پھر وہ ...
طرف دیکھنے لگا۔ "بھابی کو ہمیشاں اپنے آگے ہی رکھتا ہے۔"

"ہم چلے کیوں نہیں؟" کیپٹن تیجا سنگھ کی بیوی خفا ہونے لگی۔

"چلو ڈارلنگ ——— وہ اپنا مولوی ساب گائیڈ کدھر گیا؟"

"آئیے جناب، میں یہاں ہوں۔"

"ہاں چلو ڈارلنگ ———" لیکن شاید بوڑھے گائیڈ کی داڑھی دیکھ کر اُس نے اپنا لفظ بھی پُورا نہ کیا۔ "یہ سارا کرشمہ تو
ابھی ذرا دکھاؤ مولوی ساب، ہماری میم ساب کو ان چیزوں کا بڑا اشتیاق ہے۔"

ہم بڑے میاں کی رہبری میں غار کے اندر داخل ہو گئے۔

وہاں دیواروں پر، ستونوں پر، چھتوں پر ہر جگہ زندگی آباد تھی، یُوں لگ رہا تھا کہ یہ مُورتیں پتھروں کے باطن سے باہر
آئی ہیں اور ہمارے دیکھتے دیکھتے اب اپنی جگہ سے نکل کر ہمارے ساتھ آ کھڑی ہوں گی۔

"مٹی کی مورتیں ہیں پر کتنی زندہ ہیں!"

"ہاں صاحب۔" بوڑھا گائیڈ ہمیں بتانے لگا۔ "ایک انگریز بہادر یہاں آئے تھے۔ ایک بات انھوں نے بڑے مزے
کی کہی تھی، حضور۔" بڑے میاں نے اپنے مخصوص حیدرآبادی لہجے میں پوچھا۔

"مگر ہندوستانی سالا کبھی مزے کی بات نہیں بولتا کیا ؟" رام ناتھ کو غصہ آنے لگا۔ "انگریزی حکومت کو پورے ستر برس ہو چکے ہیں لیکن اب بھی بات بات میں صرف انگریز کے بول ہی سننے میں آتے ہیں، پارلیمنٹ میں بھی۔" رام ناتھ پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ "اور پارلیمنٹ کے باہر بھی۔"

"ہم ہندوستانی چپ چاپ میں ہی ساری باتیں کر جاتے ہیں۔" پروفیسر نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوئے پروفیسرا!" کیپٹن تیجا سنگھ ہنسنے لگا۔ "ہاں مولوی ساب ——— آپ اپنی بات شروع کرو۔"

"میں کہہ رہا تھا جناب، یہ کوئی دھوکا نہیں جو یہ مٹی کی مورتیں زندہ معلوم ہوتی ہیں، ہم بھی مٹی کی ہی مورتیں ہیں۔ ہماری زمین کی ساری زندگی مٹی سے ہی بنتی ہے، اس لیے وہ صاحب بہادر ———" رام ناتھ کی آنکھوں سے آنکھیں ٹکرا جانے پر بڑا میاں ذرا اکڑ سا گیا ——— "اس لیے میرا ایمان ہے کہ ان سب مورتوں میں بھی جان ہے۔ ادھر آئیے ———" وہ ہمیں بائیں طرف غار کی دیوار کی جانب لے آیا جس کے پہلو میں ایک بستر سنگ پر کئی فٹ کی لمبائی میں مہاتما بدھ کا بُت دائیں کروٹ دراز تھا۔ "یہاں آئیے، اب دیکھیے !"

یوں معلوم ہو رہا تھا کہ مہاتما بدھ ابھی مسکراتا ہوا خوابناک فکر مندی کی کیفیت سے باہر آ کر اپنی آنکھیں کھول لے گا۔

"اور اب یہاں آئیے، اِس کونے میں !"

اور اب یوں لگ رہا تھا کہ مہاتما بدھ اپنے جسم میں نہیں ہے، اور چونکہ وہ ابھی ابھی اپنے جسم کے اندر ہی تھا، اس لیے کچھ ایسی کیفیت ہے گویا ابھی ابھی بتی گل ہوئی ہو، اندھیرا گویا روشنی کا سایہ بن کے نظر آ رہا ہو، صرف ایک لمحہ کے لیے، لیکن یہ لمحہ ابدی ہو گیا ہو !

بیک وقت نہ ہونے اور ہونے کا یہ احساس، موت میں زندگی کی جھلک، سکون میں حرکت !

"واہ ——— وہ !" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

بڑا میاں میرے قریب سرک آیا۔ "کیوں جناب، مٹی میں جان ہے یا نہیں ؟"

"ہاں" میں نے شدت سے محسوس کیا۔ "زندگی کی ساری داستان مٹی سے ہی عبارت ہے، یہیں زندگی کا سارا سرمایہ دفن ہے۔ مٹی ہی زندگی کی ماں ہے اور اسی کے بطن سے سارے پیکر برآمد ہوتے ہیں، ہمارے، جانوروں کے، کیڑے مکوڑوں کے، سب کے، مٹی سراپا زندگی ہے اور اپنے سکوت، بہرے پن اور بے حرکتی کے باوجود بولتی، سنتی اور دیکھتی ہے ———"

"سیدھی سادی بولی میں سمجھاؤ مولوی ساب۔" کیپٹن تیجا سنگھ بڑے میاں سے کہہ رہا تھا۔ "تم مہا کبھی آئے۔ آپ ہیدرآباد کی پھارسی بولتے ہو تو ہماری سمجھ جیسے لائل پور میں جا پہنچتی ہے۔ پر چلو، ٹھیک ہے، اب تو شاید لائل پور میں بھی جاٹ بھائی اپنی پھارسی جبان سے ہی روٹی ٹکر کھاتے ہوں گے۔"

"معاف کیجیے اب میں اپنی زبان کو سلیس کر دوں گا۔"

"سلیس ؟ ———" تیجا سنگھ ہنسنے لگا۔ "سلیس کیا بلا ہوئی ؟ ——— چل کوئی بات نہیں، آگے بول۔"

"یہ دیکھیے،" بڑے میاں نے آگے بڑھ کر ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا ـــــ "یہ ڈیزائن ـــــ بنگلے کے بڑے بڑے
سیٹھ لوگ یہیں سے ساڑھیوں کے ڈیزائن سجاتے ہیں۔"

"ہاں، ویری گُڈ، مروری!" کیپٹن بولا۔ "یہ تو بات ہوئی نا۔ آؤ ڈارلنگ۔"

پروفیسر اپنی بیوی کو ایک عورت کی تصویر کی طرف لے گیا۔ "وُہ بھگلے دیکھو ششی۔ اچھے ہیں نا؟"

ششی نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"تمھیں پسند ہیں نا؟"

ششی نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"تو کل رام لعل سُنار کے پاس چلیں گے۔" پروفیسر نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ "خوب اچھی طرح ڈیزائن کو سٹیڈی کر لو۔"
اُن کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے پروفیسر کے سالے کا خیال آیا جو ایک طرف تنہا کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

میں اُس کے قریب چلا آیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں سُود صاحب؟"

"یہی سوچ رہا ہوں کہ اپنے کلچر اور کلا کی آلوچنا ایک مسلمان کی بھاشا میں کیوں سنوں؟"

"اس میں کیا بُرائی ہے سود صاحب؟ میں نے تو گیتا بھی انگریزی میں ہی پڑھی ہے۔"

"شکر ہے آپ نے اسے عربی یا فارسی میں نہیں پڑھا۔"

"پھر بھی گیتا گیتا ہی رہتی سُود صاحب۔" میں بحث میں اُلجھنے کے مُوڈ میں نہیں تھا لیکن چُپ نہ رہ سکا۔ "کوئی بڑا خیال کسی خاص
زبان کے کردار کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ بڑا خیال کسی بھی زبان کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ تصویریں دیکھیے، بن بولے بول رہی ہیں، جو ہندی سمجھتا
ہے اُس سے ہندی میں، اور جو پشتو سمجھتا ہے اُس سے پشتو میں۔"

"آئیے صاحبان، اب دوسرے غار میں چلیں۔" بڑے میاں نے ہمیں دُور سے مخاطب کیا اور ہم سب دروازے کی طرف
بڑھ گئے اور باہر چند قدم چلنے کے بعد جب ہم دوسرے غار میں داخل ہو رہے تھے تو مجھے خیال آیا کہ متمدن انسان اپنے استحکام
کھوج میں چلتا چلتا انجانے غاروں کی جانب لوٹ رہا ہے، وہ خلا میں اپنا گھر نہ بنا پایا تو از سرِ نو پہاڑوں میں پناہ لینے کے لیے چلا آ
ہر ذرّے کا اصل مقام یہی خاک ہے، انھی دیو قامت چٹانوں میں مخلوق کی جڑیں رچی بسی ہیں اور ـــــ اسی لیے اجنتا کے غا
کی یہ زندہ صُورتیں صرف یہیں ممکن ہیں، گویا یہ شکلیں کسی نے بنائی نہیں، بلکہ ان کے منتشر اجزا فطرت کی رضا کے عین مطابق اپنے آپ میں
اپنی جگہ پر جُڑ جُڑ کر سالم زندگی میں ڈھل گئے ہیں۔

"ان تصویروں کو بنانے والے کون تھے؟" رام ناتھ نے بڑے میاں سے پوچھا۔

"ان غاروں سے متعلق یہی ایک سوال ہے۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔ "جو میری دانست سے باہر ہے۔" کیپٹن تیا
سے اکھڑے پن سے اُس نے اپنا مطلب بیان کیا۔ "یعنی جو مجھے معلوم نہیں۔"

اور یہ سوال اہم بھی نہیں، میں نے سوچا۔ تاہم بچوں سے ماں باپ کا نام پوچھا جائے تو ٹھیک ہے لیکن جس شخص کے چہرے میں اپنی بھر پور، اپنا کردار، اُس کی مخصوص شخصیت دکھائی دیتی ہو، اُس کی اپنی ذات ہی اُس کی اصل پہچان ہے، اجنتا کی یہ تصویریں اپنے بالغ شعور کا ظہور ہیں اور انھیں دیکھ کر ان کے خالق کا خیال نہیں آتا بلکہ خود انھی کے خیال سے دل و دماغ مخمور ہو جاتے ہیں۔

میری نظر ایک خوبصورت عورت کی تصویر پر جمی ہوئی تھی۔

"آپ یہاں سے نیم دائرے میں گھوم کر اُس سرے تک جائیے۔" بڑے میاں نے مجھ سے کہا۔ "اس عورت کی نگاہ آپ کے ساتھ ساتھ وہاں تک گھومے گی۔"

لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ زندہ تصویر محض رسمی طور پر زندہ نہیں کہلاتی بلکہ وہ واقعی زندہ ہوتی ہے، خود آپ اپنا آپ ہوتی ہے۔ اُس کا خالق اُسے بناتا نہیں، وہ خود بخود اُس کے ذہن میں بنتی ہے اور پھر ہُوبہو اُسی شکل میں وہاں سے باہر آ جاتی ہے، اُسے یہ قطعی گوارا نہیں کہ اُس کے کسی نقش میں مبہم سی تبدیلی بھی واقع ہو، اُس کی اپنی فطرت سے اُس کا چہرہ رُونما ہوتا ہے اور وہ اپنے اس چہرے کی تمام تر جُزئیات سے اپنی فطرت کا ہی تاثر پیش کرتی ہے۔ اگر اُس کا خالق اپنی مرضی سے ان جزئیات کو بدلنا چاہے تو وہ معرضِ وجود میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے

"یہ دیکھیے دو پیار کرنے والے!" بڑے میاں نے کیپٹن تھا سنگھ سے کہا۔

"آؤ ڈارلنگ!"

یہ دو جانیں نظروں ہی نظروں میں اس ایسے ایک دُوسرے میں سمائی ہوئی ہیں کہ یہ کہیں سے اپنے آپ اپنے خالق کے ذہن میں آ وارد ہوئیں۔ انھیں اپنے خالق کی موجودگی کا قطعاً احساس نہیں، ورنہ یہ دونوں ہڑبڑا کر، سنبھل کر ایک دُوسرے سے پرے جا کھڑی ہوتیں اور اپنے خالق کی طرف دیکھنے لگتیں، لیکن انھیں اُس کی خبر بھی نہیں، ان کے لیے اُس کا وجود ہے ہی نہیں، زندہ تصویر کا کوئی خالق نہیں ہوتا، وہ اپنے ہی جراثیم سے پیدا ہوتی ہے اور اُس کی رگوں میں اپنا خون دوڑتا ہے۔

میں نے تصویر سے آنکھ ہٹا کر یُونہی اپنے آس پاس دیکھا۔

"ایرانی بھائی۔" رام ناتھ ایرانی سے کہہ رہا تھا جو اُس کی بیوی کی طرف دزدیدہ گرسنگی سے دیکھ رہا تھا گویا وہ سینے سے چمٹا ہوا گرما گرم گوشت ہو اور ایرانی کی نظریں کہہ رہی ہوں کہ بھائی، بس گوشت تمھارا ہی لذیذ ہے، باقی سب جھوٹ! کھاؤ اور کھاتے ہی چلے جاؤ ——— "ایرانی بھائی ایک بات کہوں؟" رام ناتھ ایرانی کا ہاتھ تھام کر غار کی ایک جانب سرکنے لگا۔

"ایک نہیں، سو کہو شری رام ناتھ جی، لیکن بھابی کا گوشت ایک بار پھر کھلوائیے!"

"ایک بار نہیں، سو بار میرے یار!" رام ناتھ کی آواز دھیمی ہو گئی۔ "یہ بات سُنو میری۔ الیکشن قریب آ رہا ہے، وُہ بستی کے مسلمان بھائیوں کے ووٹ ہیں نا ———"

"گھبرائیے نہیں رام ناتھ جی۔" اُس سے بات کرتے ہوئے ایرانی نے پھر رام ناتھ کی پتنی کی جانب دیکھا۔ "لیکن ایک دفعہ ———"

"ادھر آئیے صاحبان۔" [illegible] ب کو پکارا۔ "آپ کو ایک شاہکار دکھاؤں۔"

پروفیسر اپنی بیوی کو ایک [illegible] دکھا رہا تھا۔

"یہ مجھے اُن سے بھی بہتر ہی [illegible] ہے!"

"آؤ ڈارلنگ، مولوی ساب کا شاں کار بھی دیکھ لو۔" کیپٹن تیجا سنگھ بڑے میاں کے ساتھ چلنے لگا۔ "مولوی شاب، شاں کار تو کیا ہے؟ ——— ڈبل مارچ کرو ڈارلنگ۔ تم تو اس طرح چل رہی ہو جیسے......"

کیپٹن ہنسنے لگا.

اور بڈھا میاں گویا کیپٹن کا کہا ہوا سن کر اسے اپنی غلطی سمجھ کے خجل سا نظر آنے لگا۔

"بڑے میاں کو کم از کم پانچ روپے دیں گے۔" میری پُشت پر رام ناتھ نے ایرانی سے مشورہ کیا۔

"نہیں، دس تو دیجیے۔" ایرانی نے رائے دی۔

"دس؟" سُود نے غالباً اُن کی پُشت سے آگے بڑھ کر اعتراض کیا۔ "کس بات کے؟ میں تو اپنے حصے کی ایک پائی بھی ادا نہیں کروں گا۔"

"چلو مولوی ساب جلدی جلدی اپنا شاں کار دکھاؤ۔" میرے آگے کیپٹن تیجا سنگھ بڑے میاں سے کہہ رہا تھا۔ "ٹائم ہو رہا ہے۔"

"ٹائم تو ہوتا رہے گا صاحب۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔ "مگر ایسی لاجواب چیز دکھا رہا ہوں کہ آپ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

"لاجواب!" تیجا سنگھ ہنسنے لگا۔ "مولوی مولوی ساب، آپ اُردو فارسی بڑی سوفی بولتے ہو ——— ڈارلنگ سنا؛ لاجواب! ———" پھر اچانک اُسے پروفیسر کا خیال آگیا۔ "او نے پروفیسرا، آ بھائی، تم بھی لاجواب کو دیکھو،"

"ٹھہریے!" بڑا میاں کہنے لگا۔ "ادھر بائیں طرف آجائیے!"

ہم سب اُس کے پیچھے پیچھے چل کر ایک جگہ ٹھہر گئے۔

"اب سامنے دیکھیے!"

ہماری نظریں دوڑ کر سامنے دروازے کے اندر جا گھسیں اور پتھر کے چمتکار سے ٹکرا گئیں۔

اب کے پھر ہم مہاتما بُدھ کے ایک دیو قامت بُت کے سامنے کھڑے تھے۔

مہاتما بُدھ اپنی آنکھیں کھولے سادھی میں بیٹھا تھا، پتھر میں زندگی تھرک رہی تھی۔ اب مہاتما ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اب فکر مند نظر آنے لگا تھا اور اب، جیسے اُس کی آنکھوں سے نرم نرم روشنی پھوٹ کر ہماری طرف آ رہی ہو، ہم تک اس روشنی کی ایک لکیر سی بن گئی ہو، اور اب جیسے مہاتما ہماری طرف بڑھنے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھنے کا ارادہ کر رہا ہو! ——— ہم کھڑے کے کھڑے رہ گئے، جیسے ہماری کوئی شخصیت نہ ہو، ہم پتھر کے مجسمے ہوں اور وہ مجسمہ زندہ انسان ہو، جیسے ہم نہیں دیکھ رہے، بلکہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے!

ید بیضا

کوثر چاندپوری

بوڑھا پٹھان کھپریل کی چھت والے کچے اور نمناک مکان میں پڑا کھانس رہا تھا۔ اس کو قوت تحلیل ہوتی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا جسم کھانسی کے شدید جھٹکوں سے زیر و زبر ہو رہا تھا، پچھلے چار مہینے سے وہ پلنگ پر پڑا اسی طرح کھانس رہا تھا۔ اس کے جاہ و جلال کا شہرہ جو بیس بائیس سال سے بارہ بارہ کوس تک چمکتا تھا اب گہنانے لگا تھا، پہلے جو لوگ آتے جاتے خالی چوپال کو بھی جھک کر سلام کر لیا کرتے تھے، اب چھاتی تانے پٹھان بابا کے گھر کے سامنے سے گزر جاتے ہیں اور صرف کنکھیوں سے ادھر دیکھ لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، پٹھان بابا تین بیٹوں اور کئی لڑکیوں کا باپ تھا لیکن یہ ساری اولاد دوغلی تھی، آدھی ہندوستانی اور آدھی ولایتی، پٹھان بابا مردان کی طرف سے ہندوستان آیا تھا اور یہاں آکر اس نے ایک چمارن گھر میں ڈال لی تھی۔ اسی کے بطن سے یہ اولاد پیدا ہوئی تھی، پٹھان بابا کبھی کبھی اپنے بڑے بیٹے حمزہ خاں کی کسی غلطی پر خفا ہو کر کہہ دیا کرتا تھا۔

"لالہ تیری تو وہی مثل ہے کہ ماں ڈھینی باپ کلنگ، پٹھانی کی کوکھ سے جنم لیتا تو شیر کا بچہ شیر کہلاتا۔"

مگر حمزہ خاں کی ماں پٹھانی ہی کہلاتی تھی اور بہت بڑے گھیر کی شلوار پہنتی تھی وہ پشتو نہیں بول سکتی تھی لیکن پٹھانوں کے لہجہ میں باتیں کرنے لگی تھی، اور دانت صاف کرنے کے لیے اخروٹ کی چھال چبایا کرتی تھی، پٹھان بابا کے تینوں بیٹے جوان ہو چکے تھے اور کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگے تھے، لیکن ان کا وہ رعب داب نہ تھا جو خان بابا نے قائم کر لیا تھا۔ گاؤں کے جو کسان پٹھان بابا کے قرض دار تھے وہ اس کی بیماری سے بہت مطمئن تھے، غازی کھیڑے میں بھی ایک قسم کا سکون تھا، مہینوں سے پٹھان بابا کی گالیوں کی گونج نہ سنی گئی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب کبھی نہ سنی جائے گی، وہ کتوں، بلیوں، مرغیوں اور بیلوں کو بھی گالیاں دیا کرتا تھا اور یہ گالیاں بالکل وہی ہوتی تھیں جو آدمیوں کو دی جاتی تھیں، وہ آدمیوں اور جانوروں میں کوئی فرق نہ کرتا تھا، دیہات میں اس کی یہ پالیسی بہت کامیاب تھی، جانور اس سے ڈرتے ہوں یا نہ ڈرتے ہوں انسان بلا مبالغہ کانپتے تھے، اور جس کی خود اپنی نظر میں عزت تھی وہ بہت زیادہ مرعوب رہتا تھا، کسانوں کے نزدیک غازی خاں کسی طرح شیر سے کم نہ تھا جو مرتے مرتے بھی ایک آدھ گائے یا بکری اٹھا لے جا سکتا ہے۔ سب ہی کو یقین تھا کہ وہ بچنے والا نہیں ہے پھر بھی دور اندیش قسم کے لوگ احتیاط کرتے تھے جس طرح مردہ شیر کی موت کا اطمینان کرنے کی غرض سے دور ہی سے پتھر پھینکے جایا کرتے ہیں اسی طرح وہ غازی خاں کو موت کے منہ میں دیکھ کر بھی ایک دم سے اپنا رویہ نہیں بدل رہے تھے اور شام کو کھیتوں سے لوٹتے وقت اسے پوچھ لیا کرتے تھے اور پٹھان بابا پلنگ سے اٹھتا نہیں تھا۔ پوچھنے والے چوپال میں بیٹھ جایا کرتے تھے اور اس کے نوکر عجب خاں کو بلا کر طرح طرح کے سوالات کرنے لگتے تھے، ان میں سے ہر سوال کی وہ حیثیت ہوتی تھی جو مردہ شیر کی جانب پھینکے جانے والے پتھر کی ہوا کرتی ہے۔

"کیسا ہے پٹھان بابا؟"
"کوئی ڈاکٹر بھی آیا تھا؟"
"کیسا بخار ہے کہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہڈیوں سے چپک کر رہ گیا۔"
"پٹھان بابا کو بڑے ہسپتال میں داخل کر دینا چاہیئے۔"

اننتی کسان بالکل اس انداز سے کہتا جیسے کسی ناواقف شکاری کو مشورہ دے رہا ہو کہ اپنے مارے ہوئے شیر کی کھال گاؤں کے چماروں سے نہ اُدھڑ وائے بلکہ شہر لے جاکر کھالیں پکانے والے کارخانہ میں ڈال دے۔

عجب خان ولایتی بہت گورا چٹا نوجوان تھا اور اُس کے رُخسار قندھاری انار کے چھلکوں کی مانند لال گوں تھے' ان کے گرد کالی داڑھی کی سیاہ گوٹ بہت ہی دلکش نظر آیا کرتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے افریقہ اور کسی کمیونسٹ ملک کی سرحدیں آپس میں مل گئی ہیں' عجب خان دیکھنے میں پٹھان بابا کے لڑکوں سے زیادہ حسین تھا وہ سب نوکر اور یہ اُن کا آقا معلوم ہوتا تھا وہ کسانوں کے پاس بیٹھ کر بڑے انہماک سے کہتا۔

"پٹھان بابا کے تھوک میں خون آنے لگا ہے۔"

"خون؟ ـــــــ زانی داس ورزن کش تیوری چڑھا کر تعجب سے کہتا جیسے ساتھیوں سے کہہ رہا ہو شیر زخمی ہو گیا اُس کے گولی لگ گئی۔

عجب خان چوپال میں بیٹھے کسانوں کی آنکھوں میں جھانک کر ان کے اندرونی جذبات کا اندازہ کرتا اور دلوں میں پٹھان کی طرف سے خوف اور نفرت کا میل دیکھ کر اس کا جی چاہتا کہ ان کے سامنے اپنے اندرونی درد کا بھی اظہار کر دے مگر اس کے ہونٹ سل جاتے اور وہ آپ ہی آپ سہم جاتا جیسے سوات بنیر یا مردان اور دیر کی کسی پہاڑی ڈھلوان پر بندوق چل گئی ہو۔ اس علاقے میں رائفل کی آواز بڑی بھیانک محسوس ہوا کرتی تھی' عجب خان چُپ چاپ زمین پر اپنی ہتھیلی رگڑتا رہتا جیسے بہت زور کی کھجلی ہو رہی ہو لیکن یہ کھجلی روپیہ ملنے کی علامت نہ تھی کسی اور ہی بات کا نشان تھی۔ کیونکہ روپیہ تو اب اُسے ملنا ہی نہ تھا۔ کبھی کبھی عجب خان کے گالوں کا رنگ پیلا پڑ جاتا' گلاب کے شاداب پھول گیندے کے پھولوں میں تبدیل ہو جاتے اور اُس کے ہونٹ کانپنے لگتے جیسے الفاظ کا طوفان ان سے ٹکرا رہا ہو لیکن وہ مُنہ سے کچھ نہ کہتا۔ اسے گھائل شیر کی طرف پتھر پھینکنے کی ہمت بھی نہ ہوتی' عجب خان پٹھان بابا ہی کے دیس کا رہنے والا تھا' دونوں میں دور کی رشتہ داری بھی تھی' وہ غازی کھیڑے میں اپنی خوشی سے نہ آیا تھا بلکہ پٹھان بابا زبردستی اپنے ساتھ لے آیا تھا' عجب مردان چھوڑ کر اپنے چچا کے پاس چارسدہ چلا گیا تھا جب وہ کسی مسودی کی گولی کا شکار ہو گیا تو عجب خان پشاور ہوتا ہوا ہندوستان آ گیا اور دیہات میں گھوم پھر کر حینگ اور تخم حیات بیچنے لگا ایک دن اچانک پٹھان بابا اُسے مل گیا' دونوں نے ایک دُوسرے کو دیکھا' ذہن میں پُرانی روایات اُبھریں' وہ دیر تک سوچا کیے کہ ایک دُوسرے سے کتنے آدمیوں کے خون کا انتقام لینا ہے' ان کے خاندانوں میں صدیوں سے دُشمنی چلی آرہی تھی جس نے رشتہ داری کی بیڑیوں کو انتقام کی سُرخی سے ڈھک دیا تھا' عجب خان بدلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا' آزاد قبائل کے کسی درّے میں بھی مڈبھیڑ ہوئی ہوتی تو وہ کم از کم نکل جانے کی کوشش کرتا لیکن پٹھان بابا کے خون میں ابھی انتقام کی

گرمی باقی تھی، وہ اکثر برسات کی کالی راتوں میں پٹھانوں کی لڑائیوں کے واقعات دُہرایا کرتا تھا اور اپنے دادا اجبال خاں کی موت کا حال بیان کرتے وقت اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں، وہ آج بھی مہمندیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کا آرزومند تھا۔

عجب خاں کو معلوم تھا کہ غازی خاں، پلنگ خاں کا اکلوتا بیٹا اپنا دیس چھوڑ کر بہت مالدار ہو گیا ہے، لیکن وہ اس سے دُور ہی رہنا چاہتا تھا، غازی کھیڑے میں آکر عجب خاں کی آنکھیں کھل گئیں، پٹھان بابا کے قبضہ میں ہزاروں بیگھ زمین تھی جس میں ستاسوں نقد پیدا ہوتا تھا وہ سُود پر روپیہ بھی چلاتا تھا اور کسانوں کو اناج بھی تقسیم کرتا تھا جو فصل پر دوگنا ہو کر لوٹ آتا تھا، پورے علاقہ پر اس کا اثر تھا، تحصیل اور تھانہ کے اہل کار اور افسران اُسی کے یہاں ٹھیرا کرتے تھے۔ وہ بڑوں اور مرغوں سے اُن کی تواضع کیا کرتا تھا، عجب خاں نے بہت چاہا کہ یہاں سے چلا جائے اور اپنے اسی دھندے کو چلاتا رہے مگر پٹھان بابا نے اُسے یہیں رہنے پر مجبور کر دیا، اُس نے عجب خاں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

عجب خاں، ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، دشمنی تمہارے باپ دادا سے تھی، وہ بل جانتے تو ضرور بدلہ لیتا تم میرے مقابلے کے نہیں ہو، اگر چاہتا تو قسم پروردگار کی جہاں ملے تھے وہیں میدان میں کھڑا کر کے گولی سے اُڑا دیتا اور پٹھان بابا کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا، لیکن میں شیروں پر رائفل چلاتا ہوں گیدڑوں پر نہیں۔

عجب خاں بظاہر مطمئن ہو گیا مگر وہ پٹھانوں کے جذبہ انتقام سے واقف تھا، بہرحال وہ غازی کھیڑے میں رہ پڑا اور کھیتی کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک رقبہ کے لیے تحصیل میں درخواست بھی دی، مگر خان بابا نے اسے منظور نہ ہونے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ عجب خاں . . . . . . اس کا محتاج ہو کر رہے، جس طرح اور بہت سے نوکر ہیں وہ بھی اسی حیثیت سے رہے۔

پٹھان بابا نے تینوں لڑکوں سے کہہ دیا تھا کہ عجب خاں کو میں نے صرف اس لیے نوکر رکھ لیا ہے کہ زہر شیشی ہی میں بند رہے، اور خطرہ ہر وقت پیش نظر رہے تاکہ ہم اس کی طرف سے چوکنا رہوں، تم لوگ بھی اس سے ہوشیار رہنا۔ سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے وہ مہمندی ہے اور ہماری اُس سے پشتینی لاگ ڈانٹ ہے لیکن اس کے بیٹوں نے جو خود پٹھان بابا کی نظر میں بدنسل تھے ان باتوں کو بالکل اہمیت نہ دی، ایک کان سے سُن کر دُوسرے کان سے اُڑا دیا۔ وہ امن وامان کی فضا میں چار ن کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ بل چلانا جانتے تھے گولی بارود سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے، پٹھان بابا اپنی جگہ ہر طرح سے ہوشیار رہتا، وہ ایک منٹ کے لیے بھی غافل نہ تھا، اور عجب خاں کی نقل وحرکت پر کڑی نگرانی رکھتا تھا، اس کی بیٹیاں عجب خاں سے بہت گہرا پردہ کرتی تھیں، پھر بھی عجب خاں جانتا تھا کہ بڑی لڑکی مہرالنساء کی ایک آنکھ چیچک میں بیکار ہو چکی ہے، اس کے منہ پر گہرے گہرے نشان ہیں اور مجھلی فیروزہ زریں بہت حسین ہے وہی اس غازی کھیڑے کی رونق اور پھٹ تاپ ہے اور سب سے چھوٹی زرنگار یُوں تو غنیمت ہے، مگر توتلی ہے۔

فیروزہ زریں سے اس کی صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی، وہ اپنے کچھواڑے میں ٹماٹر توڑنے آئی تھی، واپسی میں ایک بہت بڑا سانپ مل گیا تھا، وہ سہم کر وہیں کھڑی ہو گئی تھی، سامنے سے عجب خاں آگیا تھا اور فیروزہ زریں نے چیخ کر کہا تھا:

پٹھان سانپ ہے!

عجب خان نے پہلے غصے سے فیروزہ زریں کی طرف دیکھا تھا پھر کہا تھا۔

میں جانتا ہوں میرے اور تمہارے بیچ میں بہت زہریلا سانپ ہے۔

اور پھر اُس نے سانپ کا سر کچل دیا تھا۔

عجب خان کو آئے ایک سال ہی گزرا تھا کہ پٹھان بابا بیمار ہو گیا شروع میں معمولی جاڑا بخار آیا پھر کھانسی رہنے لگی دھیرے دھیرے بخار جم گیا اور کھانسی نے جڑ پکڑ لی۔ پٹھان بابا کی عمر پچاس سے اوپر ہو چکی تھی۔ وہ بہت تجربہ کار اور جہاندیدہ تھا۔ اپنی بیماری کے انجام سے واقف تھا۔ ڈاکٹروں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اُسے ٹی۔ بی ہو گئی ہے اور یہ بڑی خطرناک بیماری ہے، سانس اور تھوک سے اس کی چھوت تندرست آدمیوں کو لگ جاتی ہے۔ پٹھان بابا بڑے دل گردے کا آدمی تھا، وہ بالکل بدحواس نہ ہوا، نہ ڈرا، اندر ہی اندر اس نے گھر والوں سے علاحدہ رہنا شروع کر دیا، زمین تقسیم کر کے وصیت نامہ لکھا اور لڑکیوں کی شادی کے متعلق سوچنے لگا، ایک دن اُس نے عجب خان کو بلا کر کہا۔

عجب خان تم اب جا سکتے ہو میں تمہیں نوکری سے الگ کرتا ہوں۔

جی بابا! ——— اُس نے سر جھکا کر جواب دیا اور باہر چلا گیا اور سوچنے لگا کہاں جائے، شکاری پرانا ڈر کہتا ہے کہ اب اندھیا ہوا اور بڑھاپے کی یہ کیفیت ہے کہ وہ پنجرے سے نکلنا ہی نہیں چاہتا۔ اسی دن پٹھان بابا نے آئینہ میں اپنا منہ دیکھا اس کے گال مرجھا گئے تھے، وہ سرخی غائب ہو گئی تھی جو اس عمر میں بھی جھلکتی رہتی تھی، اسی وقت اسے عجب خان کے رخساروں کی سیب کی سی سرخی یاد آئی۔ وہ ہنسا اور دیوار سے ٹنگی رائفل کو زمین پر ڈال دیا جیسے وہ ناکارہ ہو گئی ہو، پھر وہیں پڑے پڑے اس نے عجب خان کو آواز دی۔

عجب خان! ——— او عجب خان!!

جی بابا!

اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں دن رات ہمارے پاس رہا کرو۔

جی بابا ——— عجب خان نے پٹھان بابا کی چٹیا کے نیچے رکھے ہوئے مٹی کے پیالے پر مکھیاں بھنبھناتے دیکھ کر مری سی آواز میں کہا جیسے یہ حکم آزادی کے حکم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہو۔

اور اس کے بعد وہ پٹھان بابا کے پاس ہی بیٹھا رہتا۔ اسے کھانا کھلاتا اور ضرورت پڑتی تو پاؤں بھی دبا دیتا۔ پٹھان بابا پہلے ہی بہت غصہ ور تھا بیماری میں اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ذرا سی بات پر بگڑ جاتا اور عجب خان کو مار دیتا۔ گالیاں تو ہر وقت ہی بکتا رہتا۔ عجب خان کا جی چاہتا کہ پٹھان بابا کی چھاتی تاک کر رائفل چھوڑ دے یا کوئی بڑا سا پتھر اس کے سر پر دے مارے تاکہ کھوپڑی ریزہ ریزہ ہو جائے اور وہ ہانڈی سی پھوٹ جائے جس میں اب بھی انتقام کی کھچڑی پکتی رہتی ہے مگر وہ نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو جاتا۔ ایک دن فیروزہ زریں گلاس میں دودھ لے کر آئی۔ پٹھان بابا نے دو تین گھونٹ پی کر گلاس عجب خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

لے تو پی لے عجب خان مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔

عجب خان بہت سٹپٹایا۔ اس نے گلاس ہاتھ میں لیا اور ابھی ہونٹوں ہی سے لگایا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ پردے کی جانب اٹھ گئی۔ وہاں فیروزہ زریں کھڑی تھی اور زور سے انگلی ہلا کر دُودھ پینے کو منع کر رہی تھی۔ عجب خان جلدی سے بولا۔

"ابھی جی نہیں چاہتا پھر پی لوں گا۔"

"خنزیر! ـــــ سور کا پتا!! وہ مجھ کو بڑوں پرہیز کرتا ہے۔ ابھی پیتا ہو گا میرے سامنے!"

عجب خان ڈر گیا اور پورا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ فیروزہ زریں گول گول سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہی، جیسے اس روز کی طرح دونوں کے بیچ میں سانپ آ گیا ہو۔

"عجب خان! ـــــ پٹھان بابا بولا۔ تیرا باپ سمندر خان مہمندی ایک غزے میں سینہ کھول کر ایک وزیری کی رائفل کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ گولی اس کے کان کے پاس سے سنساتی نکل گئی تھی مگر اس نے سر تک نہ ہلایا تھا اور تو میرا چھوٹا دُودھ پینے ہی سے ڈر گیا ـــــ ہیجڑا کہیں کا۔ میرا بیٹا پہاڑ خان دوغلا ہے، مگر زمین پر کھڑا ہو کر شیر مارتا ہے۔"

پٹھان بابا کا پہاڑ ایسا ڈیل ڈول تیزی سے گھلتا رہا۔ وہ دن رات میں سیروں بلغم اُگل دیتا جس میں چھٹانک دو چھٹانک کچ لہو بھی ہوتا۔ عجب خان محض اس امید پر اس کے مظالم سہ رہا تھا کہ آخر وہ کب تک زندہ رہے گا، کسی دن اسی طرح ایڑیاں رگڑتے رگڑتے دم توڑ دے گا۔

پٹھان بابا کبھی کبھی موڈ میں ہوتا تو اسے اپنی پٹی کے قریب بیٹھنے کو کہتا۔

"مہمندی شیر میرے پاس آ جا ـــــ دیکھ تیرا دادا رضا خان مہمندی بڑا بہادر تھا۔ وہ اکیلا رائفل کندھے پر رکھ کر پہاڑوں میں گھومتا اور جب کوئی ہوائی جہاز آسمان میں اڑتا نظر آتا تو رضا خان تاک کر ایسی گولی چلاتا کہ جہاز ہوا میں ڈولنے لگتا۔ میرے دادا نے کئی بار اس کا مقابلہ کیا ہے۔ رضا خان جتنا بہادر تھا اتنا ہی مکار بھی تھا۔ وہ چیتے کی طرح دشمن پہ گھات لگاتا تھا۔ ایک چٹان کی آڑ میں چھپ کر اس نے ہمارے دادا اجبال خان کے گولی مار دی تھی اور وہ گولی کھا کر بھی پچاس گز تک چھرا لے کر دوڑتا چلا گیا۔"

جب پٹھان بابا اس کے دادا رضا خان کو مکار کہتا تو عجب خان کا جی چاہتا کہ اس کا گلا دبا دے۔ وہ بار بار مٹھی کھولتا اور بند کرتا، مگر اسی وقت فیروزہ زریں کی زلفوں کے وہ بال یاد آ جاتے جو اکثر اس کے ماتھے پر لہرایا کرتے تھے اور پھر اس کی وہ گول گول آنکھیں یاد آ جاتیں جن کی نیلی پتلیوں پر بادل سے چھائے رہتے، جیسے آسمان میں ربر کے گالے اُڑ رہے ہوں۔ عجب خان کی انگلیاں نرم پڑ جاتیں، اور اسے پٹھان بابا پر ترس آنے لگتا۔ پٹھان بابا کے تینوں لڑکے جوان تھے۔ حمزہ خان تو خیر معمولی تھا، دروش کا انسان تھا مگر پہاڑ خان اور اکبر خان اسنے بھینسے کی مانند موٹے تازے اور خطرناک تھے لیکن وہ ان میں سے کسی سے نہیں گھبراتا تھا۔ ڈرتا تھا صرف فیروزہ زریں کی آوارہ زلفوں کے بکھرے اور باغیانہ انداز، گول گول آنکھوں میں چمکتی ہوئی پتلیوں سے جو جن کشمیری نشے کے گھونٹوں سے زیادہ تازگی اور نیلاہٹ تھی۔ پٹھان بابا کر باتیں کرتے کرتے کھانسی اٹھتی اور وہ کروٹ بدل کر پیالہ میں بھری ماکھ پر تھوکنے کی جگہ عجب خان کو حکم دیتا۔

"عجب خان ہاتھ پھیلاؤ!"

عجب خان ہاتھ پھیلا دیتا اور پٹھان بابا اس کی ہتھیلی پر تھوک دیتا پھر اس کے چہرے پہ نفرت کی لکیریں تلاش کرنے لگتا، اور

گرج کر کہتا۔

"نمک حرام!"

"سور کا بیٹا!"

عجب خاں [illegible] کتاب کھانے لگتا اس کی رگوں میں خون کھول جاتا، لیکن فیروزہ زریں کا ٹھنڈا خیال اس کے گرم لہو میں برف کی ٹھنڈک بن کر دوڑ جاتا، وہ بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ نہ تو پٹھان بابا کو اس کی بیہودگی کا مزہ چکھا سکتا تھا اور نہ غازی کھیڑے کی بہاروں اور وہاں کے ٹھاکروں کی سرخیوں سے منہ موڑ کر بھاگ سکتا تھا۔ اب تو اسے اس گاؤں کی سرزمین سے ایک طرح کا پیار ہو گیا تھا، جس کو بزدلی بلکہ نامردی سے تعبیر کیا گیا تھا، حالانکہ پیار اور بزدلی میں بڑا فرق ہے، زمین اور آسمان کا فرق، وہ انہیں فاصلوں میں بھٹک جاتا، اس کی ہتھیلی بُری طرح کھجاتی رہتی کبھی اس میں شدت کی جلن ہونے لگتی۔ وہ سوچتا یہ جلن وہ تو نہیں جو موہنی کی ہتھیلی میں اس وقت ہوئی تھی جب اس نے انگارہ ہاتھ میں اٹھا لیا تھا، محبت بزدلی نہ ہو مگر جلن ضرور ہے ——— اسے ایک جلن اور ایک زخم سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ دیر تک سوچ کے سمندر میں غوطے کھاتا رہتا!

پٹھان بابا کھپریل کی چھت کے نمناک کمرے میں پڑا کھنکارتا رہا۔ بخار اس کی ہڈیوں سے چمٹ گیا تھا اور اس کی گرمی اس طرح دھیرے دھیرے انہیں جلا رہی تھی جیسے بھس میں پڑی چنگاری سلگا کرتی ہے۔ پٹھان بابا کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ موت کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ مرتے وقت اسے اطمینان تھا کہ اس کا خاندانی دشمن عجب خان بھی جلد ہی اس کے نقش قدم پر چلے گا، اس نے عجب خاں سے ٹھنڈا انتقام لیا ہے، وہ دق کی چھوت سے بچ نہیں سکتا، اچھی زمین پر جو دانہ بویا جاتا ہے وہ اُگتا ضرور ہے۔

ایک دن اس نے تینوں لڑکوں اور لڑکیوں کو کمرے میں بلا کر مدھم آواز میں حمزہ خاں کو مخاطب کر کے کہا۔

لالہ ——— یہ مت سمجھنا کہ میں گھر میں سانپ چھوڑے جا رہا ہوں، میں نے اس طرح اس کا سر کچلا ہے کہ ذرا سی تو کیا گونج تک آواز نہیں ہوئی، عجب خاں کے گالوں کی سرخی کم ہونے لگی ہے، وہ دبلا بھی ہو گیا ہے، میں نے اسے رائفل کی گولی سے نہیں مارا اپنا جھوٹا دودھ پلایا ہے اور بیسیوں مرتبہ اس کی ہتیلی پر تھوکا ہے۔

اس روز سب لوگ پٹھان بابا کے پاس ہی بیٹھے رہے، عجب خاں کو وہاں آنے کی اجازت نہیں تھی، رات تک پٹھان بابا کی حالت بےحد نازک ہو گئی۔ سب لوگ رات بھر جاگتے رہے، باہر عجب خان بھی جاگتا رہا، رات بہت تاریک اور بھیانک تھی غازی کھیڑہ گہری تاریکی میں لپٹا ہوا تھا اور آسمان پر چنگاریاں سی بکھری ہوئی تھیں، رفتہ رفتہ وہ بھی کجلانے لگیں، اندر سے خراٹوں کی آواز آنے لگی، دفعتہً عجب خاں چونک گیا، پلنگ کے قریب فیروزہ زریں کھڑی تھی وہ آہستہ سے بولی۔

"عجب خاں ہاتھ پھیلاؤ!"

اور جب اس نے ہاتھ پھیلایا تو فیروزہ زریں نے اپنے ہونٹ اس کی ہتیلی پر جما دیئے، عجب خاں کو ایسا لگا جیسے ابھی ابھی رضا خاں نے گولی چلا دی ہے اور وہ جلال خاں کی چھاتی کے پار ہو گئی ہے۔ اس نے مٹھی خوب زور سے بھینچ لی اسے ڈر تھا کہ مٹھی کھل گئی تو ہر طرف چاندنی کھل جائے گی۔

———

راکھ

غلام الثقلین نقوی

ایک سیدھا سادا واقعہ تھا!

تیزاب کی بوتل اور زکام کی دوا الماری کے ایک ہی دراز میں پڑی تھیں۔ متوفیہ نے دوا کی بجائے تیزاب پی لیا اور نتیجے کے طور پر موت ہوگئی۔ ڈاکٹر نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ جنازے میں محلے کے سبھی لوگ شریک تھے۔ انہیں میں اسرار احمد اسرار بھی تھے جو میونسپل کمیٹی ایک اچھے عہدے پر فائز تھے اور جن کا محلے کے پڑھے لکھے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ شاعر بھی تھے۔ بڑی رچی ہوئی غزل کہتے تھے، ان کی شہرت مقامی مشاعروں سے نکل کر کہیں دُور نہ جا سکی تھی۔

مقصود متوفیہ کا نوجوان بیٹا تھا۔ وہ قبر کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کی خشک آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد تر آہستہ آہستہ زرد ہو رہی تھی اور ایک لمحہ آیا کہ متوفیہ کو منوں مٹی کے ڈھیر نے چھپا لیا اور مقصود کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ پاس کھڑے صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے مقصود کے دل سے کوئی بوجھ اتر کر اسی قبر میں دفن ہوگیا ہو!

آج صبح جب انہیں ارشاد بیگم کی وفات کی خبر ملی تھی تو وہ چونک سے گئے تھے۔

ارشاد مر گئی! انہیں بے انتہا حیرت ہوئی۔ ارشاد مر نہیں سکتی۔ اسے مرنا نہیں چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ارشاد مر گئی ہو لیکن شاد وکہاں ہے بھلا۔ شاد و جو ان کی غزلوں کے ایک ایک شعر میں زندہ و سلامت تھی۔ یہ غزلیں ان کی بیاض میں محفوظ تھیں۔ شاد و نہیں مر سکتی کیونکہ اسے اسرار احمد اسرار کے تخیل کا آب حیات پی لیا ہے۔

لیکن ارشاد بیگم مر گئی تھی جو مقصود کی ماں تھی!

"مجھے ارشاد بیگم سے کیا غرض۔ لوگ مرتے رہتے ہیں۔ مرتے رہیں گے۔ ازل سے مرتے چلے آئے ہیں۔ تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ازل سے ہے..... لاحول ولا قوۃ..... اقبال مرحوم کا کیا تعلق یہاں..... میں بھی کتنا پریشان خیال ہوں..... شاید اس لیے بھی ان دنوں اقبال کے رنگ میں کہنے لگ گیا ہوں۔ تقدیر کے قاضی کا....."

اور چند لمحوں بعد وہ بھی اس ہجوم میں کھڑے تھے جو متوفیہ ارشاد بیگم کی چارپائی کے گرد جمع تھا!

تقدیر کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ارشاد بیگم مر کر بھی زندہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے کوئی آثار نہ تھے۔ ایسا لگتا جیسے اس نے موت کو بڑی خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا ہو!

ابھی چہرے کا رنگ بھی نہیں بدلا تھا!

کمرے میں قمقمہ روشن تھا۔ اس کی روشنی زرد زرد سی تھی۔ ارشاد کے منہ پر ایک پیلا دوپٹہ تھا۔ موت کی زردی میں نیلاہٹ جھلک رہی تھی
موت بیگوں جدیدیوں سے تھوڑی سی نیلاہٹ بھی اُٹھا کر لے آئی تھی، اپنے ساتھ یا اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا شکن۔ ایک زمانے سے
اسرار نے ارشاد کو بہت قریب سے زندگی دیکھا تھا..... آج چالیس سال کی عمر میں بھی ارشاد کے چہرے پر جوانی تھی، البتہ پیشانی پر ہلکی باریک باریک
جھریاں تھیں...... دائیں گال پر وہ تل بھی موجود تھا۔ وہ تل...... اسرار احمد لرز گئے..... اور پیشانی پر وہ متوالی لٹ بھی تھی جو
جو پہلے مجبوری ناچتی رہتی تھی..... اب قمقمے کی زرد روشنی میں اِس لٹ میں چاندی کے تار بھی چمک رہے تھے !

"ارشاد بیگم واقعی مرچکی ہے۔"

"شادو ابھی زندہ ہے۔ اُس کی جوانی سدا بہار ہے۔" اسرار احمد نے سوچا اور ارشاد کے گھر سے نکل آئے !

لیکن جب اسرار احمد اسرار متوفیہ ارشاد کے گھر سے نکلے تو گلی سونی اور سنسان تھی !

گلی میں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ نہ کسی گھر سے کوئی آواز آ رہی تھی۔ ایک منجمد سی خاموشی طاری تھی جیسے کسی نے گلی کی زندگی کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ وہ سر جھکائے چل رہے تھے اور ان کے پاؤں سے چاپ بھی نہیں اُٹھ رہی تھی۔ گلی کے پیچ و خم میں ایک اسرار جنم لے رہا تھا۔ ایک اسرار جس کے حال میں اندھیرے تھے اور تنہائیاں۔ ایک اسرار جس کے ماضی میں اُجالے تھے۔ اندھیرے اور اُجالے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے !

گلی کے موڑ پر وہ تیز تیز چلتی ہوئی شادو سے ٹکراتے ٹکراتے بچا !

حال کے اندھیرے چھٹ گئے۔ ماضی کے اُجالوں نے یک لخت گلی میں دھیمی سی روشنی پھیلا دی۔ شادو کے گال کا تل مسکرا اُٹھا۔

"کچھ لوگ چلتے ہیں تو یہ نہیں دیکھتے کہ کون گزر رہا ہے۔"

"میں...... نہیں تو....." اسرار نے شرما کر کہا۔

"میں..... نہیں تو....." شادو نے اس کی نقل اُتارتے ہوئے کہا۔

اُس کا تل مسکرایا اور ایک گڑھے میں ڈوب گیا۔ مسکراہٹ ڈوب ڈوب کر اُبھری اور لبوں کے کونوں میں روشنی کی محراب بن گئی۔

اُس نے سوچا "گلی میں اچانک روشنی کیوں ہو گئی ہے؟ میں کس منزل پر پہنچ گیا ہوں؟"

"نجانے یہ کون سی منزل ہے!" اُس کا حساس دل اس استفسار پر کانپ گیا۔

"یہاں سے گزر جاؤ۔" دل کی دھڑکن نے کہا۔

"ذرا رک جاؤ۔ دیکھو تو سہی یہ کون ہے جس نے تمہیں پکارا ہے۔" گلی کے ذرے ذرے نے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ یہ کون ہے۔ یہ شادو ہے۔ گلی کی نکڑ پر اس کا مکان ہے۔ اس کا باپ دینو محلے کا دھوبی ہے۔ اُجلے اُجلے کپڑے پہنتا ہے۔ خود میلے کچیلے میں ڈوبا رہتا ہے۔ کسی سے آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کر سکتا۔ بڑا مسکین طبع اور عاجز انسان ہے۔

بات کرتا ہے تو ڈرے ڈرے سہمے سہمے انداز میں۔ گاڑھے پسینے کی کمائی کھاتا ہے لیکن یوں سمجھتا ہے جیسے ایک نقطے کے لیے ساری دُنیا کا احسان مول لے رہا ہو۔ آج وہ دُھلے ہوئے کپڑے دینے کے لیے ہمارے گھر نہ آیا تو میں لینے کے لیے آگیا۔ میرے پاس کالج جانے کے لیے صاف قمیص نہیں تھی لیکن دینو گھر پہ نہیں تھا۔ میں لوٹا تو ......"

"تم کپڑے لینے آئے تھے نا ؟" شاؔدو نے پُوچھا

"میں .... ہاں ...."

"پھر یہیں ٹھہرو۔ میں جب تک لوٹ کر نہ آؤں یہیں ٹھہرے رہو۔"

وہ گلی میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ اِکا دُکا لوگ اُس کے پاس سے گزرتے رہے۔ ایک دو نے اُسے حیران ہو کر دیکھا بھی اور اُس کے چہرے پر شرم کے پسینے آتے رہے اور وہ سوچتا رہا: میں ایک قدم آگے بڑھا تو جانے کیا ہو۔ جبکہ پاؤں زمین کے ساتھ کیوں چپک گئے ہیں ؟"

"تم یہیں کھڑے ہو ؟" شاؔدو نے پُوچھا۔

"میں .... نہیں تو ...."

شاؔدو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"یہ لو اپنے کپڑے"

"..... میں .... نہیں تو ...."

اسرار نے جھکی جھکی آنکھوں کے ساتھ کپڑے لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

"نہیں .... ایک بار نظریں اُٹھاؤ تو کپڑے دوں۔"

اسرار پسینے میں بھیگ گیا۔

"مجھے جانے دو شاؔدو !"

"جانا چاہتے ہو تو ایک بار دیکھ تو لو۔ جو مجھے آنکھ بھر کر نہیں دیکھتے میں اُن کا راستہ روک لیا کرتی ہوں۔"

اور اسرار احمد جو بڑا شریف اور شرمیلا نوجوان تھا، اس لڑکی کو آنکھ بھر کر دیکھ لینے پر مجبور ہو گیا !

اُسے یوں لگا جیسے اُس نے اس لڑکی کو آج پہلی بار دیکھا ہو۔ یہ اجنبی لڑکی جو بڑے دلنواز انداز میں مسکرا رہی تھی اور اس مسکراہٹ سے چودھویں رات کے چاند کی زرد زرد کرنوں کی بارش ہو رہی تھی۔ چودھویں کا چاند جو گرمیوں کی ایک رات کو چمک رہا ہو اور اس رات میں حبس ہو اور ایک معطر پسینے کی خوشبو کہ جس کے جھکوروں سے نیند آتی ہے اور آبھی نہیں پاتی اور انگ انگ سے پسینہ پھُوٹ بہتا ہے۔

وہ اس چہرے کو دیکھتا رہا اور اپنی جگہ سے نہ ہل سکا !

اور یکایک شاؔدو شرما گئی۔ اُس کی آنکھیں جھک گئیں۔ شریر۔ چنچل آنکھیں اپنے آپ میں کھو گئیں۔ بے داغ زرد سنہرا سا چہرہ جو ابھی ابھی گرم گرم زندگی سے بھرپور تھا، یکدم اُداس اُداس سا ہو گیا۔ لبوں کی قوسیں اُداس اُداس شام میں زمین سے مل

...لی اُفق کی گولیاں ہو گئیں۔

"اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے جو چند لمحے پہلے یُوں تن کر کھڑی تھی جیسے اس کی ایک ٹھوکر میں پورا سنسار ہو اور جو اُسے ٹھہرنے کا حکم دے کر اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی تو ایک ایک قدم پر سڑک کے بُت نئے اُگتے جاتے تھے:

اور اس لڑکی نے چُپ چاپ کپڑے اُس کے ہاتھ میں تھما دیے!

اسرار گھر کی طرف چل پڑا۔

واؤ نے اُس کا رستہ روک کر پوچھا: "سارتے، آج گلی کے نکڑ پر شادو سے کیا کیا باتیں ہوئیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔" اُس نے بے دھیانی کے عالم میں کہا اور پاس سے گزر گیا۔

"واہ بھئی سارتے! آج تو پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے آپ کے؟"

اسرار نے جلدی جلدی ناشتہ کیا۔ کپڑے پہنے اور سائیکل لے کر کالج کی طرف روانہ ہو گیا۔

سائیکل خود بخود چلتا رہا۔ رستہ اپنے آپ کٹتا رہا۔ وہ سائیکل پر نہیں تھا۔ وہ تو اُسی نکڑ پر کھڑا تھا جہاں شادو نے اُسے ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔ سارا دن اسی طرح گزر گیا۔

اُسی نکڑ پر کھڑے کھڑے وہ شاعر ہو گیا۔

پہلی غزل کا پہلا شعر اُس پر الہام ہو کر نازل ہوا۔

نکڑ پر کھڑے کھڑے اُس نے سوچا کہ وہ یہ شعر کس کو سُنائے۔ یہ شعر جو آسمان کی بلندیوں سے اُترا تھا۔ جب تک یہ شعر کوئی سُنے گا نہیں، وہ اِس نکڑ سے ہل نہیں سکتا۔

یہ شعر جو ابھی الفاظ کے سانچے میں بھی نہیں ڈھل سکا تھا!

شادو نے یہ شعر نہ سُنا اور وہ گلی کے نکڑ پر سے نہ ہل سکا!

پھر اُس نے ایک عجیب خبر سُنی۔ شادو کا بیاہ ہو رہا ہے۔ اُس کے باپ دینو نے اُس کے لیے رشتہ تلاش کر لیا ہے اور یہ بھی کہ شادو کا ہونے والا شوہر پہلے ایک محلے کا دھوبی تھا۔ اب اُس نے بازار میں دُکان کھول لی ہے۔ فینسی ڈرائی کلیننگ اینڈ لانڈری سروس۔ اُس کی دو بیویاں پہلے سے موجود ہیں۔ پہلی بیوی دھوبی گھاٹ پر جا کر کپڑے دھونے میں مدد دیا کرتی ہے۔ دُوسری دُکان کے عقب میں کپڑوں پر استری کیا کرتی ہے اور اب اُسے تیسری بیوی کی ضرورت تھی جو گرم کپڑوں کو ڈرائی کلین کر سکے اور اُس کی نظرِ انتخاب شادو پر پڑی۔

اسرار نے سوچا: "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ دو بیویوں کا ایک شوہر تو ہو سکتا ہے، شاعر نہیں ہو سکتا اور شادو تو کسی شاعر کے دل پر شعر ہو کر اُتر سکتی ہے۔ وہ ایک لانڈری والے کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے۔"

وہ پھر گلی کے نکڑ پر آ کھڑا ہوا۔

شادو نے پوچھا: "کپڑے لینے آئے ہو؟"

"ہاں!"

"کپڑے ابھی نہیں دھلے۔ بابا آج دھوبی گھاٹ پر گیا ہے۔ آج شام تک دھلیں گے۔ پھر میں انہیں خود اپنے ہاتھوں سے استری کروں گی۔ دیکھنا ایک سلوٹ بھی نہ رہے گی۔ تہوں کی ایسی کریز ڈالوں گی کہ ہفتے بھر تک خراب نہ ہو گی۔ پھر تم چھیل چھبیلے بن کر اس گلی میں سے گزرو گے نا؟"

"میں ۔۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔۔"

"میں ۔۔۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔" اس نے اسرار کا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

وہ بازار سے گزر رہا تھا تو فینسی ڈرائی کلیننگ اینڈ لانڈری سروس کے سامنے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ فینسی ڈرائی کلیننگ کا مالک پھولے پھولے گالوں والا شخص تھا۔ اور اس کی مونچھوں پر خضاب پھرا تھا اور وہ مونچھوں کی نوکیں سنوار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تھے۔ چہرے پر ایسی ایسی جھریاں تھیں جن کو کوئی استری ہموار نہ کر سکتی تھی۔ جھریوں کا جال۔ جال کو ایک جھٹکا لگا۔ جال سمٹا اور شادو ایک چڑیا کی طرح اس جال میں پھنس کر پھڑپھڑانے لگی۔

"شادو ۔۔۔۔۔۔ شادو ۔۔۔۔" وہ تڑپ کر پکارا۔

مونچھوں کی نوکیں پھڑکیں۔

"تم کس شادو کو پکار رہے تھے؟"

اس کا جی چاہا کہ کہہ دے "وہی جو ابھی ابھی تمھارے جال میں پھنس کر رہ گئی ہے۔"

لیکن اس نے اتنا کہا "شادو ۔۔۔۔ میں نے کسی شادو کو نہیں پکارا۔"

"پگلے معلوم ہوتے ہو۔ کس محلے میں رہتے ہو۔"

"شاد گنج میں ۔۔۔۔"

"اس شہر کا کوئی محلہ شاد گنج کے نام سے مشہور نہیں۔ ادھر شیدے!"

"کیا بات ہے سیٹھ!"

"اس بابو کو دیکھو ۔۔۔۔ کوئی پاگل ہے بیچارا۔ کوئی محلہ شاد گنج بھی ہے ہمارے شہر میں؟"

"نہیں تو۔"

"یہ بابو کہتا ہے میں اس محلے کا رہنے والا ہوں۔ ابھی ابھی کسی شادو کو پکار رہا تھا۔"

"شادو والی بات ٹھیک کہی اس نے۔"

"آہ! شادو ۔۔۔۔ جاؤ بابو ۔۔۔۔ کوئی کوٹ ووٹ ڈرائی کلین کروانا ہو تو لے آنا سردیوں کے شروع میں ۔۔۔۔ پگلے نے کس کا نام لیا۔ شادو ۔۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام ۔۔۔۔۔۔"

اگلی صبح وہ شادو کے مکان کے سامنے کھڑا تھا!

دیپو گھر پر نہیں تھا۔ اُس نے دروازے پر دستک دی تو شادو باہر آئی۔

"کپڑے لینے آئے ہو؟"

"ہاں!"

"بڑے اُجلے دُھلے ہیں۔ موتیے کی کلی کی طرح۔ استری میں نے خود کی ہے۔ پر کپڑے ایک شرط پر دوں گی۔"

اسرار خاموش رہا۔

"بولو شرط منظور ہے؟"

"میں..... نہیں تو..... دیکھو! مجھے کالج سے دیر ہو رہی ہے۔"

شادو نے اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ وہ گھر کی چوکھٹ پار کر کے گلی میں آگئی۔ اُس نے ستارے کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیے:

"آج دُھلی ہوئی پتلون اور قمیض پہن کر اور سائیکل ہاتھ میں لے کر ایک بار میرے مکان کے سامنے سے گزر جانا ستارے! میرے ڈھول سپاہی! میں گلی کے اس نکڑ پر کھڑی ہو کر تیری راہ دیکھوں گی۔ کہو شرط منظور ہے۔"

"نہیں..." اسرار نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں!....." شادو نے اسرار کو کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یہ نگاہ نیزے کی انی تھی کہ فوراً دل میں اُتر گئی۔ ایک والہانہ التجا جیسے کہہ رہی ہو:

"دیکھ ستارے! میں تیرے لیے گھر کی چوکھٹ پر سے گزر آئی۔ اب میرے پاس کیا رہ گیا ہے۔ میں نے اس لیے سب کچھ لٹا دیا ہے۔ دیکھ رانجھا! ہیر بابل کے گھر سے نکل کر بیلے میں آگئی ہے۔ سوہنی نے کچے گھڑے پر تیر کر چناں پار کر لیا ہے۔ سسّی تھلوں میں رستہ بھول گئی ہے۔ اب ہیر کی لاج رکھ لینا۔ سوہنی کو شور دریا میں نہ ڈوبنے دینا۔ تھل کی ریت میں آگ ہے اور سورج سوا نیزے پر۔ سسّی کے ہونٹ پیار کے شربت کے لیے سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔"

"مجھے ایک نظر دیکھ ستارے!"

اور ستارے نے شادو کے چہرے پر وہ نظر جما دی جو آنکھ سے نہیں دل سے نکلتی ہے اور اتھاہ سمندروں کی تہ تک اُتر جاتی ہے۔ یہ نظر شادو کی آنکھوں سے اُتر کر اس کے دل تک جا پہنچی۔ اُس نے دیکھا آنکھ سے لے کر دل تک کی پہنائی ایک جامِ جہاں نما ہے جو شرابِ محبت سے لبالب بھر گیا ہے۔ اتنی بھرپور محبت کہ اُمڈ اُمڈ سے اُبل رہی تھی۔ چھلک رہی تھی۔

وہ محبت کے اس معطر پسینے میں نہا گیا تھا:

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے شادو!"

اسرار احمد شادو کے ہاتھوں کی استری کی ہوئی قمیض اور پتلون پہن کر سائیکل کو کھڑکھڑاتا ہوا اُس کی گلی میں سے گزر گیا۔ شادو اپنے مکان کے دروازے میں کھڑی اُسے تکتی رہی۔ تکتی رہی اور اسرار اُس کی نگاہوں کے ساتھ ساتھ اُڑتا رہا۔ اُسے یوں لگا جیسے

شادو کی ایک نظر نے اُسے پاتال سے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا ہے۔

فینسی ڈرائی کلیننگ کے سامنے اُس نے سائیکل کو آہستہ کر لیا۔ حمیدا ایک کرسی پر بیٹھا توند پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اسرار کو دیکھ کر شیدا دوڑتا ہوا آیا: "حمیدے! وہی کل والا بابو گزر رہا ہے۔"

"جانے دے! ذرا ٹھہراؤ اسے۔ اس سے ایک بات پوچھ لیں۔"

"بابو!" شیدے نے اُسے بلایا۔ اُس نے سائیکل روک لیا۔

"تم کس محلے میں رہتے ہو؟" حمیدے نے پوچھا۔

"پچھلے پورے میں۔"

"تم شادو کو جانتے ہو نا!"

"ہاں......"

"پر اُس دن تم کہتے تھے تم شاد گنج میں رہتے ہو۔"

"شادو کے محلے کا نام شاد گنج ہے۔ تم جس شادو کو پوچھ رہے ہو وہ دینو دھوبی کی بیٹی ہے نا؟"

"ہاں.... ہاں.... تم اُسے جانتے ہو؟"

"ہاں.... نہیں...." اسرار نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا: "پر تم کیوں پوچھ رہے ہو اُس کے متعلق؟"

"وہ حمیدے کی ہونے والی دُلہن ہے نا۔ بہت جلد حمیدا سہرا باندھ کر تمہارے محلے میں آئے گا۔"

حمیدا زور زور سے ہنسا اور اسرار کے سر میں ہتھوڑے چلتے رہے۔

"شادو حمیدے کی ہونے والی دُلہن ہے۔ حمیدا جو فینسی ڈرائی کلیننگ اینڈ لانڈری سروس کا مالک ہے جس کی مونچھیں خضاب سے کالی ہیں اور جس کے جسم سے سڑی ہوئی چربی کی بساندآتی ہے اور شادو.... جس کا جسم شبنمی راتوں کا عطر ہے۔ جس کی آنکھوں میں ستارے جھلملاتے ہیں اور جس کے سانس میں گلاب کی خوشبو ہے۔"

یکایک اسرار نے ایک عجیب بے بسی کا احساس کیا جیسے حمیدا سہرا باندھ کر اُس کے محلے میں آگیا ہے اور اُس نے شادو کو دُلہن بنا کر ڈولی میں ڈال دیا ہے اور پھر اُس نے ڈولی کو کندھا بھی دیا ہے کیونکہ شادو اُس کے محلے کی لڑکی ہے۔

نہیں.... نہیں....

"سائیکل چلا رہے ہو یا ماں کا چرخہ۔" ایک راہگیر نے کہا۔

اُس نے لڑکھڑاتے ہوئے سائیکل کو سنبھال لیا۔

سائیکل سنبھل گیا لیکن وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا۔

وہ عرش سے گرا اور پاتال تک دھنس گیا!

کالج سے واپسی پر وہ شادو کے مکان کے سامنے سے گزرا۔

[illegible] کھڑی تھی۔ اُس نے سفید رنگ کی شلوار اور سفید رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے سر پہ سفید دوپٹہ تھا جس کے چہرے پہ [illegible] پھر رہی تھی۔ وہ دھنک کی سکھی اور شُنسان تھی۔

"آ گئے میرے ڈھول سپاہی! میں کب سے تیری راہ دیکھ رہی ہوں۔"

"ارشاد بیگم! میں نے اُسے دیکھا۔"

"مجھے شادو کہہ کر پکارو ساتے اور ہاں اب بتاؤ تم نے کیسے دیکھا؟"

"وہی جو سہرے باندھ کر اس گلی میں آئے گا اور ہم جو اس گلی کے رہنے والے ہیں تجھے اپنے ہاتھوں سے ڈولی میں ڈال دیں گے۔" شادو کے زرد زرد چہرے پر سُرخی چھلکی۔ یہ چہرہ وال جیوکانہ تھا لیکن اسرار نے دُور سے آگ کی لپٹیں محسوس کیں۔

"کب ہے جب مجھے سہرے باندھ کر بیاہ لے جانے کا میرے ڈھول سپاہی کے ہوتے ہوئے!" شادو نے غصّے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شادو!" اسرار احمد نے دھیمے سے پکار کر کہا۔

"کہو ساتے!"

"میں تیرے پیار کے قابل نہیں۔ تیرے پیار میں دہکتے سُورج کی آگ ہے۔ میں جل بھن کر راکھ ہو جاؤں گا۔"

"ساتے!" شادو باہر گلی میں آ گئی۔ "پیار کی آگ میں جل کر راکھ ہونے والے ہی پیار کر سکتے ہیں۔"

"نہیں!"

"ساتے! میرے اور تیرے پیار کے رستے کا کوئی روڑا بن کر اٹھا تو میں سارے سنسار کو آگ لگا دوں گی۔"

"نہیں!"

"کیوں نہیں!" شادو کی نگاہوں میں آگ بھر گئی تھی: "میں بھرے جہان کو آگ لگا دوں گی۔ لگا دوں گی۔"

اسرار شادو کی آتشیں نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ وہ وہاں سے ٹل گیا پر گلی میں آگ لگ گئی تھی اور شعلے لپک رہے تھے اور اسرار کا تن بدن جل رہا تھا۔ اُس کے تلوے جل رہے تھے۔ زمین سُرخ انگارا تھی!

لالہ نے پوچھا: "ساتے! آج شادو سے کیا باتیں ہو رہی تھیں۔"

"کچھ نہیں۔"

"یوں لگتا ہے جیسے شادو نے سارے محلے کو ٹھکرا کر تجھے پیار کے لیے چُن لیا۔"

"ہاں لالہ! پر اُس کا پیار آگ کا جہنم ہے۔ اُس میں میرا تن بدن جل جائے گا۔"

"پیار بھی تو اسی چیز کا نام ہے ساتے پر تم بزدل ہو۔ شادو سے کہو مجھے پیار کا ایک بول بول دے۔ میں پیار کی چتا کو خود آگ دکھا کر اس میں جل مروں۔"

"جانتے ہو اُؤ میں کون ہوں ؟"

"ہاں ! تم قریشی ہو اور شادو دھوبن ہے۔ تم یہی پوچھنا چاہتے تھے نا ؟"

"ہاں یہی . . . . . لو تو ! میرے خاندان کی پُشت پر شرافت کا اُپشتارا ہے۔ میں جل بھی جاؤں تو یہ اُپشتارا نہیں جل سکتا۔"

"سارے ! تُو بزدل ہے تو پیار کا نبھانا کیا جانے۔ شادو مجھے اپنے باسی پیار کا ایک بچا کھچا قطرہ بھی بخش دے تو میں اُسے لے کر
ر بہت دُور چلا جاؤں گا۔ تُو تو آگ سے بچا رہے گا نا ؟"

ذن کی آواز آئی۔ بانکے کے گال پر تھپڑ سے تھے اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"ابھی تیرا پیار زندہ ہے سارے ! پر جب تیرا پیار خودکشی کی موت مر جائے تو میرا سندیسہ شادو تک ضرور پہنچا دینا۔"

ابھی شادو کی گلی سُونی اور سنسان بھی نہ ہوئی تھی کہ اُس کے پیار نے خودکشی کر لی۔

ابھی جینے کا ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا۔ نہ اُس نے شادو کے جانے کو ابھی کندھا دیا تھا کہ اُس نے شکست قبول کر لی تھی ! گلی اُس
ا سرِ شام ہی بجھ گئی گئی تھی کیونکہ اِس شام کی کوکھ سے کل جو سُورج نکلا تھا، وہ آج شام ہی بجھ گیا تھا اور رات کے اندھیروں میں سناٹے
بجے سے اور تھر تھراتے تھے اور اسرار اپنی بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ ابھی تک اُس نے لیمپ روشن نہیں کیا تھا۔ لیمپ روشن ہو بھی جاتا تو اُس
دل کی گلی تاریک رہتی !

اُس کی بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا اور کھلے دروازے میں سے گلی کا اندھیرا اندر آ رہا تھا !

"سارے !" اندھیرے میں ایک کرن چمکی۔ "میں آ گئی۔"

"تم کیوں آئیں شادو ! میں تو جل کر بجھ چکا ہوں۔ جا ! میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"سارے پیار کرنے والے جلتے رہتے ہیں۔ بجھتے نہیں۔ میرے پیار کو دھوکا نہ دے۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لے اور مجھے
چل۔ میں نے سُنا ہے خدا کی دُنیا بہت کھلی ہے۔"

"شادو ! میں مجبور ہوں۔ جاؤ ! کل چپکے سے ڈولی میں بیٹھ جانا۔ میں ڈولی کو کندھا دے دوں گا۔"

"سارے ! تُو تو بہت بزدل نکلا۔ بے وفا ! تُو میرے ساتھ اتنے قدم کیوں چلا۔ مجھے اب شُور دریا میں چھوڑ کر کہاں جا
رہے ہو ؟"

"کہیں بھی نہیں۔ میں اسی گلی میں رہوں گا شادو ! پر میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

اندھیرے میں آنسوؤں کی گرمی لپکی اور اسرار پسینے میں نہا گیا۔

وہ ایک قدم آگے بڑھی۔ اسرار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بڑھتی رہی۔ اسرار پیچھے ہٹتا رہا۔ پھر دیوار نے اُس کا رستہ روک
شادو نے اپنی آغوش پھیلا دی۔ اندھیرا سمٹ کر شادو کی آغوش میں سمٹ گیا اور اس آغوش میں اسرار کا پُورا وجود رچ گیا تھا۔ بھرپور آغوش میں
پیار کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک لمحہ اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ تو راکھ کا ایک ذرّہ ہے۔ وہ

[illegible] ایک لمس سے آگ کا بھبکا بن گیا تھا۔

وہ اندھیرے میں جاگا اور ابھی تک اس کے انگ انگ میں کنوارے پتے کی خوشبو بسی ہوئی تھی!

اور وہ رو پڑا۔

گلی رو پڑی۔ اندھیرے رو پڑے۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ کوئی بیوہ استری ہو جس کا سہاگ ایک لمحہ پہلے آباد ہوا اور

لُٹ اُجڑ گیا۔

دوسرے دن گلی اُجڑ گئی!

حالانکہ جنازے کا ایک شعلہ بھی نہ اُبھرا تھا پر شادو گلی کو چھوڑ گئی تھی۔ وہ گپ بازے کی جھپٹ کا ایک قطرہ اُڑا ہی لے گیا تھا آخر! گلی سنسان تھی حالانکہ اس میں بھانت بھانت کی باتوں کا شور تھا۔ شادو نے محلے کی عزت کا جنازہ نکال دیا تھا...... اس محلے کا نام ن[illegible] گیا ہے...... اس کلموہی نے محلے کی ناک کاٹ دی..... آخر وہ بیوہ تھی نا...... اتنا جوبن سنبھال نہ سکی.....

جوبن آیا ہو تو محلے کا نام اُجلا کیوں رہے.....

حمیدے کے نوکروں نے شادو کا سراغ لگا لیا۔

اتنی کھلی دُنیا میں اُنھیں چھپنے کو جگہ نہ مل سکی تھی۔ حمیدے نے نہ سہرا باندھا، نہ بینڈ بجوایا لیکن شادو کو ساتھ لے گیا۔

اچھا ہُوا کہ اسرار احمد اسرار کے جسم کی پشت پر شرافت کا کوہ ہمالیہ دھرا تھا، اپنے کندھوں پر شادو کی ڈولی کا بوجھ نہ اُ[illegible]

اُس دن سے اسرار احمد غزل کے شاعر ہو چکے تھے!

اور آج شادو مر چکی تھی!

اُس نے غلطی سے تیزاب کا ایک گھونٹ پی لیا تھا۔ اُس کے بیٹے منصور نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی جیسے اُس کے [illegible] ایک بوجھ اُتر گیا ہو!

تیزاب کا ایک گھونٹ..... شادو کو تیزاب کے ایک گھونٹ نے قتل کر دیا تھا..... نہیں.... اسرار احمد ا[illegible] اپنی سوچ کا دروازہ بند کر دیا کیونکہ اس دروازے سے ایک جھلسا دینے والی کرن اپنا راستہ بنا رہی تھی۔

شادو تو اُسی دن مر چکی تھی جس دن وہ حمیدے کے نکاح میں آئی تھی!

شاید.........

لیکن اس کا حسن سدا بہار تھا۔ وہ نکھرتا رہا پھر ناشی کی منزل کی طرف آہستہ آہستہ رواں چاند کی طرح۔ دیکھتے دیکھتے ماں بن گئی۔ منصور ابھی آٹھ سال کا تھا کہ حمیدا جس کی مونچھوں پر خضاب کی مستند جوانی کی سیاہی تھی اور جس کے [illegible]

تہیں تقسیم یک ایک غبارے کی طرح پھٹ گیا۔ اس کی جائداد تقسیم ہوئی تو شادو اپنے آبائی مکان میں اُٹھ آئی۔ فینسی ڈرائی کلیننگ اینڈا
ورکس کی دکان بند ہو گئی۔ شادو اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اسرار احمد اسرار میونسپلٹی میں ملازم ہو گئے اور ان کی ایک نہایت شر
گھرانے میں شادی ہو گئی۔ اب وہ شادو کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ پر نہ جانے کیوں جب کبھی وہ کسی عشقیہ شعر کی فکر میں ہوتے تو شا
اُن کے سامنے سنگار کیے آ کھڑی ہوتی اور انہیں اپنے الکاہ تازہ سے شادو کے کنوارپنے کی تیز خوشبو آنے لگتی اور وہ
کر رہ جاتے!

منصور سکول میں داخل تھا۔

شادو کو بچوں کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔

بڈھا باپ دینو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا اور اب شادو کو محسوس ہوا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اس نے یہ خلا محبت کے د
شیدے کے ساتھ نکاح کر کے پورا کر لیا۔ شیدا بھی صرف چند سال ساتھ نبا سکا اور ایک لڑکے کا تحفہ دے کر غائب ہو گیا۔ شیدے
بعد اس نے کسی سے نکاح نہ کیا۔ وہ ایک امیر گھرانے میں برتن مانجھنے پر ملازم ہو گئی۔ ایک دن گھر کے مالک نے کسی تقریب کے
ایک دس کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ نوٹوں کا یہ سلسلہ لامتناہی ہو گیا اور منصور پڑھتا رہا۔ اس کے بہن بھائی پلتے رہے۔ ایک دن
کی مالکہ نے شادو کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا!

شادو نے گھر کے دروازے چوپٹ کھول دیے۔

محلے والوں کی آنکھیں ذرا دیر سے کھلیں۔ دبی زبان میں باتیں ہوئیں اور باتوں کا شور بلند ہوا تو کھیتوں کی بھنبھناہٹ شا
کے گھر تک جا پہنچی۔

"دیکھو شادو! اب جو تم نے کام شروع کر دیا ہے، اس سے محلے کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہے گی۔ پہلے بھی تم نے
گھر سے بھاگ کر ہماری ناک کاٹ ڈالی تھی۔"

شادو محتاط ہو گئی!

اس نے کھلے دروازے کو بند کیا اور چور دروازہ کھول دیا۔

پھر محلے والوں نے ایک کانفرنس کی۔ اس میں اسرار احمد اسرار بھی شامل تھے۔ طے پایا کہ شادو کے گھر جا کر اسے متنبہ کر دیا
شادو نے دروازے پر ان کا سواگت کیا۔ اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کا
جائزہ لیا۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اسرار کے چہرے پر ٹھٹک گئیں۔

ان آنکھوں نے کہا: "تم بھی!"

اسرار احمد اسرار نے نظریں چرا لیں لیکن ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔ اسرار کو یوں لگا جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا
اب سیلاب آئے گا اور سارا محلہ ڈوب جائے گا۔ یہ لوگ ڈوب جائیں گے اور ان میں سے کوئی بھی اس سمندر میں سے اُبھر نہ سکے
کیونکہ ان سب کی پشتوں پر شرافت کا بوجھ لدا ہے۔

شادو نے پیچھے سے چور دروازہ بھی بند کر دیا!

اس نے منصور کو کام پر لگایا ۔ وہ آٹھ جماعتوں سے آگے نہ پڑھ سکا۔ پہلے شادو کو منصور سے کیا کیا امیدیں تھیں
منصور کپڑے دھوتا۔ شادو استری کرتی۔ کنبہ پلتا رہا۔ منصور جوان ہوا تو اس نے لانڈری کی دکان کھول لی۔ اس کا نام فینسی ڈرائی
کلیننگ اینڈ لانڈری سروس رکھا گیا۔ منصور کی دکان نے خوب ترقی کی اور اب اسے شادی کی فکر لگ گئی۔ لیکن اسے کسی شریف
دھوبی کے ہاں سے رشتہ نہیں مل رہا تھا!

اور منصور کو پہلی بار ماں پر غصہ آیا۔ ماں جس نے اس کی عزت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ یہ کھوئی ہوئی عزت
کہاں سے لاتے۔ منصور اپنی ماں شادو سے کھنچا کھنچا رہنے لگا پھر وہ بات بات پر ماں سے لڑنے لگا اور آخر اسے ماں کا وجود زہر
لگنے لگا!

اور اس دن اسرار نے دیکھا کہ منصور کے ہاتھ میں دو بوتلیں تھیں۔ دونوں میں کالے رنگ کی مائع بھری تھی۔ اس نے اسرار سے
علیک سلیک کے بعد کہا: "اماں آج کئی دنوں سے نزلے زکام میں مبتلا ہیں۔ ان کے لیے دوائی لایا ہوں۔"
"دونوں بوتلوں کا رنگ ایک ہی ہے۔"
"دوسری میں تیزاب ہے۔ بازار سے آتے ہوئے لے آیا۔ کل صبح دکان پہ لے جاؤں گا۔"
"تیزاب کس کام آتا ہے؟"
"ڈرائی کلیننگ میں ۔ . . . کپڑا رنگنے میں . . . ."
اور اسرار احمد یہ نہ کہہ سکے: "میاں منصور ان بوتلوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا۔"

اور اس رات شادو نے غلطی سے تیزاب کا گھونٹ پی لیا!
صبح طبی امداد ملنے سے پہلے پہلے وہ مر چکی تھی۔
ایک سیدھا سادا حادثہ تھا!
تیزاب کا ایک گھونٹ ایک سدا جوان عورت کو قتل کر گیا تھا!
شادو کا قاتل تیزاب کا ایک گھونٹ تھا!
منصور نے کتنی غلطی کی کہ کالے رنگ کی مائع کی دونوں بوتلوں کو خلط ملط کر دیا!
قاتل منصور تھا جس نے احتیاط نہ کی!
نہیں . . . . .
ہو سکتا ہے شادو نے خود اپنے آپ کو قتل کر لیا ہو۔

وہ مقصود کے رستے سے ہٹ جانا چاہتی ہو جیسے اُس کے گھناؤنے ماضی کی وجہ سے کوئی شریف رشتہ نہیں مل رہا تھا !

شادو کی قاتل شادو تھی . . . .

نہیں . . . . .

پھر قاتل کون تھا . . . . ایک گھونٹ . . . . . ایک حادثہ . . . . ایک لمحہ . . . .

نہیں . . . . .

اب یہ لمحہ قبر کی آغوش میں منوں مٹی کے نیچے دفن ہوگیا تھا !

اسرار قبر سے ہٹ کر دو قدم دُور چلے گئے۔

یہاں ایک بڑھا اوکاں کھڑا تھا اور اُس کی جھانجھنوں سے ایک ماتمی نغمہ بکھر رہا تھا مسلسل . . . . نغمۂ موت . . .

ببول اور بیر کی سوگوار جھاڑیوں پر صدیوں کی دھول جمی تھی !

اور لوگ قبرستان سے جا چکے تھے۔ صرف مقصود کھڑا تھا۔

کچھ عرصہ بعد مقصود بھی چلا گیا۔

تو قبرستان کا اسرار چاروں کھونٹ سے لپک کر آیا۔

جھانجھنوں سے پائل کی جھنکار اُٹھی۔

قبرستان کے آنگن میں موت رقص کرنے لگی۔ اُس کے پائل کی جھنکار میں آواز نہیں تھی۔

"تم کون ہو ؟"

پائل کی جھنکار مجسّم ہوگئی۔ اُس کے حسین چہرے پر موت کی زردی تھی۔

"میں ہوں شادو !"

"تم !"

اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ کانپ گیا۔ وہ ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ابھی ابھی تم پوچھ رہے تھے شادو کو کس نے قتل کیا ؟"

"ہاں !"

"جاننا چاہتے ہو اُس کا قاتل کون ہے ؟"

"نہیں !"

"سنو تو ! وہ قاتل تم ہو۔"

"نہیں !"

اُس نے سینہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کا گلا گھونٹ دیا !

اللہ کا حکم

احمد سعید

اس نوجوان کے ہاتھ جتنے پیسے لگتے وہ ان سے بہانے فروخت، پنجروں میں بند پرندے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر چھوڑ دیتا۔ انھیں بانس کی باریک باریک سلاخوں سے باہر نکالنے کے لیے وہ ہر دم بے چین رہتا۔ ننھے ننھے شرنے اور چھوٹی چھوٹی نیلی چڑیاں جب پھُر سے پنجرے سے باہر غول کی صورت میں ایک ہالے کی مانند نیم دائرہ بناتے ہوئے اُڑ جاتیں تو اُس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو ڈبڈبا آتے۔ اُسے بچپن ہی سے یہ شوق پیدا ہو گیا تھا جو آہستہ آہستہ جنون کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اگر اس کے پاس پرندے خرید کر انھیں رہا کرنے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو وہ بے چارے لوگوں کے مُرغے مُرغیاں، اور بعد ازاں پالتو جانور چھپے چوری چھوڑنے سے ملتا۔ پر اُسے یہ بات دیکھ کر حیرت ہوتی کہ وہ پھر اپنے مالک کے پاس آجاتے، اس لیے کہ اس کے ہاں ان کا پیٹ پلتا تھا اور وہ ہر خطرے سے محفوظ رہتے تھے۔ جبھی تو لوگ، اُس نے سوچا، ملازمت کرتے ہیں مگر اس کے باپ کی طرح غیر مطمئن رہتے ہیں۔ لیکن قدرت کی ہر چیز کتنی آزاد ہے اور آزاد رہ کر ہی زندہ رہتی ہے۔ اس کی سوچ کی ساری تان تو یہاں ٹوٹتی کہ پرندے اور جانور پنجروں میں بند رہنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے اُس نے اس معمہ کو حل کرنے میں اپنا بیشتر وقت ضائع کر دیا جسے دوسرے بچے اور نوجوان تعلیم حاصل کرنے میں صرف کرتے تاکہ اس سے فارغ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں۔

"جب بھوکا مرے گا تو آزاد رہنے کا مزہ چکھے گا۔ جان مار کر پیسے ہم کمائیں اور یہ نواب زادے انھیں پرندے چھڑانے کی نذر کر دیں۔ حد ہو گئی!!"

اس نوجوان کا باپ مدت سے سالہا سال سے سدھارنے کی بے سُود کوشش کرنے کے بعد ایک روز فیصلہ کن اور مایوسانہ انداز میں اس پر اس کی ماں کے سامنے دھاڑا۔ اس کے جواب میں وہ ایسے حرامخور اور بے حیا لیکن لاڈلے بیٹے پر اور اپنی پھوٹی قسمت پر آنسو بہایا کرتی۔ لیکن آج کا دن تو ان کی زندگی میں ایک موڑ بن کر آیا چونکہ باپ کے انتہائی درشت رویے کے باوجود اس پر رنج و ملال کے تاثرات پیدا ہونے کی بجائے اس پر ایک ناگفتہ بہ جلال اور سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور جب اُس کی ماں نے بھی اُسے ایک بیکار ہستی ٹھہرایا اور اُس نے شدید بیزاری ظاہر کی اور یہ کہا "کاش تم پیدا ہی نہ ہوتے اور ایسا روگ بن کر رہ جاتے" تو اس نے جواب دیا "ماں خوش ہو کہ اللہ نے مجھے کل رات حکم دیا ہے کہ میں نے ....."

"دُنیا کے سارے بندی پرندوں کو آزاد کرانا ہے۔"

اس کے جواب میں بیٹے کی آنکھیں کیسا جگمگا اٹھیں اور اُس نے کہا۔ "ہاں، تم نے آدھی بات ہی سمجھی...."

"میں نے سچ کہا ہے۔ اگر میں تیرے دل کی بات نہ سمجھوں گی تو اور کون سمجھے گا...... میری نظروں کے سامنے سے

جا!"

"برہنہ پیغمبر پر دُنیا پہلے ہنسا کرتی ہے ہاں۔"

"توبہ کر، توبہ۔ مردود۔ تیری یہ مجال!"

"ہاں میں نے رات خواب دیکھا ہے۔ اس میں اللہ میاں نے مجھے ———"

لڑکے کا فقرہ اس کے گال پر ماں کا زور سے ایک تھپڑ لگنے نے مکمل کر دیا۔ وہ خود خوف سے کانپنے لگی کہ اس لڑکے کو کیا ہے۔ اس کا دماغ تو کہیں نہیں چل گیا۔ ایسے شیر جیسے جوان پر یوں بھی ہاتھ اُٹھاتے کون نہ گھبراتا۔ لیکن لڑکے نے اس کے جواب میں سے سر جھکا دیا اور اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر پتھر کی مانند گر پڑا اور وہاں دیکھتے دیکھتے یوں سو گیا جیسے اُسے بڑی نیند ہو۔

ماں کے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے پر کھانا کھانے کے لیے اُٹھا، نیم خوابی کی سی حالت میں دو چار نوالے لیے اور پھر سو رہا۔ باپ ت باہر سے واپس آنے پر اس کی طرف دیکھنا تک گوارا نہ کیا لیکن ماں نے چپکے سے اس کے سرہانے بیس روپے کے نوٹ یے۔ حسب عادت وہ جب بھی اس پر خفا ہوتی تو اس کے سرہانے، سوتے وقت، کچھ پیسے چھوڑ جایا کرتی . . . . نے رات ایک خواب دیکھا تھا کہ پنجرے میں بند جانور بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اسے اپنے یں اللہ کا یہ حکم صادر ہوتا سنائی دیا۔ "اُٹھ میرے پیغمبر۔ جا اور سارے جانوروں کو آزاد کرا!"

جب لڑکے کا ہاتھ اتفاقاً کسی سرسراتی شے سے لگا تو اُسے وہاں بیس روپے کے نوٹ پڑے دکھائی دیے جنہیں اس ے فال کے طور پر تعبیر کیا۔

اُسی روز ریل کے ذریعے بارہ گھنٹے کی مسافت طے کر کے وہ لاہور پہنچا جہاں اُس نے اپنا مشن پورا کرنا تھا۔ دُور ہی سے اُسے سے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ چنانچہ اُسے چڑیا گھر کھلنے سے پہلے ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے باہر انتظار کرنا پڑا۔ اس کا دروازہ کھلتے ہی وُہ شیر کے پنجرے کی طرف لپکا۔

شیر پنجرے کے اندر بڑی طمانیت سے چکر لگا رہا تھا۔ نوجوان نے پنجرے کے قریب پہنچ کر اس سے سرگوشی میں کہا۔

"میں آگیا، میں آگیا۔ اب فکر نہ کرو۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے دونوں بازو اس کی طرف یوں پھیلا دیے جیسے اُسے اپنے ے لگا لینا چاہتا ہو۔ وہ ساتھ ساتھ مُنہ میں کچھ بُڑبُڑا رہا جیسے کوئی منتر پڑھ رہا ہو۔ جب شیر اس کی جانب آتا تو نوجوان کی آنکھیں وحشیانہ اور فتحمندانہ انداز میں پھیل جاتیں اور وہ اُسے اشاروں اشاروں میں کچھ کہتا دکھائی دیتا۔ اتنے میں پنجرے کے باہر تماشائیوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ نوجوان اس کی موجودگی سے بے خبر تھا حتیٰ کہ شیر یکدم اپنے اندرونی پنجرے میں چلا گیا۔ اس کے باعث نوجوان بے چین ہو کر پنجرے کا طواف کرنے لگا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ تماشائی بڑے متجسس اور قدرے فکرمند انداز میں اُسے دیکھنے ں ——— وُہ تو کٹہرے کے اندر چلا گیا تھا جہاں قدم رکھنا ممنوع تھا۔ اُس نے پنجرے کی سلاخوں میں سے ہاتھ اندر

والا کر شیر کو باہر جانے [illegible] ۔ اتنے میں "بابا! بابا!" کی آواز آئی۔ سنتے ہی کر شیر نے عجب انداز سے باہر نکلنا چاہا۔ نوجوان [illegible] لے کر [illegible] کو پکڑ کر زور سے باہر دھکیل دیا۔

"ہوش کرو، پاگل تو نہیں ہوگئے نوجوان!" یہ خان بابا! چڑیا گھر کا ہیڈ جمعدار تھا جو وہاں چالیس برس سے جانوروں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے شیر کی کمر پر تھپکی دی اور اسے مخصوص ہدایات دیتے ہوئے کہ کہ اس عرصہ میں نوجوان نے شیر کی طرف سنا پھولوں کا ہار پھینکتے دیکھا تو لپک کر اس کی گردن اپنے آہنی ہاتھ میں پکڑ لی۔

"پاگل۔ مرنے کا ارادہ ہے۔ کیا کرتا ہے!" خان بابا نے یہ کہتے ہوئے نوجوان کو دوبارہ کٹہرے سے باہر کھڑا کر دیا۔ اس کے جواب میں نوجوان نے پشتو میں کہا۔

"کل ۔ ۔ ۔ ۔ یا دو چار روز میں رام ہو جائے گا۔"

خان بابا اس کی بات سمجھ کر ہنس دیا۔ اُسے نوجوان پر رحم بھی آیا اور جانوروں سے پیار رکھنے پر اس کا دل پسیج بھی گیا۔ چنانچہ وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے ہمراہ دوسرے پنجروں کی جانب لے گیا جہاں شیر اور شیرنی بند تھے۔ نوجوان چونکہ چڑیا گھر میں اس کا ہم وطن تھا اس لیے وہ اس کی بولی سمجھ سکتا تھا۔

ان کے سوا سوائے گوشت کھانے کا کر دوسرے جنگلی جانور پنجروں کے اندر رفتار آلود انداز میں نیم دراز تھے۔ خان بابا نے انھیں بھی وہاں سے آواز دے کر اٹھایا تاکہ تماشائی انھیں دیکھ سکیں۔ انھیں قریب آنے پر پالتو جانوروں کی طرح پیار کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شیرنی کا چار پانچ [illegible] کا اُس کے پیچھے آ رہا تھا۔ خان نے اُسے ننھے منے کی طرح پیار کیا۔

تین چار روز تک نوجوان مسلسل قبل از وقت ہی چڑیا گھر آجاتا۔ اس کے باعث اس کا سارا عملہ اس سے قدرے مانوس ہوگیا۔

"خان۔ اسے بھی کسی پنجرے میں بند کر دو۔"

"نیا جانور!"

وہ ہنس کر رہ جاتے۔ شروع میں ان کی استہزا آمیز ہنسی پر وہ دل ہی دل میں کڑھ لیکن جب [illegible] خان بابا سے جنگلی جانوروں کو رام کرنے کا راز معلوم کرنے کی بجائے ان کی طرف رجوع کیا تو وہ اس سے تپاک سے ملنے لگے۔ چنانچہ وہ چڑیا گھر کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات کے علاوہ بھی اُسے کوئی منتر پڑھ پڑھ کر شیر اور شیرنی کے پنجرے کا طواف کرنے دیتے۔ علاوہ ازیں نوجوان نے جب کٹہرہ پار کر کے جانوروں کے قریب جانے سے بجرم گریز کرنا شروع کیا تو انھیں اُس کی جانب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔ تاہم خان بابا اُسے کٹہرے کے پاس دیکھ کر اُس سے ضرور خبردار کرتا اور اُس سے تعلقات بڑھانے سے روکتا۔

"خان بابا کو شیروں پر راج کرتے چالیس سال لگے ہیں۔" نوجوان دل ہی دل میں کہتا "لیکن میں ــــــ اگر وہ مجھے نہ روکے تو ــــــ"

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سات آٹھ روز میں نوجوان نے چوکیداروں کی خاطر تواضع پر سب پیسے خرچ کر ڈالے تو اُنھوں نے اس سے مُنہ موڑ لیا۔ اس کے اطوار دیکھ کر اُنھوں نے کہا: کیسے پاگل سے پالا پڑا ہے۔ کہیں کچھ کر بیٹھا تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا، ورنہ کہیں خان بابا ہی سپرنٹنڈنٹ صاحب سے شکایت نہ کر دے۔ اگر جانوروں سے اتنا پیار ہے تو چڑیا گھر میں نوکری کیوں نہیں کر لیتا۔"

ایک رات جب سب چوکیدار سو رہے تھے اور کبھی کبھار گیدڑ اور اُلّو بولنے کے سوا چڑیا گھر پر سکوت مسلط تھا تو ایک سایہ اس کا داخلی دروازہ پھاند کر اس کے اندر داخل ہوا اور چھپتا چھپاتا شیرنی کے پنجرے کی جانب لپکا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں کچھ پکڑا ہوا تھا۔ ایک چوڑی اور پھولی ہوئی چیز، دُوسری لمبوتری۔ کچھ وقفے کے بعد شیرنی کے پنجرے کے تالے پر زور سے ایک دو ضربیں لگنے کی آواز آئی۔ جب تالہ نہ ٹوٹا تو ایک اور چوٹ لگی۔ یہ بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اس پر سایہ بجلی کی مانند پنجرے کی دُوسری جانب بڑھا۔ اس کے اندر سے جانور اپنے اپنے پنجروں کی طرف جاتے تھے۔ اب تالے پر اینٹ سے چند وار ہونے اور پنجرے کے اندر سے شیرنی کے کسمسانے اور غرانے کی آواز آئی۔ معاً خطرے کا الارم ہوا۔ چوکیدار جاگ اُٹھا۔ شاید چوری ہو رہی تھی۔ لیکن سایہ الارم سے بے خبر رہا۔ آخر کار وہ تالہ توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ تالا گر پڑا۔ سائے نے پنجرے کا دروازہ اندر کو دھکیلا ——— ایک دیو قامت انسان اسے پُوری طاقت سے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ اسے آدھا ہی کھول سکا۔ اس دوران کچھ چوکیدار ان پنجروں کی طرف لپکے جدھر سے آواز آئی تھی۔ اب سائے نے ایک ٹوکری پنجرے کے دروازے کے پاس رکھ دی اور خود آگے ہو کر یوں بیٹھ گیا کہ اس کے پاؤں باہر نکل گئے۔ نیم تاریکی میں دو شعلہ بار آنکھیں اودھر بڑھیں اور سائے کو اپنے قریب شیرنی کی مخصوص بُو اور گرمی قریب سے قریب تر آتی محسوس ہوئی حتیٰ کہ اس کا سانس اُس کے کندھے اور گردن کو چھونے لگا۔

"آؤ۔ آؤ۔ میں تمھیں آزاد کرنے آیا ہوں۔" سایہ بولا۔

شیرنی نے پہلے کچھ سونگھا ——— پھولوں سے بھری ایک ٹوکری ——— پھر معاً اس کے دانت سائے کے کندھے میں کھب گئے۔ کرب کی ایک آواز آئی اور اُسے اپنا کندھا اور بازو اُترتا محسوس ہوا۔ سائے نے اس پر لمبی لوہے کی سلاخ زور سے شیرنی پر مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا لیکن یہ ادھ کھلے دروازے سے ٹکرا کر گر گئی۔

"خان بابا۔ بندوق!"

"نہیں نہیں۔ خان کو ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پاگل ۔ ۔ ۔ ۔ پاگل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شیرنی کا پنجرہ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی حفاظت کرو۔" خان بابا چلّاتا ہوا پنجرے کی جانب لپکا۔

"رُسّی بابر" وہ پنجرے کے قریب پہنچ کر کڑکا۔ اُس نے دیکھا کہ اس کے نیم وا دروازے میں سے بابر باہر نکل رہا تھا۔ اس کے الٹے پاؤں باہر تھے۔

"بابر!" خان بابا کی آواز سُنتے ہی وہ معاً پیچھے مُڑ گیا اور بابا کے بوڑھے بازوؤں میں نہ جانے اس وقت کہاں سے اتنی بے پناہ قوت

آگئی کہ اُس نے [illegible] بند کر دیا۔

[illegible]۔ واکر واکر شکر ہے!" اُس نے [illegible] آخری اپنے آپ پر خان بابا کو شعلوں میں پڑتے دیکھ کر مٹتے ہوئے کا جنگل پر گیا
نے بندوقوں سے بچ بچا [illegible] نے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

تو کہیں دُور بیٹھی سائے کا سالم بازو چبا رہی تھی۔ اب دُور سے اِتنا پانی کی آواز آئی۔ یہ مجروح نوجوان تھا جو دریا کی راہ نکالے بغیر خون کا قطرہ چھوڑتے ہوئے واپس جا رہا تھا کہ گھر کے راستے میں ایک چوکیدار نے دبوچ لیا۔ اس پر نوجوان نے سامنے سے وار کرنا چاہا لیکن نے اس کا وار اوچھا کر دیا۔

"اللہ کا حکم ہے۔ تم مجھے روکنے والے کون ہو" نوجوان نے پشتو میں کہا۔

"جانور خدمت اور پیار سے رام ہوتا ہے۔" خان بابا نے جواب دیا۔

نوجوان کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ تین چار گھنٹے میں مر گیا۔

"جانوروں کو آزاد کر دو۔ آزاد" یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔

کرسی

ستیش بترا

مسٹر اینڈرسن اپنے ایرکنڈیشنڈ کیبن میں بیٹھے ڈاک پر دستخط کر رہے تھے۔ یہ اُن کا دفتر میں آخری دن تھا۔ اُن سے ذرا پیچھے نہایت ادب سے کھڑی اُن کی سیکرٹری مس واڈیا باری باری ٹائپ شُدہ خط پیش کرتی اور اینڈرسن دستخط کرتے ہوئے کبھی کوئی سوال پوچھ اُٹھتے تو وہ نہایت انکساری سے مطلوبہ معلومات فراہم کر دیتی۔ مسٹر اینڈرسن کو مس واڈیا کی فرمانبرداری، اُس کی کاروباری معاملوں کو سمجھنے کی سوجھ بوجھ اور ٹیپ ریکارڈر سی یادداشت نے ہمیشہ متاثر کیا تھا۔ وہ اکثر فرم کے ڈائرکٹروں اور اعلیٰ افسروں سے کہا کرتے "مس واڈیا تو اس فرم کی چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہے!"

جب مسٹر اینڈرسن آخری خط پر دستخط کر چکے تو اُنھوں نے اپنی سنہری عینک اُتار کر میز پر رکھ دی۔ اور اپنی نیلگوں آنکھوں کو ہتھیلیوں کی پُشت سے ملتے ہوئے مس واڈیا کی طرف دیکھا اور پھر اُن کا مہربان بڑھا ہوا چہرہ مُسکرا دیا۔

"مس واڈیا! تیس سال کے لمبے عرصے کے بعد میں آج اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔ آج اس فرم کو شروع ہوئے بھی اتنا ہی عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن پچھلے پندرہ برسوں میں جس رفتار سے فرم کا کام بڑھا ہے اور جس طرح سے ان بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کو نبھانے میں جو مدد تم نے مجھے دی ہے میں اُس کے لیے بے حد شکرگزار ہوں!" اور وہ اُس سے ہاتھ ملانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مس واڈیا کا دُبلا پتلا وجود جیسے ایک لمحے کے لیے لرز گیا۔ اُسے مسٹر اینڈرسن کے ساتھ کام کرنے میں جو لطف آیا تھا وہ اُسے کبھی بھی نہ بھلا سکے گی۔ اُس کا گلا شدتِ جذبات سے بھر آیا۔

"میں آپ کی مہربانیوں کو کبھی نہیں بھلا سکتی سر! میں بلکہ فرم کے سب لوگ آپ کو ہمیشہ [illegible] کریں گے!" اُس نے آگے بڑھ کر مسٹر اینڈرسن کا ہاتھ تھام لیا۔

مسٹر اینڈرسن شفقت بھری نگاہوں سے اُس کی طرف چند لمحے دیکھتے رہے اور پھر اُن کے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔ "مس واڈیا۔ میں تمہاری ان اَن تھک خدمات کے لیے ایک نہایت معمولی سا تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں!" اُنھوں نے میز کا دراز کھولا اور ایک سونے کی گھڑی نکال کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دی۔

"مسٹر اینڈرسن!" وہ اتنا قیمتی تحفہ دیکھ کر چونک پڑی اور پھر اُس نے شدتِ جذبات سے مسٹر اینڈرسن کی ہتھیلی کی پُشت کا بوسہ لیا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

مسٹر اینڈرسن نے اُس کی پیٹھ کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا "دیکھو۔ دیکھو! اب بچے نہ بنو!"

مس واڈیا نے رومال سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے ڈاک کے کاغذوں کو سنبھالتے ہوئے کہا: "کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ کل سے اینڈرسن اینڈ گراہم لمیٹڈ کی اس فرم میں اینڈرسن نہ ہوں گے!"

"دُنیا کا یہی دستور ہے مس واڈیا!" اینڈرسن نے فلسفیانہ انداز میں اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر انھوں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی "ارے! ساڑھے پانچ بج چکے ہیں! مس واڈیا اب تم گھر جا سکتی ہو! میں ابھی کچھ دیر اور بیٹھوں گا! بائی بائی مس واڈیا!"

وہ اُسے دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئے۔

"گڈ بائی سر، گاڈ بلیس یو!" اور مس واڈیا کیبن کا دروازہ آہستگی سے بند کرتے ہوئے، سسکیوں کو رومال میں دباتے باہر چلی گئی۔

مس واڈیا کے جانے کے بعد مسٹر اینڈرسن کی نگاہیں کمرے میں پڑی ہوئی فائیلنگ کیبنٹ سے ٹکرائیں، آدم قد کاروباری نقشے سے پھسلیں، اپنے سامنے پڑے ہوئے کمان کی طرح خمیدہ میز کی چمکدار سیاہ سطح میں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔ کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے دبیز، بادامی پردے گنجان شکنوں میں بٹے، فرش پر متحرک سے تھے۔ کھڑکی کے پاس کسی بیلچے کی طرح، ڈوری سے بندھے سرخ پردے لٹک رہے تھے اور ان کے درمیان سے ایرکنڈیشنر کمرے میں چھنتی ہوئی ٹھنڈی ہوا پھینک رہا تھا۔ دائیں طرف دیوار پر لگے ہوئے ہندوستان کے نقشے پر چار بہت سے سرخ پِن اور آٹھ نیلے پِن لگے ہوئے تھے۔ سرخ پِن کمپنی کے زونل دفتروں کی نشاندہی کرتے تھے اور نیلے پِن کمپنی کی مختلف شاخوں کی! پچھلے پندرہ سالوں میں اینڈرسن اور گراہم کے مشترکہ ہاتھوں سے لگایا ہوا پودا تیزی سے ایک مضبوط گھنے سایہ دار درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اُس کے ٹھنڈے سائے کے نیچے اب تین ہزار سے زیادہ شخص اپنی روزی کما رہے تھے۔ مسٹر اینڈرسن کو وہ دن نہایت اچھی طرح یاد تھا جب آج سے تیس سال پہلے انھوں نے اپنے ایک جگری دوست گراہم کے ساتھ بمبئی میں ایک چھوٹے سے دفتر "اینڈرسن اینڈ گراہم" کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اُس وقت اُن کے پاس صرف ایک سٹینوگرافر تھی اور دو نوجوان محنتی کلرک۔ اور پھر یہ چھوٹا سا ایک کمرے پر مشتمل دفتر فورٹ کی کئی مشہور بلڈنگوں سے زیادہ اور پھر اور زیادہ جگہ کی تلاش میں منتقل ہوتا آج بیلارڈ اسٹیٹ کی ایک عالیشان ایرکنڈیشنڈ بلڈنگ کے پورے دو فلوروں کو بھی ناکافی پا رہا تھا۔

مسٹر اینڈرسن کی میز آج بالکل خالی ہو چکی تھی۔ ٹرے میں، ساتھ لگے ہوئے اسٹینڈ پر خلافِ معمول ایک بھی فائل نہ تھی، ایک بھی کاغذ نہ تھا! وہ ایک لمحہ کے لیے خوشی سے مسکرا اُٹھے۔ وہ آج بالکل آزاد تھے! انھیں اب فرم کے کسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انھوں نے کونے میں پڑے ہوئے ریوالونگ بک ریک کو زور سے گھمایا۔ ریک میں لگی ہوئی کمپنی لا، بزنس منیجمنٹ اور ٹیکس سے متعلق موٹی موٹی کتابیں تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی میری۔گو۔راؤنڈ (Merry - go - round) کی گھومنے والی ہاتھی نما نشستیں ہوں۔ سامنے دیوار پر 'بکری' اور 'فائدہ' کے گراف کی درجہ بدرجہ اُبھرتی لکیریں گویا چھت کو چھونے لگی ہوں۔ یہ پیٹ بھرے ہوئے ہاتھی اور نرگس کے پھول ہی سے کمرہ ہمیشہ معطر رہتا تھا، یہ لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے ہوں۔ انھوں نے میز پر سے پیپر ویٹ

اُٹھایا اور اُسے اِس ہاتھ سے اُس ہاتھ میں اُچھالنے لگے۔

دروازہ پر ایک جانی پہچانی دستک ہوئی۔

"کم اِن جیکی!" اُن کی آواز میں ایک کھلنڈراپن اُبھر آیا۔ اُن کا قیاس بالکل درست تھا۔ وہ جیک گراہم ہی تھا!

"اینڈی! تم آج ہم سے الگ ہو رہے ہو۔ میں نے سوچا ایک ریٹائر ہونے والے ڈائریکٹر کے حضور میں اپنا سلام بجا لاؤں!"

"اوہ ڈونٹ بی سلی جیکی!" اینڈرسن نے اُٹھ کر گراہم کو کندھوں پر دباؤ ڈال کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں فرم سے جُدا ہو رہا ہوں۔ تُم سے تو نہیں! میں ویسے بھی اب فرم کی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ فرم کو جوان خون کی ضرورت ہے!"

"اور تجربہ کی بھی!"

"وہ تجربہ تو تمہارے مجسّم رُوپ میں موجود ہے ہی!" اینڈرسن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تمہارے نئے ڈائریکٹرز ہے۔ بی پٹیل کا جوش اور اُمنگ اور تمہارا جاندیدہ تجربہ اس فرم کو اور دُور تک لے جائیں گے! میرے لیے کیا اتنا فخر کم ہے کہ اس فرم کے نام کے ساتھ میرا حقیر نام بھی منسلک ہے!" اور پھر وہ ہنس دیے۔

"یاد ہے وہ دن جب تم نے اس فرم کو شروع کرنے کا پلان میرے سامنے رکھا تھا! میں تو کچھ عرصہ کے لیے کانپ گیا تھا!"

"اینڈی! تم تو بخوبی جانتے ہو کہ اس فرم کو چلانے میں ہمارے لیے آزمائش کے کئی مواقع آئے اور جب بھی میرے قدم ڈگمگائے تو ہمیشہ تمہاری ثابت قدمی اور خود اعتمادی نے مجھے سہارا دیا۔ یاد ہے وہ ہڑتال جب یونین نے اپنی ناجائز مانگیں ہمارے سامنے رکھی تھیں اور تم نے ان مانگوں والے کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے کتنی خود اعتمادی سے کہا تھا 'اینڈرسن اور گراہم کی فرم فورڈ کے ایک گمنام کمرے سے محض پانچ آدمیوں سے شروع ہوئی تھی۔ اینڈرسن اور گراہم کے بازوؤں اور دماغ میں اب بھی اتنی ہمت اور طاقت ہے کہ وہ ایسی ہی کئی فرموں کو پھر سے جنم دے سکیں۔'"

مسٹر اینڈرسن مسکرا دیے۔

اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور تھوڑے سے کھلے دروازے میں سے پٹیل کے لمبے لمبے گھونگریالے بالوں سے بھرے سر نے اندر جھانکا۔

"کم اِن جے پی۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں صرف تمہاری کسر باقی تھی!" مسٹر اینڈرسن نے اپنی پُرجوش آواز میں شرارت بھرے انداز میں کہا۔

"مسٹر اینڈرسن! میں اِس آخری روز آپ سے ملنے کی سعادت چاہتا تھا!" اُس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھا دیا۔

کہنے لگا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ ریٹائر ہونے کے بعد بھی فرم سے دلچسپی جاری رکھیں گے اور ہمیں آپ کے دیرینہ تجربے کا فیض نصیب ہوتا رہے گا۔"

جے۔ پی۔ چیپل فرم کا ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ مینیجنگ ایجنسی میں بھی گراہم اور اینڈرسن کے ساتھ تیسرا ساجھی تھا۔ دراصل ایک فرم میں سرمائے کی ضرورت پڑنے پر چیپل کے مرحوم باپ نے مینیجنگ ایجنسی میں حصے کے عوض سرمایہ لگانے کی پیشکش کی تھی اور اب جب کہ اینڈرسن ریٹائر ہو رہے تھے انھوں نے مینیجنگ ایجنسی میں اپنا حصہ گراہم اور چیپل کو بیچ دیا تھا۔

"اچھا مسٹر اینڈرسن! مجھے چند لوگوں کو لینے کے لیے ہوائی اڈے پر پہنچنا ہے ——— میں اب آپ سے رخصت چاہوں گا وش یو دی ویری بیسٹ (Wish you the very Best!)" اور وہ ہاتھ ہلاتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

"اچھا لڑکا ہے!" اینڈرسن نے کہا۔

"لیکن یہ وقت پڑنے پر کبھی کبھی ضدی بھی ثابت ہو سکتا ہے!" گراہم نے کہا۔

"جوان ہے! وقت کے تھپیڑے سب کو راہِ راست پر لے آتے ہیں!"

"اچھا اینڈی! میں بھی چلوں گا! تمھارے کیا ارادے ہیں! تم نہیں چل رہے کیا؟"

"نہیں جیکی! میں ——— میں ذرا کچھ دیر اور ٹھیروں گا!"

"میں سمجھتا ہوں اینڈی! یہ پودا تمھارے ہاتھوں کا ہی لگایا ہوا ہے جسے تم نے دن رات محنت کر کے اپنے خون اور پسینے سے سینچا ہے! تمھیں اس کا رُواں رُواں عزیز ہے! تمھیں اس سے بچھڑنے ہونے کتنی تکلیف ہو رہی ہو گی!"

"نہیں جیکی! تم تو جانتے ہو میں اتنا زیادہ جذباتی نہیں ہوں۔ لیکن پھر بھی میں کچھ دیر اور رُکنا چاہوں گا!"

"فرم چھوڑنے کے بارے میں تم اب بھی اپنا فیصلہ بدل سکتے ہو، اینڈی!"

"نہیں اب میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے، جیکی۔ میں اب تھک گیا ہوں۔ مجھے آرام اور چین چاہیے اور وہ بزنس میں نہیں مل سکتا"

"ٹھیک ہے اینڈی! مجھے تمھارے خیالات کا احترام ہے! اچھا اب میں چلتا ہوں!"

گراہم کے چلے جانے کے بعد وہ دیر تک کسی سوچ میں کھوئے اپنے کمرے میں بیٹھے رہے گویا وہ زندگی بھر کے گزرے ہوئے وقت کو چند مختصر لمحوں میں سمو دینا چاہتے ہوں۔ اینڈرسن اینڈ گراہم لمیٹڈ نام کا فرم تھا اُن کا شاہکار، دنیا کو اُن کی دین! اُن کی ساری زندگی کا حاصل اور نچوڑ! وہ دھیرے سے اُٹھے اور اپنے کیبن سے باہر کشادہ ہال میں نکل آئے جہاں زیتونی رنگ کی آہنی میزوں اور کرسیوں کی لمبی قطاریں ہال بھر کی وسعت میں الماریوں کے درمیان نہایت ترتیب سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ہال بالکل خالی تھا۔ سنسان۔ ٹائپ رائٹروں کی کھٹ کھٹ، ٹیلیفون کی ہنٹ ہنٹ پر بجنے والی گھنٹیاں، چہکتی چہکتی نسوانی آوازیں، پھرتی سے اِدھر اُدھر گھومتے قدموں کی بھیڑ کے بغیر یہ ہال بالکل ویران معلوم ہو رہا تھا۔ ہر صبح کی طرح یہ ہال کل پھر بھر جائے گا، پھر وہی شاف کی چہل پہل، پھر وہی جانا پہچانا شور۔

گا —— لیکن اس وقت تو یہاں بالکل سناٹا تھا۔ اس ویرانی میں ہال کی کرسیاں اور میز بالکل غمگین نظر آ رہے تھے حتیٰ کہ بین دروازے کے
پر لگے ہوئے بگل کے کلاک کی ٹک ٹک بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ تمام میز کرسیاں، الماریاں ایک ایک کر کے اُن کی نظروں کے سامنے پھیل
گئیں۔ یہ اتنی بڑی تعداد کیسے ہو گئی؟ کیونکر ہو گئی؟ پانچ آدمیوں سے تین ہزار! تین ہزار خاندان اس فرم کی بدولت اپنی زندگی بسر کر رہے
تھے! اس شاندار ترقی میں اُن کا کتنا بڑا ہاتھ تھا! وہ رکتے، جھکتے، گردن گھماتے، دھیرے دھیرے چلتے، دروازے کے قریب پہنچ
گئے۔ دربان نے نہایت ادب سے دروازہ کھول دیا۔

"اچھا جوزف بائی بائی!" اور دربان نے نہایت چستی سے سلیوٹ مار دی۔ اُنھوں نے مسکراتے ہوئے ہلکے سے سر
ہلا دیا۔

"آج سلیوٹ نہیں!" اور اُنھوں نے اپنا ہاتھ دربان کی طرف بڑھا دیا۔ جوزف ایک لمحہ بھونچکا سا رہ گیا! اور پھر اُس نے
جلدی سے مسٹر اینڈرسن کا ہاتھ تھام لیا اور اُسے آنکھوں سے لگا لیا۔ جب اُس نے سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ مسٹر اینڈرسن
نے اُس کے کاندھوں کو تھپتھپایا اور بلڈنگ سے باہر آ گئے

سفید بے داغ وردی میں ملبوس شوفر نے نہایت ادب سے آگے بڑھ کر دمکتی ہوئی سیاہ پونٹیک کار کا دروازہ کھول دیا۔
اور زندگی سے تھکے ماندے اینڈرسن کار میں بیٹھ گئے۔

اگلے روز صبح سوا نو بجے دفتر میں روزمرہ کی طرح چہل پہل تھی۔ چند لوگ گروہوں میں بٹے، کسی ڈیسک کے گرد دوستوں سے خوش گپیوں
میں مشغول تھے۔ کچھ لوگ باری باری دفتر میں چلے آ رہے تھے۔ ہر آنے والے کے ساتھ 'ہیلو'، 'گڈ مارننگ' کا شور اُٹھتا اور پھر وہ دفتر
کی بڑھتی ہوئی آبادی میں اپنے مقرر شدہ کونے میں جذب ہو جاتا۔ اس شور میں نسوانی آوازیں اور قہقہے نہایت صاف طور پر سنائی دیتے
تھے بے باک مذاق، کہیں دبی دبی ہنسی۔ دفتر کی سفید نیلونوں کے جمپروں، خوشنما اور رنگین سکرٹوں سے گوری گوری ٹانگیں جھانکتی، ہال
کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتی، اِدھر اُدھر جا رہی تھیں۔ دفتر ٹھیک ساڑھے نو بجے لگتا تھا۔ ان آخری پندرہ منٹوں میں شور کی لے دھیرے دھیرے
اتنی دھیمی ہوتی چلی جاتی تھی کہ ساڑھے نو بجے ٹائپ رائٹروں کی کھٹ کھٹ یا چند دبی دبی سرگوشیوں کے علاوہ ہال پر ایک عجیب قسم کی
خاموشی قبضہ جما لیتی۔ اور پھر آہستہ آہستہ دس بجے کے قریب جب فرم کے گاہک اور باہر کے لوگ آنے لگتے تو یہ شور ایک نیا سُر بدل
لیتا۔ باہر سے آنے والوں کی ضرورت سے زیادہ بلند آوازیں اور اندر کے لوگوں کا مسکرا کر مہذب گفتگو کرنے کا طریقہ، ایک مخصوص کاروباری
شور میں ڈھل جاتا۔

گراہم کی سیکرٹری مس ہیربرٹ باتھ روم سے اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک، گالوں پر سُرخی اور پاؤڈر لگا کر ابھی ابھی لوٹی تھی اور فائلنگ
کیبنٹ کھول کر کچھ فائلیں نکال رہی تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک گئی۔ مسٹر گپتا جنھوں نے ابھی ابھی سگار سلگایا ہی تھا، جلتی ہوئی دیاسلائی
پکڑے، حیرت سے بت بن کر رہ گئے۔ مس گھوش والا کی پھرتی سے ٹائپ کرتی ہوئی انگلیاں ٹھہر گئیں۔ مسٹر شیشی جنھوں نے ایک نہایت ضروری خط

کھیلنا شروع کیا تھا، جیتے جیتے یکدم رُک گئے۔ دو حسین گردنیں اور نگاہیں ایک ساتھ مڑ گئیں۔ دروازے پر لگا ہوا کلاک ساڑھے نو بجا رہا تھا اور اُس کے ساتھ ہی کھلے دروازے میں سے فرم کے ریٹائر شدہ ڈائریکٹر مسٹر اینڈرسن ــــ روزمرہ کی طرح آج بھی داخل ہوتے دیکھے۔ سب نے صرف اتنا نوٹ کیا کہ اُن کے ہاتھ میں معمول کے مطابق آج بیگ کی بجائے صرف اخبار .... تھا۔ وہ اخبار والے ہاتھ کو اپنے مخصوص انداز سے سر کے اوپر لہراتے، سب کو "گڈ مارننگ" کہتے اپنے کیبن کی طرف بڑھ گئے۔

مسٹر گوپال کے ہاتھ میں دیا سلائی کا شعلہ اُن کی انگلیوں کو جلانے لگا تھا اور انھوں نے "ڈیم اِٹ" کہتے ہوئے دیا سلائی کی تیلی ایش ٹرے میں پھینک دی۔ خط لکھواتے ہوئے مسٹر شیٹی نے اپنی سٹینو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تو مسٹر اینڈرسن کو دوبارہ بھی اعزازی پارٹی فائدت ہو گئی!" مس گورے والا کا تعجب بے اختیار اُٹھ کر کھلوں سے نکل کر سوالیہ فقرہ بن گیا۔ فائلیں نکالتی ہوئی مس ہیریٹ نے مس واڈیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یور باس!" اور پھر اُس نے ایک ادا سے اپنی ایک انگلی اپنے گھنگھریالے سر کے پاس سے گھمائی جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ مس واڈیا دیکھو تمھارے باس کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہو گیا ہے۔

مس واڈیا بھی اینڈرسن کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ شاید مسٹر اینڈرسن کوئی ضروری کاغذ بھول گئے تھے جس کی وجہ سے انھیں آج پھر دفتر آنا پڑا تھا۔ لیکن یہ ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ مسٹر اینڈرسن اپنے کام کاج میں جس قدر تفصیل سے دلچسپی لیتے تھے، شاید ہی فرم میں کوئی دوسرا لیتا ہو گا۔ اور پھر اُن کے ذاتی کاغذات کے تمام فائل پچھلے ہفتے ہی اُن کے بنگلے پر بھیجے جا چکے تھے۔ اب تو اُن کے کمرے میں کوئی کاغذ تھا۔ پھر کیا وجہ تھی؟ مسٹر اینڈرسن کو بغیر اطلاع دیے کسی کا اُن کے دفتر میں آنا پسند نہ تھا۔ وہ ضرورت پڑنے پر خود ہی سیکرٹری کو بلانے کے قائل تھے۔ وہ بڑی بے صبری سے انٹر کام Intercom پر بلاوے کا انتظار کرنے لگی۔

ایک گھنٹے سے زیادہ گزر گیا لیکن مس واڈیا کے لیے مسٹر اینڈرسن کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آیا۔ دفتر میں چہ میگوئیاں بڑھ گئیں۔ مس گورے والا کا جی بھی اس راز کو جاننے کے لیے بے حد بے چین ہو رہا تھا۔ وہ باتھ روم جانے کے بہانے مسٹر اینڈرسن کے کیبن کے سامنے سے گزری اور دروازے میں لگے ہوئے بیضوی شیشے میں سے جھانک کر اُلٹے پاؤں مس واڈیا کی طرف لپکی۔

"مس واڈیا! مس واڈیا!" اُس کی آواز میں ایک عجیب گھبراہٹ اور حیرت کا عنصر تھا گویا وہ کوئی ناممکن چیز دیکھ کر آ رہی ہو۔

مس ہیریٹ اور کیبن میں دوسری بیٹھی ہوئی سٹینو گرافر اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر مس واڈیا کی میز کے پاس پہنچ گئیں۔

"مس واڈیا! آپ کا باس تو بڑے مزے سے میز پر دونوں ٹانگیں چڑھائے، سگار پیتا، دھواں چھوڑتا، اخبار پڑھ رہا ہے!" مسٹر اینڈرسن سے ایسی توقع کرنا واقعی کچھ عجب سا معلوم ہوتا تھا۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"اچھا!" مس واڈیا بھی اپنے تعجب کو چھپا نہ سکی۔

"ارے اخبار ہی پڑھنا تھا تو اپنی کوٹھی کا برآمدہ کیا کافی تھا!" مس ہیریٹ نے چوٹ کی۔ اور پھر "بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں"

اد کرشا نے جلدی جلدی اپنے میز پر ٹائپ کرنے میں مشغول ہو گئی۔ سب لڑکیاں اپنی اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئیں۔

مس واڈیا کو مس لیمبرٹ کا یہ جملہ اپنے باس کی شان میں زیادہ اچھا نہ لگا۔ جیسے واقعی مسٹر اینڈرسن نے ریٹائر ہونے کے بعد دفتر میں آکر کوئی بھول کی ہو۔ اس نے کچھ سوچ کر مسٹر اینڈرسن کے کیبن میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مسٹر اینڈرسن کے کیبن کے قریب پہنچ کر اس نے پہلے بیضوی شیشے میں سے ایک سرسری لیکن پُرمعنی انداز سے اندر جھانکا۔ مس اُنے والا واقعی ٹھیک کہہ رہی تھیں اُس نے پچھلے پندرہ سالوں میں مسٹر اینڈرسن کو کبھی اس انداز میں نہیں دیکھا تھا۔ اس نے نہایت ادب سے دستک دی۔ اندر سے مسٹر اینڈرسن کی جانی پہچانی آواز سُنائی دی۔

"کم اِن !"

اُس نے نہایت تپاک سے دروازہ کھولا اور جگمگاتا ہُوا سر لیے اندر داخل ہو گئی۔

"میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں سر ؟"

مسٹر اینڈرسن نے اخبار بند کرتے ہوئے میز سے ٹانگیں ہٹا لیں۔

"او مس واڈیا۔ تم ! تمھیں اس کمرے میں کوئی فرق محسوس ہو رہا ہے ؟ دیکھو اس کمرے میں کتنی شانتی ہے، کتنا سکون ! کل تک یہاں ٹیلیفون کی گھنٹیاں متواتر بجتی رہتی تھیں، ہر کوئی، ہر لمحہ اپنا مسئلہ حل کروانے یا میری رائے لینے گھُسا آتا تھا۔ میں ان سب سے پریشان ہو گیا تھا۔ میرے دل میں بڑی خواہش تھی کہ میں ایک بار اس کیبن میں ایسی ہی خاموشی اور شانتی کو محسوس کر سکوں ! زندگی محض معروفیات کا نام ہی تو نہیں کل تک معروفیات میری زندگی کو دھکیلے آ رہی تھیں، آج میں اُن پر حاوی ہُوں ! زندگی میرے اشارے پر ناچ سکتی ہے ! میں چاہوں تو اسی وقت دفتر سے اُٹھ کر جا سکتا ہُوں۔ کل تک میں ایسا کرنے کے لیے ترس گیا تھا ! یہ کُرسی میرے پاؤں میں زنجیر باندھے ہوئے تھی لیکن آج ——— میں آزاد ہوں، خُود مختار ہوں، جو چاہوں کر سکتا ہُوں !" اور اُنھوں نے تیزی سے میز کے قریب رکھا ہُوا ٹیبل لیمپ گھما دیا۔

اتنے میں ایک جانی پہچانی دستک سُنائی دی اور پل بھر میں گراہم نے اندر جھانکا۔ وہ جیسے اینڈرسن کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے چونک گیا۔ اور پھر وہ مُسکراتا ہُوا بولا۔ "اینڈی تم آج یہاں ؟" اور پھر اُس نے گھومتے ہُوئے ٹیبل لیمپ کی طرف دیکھا۔

"بڑے اچھے مُوڈ میں ہو اینڈی !"

"ہاں جیکی۔ میں محسوس کرنا چاہتا تھا کہ ذمّہ داریوں کا کانٹے دار تاج اُتارنے کے بعد انسان اپنے آپ کو کتنا ہلکا محسوس کرتا ہے ! جیکی اگر تمھیں اعتراض نہ ہو تو میں اس کیبن کو ابھی چند روز استعمال کروں گا !"

"ارے واہ اینڈی ! یہ بھی کوئی پُوچھنے کی بات ہے ! تم جب تک چاہو اس کیبن کا استعمال کرو۔ دیکھو مس واڈیا۔ یہ کیبن مسٹر اینڈرسن کے لیے مخصوص رہے گا۔ میں نے کل مسٹر ٹمبل سے مسٹر شیٹی کو یہ کیبن دینے کے لیے کہہ دیا تھا۔ انھیں کہہ دو کہ سابقہ انتظام برقرار رہے گا۔ اور اینڈی اگر چاہو تو مس واڈیا بطور سیکرٹری اب بھی تمہارا کام کر سکتی ہے !"

"نہیں شکریہ۔ میں اب کاروبار میں نہیں اُلجھنا چاہتا۔ مس واڈیا کو اب کوئی اور کام دیا جا سکتا ہے !"

"ٹھیک ہے۔ اگر یہ بات ہے تو میرا ارادہ مس واڈیا کو اس کا سیکرٹری بنانے کا ہے!"
"نہایت اچھا خیال ہے۔ مس واڈیا بے حد قابل ہے۔ آپ کی بہت مدد کر سکتی ہے!"
مس واڈیا اپنی تعریف سن کر شرما گئی اور وہ دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر باہر چلی گئی۔

چونکہ مسٹر اینڈرسن کے کام کی بیشتر ذمہ داری مسٹر پٹیل کو سونپ دی گئی تھی اس لیے مس واڈیا کو بھی توقع تھی کہ وہ جلد ہی مسٹر پٹیل کی سیکرٹری بنا دی جائے گی لیکن ایک ہفتہ گزر جانے پر بھی کوئی ایسے آرڈر نہیں آئے۔ وہ چند دنوں تک مسٹر اینڈرسن کی بچی ہوئی فائلوں پر نوٹ لگاتی رہی لیکن آہستہ آہستہ اس کی مشغولیات ختم ہو گئیں۔ وہ مس لیمبرٹ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس کے پاس فرصت کہاں تھی۔ اب وہ کبھی کبھی اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتی یا پھر اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے جاسوسی ناول پڑھنے میں مشغول رہتی۔ نہ جانے اسے کیوں احساس ہو رہا تھا گویا وہ بھی مسٹر اینڈرسن کے ساتھ ساتھ ریٹائر ہو گئی ہو۔

مسٹر اینڈرسن اس دوران میں باقاعدہ دفتر آتے لیکن گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد وہ اچانک اپنے کیبن سے نکل کر چل دیتے گویا وہ اتنا عرصہ پنجرے میں بند رہنے کے بعد فضا میں آزاد اڑنے کے لیے اپنے پر تول رہے ہوں۔ دفتر کے سبھی لوگ ان کا احترام کرتے لیکن ادھر مسٹر گراہم کے یورپ کے دورے پر روانہ ہونے کے بعد کچھ دنوں سے ایسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے نئے ڈائریکٹر پٹیل کے دل میں ان کا احترام کم ہوتا جا رہا ہو۔

ایک دن جب مس واڈیا دفتر آئی تو ایک لفافے میں اس کے لیے نئے احکام رکھے تھے۔ وہ اب مسٹر مہتہ کی سیکرٹری بنا دی گئی تھی۔ مسٹر مہتہ فرم کے سیلز منیجر تھے اور فرم کے اعلیٰ افسروں میں سے تھے لیکن ایک ڈائریکٹر کی سیکرٹری رہنے کے بعد وہ اس زوال کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ اسے اپنی پچھلی اٹھارہ سالہ سروس، مسٹر اینڈرسن اور مسٹر گراہم کے تعریفی جملے بالکل بے معنی معلوم ہوئے۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ ایک نہایت خوبصورت نوجوان سندھی لڑکی، چست کپڑوں میں ملبوس، کھلے مسکراتی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دفتر کی اسسٹنٹ گرل تھی۔

"مس واڈیا۔ یہ ہیں مس ریتا گرسہانی۔ مسٹر پٹیل کی نئی سیکرٹری! آپ چونکہ مسٹر مہتہ کے کیبن میں جا رہی ہیں مسٹر پٹیل نے انھیں یہ سیٹ دینے کے لیے کہا ہے!"

مس واڈیا کو جیسے ایک چکر سا آ گیا۔ وہ نہایت مشکل سے سنبھلی۔ اس نے اپنی سیٹ خالی کر دی اور اس پر ایک نہایت دلفریب ادا سے مس ریتا گرسہانی 'تھینک یو' کہہ کر بیٹھ گئی ——— مس واڈیا کو ایسے معلوم ہوا جیسے کسی جوان دلہن نے بوڑھی ساس کو دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دیا ہو۔

وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر کے مسٹر اینڈرسن کے کیبن کی طرف بڑھی اور دستک کے جواب کا انتظار کیے بغیر داخل ہو گئی۔

"سر، میں آپ سے رخصت ہونے آئی ہوں۔ میں نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے!"

"ارے کیوں، مس واڈیا؟" مسٹر اینڈرسن چونک پڑے۔ "تم۔ تم یہ فرم چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو؟"

"مسٹر پٹیل نے اپنے لیے ایک نئی سیکرٹری appoint کر لی ہے اور مجھے مسٹر مہتہ کے ساتھ کام کرنے کے لیے آرڈر دے دیے گئے ہیں؟"

"مسٹر مہتہ کے ساتھ؟ جے بی نے نئی سیکرٹری چن لی! کیا وہ فرم میں پہلے سے نہیں تھی؟"

"نہیں!" اور ایک لمحے کے لیے مسٹر اینڈرسن پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

"یہ فرم کی پالیسی کے بالکل خلاف ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے! کیا جے بی اتنا بھی نہیں سمجھتا!" اور انھوں نے ٹیلیفون آپریٹر کو مسٹر پٹیل سے ملانے کے لیے کہا۔ "میرے رہتے ہوئے یہ کبھی نہیں ہو سکتا!"

"جے۔ بی میں اینڈرسن بول رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے لیے فرم سے باہر کی کوئی سیکرٹری اپوائنٹ کر لی ہے؟"
کی آواز میں معمول کی طرح خود اعتمادی تھی۔ وہی آواز جو سالہا سال فرم کی پالیسی کے بارے میں اپنے فیصلے دیتی آئی تھی۔

ٹیلیفون کے دوسرے سرے سے ایک نہایت مختصر سی آواز آئی۔

"لیکن کیوں؟" مسٹر اینڈرسن کی آواز میں حیرت تھی۔ "یہ فرم کی بنیادی پالیسی کے خلاف ہے!"

دوسرے سرے سے ایک طویل ہوں ہوں سنائی دیا۔ اینڈرسن کے چہرے کی جھریاں ہر لمحہ نمایاں ہوتی جا رہی تھیں اور اُن کی آ
میں جیسے ایک تھکن سی چھا گئی ہو جیسے سالوں سال حکومت کرنے والا بادشاہ آج محتاج ہو گیا ہو۔

"ہاں جے۔ بی تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ مجھے فرم کی پالیسی کے بارے میں اب کچھ بھی کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔" اور انھوں نے دھیرے سے بیمار ہاتھوں سے مس واڈیا سے نظریں ملائے بغیر، ٹیلیفون کا چونگا واپس رکھ دیا۔ انھوں نے میز سے اخبار اٹھا لیا اور لڑکھڑاتے ہوئے کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

مس واڈیا دیر تک ٹکٹکی باندھے مسٹر اینڈرسن کی خالی، جھولتی ہوئی کرسی کی طرف دیکھتی رہی۔

قرآن کریم کا سب سے پہلا اُردو ترجمہ

حکیم محمد اسماعیل پانی پتی

حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ مجدد وقت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نور اللہ مرقدہا کے گرامی قدر فرزند اور نہایت عالم و فاضل اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ آپ ہی کے قلب صافی سے وہ چشمۂ علم و عرفان پھوٹا جسے لوگ "موضح القرآن" کے نام سے جانتے ہیں۔ یعنی آپ ہی وہ محترم ہستی اور مقدس شخص ہیں جنہوں نے ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء میں سب سے پہلے قرآن کریم کا ترجمہ اُس وقت کی مروجہ اُردو میں کیا۔ یہ ترجمہ (جس کا نام خود حضرت مترجم نے موضح القرآن (قرآن مجید کے مضامین کو واضح اور روشن کرنے والا) رکھا تھا) اس قدر خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ کیا گیا تھا کہ اگرچہ اُس کو آج پونے دو صدیاں گزر چکی ہیں مگر اس کی شہرت اور عظمت آج تک باقی ہے۔

اس تاریخی ترجمہ کے مترجم حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور وہیں ذکرِ الٰہی اور خدمتِ خلق کرتے ہوئے اور قرآن و حدیث کا درس دیتے ہوئے ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں وفات پائی۔ دہلی میں دہلی دروازہ کے باہر آج بھی اُن کا مزار زیارت گاہِ عوام و خاص ہے (تذکرہ علمائے ہند فارسی مولفہ مولانا رحمان علی میں سالِ وفات ۱۲۴۲ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں)

اس نادر و نایاب ترجمہ کا ایک قلمی نسخہ حضرت حکیم نور الدین صاحب طبیب شاہی ریاست جموں و کشمیر کے کتب خانہ میں تھا۔ ۱۹۱۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ جس کے بعد اُن کی تمام عربی و فارسی کتب اور ہزاروں قلمی نوادرات کا بے مثل ذخیرہ اُن کے ورثا نے صدر انجمن احمدیہ قادیان کو دے دیا۔ انہی بیش بہا کتابوں سے قادیان کی مرکزی لائبریری وجود میں آئی جس میں تیس ہزار سے زیادہ عربی و فارسی کی قلمی اور مطبوعہ کتابیں تھیں۔ میں جب ۱۹۲۷ء میں اس عظیم الشان کتب خانہ کا لائبریرین ہوکر آیا تو میں نے وہاں منجملہ دیگر نایاب مخطوطات کے حضرت شاہ صاحب کا یہ ترجمہ بھی دیکھا۔ میں نے اُس وقت اُس کے دیباچہ کی نقل ایک کاپی میں کرلی تھی اور نمونہ کے طور پر سورۂ فاتحہ کا ترجمہ بھی احتیاطاً ساتھ ہی لکھ لیا تھا جسے آج بیس برس

ے بعد محبی و مشفقی محمد طفیل صاحب مدیر نقوش کی فرمائش پر قارئین کرام کی خدمت میں بطور تبرک پیش کر رہا ہوں۔

یہ دیباچہ آج سے پونے دو صدی پہلے کی اُردو کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے۔ اُس وقت جو رسم الخط رائج تھا اُس کے موافق یہ ترجمہ لکھا گیا ہے۔ اور میں نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ حرف بحرف اور لفظ بلفظ بالکل مُطابقِ اصل نقل کیا ہے۔ جس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ آج سے ۱۸۰ سال پیشتر کس قسم کی اُردو بولی جاتی تھی اور وہ کس طریقہ سے لکھی جاتی تھی۔ تاریخ ادب اُردو کے مورخ کے لیے یہ دیباچہ بہت دلچسپ اور دلکش چیز ہے۔ جو قدیم اُردو کی عبارت اور طرزِ تحریر کو ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے ——— جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے یہ دیباچہ پہلے ایڈیشن میں چھپا ہو تو چھپا ہو بعد کے ایڈیشنوں میں میری نظر سے تو نہیں گزرا۔

وھو ہٰذا۔

رام گلی نمبر ۳۔ لاہور خاکسار: محمد اسماعیل پانی پتی

دیباچہ موضح القرآن

الٰہی شکر تیری احسان کا ادا کرون کس زبان سی کہ ہماری زبان کو پاکی اپنی نام کر، اور دلکو روشنی دی اپنی کلام کر، اور رامت بن کیا اپنی رسول مقبول کے جو اشرف انبیا اور نبی الرحمۃ جس کی شفاعت سی امیدوار ہین ہم کہ پاوین دو جہان کی نعمت، الٰہی اوس نبی مت پر اپنی رحمت کامل سی درجات اعلیٰ نصیب کر جو حد نہو کسی مخلوق کی، اور اپنی عنایت اوس پر ہمیشہ افزون رکہ دُنیا و آخرت مین اور اوسکی آل اطہار پر اور اصحاب کبار پر اور اوس کی امت کی علمای مقتدا اور اولیا باصفا پر اور عزبا اور ضعفا پر سب پر آمین یا الٰہ العالمین، بعد ازین سُنا چاہی کہ مسلمان کو لازم ہی کہ اپنی رب کو پہچانی اور اوس کی صفات جانی اور اوسکی حُکم معلوم کری اور مرضی و نامرضی تحقیق کری کہ بغیر اسکی بندے نہین اور جو بندگی بجا نہ لاوی وہ بندہ نہین اور اللہ سبحانہ کی پہچان آدمی بتانی سی آدمی پیدا ہوتا ہی بعض نادان سب چیز سیکہتا ہی سکہانی سی اور سکہانی والی ہر چند تقریر کرین اوس برابر نہین جو اللہ نی آپ بتایا اوسکی کلام مین جو ہدایت ہی دوسری مین نہین پر کلام پاک اوسکا عربی زبان ہی اور ہندوستانی کو اوسکا ادراک محال اسواسطی اس بندہ عاجز عبد القادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہماری والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ بن عبد الرحیم محدث دہلوی ترجمہ فارسی کر گئی ہین سہل و آسان اب ہندی زبان مین قرآن شریف کو ترجمہ کرئے الحمد للہ کہ سنہ ۱۲۰۵ بارہ سو پانچ مین میسر ہوا۔ اب کئی باتین معلوم رکہنی اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بلفظ ضرور نہین کیونکہ ترکیب ہندی ترکیب عربی سی بہت بعید ہی اگر بعینہ وہ ترکیب رہی تو معنی مفہوم نہون دوسرے یہ کہ اسمین زبان ریختہ نہین بولی بلکہ ہندی متعارف تا عوام کو بی تکلیف دریافت ہو تیسرے یہ کہ ہر چند ہندوستانی کو معنی قرآن اس سی آسان ہوئی لیکن اب بھی استاد سی سند کرنا لازم ہی اول معنی قرآن بغیر سند معتبر نہین دوسرے ربط کلام ماقبل و مابعد سی پہچاننا اور قطع کلام سی بچنا بغیر اُستاد نہین آتا چنانچہ قرآن

دی عربی ہی پر مرتب ہی مشکل اشکال کی تہی یہ تہی کہ اول خلاصہ ترجمہ قرآن ہوا تہا سب ... [illegible]
ہی متعلق آخر ... داخل کی اور فائدہ کی اعتبار کرو ف نشان لکہا ... [illegible] ... ہی
داخل کری بابی ... ہندی لکہنی میں طول ہی استاد سی معلوم ہوئی البتہ ہندی میں بعض چیز لکہتی ہیں کہ ... [illegible] ... ہی
فارسی خوان اہل ... ہی وجود دیکہ ترجمہ ... اور اس کتاب کا نام ... قرآن ہی ... [illegible] ... تاریخ
ہی ... سیدی ... تیری ... اور ... اپنی فضل سی یا رحمٰن یا رحیم یا مالک الملک ذو الجلال والاکرام ...

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ وَ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ سَبْعُ اٰيَاتٍ

سورۂ فاتحہ مکی و مدنی میں نازل ہوا۔ سات آیات ہی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بنام خدای بخشایندہ مہربان ہندی شروع اللہ کی نام سی جو بڑا مہربان رحمت دینے والا۔

الحمد للہ رب العالمین ۝ ستایش خدای راست پروردگار عالمہا یعنی عالم انس و عالم جن و عالم ملایکہ و علی ہذا القیاس ہندی سب تعریف اللہ کو ہی جو صاحب ساری جہان کا الرحمن الرحیم ۝ بخشایندہ و مہربان ہندی بہت مہربان نہایت رحم والا — مالک یوم الدین ۝ خداوند روز جزا ہندی مالک انصاف کی دن کا ایاک نعبد و ایاک نستعین ۝ ترا می پرستیم و از تو مدد میطلبیم ہندی تجھکو ہم بندگی کریں اور تجھ سی مدد چاہیں اہدنا الصراط المستقیم ۝ بنما ما را راہ راست ہندی چلا ہم کو راہ سیدھی صراط الذین انعمت علیہم ۝ راہ آنانکہ انعام کردہ بر ایشان ہندی راہ اونکی جن پر تو نی فضل کیا غیر المغضوب علیہم ولا الضالین ۝ بجز آنانکہ خشم گرفتہ شد بر آنہا و بجز گمراہان ہندی نہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والی

ف یہ سورہ اللہ تعالی نی بندوں کی زبان سی فرمائی کہ اس طرح کہا کریں۔

ے مراد از آنانکہ انعام کردہ شد بر آنہا چہار فرقہ اند نبیین و صدیقین و شہدا و صالحین و مراد از آنانکہ خشم گرفتہ شد بر آنہا یہود اند و از گمراہان
نصاری ... قبول کی ... پر تو نی فضل کیا ... نبیین صدیقین شہدا و صالحین اور جن پر غصہ ہوا وے
یہود اور گمراہ ... نصاری مراد ہیں ف

دنیائے عرب

نصیر عالم

مغربی مصنف جس علاقے کو "مشرق قریب" کہتے ہیں وہ ایک پاکستانی مصنف کے لیے "مغرب قریب" ہے۔ اسی طرح "مشرق وسطیٰ" پاکستانیوں کے لیے "مغرب وسطیٰ" ہونا چاہیے۔ دراصل ایسی تمام اصطلاحات جن سے سمت ظاہر کی جاتی ہے اضافی ہوتی ہیں۔ تمام سمتوں کا مرکز اس شخص کا محلِ وقوع ہوتا ہے جو سمت متعین کر رہا ہے۔ اگر یہ مرکز بدل جائے تو سمتوں کی تبدیلی بھی لازمی ہے۔ مغربی مصنفین نے جس علاقے کو "مشرق قریب" یا "مشرق وسطیٰ" کہا ہے وہ اُن کے محلِ وقوع کے اعتبار سے درست ہے لیکن اہلِ مشرق کے لیے درست نہیں ہے۔ بایں ہمہ اہلِ مشرق اپنی تحریروں میں متذکرہ علاقہ کو یہی نام دیتے ہیں جو مغربی مصنفین نے دے دیا ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اہلِ مغرب کی تقلید مشرق کی عادتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ گو مغرب کا سیاسی غلبہ ختم ہو گیا ہے لیکن اقتصادی اور کہیں کہیں تمدنی غلبہ ہنوز باقی ہے۔ خصوصاً جدید علوم اہلِ مشرق نے مغرب سے سیکھے ہیں اس لیے مغرب کی علمی اصطلاحیں خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط رواج پا گئی ہیں۔ مشرقی تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق مغرب کی رائج کردہ علمی اصطلاحات کی ترمیم و تنسیخ کے لیے ایک عرصہ درکار ہوگا۔ تاہم اس ضمن میں اگر اب بھی ابتداء نہ کی گئی تو یہ عرصہ اور بھی طویل ہو جائے گا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد تک دنیائے عرب کا مقبول ترین نام "مشرق وسطیٰ" تھا۔ آج کل اکثر مغربی مصنفین "مشرق قریب" کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ یا مشرق بعید کی علاقائی حدود کیا ہیں اور ان میں کون سے ملک شامل ہیں؟ یہ ابتدائی باتیں اب تک طے نہیں ہو سکی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مصنف اس علاقے کی حدود خود ہی متعین کر لیتا ہے۔ جس علاقہ کو روایتی طور پر مشرق وسطیٰ کہا جاتا ہے وہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے سنگم کا ایک چھوٹا علاقہ ہے اور اس میں زرخیز ہلال Fertile Crescent کے ممالک یعنی عراق، شام، لبنان، فلسطین اردن اور جزیرہ نمائے سینائی شامل ہیں لیکن بعد میں مشرق وسطیٰ کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں۔ بعض مصنفین نے تمام عرب ممالک کو مشرق وسطیٰ میں شامل کر لیا اور بعض نے ترکی، ایران، افغانستان حتیٰ کہ روس کی مسلم ریاستوں اور پاکستان تک کو شامل کر لیا ہے۔ علاقہ کی اس بڑھتی ہوئی وسعت کے پیشِ نظر بعض مصنفین نے "مشرق قریب" کی اصطلاح کو رواج دیا لیکن مشرق وسطیٰ کی طرح مشرق قریب کی حدود بھی غیر متعین ہی رہیں۔ علاقائی حدود کا اس طرح بدلتے رہنا مطالعہ کی باقاعدگی کے منافی ہے۔ دراصل اس علاقہ کو جغرافیائی نام دینا ہی غلط ہے۔ آج کل جس علاقہ کو مشرق وسطیٰ یا مشرق قریب کہا جاتا ہے وہ ایک تمدنی علاقہ ہے اور وہ تمدن عربوں اور مسلمانوں کا تمدن ہے۔ اس لیے اس علاقہ کو "دنیائے عرب"

کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ دُنیائے عرب کی حدود مغرباً شرقاً مراکش سے لے کر عراق تک اور شمالاً جنوباً (ایشیا میں) ترکی، شام اور فلسطین کے ساحل سے لے کر جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی ساحل تک اور (افریقہ میں) افریقہ کے شمالی ساحل سے لے کر سوڈان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لیے دُنیائے عرب میں مندرجہ ذیل ملک شامل ہیں:۔

مراکو، الجیریا، ٹیونس، لیبیا، مصر، سوڈان، فلسطین، شام، لبنان، عراق، کویت، بحارین، سعودی عرب، یمن، مسقط و عمان، عدن اور شائخ کی چھوٹی ریاستیں۔

طبعی حالات اور آبادی

دُنیائے عرب کا رقبہ ۱۱۰,۹۵۰,۰۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ مگر اس علاقہ کے بہت کم حصے سمندر سے پانچ سو میل دُور ہیں لیکن اکثر ساحلوں پر بلند پہاڑ ہیں جس کی وجہ سے ساحلی علاقوں میں زیادہ بارش ہوتی ہے اور اندرونی حصوں میں بہت کم۔ اکثر اندرونی علاقے ریگستانی ہیں لیکن دو خشک علاقے دریا کی آب پاشی کے باعث نہایت شاداب اور زرخیز ہیں۔ یہ ہیں مصر میں نیل اور عراق میں دجلہ و فرات کی وادی۔ ساحلی علاقوں اور دریا کی وادیوں کو چھوڑ کر بقیہ علاقے میں بڑے بڑے گھاس کے میدان یا نیم ریگستانی اور ریگستانی خطے ہیں۔ بلندی اور بارش کے نمایاں تفاوت کے باعث ایک چھوٹے سے خطہ میں بھی آب و ہوا کا بڑا فرق اور بعض جگہ تضاد پایا جاتا ہے۔

اس وقت دُنیائے عرب کے کل رقبہ کا صرف پانچ فیصد زیر کاشت ہے۔ خصوصاً سوڈان، مصر اور عراق میں زیر کاشت کی وسعت کے امکانات ہیں لیکن مصنوعی آب پاشی بہرحال ایک حد تک ہی زیر کاشت علاقہ میں اضافہ کر سکتی ہے۔ عظیم اسوان بند کی تکمیل کے بعد بھی مصر کے زیر کاشت علاقہ میں صرف ⅓ کا اضافہ ہوگا۔

سوائے تیل کے معدنیات کمیاب ہیں۔ لوہا، کرومیم، تانبہ اور مینگنیز شمال مغربی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ پوٹاش بحرِ مُردار کے قرب و جوار میں ملتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی چیز اس مقدار میں نہیں ہوتی کہ اس کی بنیاد پر بھاری صنعتیں قائم ہو سکیں۔ اگر افراط سے کوئی چیز ملتی ہے تو وہ ہے پٹرول۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ دُنیائے عرب میں ساری دُنیا کے ۷۰ فیصد سے زیادہ تیل کے ذخیرے ہیں۔ یہ تیل زیادہ تر خلیج ایران کے آس پاس تقریباً ۸۰۰ میل کے نصف قطر میں پھیلا ہوا ہے۔ شمالی صحرا میں بھی تیل کے ذخیرے موجود ہیں لیکن ابھی ان کے متعلق پوری معلومات حاصل نہیں ہوئی ہیں۔ دُنیائے عرب کے جن ذخیروں سے اس وقت تیل نکالا جا رہا ہے وہ زیادہ سے زیادہ استحصال اور استعمال کے باوجود سَو سال تک چل سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر اسی رفتار سے تیل نکالا جائے تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ذخیرے صرف بارہ سال میں ختم ہو جائیں گے اس لیے دُنیائے عرب کے پٹرولیم میں یورپ اور امریکہ کے صنعتی ممالک کی دلچسپی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ اس دلچسپی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ دُنیائے عرب میں پٹرولیم نکالنے اور صاف کرنے پر لاگت اس قدر کم آتی ہے کہ یہاں کام کرنے والی کمپنیاں امریکہ اور یورپ میں تیل نکالنے والی کمپنیوں سے کھلے بازار میں مقابلہ کر سکتی ہیں۔ جب مقامی حکومتوں اور بدیسی کمپنیوں کے درمیان نصف نصف منافع کے معاہدے ہوئے ہیں سعودی عرب اور دیگر

پیدا کرنے والی ریاستوں کا تقریباً سارا مالیہ تیل کی آمدنی سے حاصل ہوتا ہے۔ گزشتہ سالوں میں اس علاقہ کی حکومتوں کو تیل سے ایک ارب ڈالر سالانہ آمدنی ہوئی ہے۔ تیل کی بڑھتی ہوئی قیمت کے پیش نظر آئندہ دس سال میں یہ آمدنی ڈیڑھ ارب سے دو ارب ڈالر تک بڑھ سکتی ہے۔ لیکن پٹرول اور اس سے حاصل شدہ ڈالر کھانے کی اشیا اور پانی کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ تیل سے حاصل ہونے والی دولت اور زراعتی افلاس کے درمیان جو تضاد ہے اس کی واضح مثال کویت میں نظر آتی ہے۔ کویت کا رقبہ صرف ۶,۰۰۰ مربع میل ہے۔ (۲) چھوٹی سی ریاست میں ایک شیخ کی حکومت ہے۔ تیل سے شیخ کو تیس کروڑ سے لے کر چالیس کروڑ ڈالر سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ کویت کی آبادی صرف دو لاکھ ہے۔ گو کویت کا شیخ اپنی رعایا کو مفت تعلیم دیتا ہے اور عوام کی آسائش کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے پھر بھی انگلینڈ کے بنک میں اس کی جمع شدہ دولت سب سے زیادہ ہے۔ لیکن کویت کے پاس پینے کے لیے پانی تک نہیں ہے۔ سمندر کے پانی کو مقطر کر کے پینے کے قابل بنایا جاتا ہے اور (۲) مقصد کے لیے تین کارخانے بنائے گئے ہیں۔ تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں صرف عراق ایسا ہے جس کی آبادی کافی ہے، پانی بھی میسر ہے اور زمین بھی زرخیز ہے۔ اس لیے صرف یہی ایک ایسا ملک ہے جو تیل سے حاصل شدہ آمدنی کو دیگر شعبوں میں ترقی کے لیے خرچ کر سکتا ہے۔ ایسے دوسرے ملک مصر، شام، لبنان اور سوڈان ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کے پاس تیل کے ذخیرے نہیں ہیں۔ ان میں سے چند ملکوں کو ان کے علاقہ سے گزرنے والی پائپ لائنوں سے ضرور کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔

دنیائے عرب کی کل آبادی ۸ کروڑ پچاس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے تقریباً ۷ کروڑ لوگ عربی بولتے ہیں۔ ہر ملک کی آبادی، لسانی اور نسلی تقسیم مندرجہ ذیل ہے:-

۱۔ مراکو: کل آبادی: ۹۰ لاکھ ۷۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: بربر ۶۰ فیصد، عربی ۳۰ فیصد، فرنچ ۶ فیصد، دیگر ۴ فیصد۔

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۳ فیصد، عیسائی ۶ فیصد، دیگر ۱ فیصد۔

۲۔ الجیریا: کل آبادی: ۹۰ لاکھ ۶۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: عربی ۷۲ فیصد، بربر ۱۴ فیصد، فرنچ ۱۴ فیصد (۱۹۴۸ء میں)

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۸ فیصد، عیسائی ۲ فیصد (۱۹۵۴ء میں)

۳۔ طیونس: کل آبادی: ۳۰ لاکھ ۷۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: عربی اور بربر ۹۳ فیصد، فرنچ ۷ فیصد۔

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۱ فیصد، عیسائی ۷ فیصد، دیگر ۲ فیصد۔

۴۔ لیبیا: کل آبادی: ۱۰ لاکھ ۱۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: عربی ۹۴ فیصد، اطالوی ۶ فیصد۔

منجی تقسیم: مسلمان ۹۴ فیصد، عیسائی ۶ فیصد۔

۵۔ سوڈان: کُل آبادی: ایک کروڑ ۲۰ لاکھ

لسانی تقسیم: عربی ۷۰ فیصد، نوبی اور حبشی قبائل کی زبانیں ۳۰ فیصد

منجی تقسیم: مسلمان ۷۰ فیصد، وحشی مذاہب ۳۰ فیصد۔

۶۔ متحدہ عرب جمہوریہ:

مصر: کُل آبادی: ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ۹۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی۔

منجی تقسیم: مسلمان ۹۱ فیصد۔ عیسائی ۹ فیصد

شام: کُل آبادی: ۳۴ لاکھ ۱۰ ہزار

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی۔

منجی تقسیم: ۸۸ فیصد مسلمان، ۱۲ فیصد عیسائی

۷۔ اسرائیل: کُل آبادی: ۱۰ لاکھ ۶۰ ہزار

لسانی تقسیم: ہبرو ۴۵ فیصد، عربی ۱۲ فیصد، یدی ۱۰ فیصد

منجی تقسیم: یہودی ۹۰ فیصد، مسلمان ۶ فیصد، عیسائی ۴ فیصد۔

۸۔ غازہ: کُل آبادی: ۳۰ ہزار

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

منجی تقسیم: صد فی صد مسلمان

۹۔ لبنان: کُل آبادی: ۱۰ لاکھ ۳۰ ہزار

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

منجی تقسیم: مسلمان ۶۳ فیصد، نصرانی عیسائی ۹۲ فیصد، دیگر ۵۲ فیصد۔

۱۰۔ اردن: کُل آبادی: ۱۰ لاکھ ۴۰ ہزار

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

منجی تقسیم: مسلمان ۹۴ فیصد، عیسائی ۶ فیصد

۱۱۔ عراق: کُل آبادی: ۵۵ لاکھ ۲۰ ہزار

لسانی تقسیم: عربی ۸۰ فیصد، کردی ۱۸ فیصد، دیگر ۲ فی فیصد

منجی تقسیم: صد فی صد مسلمان

۱۲۔ سعودی عرب : کل آبادی : ۷۰ لاکھ
لسانی تقسیم : صد فی صد عربی
مذہبی تقسیم : صد فی صد مسلمان

۱۳۔ یمن : کل آبادی : ۴۴ لاکھ ۵۰ ہزار
لسانی تقسیم : صد فی صد عربی
مذہبی تقسیم : صد فی صد مسلمان

۱۴۔ برطانیہ کے تحت ریاستیں : کل آبادی : ۱۰ لاکھ ۸۰ ہزار
لسانی تقسیم : صد فی صد عربی
مذہبی تقسیم : صد فی صد مسلمان

روایتی تمدن | دنیائے عرب کے جدید تمدن کا خاص منبع اسلام ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس علاقہ کے کچھ ملک مہذب، کچھ نیم مہذب اور بعض بالکل وحشی تھے۔ اسلام نے نہ صرف ایک مشترک مذہب کے رشتہ میں لوگوں کو منسلک کر دیا بلکہ انھیں ایک سیاسی در لسانی وحدت بھی بنا دیا۔ عربی معاشرہ خانہ بدوش قبائل، گاؤں اور شہروں میں تقسیم ہے۔ ان تینوں میں تقسیم کار یہ ہے کہ گاؤں کے باشندے اناج پیدا کرتے ہیں، خانہ بدوش قبائل مویشی پالتے ہیں اور شہری لوگ صنعت و حرفت اور تجارت کرتے ہیں۔ ان تینوں طبقوں کے درمیان تعلق اور میل جول اقتصادی تقاضوں اور ضرورت سے آگے نہیں بڑھا تھا لیکن اسلام نے ان کو ایک ثقافتی اور سیاسی وحدت بنا دیا۔ گو اسلام نے مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیا لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کے علیحدہ وجود کو بھی برقرار رہنے دیا۔ ان کے سماجی اور مذہبی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کی اور وراثت و ازدواج سے متعلق ان کے قوانین جوں کے توں رہنے دیے۔ دوسرے اسلام نے دیگر مذاہب کے برعکس مسلم معاشرہ کو مذہبی طبقوں میں تقسیم نہیں کیا۔ گو آلِ رسول اور علما کی عزت کی جاتی ہے لیکن انھیں طبقاتی طور پر کوئی مراعات حاصل نہیں رہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے تک مفتوحہ ملکوں کی اراضیات ریاست کی ملکیت تھیں اور مزارع براہِ راست ریاست کو مالیہ ادا کرتے تھے۔ لیکن امیر معاویہ نے حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں صرفِ خاص کے لیے شام کی زرخیز اراضیات حاصل کر لیں اور اس طرح مسلمانوں کے معاشرہ میں جاگیردارانہ نظام کی اقتصادی بنیاد پڑی جو بعد میں ملوکیت کا اساس ثابت ہوئی۔ ملوکیت کے اس دور میں حکومت کا اقتدار مالیہ، عسکریت اور خاندانی برتری پر منحصر تھا۔ حکومت کا سب سے زیادہ اثر شہروں میں، اس سے کم گاؤں میں اور سب سے کم قبائلی علاقوں میں محسوس ہوتا تھا۔ شہروں پر فوجی صوبہ دار یا موروثی جاگیردار حکومت کرتے تھے [illegible] کے معاملات میں مرکز کی طرف سے بہت کم دخل اندازی ہوتی تھی۔ خانہ بدوش قبیلے عموماً حکومت کے [illegible] آزاد رہتے تھے۔ شہروں کی معیشت اہلِ حرفہ، صنعتکاروں اور تاجروں کی آزاد جماعتوں کے

دریہ چلتا تھی۔ [illegible] میں عام طور پر ہر ادنیٰ [illegible] اور سیاسی اقتدار [illegible] اسلام [illegible] کا مذہب تھا۔ [illegible] اصول اور رسم و رواج حکومت [illegible] پر جاری ہوتے تھے۔ [illegible] ان میں پیغمبر اسلام ہی ایک ایسی ہستی ہیں جو نہ صرف مذہبی پیشوا بلکہ ایک کامیاب سیاسی مدبر بھی تھے۔ اسلام نے نہ صرف مبارک دور میں بلکہ بعد میں بھی سیاست کو مذہب سے جدا نہیں ہونے دیا۔ پیغمبر اسلام کے خلیفہ حکمران بھی تھے اور دینی پیشوا بھی۔

سیاست و دین کے باہمی ربط سے جو اثرات مرتب ہوئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ علما اور مذہبی رہنما اپنا کوئی علیحدہ گروہ نہیں بنا سکے اور سیاسی حکمرانوں کے تابع رہے۔ عیسائی مذہب یا ہندومت کی طرح اسلام میں پادریوں یا برہمنوں کا کوئی علیحدہ اور برتر طبقہ نہیں ہے۔ مذہبی رہنماؤں کو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت بھی حاصل نہ ہو سکی۔ علما، مفتی اور قاضی حکومت سے علیحدہ نہیں بلکہ حکومت کے کارندے تصور کیے جاتے تھے۔

۲۔ چونکہ دین اور سیاست ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں تھے اس لیے اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اختلافات نے مذہبی تفرقہ کی شکل اختیار کر لی۔

۳۔ اسلام کے دستوری نظریات میں حکمران کی ذاتی صفات اور خصوصیات پر زور دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی حکمران مذہبی پیشوا بھی ہوتا تھا۔

۴۔ بین الاقوامی تعلقات میں اخلاقی اقدار کے احترام پر زور دیا گیا۔

۵۔ جنگ یا جہاد کی صورت میں بھی اخلاقی اقدار اور مذہبی احکام کی پابندی لازمی قرار دی گئی۔

خلفائے راشدین کے دور میں مندرجہ بالا اصولوں پر سختی سے عمل کیا گیا۔ لیکن جاگیردارانہ نظام اور ملوکیت کے دَور میں یہ اصول بالائے طاق رکھ دیئے گئے۔ گو سیاست سے متعلق مذہبی احکام اور اصولوں کی تردید کھلے بندوں نہیں کی گئی اور اسلامی اقدار لوگوں کے ذہنوں سے محو نہ ہو سکیں لیکن حکمرانوں اور اہلِ سیاست نے عملاً ان تمام برائیوں اور مکاریوں کو روا رکھا جو جاگیرداری نظام اور ملوکیت کا لازمی نتیجہ تھیں۔ تاہم اسلامی دُنیا میں ملوکیت کا دور عیسائی دُنیا کی طرح تاریک نہیں تھا۔ اسلام میں [illegible] اور فراخدلی پائی جاتی ہے اس کے باعث ملوکیت کے دور میں بھی علوم و فنون کی ترقی ہوئی۔ اس دور میں عربوں نے دُوسروں سے سیکھا بھی اور دُوسروں کو سکھایا بھی۔ ابتدائی دور میں عرب حکمرانوں نے ایرانی، شامی، عیسائی اور یہودی سائنس دانوں، حکیموں اور انجنیئروں کو ملازم رکھا اور ان کے علم و فن کی قدر افزائی کی۔ عباسیوں کے دور میں علوم و فنون کو بے حد ترقی ہوئی۔ یونانی حکما اور فلاسفہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ خلیفہ مامون الرشید نے (۸۱۳ - ۳۳) سائنس اور حکمت کی کتابوں کے ترجمے کرائے اور سب سے پہلے یونیورسٹی کی طرز کا تعلیمی نظام قائم کیا۔ اہلِ علم و فن کی سرپرستی خلفا اور حاکموں کے فرائض میں شمار ہونے لگی۔ ایک [illegible] تک ہر مسلمان حاکم کے دربار میں ممتاز اہلِ علم و فن کی قدر افزائی ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے یونان، ایران اور ہندوستان کی علمی و فنی روایات

.تجربات کو یکجا کر دیا اور ان روایات کی بنیاد پر جدید علم و فن کی عمارت تعمیر کی۔ مسلمانوں کی یہ خدمت دُنیا کی موجودہ اور آئندہ
لیں نہ بھلا سکتی ہیں اور نہ فراموش کر سکتی ہیں۔

اریخی پس منظر

گو دُنیائے عرب قدیم ترین تہذیبوں کی گہوارہ ہے تاہم یہ امر تعجب خیز ہے کہ بظاہر جدید تہذیب
تمدن میں قدیم تہذیبوں کے نشانات نہیں پائے جاتے۔ اگر آثارِ قدیمہ دریافت نہ ہوتے تو آج
، دُنیا کو یہ تک معلوم نہ ہوتا کہ اس سرزمین میں سمیری، اسیری اور مصری تہذیبوں نے جنم بھی لیا تھا یا نہیں۔ یہ اسلام کی ہمہ گیر طاقت
ں یا معجزہ کہ جس نے اس دُنیا کے قدیم تہذیب و تمدن کو ایک بھولی ہوئی داستان بنا دیا اور یہاں کے لوگوں کو جدید تہذیب، ترقی پسند
ن اور نئی زبان بخشی۔ اکثر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دُنیائے عرب کے تمدن کی تاریخ ہی اسلام اور عربی زبان سے شروع ہوتی
ے لیکن در اصل ایسا نہیں ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اسلام بھی دُنیائے عرب کی قدیم تہذیب و تمدن کے تاریخی سلسلہ کی ہی
ـ اہم اور انقلابی کڑی ہے۔ خود پیغمبرِ اسلام ؐ نے یہ فرمایا ہے کہ قرآن گزشتہ آسمانی صحیفوں میں انسانی تحریفات کی تصحیح کرتا ہے
د اسلام خدا کا دیا ہوا وہی پرانا مذہب ہے جس کی شکل کفار اور منافقوں کے ہاتھوں مسخ ہو گئی تھی۔

دُنیائے عرب میں اگر ایک طرف بنجر اور ویران ریگستان ہیں تو دُوسری طرف دریاؤں کی زرخیز وادیاں ہیں۔ ابتدا
ں خانہ بدوش قبائل اپنے مویشی کے لیے چارہ کی تلاش میں دریائی وادیوں تک پہنچے ہوں گے اور پھر یہاں مستقل آباد
ـ گئے ہوں گے۔ اس طرح انھوں نے خانہ بدوشی چھوڑ کر زراعتی زندگی اختیار کی ہوگی۔ اس علاقہ کے جغرافیائی حالات
بھی ایسے ہیں کہ جن سے معاشی تضاد پیدا ہوا ہوگا اور اس تضاد کی وجہ سے خانہ بدوش قبائل اور زراعتی قبائل کے
ر میان ایک مستقل کشمکش اور جنگ و جدل کا بازار گرم رہتا ہوگا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دُنیائے عرب کا علاقہ ایشیا،
ر یقہ اور یورپ کا سنگم ہے۔ یہاں تو دُنیا کے ہر حصے سے خانہ بدوش قبائل آئے ہوں گے اور ایک دوسرے
ے ٹکرائے ہوں گے۔ جب دو قبیلے یا دو قومیں ایک دُوسرے سے ملتے ہیں (خواہ وہ میدانِ جنگ میں ملیں یا بازار
ں) تو ترقی ہوتی ہے۔ جنگ کے دوران ایک فوج دُوسری فوج کے طریقِ جنگ اور ہتھیاروں سے واقف ہو جاتی
ی۔ جنگ کے بعد فاتح قوم مفتوح کو اپنا غلام بنا لیتی تھی اور اس طرح وہ ایک دُوسرے کے رہن سہن، سوچنے اور
مجھنے کے طریقوں سے واقف ہو جاتے تھے اور کچھ عرصے بعد ان کی زبان، تہذیب اور تمدن ایک دُوسرے میں
دغم ہو جاتے تھے۔ بین القبائلی میلوں اور منڈیوں میں دُور دراز قبائل کے تاجر ایک دُوسرے سے ملتے تھے اور نہ
ر ف اجناس و مصنوعات بلکہ زبان و خیالات کا تبادلہ بھی کرتے تھے۔ الغرض یہ علاقہ مختلف قبیلوں اور نسلوں کے لیے
یدانِ کارزار بھی تھا اور مشترک بازار بھی۔ اس لیے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دُنیا کی اوّلین تہذیبوں کے بیج اسی علاقہ کی
ادیوں میں بوئے گئے۔ دجلہ و فرات اور نیل کی وادیوں میں سمیری، اسیری اور مصری تہذیبوں نے جنم لیا اور ان کی
شعاعیں دُور دُور تک پہنچی تھیں۔ دجلہ و فرات اور نیل کی وادیوں کے درمیان فونیشیا (موجودہ فلسطین) کا ساحلی
لاقہ واقع ہے۔ مغرب و مشرق کے بادشاہوں اور شہنشاہوں کی فوجیں اس علاقہ میں ایک دُوسرے سے نبرد آزما

ہوتی ہوں گی۔

جب تیرھویں صدی قبل مسیح میں شمال سے آنے والے وحشی قبائل نے ہیٹیوں کی سلطنت کو تباہ کر دیا، لیبیا اور حبشہ کی بغاوتوں کے باعث مصر کی بھی کمر ٹوٹ گئی اور جلد وقت ایسا آیا کہ کوئی مضبوط سلطنت نہیں رہی تو فونیشیا کے کنعانیوں پر سمندر کی جانب سے فلسطینی بحری قزاق اور جنوب کی طرف سے سامی نسل کے یہودی یا بنی اسرائیل ٹوٹ پڑے۔ بعد میں کنعانیوں اور فلسطینیوں کو یہ سرزمین چھوڑنی پڑی اور وہ کریٹ اور کارتھیج میں جاکر آباد ہو گئے۔ وہاں انھوں نے تہذیب کی شمعیں روشن کیں۔ بنی اسرائیل نے یہاں اسرائیل اور یہودہ کی دو سلطنتیں قائم کیں۔ حضرت سلیمان (۹۷۵ - ۹۳۵ قبل مسیح) کے زمانے میں بنی اسرائیل کو عروج حاصل ہوا۔ ۵۸۶ قبل مسیح میں بابل نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا اور ان کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے بعد سے بنی اسرائیل کسی نہ کسی فاتح کے زیر نگیں رہے۔ مگر انھوں نے کبھی بھی غیر ملکی تسلط کو دل سے قبول نہ کیا۔ غیر ملکی حاکموں کے مظالم اور غیر محفوظ حالات نے ان میں وہ تمام خوبیاں اور برائیاں پیدا کر دیں جو ایک مظلوم معاشرے کے لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے خدا کی ذات کے متعلق سوچا اور اپنی مصیبتوں کا مداوا دوسری دنیا میں تلاش کیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے دنیا کو یہودیت اور عیسائیت کے مذاہب دیے۔ اسلام بھی انھیں مذاہب کے ارتقا کا سلسلہ ہے۔ چونکہ وہ فاتح حاکموں سے ہمیشہ باغی رہے اس لیے انھوں نے تجارت کا آزاد پیشہ اختیار کیا اور دور دراز کے ملکوں سے نہ صرف تجارت کی بلکہ وہاں جاکر رہنے بسنے بھی لگے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے مذہب اور معاشرت میں کوئی فرق نہ آیا۔ تجارتی تقاضوں اور غیر محفوظ و غیر یقینی حالات نے ان کے دلوں میں دولت کی محبت پیدا کی۔ انھوں نے پس انداز کرنے کی عادت ڈالی جو بڑھ کر بخل کی صورت اختیار کر گئی۔ قومی و معاشرتی اعتبار سے وہ تنگ نظر ہو گئے۔ وہ کبھی دوسروں سے خلوص نہ کر سکے انھوں نے جب بھی موقع ملا دھوکہ دیا اور اکثر تو اپنے پیغمبروں، رہنماؤں اور اپنے آپ کو بھی دھوکہ دینے سے باز نہ آئے۔

بابل و نینوا، مصر اور ایشیائے کوچک کی سلطنتوں کے بعد ایرانیوں کا زمانہ آیا۔ ۵۵۰ قبل مسیح میں سائرس اعظم نے ایرانی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور دارائے اول نے ایرانی سلطنت کی حدود دریائے ڈینیوب سے دریائے سندھ تک اور بحر ارال و کوہ قاف سے مصر کے بالائی حصے تک پھیلا دیں۔ ایران اور یونان میں ایک عرصہ تک جنگیں ہوتی رہیں۔ آخرکار سکندر اعظم کی قیادت میں یونان نے ایران اور مصر پر فتح حاصل کر لی۔ یونانیوں کے بعد رومیوں کا زمانہ آیا۔ وہ ایک عرصہ تک شمالی افریقہ میں کارتھیج (جو فلسطین سے جانے والے فونیشین کنعانیوں کی سلطنت تھی) سے برسرپیکار رہے اور آخرکار اس پر غلبہ پالیا۔ انھوں نے مصر اور فلسطین پر بھی قبضہ کر لیا۔ رومیوں کی سلطنت برطانیہ سے لے کر مصر تک اور مراکش سے لے کر آرمینیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ شمال کے وحشی حملہ آوروں نے روم کی سلطنت کو ختم کر دیا۔ مشرقی روم کی سلطنت عثمانی ترکوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ غرض تہذیب کی ابتدا سے رومی سلطنت

کے دَور تک جب بھی کوئی طاقت ایشیا، افریقہ، یا یورپ سے اُبھری اُس نے موجودہ دُنیائے عرب کے علاقوں کو فتح کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھا۔ خاص طور پر شام، لبنان، فلسطین اور مصر کے ساحلی علاقے محلِ وقوع کے اعتبار سے اس قدر اہم تھے کہ ہر سلطنت ان کو اپنے قبضے میں رکھنا دفاع کے لیے ضروری سمجھتی تھی۔

دُنیائے عرب کی جدید تاریخ نزولِ اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی زندگی ہی میں حجاز کو متحد کر کے جزیرہ نمائے عرب کے اتحاد کی بنیاد رکھ دی تھی۔ ۶۳۲ء میں پیغمبرِ اسلامؐ کی رحلت کے بعد عرب مسلمانوں نے ایرانی اور بازنطینی سلطنتوں کو فتح کر لیا۔ اسلامی فوجیں ایران سے وسط ایشیا اور ہندوستان تک پہنچ گئیں۔ شام، مصر، شمالی افریقہ اور اسپین پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور آخرکار وہ فرانس تک پہنچ گئے۔ ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک پہلے چار خلفا کی حکومت رہی۔ ۶۶۱ء میں امیر معاویہ نے خلافت حاصل کر لی اور بنو امیہ نے شام کے شہر دمشق سے ۷۵۰ء تک حکومت کی۔ بنو امیہ کا تختہ بنو عباس نے اُلٹ دیا۔ اُنھوں نے عراق میں بغداد کا شہر آباد کیا اور اس دارالحکومت سے ۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء تک حکومت کرتے رہے۔ عباسیوں کا دور امن اور فارغ البالی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ ان کے زمانے میں ایرانیوں کو دربار اور امورِ حکومت میں بہت کچھ دخل ہوگیا۔ ۸۵۰ء کے بعد صوبائی حکمراں تقریباً خودمختار ہو گئے اور عملاً خلیفہ کا اقتدار ختم ہونے لگا۔ گیارھویں صدی کے وسط میں سلجوق ترکوں نے ایران پر قبضہ کر لیا۔ وہ ۱۰۵۵ء میں بغداد پر بھی قابض ہوگئے اور ان کی سلطنت ہندوستان سے بحرِ ایجین تک پھیل گئی۔ دسویں صدی میں خلافت دو خاندانوں میں بٹ گئی۔ مصر میں فاطمی خلیفہ تھے جن کا سکہ شمالی افریقہ اور کبھی کبھی شام تک چلتا تھا۔ اُدھر اسپین میں بنو اُمیہ کی خلافت تھی جو ۱۴۹۲ء تک قائم رہی۔ اسپین میں مسلمانوں نے تقریباً ۵۰۰ سال تک حکومت کی اور ان کے دور میں یہ ملک یورپ کا سب سے زیادہ مہذب ملک سمجھا جاتا تھا۔

۱۲۵۸ء میں منگول حملہ آوروں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے بعد عباسی خلافت کا نام بھی باقی نہ رہا۔ اس کے ساتھ ہی سلجوق ترکوں کی سرداری بھی ختم ہوگئی۔ لیکن عثمانی ترکوں نے ایشیائے کوچک میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ جلد ہی اُنھوں نے بلقانی ریاستوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ ۱۴۵۳ء میں جب عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تو مشرقی بزنطینی سلطنت کا آخری چراغ بھی گل ہوگیا۔ عثمانی ترکوں نے شام، فلسطین اور مصر کی مملوک سلطنت پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہ دو سو سال تک ایران کی صفوی حکومت سے نبرد آزما رہے اور آخرکار عراق پر بھی اُن کا قبضہ ہوگیا۔

یورپ کے عیسائیوں نے گیارھویں صدی کے زمانے میں صلیبی جنگوں کا آغاز کیا۔ گو یہ جنگیں مذہب کے نام پر لڑی گئیں لیکن مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو دُنیائے عرب سے بے دخل کر کے ہندوستان اور مشرقِ بعید سے ہونے والی تجارت کا راستہ صاف کیا جائے۔ گو یورپ کے عیسائیوں کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور فلسطین آخرکار صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں اُنھیں شکست ہوئی لیکن اسپین اور سسلی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ آخرکار

وقت ایسا بھی آیا کہ عثمانی سلطنت کی گرفت کمزور ہو گئی اور یہ زوال پذیر ہو گئی۔ یورپی طاقتیں اس سے مراعات حاصل کرتی گئیں۔ خصوصاً انگریز تاجر یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح وہ بلاواسطہ ہندوستان اور مشرقِ بعید سے تجارت کریں اور مسلمان تاجروں کا درمیانی واسطہ ختم ہو جائے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے یورپ نے صلیبی جنگ کی تھی۔ لیکن جہاں متحدہ شاہی فوجیں اور مذہبی رہنما ناکام رہے وہاں انگریز تاجروں نے کامیاب ہو کر دکھایا۔ ۱۵۸۱ء میں انگریزوں نے لیوانٹ کمپنی بنائی اور ترکی سلطان سے تجارت کی مراعات حاصل کر لیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی گئی۔ خلیج فارس میں پرتگالیوں نے ہرمز کے جزیرہ پر قبضہ کر لیا۔ شاہِ ایران نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے مدد کی درخواست کی اور انگریزوں کو ایک نادر موقع ہاتھ آگیا انھوں نے ہرمز سے پرتگالیوں کو بے دخل کر دیا اور ولندیزیوں نیز فرانسیسیوں کو بھی اس علاقے سے دور رہنے پر مجبور کر دیا۔ ہندوستان کے دفاع کے لیے اور تجارتی گزرگاہ کی حیثیت سے انگریزوں کی نظر میں خلیج فارس بہت اہم تھی۔ جب نپولین مصر پر قابض ہو گیا تو ۱۷۹۸ء میں انگریزوں نے مسقط کے حکمران اور دیگر ساحلی ریاستوں سے معاہدے کر کے انھیں اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ۱۸۳۹ء میں انھوں نے عدن پر قبضہ کر کے وہاں بحری اڈہ قائم کر لیا۔

سلطنتِ عثمانیہ زوال پذیر تھی۔ ۱۷۹۸ء میں فرانس نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ سولھویں صدی میں آسٹریا کا دباؤ بھی بڑھنے لگا۔ اس کے ایک صدی بعد رُوس نے بھی پاؤں پھیلانے شروع کر دیے۔ مصر کے پاشا محمد علی نے بغاوت کی اور اس کی فوجیں استنبول تک پہنچ گئیں۔ رُوس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک معاہدہ کی رُو سے سلطنت کے دفاع میں مدد کے بدلے ترکی کے بعض اندرونی معاملات میں دخل دینے اور بوقتِ ضرورت درۂ دانیال بند کرنے کے حقوق حاصل کر لیے۔ اس معاہدہ سے برطانیہ رُوس کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا۔ جب دُوسری بار محمد علی نے استنبول پر حملہ کیا تو برطانیہ اور دُوسری مغربی طاقتوں نے دخل اندازی کی اور تنازعہ کا پُرامن تصفیہ کرا دیا جس کے نتیجہ میں مصر خود مختار ہو گیا۔ ۱۸۲۷ء میں برطانیہ، فرانس اور رُوس نے مل کر سلطنتِ عثمانیہ کے بحریہ کو تباہ کر دیا جس کا بلاواسطہ نتیجہ یہ ہوا کہ یونان سلطنت کے قبضہ سے نکل گیا۔ ۱۹۱۲ء تک بلقان کی تمام عیسائی ریاستیں اور جزیرہ کریٹ سلطنتِ عثمانیہ کے قبضہ سے نکل گئے اور طرابلس (لیبیا) پر اٹلی نے قبضہ کر لیا۔

اُنیسویں صدی میں برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ سلطنتِ عثمانیہ کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھا جائے۔ انگریزوں کو ڈر تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ کی تباہی سے جو خلا پیدا ہوگا وہ رُوس پُر کرے گا۔ چنانچہ کریمیا کی جنگ میں برطانیہ اور فرانس نے رُوس کے خلاف سلطنتِ عثمانیہ کی مدد کی اور برطانیہ نے اس کے معاوضہ میں سائپرس کا جزیرہ حاصل کر لیا۔ ۱۸۸۲ء میں برطانیہ مصر پر قابض ہو گیا۔ ترکی کا سلطان اب بالکل مجبور اور بے بس تھا۔ اُنیسویں صدی کے آخر تک کریمیا اور کوہ قاف کے کچھ حصے رُوس کے قبضے میں چلے گئے۔ الجزائر اور تیونس پر فرانس قابض ہو گیا۔ بوسینا اور ہرزیگووینا کو آسٹریا نے دبا لیا۔ صرف جرمنی ہی ایک ایسا ملک تھا جس نے سلطنتِ عثمانیہ کے کسی علاقے پر قبضہ نہیں کیا تھا اور قیصرِ جرمنی ترکی کے سلطان کی دوستی

کا مہرہ تھا۔ اس دوست نوازی کا راز اس وقت ظاہر ہوا جب جرمنی نے ترکی کی وساطت سے برلن سے بغداد تک ریل چلانے کی سکیم مکمل کر لی اور ترکی فوج کو تربیت دینے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اس صورتِ حال کا توڑ برطانیہ نے یوں کیا کہ اپنے پرانے دشمن روس سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔

پہلی جنگِ عظیم

۴ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ سلطنتِ عثمانیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے شریفِ مکہ اور شاہ سعود سے خفیہ معاہدے کر کے عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر تیار کر لیا۔ یہ بغاوت ۵ جون ۱۹۱۶ء کو شروع ہوئی۔ جنگ کے دوران عربوں کی یہ بغاوت ترکوں کی شکست کا پیغام تھی۔ ترکوں کو بیک وقت انگریزی فوجوں اور ٹی۔ ایس لارنس کی قیادت میں اٹھنے والے عرب گوریلوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ جنگ کے بعد عربوں کو توقع تھی کہ انگریز اپنے وعدے پورے کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انگریزوں نے عرب ریاستوں اور فلسطین کی آزادی کا وعدہ کیا تھا لیکن دوسری طرف ۱۹۱۶ء میں برطانیہ، فرانس اور روس نے خفیہ معاہدے کر کے دنیائے عرب کو آپس میں بانٹ لینے کی سکیم بھی بنا لی تھی۔ یہ حصے بخرے تو تولیتی نظام کے ماتحت ہونے ہی تھے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ انگریزوں نے ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو بالفور اعلان کے ذریعہ یہودیوں سے یہ وعدہ کیا کہ فلسطین میں ان کی قومی ریاست قائم کی جائے گی۔

شام میں ترکوں کی شکست کے بعد انگریزوں نے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۱۹ء کو امن کانفرنس میں طے کیا گیا کہ عرب علاقوں کو ترکی سے علیحدہ کر لیا جائے اور فاتح ملکوں کو ان کا متولی بنا دیا جائے۔ برطانیہ اور فرانس تولیتی علاقوں کی سرحدوں کے سوال پر متفق نہ ہو سکے۔ چنانچہ دو امریکیوں کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ لوگوں کی خواہشات معلوم کریں اور اپنی تحقیقاتی رپورٹ امریکی صدر کی خدمت میں پیش کریں۔ اس رپورٹ کی سفارشات برطانیہ اور فرانس نے قبول نہیں کیں کیونکہ کنگ اور کرین نے اپنی رپورٹ میں شام پر فرانسیسی نگرانی کی مخالفت کی تھی اور بالفور اعلان کو بھی غیر دانشمندانہ قرار دیا تھا۔

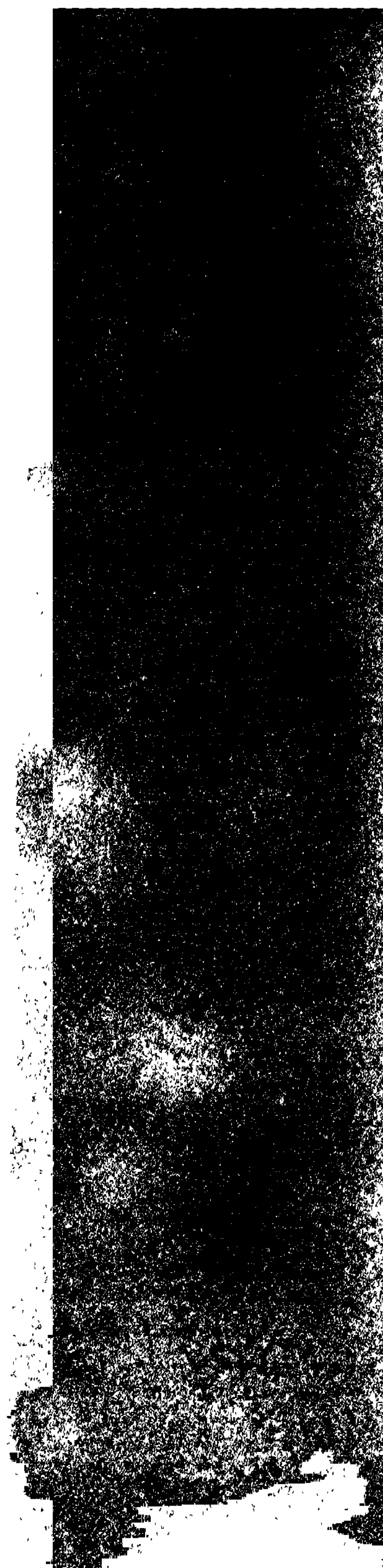
ستمبر ۱۹۱۹ء میں برطانیہ اور فرانس میں ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے انھوں نے عرب علاقوں کے حصے بخرے کر لیے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۰ء کو شام کے سربرآوردہ لوگوں کی کانگریس نے امیر فیصل کو شام اور فلسطین کا تاج پیش کیا لیکن برطانیہ اور فرانس نے اس فیصلے کو نہیں مانا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۲۰ء کی سان ریمو کانفرنس نے شام اور لبنان کو فرانس کی نگرانی میں اور فلسطین اور یردن کو برطانوی تولیت میں دے دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ بالفور اعلان کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ لیگ آف نیشنز نے سان ریمو کانفرنس کے فیصلوں کی توثیق کر دی۔

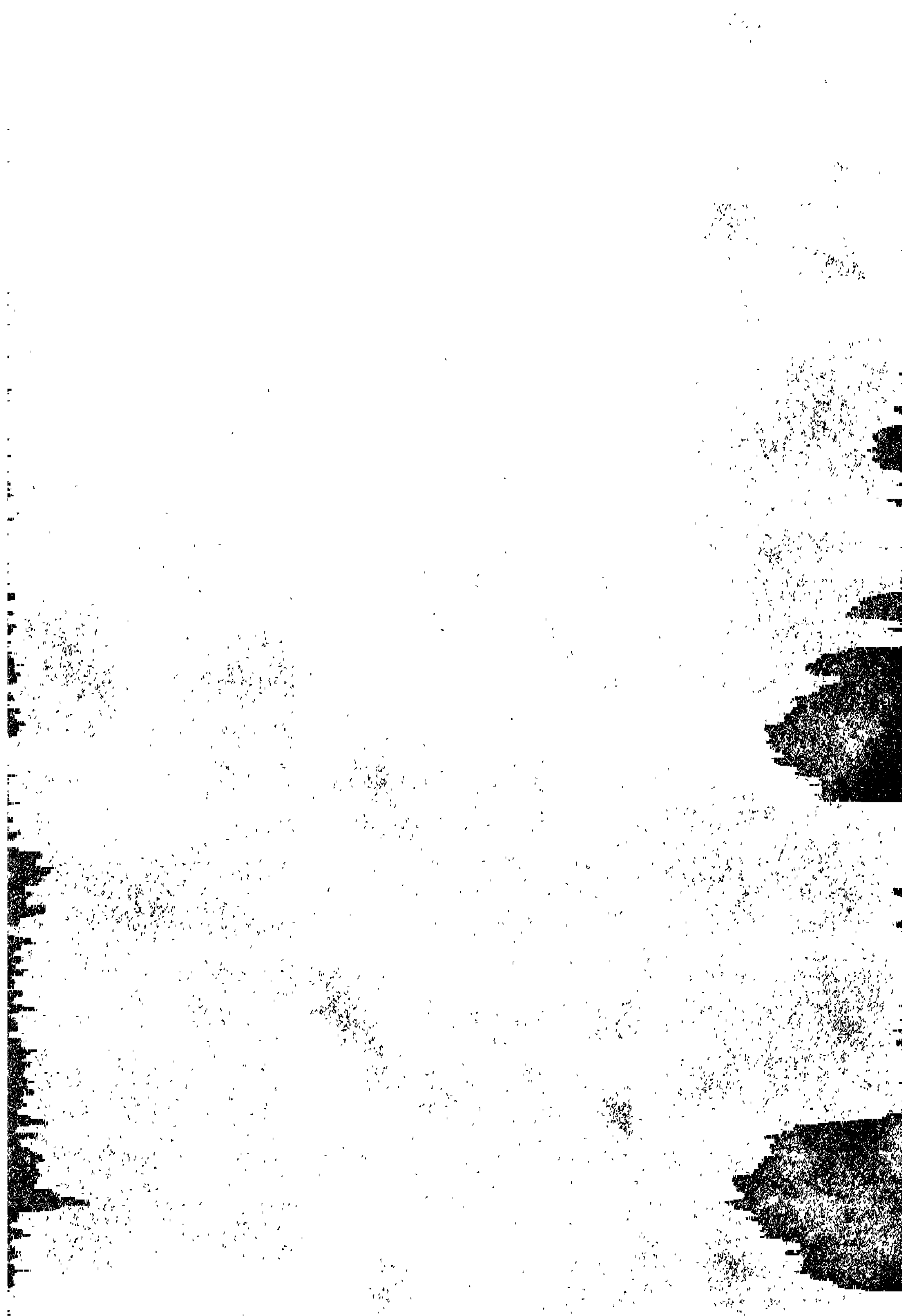
فرانس نے امیر فیصل کو شام سے نکال دیا اور انگریزوں نے انھیں عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ یردن ان کے چھوٹے بھائی امیر عبداللہ کی سرداری میں دے دیا۔ اس طرح سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ مغربی طاقتوں کا اثر مکمل تسلط میں تبدیل ہو گیا اور عرب قومیت جس نے آزادی کی توقع میں ترکوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اب مغربی طاقتوں کے سیاسی اور

اقتصادی [illegible] ہو گئی۔

ترکی میں مصطفیٰ کمال کی قیادت میں ترکی کی جمہوریہ نے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت کے خاتمہ کا اعلان کیا تو اس کے بعد شریف مکہ نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا لیکن چند ماہ بعد جب نجد کے شاہ ابن سعود نے حجاز پر حملہ کیا اور شریف مکہ خلافت سے دست بردار ہو گئے تو یہ خلافت بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سے مسلمانوں کی مرکزیت ایک قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئی۔ مغربی تسلط کے دوران اسلامی تحریک اور اسلامی اتحاد کی جگہ جد و جہد آزادی، عرب قومیت اور عرب اتحاد نے لے لی۔ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد سے دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ تک کا زمانہ عرب قومیت کی تشکیل و تنظیم کا دور ہے دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے مختلف ملکوں میں عرب قومیت کی سیاسی اور مسلح جد و جہد کا دور شروع ہوتا ہے جو ہنوز جاری ہے۔ اس سے قبل کہ ہم اس جد و جہد کا تاریخی جائزہ لیں دنیائے عرب پر مغربی اثرات کا مطالعہ ضروری ہے

(باقی آئندہ)





اختر صاحب

محمد طفیل

"اپنے ہیرو کے قریب نہ جاؤ۔ اس کی عظمت
مداحوں کے قرب کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

مذہب ——— اور ——— رومان!

انہی دو حقیقتوں میں اختر صاحب گم ہیں۔ آئیے انہیں ڈھونڈ نکالیں۔

ویسے تو یہ پروفیسر ہیں اور نامور پروفیسر، اور میں ادب کا طالب علم ہوں اور غیر معروف طالب علم، اس لیے میں ایک ایسی [illegible]نی کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جسے پڑھنے کے لیے علم کی کئی سیڑھیاں طے کرنی پڑیں ——— اور پھر جانچنے کے لیے؟ ——— اس [illegible]ے لیے تو اس سے بھی زیادہ ڈگریاں چاہییں۔ شخصی پرکھ کی ڈگریاں! ——— دانا کہتے ہیں کہ کتابیں نہیں پڑھ سکتے تو انسانی چہرے [illegible]ھو۔ میں کتنا ہوں کتابیں پڑھنے کے باوجود انسانی چہرے نہیں پڑھ جانتے

مجھے اختر صاحب سے "مکتبی" یا "کالجی" درس لینے کا موقع تو نہیں ملا۔ مگر ذہنی طور پر میں انہیں استاد مانتا ہوں۔ امام مانتا [illegible]ں۔ استاد علم کے معاملے میں، امام کسی اور معاملے میں!

بات طالب علم اور استاد کی چل نکلی ہے۔ اس لیے میں بھی اختر صاحب کو طالب علمی کے زمانے سے پہچاننے کی کوشش کروں گا۔ [illegible]رف کوشش! جو ناتمام بھی ہو سکتی ہے اور ناکام بھی!

تصور کیجیے۔ اس وقت ایک محقق کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے اور وہ پورے طنطنے کے ساتھ بول رہی ہے:۔

ابتدائی تعلیم کا زیادہ حصہ اوریو (وطن) اور مونگیر میں طے کیا۔ ۱۹۲۶ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسکالر[illegible]پ ملی۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک سائنس کالج پٹنہ میں رہے۔ اسکالرشپ ملی۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک بی اے آنرز انگریزی [illegible] کیا۔ گولڈ میڈل ملا۔ ۱۹۳۶ء میں ایم اے اردو کیا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پاس ہوئے۔ گولڈ میڈل ملا۔ ڈی لٹ ۱۹۵[illegible]ء [illegible] کیا۔

یہاں حلول شدہ محقق کی روح سے معذرت کیے لیتے ہیں "اگر آپ میری باتیں بھی سن سکیں۔"

اگر مندرجہ بالا واقعات میں ایک دو اور واقعات کا اضافہ کر دیا جائے تو ان کی سوانح عمری مکمل ہو جائے گی۔ مثلاً ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۵ء تک انڈین سیکرٹریٹ میں رہے اور درس و تدریس کی ملازمت ۱۹۳۶ء سے کی تو بس اختر اورینوی [illegible] نگاہ کے موٹے موٹے واقعا[ت]

نثر ل [illegible]

لگے اور اگر ان کا کہ [illegible]

کرتے رہتے ہیں [illegible]

مطمئن ہوتے ہیں اور کبھی ناآسودہ [illegible]

رہتے ہیں اور اگر کوئی ان سے مذاق کرے تو [illegible]

یہ خوش ہیں اور احباب ان سے خوش!

کھانے میں، لباس میں، آرائش میں، ان کا پسندیدہ ہر قسم کا [illegible]

کھانے میں ——— میٹھا ہو یا چٹ پٹا، ابلا ہو یا تلا ہوا، [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] ——— لباس میں ——— صاف عام سفید کپڑے، جن میں شیروانی بھی شامل، سوٹ بھی شامل ——— آرائش میں ———

صاف ستھرا کمرہ، جس میں کسی قسم کی آرائش نہ ہو۔ پھول بہت پسند ہیں، ایشیائی بھی مغربی بھی!

دیکھ لیجیے میں نے چند ہی سطروں میں کتنی معلومات فراہم کر دیں۔ تعلیم کا حال لکھ دیا، عادات لکھ دیں، پسندیدہ اور مرغو[ب]

چیزوں کے بارے میں لکھ دیا۔ ہو گیا مضمون مکمل؟

لیجیے وہی محقق کی روح پھر آن نازل ہوئی۔ کہتی ہے:۔

"برخوردار طفیل کی معلومات ناقص ہیں۔ یہ دکھ اور بھی سوا معلوم ہوتا ہے۔ جب ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ برخوردار کے اختر[...]

کے گھرانے سے قریبی تعلقات ہیں۔ مثال کے طور پر صرف چند کوتاہیوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ اختر صاحب کو ۱۹۱۸ء میں ٹائیفا[ئڈ]

ہوا تھا جس میں چالیس دن تک مبتلا رہے۔ پھر ۱۹۲۰ء میں انھیں ناسور ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں کالا آزار، ۱۹۲۵ء میں درد مفاصل [...]

میں پھیپھڑوں کی کمزوری، فالباً سل، پھر ۱۹۳۳ء میں دوبارہ سل کا اور ۱۹۳۶ء میں (دوبارہ) درد مفاصل کا حملہ ہوا۔ مگر ان کے مضمو[ن]

ان باتوں کا کہیں ذکر نہیں اور کہتے ہیں ——— مضمون مکمل ہو گیا! ——— چہ خوب!

میں اس مضمون میں ایسی واقعاتی باتوں کو کم سے کم لانا چاہتا تھا۔ مگر کچھ روایتی تقاضوں کی خاطر اور کچھ "دو اور دو چا[ر]"

قسم کے حضرات کے لیے کہیں کہیں اس بدعت حسنہ سے بھی کام لینا پڑے گا ——— اجازت ہے؟

ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ اختر صاحب جو کچھ ہیں اور جیسے کچھ ہیں وہ تو مندرجہ بالا سطروں میں آ گئے ہیں۔ چونکہ ہمیں

کچھ اور کچھ اور ——— کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے میں بھی بال کی کھال اتاروں گا خواہ سلیقہ ہو یا نہ ہو۔

بچپن میں انھیں کبڈی اور فٹ بال سے دلچسپی تھی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اختر صاحب آج بھی کبڈی اور فٹ بال سے شوق فر[ماتے]

ہوتے تاکہ دیکھنے والوں کو لطف آتا۔ ہم سب بڑے عجیب واقع ہوئے ہیں۔ جو کام ہمیں اس عمر میں کرنے چاہئیں وہ ہم [نہیں]

کرتے۔ دوستوں کے لیے مسرتوں کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ بچپن میں برابر بیمار رہے۔ شرارت جو بچوں کا [حق]

ہے اس کے لیے انھیں فرصت ہی نہ ملی۔ مطلب یہ کہ ان کی زندگی سے نچلے لطف اندوز ہونے نہ پائے۔

[illegible] بھی اور نشہ شباب عروج پر ہوتا ہے جب آدمی اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔
[illegible] کی آرزو، ہر شرارت پر طبیعت آمادہ، ہر ذمہ داری سے آزاد، یہ دور بھی
[illegible] بے راہ روی سے وابستہ ہوتا ہے۔
[illegible] بننے کی کوشش کی۔ بن ٹھن کے رہتے تھے۔ لڑکیوں کی طرف سے مطمئن تھے کہ
[illegible] کے بعد سپرنٹنڈنٹ کے خلاف فارسی اور عربی میں نظمیں لکھیں۔ شاہ جہاں، مال کوس
[illegible] تالیاں دیں۔ اس لیے کہ وہ راستے کا روڑا تھے ——
[illegible] کالج میں تھے جو ان کی تصویریں بنایا کرتے تھے اور وہ لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں جس
پر ہنگامے بھی ہوتے تھے۔ تالیاں بھی پٹتی تھیں۔

نوجوان جو تازہ تازہ عشق فرماتے تھے، وہ سب کے سب ان کے پاس جا کر رُوداد بیان کیا کرتے تھے۔ ان کی آشیرواد لیا کرتے تھے، تسکین پایا کرتے تھے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو بھلا بتائیں یہ خود کیسے خاموش رہتے یہ بھی اپنے معاشقوں کی داستان سناتے (یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ نوجوان، ہر اس نگاہ کو، جو اُن پر اچانک پڑ گئی ہو، اپنے معاشقے کی ابتدا سمجھ لیتے ہیں۔ لہذا معاشقوں کی کمی بھی کیا ہو گی)
اختر صاحب میں جتنے بھی اوصاف تھے وہ سب ایسے تھے جو کالج کے لڑکوں کو بھاتے ہیں۔ اگر کوئی ان بچوں میں ہر دلعزیز ہوتا ہے یا مرکزیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے تو وہ اختر صاحب کا ہی شاگرد ہوتا ہے یا اختر صاحب کسی ایسے ہی استاد کے شاگرد ہوتے ہیں۔ محض قابلیت، محض شرافت تازہ خون کو راس نہیں آتی۔

جی چاہتا ہے کہ ان دنوں کا ایک واقعہ تو سنا ہی دوں!

جن دنوں یہ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے وہاں نرسیں سب کی سب اینگلو انڈین تھیں۔ جوانی لڑکوں پر بھی آتی ہے۔ لڑکیوں پر بھی، من چلے یہ بھی ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہوتی ہیں۔ ماحول خوش نظر ہو، حالات "امید افزا" ہوں اور دور دل میں لڈو پھوٹنے کا ہو تو ایسے میں کسی ایک فریق کو شرارت کی سوجھے تو خود سوچ لیجیے کیا کیا لطف نہ آتا ہو گا۔ میرا خیال ہے اس ضمن میں مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سبھی مجھ سے زیادہ "باعلم" ہوں گے۔

پہلے فریقین میں چھوٹی چھوٹی شرارتیں چلیں۔ کبھی کسی کا پلڑا بھاری رہا، کبھی کسی کا، اچانک یکم اپریل کو نرسوں کی طرف سے انگریزی میں ایک نظم آئی۔ جس میں سینیئر طلبا کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔ اختر صاحب کے سپرد اس نظم کا جواب دینا ہوا۔ ان سے انگریزی میں جواب بن نہ پڑا۔ اردو میں نظم لکھی۔ جو غالباً ان کی پہلو ٹھی کی نظم تھی ؎

خالِ رخِ موریسن ، حسنِ رخِ ڈیوڈسن

حسب توقع نظم خوب چلی۔ لڑکوں کی نرسوں سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ ان آفت کے پرکالوں سے کترا کر نکل جاتیں۔ کسی میں ہمت تھی جو ترنم میں یہ پڑھتا —— خالِ رخِ موریسن ——
جیسے گھر والوں کے کانوں میں بھنک پڑ گئی ہو —— برخوردار تو لڑکیوں کے حسن کی تعریفیں بھی کرنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے

ان کی شادی کی سوچی۔ یہ اڑنگا ایسا ہے کہ بڑے بڑوں کے بل نکل گئے۔ ۱۹۶۳ء میں ان کی شادی کر دی گئی تاکہ بیخود دہلوی اور داغ کی برادری میں اضافہ نہ کریں۔

باتوں باتوں میں اختر صاحب نے بتایا کہ انھیں ایک نہایت مشرقی بیوی کی خواہش تھی۔ اس کے ساتھ رومانیت کے خواب بھی دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب میں بھی ایک طرح کی رومانیت ہے۔

یہ زندگی میں ہمیشہ دو دھاری تلوار سے کھیلتے رہے اور وہ تلوار تھی مذہب کی، رُومان کی۔ اللہ کا شکر ہے کہ انھیں بیوی مذہبی بھی ملیں اور رُومانی بھی، ورنہ ان پر وفیسر صاحب کے بہکنے کے سو بہانے تھے۔

باتوں ہی باتوں میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ میں نے اختر صاحب سے پوچھا ——— "کیا آپ خوفناک قسم کا سچ بول سکتے ہیں؟"

"بہ فضلِ خدا"!

اب اس بفضلِ خدا قسم کے جواب کے بعد ہمت تو نہ تھی کہ کسی شرارت کی گنجائش ہوتی مگر بات مُنہ سے نکل گئی ——— "آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ کیوپڈ آپ پر بڑا مہربان تھا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

اُستاد تو یہ ہیں ہی فوراً پینترا بدل گئے ——— "میں نے بعض مذہبی شخصیتوں سے محبت کی ہے۔ لیکن اللہ میاں سے اب مناسبت نہیں ہوتی۔ حضرت محمد صلعم کو بہت چاہتا ہوں۔ سیاست کے قائدین میں پنڈت نہرو اور محمد علی جناح کو بہت چاہا۔ دوستوں میں منافقوی، شرف عظیم آبادی، علی اظہر، نذیر احمد، ننالی، علی عباس، اور کئی سے نسبت کی ہے۔"

دیکھ لیا آپ نے صاف چھوٹ گئے۔ پوچھا کچھ، جواب کچھ۔ یہی وجہ تھی کہ کہنا پڑا ——— "پیر و مُرشد! آج تو میں آپ کا قائل ہو گیا۔"

انھوں نے میرا منشا تو پہلے ہی مرحلے پر بھانپ لیا تھا۔ محض تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے تھے۔ اس لیے انھیں میری قائل ہونے والی بات کے جواب میں کہنا پڑا ——— "اچھا تو سنو!":

"تم سے اسرار پر ایک معصوم سی یاد اُبھر آئی ہے۔ گیارہ سال کی عمر میں نگر رتی محل میں احمد شمسی صاحب (ماموں جان) کے یہاں قیام تھا۔ ان کے فلیٹ کے نیچے ایک بنگالن ۱۳، ۱۴ سال کی رہتی تھی۔ تین مہینے تک اس کو بے حد چاہا۔ کبھی ملے نہ تھے۔ صرف گیت گاتے تھے۔ جب شملے سے واپس ہوئے تو برسوں اس کے فراق میں روتے رہے ——— اس کے بعد شکیلہ کو چاہا اور چاہا گیا بعد ازاں ناگفتنی[1] ——— میرے لیے نہیں، دُوسروں کے لیے ——— اکثر محبوب بنتے رہے اور محبت کا جواب محبت کی زبان میں دیتے رہے۔"

میں نے ان باتوں سے محسوس کیا کہ اختر صاحب مزے کے آدمی ہیں۔ جھوٹی بڑائی کے قائل نہیں۔ اپنی خامیوں پر بھی نظر ہے۔

---

(۱) اس ناگفتنی کا بھی کچھ حال مجھے معلوم ہے مگر یہ باتیں یہ خود چھپانا چاہتے ہیں ان کے لکھنے میں تکلف بھی کیا۔

پہلوؤں سے بھی آگاہ ہیں۔

دیکھیے ایک دور وہ ہوتا ہے جب انسان اپنے جھوٹے معاشقوں کا حال بیان کرتا ہے اور ایک ایسا وقت آتا ہے کہ سچی باتوں پر بھی زبان نہیں کھلتی۔

ویسے اتنا ضرور ہے کہ یہ بات بات پر تڑپ سکتے ہیں۔ بات بات پر اٹک سکتے ہیں ۔ ذرا تڑپنے اور اٹکنے والی بات کی وضاحت کر دوں تاکہ معاملہ قابو میں رہے۔

تڑپنے والی بات تو یہ ہے کہ سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ دنیا میں کہیں کوئی ظلم ہوا ہو۔ درد کی ٹیس ان کے جگر میں اٹھے گی۔ اٹکنے والی بات یہ ہے کہ بس ذرا جواہر لعل کی طرح اچکن میں پھول اٹکا لینے کے عادی ہیں۔ اس کے علاوہ ریکارڈ بہت اچھا ہے۔

لیجیے! بچپن کے دن اور جوانی کی راتوں کے قصے ختم ہوئے!

ساری دنیا اختر اورینوی کے رشتے سے شکیلہ اختر کو جانتی ہے۔ مگر میں نے اختر صاحب کو شکیلہ کے رشتے سے پہچانا۔

ادبی حلقوں میں اختر صاحب کی دھاک ربع صدی سے ہے۔ میں بھی ان کے نام سے واقف تھا۔ خط و کتابت بھی تھی۔ مگر جب ۱۹۶۰ء میں شکیلہ بہن ملیں تو اختر صاحب سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ یہ اعجاز بہن کا تھا کہ انھوں نے باتوں ہی باتوں میں اختر صاحب کی تصویر اتار کر دکھا دی۔

۱۹۶۱ء میں میرا دلی جانا ہوا تو شکیلہ کے لکھنے پر پٹنہ بھی جانا پڑا۔ ابھی میں پٹنہ سے ایک دو اسٹیشن ادھر ہی تھا کہ ایک اسٹیشن پر ایک صاحب ملیں۔

بھائی صاحب السلام علیکم!

"جی!"

میں شکیلہ کی بہن عذرا ہوں۔

اچھا اچھا!!

مجھے شکیلہ نے لکھا تھا کہ بھائی آ رہے ہیں۔ اس لیے تم انھیں اسٹیشن پر ضرور ملنا۔

آپ نے کیسے پہچان لیا کہ میں ہی طفیل ہوں۔

واہ بھائی کو پہچاننا بھی کوئی مشکل بات ہوتی ہے۔

لیجیے صاحب ابھی پٹنہ آیا نہ تھا کہ شکیلہ کے خلوص کا جادو چلنے لگا۔ پٹنہ آیا تو گھر کے بہت سے افراد کے ساتھ اختر صاحب کو بھی دیکھا۔

آ گئے اور اس کی کچھ عادت پڑ چھوٹ گئی تاہم ضروری ہو تو یہاں لیجیے کہ انہیں دماغی کھانے کا ہوکا ہے۔ خود بھی کھاتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھلاتے رہتے ہیں جس سے آیا ہیں۔ مگر کبھی کبھی گوشہ نشینی کو اپنی جان کے بچاؤ کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ موجودہ زندگی سے کبھی تو مطمئن ہوتے ہیں اور کبھی نا آسودہ، شاگردوں کو جگر کا ٹکڑا سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ شاگرد شکوہ سنج ہیں، دوسروں پر فقرے چست کرتے رہتے ہیں اور اگر کوئی ان سے مذاق کرے تو بگڑ جاتے ہیں۔ ویسے دوستوں کے درمیان اپنے اوپر پھبتی پر بھی ہنس لیتے ہیں۔ احباب سے یہ خوش ہیں اور احباب ان سے خوش!

کھانے میں، لباس میں، آرائش میں، ان کی پسند کچھ اس قسم کی دریافت ہوئی ہے :-

کھانے میں ——— بُھنا ہوا چنا، ہرا چنا، کاجو، میٹھی روٹی، انڈے کا حلوہ، بُھنا ہوا مرغ، بھونی کھچڑی، فروٹ پڈنگ، فرنی ——— لباس میں، ——— صاف عام سفید کپڑے، جن میں شیروانی بھی شامل، سوٹ بھی شامل ——— آرائش میں ——— صاف ستھرا کمرہ، جس میں کسی قسم کی آرائش نہ ہو۔ پھول بہت پسند ہیں، ایشیائی بھی مغربی بھی!

دیکھ لیجیے میں نے چند ہی سطروں میں کتنی معلومات فراہم کر دیں۔ تعلیم کا حال لکھ دیا، عادات لکھ دیں، پسندیدہ اور مرغوب چیزوں کے بارے میں لکھ دیا۔ ہو گیا مضمون مکمل؟

لیجیے وہی محقق کی روح پھر آن نازل ہوئی۔ کہتی ہے :-

"برخوردار طفیل کی معلومات ناقص ہیں۔ یہ دکھ اور بھی سوا معلوم ہوتا ہے۔ جب ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ برخوردار کے اختر صاحب کے گھرانے سے قریبی تعلقات ہیں۔ مثال کے طور پر صرف چند کوتاہیوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ اختر صاحب جب کہ ۱۹۱۸ء میں ٹائیفائڈ ہوا تھا جس میں چالیس دن تک مبتلا رہے۔ پھر ۱۹۲۰ء میں انہیں ناسور ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں کالا آزار، ۱۹۲۵ء میں وجع مفاصل، ۱۹۳۱ء میں پھیپھڑوں کی کمزوری، غالباً سل، پھر ۱۹۳۳ء میں دوبارہ (۲) کا اور ۱۹۳۵ء میں (دوبارہ) وجع مفاصل کا حملہ ہوا۔ مگر ان کے مضمون میں ان باتوں کا کہیں ذکر نہیں اور کہتے ہیں ——— مضمون مکمل ہو گیا! ——— چہ خوب!"

میں اس مضمون میں ایسی واقعاتی باتوں کو کم سے کم لانا چاہتا تھا۔ مگر کچھ روایتی تقاضوں کی خاطر اور کچھ "دو اور دو چار" قسم کے حضرات کے لیے کہیں کہیں اس بدعتِ حسنہ سے بھی کام لینا پڑے گا ——— اجازت ہے؟

ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ اختر صاحب جو کچھ ہیں اور جیسے کچھ ہیں وہ تو مندرجہ بالا سطروں میں آ گئے ہیں۔ چونکہ ہمیں کچھ اور، کچھ اور ——— کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے میں بھی بال کی کھال اتاروں گا خواہ سلیقہ ہو یا نہ ہو۔

بچپن میں انہیں کبڈی اور فٹ بال سے دلچسپی تھی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اختر صاحب آج بھی کبڈی اور فٹ بال سے شوق فرماتے ہوتے تاکہ دیکھنے والوں کو لطف آتا۔ ہم سب بڑے عجیب واقع ہوئے ہیں۔ جو کام ہمیں اس عمر میں کرنے چاہئیں وہ ہم اپنے کرنے دوستوں کے لیے مسرتوں کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ بچپن میں برابر بیمار رہے شرارت جو بچوں کا حق ہے اس کے لیے انہیں فرصت ہی نہ ملی۔ مطلب یہ کہ ان کی زندگی سے نتیجے لطف اندوز ہوئے نہ بوڑھے۔

کالج میں پہنچے تو اور لڑکوں کی طرح بابا جو مجوان کا بھی روزمرّہ تھا۔ یہ عُمر وہ ہوتی ہے جب آدمی اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔
ہر چونکانے والی بات کی دُھن، مرکزِ نگاہ بننے کی آرزو، ہر شرارت پر طبیعت آمادہ، ہر ذمہ داری سے آزاد، یہ دور بھی
کیا دلچسپ ہوتا ہے جس میں مسرّتوں کا واسطہ، ہر بے راہ روی سے وابستہ ہوتا ہے۔
انھوں نے بھی متعدد دہمہ کا لجیا بننے کی کوشش کی۔ بن ٹھن کے رہتے تھے۔ لڑکیوں کی طرف سے مطمئن تھے کہ
کالج کے ہیرو ہیں ہم تو ہیں۔ اس خوش فہمی کے بعد سپرنٹنڈنٹ کے خلاف فارسی اور عربی میں نظمیں لکھیں۔ شاہ جہان، مال کوس
اله بھیرویں میں اُنھیں گالیاں دیں۔ اس لیے کہ وہ راستے کا روڑا تھے ———
ان کے ایک یار کالج میں تھے جو ان کی تصویریں بنایا کرتے تھے اور وہ لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں جس
پر ہنگامے بھی ہوتے تھے۔ تالیاں بھی پٹتی تھیں۔
نوجوان جو تازہ تازہ عشق فرماتے تھے: وہ سب کے سب ان کے پاس جا کر رُو داد بیان کیا کرتے تھے۔ ان کی آشیرواد لیا کرتے تھے،
تکمیں پایا کرتے تھے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو بھلا بتائیں یہ خود کیسے خاموش رہتے یہ بھی اپنے معاشقوں کی داستان سُناتے۔ یہ تو آپ جانتے
ہی ہوں گے کہ نوجوان، ہر اس نگاہ کو، جو ان پر اچانک پڑ گئی ہو، اپنے معاشقے کا آغاز سمجھ لیتے ہیں۔ لہذا معاشقوں کی کمی بھی کیا ہوا۔
اختر صاحب میں جتنے بھی اوصاف تھے وہ سب ایسے تھے جو کالج کے لڑکوں کو بھاتے ہیں۔ اگر کوئی ان برائیوں میں ہر دلعزیز
ہوتا ہے یا مرکزیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے تو وہ اختر صاحب کا ہی شاگرد ہوتا ہے یا اختر صاحب کسی ایسے ہی اُستاد کے شاگرد ہوتے
ہیں۔ محض قابلیت، محض شرافت تازہ خون کو راس نہیں آتی۔

جی چاہتا ہے کہ ان دنوں کا ایک واقعہ تو سُنا ہی دوں!

جن دنوں یہ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے وہاں نرسیں سب کی سب اینگلو انڈین تھیں۔ جوانی لڑکوں پر بھی آتی ہے۔ لڑکیوں
پر بھی، من چلے یہ بھی ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہوتی ہیں۔ احوال خوش نظر ہو، حالات "اُمید افزا" ہوں اور دور دل میں لڈو پھوٹنے کا ہو
تو ایسے میں کسی ایک فریق کو شرارت کی سُوجھے تو خود سوچ لیجیے کیا کیا لطف نہ آتا ہوگا۔ میرا خیال ہے اس ضمن میں مجھے کچھ زیادہ کہنے
کی ضرورت نہیں۔ سبھی مجھ سے زیادہ "باعلم" ہوں گے۔
چلے فریقین میں چھوٹی چھوٹی شرارتیں چلیں۔ کبھی کسی کا پلڑا بھاری رہا۔ کبھی کسی کا، اچانک یکم اپریل کو نرسوں کی طرف سے انگریزی
میں ایک نظم آئی۔ جس میں سینیئر طلبا کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔ اختر صاحب کے سپرد اس نظم کا جواب دینا ہوا۔ ان سے انگریزی میں جواب
نہ بن پڑا۔ اُردو میں نظم لکھی۔ جو غالباً ان کی پہلو ٹھی کی نظم تھی ؎

خالِ رخِ موریس ، حُسنِ رُخِ ڈیوڈسن

حسبِ توقع نظم خوب چلی۔ لڑکوں کی نرسوں سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ ان آفت کے پرکالوں سے کترا کر نکل جاتیں۔ کس میں ہمت تھی جو تم
میں یہ سُنتی ——— خالِ رُخ موریس ———
جیسے گھروالوں کے کانوں میں بھنک پڑ گئی ہو ——— برخوردار تو لڑکیوں کے حُسن کی تعریفیں بھی کرنے لگے۔ چنانچہ اُنھوں

ان کی شادی کی سوچی۔ یہ ارادہ ایسا [illegible] بدوں کے بل نکل گئے۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی شادی کر دی گئی تاکہ برخوردار فرمانبردار دامن کی برادری میں اضافہ نہ کرے

باتوں باتوں میں اختر صاحب نے بتایا کہ انھیں ایک نہایت متقی بیوی کی خواہش تھی۔ اس کے ساتھ رُومانیت کے طالب بھی دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب میں بھی ایک طرح کی رُومانیت ہے۔

یہ زندگی میں ہمیشہ دو دھاری تلوار سے کھیلتے رہے اور وہ تلوار تھی مذہب کی، رُومان کی۔ اللہ کا شکر ہے کہ انھیں بیوی مذہبی بھی ملیں اور رُومانی بھی، ورنہ ان پروفیسر صاحب کے بچنے کے سو بہانے تھے۔

باتوں ہی باتوں میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ میں نے اختر صاحب سے پوچھا ——— "کیا آپ خوفناک قسم کا سچ بول سکتے ہیں؟"

"بفضلِ خدا"!

اب اس بفضلِ خدا قسم کے جواب کے بعد بحث تو دھنی کہ کسی شرارت کی گنجائش ہوتی مگر بات مُنہ سے نکل گئی ——— "آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ کیوپڈ آپ پر بڑا مہربان تھا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

اُستاد تو یہ ہیں ہی، فوراً پینترا بدل گئے ——— "ہاں میں نے بعض مذہبی شخصیتوں سے محبت کی ہے۔ لیکن اللہ میاں سے اب تک محبت نہیں ہوئی۔ حضرت محمد صلعم کو بہت چاہتا ہوں، مسلم کے قائدین میں پنڈت نہرو اور محمد علی جناح کو بہت چاہا۔ دوستوں میں رنا نقوی، شرف عظیم آبادی، علی اظہر، زیڈ اے نقاش (علی عباس) اور دوسروں سے محبت کی ہے۔"

دیکھ لیا آپ نے صاف بچ نکل گئے۔ پوچھا کچھ، جواب کچھ۔ یہی وجہ تھی کہ کہنا پڑا ——— "پیر و مرشد! آج تو میں آپ کا قائل ہو گیا۔"

انھوں نے میرا منشا تو پہلے ہی مرحلے پر بھانپ لیا تھا۔ محض تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے تھے۔ اس لیے انھیں میری قائل ہونے والی بات کے جواب میں کہنا پڑا ——— "اچھا تو سنو!":

"تو اسے اصرار پر ایک معصوم سی یاد اُبھر آئی ہے۔ گیارہ سال کی عمر میں نگر دھام میں احمد شمسی صاحب (ماموں جان) کے یہاں قیام تھا۔ ان کے فلیٹ کے نیچے ایک بنگالن ۱۳، ۱۴ سال کی رہتی تھی۔ تین مہینے تک اس کو بے حد چاہا۔ کبھی ملے نہ تھے۔ صرف گیت سنتے تھے۔ جب شہر سے واپس ہوئے تو ٹرین میں اس کے فراق میں روتے رہے ——— اس کے بعد شکیلہ کو چاہا اور چاہا گیا بعد ازاں ناگفتنی[1] ——— میرے لیے نہیں، دُوسروں کے لیے ——— اکثر محبوب بنتے رہے اور محبت کا جواب محبت کی زبان میں دیتے رہے۔"

میں نے ان باتوں سے محسوس کیا کہ اختر صاحب مزے کے آدمی ہیں۔ جھوٹی بڑائی کے قائل نہیں۔ اپنی خامیوں پر بھی نظر

---

(۱) اس ناگفتنی کا بھی کچھ حال مجھے معلوم ہے مگر جو باتیں یہ خود چھپانا چاہتے ہیں ان کے لکھنے میں لطف بھی کیا۔

یوں سے بھی آگاہ ہیں۔

دیکھیے ایک دور وہ ہوتا ہے جب انسان اپنے چھوٹے معاشقوں کا حال بیان کرتا ہے اور ایک یہ وقت آتا ہے
باتوں پر بھی زبان نہیں کھلتی۔

ویسے اتنا ضرور ہے کہ یہ بات بات پر تڑپ سکتے ہیں۔ بات بات پر اٹک سکتے ہیں ۔ ذرا تڑپنے اور اٹکنے
ت کی وضاحت کردوں تاکہ معاملہ قابو میں رہے۔

تڑپنے والی بات تو یہ ہے کہ سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ دُنیا میں کہیں کوئی ظلم ہوا ہو۔ درد کی
ان کے جگر میں اُٹھے گی۔ اٹکنے والی بات یہ ہے کہ بس ذرا جواہر لعل کی طرح اچکن میں پھول اٹکا لینے کے عادی ہیں۔
ے علاوہ ریکارڈ بہت اچھا ہے۔

لیجیے! بچپن کے دن اور جوانی کی راتوں کے قصے ختم ہوئے!

ساری دُنیا اختر اور بیوی کے رشتے سے شکیلہ اختر کو جانتی ہے۔ مگر میں نے اختر صاحب کو شکیلہ کے رشتے سے
۔ ا

ادبی حلقوں میں اختر صاحب کی دھاک ربع صدی سے ہے۔ میں بھی ان کے نام سے واقف تھا۔ خط و کتابت بھی تھی۔
ب ۱۹۶۰ء میں شکیلہ بہن ملیں تو اختر صاحب سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ یہ اعجاز بہن کا تھا کہ انھوں نے باتوں ہی باتوں
اختر صاحب کی تصویر اتار کر دکھادی۔

۱۹۶۱ء میں میرا دلّی جانا ہوا تو شکیلہ کے لکھنے پر پٹنہ بھی جانا پڑا۔ ابھی میں پٹنہ سے ایک دو اسٹیشن ادھر ہی تھا کہ
کے اسٹیشن پر ایک صاحب ملیں۔

بھائی صاحب السلام علیکم!

"جی!"

میں شکیلہ کی بہن عذرا ہوں۔

اچھا اچھا!!

مجھے شکیلہ نے لکھا تھا کہ بھائی آرہے ہیں۔ اس لیے تم انھیں اسٹیشن پر ضرور ملنا۔

آپ نے کیسے پہچان لیا کہ میں ہی طفیل ہوں۔

واہ بھائی کو پہچاننا بھی کوئی مشکل بات ہوتی ہے۔

لیجیے صاحب ابھی پٹنہ آیا نہ تھا کہ شکیلہ کے خلوص کا جادو چلنے لگا۔ پٹنہ آیا تو گھر کے بہت سے افراد کے ساتھ اختر
صب کو بھی دیکھا۔

[illegible] آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپکے استقبال کے لیے اختر صاحب بھی آئے ہیں۔ وہ دیر تک کسی کے لیے نہیں آتے۔ پہلے [illegible]، اختر صاحب کی عنایت اور قربت کا احساس دلا دیا گیا۔ مجھے بھی بڑے پیار سے ملے۔ میں نے دیکھا لمبے قد کے خوبصورت آدمی جو قطعاً ادیب نہیں لگتے تھے۔ بلکہ کوئی آئی۔سی۔ایس افسر معلوم ہوتے تھے۔ یونانی کٹ چہرہ، دودھ جیسی رنگت، جو ہماریوں میں کم لوگوں کو نصیب ہے (ویسے عورتوں کی بات دوسری ہے) کلین شیو، لب و لہجہ دلآویز، آواز میں کھنک، زبان فرفر!

یہ سارے رنگ ڈھنگ ایسے تھے جو جدید ادب کی تخلیق کر رہے تھے۔ مگر میں بھی ایسا کھرا انسان ہوں کہ کسی سے بھی مرعوب نہیں ہوتا۔ خواہ زبان سے کچھ کہوں ۔ دماغ یہی کہتا ہے۔ ہنھ!

اب میرے سامنے اختر صاحب ہیں اور میں ہوں ——— اختر صاحب کا کمرا کوٹھی کے ایک کونے میں ہے۔ گھر سے متعلق بھی، گھر سے الگ بھی، مطلب یہ کہ جیسا ماحول بنانا مقصود ہو ویسا بنا لیا جائے۔

یہ جو ادیب لوگ ہوتے ہیں۔ بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ من کی دنیا میں اتنے محو ہوتے ہیں کہ انھیں گھر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ بیوی بچوں کو بھی یہ ایسے ہی سمجھتے ہیں۔ جیسے گھر کی کوئی دوسری چیز، مثلاً میز، کرسی، بہت ہوا تو بیوی کو صوفہ سیٹ سمجھ لیا۔

اختر صاحب بیوی کو صوفہ سیٹ سمجھتے ہیں یا کرسی، میں کیا جانوں! خیریت ہے تو یہ کہ شکیلہ بھی مشہور افسانہ نگار ہیں۔ اب ان دونوں کے ایک دوسرے کے بارے میں کیا تاثرات ہوں گے۔ اللہ ہی جانے۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو صوفہ سیٹ سمجھتے ہوں۔

ان سے باتیں شروع ہوئیں، ادب پر، سیاست پر، مذہب پر، ہر موضوع پر سمندر کی سی روانی کی طرح بہے۔ یہ بہتے گئے۔ میں سنتا گیا۔ تقریر کا سلیقہ، لہجہ میں تازگی، میں نے بڑے بڑے مقرر دیکھے ہیں۔ باتوں سے موم کر لینے والے، مگر ان میں بھی یہ بہت کم نظر آئے ——— ادھر اگر ذہن ابوالکلام، ظفر علی خان، بہادر یار جنگ اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرف ؟ جاتا ہے۔

اختر صاحب کی مقررانہ خوبیوں کے ساتھ، جی چاہتا ہے کہ اپنی بھی ایک خوبی کی ——— اطلاع بہم پہنچا دوں۔ میری اس خوبی کی تشہیر میں، ان کی شرارت آمیز باتوں کا بھی تو حال کھلے گا۔

جن دنوں میں اختر صاحب کے "نرغے" میں تھا۔ ان دنوں پہلے تو یہ مجھے اپنے کالج لے گئے اور اپنے شاگردوں سے جا کر کہا ـ ـ "دیکھو بھئی۔ یہ ہیں وہ چیز، جس کے دیکھنے کی آپ کو بھی تمنا تھی۔"

اختر صاحب کے اس ریمارکس پر طالب علم مسکرائے۔ لڑکیاں ہنسیں۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ اختر صاحب میرا ٹکٹ لگانے والے ہیں تو میں کبھی ان کے ساتھ نہ جاتا۔ انھوں نے تو اتنا کہا تھا۔ ذرا کالج تک چلو۔ میں سمجھا گھمانے پھرانے لے جا رہے ہیں۔ مگر انھوں نے کلاس میں لے جا کر کھڑا کر دیا ——— یہ ہیں وہ!

ستم پر ستم یہ کہ اُسی دن چار بجے شام کہا: "چلو چلیں۔"

"کہاں؟"

"انجمن تماشائے ادب" نے آپ کے اعزاز میں دعوت کی ہے۔"

"نہیں جناب میں نہیں جاتا۔"

"صرف چائے کی دعوت ہے۔ وہاں کوئی مقالہ وغیرہ نہیں پڑھنا ہوگا۔ بفرضِ محال اگر کوئی سوال پوچھے تو جواب دے دینا۔"

"اس دعوت کو قبول کیجیے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی وعدہ کیا ہوا ہے اور شکیلہ نے بھی وعدہ کیا ہوا ہے۔"

جی چاہا کہ ابھی اپنا سوٹ کیس اٹھاؤں اور واپس چل دوں۔ اس لیے کہ میں ہنگاموں سے گھبراتا ہوں۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو "زیادہ" ہوتے ہیں۔

ناچار ساتھ ہو لیا۔ مگر اس عرصے میں کہ یہ کپڑے وپڑے بدلتے۔ میں نے دو چار سطریں لکھنے کی کوشش کی کہ اگر سر پہ پڑ ہی گئی تو کچھ کہہ بھی سکوں۔

قلم لے کے بیٹھا تو سب سے پہلے مجھے رشید احمد صدیقی کا وہ فقرہ یاد آیا۔ جو انھوں نے ایک جلسے میں کہا تھا ـــ "گھر سے جو کچھ یاد کرکے [illegible] تھا۔ وہ یہاں آکر بھول گیا ہوں۔"

اس کے بعد جو کچھ لکھا۔ وہ دیگر یادداشتوں کے ساتھ محفوظ رہا۔ اُسے نقل کیے دیتا ہوں۔

دوستو!

قبلہ اختر اورینوی صاحب جن کے بارے میں آپ کا خیال ہوگا کہ نہایت معقول آدمی ہیں، انھوں نے میرے ساتھ کسی قسم کی معقولیت کا ثبوت نہیں دیا۔ انھوں نے ابھی ابھی مجھے یہ خبر سُنا کر تُرلا دیا کہ تمھیں تماشائے ادب کے جلسے میں جانا ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑے اللہ کا۔ خدا کے لیے مجھے نہ لے جائیں۔ اس لیے کہ میں بھوتنیوں کی طرح پلا ہوں۔ دوسرے میری زندگی کاغذ اور قلم کی معیت میں گزری ہے۔ لہٰذا مجھ سے تماشا نہ بنا جائے گا۔ مگر یہ نہیں مانے اور یوں میرے جذبات کو گھسیٹ کے یہاں لے آئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ لکھنا پڑھنا اور چیز ہے اور اپنی چرب بیانی کے ذریعے دوسروں کے دلوں کو مسخر کرنا اور چیز، میں نرا پڑھا لکھا انسان، میری [illegible] شامت آئی ہے۔ مرنا بھی تھا تو یہ کیا ضروری تھا کہ گنگا کے کنارے آکر مرتا۔ ویسے تو گنگا کے کنارے آکر مرنا اچھا شگون ہے بشرطیکہ میں رامچندر کی اولاد میں سے ہوتا۔

میں نے اختر صاحب سے پوچھا کہ بھائی جان ذرا یہ تو بتا دیجیے کہ انجمن تماشائے ادب میں تماشے کے علاوہ کیا ہوگا تو انھوں نے فرمایا تھا۔ وہ لوگ آپ سے سوال پوچھیں گے۔ جواب دے دینا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی کو بھی جواب دینا، شرفا کے نزدیک کبھی بھی مستحسن نہیں رہا۔ اس لیے میں شرفا میں سے نہ ہوتے

ہوئے بھی کسی کو جواب دینا پسند نہیں کرتا۔

ویسے مجھے اختر صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ انہیں وہاں پاکستان میں اردو کے مستقبل پر بات چیت کرنی ہوگی۔ بظاہر یہ سوال معصوم سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کا جواب عرض کرنا آسان نہیں۔ اس لیے کہ ہم پاکستانیوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ اردو کے لیے بھی سوچنا چاہیے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اردو کی پوزیشن کچھ ایسی ہو گئی ہو کہ جیسے کوئی کنواری لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر سے بھاگ گئی ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کو نہ ہندوستان والے قبول کرتے ہیں اور نہ پاکستان والے۔ یوں تو ہماری سرکاری زبان اردو بھی ہے۔ مگر ہم جب تک ہم انگریزی کی درباریاں نہیں بھولیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مغربی پاکستان اس لیے آتا ہے کہ اردو سیکھ آئیں تو وہ انگریزی سیکھ کر واپس جاتا ہے۔ غرض اردو گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سہی، مگر ابھی پاکستان میں ایسے اللہ والے ہیں۔ جو اسے اپنی ہی ماں بہن سمجھتے ہیں۔

مجھے زیادہ وقت نہیں ملا کہ میں اس مرحلے سے نپٹنے کے لیے تیار ہو کر آ سکتا۔ یہ سراسر اختر صاحب کی شرارت اور آپ کی محبت ہے جو میں یہاں موجود ہوں۔ بھلا وہ بھی کیا آدمی ہوا جو رہیں اور یہیں نہ بول سکتا ہو۔

پہلے میرا ارادہ نہ تھا کہ اختر صاحب پر مضمون لکھوں گا۔ مگر ان کی چند ایک شرارتیں یاد آئیں تو سوچا —— یہی وقت ہے انتقام لینے کا۔

ویسے کہیں میں نے یہ بھی پڑھا ہوا ہے کہ جو شخص دوسروں کے عیوب کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے وہ اپنی جد و جہد میں دوسروں کے اتنے عیبوں کا کھوج نہیں پاتا جتنے کہ خود اپنے عیب عریاں کر دیتا ہے —— اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں اپنے ہی عیوب پر سے پردے سرکا رہا ہوں۔ ایک لحاظ سے یہ بات ہے بھی ٹھیک، اس لیے کہ اختر صاحب میرے لیے غیر نہیں۔ وہ رسوا ہوئے تو میں رسوا ہوا۔

مجبوراً میں پھر ان کے ابتدائی دنوں کی طرف لوٹتا ہوں۔ وہی محققانہ تقاضے پورے کرنے کے لیے۔ ممکن ہے آپ کو یہ گمان ہو کہ میں نے ان کا سن پیدائش بتاؤں گا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ وہ کہاں پیدا ہوئے۔ یہ سب کچھ بتانا میرا کام نہ تھا۔ ویسے اگر میں یہ بتا دوں تو کچھ حرج بھی نہیں۔ ان کو سن لیجیے کہ یہ ۱۴؍ اگست ۱۹۱۰ء میں بمقام کاکو ضلع گیا پیدا ہوئے جو ان کا نانہال ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہاں دو چار اور بھی کڑوے گھونٹ پی لیے جائیں۔ یوں ہم شخصی پہچان کے ساتھ کچھ تاریخ جغرافیے کے اسباق بھی پڑھ لیں گے۔ مثلاً یہ کہ کن کن استادوں سے متاثر ہوئے، کن کتابوں سے متاثر ہوئے۔ کن لوگوں سے متاثر ہوئے۔ کن دشمنوں سے متاثر ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

یہ باتیں بظاہر تھکا دینے والی ہیں۔ دلکشی بھی ان میں کچھ نہیں۔ مگر اختر صاحب کے بارے میں جاننے والے ممکن ہے یہی کچھ سننا چاہتے ہوں اور وہ باتیں جو میرے نزدیک اہم ہیں، سننا ہی نہ چاہتے ہوں۔ اس لیے احتیاطاً چار دوں اور دو ایسے بتا

اُنھوں نے ابتدائی تعلیم تو اپنی والدہ سے پائی۔ اُردو فارسی، انگریزی اور قرآن حکیم اپنے والد سید وزارت حسین صاحب سے
(پ)ڑھا۔ قرآن شریف باترجمہ اور تفسیر اور دوسری مذہبی کتابیں اپنے چچا سید ارادت حسین صاحب اور حکیم خلیل احمد صاحب
سے پڑھیں۔

اس کے علاوہ کچھ اور اُستادوں کے نام بھی بتلائے تھے۔ چند ایک نام لکھتا ہوں۔ مثلاً زلی سادھو خاں، چارلس ریڈ،
(چ)ودھری، حمید علی خاں، پروفیسر جے ایل۔ بی، فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر گیان چند۔ —— بقول ان کے، یہ سب ایسے مشفق
(ا)ستاد تھے کہ جنھوں نے انھیں مٹی سے سونا بنایا —— ویسے اتنا اندازہ تو میں نے بھی لگایا کہ انھوں نے اپنے اُستادوں کا
ذکر بڑے فخر اور بڑی رقت کے ساتھ کیا تھا۔

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ کن کن کتابوں سے متاثر ہوئے۔ کہنے لگے۔ قرآن حکیم، احمدیت اور حقیقی اسلام،
(جناب مرزا بشیر الدین محمود احمد) اسلام کا اقتصادی نظام اور نظامِ نو (جناب مرزا بشیر الدین محمود احمد) اینا کرینا (ٹالسٹائی)
سٹرم (ایلیا اہرن برگ) وومن اِن لو (لارنس) فار ہوم دی بیل ٹولز (ہیمنگوے) مومنٹ اِن پیکنگ (لن یوٹنگ) بانگِ درا
(با)لِ جبریل (اقبال) نگارستان، جمالستان (نیاز فتحپوری) المامون (شبلی) اقبال کی ساری فارسی کتابیں، مثنوی مولانا روم،
(جو)ش کی رومانی نظمیں، اختر شیرانی کی رومانی نظمیں۔

دیکھا آپ نے متاثر ہونے والی کتابوں میں پہلا نام تو انھوں نے قرآن حکیم کا لیا اور آخری —— جوش اور اختر شیرانی
کی رومانی نظموں کا —— لاریب اختر صاحب انہی دو جذبوں کے اندر بند ہیں اور ان جذبوں میں جو بُعد ہے وہ بھی ڈھکا چھپا
نہیں۔ ایک طرف خدا سے رشتہ ہے، دوسری طرف اس کے "خاص" بندوں سے انہی دو انتہائی جذبوں کی ٹھک اور کھٹک کے
سہارے یہ اپنی زندگی کو معطر کیے ہوئے ہیں۔

مگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ آپ کن لوگوں سے متاثر ہوئے تو یہ فرفر جواب دیتے ہیں، مرحومین میں حضرت محمد صلعم، حضرت
ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، مرزا غلام احمد، بودھ، کرشن، سعدی، اقبال، شیکسپیئر، بابر، محمد بن قاسم، مہارانہ پرتاپ
سنگھ، ٹیپو سلطان، میر قاسم، شاہ ولی اللہ، پنڈت جواہر لعل نہرو، محمد علی جناح!

زندوں میں —— مرزا بشیر الدین محمود احمد، امام جماعت احمدیہ، ونسٹن چرچل[3]، پروفیسر بکو پیٹے گو۔ اے۔
(ر)عنت محمود (ڈسٹر وسٹے) اور سارے احباب، شکیلہ اختر[2] اور ارُول۔

اور تو ساری باتیں ٹھیک ہوئیں۔ مگر دیکھیے یہ تو اپنی بیوی سے بھی متاثر نکلے۔ یہ کھٹک والی بات ہے جو ذرا کم ہی سننے
(م)یں آتی ہے۔ خواتین تو سارے زوجیت کے کہہ دیتی ہیں کہ میں اپنے شوہر سے متاثر ہوں —— مگر ان کی زن پرستی کا حال

---

[1] یہ میاں چند وہ ہیں جنھوں نے اُردو کی نثری داستانیں لکھ کر شہرت حاصل کی۔
[2] اصل میں شکیلہ اختر کی جسم مجموعی ہے۔ مگر اختر صاحب اسے ایک شخصیت ہی سمجھتے ہیں۔
[3] ان دنوں چرچل زندہ تھے۔

اب کُھلا ہوں گا ریگ چو صاحب!

میرا خیال ہے یہ موڑ ہیں ہیں۔ اس لیے ان سے الگ اختر ہی سے پوچھا جائے کہ آپ کن کن واقعات سے متاثر ہوئے اس سوال کے بعد ہم ان سے کچھ نہ پوچھیں گے۔ صرف اپنی کہیں گے۔ "ہاں تو جناب وہ واقعات بتائیں گے۔ جن سے آپ متاثر ہوئے!

سنو بھئی کیا مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میں متاثر ہوا ہوں۔ جنگ بدر، جنگ حنین، جنگ قادسیہ، جنگ یرموک، واقعہ کربلا، فتح سندھ، جنگ پانی پت، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، تقسیم ہند ۱۹۴۷ء، انقلاب فرانس، اپنی والدہ کی موت (جب اختر صاحب ۱۴ سال کے تھے) چچا کی موت، اپنے بھتیجے اعجاز کی وفات ——— اور اپنی شادی سے!

لیجیے صاحب ہم لوگ ان مجہول بھول بھلیاں سے نکل آئے جو محض ریاضی کے سوال تھے۔ اختر صاحب کا شکریہ جی چاہتا ہے کہ یہاں ایک کپ چائے پی جائے تاکہ حواس ٹھکانے رہیں۔

یہاں ایک دلچسپ قصہ سن لیجیے تاکہ ذہن کو ذرا سی آسودگی ملے ـــ عام طور پر ان کی زندگی بڑی دلچسپ گزری۔ ادیان کے جنگلات و دریا میں سیر و شکار، مرغابی سے لے کر شیر تک، ارول میں دریائے سون میں تیراکی، کم و بیش روزانہ پکنک، تصویریں بنانا اور دوستوں سے بے وقوف بنانا۔ شلاً ـــ

بزرگوں اور لڑکیوں نے ارول میں سازش کی کہ ایک کمرہ پر جنات کا سایہ ہے۔ پٹنہ سے اختر صاحب گئے تو انھیں بیوقوف بنانے کے لیے پوری فضا تیار تھی۔ رات آتے ہی کھلی چھت پر لمبے تڑنگے سفید پوش جن تشریف لائے اور غائب ہو گئے۔ لڑکیاں چیخیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ سبز الائچیوں کی بارش ہوئی۔ مٹھائیوں کی ڈلیاں برسیں، اختر صاحب متاثر ہوئے۔ مگر بظاہر دلیری کا اظہار کرتے رہے۔ سسرال اور سالیوں کے درمیان ہنسی اور بہادری کا مسئلہ جو درپیش تھا۔

پھر یہ ہوا کہ زعفرانی تحریر میں خط آنے لگے۔ ہر روز رات کو یہ سماں بندھ جاتا۔ رونگٹے کھڑے ہوتے رہے۔ لڑکیاں چیخا کرتی رہیں۔ بالآخر اختر نے اپنی مذہبیت سے فائدہ اٹھایا۔ اور ایک دن جنات کو عربی اور فارسی کے موٹے موٹے الفاظ میں ایک خطبہ دے ڈالا۔ اور نصیحت فرمائی کہ اہلِ اسلام کو مت ستاؤ۔

کچھ دنوں کے بعد لڑکیاں پھوٹ پڑیں۔ کھل کھل ہنسیں۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ محض ڈرامہ تھا۔ اختر خفیف ہوئے اور شرمندگی اور خفگی کے مارے کئی دنوں تک اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑے رہے۔ آخر سالیوں نے منا لیا۔ جنوں کا سایہ تھا۔ پریوں نے دُور کیا۔

بہ حیثیت علم و فضل اللہ تعالیٰ کی ان پہ خاص رحمت ہے۔ ہزاروں نے ان سے فیض اٹھایا ہو گا۔ مگر یہ ہیں کہ اپنے اس منصب سے مطمئن نہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز اور ہے۔ یہ تو درس و تدریس کے مشغلے ہی سے خوش نہیں۔ یہ تو یہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر ہو کے یورپ اور امریکہ جاتے اور تبلیغِ اسلام کرتے۔ یہ ہے ان کی وہ آرزو جو پوری نہ ہوئی۔ چونکہ درس و تدریس کی "دلدل"

اپنے ہوئے ہیں اس لیے کہ دیتے ہیں کہ نہیں نہیں۔ یہ منصب بھی میری آرزؤں کے مطابق ہے۔

ان تمام مشاغل کے علاوہ ان کی ایک نشاط اور بھی ہے وہ یہ کہ چپ چاپ بستر پر بیٹھے رہیں اور کوئی بھی انھیں پریشان نہ کرے — عموماً یہ "بیماری" ان لوگوں کو لاحق ہوتی ہے۔ جو اپنے من کی بات دوسروں سے نہ کہہ سکتے ہوں اور یوں وہ تنہائی میں خیالوں کی "مجلسیں منعقد" کرتے ہیں اور خود کلامی میں لطف پاتے ہیں۔

جہاں تک میں نے انھیں پڑھنے کی کوشش کی پتہ یہی چلا کہ یہ کسی طرح بھی مطمئن نہ ہوتے۔ اب جب کہ یہ اپنی یونیورسٹی میں اپنے شعبے کے ہیڈ ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اگر میں ڈاکٹر بنتا اور آزادانہ پریکٹس کرتا تو اچھا ہوتا۔ اگر یہ واقعی ڈاکٹر ہوتے تو یہ کہتے۔ میں ان آپریشن، یہ گلی سڑی بیماریوں کی تشخیص اپنے بس کا روگ نہیں۔

ایک وقت میں یہ کہتے تھے کہ مجموعی طور پر شیکپیئر سے اچھی نبھی ہے۔ یہ بڑی ایثار پسند اور وفا شعار ہیں۔ لیکن مزاج میں تیزی اور سخت قسم کی انفرادیت ہے جو ابھرتی ہے۔ بہ فرضِ محال ان کی شادی اگر شیکپیئر سے نہ ہوئی ہوتی تو اب تک یہ سنیاس لے چکے ہوتے۔

یہ اپنے معمولات میں بڑے باضابطہ ہیں۔ زندگی مقررہ سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے۔ بیماریوں نے اور بھی زیادہ با اصول بنا ڈالا۔ پروگرام میں ذرا بھی تبدیلی ہو جائے تو چڑچڑا جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی بے ضابطہ بھی ہو جاتے ہیں، مگر صرف احباب کے ساتھ! ورنہ دیدۂ ذوق، مہتاب و ہو بننے ہی کا ہے۔

طبیعت میں حد درجہ سنجیدگی اور باضابطگی کے ساتھ، خوش مزاجی اور ظرافت کی بھی چاشنی ہے۔ ہر وقت ابوالکلام بنے نہیں بیٹھے رہتے — "حلقۂ یاراں" کی ترجمان ہیں یہ!

گزشتہ صفحات میں اُن کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑی ہوگی۔ ممکن ہے کہ مذہبی خیالات اور رجحانات پر ابھی کچھ مزید کہنے کی ضرورت ہے۔

مگر ہم مذہب کے بارے میں اُن کے خیالات جاننا چاہیں گے تو اس سلسلے میں آپ کو بڑی بے باکی کے ساتھ کہیں گے۔ تمام مذاہب میں اسلام کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ مذہب سمجھتا ہوں۔ زندگی گزارنے اور آفاقی تنظیم انسانیت کے لیے مذہب کو ضروری سمجھتا ہوں۔ اخلاق کا وسیع اور پائیدار تصور، بغیر مذہب کے ناممکن ہے۔ معمولی سطح پر، بغیر مذہب کے بھی قیام ممکن ہے لیکن رفعت و لطافت اخلاق جس کو روحانیت کہا جاتا ہے۔ صرف خدا تعالیٰ کی ذات کے اسلامی تصور سے حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ غیر مذاہب کے لوگوں سے بھی رواداری اور تعصب نہیں برتتے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اسلام تعصب سے منع کرتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین اور لا اکراہ فی العقل ان کا عقیدہ ہے۔ رشتہ داروں اور احباب میں شیعہ، سُنّی، وہابی، حنفی، دہریہ، اشتراکی، اشتمالی، ہندو، عیسائی سبھی ہیں اور سبھوں سے اچھے تعلقات ہیں۔ عقیدتاً بھی دُوسرے مذاہب کے لوگوں کو اصل جہنم نہیں کہتے۔ نجات کا مسئلہ صرف خدا اور بندے کا معاملہ سمجھتے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے یہ اسلامی جمہوریت اور خلافت کے قائل ہیں۔ اسلامی اقتصادی نظام جس میں اشتراکیت کی خوبی اور

حصولِ دولت [illegible] میں موجود ہوں۔ اسلامی نظام میں بھی اخلاق کو ضروری سمجھتے ہیں۔ [illegible] ضروری سمجھتے ہیں۔ قومیت کے بارے میں اقبال کا یہ شعر گنگناتے رہتے ہیں۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

حکومتِ وقت کی اطاعت بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر تنقید اور حریتِ ضمیر کے ساتھ!

میں آپ کے صبر و تحمل کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے باغ و بہار قسم کے آدمی کے بارے میں میری ژولیدہ نگاری کو برداشت کیا مگر ابھی میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑے سے صبر سے اور کام لیں تاکہ ان کے ادبی نظریات اور پسند کے بارے میں بھی بات چیت ہو سکے۔ بہت آدمی کے بارے میں یہ جاننا شاید ضروری نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ مگر ایک ادیب کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے۔ اس سوال کی روشنی میں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اپنے آپ کو بھی اچھی خاصی اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن کبر نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تنقید صحیح کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی تخلیقات کو بھی کم قیمت نہ سمجھا جائے اور یہ بھی کہ جس نے خود کو پہچانا اور اپنی حقیقت کو پہچانا اُسے بڑے سے بڑا بھی نہیں کر سکتا۔

ٹٹولنے پر معلوم ہوا کہ ان کے پسندیدہ ادیبوں میں ایلیٹ، ریلکے، کیفکا، اسٹین بک، خلیل جبران، ملٹن، منفلوطی، ٹیگور، نظیر اکبرآبادی، انیس، غالب، اقبال، شاد عظیم آبادی، راسخ عظیم آبادی، مرزا رسوا، پریم چند، محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، منٹو اور اختر شیرانی ——— اور ——— جوش ملیح آبادی، نیاز فتحپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، روش صدیقی اور احمد ندیم قاسمی ہیں۔

یہ ساری یادداشتیں وہ ہیں جو میں ان سے جھپٹ لایا تھا۔ انھیں منضبط کر کے لکھنے کے لیے مسلسل ملاقاتوں کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد جو کچھ لکھا جاتا وہ زیادہ کارآمد ہوتا۔ مگر میں کیا کروں۔ اختر اورینوی نمبر میری مزید ملاقاتوں کے لیے رک نہیں سکتا۔ اس نمبر میں میری شرکت ضروری تھی۔ خواہ ضرورت وہی کچھ ہو جو یوسف کی خریداری کے سلسلے میں مصر کی اُس بڑھیا کو پیش آئی تھی۔

یہ مضمون پٹنہ کے ایک رسالے کے لیے لکھا تھا۔ جو ان کی اجازت سے یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

۵۵۵

مہندر ناتھ

کھڑکی میں بیٹھے ہوئے نرملا نے گزرے ہوئے برسوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ پندرہ سال پہلے اُس کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی اور وہ لاہوری دروازے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اُس کا باپ بچپن میں مر چکا تھا۔ صرف ماں زندہ تھی۔ ماں نے اُسے کیسے پالا پوسا تھا؟ اُس کے متعلق اُسے کوئی خاص علم نہ تھا اور نرملا نے یہ جاننے کی کوئی خاص کوشش بھی نہ کی۔ پانچویں جماعت تک ماں نے نرملا کو پڑھایا تھا۔ اُس کے بعد وہ ناچ سیکھنے لگی تھی۔ چند برسوں میں وہ نرت سے اچھی خاصی واقف ہو گئی۔ جب کبھی وہ کوئی فلمی گانا سُن لیتی تو خود بخود اُس کے پاؤں ناچ کی دُھن پر تھرکنے لگتے۔ نہ جانے اُسے ناچ سے اتنا عشق کیوں ہو گیا تھا۔ گھر میں کوئی نہ ناچتا تھا۔ نہ باپ کو اِس قسم کے آرٹ سے شغف تھا اور نہ ہی ماں کو۔ اور وہ دور دراز سے جو رشتے دار ملنے آتے اُنھیں تو اس پیشے یا آرٹ سے سخت نفرت تھی۔ صرف اُس کی ماں ہی تھی جس نے اُسے ناچنے کے فن میں دلچسپی لینے کی ترغیب دی۔ یُوں نرملا کا قد خاصہ لمبا تھا۔ سرو قد کہنے میں کوئی مُبالغہ نہ ہوگا۔

لمبی لمبی مخروطی اُنگلیاں مضبوط اور توانا بانہیں۔ چہرے کا رنگ گندمی نہ تھا بلکہ گندمی رنگ سے زیادہ صاف اور شفاف۔ ماتھا چھوٹا۔ بال گہرے سیاہ، آنکھیں موٹی موٹی، چہرہ لمبوترا اور پاؤں بے حد حسین تھے۔ اگر کوئی آدمی پہلے نرملا کے پاؤں دیکھ لیتا تو شاید اُس کے چہرے کی طرف نگاہ نہ ڈالتا۔ یُوں تو اچھی خاصی ڈیل ڈول کی تھی، جسم کی ہڈیاں اُبھری تھیں۔ وہ نازک اندام سی لڑکی نہ تھی کہ چھوئی موئی کی طرح بل کھا کر سمٹ ہی جاتی۔ جب سامنے کھڑی ہو جاتی تو ایک باوقار سی لڑکی لگتی۔ کبھی کبھار تو یُوں احساس ہوتا کہ کسی جاٹ کی لڑکی ہے، جس کے باپ نے کھیتوں میں ہل چلایا ہوگا۔ جبھی تو جسم سے ایک توانائی اور مضبوطی کا احساس ہوتا تھا جو بہت کم لڑکیوں کے جسموں سے جھلکتا ہے۔

نرملا کا مستقبل اتنا روشن نہ تھا۔ ماں کی عمر اُس وقت سینتالیس برس سے اُوپر ہی تھی اور اُس کا سرمایۂ حیات صرف نرملا تھی۔ مگر نرملا کی پرورش متوسط طبقے میں نہ ہوتی تو نرملا کب کی بازارِ حسن کی نذر ہو جاتی۔ نرملا کی ماں نے اچھے دن دیکھے تھے۔ [illegible] کھیتوں کا گیہوں اُس کی رگوں میں جوش مارتا تھا اور اُس نے اپنی جوانی میں نہر کے ٹھنڈے پانی میں ڈبکی لگائی تھی اور آم کے درختوں کے تلے بیٹھ کر شیریں آم چوسے تھے۔ نرملا کی ماں آسانی سے اُس راہ کی طرف راغب نہ ہو سکی اور نہ ہی نرملا کو اُس راہ پر چلا سکی۔

جب لڑکی حسین ہو، جوان ہو، ماں بوڑھی ہو اور گھر کے اندر گھنگرو چھنکتے ہوں تو خود بخود راہ گیر دل اور

وہ پہلے نوجوانوں کی نگاہیں اس گھر کی طرف اٹھیں گی۔ نوجوان آتے جاتے کسی نہ کسی بہانے چند لمحوں کو [illegible] اور
ب کبھی اس کے قد و قامت کو دیکھتے تو رکتے ——— یار اگر اس نے ایک چانٹا مار دیا تو میرے عشق کا بھوت اتر جائے
اس لیے اس گھر میں قدم رکھنے کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بے حد چالاک اور سمجھدار ہو۔ جو بات یوں کرے
معلوم ہو کہ محض دوستی اور ہمدردی کا غلاف اوڑھ کر اس نے ادھر رخ کیا ہے۔ اس کے ذہن پہ ریشمی زلفوں کا کوئی سایہ
نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا بڑا ما حسینہ کے پائل کی جھنکار اس کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔ وہ ہوش و حواس کھو کر
دیوانے کا رخ نہ کرے تو بات بن سکتی ہے۔

سیٹھ جواد علی اسی محلے میں رہتا تھا جس نے اینٹوں کے بزنس میں کافی روپیہ کمایا تھا۔ ابھی تیس پینتیس برس کی عمر تھی۔
صرف ایک شادی کی تھی۔ تین اور شادیاں کرنے کا ارادہ تھا۔ بے حد باتونی، رنگت کالی مگر دل کا بڑا شیکنی کلر تھا۔ خوبصورت
شکل دیکھتا تو آن واحد میں فریفتہ ہو جاتا۔ سیمنٹ اور چونے کے بیوپار میں کسی کو فائدہ نہیں ہوتا۔ مکانوں میں چونا لگنے کے علاوہ
جس کا مکان تیار کرتا اسے بھی چونا لگا دیتا۔ گو تھا ان پڑھ مگر سوجھ بوجھ پڑھے لکھوں سے زیادہ تھی۔ کمبخت اگر ذرا بھی خوش شکل
ہوتا تو ڈاکٹر مارڈ کی طرح ایک حرم آباد کر لیتا۔

اس لیے جب کبھی نزلا اس کے قریب سے گزرتی تو اس کا دل ہچکیاں لینے لگتا۔ سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آ جاتی۔ وہ
جانتا تھا کہ یہ پھل اس کے لیے ممنوع تھی اور اس کی پہنچ سے باہر تھی۔ مگر انسان اس نامراد دل سے کیا کہے۔ نزلا کو دیکھ کر اس
کی رگوں میں خون کیوں جوش مارنے لگتا ہے۔ وہ لڑکی سے کیا کہے، کس سے کہے؟ ماں سے یا بیٹی سے؟ اپنے بدصورت چہرے
کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اور نزلا کی خوبصورتی کا اندازہ کرتے ہوئے یہی مناسب تھا کہ پہلے ماں سے راہ و رسم بڑھائی جائے۔
جمعہ کے دن وہ مٹھائی کا ایک خوبصورت ڈبہ لے کر نزلا کے گھر وارد ہوا۔ سلام دعا کے بعد اس نے اپنا تعارف کرایا اور
کہا ——— "ماں جی! میں آپ کے محلے میں رہتا ہوں۔ آج عید ہے۔ اس لیے سوچا اسی بہانے مل لوں۔" نزلا کی ماں نے
جواد علی کو دیکھا۔ جتنا ہی بدصورت آدمی تھا۔ لیکن ڈبہ خوبصورت لایا تھا۔ اس کی باتوں میں چاشنی اور لطافت تھی۔ بات بات میں
ماں جی، ماں جی کہتا رہتا۔ جیسے نزلا سے اسے دلچسپی نہیں۔ طرز تکلم میں خوشامدانہ پہلو زیادہ نمایاں تھا اور خوشامد سے تو خدا بھی
راضی ہو جاتا ہے۔ نزلا کی ماں تو محض ایک عورت تھی جو جواد علی کا نام سن چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جواد علی ایک امیر آدمی
ہے۔ اس لیے نزلا کی ماں نے خاموشی سے مٹھائی کا ڈبہ لے لیا۔ جواد علی نے ادھر ادھر دیکھا ضرور۔ مگر اسے نزلا نظر نہ
آئی۔ بس دل ہی دل میں اس کافر ادا حسینہ کے حسن کی داد دے کر اور ماں جی کو آداب کہہ کر باہر چلا آیا۔

نزلا گھر پہنچی تو ماں نے جواد علی کا ذکر کیا اور ساتھ ہی مٹھائی کا ڈبہ دکھایا۔

نزلا نے جواد علی کا نام سن رکھا تھا مگر اس کی شکل و صورت نہ دیکھی تھی۔

"ماں کیسی صورت ہے اس کی؟"

"بس بیٹی نہ پوچھو بیلا۔ دیکھ کے بس تھے تھے۔ کالا کلوٹا۔ مگر باتیں شہد کی طرح میٹھی اور رسیلی کرتا ہے۔"

"ماں! ایسے انسانوں کے پاس لکشمی کیسے آتی ہے؟"
"شاید لکشمی بھی رنگ رُوپ نہیں دیکھتی۔ اُنہی کے پاس زیادہ آتی ہے جن کے پاس پہلے ہی لکشمی ہوتی ہے۔"
"کیا لینے آیا تھا؟"
"بس یہ ڈبّہ دیا اور چلا بنا ـــــ" ماں یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

ادھر جواد علی نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ چکّر چلایا جا سکتا ہے۔ ماں اتنی تنگ نظر نہ تھی کہ وہ اُس محدُود سے دائرے میں سما نہ سکتا۔ نرملا کی ماں کو اُس کا آنا بُرا لگتا تو وہ مٹھائی کا ڈبّہ واپس کرتی۔ اگر ماں نے اُس کے آنے جانے پر کوئی روک تھام نہ لگائی تو بیٹی کو رام کرنا مُشکل نہیں۔ جواد علی نے نرملا کے گھر آنا جانا شرُوع کیا۔ اکثر ماں سے مُلاقات ہوتی۔ جب کبھی جواد علی آتا کوئی نہ کوئی چیز ساتھ لاتا۔

بڑے ادب اور سلیقے سے بیٹھتا۔ باتیں ماں سے کرتا اور نگاہیں نرملا کو ڈھونڈتیں۔

"بس ماں جی۔ تازہ خربوزوں کا ٹوکرا کیا آیا کہ میں نے سوچا کہ پہلے ماں جی کے پاس چلوں۔ اُمید ہے اس غریب کا تحفہ قبول کریں گی۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو بیٹا۔ ارے تم اس علاقے کی ناک ہو۔"

"نہیں ماں جی۔ میں آپ کی جُوتیوں کی خاک ہُوں۔ بس آپ سے ملنے چلا آتا ہُوں۔ آپ کی نظرِ عنایت چاہیے ماں جی۔ دولت نے کس کا ساتھ دیا جو میرا ساتھ دے گی۔ بس مجھے تو صرف اللہ پر بھروسہ ہے۔ خُدا عزّت سے رزق دیتا رہے یہی میری دلی تمنّا ہے۔ اچھا ماں جی۔ مجھے اجازت دیجیے گا۔"

"بیٹا کچھ چائے پانی؟"

"پھر کسی دن ماں جی ـــ"

یہ کہہ کر جواد علی چلا جاتا۔ یہ عجیب و غریب سی بات تھی کہ جب کبھی جواد علی آتا نرملا گھر میں نہ ہوتی اور ماں کبھی نرملا سے جواد علی کے خلوص، ایثار، انسانی دوستی اور بھائی چارے کا ذکر کرتی۔

"بڑا خوش خلق اور ملنسار آدمی ہے نرملا۔"

"کم بخت کی صُورت بڑی بدصُورت ہے ماں۔"

"سیرت کا جواب نہیں۔"

"سیرت کس نے دیکھی ماں۔ ظاہری خول سے کیا پتہ چلتا ہے ماں کہ انسان کے اندر کیا ہے؟"

"اندر کی بات تو پرماتما ہی جانے بیٹی۔"

جواد علی نے ماں کو تحفے دے کر اُس پر جادُو سا کر دیا۔ سنجیدہ انداز میں باتیں کر کے اپنی شرافت کا سکّہ جمایا۔ جواد علی اب موقعے کی تاک میں تھا کہ وہ نرملا سے بات چیت کا سلسلہ شرُوع کرے۔ اور یہ دیکھے کہ اُس پری جمال لڑکی نے اُس کی شخصیت

یا اُٹھ دیا۔ اُسے جانے کے بعد [illegible] یہ محسوس تو کر لیا کہ اُن [illegible] سے باتیں کرنے
تو وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی جاتی اور جب تک وہ باتیں [illegible] جواد علی نے اس نفرت
محسوس کر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر شکل کی بات کی تو منہ کی کھانی پڑے گی۔ ایک شادی کے بعد دوسری شادی کیسے ممکن تھی۔ و
مسلمان تھا اور نرملا ہندو۔ وہ بدصورت تھا اور نرملا خوبصورت۔ وہ نرملا سے عمر میں بھی بڑا تھا۔

بس ایک بات میں وہ نرملا سے بہتر تھا کہ وہ امیر تھا۔ ماں اور بیٹی کی بڑی مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی اور جواد علی کو
ت کا احساس تھا۔ روپیہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ کھوٹے کو کھرا بنا سکتا ہے اور سچے کو جھوٹا۔ اس کے آگے بڑے بڑ
ے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہ تو محض دو عورتیں تھیں۔ اکیلی۔ بے سہارا۔ بے بس۔

پھر بھی سوچ سمجھ کر قدم رکھنا چاہیے۔ محض روپوں کی نمائش کر کے انسان نہیں خریدے جاتے۔ کچھ سلیقہ، کچھ طور طر
قت اور حالات کو دیکھ کر آگے بڑھنا چاہیے۔ پہلے نرملا کی ماں سے بات کی جائے۔ بڑھیا کے دل میں ڈوب کر اُس انمول
و سیپ سے باہر نکالا جائے۔ بس اسی اُمید پر جواد علی غوطہ زن ہوا اور جب غوطہ لگا کر اُبھرا تو ہاتھ میں نہ سیپ تھا
موتی۔ ایک فقیر کی طرح دونوں ہاتھ خالی تھے۔

ماں نے صاف کہہ دیا۔ "میں آپ کو اتنی گندی ذہنیت کا انسان نہ سمجھتی تھی۔ سوچ سمجھ کر تو بات کرتے۔ ہم
ہندو، آپ مسلمان۔ پھر آپ کی شادی ہو چکی ہے۔ عمر میں نرملا سے بڑے ہیں آپ۔ کسی طرح بھی یہ بات ٹھیک نظر نہیں آتی۔ و
ایسی بات منہ سے نہ نکالیے نہیں تو میں بہت بُری طرح پیش آؤں گی ——"

جواد علی اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ جواب سُن کر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ دل کی بستی پر کسی نے شب خون مارا تھا اور س
مال متاع لے کر چلا گیا۔ جواد علی کا شمار بے وقوف عاشقوں میں نہ ہوتا تھا کہ گریبان چاک کر کے کسی ویرانے کی طرف رُخ
—— وہ تو بیسویں صدی کا عاشق تھا۔ سیمنٹ اور چونے کا بیوپاری جس نے گھروں کو تعمیر کرنا سیکھا تھا اُجاڑنا ن
ناکامی کے بعد، اپنے آپ کو ختم کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ لیکن وہ ایک بات سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ نرملا کی تصویر اُس
داغ پر ایسی اُبھری کہ جواد علی نے اُسے مٹانے کی بہت کوشش کی مگر یہ تصویر ایسی اُبھری کہ پرانے نقوش مٹتے گئے اور
ایسی، مستانی شوخ رنگ کی تصویر قطب مینار کی طرح سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

پانچ برس اور گزر گئے۔ نرملا اور اُس کی ماں نے لاہور چھوڑ کر بمبئی کا رُخ کیا۔ بمبئی تو روشنیوں کا شہر تھا۔ چا
کے سکوں سے جگمگاتا ہوا شہر جہاں حسین لڑکیوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ جہاں روپیوں کی کمی نہیں اور حُسن کے پجاریو
بھرمار ہے۔ بس لڑکی حسین، خوبصورت اور پُرکشش ہونی چاہیے۔ لیکن غریب لڑکی ہی ہو تب بھی چلے گی اور شہر میں کا
گی۔ بھوکی نہیں مرے گی —— اور اگر ذرا گورے رنگ کی ہو، جسم گولائیوں اور اُبھاروں سے مرصع ہو، آواز میں کھنک اور جادو
اور زُلف ماتھے پر پریشان ہو، چال البیلی اور مستانی ہو، آنکھیں نیلی نیلی کسی گہری جھیل کے پانیوں کی طرح، اور جب سیاہ ز
فضا میں لہرائیں تو آسمان پر کالی گھٹا چھا جائے تو سمجھو الٰہ دین کا چراغ آپ کے پاس ہے اور اُس سے فائدہ نہ اُٹھا

بات ہے۔

نرملا نے اس شہر میں وارد ہوتے ہی طوفان مچا دیا۔ فلمی جوہریوں نے اُس موتی کو پرکھ کر ناچنے والی کا رول دیا۔ نرملا کے پاؤں ایسے تھرکے کہ ہر قدم پر نعرۂ تحسین بلند ہونے لگا۔ دو برس میں نرملا ایک جھونپڑے سے نکل کر ایک اچھے خاصے فلیٹ میں وارد ہو گئی۔ اُس کے بعد نرملا کے پرستاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ حسن کے پجاریوں نے آگے بڑھ کر نرملا کا ہاتھ تھامنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ماں نے سوچا ابھی تو کشتی کی ابتدا ہوئی ہے۔ اِن حالات میں نرملا کا کسی ایک عاشق کے ساتھ وابستہ ہو جانا ایک بہت بڑی غلطی ہو گی اور نرملا بھی تو اپنی ماں کی بیٹی تھی۔ جذبات کی رو میں بہنا بیوقوفی ہے۔ "ابھی ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"، روپے کی بہتات نے عقل پر تالا لگا دیا۔ ایک نئے عاشق جانباز نے کہا ـــــ "سندری! اپنا کل جسم میرے لیے وقف کر دو اور میرے سوا کسی اور کو نہ دیکھو۔" یہ نیا عاشق ماتھے پر تلک لگاتا تھا اور ریشمی دھوتی پہنتا تھا۔ مرغ اور مچھلی بالکل نہ کھاتا مگر نو عمر لڑکیوں کے پیچھے ایسے بھاگتا جیسے گھوڑا ریس میں بھاگتا ہے۔ اور ہر حالت میں فرسٹ آنے کی کوشش کرتا۔ گو پنڈت ہرچرن عمر رسیدہ تھے۔ سر کے بال تقریباً سفید ہو چکے تھے، خضاب لگا کر عالمِ شباب کے مزے لینے کی کوشش کرتے۔ بڑھاپے میں جوانوں سے سبقت لینے کی کوشش کرتے۔ جب کسی لڑکی کو دل دے بیٹھتے تو پھر روپے پیسے کی پروا نہ کرتے۔ جس کو محبوبہ کہہ دیا اُس کی ہر امنگ کو پورا کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے۔ نرملا کو دیکھتے ہی کہنے لگے کہ تمہیں ہیروئن بنا دوں گا اگر تم باقی عاشقوں سے آنکھیں پھیر لو۔ نرملا اور اُس کی ماں مان گئی۔ حسن کے پجاری نے اپنی پوری پونجی ایک فلم بنانے میں لگا دی۔ ماں باپ، بیوی بچوں کی پروا نہ کی کہ کل اُن کا کیا ہو گا۔ اجی جہنم میں جائیں سب اپنی خواہش کے آگے۔ باقی سب باتیں بے کار تھیں۔ اس دنیا میں انسان بار بار تھوڑے ہی آتا ہے۔ "پریم کی گنگا بہانے چلو" ـــــ فلم بنی اور لگی، فیل ہو گئی۔ نرملا نے جس نے ہیروئن بننے کے بعد بڑے بڑے خواب دیکھے تھے آن واحد میں اُن خوابوں کو چکنا چور ہوتے دیکھا۔ ہرچرن اپنا پورا اثاثہ یہ فلم بنانے میں گنا چکے تھے، دوستوں اور رشتے داروں نے لعنت ملامت کی۔ مگر اُن کا کردار نہ بدلا۔ کہیں سے روپئے ملتے تو سیدھے نرملا کے گھر کی طرف رُخ کرتے۔ نرملا اسے بوڑھے پجاری کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھتی اور ایک دو مسکراہٹیں اور ادائیں دکھا کر نکل جاتی۔ بے چارا بوڑھا پجاری ہائی بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ اُس کا فرادا اُس کی بے وفائیوں کی تاب نہ لا کر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

ان تین چار برس میں نرملا کی شکل اور شباب میں کچھ تبدیلیاں سی آ گئیں۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اُس کا اثر صورت اور جسم پر ضرور پڑتا ہے۔ وہ معصومیت اور پاکیزگی جو اُس کے چہرے سے عیاں تھی رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ حسن اور شباب کا نکھار بھی غائب ہو گیا۔ اور اُس کی جگہ چہرے پر ایک کرختگی سی آ گئی، جسم پر گوشت کی ایک تہہ کا اضافہ ہو گیا۔ اُس میں وہ رعنائی اور کشش نہ رہی۔ پھر بھی تیور وہی تھے۔ ابھی عمر ہی کیا تھی۔ بمبئی میں بیوقوفوں کی کمی نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ نرملا بھی موقعے کی تلاش میں تھی۔ کوئی ایسا حسن کا پجاری مل جائے جو دادِ حسن بھی دے اور پوری قیمت بھی۔ ادھر جو عاشق آتے وہ بالکل فقیر اور کمینے نکلے ـــ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے۔ پھر چھ آٹھ مہینے کھلا پلا کر آگے بڑھ جاتے اس لیے وہ تمام

آرزوئیں اور تمنائیں جو ابھی تک پروان نہ چڑھی تھیں، ابھی تک نگاہوں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔

انھیں دنوں جواد علی پھر آ دھمکا۔ یہ کمبخت کہاں سے آن ٹپکا۔ جواد علی کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا۔ جسم فربہ ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا دل لاہور میں نہ لگا اور اس نے ان کے چلے جانے کے بعد بمبئی کا رخ کیا۔ یہاں کی آب و ہوا اسے خوب راس آئی۔ وہی سیمنٹ اور چونے کا بیوپار۔ "ماں جی ایسا رنگ جما ہے کہ روپیہ کا انبار لگ گیا۔ آپ کی دعا سے دو اور شادیاں کر لی ہیں۔ یعنی اب کل تین عدد بیویاں ہیں اور مبلغ آٹھ عدد بچے۔ سب بیویوں کو الگ الگ مکان لے دیے ہیں۔ مزے سے کھاتا ہوں، کار میں سیر کرتا ہوں اور بنک بیلنس روز بروز بڑھ رہا ہے۔ آپ کی دعا سے پہلے بھی کسی بات کی کمی نہ تھی اور اب بھی نہیں۔" جواد علی نے کمرے میں نگاہ ڈال کر کہا ——— "نزہلا کہاں ہے ماں جی؟"

"ذرا طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر سے ملنے گئی ہے۔" نزہلا کی ماں نے جواب دیا۔

شاید نزہلا کی کمی تھی جسے جواد علی نے شدید طور پر محسوس کیا تھا۔ پھر جواد علی نے اٹھتے ہوئے کہا ——— "ماں جی کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہیے گا۔ بس اپنا بچہ سمجھ کر حکم دیجیے۔ اگر آپ کی فرمائش پوری نہ ہو تو لعنت ہے اپنی کمائی پر۔"

نزہلا کی ماں نے محسوس کیا کہ چند برسوں ہی میں سیٹھ جواد علی کافی ڈھیٹ اور منہ پھٹ ہو گیا تھا۔ روپے کی فراوانی نے اسے کافی بد اخلاق اور بے شرم بنا دیا۔ شاید یہ شہر ہی ایسا ہے۔ جو یہاں آتا ہے بڑی جلدی بے شرم اور بے غیرت ہو جاتا ہے ... وہ خود بھی تو ...... یہ سوچ کر چونکی۔

اتنے میں نزہلا آ گئی اور ماں نے سیٹھ جواد علی کا ذکر کیا۔

"ماں اس کا رنگ کیسا ہے؟"

"اس کا رنگ تو یہاں خوب چمکا ہے بیٹی! کار میں گھومتا ہے۔ نزہلا مردوں کی زحمت کون دیکھتا ہے ان کا بنک بیلنس دیکھا جاتا ہے۔"

"سچ کہتی ہو ماں، پھر بھی مجھے اس شخص سے نہ جانے اتنی نفرت کیوں ہے؟ ایک بار تم نے صاف جواب دے دیا تھا اب پھر ......"

"بیٹی وہ آتا ہے تو ہم سے کچھ لے کے نہیں جاتا۔" پھر ماں نے نزہلا کی طرف دیکھا۔ نزہلا کی نفرت کو دیکھ کر وہ خاموش سی ہو گئی۔ جواد علی کافی ضدی تھا۔ وہ کبھی کبھار چکر ضرور مارتا تا کہ ان کی مالی حالت کا پتہ چلتا رہے۔ ابھی تک مالی حالت اتنی بری نہ تھی کہ جواد علی اپنے دل کی بات کہہ سکتا۔ سب وہ دل کی بات اس وقت کہے گا جب اسے یقین ہو گا کہ معاملہ پٹ جائے گا۔ ہر بار شکست کا منہ دیکھنا بھی کہاں کی عقل مندی ہے۔

اس طرح پانچ سال اور گزر گئے۔ نزہلا کی اقتصادی حالت بجائے بہتر ہونے کے بگڑ گئی ہو گئی۔ عمر تو تک ایک لمبی تھی۔ زیادہ تر عاشق کنگال اور باتونی نکلے۔ جلیبیں بنانے کی سکیمیں کافی تھیں۔ روپیہ ندارد۔ سکیمیں الٹ کر اور پائے

پی کر چلے جاتے۔
نرملا اس بات کی متلاشی تھی کہ کوئی تو اس کا ہاتھ پکڑے اور عقل کا اندھا مل جائے تو مستقبل سنور جائے۔ اسی دوران میں نیوی کا ایک افسر بلا شرکت غیرے پی کر نرملا کے گھر پڑا رہتا۔ شراب، کھانے پینے کے اخراجات، باہر کی تفریح، سینما، کپڑے سبھی کے پیسے وہ دے دیتا مگر ان روپیوں سے زندگی تو نہیں بنتی۔ جب نرملا نے تنگ آکر شادی کے لیے کہا تو نیوی کا افسر اگلے دن روانہ ہو گیا اور پھر نرملا سے ملنے نہ آیا۔
کچھ اسی قسم کے چکروں میں نرملا نے اپنا حسن و شباب کھو دیا۔ حسن کو بڑی فراخدلی سے لٹایا جس چیز کی لوگ قیمت ادا کرتے ہیں اسے سنبھال کر نہ رکھا۔ وہ محرابوں اور قوسوں کا تاج محل ایک کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا۔ اب بھولے بھٹکے مسافر آتے اور کھنڈر کو دیکھ کر کہتے عمارت ضرور عظیم ہوگی۔

یہ وہی لمحات تھے جب نرملا نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر سوچا کہ زندہ رہنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ اب تو سہارے کی ضرورت تھی۔ اسی دوران میں جواد علی پھر وارد ہوا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو بھانپ لیا کہ اب سب پنچھی اڑ گئے ہیں۔ شمعِ حسن بھی بجھی بجھی سی ہے۔ جس نخوت اور رعب داب سے نرملا بات کرتی تھی اس کی جگہ نرمی اور التجا نے لے لی۔ جواد علی نے اپنا رویہ نہ بدلا۔ وہی خوشامدانہ اندازِ گفتگو رہا۔ دلِ بے تاب کی دھڑکنوں کو اپنے تک محدود رکھا۔ یہ پاپا عاشق بڑا ہی ضدی اور خود سر تھا۔ ظاہری نرمی تلے ——— استقامت، مضبوطی اور توانائی کی تہ تھی۔ وہ دل کی بات کہہ کر دوبارہ رسوا نہ ہونا چاہتا تھا۔ بس ماں جی سے کہتا ——— "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے۔ اللہ کی مہربانی سے میرا کاروبار خوب چمکا ہے۔ اگر میں آپ کے کام آسکوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ چلیے نا ذرا آپ کو باہر گھما دوں۔"
اس دن نرملا اور اس کی ماں کار میں بیٹھ کر باہر چلی گئیں۔ واپسی پر جواد علی نے نرملا کو کچھ چیزیں خرید دیں اور جب نرملا گھر میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں جواد علی کی خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔ یہ جواد علی کی پہلی فتح تھی۔
اب ہر دوسرے تیسرے دن جواد علی اپنی کار لے کر آجاتا۔ نرملا کی ماں جو فرمائش کرتی جواد علی پوری کرتا۔ نرملا دل ہی دل میں کڑھتی، لڑتی۔ پھر ماں کے کہنے پر سیٹھ جواد علی کے ساتھ سینما دیکھنے چلی جاتی۔ دونوں جوہو پر سیر کرنے نکل جاتے۔ میرین ڈرائیو پر کار فراٹے بھرتی ہوئی نکل جاتی۔ نہ جانے اس تمام عرصے میں نرملا میں یہ اچانک تبدیلی کیسے آگئی کہ اسے جواد علی اچھا لگنے لگا۔ جس کالے رنگ کو دیکھ کر وہ منہ پھیر لیتی تھی وہی کالا رنگ اسے بھا رہا تھا۔ کیا یہ روپیوں کا جادو تھا یا جواد علی کے خوشامدانہ طرزِ گفتگو کا اثر یا آنے والی زندگی سے بچنے کے لیے اس نے یہ راہ اختیار کی تھی — اب زندگی کو سنوارنا ہے تو سنوار لو۔ ادھر جواد علی پر یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ رات کی رانی راہ راست پر آرہی ہے۔ جواد علی نے دل کھول کر روپیہ صرف کیا اور ساتھ ساتھ نرملا کو اس کے مستقبل کے متعلق اشارے کرتا رہا۔ "موقع ہے، اپنی زندگی

بنا [illegible] ہوں۔ جنم جنم کا ساتھی۔ وعدہ ہے تمھیں پہلی بار دیکھا تھا تو اُس وقت مرنے کے [illegible] کی تمنا تھی مذاق [illegible] تمھیں پانے کے جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں وہ مجنوں نہیں کہ گریبان چاک کر [illegible] جنگل جنگل گھوموں [illegible] ہے۔ اور جب تک زندہ رہوں گا تمھیں پانے کے لیے میرا دل تڑپتا رہے گا۔ [illegible]
محبت ——— کے [illegible] دن رات محنت کرتا ہوں۔ اپنی تین بیویوں کو پالتا ہوں۔ اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہوں۔ دوستوں کی مدد کرتا ہوں۔ غریبوں میں روپئے تقسیم کرتا ہوں۔ کافی بزنس بڑھا لیا ہے۔ تم میری چوتھی بیوی ہو گی اور میری آخری بیوی کا ——— بدصورت ضرور ہوں مگر دل کا بڑا خوبصورت اور قسمت کا دھنی ہوں۔ نرملا مجھ سے شادی کرو۔ زندگی بڑے مزے سے کٹے گی۔ تمہارے بھلے کے لیے کہتا ہوں۔ اب زیادہ نہ تڑپاؤ۔ ہاں کردو تو سب سے پہلے نیا فلیٹ خرید کر دوں گا۔ نئے فرنیچر سے ایسا سجا دوں گا کہ بمبئی کی تمام عورتیں عش عش کر اُٹھیں۔ اِن دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ سے باہر نکلو اور ایک خوشگوار اور باوقار زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اور نرملا جو آج سے دس سال پہلے سیٹھ کی صورت دیکھنا پسند نہ کرتی تھی آج اُس کی باتیں بڑے غور سے سُن رہی تھی۔ سوچ رہی تھی وہ کیا جواب دے۔ آج سے دس سال پہلے اس کے خون کا ایک قطرہ بھی اس شخص سے ہمکلام ہونے کے لیے تیار نہ تھا مگر آج قسمت اُلٹا فیصلہ کر رہی تھی۔ ہاں وہ بازی ہار گئی تھی۔ گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی تھی کیوں کہ جواد علی کے اُن تمام فقروں کو سُن کر دل نے ملامت نہ کی۔ ذہن نے بغاوت نہ کی۔ بس یہی کچھ کچھ ہو رہا تھا۔ شاید درست ہو رہا تھا۔ اس عرصے میں نرملا نے جو فرمائش سیٹھ سے کی جواد علی نے اُسے پورا کیا اور یہ مانگیں اس طرح پوری کیں کہ سیٹھ کی گرفت نرملا پر مضبوط ہوتی گئی۔ وہ سنہرے سپنے جن کی چھاؤں میں اُسے نیند آنے لگی تھی، وہ سپنے اب ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ وہ سب کچھ کرے گی۔ وہ اپنا نام تک بدل دے گی۔ مذہب میں کیا رکھا ہے۔ نام بدلنے سے کیا ہوتا ہے، وہ مندر کب جاتی ہے کہ اب مسجد میں جانے گی۔ ہاں ایک بہتر زندگی گزارنے کے لیے وہ ہر روایت کو توڑے گی اور جو کچھ سیٹھ کہے گا کرے گی۔ وہ بھوکی مرنا نہیں چاہتی۔ وہ ان دو کمروں میں رہنا نہیں چاہتی۔ وہ یوں ٹراموں اور بسوں میں گھومنا نہیں چاہتی۔ اب تو کار کا چسکا بھی پڑ گیا تھا پھر ایک دن وہ چپکے سے مہرالنسا بن گئی اور سیٹھ کے نئے فلیٹ میں وارد ہوئی۔ سیٹھ نے واقعی اُس مکان پر اچھی خاصی رقم خرچ کی تھی۔ بہترین فرنیچر سے فلیٹ کو سجایا تھا۔ اب سیٹھ جواد علی مہرالنسا کے ساتھ رہنے لگا۔ تقریباً چھ ماہ تو خوب گزرے اُس کے بعد لڑائی ہو گئی۔ مہرالنسا نے سوچا تھا کہ اُس نے اتنی بڑی قربانی کر کے سیٹھ کو جیت لیا ہے لیکن مسلسل لڑائیوں سے یہ بات مہرالنسا پر عیاں ہو گئی کہ سیٹھ بھی مجبور و لاچار ہے۔ کمبخت کسی بیوی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے دل میں ہر بیوی کی جگہ ہے۔ وہ آٹھ دن میں دو راتیں اُس کے ہاں گزارتا اور باقی چھ راتیں دُوسری بیویوں کے پاس۔ مہرالنسا نے ہر حربہ استعمال کر کے دیکھ لیا۔ رات رات جاگ کے دیکھ لیا۔ فاقے کر کے دیکھ لیا۔ گھر میں ہنگامہ کر کے دیکھ لیا مگر سیٹھ جواد علی کے رویّے اور سلوک میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ سیٹھ نے ایک دن صاف صاف کہہ دیا۔ "تو مجھے قید کرنا چاہتی ہے یہ کبھی نہ ہو گا۔ تمہاری ضد مجھے حیوان نہیں بنا سکتی۔" اب مہرالنسا کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ شخص ایک عورت کا ہو کے نہیں رہ سکتا۔ یہ شخص آوارہ

بدمعاش ہے۔ اس نے اپنے من کی خوشی کے لیے مجھ سے شادی کی تھی تاکہ اپنی برسوں پرانی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکے اور جب اُس خواہش کی تکمیل ہو گئی تو سیٹھ نے اصلی رُوپ دکھا دیا۔

اب وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس سے گلہ کرے؟ کس سے شکایت کرے؟ یہ کوئی میاں اور بیوی کی زندگی نہ تھی۔ محض آقا اور غلام کا رشتہ تھا۔ وہ دن بھر انتظار کرے؟ کیوں انتظار کرے؟ محض دو وقت کھانا کھانے کے لیے۔ لوگوں کو ایک جا بجا فلیٹ دکھانے کے لیے۔ اور سیٹھ جواد علی کا جہاں جی چاہتا ہے چلا جاتا ہے۔ کئی دن گھر سے غائب رہتا۔ کیا جانے اِس وقت کس بیوی کے پاس ہوگا۔ یہ سوچ کر اُس کا خون جوش مارنے لگتا اور وہ بڑبڑانے لگتی۔ اس بار تو سیٹھ پانچ دن کے وقفے کے بعد گھر آیا۔ بس پھر کیا تھا۔ مہرالنساء نے سیٹھ کو گریبان سے پکڑ لیا۔ سیٹھ نے جوابی حملہ کیا اور دو تین تھپڑ رسید کیے۔ وہ چیخی چلائی۔ اُس نے دو چار لاتیں جمادیں۔ اُس دن تو مار برداشت کر گئی اُس کے بعد تو تقریباً جب کبھی اُس نے کوئی شکایت کی جواد علی فوراً دو چار گندی گالیاں دیتا۔ اور ایک دو تھپڑ رسید کرتا اور ساتھ ہی کہتا ـــــ "عورت کے مزاج کو ٹھیک کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اُسے ہر روز پیٹا جائے۔" ہائے اِس جواد علی کو کیا ہو گیا۔ بیاہ سے پہلے اُس نے کبھی جھڑکا تک نہ تھا۔ چاپلوسی کرتے کرتے اُس کی زبان تھک جاتی تھی۔ اب تو ایک لفظ بھی سُننے کو تیار نہیں۔ اس شخص نے اُس کی جُوتیاں اُٹھائی تھیں! وہ کیا کرے! کہاں جائے؟ اس گھر میں رہی تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ یہ مار پیٹ، یہ گندی گالیاں، یہ وحشیانہ سلوک برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ شخص اپنے آپ کو سُدھار نہیں سکتا۔ اِن حالات میں وہ اس کے پاس نہیں رہ سکتی۔ دراصل ہم دونوں کا مزاج نہیں ملتا۔ دونوں کی سوچ سمجھ کی راہیں مختلف ہیں۔ یہاں رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اگر چند دن اور ٹھہر گئی تو پاگل ہو جائے گی اور پھر ایک دن فیصلہ کر کے وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی آئی کہ دوبارہ جواد علی کے گھر نہ جائے گی۔

وہ اپنی پرانی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی تھی ماہ و سال اُس کی نگاہوں کے سامنے گزرنے لگے۔ پرانی یادیں۔ جب وہ صرف پندرہ برس کی تھی تو جواد علی لاہور میں ملا تھا۔ پانچ سال گزرنے کے بعد وہ بمبئی چلی آئی۔ یہیں پر عاشقوں کا ایک قافلہ ملا۔ اسی طرح پانچ پانچ برس اور گزر گئے۔ سیٹھ جواد علی پھر آیا۔ اب حالات بدل چکے تھے۔ سیٹھ کے ساتھ شادی کی۔ شادی کے بعد نفرت، بیزاری اور علیحدگی۔ کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے ۵۵۵ کے ہندسے اُس کی نگاہوں کے سامنے ناچ رہے تھے کیونکہ اُس کی زندگی میں ہر پانچ برس کے بعد ایک اہم تبدیلی ہوتی رہی اور آج وہ اُس جگہ پر پہنچ گئی تھی جہاں سے اُس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

ڈاک گھر کی شہزادی

کشمیری لال ذاکر

اس کا گھر ڈاک گھر کے عین سامنے تھا۔

سڑک کی اس پار شاملات تھی۔ تیسرے کنوئیں کے مقابل پہلا مکان کیدار ہی کا تھا۔ اس کے پہلو میں دیال نمبردار کی حویلی تھی۔ دیال موضع دھن کوٹ کا نمبردار تھا۔ زمینیں تو اس کی گاؤں میں تھیں لیکن رہائش اُسے شہر کی پسند تھی۔ چنانچہ اس نے شہر میں چار آنے گز کے حساب سے کوئی سات سو مربع گز زمین خرید کر اس پر پکی اینٹوں کا مکان بنوایا تھا۔ اگرچہ اس کے فوت ہو جانے پر اس کے بیٹوں نے گاؤں کی ساری زمین بیچ ڈالی تھی اور اس طرح نمبرداری کی وراثت ختم کر ڈالی تھی لیکن وہ حویلی ابھی تک دیال نمبردار کی ہی حویلی کہلاتی تھی۔ حویلی کے برابر والا مکان شیو نارائن شرما انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کا تھا، جو محلے سے زیادہ ایک بڑا سا موٹر گیراج نظر آتا تھا۔ شرما اپنی کنڈل دار مونچھیں بڑے اہتمام سے سجاتا تھا۔ کیدار بٹوارے کے بعد جب یہاں آیا تو پہلا شخص جس سے اس کی ملاقات ہوئی وہ شیو نارائن شرما تھا۔ اس کی کنڈل دار مونچھوں کو دیکھ کر اُسے ایک لطیفہ یاد آیا تھا جو اس نے کالج کے زمانے میں کسی سے سنا تھا۔

پٹھانوں کی ایک ٹولی اپنے ڈھنگ نرالے ٹھاٹ بڑی شان سے قطار میں جا رہی تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ کسی نے پوچھا تمہارا لیڈر کون ہے؟

جواب ملا جس کی پشت پر ہاتھ رکھ دو وہی لیڈر ہے۔

لیکن شرما کی مونچھوں کے ڈنکوں میں زہر کی بجائے شہد تھا اور اسی شہد سے اس کا انشورنس کا کام کامیابی سے چل رہا تھا۔

دیال نمبردار کی وسیع لیکن قدرے بے وضع حویلی، شرما کا گیراج نما گھر، محلے کا پرانا شاملاتی کنواں جس کے ارد گرد پانی کی وجہ سے ہر وقت مچھروں کے غول منڈلاتے رہتے اور سامنے پرانا، اندھیرا اور سیلن سے اٹا ہوا ڈاک گھر۔ اس سارے ماحول میں کیدار کو بے حد اکتاہٹ محسوس ہوتی اور اس اکتاہٹ میں اضافہ کرنے والی نچلی منزل میں قیام پذیر مکان کی مالک سود خور بنیائن تھی جو شہر کے بھنگیوں کو روپیہ قرض دیا کرتی تھی۔ اس کے ہاں بھنگنوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا جو اپنے چاندی کے گہنے اس کے پاس رہن رکھنے آتی تھیں۔ وہ بنیائن شکل و صورت اور سود خوری سبھی لحاظ سے بھیانک تھی۔ کیدار اس کی کرخت، اونچی اور کھردری آواز سے بچنے کے لیے کمروں کے دروازے اکثر بند رکھتا تھا۔ اسے ہر ماہ کی تیس تاریخ کو ہی اگلے مہینے کا کرایہ دے دینا پڑتا تھا۔ اور صبح اُٹھتے ہی چھت پر چڑھ جاتا کہ اس بنیائن کی صورت نظر نہ آئے اور بازار میں گزرتے ہوئے کسی شخص یا کنوئیں پر پانی بھرنے والی کسی عورت کی شکل دیکھ کر ہی وہ دن کا آغاز کرے۔ کیدار ویسے تو وہمی طبیعت کا نہیں تھا لیکن صبح

کسی غلط قسم کے آدمی کا منہ دیکھنے سے ہمیشہ بچتا تھا۔ جب کبھی شودر خدیا ئن اس کے ماتھے لگتی اُس کا دن بُرا کٹتا تھا۔

صبح سویرے اُٹھ کر دیال نمبردار کی حویلی، شرما کے گھر، محلے کے کنویں اور پھر ڈاک گھر کی پرانی عمارت پر نظر ڈالنا کیدار کا معمول بن چکا تھا۔ یہ اس کے روزمرہ کے پروگرام کا ایک جزو تھا۔ ویسے تو ڈاک گھر کی ساری عمارت ہی اُسے کال کوٹھڑی سی نظر آتی تھی لیکن اُس کا سڑک کی طرف کھلتا ہُوا برآمدہ اسے اور بھی اکھرتا تھا۔ لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں والی کھڑکیوں کے پیچھے میزوں پر جھکے ہوئے پوسٹل کلرک اُسے اُن قیدیوں کی طرح نظر آتے جنہیں عمر بھر کی قید ملی ہو اور جنہیں دیکھنے کے لیے تماشائی برآمدے میں کھڑے ہوں اور اُن کا منہ چڑا رہے ہوں۔ اُسے ان کلرکوں پر بڑا ترس آتا اور ان تماشائیوں پر بے حد غصہ۔ کون ہے جو قیدی نہیں؟ وہ سوچتا۔ کون ہے جو آزاد ہے؟ کس نے کوئی جرم نہیں کیا؟ کس کے سر کسی کا خون نہیں؟ پھر کون کسی کو مجرم ٹھہرا سکتا ہے؟

اور اس کے ان سوالوں کا جواب اُسے چمپا نے دیا تھا جسے وہ دو سال سے دیکھتا آ رہا تھا۔

چمپا کا اصلی نام کیدار کو معلوم نہیں تھا۔ شاید چمپا بھی اُسے بھول گئی تھی۔ وہ کہاں سے اور کیسے یہاں آئی تھی، کون اُسے یہاں لایا تھا اور کیوں لایا تھا؟ ان سب باتوں کا کیدار کو علم نہیں تھا۔ اُسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک صبح جب وہ گھر سے باہر نکلا تو ایک جوان، خوبصورت، گورے رنگ کی عورت نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے ریشمی لیکن پرانے تھے۔ اس نے کسی اجنبی زبان میں کیدار سے بات کی اور اس کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ اُسے پنجابی، ہندی اور انگریزی کے علاوہ کوئی اور زبان نہ آتی تھی۔ وہ اُس کی بات تو نہ سمجھ سکا تھا لیکن اس کے حسن و شباب سے ضرور متاثر ہُوا تھا۔ وہ پل بھر کو رُکا۔ اس نے اس عورت کی بات سمجھنے کی کوشش کی، لیکن نہ سمجھ سکا اور جب وہ آگے سرکنے لگا تو اس عورت نے اس کا بازو پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں جوڑ کر ہونٹوں کے ساتھ لگاتے ہوئے کیدار کی طرف دیکھا۔ اب کیدار جان پایا کہ اُسے سگریٹ کی حاجت تھی۔ اس نے جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، ایک سگریٹ اُسے دیا، دوسرا اپنے ہونٹوں میں دبا لیا اور پھر پہلے اُس کا اور بعد میں اپنا سگریٹ جلا کر آگے بڑھنے لگا تو عورت نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ یہ اس قصبے میں اس اجنبی پاگل عورت کا پہلا قہقہہ تھا جو دیر تک کیدار کا تعاقب کرتا رہا۔ کیدار اس قصبے کا پہلا آدمی تھا جس کی شکل اس پاگل عورت نے دیکھی تھی۔ کیدار جب تھوڑی دیر گھوم کر واپس آیا تو وہ اجنبی عورت ڈاک گھر کے برآمدے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ وہ آنکھ بچا کر نکل گیا۔

کیدار نے اب صبح سویرے چھت پر چڑھنے کی بجائے تھوڑی دیر سیر کرنے کی عادت ڈال لی تھی۔ وہ جب گھر سے باہر نکلتا وہ اجنبی پاگل عورت سامنے کھڑی ہوتی، اُسے دیکھ کر مسکراتی۔ وہ اُسے ایک سگریٹ دیتا، اسے سلگاتا اور آگے بڑھ جاتا اور عورت کے قدرے بے ترتیب قہقہے اس کا پیچھا کرتے رہتے۔

بہت دنوں تک یہ معمول چلتا رہا۔ کیدار نے اب اُسے ایک پرانی رضائی اور پرانا تکیہ بھی دے دیا تھا اور جانے کس نے اور کیسے اُس کا نام چمپا رکھ دیا تھا۔ بازار میں آس پاس کے دکان دار اُسے چمپا کہہ کر پکارتے تھے اور اس سے چھیڑ خانی کرتے تھے۔ وہ ان کی زبان سے ناواقف ہونے کے کارن کچھ نہ سمجھتی تھی۔ اور جواب میں صرف مسکرا دیتی تھی اور وہ اسے سگریٹ، بیڑی، آنہ ٹکہ، ایک آدھ روٹی اور اس قسم کی چیزیں دیتے تھے جنہیں وہ مسکراتے ہوئے لے لیتی تھی۔ اس کے دانت چھوٹے چھوٹے اور ہموار تھے اور جب وہ مسکراتی تھی تو اچھے لگتے تھے۔ اس کے اعضا میں گٹھن اور جسم میں سڈول پن تھا۔ محسوس ہوتا تھا جیسے اُسے پاگل ہوئے بہت زیادہ عرصہ نہیں ہُوا تھا۔ وہ دن بھر بازار میں اِدھر اُدھر

کھوتی اور پڑی چپ رہتی اور اس کی رضائی اور تکیہ ڈاک گھر کے برآمدے میں ایک طرف پڑا رہتا۔ رات کو وہیں رضائی میں گھس کر سو جاتی اور صبح دن چڑھے سے پہلے اٹھ جاتی۔ پاگل پن کے باوجود وہ اس شخص کو نہیں بھولی تھی جس نے اسے اس اجنبی قصبے میں پہلے روز ہی سگریٹ دیا تھا۔ اسے اب بھی کیدار کا انتظار رہتا تھا اور جب ایک بار کیدار بیمار پڑ گیا اور کئی روز تک گھر سے باہر نہ نکلا تو چمپا کونے میں کھڑی ہر صبح اس کا انتظار کرتی رہتی اور بے حد اداس رہنے لگی۔ کسی نے اسے سگریٹ دیا تو بنا مسکرائے اسے لے لیا۔ گویا سگریٹ دینے والے کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس کی مسکراہٹ میں اس کی احسان مندی کی گواہی تھی۔

کیدار کے لئے چمپا اپنے ماحول کا ہی ایک جزو بن گئی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے یہ ماحول جس میں وہ بھی رہا تھا نامکمل تھا۔ نمبردار کی حویلی، شرما کا گھر، شاملاتی کنواں، یہ سب کسی کہانی کے حصے تھے لیکن کہانی ادھوری تھی اور جب دن سے چمپا آئی تھی یہ کہانی مکمل ہو گئی تھی۔ کہانی کو جیسے ایک جیتا جاگتا، سانس لیتا ہوا، حرکت کرتا ہوا عنوان مل گیا تھا۔

چمپا کو کہیں سے ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی اور بدوضع سا آئینہ مل گیا تھا اور وہ ہر صبح ڈاک گھر کے برآمدے میں بیٹھ کر بالوں میں کنگھی کرتی تھی اور ان میں گاڑھے سرخ رنگ کا ربن ڈالتی تھی۔ اس کا جسم کچھ اور بھر گیا تھا اور پہلے سے اچھا لگنے لگا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس میں ایک اور تبدیلی بھی آ گئی تھی۔ لوگوں کی چھیڑ خانی کے کارن اب وہ غصے میں آکر چلاتی تھی۔ کسی اجنبی زبان میں جسے کم سے کم اس قصبے کا ایک بھی آدمی نہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ ریشمی قمیص اور لہنگا جو اس نے پہن رکھا تھا اب کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس کے جسم کے انگ ان دریچوں سے باہر جھانکتے رہتے تھے۔

ایک رات کیدار نے چمپا کے زور زور سے بولنے کی آواز سنی، جیسے وہ کسی کو گالیاں دے رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر سڑک کی طرف دیکھا۔ پربھاتی چوکیدار ہاتھ میں لٹھ لیے کھڑا تھا۔

"کیوں تنگ کر رہے ہو بے چاری کو؟" کیدار نے کھڑکی سے باہر ذرا جھک کر چوکیدار سے کہا۔

چوکیدار چونکا

"یوں ہی ذرا مذاق کر رہا تھا، بابوجی۔" چوکیدار نے جواب دیا اور اپنا لٹھ زور سے سڑک پر ٹیک کر آگے چل دیا۔ اور پھر اس کی آواز گونجی۔ "ہوشیار، خبردار، جاگتے رہو!"

اس سے اگلی رات بھی چوکیدار نے چمپا کو گالیاں بکتے ہوئے سنا اور چوکیدار کو ڈاک گھر کے برآمدے کے سامنے کھڑا دیکھا۔ کیدار نے جب اسے پھٹکارا تو وہ سر جھکائے آگے بڑھ گیا لیکن بڑبڑاتا رہا۔ "سالا اس پاگل چھوکری کو بھی اپنی جائداد سمجھتا ہے۔"

اور کیدار اس کے لٹھ کی آواز اور اس کے "ہوشیار، خبردار جاگتے رہو" کی گونج سنتا رہا۔

کئی راتوں تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ کیدار جیسے واقعی بڑی دیانتداری سے اپنی جائداد کی حفاظت کر رہا تھا۔

لیکن پھر کبھی چمپا کے بکنے جھکنے کی آواز نہیں آئی۔ اس نے اب گالیاں دینا بند کر دیا تھا۔ اب اسے ایک دوسری قسم کی پرانی قمیص اور دوسرے ہی رنگ کا لہنگا مل گیا تھا، جس میں کہیں کوئی زخم نہ تھا، جن میں سے اس کے جسم کی چاندنی رستی تھی۔ اب وہ کیدار سے سگریٹ لینے کے لیے راستے میں کھڑی نہ ہوتی تھی، بلکہ ڈاک گھر کے برآمدے میں رضائی لپیٹے پڑی رہتی تھی اور کیدار اسے وہیں ڈاک گھر کے برآمدے میں

تی سگرٹ دیتا تھا اور جب کبھی تو وہ گہری نیند سوئی ہوتی تھی اور کیدار سگرٹ اس کے تکیے پر رکھ کر سیر کو نکل جاتا تھا۔

پھر ایک روز کیدار کو یہ جان کر بے حد صدمہ ہوا کہ چمپا پیٹ سے تھی اور حالات خاصی نازک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی غفلت کے کارن اس کی جائداد لُٹ گئی تھی۔ وہ دن اس کا بڑا تلخ گذرا۔ اُسے یقین تھا کہ اس گناہ کا مرتکب بازار کا چوکیدار ہو سکتا ہی تھا، لیکن اس کے پاس اس بات کا کیا ثبوت تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ چمپا کا کیا حشر ہوگا، کیدار پریشان ہوتا رہا اور آنے والے حالات کا انتظار کرتا رہا۔ بازار کے دکان دار چمپا کو چھیڑتے، اُسے ستاتے اور تنگ کرتے۔ وہ ان کے طعنے سن کر کراہیاں بھرتی اور وہ ہنستے اور قہقہے لگاتے۔ کیدار دیکھتا تو وہ انہیں ڈانٹ بھی دیتا۔ لیکن وہ ہر گھڑی وہاں تھوڑی موجود رہتا تھا۔ لوگ جب بھی موقع ملتا چمپا کو پریشان کرتے اور وہ بے چاری ایک اچھا خاصا مذاق بن کر رہ گئی۔ لیکن اس کے بالوں کی گھٹائیں اب بھی کالی تھیں، اس کے دانتوں کے موتی اب بھی چمکتے تھے اور اس کے حُسن کی جاذبیت اب بھی قائم تھی۔

آدھی رات کے قریب کیدار نے چمپا کی چیخوں کی آواز سنی۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ ڈاک گھر کی شہزادی برآمدے میں پڑی بُری طرح چیخ رہی تھی۔ کیدار سیڑھیاں اُتر کر فوراً اس کے پاس پہنچا، اُسے سگرٹ دیا لیکن اس نے سگرٹ نہیں لیا صرف اپنے پیٹ پر ہاتھ مارتی رہی۔ کیدار نے پاس کے بس سٹینڈ سے ایک رکشا والے کو جگایا۔ چمپا کو بڑی مشکل سے اس میں لادا اور اسے فوراً ہسپتال لے گیا۔ وہ تمام راستہ چیختی اور چلاتی رہی۔ ایمرجنسی وارڈ میں داخل کرا کر اس نے چمپا کو ڈاکٹر کے سپرد کیا اور خود ہسپتال کے وسیع احاطے میں مولسری کے درخت کے نیچے بیٹھا سگرٹ پھونکنے لگا۔ اس نے پیٹھ درخت کے تنے سے لگا دی اور سوچنے لگا کہ بچہ پیدا ہوا تو اسے سنبھالے گا کون؟ چمپا کو اتنا ہوش کہاں ہوگا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے۔ کتنا ظلم کیا تھا چوکیدار نے اس بے کس اور لاچار عورت پر، جسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ کوئی اسے کہاں لے جا رہا تھا۔ اس نے ایک حواس کھوئی عورت کے وشواس کا کس بُری طرح گلا گھونٹا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے چوکیدار کے پیچھے چلتی گئی اور اس نے اُسے پہاڑ کی آخری چوٹی سے ایک زور کا دھکا دے کر نیچے پھیلی ہوئی عمیق کھائی میں گرا دیا اور اب اس کی ہڈیاں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھیں اور اس کے جسم کا ایک ایک انگ کٹ گیا تھا۔ کیدار اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا اور سگرٹ پھونکتا رہا اور رات بے آواز قدموں سے گذرتی رہی اور چمپا ایک نئے انسان کی تخلیق میں مصروف بے شدھ پڑی کراہتی رہی۔ اور پھر پربھات کا ملگجا اُجالا مسکرایا اور اپریشن تھیٹر سے باہر نکلتی ہوئی نرس نے بتایا کہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا اور کیدار پھٹی پھٹی آنکھوں سے نرس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور اس کی انگلیوں میں تھمی سگرٹ سلگتی رہی۔ اور پھر وہ دھیرے دھیرے ہسپتال کے احاطے سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے دل و دماغ پر ایک درد بھرا بوجھ تھا اور اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پاگل اور بے سہارا اور مجبور عورت سے اس کا کوئی غیر واضح اور ان بوجھا رشتہ تھا۔ ایک ایسا تعلق جس کی وہ تشریح نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ایسا سمبندھ جس کی تفصیل نہ دی جا سکتی تھی۔ جس کی کوئی رُوپ ریکھا نہ بن سکتی تھی، لیکن جو ایک گہرے انسانی جذبے پر مبنی تھا۔ ایک ایسا جذبہ جو انسانوں کو بغیر مذہب و قوت اور عقل و ہوش کا امتیاز کئے ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے۔

چمپا جتنے روز ہسپتال میں رہی، کیدار صبح شام اُسے دیکھنے جاتا۔ جب تک اس کے جسم میں نقاہت اور پاؤں میں لغزش رہی وہ بستر پر پڑی رہی اور جب اس کے نڈھال جسم میں طاقت آ گئی تو وہ ایک شام ہسپتال سے بھاگ آئی اور ڈاک گھر کے ویران برآمدے میں پھر سے

اور جب وہ ہسپتال سے بحال ہو کر [illegible] نہیں اس کی

[illegible] وہ مسکراہٹیں اپنے آنچل میں چھپا لیتی ہو۔ وہ دن [illegible] اپنے بچے کو ساتھ

[illegible] بیٹھے سلاتے ہوں [illegible] ہی ہو۔ لوگ اسے مذاق کرتے چڑاتے، ستاتے اور وہ [illegible] کو اپنے جسم کے

ساتھ بھینچ لیتی کہ کوئی اسے چھین نہ لے اور پھر جاگ کر ڈاک گھر کے برآمدے میں آ جاتی اور اس کی آنکھیں اور [illegible] ڈھونڈنے لگتیں اور اس کے

ہاتھوں کی انگلیاں بھینچ جاتیں اور تکیہ اس کی چھاتی سے لگ جاتا۔

کیدار اب بھی اُسے سگریٹ دیتا۔ دوسرے تیسرے دن مٹی کے کٹورے میں دودھ ڈال دیتا اور کبھی کبھی اس کی جھولی میں پھل بھی ڈال دیتا۔ لیکن اب وہ مسکراتی نہیں تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہتی اور ایک لفظ تک نہ بولتی۔ جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو۔ جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔

اور دن گذرتے گئے۔

اور پھر ایک صبح کیدار نے دیکھا ایک نوجوان مرد اپنے جسم پر ایک پھٹا ہوا کمبل لپیٹے بیڑی پیتے ہوئے بازار میں سے گذرتے ہوئے آیا اور ڈاک گھر کے برآمدے میں دیوار کے ساتھ پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ کیدار نے جان لیا کہ ہوش مندوں کی بستی میں ایک اور دیوانہ وارد ہوا ہے ڈاک گھر کے برآمدے کی رونق بڑھ گئی تھی اور اس کی توجہ کا مرکز بننے کے لئے ایک اور کردار آ گیا تھا۔ اور چمپا، جسے وہ ڈاک گھر کی شہزادی کہا کرتا تھا، اپنے جنون کی وابستگیاں ساتھ لئے بجھتی جا رہی تھی۔

یہ نیا دیوانہ بڑا بے نیاز قسم کا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے کوئی چیز نہ مانگی، کبھی کسی دکان کے سامنے کھڑا نہ ہوا۔ کسی راہگیر سے بات نہ کی۔ بس اپنے حال میں مست۔ چل رہا ہے تو چلے ہی جا رہا ہے۔ بیٹھا ہے تو گھنٹوں دیوار کے ساتھ پیٹھ ٹیکے بیٹھا رہے گا۔ بیڑیاں پیا رہا ہے تو مسلسل پئے جا رہا ہے، جب تک کہ بنڈل کا بنڈل ختم نہیں ہو جاتا۔ شہر میں دیوانے تو اور بھی تھے، لیکن یہ تو دیوانوں کا بادشاہ تھا۔ بالکل ہی الگ اور انوکھا، جس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے چمپا کی طرف بھی دھیان نہ دیا۔ جیسے ڈاک گھر کے برآمدے پر سوائے اس کے کسی اور کا ادھیکار ہی نہ تھا۔ پر بھاتی چوکیدار نے اب اپنی ڈیوٹی بدلوا کر شہر کے دوسرے حصے میں لگوا لی تھی اور اب ایک اور چوکیدار آ گیا تھا، جو سوتا زیادہ تھا، پہرہ کم دیتا تھا۔

اور ایک دن کیدار نے صبح سویرے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو چمپا اپنے تکئے کو سینے سے چمٹائے سو رہی تھی اور دیوانہ دیوار کا سہارا لئے بیڑی پی رہا تھا اور سوئی پڑی چمپا کو ایک ٹک گھورے جا رہا تھا۔ چمپا کا گدرایا ہوا جسم اس کی پھٹی ہوئی قمیض سے یوں باہر جھانک رہا تھا، جیسے جھاڑ جھنکار میں چاند کی کرنوں کی اوٹ سے ابلتا ہوا چشمہ چمک رہا ہو۔ دیوانے کی نظریں یوں گڑی تھیں جیسے ان کیلیں گاڑ دی گئی ہوں۔ جانے کیوں کیدار کو یہ سب اچھا لگا۔ ایک ہوش کھویا انسان دوسرے ہوش کھوئے انسان میں دلچسپی لینے لگا تھا، اس سے ایک لگاؤ محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک سمبندھ کی روپ ریکھا بننے لگی تھی۔ ایک تعلق کی بنیاد پڑنے جا رہی تھی۔ کیدار کی زندگی کا یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے جنون کی ایک نئی گھٹنا تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے ڈاک گھر کا مٹی سے اٹا ہوا برآمدہ اس کے اندر جیسے کمرے اور میزوں پر میں کی طرح ثبت بنے کلرک سب زندگی میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ زندگی اپنی خوبصورتیاں، وابستگیاں اور لطافتیں لے کر آ گئی تھی اور انہیں جھولیاں بھر بھر کر لٹا رہی تھی۔ ہوش کھوئے ہوئے لوگ باہوش ہو رہے تھے اور باہوش انسان ہوش کی ان حدود

گذر رہے تھے جو ہیں زندگی کی خوبصورتیوں سے دُور رکھتی ہیں اور ان سیماؤں میں داخل ہو رہے تھے جہاں سے سپنوں کے سنگ بیل
ح بوتے ہیں اور امیدوں کی پگڈنڈیاں نکلتی ہیں اور آرزوؤں کے شگوفے پھوٹتے ہیں اور تمناؤں کی کلیاں چٹکتی ہیں اور کلپنا کی کہکشاں
مانگ میں موتی ٹانک کر اشارے کرتی ہے اور رات اپنے گیسو کھولے صبح کے دریچے سے جنتوں سے آتی ہوئی عطر بیز ہواؤں کا
ار کرتی ہے۔

اور پھر کیدار کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا۔
ڈاک گھر کے سامنے کھلتی ہوئی کھڑکی بند ہو گئی۔
اور سامنے کے مکان میں رہنے والی نبیا تن کی پاٹ دار آواز اور بھی اونچی ہوتی گئی۔

اور جب دس روز کے بعد کیدار واپس لوٹا تو اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی اسے چمپا کا خیال آ گیا۔ اور اس کے ساتھ اس
انے کا بھی جو ایک صبح چمپا کو بڑی لگن سے گھور رہا تھا۔ یوں تو گاڑی ٹھیک چار بجے پہنچتی تھی لیکن لیٹ ہونے کے کارن آج
چ بجے پہونچی تھی۔ کیدار قلی سے سامان اٹھوا کر رکشا میں بیٹھا اور رکشا والے کے پوچھنے پر کہ اسے کس جگہ جانا تھا۔
نے جواب دیا۔

"ڈاک گھر کے سامنے۔"

یہ الفاظ کہتے ہی اسے چمپا کا دھیان آیا اور اس کے بھرے بھرے جسم کا اور اس کی وحشی آنکھوں کا اور اس کے لمبے
ں کا اور اس کے تکیے کا جسے وہ ہر لمحہ سینے سے چمٹائے رکھتی تھی۔

رکشا کے پہیے گھوم رہے تھے اور کیدار نئے دیوانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جانے کیا کر رہا ہوگا۔ اس وقت وہ غالباً
رہا ہوگا۔ لیکن اب لوگ جاگ رہے تھے۔ سویرا ہونے والا تھا۔ نہیں وہ جاگ رہا ہوگا۔ اور بیڑی پی رہا ہوگا اور دیوار کے ساتھ
ٹیکے چمپا کے گھر رائے ہوئے انگوں کو گھور رہا ہوگا۔ جو اس کی پھٹی ہوئی قمیص کے دریچوں سے باہر جھانکتے رہتے تھے۔ کیدار نے
ٹ سے سگرٹ نکال کر سلگا لیا۔ وہ اصولاً صبح سویرے سگرٹ نہیں پیتا تھا۔ پہلا سگرٹ وہ اس سمے پیتا تھا جب چائے کی گرم
پیالی اس کے ہونٹوں کو چھوتی تھی۔ لیکن جب اس کا دماغ سوچ کی بھول بھلیوں میں ہوتا تو وقت کی کوئی تخصیص نہ رہتی۔ سگرٹ
ہی سلگ سکتا تھا۔ چاہے آدھی رات ہو یا بھور کا ملگجا اجالا، اور اب بھور کے ملگجے اجالے میں سگرٹ کا دھواں فضا میں
ل ہو رہا تھا اور رکشا کے پہیے تار کول کی سڑک پر گھوم رہے تھے۔
رکشا رک گئی تھی۔
ڈاک گھر آ گیا تھا۔

کیدار نے رکشا والے کو کرایہ دیا اور اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر گلی کی طرف مڑا۔ انشورنس کمپنی والے شرما کے کھانسنے کی آواز آ رہی
۔ وہ جاگ اٹھا تھا۔ کنویں کی جگت پر بھی دو ایک سائے حرکت کر رہے تھے۔ گلی کی بوڑھیں منہ اندھیرے پانی بھرنے آ گئی تھیں۔
ین بھلا انہیں دیر تک کہاں سونے دیتی تھیں۔ گلی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے سوچا وہ ڈاک گھر کے برآمدے کی طرف تو ایک نظر

ڈال کر وہ جانے لگا تو پھر اس نے برآمدے کے اس حصے کی طرف دیکھا [illegible]

کی دکھتا ہوا لالٹین کم ہمت شور مچا گیا تھا شاید [illegible]

سنبھالے برآمدے کی طرف بڑھا۔ اس سمت جہاں چھپا سویا کرتی تھی۔ اس نے دیکھا [illegible]

برآمدے کے اندر چھپا خرّاٹے سے سو رہی تھی [illegible]

چولہے میں بے خبر سویا پڑا تھا۔ کیدار کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

ڈاک گھر کی شہزادی ملکہ بن گئی تھی۔

کیدار گلی میں جانے کو مڑا۔ دو کتے کسی چیز کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے اپنے کھیل میں لگے تھے۔ اس نے دیکھا یہ تو تکیہ تھا جسے چھپا ہمیشہ اپنے ساتھ چپٹائے رکھتی تھی۔ کتے اسے جانے کب اٹھا لائے تھے اور اس کی روئی ادھر ادھر بکھیر رہے تھے اور چھپا کو آج جیسے اس کی فکر ہی نہ تھی۔ ایک غلیظ گھٹیا اور پرانا سا تکیہ ہی تو تھا آخر!

ایک ملکہ کا ایسی حقیر چیزوں سے کیا واسطہ!

وہ پل بھر کتوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر اپنے مکان کی طرف بڑھ گیا۔

ادبی روایت اور شخصی استعداد

مصنف: ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ترجمہ: سید افضال حسین نقوی

انگریزی ادب میں ہم شاذ و نادر ہی روایت کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ گو ہم کبھی کبھی اس نام کا استعمال ضرور کر لیتے ہیں تاکہ اس کی عدم حیثیت پر بحث کر سکیں۔ ہم کسی "خاص ادبی روایت" یا کسی "عام ادبی روایت" کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس لفظ کو صفت کی صورت میں کسی شاعر سے متصف کر کے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شاعر کا کلام "روایتی" ہے اور فلاں شاعر کا کلام "انتہائی روایتی"۔ بہرحال مشکل ہی سے یہ لفظ محلِ استعمال بن سکتا ہے تاوقتیکہ اسے تنبیہی روزمرہ کی صورت میں استعمال نہ کیا جائے، ورنہ دوسری کسی صورت میں اس کا استعمال مشکل ہی سے مستحسن قرار پا سکتا ہے کیونکہ یہ اپنے اثرات کے لحاظ سے جس کاوش کو بہتر گردانتا ہے وہ فنِ تعمیر کی نئی اور عمدہ تراش خراش سے متعلق ہوتی ہے۔ غرض آپ مشکل ہی سے اس لفظ کو انگریز سامعین سے مانوس کر سکیں گے تاوقتیکہ آپ کی واقعی منشا فنِ تعمیر کی طرف رجوع کرانا نہ ہو۔

یقیناً اس لفظ کا تنقیدی حیثیت سے کسی زندہ یا مردہ اہلِ قلم کے متعلق مستعمل ہونے کا بظاہر امکان نہیں کیونکہ ہر قوم اور ہر نسل کا نہ صرف اپنا تخلیقی دماغ ہوتا ہے بلکہ اس کا اپنا الگ ایک تنقیدی مذاق بھی ہوتا ہے اور یہ دماغ اپنی تخلیقی استعداد کے مقابل اپنی تنقیدی جبلت کی کوتاہیوں اور قیود سے بے خبر رہتا ہے۔ ہم فرانس کے ضخیم تنقیدی سرمایہ سے جس سے اس کی زبان پر ہے اس کے تنقیدی انداز اور جبلت کا پتہ پاتے ہیں اور ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہماری بے حسی مسلّم ہے اور فرانسیسی ہمارے مقابلے میں زیادہ "تنقیدی" مذاق رکھتے ہیں۔ حالانکہ کبھی کبھی ہم پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ فرانسیسی ہمارے مقابلے میں کم سریع العمل ہیں۔ ممکن ہے فرانسیسی ایسے ہی ہوں لیکن ہمیں اپنے آپ کو یہ ضرور یاد کرانا چاہیے کہ تنقید اتنی ہی ضروری اور بدیہی چیز ہے جتنا کہ کسی ذی روح کے لیے نفس کی آمد و شد۔ چنانچہ ہمیں کسی چیز کے پڑھتے وقت اس کے مطلب کے ادراک کرنے اور جذباتیت سے متاثر ہونے میں قباحت نہیں محسوس ہونی چاہیے کیونکہ ایسی صورت میں ہم اپنے قوائے ذہنی کو کسی تنقیدی کاوش پر مزید تنقید کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ اس اندازِ فکر کی روشنی میں جو حقائق ہمارے سامنے ظہور میں آتے ہیں ان میں ایک ہمارا کسی بات پر اڑ جانے کا رجحان ہے مثلاً ایسے موقع پر جبکہ ہم کسی شاعر کی تعریف و توصیف کرتے ہیں اور اس کی شاعری کا ایسا رخ اجاگر کرتے ہیں جس کی دوسرے شاعر کے ہاں مماثلت نہیں ملتی تو ہم یقیناً ایسے ہی رجحان کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ روئے سخن کسی شاعر یا قلم کار کے کسی خاص انداز یا رخ کی طرف ہوتا ہے تو ہم کوشش کرتے ہیں کہ معلوم کریں کہ اس میں اس کی انفرادیت کا کتنا دخل ہے اور بحیثیت انسان اس کا جوہر دانی کیا ہے۔ ہم اس بات

یہ ہے [illegible] کہ کسی شاعر کا اپنے عہد [illegible] ہم [illegible] ہے جس حد تک مختلف ہے۔ ہم [illegible] کوشش [illegible] [illegible] کہ ہم اس منفرد یا تعصب سے ہٹ کر [illegible] تحقیق [illegible] جاسکے بڑا شاعر بلکہ اُس کا انتخاب بھی مختلف اور منفرد ہے۔ منفرد کلام تخلیق کرنے کے [illegible] نہیں پا سکا [illegible] انھی منفرد مقامات پر بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔ میری اس گفتگو سے مراد کسی غیر پختہ پرکشش [illegible] نہیں بلکہ ایسی روایت سے ہے جو پُرانی چلی رکھتا ہو۔

تاہم اگر کوئی ادبی روایت صرف گزری ہوئی نسل کی کامیابیوں کی اندھی تقلید ہی کو اپنا شعار بنائے تو یقیناً ایسی روایت کو سختی سے کچل دینا چاہیے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ روایات کے ایسے دھارے ریگزارِ عصر میں ڈوبے اور گم ہو گئے چنانچہ میرے نزدیک تو از سرِ نو کہیں بہتر بدعت ہے۔ ادبی روایت ایک بڑی اہمیت کی چیز ہے۔ یہ وراثتاً حاصل نہیں ہوتی۔ البتہ اس کے حصول میں آپ کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ادبی روایت کے ضمن میں تاریخ کا تصور سب سے پہلے ابھرتا ہے جس سے رُو گردانی ہر اُس شخص کے لیے ناممکن ہے جسے پچیس سال کی مدت سے زیادہ بحیثیت شاعر اپنا وجود منوانا ہو۔ یہ تاریخی تصور ایک ایسی حس رکھتا ہے جو نہ صرف گزشتنی کیفیت بتاتی ہے بلکہ اُس کی موجودگی پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ یہ تاریخی تصور ایک آدمی کو نہ صرف اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ محض اپنے نسل کے متعلق لکھے جو اُس کی ہڈیوں میں رچی بسی ہے بلکہ اس احساس کے ساتھ لکھے کہ یورپ کا پورا ادب جو ہومر ([illegible]) سے شروع ہوتا ہے جس میں خود اُس کے اپنے ملک کا ادب ایک مساوی حیثیت رکھتا ہے، ایک باقاعدہ ضابطہ ہے۔ یہ تاریخی تصور منفی زمانہ بھی ہے اور وقتی بھی نیز یہ تصور ہر دو صورتوں کی یکجا اجتماعی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہی تصور ایک قلم کار کو روایتی بنا دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک اہلِ قلم کو اُس کے اپنے دور میں اپنا مقام متعین کرنے میں صاحبِ نظر اور ذکی الحس بناتا ہے۔

کسی شاعر یا کسی فنکار کی کوئی علیحدہ مکمل حیثیت اور معنی نہیں ہوتے۔ اُس کی اہمیت اور اچھائی در اصل اُس کے اپنے تعلقات کی پسندیدگی میں مضمر ہے جو اُسے اپنے مرحوم شاعروں اور فنکاروں سے ہوتی ہے۔ آپ اُسے اس کی واحد حیثیت سے قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ آپ کو اُس کی انفرادی حیثیت الگ کرنی پڑتی ہے تاکہ آپ اُس کا مقابلہ پچھلے لوگوں سے کر سکیں۔ اس سے میری مدعا تاریخی اصولِ تنقید ہی نہیں بلکہ جمالیاتی اصولِ تنقید بھی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی نئی کاوش کے جنم دینے میں جن دقتوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے بعینہٖ انھیں پریشانیوں سے پچھلی تصنیفوں اور کاوشوں کو بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ موجودہ ادبی نمونے بذاتِ خود ایک آئیڈیل ضابطہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں نئی کاوشوں سے رد و بدل کی جا سکتی ہے۔ موجودہ ضابطہ اسی وقت تک مکمل رہتا ہے جب تک کوئی نئی تصنیف وجود میں نہیں آتی کیونکہ کسی نئی اور اچھوتی چیز کی آمد پر پچھلا نظام اور قاعدہ برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قاعدے میں تبدیلی اور رد و بدل اور ایک دوسرے سے ادبی مناسبات میں ہم آہنگی ظہور میں آتی ہے۔ یہی وہ قربت ہے جو نئے اور پرانے نظام میں پائی جاتی ہے۔ جو شخص بھی اس نظام کے تصور

تو پسند کرتا ہے اور انگریزی اور یورپی ادب کو بھی اُسی طرز پر مستحسن قرار دیتا ہے وہ اس امر کو ضروری خیال کرتا ہے کہ ماضی کو حال سے بدل دیا جائے لیکن یہ تبدیلی اُسی حد تک ہونی چاہیے جس حد تک ماضی نے حال کو متاثر کیا ہے۔ جو شاعر اس حقیقت سے آشنا ہے وہ یقیناً بہت سے مصائب اور بہت سی ذمہ داریوں سے بھی کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہے۔

ایک مخصوص خیال کے مطابق اُس کی اس امر سے بھی آگاہی ضروری ہے کہ اُسے ماضی کے اصولوں پر جانچا اور پرکھا جانا چاہیے۔ میں نے اپنے مُدعا کے اظہار کے لیے جانچنے اور پرکھنے کا لفظ استعمال کیا ہے نہ کہ ایسا لفظ جس سے توڑ پھوڑ کے معنی استنباط کیے جا سکیں۔ تاہم اوّل تو یہ تنقید اتنی اچھی یا اتنی بُری نہیں ہونی چاہیے کہ ہم گزشتنی کیفیت کا شکار ہو کر رہ جائیں اور دوئم یہ تنقید حتمی طور سے پُرانے ہی نقادوں کے اصولوں پر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ فیصلہ بھی ہے اور تقابل بھی جس سے دو چیزوں کو پایا جا سکتا ہے۔ محض مُطابقت کے معنی نئی تصنیف کے لیے یہ ہوں گے کہ مطلق حق مطابقت ادا نہیں ہوا۔ اور یہ کاوش نئی ہرگز نہ متصور ہو گی اور ادب کا شہ پارہ نہ قرار پا سکے گی۔ ہم پوری طرح نہیں کہہ سکتے کہ نئی تصنیف فقط اس لیے بہتر ہے کہ حالات سے مُطابقت کرتی ہے اگر یہ مُطابقت اُس کی ماہیت کے لیے امتحان ضرور ہے۔ یہ امتحان حقیقتاً بتدریج اور سوچ سمجھ کر بروئے کار لانا چاہیے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی شخص مطابقت کے لیے ایسے حکم کی حیثیت نہیں رکھتا جس سے غلطی سرزد ہونے کا امکان نہ ہو یا جسے ہم معصوم کہہ سکیں۔ ہم کہنے کو تو کہہ سکتے ہیں کہ کوئی کاوش بظاہرہ (حالات سے) مطابقت کرتی ہے یا مُنفرد ہے یا بظاہرہ منفرد نظر آتی ہے اور اس کا امکان رکھتی ہے کہ مطابقت کرے لیکن ہم یہ مشکل حتمی طور سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کے متعلق ہم کچھ کہہ رہے ہیں وہ حقیقتاً وہی ہے کوئی اور دُوسری چیز نہیں۔

مزید ذہنی غواصی کے لیے اگر آگے بڑھا جائے تو اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا ہو گا کہ ایک شاعر کا اُس کے ماضی سے کیا تعلق۔ ہم دیکھیں گے کہ نہ تو وہ اپنے ماضی کو ایک بے مصرف ڈھیر سمجھتا ہے اور نہ ہی اپنے ماضی کو ہر روگ کے لیے تریاق سمجھتا ہے۔ نہ وہ ایک آدھ ذاتی اور انفرادی تعریف سے اپنے آپ کو کلی طور سے ہم آہنگ کر لیتا ہے اور نہ ہی وہ کسی خاص دور سے اپنے آپ کو کلی طور سے منسلک کرتا ہے۔ پہلا طریقۂ کار نامناسب ہے، دُوسرا شباب کے تجربہ پر مبنی ہے اور تیسرا ایک عمدہ اور پسندیدہ ضمیمہ ہے۔ شاعر کو ادب کے خاص دھاروں اور رُجحانات کا علم ہونا چاہیے لیکن ان میلانات اور رُجحانات کا ضروری نہیں کہ شہرت ہی منبع و مبدا ہو۔ اُسے سمجھنا چاہیے کہ ادب کا معیار کبھی بلند نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب کا مواد کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ اُس کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یورپ کا دماغ یا اُس کے اپنے ملک کا دماغ یا ایسا دماغ جس کے متعلق اُسے علم ہو کہ وہ ذاتی اور انفرادی ذہانت سے بالا ہے، تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ تبدیلی ترقی کے مترادف ہے لیکن یہ ترقی درمیانی چیزوں کو کالعدم قرار نہیں دیتی۔ شیکسپیئر (Shakespeare) یا ہومر (Homer) یا مگدلینی حکاسوں (Magdalenian draughtsmen.) پر کوئی چیز مُسلط نہیں کی جا سکتی۔ یہ ترقی یہ تھا، یا ایک معقول سی ذہنی اُلجھاؤ کسی فنکار کے نقطۂ نظر سے ترقی کے مصداق نہیں اور نہ ہمارے معیار ہی کے مطابق یہ ترقی کہلانے کی مستحق ہے شاید آخر میں محض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ترقی مشینوں اور اقتصادی اُلجھاؤ کا نتیجہ ہے۔ ماضی اور حال کا یہ فرق دراصل حساس

اور مجموعہ حال کی آگاہی ہے۔ یہ آگاہی اس حد تک حقیقی ہے کہ ماضی کی بنا پر [illegible] [illegible] نہیں ہیں [illegible]۔ کسی شخص کا قول ہے۔

مرحوم قلم کار ہم سے بہت پیچھے ہیں کیونکہ ہم ان سے بدرجہا بہتر جانتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ وہ اسی قسم کے نفوس ہیں جن سے ہم بخوبی واقف ہیں۔

میں اس عام اعتراض کے جواب کے لیے بالکل حاضر و آمادہ ہوں کہ بتا سکوں کہ نظم کا کیا کام ہے اور یہ میرے پروگرام کا جزو بھی ہے۔ اعتراض دراصل یہ تکلیف ہے کہ شاعری کے لیے بے اندازہ تبحرِ علم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ایسا دعویٰ ہے جو ہر دور کے شاعروں کی حیات کی روشنی میں رد کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہنا صداقت پر مبنی ہوگا کہ علم کی بہتات قوتِ شاعری کو مضمحل کر دیتی ہے۔ تاہم اس یقین پر ہم بضد ہیں کہ ایک شاعر کو کم از کم اس حد تک ضرور جاننا چاہیے جو اس کی ضروریاتِ شعری میں آڑے نہ آئے اور مناسب کسب میں مدد دے نیز اُسے ذہنی کاہلی کا شکار نہ ہونے دے۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ علم کو اس حد تک محدود کر دیا جائے کہ وہ صرف فائدہ مند شکلوں میں ہی تبدیل کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر جس کا امتحان لیا جا سکے یا جسے ڈرائینگ روم کی زینت بنایا جا سکے یا جسے محض تشہیر دی جا سکے۔ بہت سے لوگ علم کو جذب و کسب کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ بہت سے جاہل علم کے بوجھ تلے پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں۔ شیکسپیئر (SHAKESPEARE) نے پلوٹرک (PLUTARCH) سے اُن لوگوں کے مقابلے میں بدرجہا بہتر اور ضروری تاریخی مواد حاصل کیا ہے جنہوں نے پوری برٹش میوزیم سے استنباط کرنے کی کوشش کی ہے — اب یہاں جس چیز پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ شاعر اس امر کی صلاحیت رکھتا ہو جس سے وہ ماضی کی آگاہی حاصل کر سکے اور ماضی کو کماحقہٗ تفصیل سے پیش کر سکے۔ یہ صلاحیت اُس کی اپنی پوری ادبی زندگی میں جاری و ساری رہنی چاہیئے۔

ہوتا یہ ہے کہ ایک فن کار کو اپنی ذات مسلسل طور سے اعلیٰ قدروں کے حوالے کرنی پڑتی ہے۔ ایک فن کار کی کامیابی اور ترقی کا راز اُس کی اپنی مسلسل قربانی اور شخصیت کی موت پر مبنی ہے۔

اب باقی یہ رہ جاتا ہے کہ اُس عمل کی تعریف کی جائے جس کی رُو سے شخصیت کی نفی حاصل ہو سکے اور اس عدمِ شخصیت کا ادبی روایت کے تصور سے تعلق بتایا جا سکے۔ اسی عدمِ شخصیت کی رُو سے ادب اور فنی سائنس کے درجہ تک پہنچتا ہے۔ میں اس سلسلہ میں دعوتِ فکر دیتا ہوں کہ ذیل کی مثال کی روشنی میں آپ غور فرمائیں اور کسی نتیجہ پر پہنچیں کہ آیا اس کیمیائی عمل کا کیا ردِعمل ہوگا جب ہم ایک پلاٹینم کے عمدہ تار کو ایک ایسے ظرف سے گزاریں جس میں آکسیجن اور سلفر ڈائی اکسائڈ دونوں موجود ہوں۔

(۲)

حقیقی تنقید اور پُر مغز تعریف کا رُخ کسی دراصل شاعری ہوتی ہے نہ کہ شاعر۔ اگر ہم اخباری نقادوں کے بے ہنگم شور اور رائج خیالات کے چلے سُروں میں عام تواتر پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شاعروں کے بھاری تعداد میں نام ملتے ہیں لیکن

اگر ہم تعصب (یہ اخبارات کے نقادوں کی شہادت) پر بھروسہ کرتے ہوئے شاعری سے حظ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم مشکل ہی سے ان نظموں کو پا سکتے ہیں جن کی ہمیں تلاش ہے۔ میں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ اس چیز کو بیان کیا جائے کہ ایک نظم کا دوسرے مختلف شاعروں کی نظموں سے کیا رشتہ اور تعلق ہے نیز شاعری کا ایسا تصور پیش کیا ہے کہ وہ دنیا کی تمام شاعری کو جو کبھی بھی نظم کی گئی ہو دراصل ایک زندہ کل ہے۔ دوسرا رخ اس غیر شخصی شاعرانہ نظریہ کا ہے کہ نئی نظم کا اس کے مصنف شاعر سے کیا تعلق ہے۔

میں نے ایک تمثیل کی مدد سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ پختہ دماغ شاعر نیم پختہ دماغ شاعر سے نہ صرف شخصی حیثیت سے مختلف ہوتا ہے جو ممکن ہے عام طور سے پسندیدہ نہ ہو بلکہ ایسی مکمل صنف کی صورت میں منفرد ہوتا ہے جو ہر قسم کے احساسات اور خیالات کی نئے انداز میں ترجمانی کر سکے۔ یہ تمثیل تو ایک کیمیا داں کے اس تجربہ سے ظاہر ہے جبکہ متذکرہ بالا گیس ایک پلاٹینم کے تار کی موجودگی میں ملتی ہیں تو نتیجہ سلفورک ایسڈ کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ یہ مرکب اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب پلاٹینم موجود ہو تاہم یہ نو زائیدہ ایسڈ اپنے اندر پلاٹینم کا کوئی جزو نہیں رکھتا اور نہ ہی بظاہر اس عمل سے پلاٹینم متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقتاً پلاٹینم ساکن، غیر متعلق اور ناقابل تبدیل رہتا ہے۔ شاعر کا دماغ پلاٹینم کے تار سے مشابہ ہے۔ یہ جزوی یا خصوصی طور سے کسی شخص کے اپنے تجربہ پر مبنی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جتنا زیادہ پختہ فن کار ہوگا اتنا ہی اس میں زیادہ شدت سے الگ الگ اس کے اندر کا انسان ہوگا جو دکھ سہتا ہے اور اس کا اپنا دماغ ہوگا جو تخلیق کرتا ہے۔ غرض اسی شدت سے اس کا مکمل دماغ جذبات و احساسات جو اس کے مواد ہیں تحلیل بھی کر سکے گا اور ان کی ترسیل بھی کر سکے گا۔ اسی تجربہ کی روشنی میں آپ دیکھیں گے کہ غیر متحرک ترسیل کرنے والی شے (شاعر کا دماغ) کی موجودگی میں جو دو عناصر داخل ہوتے ہیں وہ اصل میں جذبات اور احساسات ہیں۔ کوئی شخص جو کسی ادبی یا فنی تخلیق کو دیکھ کر حظ حاصل کرتا ہے وہ اس تاثر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو وہ غیر ادبی شے کے تجربہ کی صورت میں حاصل کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کسی واحد جذبہ کا اثر ہو یا مختلف جذبات کا طفیل ہو۔ یہ مختلف احساسات جو کسی مصنف کو خاص لفظوں یا محاوروں یا پیکروں کی صورت میں شاعرانہ ورثہ کے طور پر ملتے ہیں دراصل کسی تخلیق کو کمال تک پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بہتر سے بہتر شاعری بغیر جذبات کے استعمال کیے ہوئے صرف احساسات کی مدد سے ظہور میں آسکتی ہے۔ انفرنو (Inferno) کے پندرھویں کینٹو* (برونیتو لاطینی) میں جذبات ثبت کا عمل دخل ہے۔ جیسا کہ اس کی [illegible] سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا تاثر گو کہ تنہا اور واحد ہے جیسا کہ کسی دوسرے ادبی شاہکار کا ہو سکتا ہے، حقیقت میں ایک کافی الجھی ہوئی تفصیل کا نتیجہ ہے۔ آخری بند ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جو نہ صرف خود بخود ظہور میں آتا ہے اور پچھلے واقعات کی مدد سے آگے بڑھتا ہے بلکہ شاعر کے دماغ میں غیر یقینی صورت میں جاگزیں رہتا ہے جب تک کہ ایک مناسب ترتیب اضافہ کے لیے داخل نہیں ہو جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاعر کا دماغ دراصل بے شمار احساسات، محاورات اور تصورات کے لیے اکتساب اور تحویل کا ایک خزانہ ہے جہاں یہ اسی صورت میں بٹتے

---

* Brunetto Latini

ہیں تا وقتیکہ وہ تمام عناصر جو ہے انتخابات سے ایک نیا مرکب نمود میں آسکتا ہے ایک جگہ جمع نہ ہو جائیں
مگر آپ دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ شاعری کے مختلف اقتباسات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کریں تو آپ دیکھیں گے
کہ شاعری کس قدر وسیع اور مختلف النوع اصناف کا مجموعہ ہے اور یہ کہ دنیا کا کوئی نیم اخلاقی معیار اس نقطہ نظر کو سمجھنے
سے قاصر رہتا ہے کیونکہ "ڈرامائی" جذباتیت سے متعلق نہیں بلکہ فنی عملی اور ادبی دباؤ کی شدت کا نتیجہ ہے جو بقول شخصے ایک
دھماکے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ پاؤلو (Paolo) اور فرانسسکا (Francesca)
کا قصہ ایک خاص جذبہ کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن شاعری میں شدت بالکل ہی الگ چیز ہوتی ہے اور یہ اس تجربہ سے قطعاً
الگ ہے جو کسی شے سے متاثر ہو کر حاصل کیا جاتا ہے البتہ اس کی شدت اس درجہ نہیں ہے جتنی کہ کینٹو چھبیس (۲۶) '
'یولیسس کے سفر' میں ہے جس میں جذبات کو براہ راست طفولیت حاصل نہیں ہے۔ جذبات کی مختلف شکلیں
بدلنے کے سب شاعرانہ طریقے ممکنات میں سے ہیں۔ اگامیمنن (Agamemnon) کا قتل یا اوتھیلو (Othello)
کی پریشانی ایک ادبی اور فنی تاثر پیدا کرتے ہیں جو بظاہر ممکن حد تک اچھوتا پن پیش کرتے ہیں جو کہ ڈانٹے (Dante)
کے مناظر سے زیادہ جدت کے حامل ہیں۔ اگامیمنن میں فنی جذبہ اور تاثر حقیقی ناظر کے لیے بدرجہ اتم موجود ہے۔ اوتھیلو میں
یہ جذبہ ڈرامہ کے کردار خصوصی کی حد تک محدود رہتا ہے۔ اگامیمنن کے قتل میں اجزا کا اجتماع انتہائی پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے
جتنا کہ یولیسس کے سفر میں ہے اور ہر دو صورتوں میں عناصر کا پھٹنے والا ایک دھماکہ ہے۔ کیٹس (Keats) کی
اوڈ (خطابیہ نظم) بہت سے قسم کے احساسات کا مرقع ہے جن کا عنادل کی ذات سے کوئی تعلق نہیں لیکن جو غالباً ایک حد
تک یا تو اس پرندے کے پرکشش نام کی وجہ سے یا کسی حد تک اپنی شہرت کی باعث اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ
یکجے جاسکیں۔

میں جس نکتۂ فکر کو ہدف بنانا چاہتا ہوں وہ دراصل کُلی اتحادِ روح کا مابعد الطبیعاتی نظریہ ہے۔ میرا مقصد یہ ہے
کہ شاعر کے پاس اظہار کے لیے اپنی "شخصیت" نہیں بلکہ ایک خاص ذریعہ (میڈیم) ہے جو کہ فقط ذریعہ ہوتا ہے شخصیت
نہیں جس میں تجربات اور تاثرات انوکھے پن سے خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ تاثرات اور تجربات جو انسان کے لیے اہم حیثیت
رکھتے ہیں شاعری میں ان کا کوئی مقام نہیں ہوتا اور جو تاثرات شاعری میں کچھ اہمیت حاصل کر لیتے ہیں وہ انسانی اور انسانی
شخصیت کے لیے غیر اہم ہوتے ہیں۔

میں ایک نظم کا اقتباس پیش کرتا ہوں جو اس امر کے لیے غیر مانوس تو ضرور ہے کہ اُسے مندرجہ بالا کنایات کی روشنی
میں نئی توجیہہ عطا کی جائے:۔

میں سوچتا ہوں کیوں نہ اپنی ذات کو ملامت کروں،
کہ ناحق اُس کے حسن کا پرستار رہا،
جس کی موت کے متعلق علم تھا کہ اُس کا شدید انتقام لیا جائے گا

کیا یہ ریشم کا کیڑا تیری خاطر اپنی سنہری محنت طویل کرتا ہے ؟
کیا صرف تیرے لیے وہ موت کے منہ میں جانا پسند کرتا ہے ؟
کیا صاحب مقدرت اپنی بیگمات کی پل بھر کی خوشی کے لیے اپنے کو بیچ ڈالتے ہیں ؟
کیوں وہ شخص صراط مستقیم سے بھٹکتا ہے،
اور اپنی زندگی قاضی کے جنبش لب کے حوالے کرتا ہے ،
(کیا اس لیے کرے وہ) اپنے نظریات کو جلا دے سکے،
اور نوبت و نقارہ رکھ کر اپنی بہادری کا ڈھنڈھورا پیٹ سکے ۔

یہ اقتباس (جیسا کہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے) منفی اور مثبت جذبات کا مجموعہ ہے جس میں ایک طرف تو حسن کے لیے ایک شدید اور مضبوط قسم کی کشش ہے اور دوسری طرف اتنی شدت سے بدصورتی کی طرف رغبت بھی ہے جو کہ پہلے تاثر سے نہ صرف متضاد ہے بلکہ پہلا تاثر ضبط بھی کر دیتی ہے ۔ یہی متضاد جذبات کا بیلنس ڈرامائی سچوئیشن کی جان ہے، جس کے لیے زبان خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن صرف سچوئیشن بھی اس کے لیے کافی نہیں ۔ یہ دراصل ایک ترتیبی اور ترکیبی جذبہ ہے جسے ڈرامہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ کلی تاثر اور مستحکم لہجہ بے شمار سبک رو محسوسات کا نتیجہ ہے جو ایسے جذبات سے یک گونہ مناسبت رکھتا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا لیکن دراصل یہی جذبہ دوسرے اجزا سے مل ملا کر ایک نئے " ادبی جذبہ " کی تخلیق کرتا ہے ۔

کوئی شاعر اپنے ذاتی جذبات یا اپنی زندگی کے خاص واقعات کی وجہ سے ممتاز اور پسندیدہ شمار نہیں کیا جاتا کیونکہ اس کے خاص جذبات سارے کے سارے خام اور سپاٹ ہو سکتے ہیں۔ لیکن شاعری میں یہی جذبہ انتہائی پیچیدہ اور الجھی ہوئی چیز بن جاتا ہے مگر اس درجہ پیچیدہ بھی نہیں جیسے عام لوگ اپنی زندگی میں غیر معمولی اور الجھے ہوئے جذبات رکھتے ہیں ۔ درحقیقت ایک شاعرانہ مذاق اور غلطی ہے کہ شاعری میں نئے انسانی جذبات کے اظہار کی راہیں ڈھونڈھی جائیں اور پھر طرہ یہ ہے کہ غلط مقامات پر اس جدت کی تلاش کی جائے جس کا ظاہر ہے نتیجہ مگم فن کے سراغ پر ختم ہوتا ہے ۔ شاعر کا کام یہ نہیں ہے کہ نئے جذبات ڈھونڈے جائیں بلکہ اس کا کام عام جذبات کی نشاندہی اور ان کا استعمال ہے ۔ انھیں محسوسات کا اظہار کرنا ہے جو حقیقی جذبات کا درجہ نہیں رکھتے اور ایسے ہی جذبات کا شاعرانہ استعمال کرنا ہے جن کا اسے بذات خود تجربہ نہ ہو ۔ انھیں صورتوں میں اسے اپنی باری سمجھنے اور مقصد برآری کرنے کا قوی امکان ہے ۔ چنانچہ ہمیں باور کرانا چاہیے کہ جذبات کا سکونی حالت میں اعادہ کرنا ایک غلط طرز عمل ہے کیونکہ ایسی صورت میں نہ تو ہم اسے صحیح معنوں میں جذبہ کا نام دے سکتے ہیں نہ ہی گزری ہوئی باتوں کا اعادہ تصور کر سکتے ہیں ۔ ظاہر ہے جب تک معنوں کی صورت اور ہیئت میں تبدیلی نہ کی جائے ہم اسے سکونی کیفیت کا درجہ نہیں دے سکتے ۔ اس کیفیت کو دراصل توجہ کی مرکوزی یا اس کے نتیجہ کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں جو یقیناً بے شمار ایسی چیزوں کی روشنی میں حاصل ہوتی ہیں جسے ایک ہوشیار اور باعمل انسان تجربات کا درجہ نہیں دیتا ۔ یہ توجہ کی مرکوزی بھی عمداً اور سوچ سمجھ کر حاصل نہیں ہوتی کیونکہ

اُن تجربات کی یا [illegible] تجربات کا اس
کا اعادہ دراصل [illegible] اظہار کا سوال ہے۔ لیکن [illegible]
بجز کر شاعر [illegible] ہے۔ حقیقت میں اب شاعری کی بات جہاں ایسی جگہ [illegible] جذبات کا جو
اور ایسی جگہ [illegible] ثبوت دے جہاں اس کے لیے سب سے زیادہ [illegible] ہے۔ دونوں [illegible] اس کے [illegible] میں شخ
[illegible] بھی ہیں شاعری جذبات کو بے لگام چھوڑنے کا نہیں بلکہ جذبات سے [illegible] کا نام ہے۔ یہ شخصیت کے اظ
نہیں بلکہ اس سے گریز کا نام ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ وہی جو شخصیت اور جذبات دونوں کے مالک ہیں یہ بات اچھے طور سے سمجھ
ہیں کہ ان دونوں چیزوں سے گریز کیا معنی رکھتا ہے۔

(۳)

"دماغ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الوہیت کا حامل ہے اور اپنی جگہ ایک غیر متاثر حیثیت رکھتا
ہے۔" *(ارسطو۔ ڈی۔ انیما۔ باب چہارم)

اس مضمون کو ما بعد الطبیعیاتی اور تصوفی حدود کے قریب ہی رک جانا چاہیے۔ اس مقالہ کو عملی نتائج تک ہی محدود رہنا چاہیے جسے شاعری میں دلچسپی لینے والا ذمہ دار آدمی عملاً منطبق کر سکے۔ شاعر سے توجہ ہٹا کر شاعری کی طرف منعطف کرنا قابل ستائش کام ہے کیونکہ یہ فعل اُس کی ماہیت کا تجزیہ کرنے میں بجا طور سے مدد دے گا اور بتا سکے گا کہ حقیقی شاعری کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ بیشتر ایسے ہیں جو نظم میں پُرخلوص اظہار کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کم ایسے ہیں جو فنی مہارت پسند کرتے ہیں لیکن بہت کم ایسے ہیں جو یہ جان سکیں کہ اہم اور خاص جذبہ کا کب اظہار ہوتا ہے جس کی حیات کے نشان صرف نظم میں ملتے ہیں اور شاعر کی سوانح میں نہیں ڈھونڈھے جا سکتے۔ شاعر اپنی شخصیت کی اُس وقت تک نفی حاصل نہ کر سکتا جب تک کہ وہ جس کام کی تکمیل دے رہا ہے مکمل طور سے اپنے کو اس کے حوالہ نہ کر دے۔ اور نہ ہی اس وقت سمجھ سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے تا وقتیکہ وہ اپنے دور میں نہ صرف جینے کا چلن سیکھے بلکہ ماضی کے موجود لمحے کو بھی محسوس نہ کرے اور اسے گزری ہوئی باتوں کا ہی نہیں بلکہ اپنے دور کی موجود اور زندہ حقیقتوں کا بھی علم ہونا چاہیے۔

---

* Aristotle, de Anima, Chap IV

چہار شنبہ مبارک

(ابتدائیہ)

شاعر: ٹی۔ایس۔ایلیٹ مترجم: سیّد فیضی

بیتی باتوں کی طرف لوٹ کے جانے کی مجھے،
اب نہیں خواہش کوئی!
اب کوئی امید نہیں،
اب نہیں خواہش کوئی!
اب یہ خواہش بھی نہیں ہے
کہ کسی کا مجھے الطافِ فراواں مل جائے،
یہ تمنا بھی نہیں ہے کہ مجھے
غیر کی تقدیرِ فروزاں مل جائے،
میں اب ان چیزوں کی خاطر
کسی کوشش کے لیے بھی تو نہیں ہوں کوشاں
سال خوردہ ہو جو شاہین
تو پرِ ماز کو پرکس کے لیے پھیلائے!
عہدِ رفتہ کی گئی تاب و تواں
ماتمی کیوں مجھے اپنا بٹھائے!

(۲)

میرا اب ساعتِ رفتہ کے فنا یاب تجمل سے
نہ ملنا ہوگا!
اور وہ میرے خیالوں میں بھی اب
بار نہیں پا سکتی
اور میں جان گیا ہوں
کہ میں اس رفتہ تجمل کی فنا یابی کو اب
پھر سے نہ جانوں گا کبھی،
اب تو میں سایۂ گل میں لبِ جو
جرعہ کشِ زیست نہیں ہو سکتا

(۳)

اور میں جان گیا ہوں کہ
زماں تو ہے سدا سے قائم!
اور میں جان گیا ہوں کہ
حقائق جنھیں کہتے ہیں وہ اک خاص زماں
خاص مکاں کے ہیں فقط زندانی!
اسی ادراک سے میں خوش ہوں
کہ یہ عالمِ اشیاء تو یہی ہے کہ جو ہے!!
اب کسی چہرۂ شاداب،
کھنکتی ہوئی آواز

[illegible] ہے
اسی اداک سے میں خوش ہوں
کہ میں اپنی خوشی کے لیے
بنیاد اٹھا سکتا ہوں
اور — اللہ سے دعا کرتا ہوں
کہتا ہوں — کہ

اے میرے خدا
مجھ کو ہر چیز بھلا دینے کی توفیق عطا کر دے
کہ میں —
خود سے،
ہر اک بخت کے اُلجھاوے سے،
ہر اک بات کی تفصیل سے
آزاد رہوں!

وہ — کہ جو ہو چکا
اب پھر تو نہیں ہو سکتا!
دورِ رفتہ کی طرف
میرا پلٹنا بھی نہیں ہو سکتا!!

یہ دعا ہے —
کہ ترا عدل ہمیں
تیری عنایت ہی سے دوچار کرے
یہ پر و بالِ کہن —
اب پھر پرواز نہیں،
یہ پر و بال —
جتنا ہی کر سکتے ہیں،
یہ تنک مایہ ہوا
خشک ہوا!!
میرے دل سے بھی تنک مایہ ہوا
خشک ہوا!!

اے خدا!
ہم کو یہ توفیق عطا کر دے
کہ ہم فکر کریں،
غم نہ کریں،
اور سکون اور تسلّی کے ہی پیکر بن جائیں!

ہم گنہگاروں کی خاطر،
کرو کچھ اب بھی دعا!
اور
دمِ آخر بھی دعا!!
ہم گنہگاروں کی خاطر کرو،
کچھ اب بھی دعا!
اور —
دمِ آخر بھی دعا!

آنکھ اور اندھیرا

عذرا بخاری

زندگی گویا لعنت کا ایک ایسا مقفل طوق بن کر گلے میں لٹک گئی تھی جیسے اس کی چابی کہیں کھو گئی ہو۔ نہ اتارے بنے نہ اٹھائے بنے۔ عجب مصیبت تھی۔

گھر کی فضا سخت بیزار کن اور بور ہو گئی تھی۔ فرخندہ اکثر کھڑکی کے قریب کہنیاں ٹکائے اس کے بند کواڑوں کو گھورتی رہتی۔ اور جب اُسے شعوری طور پر یقین ہو جاتا کہ کھڑکی بند اور مقفل ہے تو اُسے اچانک کمرہ پہلے سے زیادہ تنگ اور گھٹا گھٹا محسوس ہونے لگتا۔ تب اس کا جی چاہتا کہ بند کواڑ اور تنی ہوئی دیواروں کے ساتھ سر پھوڑ کر مر جائے۔ مگر اسی وقت اسے محسوس ہوتا کہ ابا اپنی سرخ آنکھوں سے کواڑ کے ساتھ لگے اندر جھانک رہے ہوں۔ سردی کی ایک لہر اس کی رگوں میں دوڑ جاتی۔ وہ جھرجھری لے کر دروازے کی طرف دیکھتی رہتی، اور جب اُسے یقین ہو جاتا کہ دروازے میں کوئی متنفس موجود نہیں، تو وہ ایک گھورتی سی نظر کمرے کے چاروں طرف ڈالتی۔

بشریٰ کی چارپائی اب بھی کھڑکی کے قریب جوں کی توں پڑی تھی۔ اسے یاد تھا جب پہلے پہل وہ اس گھر میں آ کر رہے تھے تو بشریٰ نے کیسے جبر سے اس سے یہ جگہ چھینی تھی، لیکن اب بشریٰ کے چلے جانے کے بعد بھی وہ بشریٰ کی چارپائی کو وہاں سے ہٹا دینے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی کہیں کوئی اسے بشریٰ جیسا نہ سمجھنے لگے۔ وہ بشریٰ نہیں تھی، فرخندہ تھی۔ سر سے پیر تک فرخندہ اپنی اس الگ تھلگ شخصیت کو منوانے پر بضد۔ سردی کی ٹھٹھری اور برسات کی حابس راتوں میں بھی وہ اپنے اسی کونے میں سوتی، جہاں ہوا اور روشنی کا گزر تک نہ تھا اور بشریٰ کی چارپائی اسی اکڑ اور ڈھٹائی کے ساتھ وہاں پڑی تھی۔ ابا اور اماں کو بھی اسے وہاں سے ہٹا دینے کا خیال نہیں آیا تھا۔ بستر کی چادر پڑے پڑے مٹیالی ہو گئی تھی۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اماں سے کہے بھلا اُسے دھویا کیوں نہیں جاتا۔ لیکن پھر وہ چپ رہی۔ اور بھی تو بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کے بارے میں وہ چپ تھی۔

مثلاً بشریٰ کی وہ تصویر جو ایک پرانی طرز کے فریم میں جڑی میز پر الٹی رکھی تھی۔ اُفوہ! بشریٰ بھی کس قدر آمرانہ خیالات کی مالک تھی۔ کمرے کی واحد میز کو اس نے صرف اپنی تصویر کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ حالانکہ اس میز پر فرخندہ کا بھی بشریٰ جتنا ہی حق تھا، لیکن اب بشریٰ کے جانے کے بعد بھی اس کی تصویر میز پر پہلے کی طرح قبضہ جمائے تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک دن ابا نے کمرے کا جائزہ لیا سونگھ سونگھ کر لیتے ہوئے اس تصویر کو الٹا کر دیا تھا اور اب فرخندہ کو تصویر میں بشریٰ کے بے نیاز چہرے پر پھیلی ہوئی باغیانہ سی مسکراہٹ نظر نہ آتی تھی۔ اس تصویر کے علاوہ ایک ریک بھی تھا۔ یہ بھی بشریٰ کی ملکیت میں تھا۔ اس شیلف میں اوپر تلے نہایت بے ترتیبی

تھیں اصلاحی ناول تھے — یہ ناول اور رسالے زیادہ تر وہ تھے جو کسی سے پڑھنے کے لئے [illegible]
ہیں ان میں ایسی کتابیں تھیں جنہیں بشریٰ نے لائبریری سے نہایت چالاکی سے اڑایا تھا ۔ اور چند ایک [illegible]
نے اس نے بازار سے خریدے ہوئے بھی تھے — ان کتابوں میں خاص وہ قسم کی کتابوں کے ساتھ فلمی رسالے بھی تھے [illegible]
اشتہار ہوتے ہیں فلمی رسالوں میں ۔ ابا کو جتنی چڑ تھی ایسی کتابوں اور رسالوں سے اتنا ہی بشریٰ انہیں ٹھونس ٹھونس کر بکس میں رکھتی
اور مزے لے لے کر پڑھتی ۔ ابا کو سب معلوم تھا ، مگر بشریٰ کا پیار جیسے قفل بن کر ان کے ہونٹوں پر لگ گیا تھا ۔

بس یونہی کبھی اماں سے دبی زبان میں ذکر کر دیتے ۔

" یہ بشریٰ کتابیں خریدنے کو اتنے پیسے کہاں سے لیتی ہے " ؟

" میں کیا جانوں ۔ باپ سے ہی لیتی ہوگی ۔" اماں پہلے ہی ابا کے بے جا لاڈ پیار سے جلی بیٹھی تھی ۔

" کچھ خودسر ہو گئی ہے ۔" ابا کا لہجہ اور دھیما ہو جاتا ۔

" پیار میں بچہ بگڑتا ہی ہے ۔ سنورتا کبھی سنا نہ دیکھا ۔" اماں جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے جاتیں ۔

" آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی ابھی بچپنا ہے نا ۔" ابا بات کے سنجیدہ پہلو کو بچانے کی کوشش کرتے تو اماں تڑخ کر جواب دیتیں

" بچپنا تو اس کا ساری عمر نہ جائے گا ۔ سیانے کہتے ہیں ۔ لڑکا بگڑے گھر منگتے ۔ لڑکی بگڑے بر منگتے ، مگر آپ کو فکر کرنے کی
کیا ضرورت ہے ۔"

" ہشت ۔ بیوقوف ۔ جاہل ۔ کچھ سوچتی ہی نہیں بکے چلی جاتی ہے ۔" ابا کی آنکھیں خون کبوتر ہو جاتیں ۔ ان کی کڑک کے آگے
اماں کی کیا ہستی ۔ مگر وہ پھر بھی خاموش نہ ہوتیں ۔

" تو یہ ہے جانے اس آدمی کو شادی کے نام سے اتنی چڑ اور نفرت کیوں ہے ۔ لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں ۔ یہ کوئی گھر رکھنے کی
چیز تھوڑی ہیں ؟"

" اے سانت جان کو آ جاتی ہو ۔ آخر چاہتی کیا ہو ۔ کسی دیوار سے اپنا سر پھوڑ کر مر جاؤں کہ لڑکی کو کسی کنوئیں میں دھکیل دوں ۔ کچھ
ماں پلے ہو ۔ کوئی مناسب رشتہ ہو تو بات بھی کروں ۔"

ابا جیسے تھک ہار کر جواب دیتے ۔

" رشتہ تو ڈھونڈنے ہی سے ملے گا ۔" اماں کہتیں ۔

" غریبوں کو کون پوچھتا ہے ۔ سب پیسے کے پیر ہیں ۔ ہم غریبوں کو تو خدا بھی ڈھونڈے بغیر نہیں ملتا ۔"

" تو پھر تم اپنے جیسا گھر ڈھونڈ لو ۔ لڑکا پڑھا لکھا ہو ۔ بات پکی کر چھوڑیں اگلے سال شادی ہو جائے ۔"

" اوہ ! تم سے تو بات کرنا مصیبت مول لینا ہے ۔ ایک دفعہ کہہ جو دیا ، ہو جائے گا سب کچھ ۔ اب کچھ نہ بولنا ۔" ابا کے
سرد لہجے سے اماں کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ۔ دونوں خاموش ہو جاتے ۔

اور فرخندہ سوچتی رہ جاتی ۔ واقعی ابا کو شادی کے نام سے اتنی چڑ کیوں ہے ۔ دو سال بیت گئے ۔ اماں کی ہر کوشش ابا

کی سرد مہری کے آنگے پانی کا بلبلہ بنتی رہی ۔ بشریٰ ایک دفعہ بی اے میں فیل ہو کر پھر اس کی تیاری میں مشغول تھی ۔ اب اس نے اماں کی ان کوششوں میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دیا تھا ۔

اب اس سلسلے میں کوئی عورت ان کے ہاں آتی اور اماں اسے اندر جانے کو کہتیں تو وہ فوراً رکھاوٹ سے جواب دیتی ۔

" فرخندہ کو دکھا دیجئے ۔ میں نہیں جاؤں گی ۔"

" کیوں ؟ " اماں تیکھی ہو کر پوچھتیں ۔

" میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی ۔" بشریٰ فیصلہ کن لہجے میں جواب دیتی ۔ " بی ٹی کر کے میرا ارادہ سروس کرنے کا ہے ۔"

اماں بے چاری عجب مصیبت میں پھنس گئی تھی ۔ ایک طرف آبا اس کے کاموں میں روڑے اٹکا رہے تھے ۔ دوسری طرف صاحبزادی اکڑ بیٹھی تھیں ۔

آبا بشریٰ کی باتیں سنتے اور چپ رہتے ۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ آبا کو بشریٰ پہلے سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی ۔ بشریٰ بشریٰ کرتے ان کا منہ سوکھتا ۔ باہر سے جب بھی آتے بشریٰ کے لئے ضرور کچھ لاتے ۔ یوں لگتا تھا جیسے بشریٰ کے ارادوں سے آبا خوش تھے ۔

لیکن یہ تو صرف فرخندہ کو معلوم تھا کہ بشریٰ کے ارادے کیا تھے ۔ دو سال کے اس ناٹک نے جو آبا اور اماں اس کی شادی کے بارے میں کھیلتے رہے آخر اب اس کے اندر کونسے نئے جذبہ کو بیدار کر دیا تھا ۔ اور اب وہ کیوں اس بات میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی ۔

وہ بشریٰ کی رازداں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی رازداں تھی ۔ دوسرے معاملات کی طرح بشریٰ نے یہاں بھی دھاندلی سے کام لیا تھا اور بغیر ایک لفظ کہے یا اس کی خواہش اور رائے کا خیال کئے اسے اپنے اعتماد میں لے لیا تھا ۔

راستہ چلتے ہوئے جب وہ اچانک اس سے کہتی " فرخندہ آج میں گھر دیر سے آؤں گی اماں سے کہہ دینا ، ڈگری کلاس کا کوئی فنکشن ہے ۔" تو فرخندہ کچھ جواب نہ دیتی ، لیکن گھر پہنچ کر اماں کے استفسار پر چپکے سے بشریٰ کے الفاظ دہرا دیتی ۔

اماں کسمسا کر چپ کی چپ رہ جاتیں ۔ آبا کے چہرے کا رنگ بھی ایک لمحہ کے لیے مٹیالا ہو جاتا ، لیکن پھر وہ سنبھل کر کہتے " کالجوں میں یہی تو مصیبت ہے ۔ آئے دن کوئی نہ کوئی فنکشن ۔ پڑھائی کم اور فنکشن زیادہ ۔ تم بھی فرخندہ اس کے ساتھ رک جاتیں ۔ اب وہ اکیلی آئے گی ۔ اچھا میں جا کر لے آؤں گا ۔" اور فرخندہ ایک دم گھبرا کے کہتی " ادھر آنے والی بہت سی لڑکیاں ہیں ۔ خود ہی آ جائے گی اُن کے ساتھ ۔"

" بس تو پھر ٹھیک ہے ۔"

آبا کے گرتے وجود کو جیسے سہارا مل جاتا ۔

" کسی دن سر پہ ہاتھ رکھ کر رو گے ۔" اماں تلخی سے کہتیں ۔

" تم تو یونہی بکتی رہتی ہو ۔" آبا ناگواری سے جواب دے کر خاموش ہو جاتے اور فرخندہ کو یوں لگتا جیسے آبا سب کچھ جانتے ہیں ۔ بشریٰ نے آبا پر بھی دھونس جما کر انہیں اپنا رازداں بنا لیا ہے ۔

تب وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں آ جاتی ۔ یہ کمرہ اس کے اور بشریٰ کے لئے وقف تھا ۔ چپکے سے کمرے کی تنہا کھڑکی

کھلا کر وہ چُھت پھٹے ہیں ہنا کتی۔ ہیں کروٹیں والے بگولوں کی ایک قطار پر چھڑ چھڑا رہی تھی کی کراہتیں میں [illegible] وہ سوچتی اس وقت بشریٰ اخلاق کے ساتھ کسی سینما ہاؤس میں کوئی فلم دیکھ رہی ہوگی۔ اخلاق اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ [illegible] اس نے اسے صرف دور سے دیکھا تھا اور وہ بھی چند ایک بار۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہے۔

اسے افسوس تھا کہ بشریٰ اخلاق کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ لیکن وہ خود اکثر سوچتی رہتی۔ بشریٰ کے پاس جو اونچے اور خوبصورت خواب ہیں اخلاق ان کی تعبیر نہیں بن سکتا۔ بشریٰ اس چھوٹے سے گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر کھلی فضا میں پرواز کرنا چاہتی ہے۔ اسے حرارت سے بھرپور ہمہماتی رزقتی پھڑکتی زندگی چاہیئے۔ اسے اجالوں سے محبت ہے۔ اس کے خواب بہت خوبصورت اور بہت قیمتی ہیں اور اخلاق انہیں پورا نہیں کر سکتا۔ کئی بار اس کا جی چاہتا کہ بشریٰ کو سمجھائے، لیکن وہ جانتی تھی کہ بشریٰ ایک تحقیر آمیز تبسم کے ساتھ اس کے مشورے کو ٹھکرا دے گی۔ بشریٰ بہت زیادہ جذباتی تھی اور اخلاق کے بارے میں تو وہ انتہائی شدت پسند ثابت ہو رہی تھی۔ وہ خاموش رہی اور اسی خاموشی میں وہ کالی اور بھیانک رات آ گئی، جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

ٹک ٹک کرنے چھوٹے سے ٹائم پیس نے ابھی ابھی بارہ بجائے تھے۔ اور وہ ہاتھ میں کاغذ کا چھوٹا سا پُرزہ لئے کواڑ کے سہارے کھڑی کانپے جا رہی تھی، اور روئے جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سامنے سیڑھیوں کا کھلا منہ کسی اژدہے کے کھلے تاریک منہ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اور ابھی ابھی بشریٰ اس تیز نوکیلے چبا جانے والے دانتوں کی قطاروں کے درمیان بنے ہوئے تاریک راستے پر خوشی کے ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی چلی گئی تھی۔ کیوں۔ بشریٰ کو تو اُجالوں سے پیار تھا۔ پھر وہ کیوں اس اندھیرے غار میں اتر گئی تھی۔ کیا روشنی پانے کے لئے تاریکی سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ کانپ کانپ کر روئے جا رہی تھی اور اس بھیگی مٹھی میں کاغذ کا پُرزہ بھی اس کے ساتھ لرز رہا تھا۔ بشریٰ نے اس کی مرضی کے خلاف اس پر اعتماد کر کے اسے ایک بڑی اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک مُجرم خیال کر رہی تھی۔ آخر اس نے یہ سب کچھ اس سے چھپ کر کیوں نہیں کیا۔ ایک بارگی اُس کا جی چاہا وہ بشریٰ کے اعتماد کو ٹھکرا دے۔ اور ابھی چیخ چیخ کر اس کا بھید فاش کر دے۔ مگر پھر اس کی دبی ازلی بزدلی آڑے آئی۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔

چبوترے کے پاس ابا چارپائی پر گہری نیند میں مدہوش تھے۔ اندھیرے کے باوجود اس نے اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ ابا کے کسی خوفزدہ بچے کے سے معصوم اور بھولے چہرے کی طرف دیکھا اور اسے اُن پر بڑا ترس آیا۔ صبح اس چہرے پر موت کی زردی کھنڈ جائے گی۔ اس کا سینہ جیسے غم سے پھٹنے لگا۔ اس نے ابا سے نظریں ہٹا کر اماں کی طرف دیکھا۔ صبح یہ چہرہ بھی غم سے سُت جائے گا۔ اور آنسو بے اختیار اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ تبھی اماں نے کروٹ لی وہ جلدی سے کواڑ چھوڑ کر اپنے بستر میں دبک گئی۔ اس کی ماں نے ذرا سا سر اونچا کیا۔ دائیں طرف تھوک کر اس نے بائیں طرف کروٹ لی اور بڑبڑانے کے لہجے میں کلمہ اور آیۃ الکرسی پڑھنے لگی۔ ان کے منہ سے یہ بھی نکلا بشریٰ آ گئی ؟ اس کے بعد وہ پھر اونگھ گئیں۔ فرخندہ نے سوچا شاید ماں نے کوئی بھیانک سپنا دیکھا ہے۔ اس کا دل خوف سے کانپنے لگا۔ دور کسی اجاڑ سے اُلو کے چیخنے کی آواز آئی اور اندھیرے میں دو تین چمگادڑیں ایک دوسری پر جھپٹے چلی گئیں۔ ساری رات وہ ایک ٹک کبھی اماں کبھی ابا اور کبھی اژدہے کے تاریک منہ کی طرف دیکھتی رہی۔

صبح ماں نے اسے آواز دی تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی - اس پر گہری افسردگی طاری تھی اور دل و دماغ بوجھل ہو رہے تھے۔ ماں
اسے ابا کو جگانے اور بشریٰ کو اُوپر سے بُلانے کا کہہ کر کچن میں چلی گئی تھی - اور وہ حیرت میں ڈوبی اپنی چارپائی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی - ابا کو
تو وہ جگا دے گی مگر بشریٰ کو وہ کہاں سے لائے گی - بشریٰ جو وہم کی طرح ہر جگہ تھی بھی اور نہیں بھی تھی - ماں کی دُوسری آواز پر وہ مجبوراً
اٹھی اور کوٹھے کی سیڑھیوں پر زور سے پاؤں مارتی اُوپر گئی اور سیڑھیاں طے کرتے ہُوئے اس نے بڑی دل گرفتگی سے دُعا مانگی "اے خدا
بشریٰ اوپر ہو -" لیکن بشریٰ اوپر نہیں تھی - وہ آہستگی سے نیچے اتری -

"بشریٰ اوپر نہیں ہے" - ماں کو یہ اطلاع دیتے وقت اسے آواز کو حلق سے کھینچ کر نکالنا پڑا -

"اوپر نہیں ہے ؟" ماں کے ہاتھ سے کیتلی چھوٹ کر زمین پر آ رہی -

"غسل خانے میں دیکھو -" اور پھر اُسے غسل خانے کے علاوہ گھر کا کونہ کونہ دیکھنا پڑا ، لیکن بشریٰ کی آگے آگے بھاگتی ہوئی
پرچھائیں کو وہ گھر کے کسی کونے سے نہ پکڑ سکی - تب ماں سر میں خاک ڈالتی دو ہتھڑ پیٹتی کچن سے باہر نکلی اور صحن میں پہنچ کر دھڑ سے زمین پر
کٹے ہُوئے درخت کی طرح گر پڑی - ابا اچانک سوتے سے جاگ پڑے انہوں نے اپنی سرخ ادھ مُندی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا اور پھر
گھبرا کر اُٹھ بیٹھے -

"یہ یہ کیا ہُوا تمہیں ؟" پھر انہوں نے روتی ہوئی فرخندہ کی طرف دیکھا پھر بوکھلا کر سوال کیا -"بشریٰ کہاں ہے -" یہ سوال
اس طرح کیا گیا تھا ، جیسے خطرے کی لال بتی وہ بہت پہلے کی دیکھ چکے ہوں -

بشریٰ کے جانے کے بعد گھر کی فضا یکسر بدل گئی تھی - گھر پر ہر وقت ایک سوگوار سناٹا چھایا رہتا - ابا اور اماں اپنے ستے ہُوئے بے رونق
چہروں کے ساتھ گھر میں سایوں کی طرح چلتے پھرتے - کھوئے ہوئے گم سم اور خاموش ایک دوسرے سے بیزار اور جھلائے ہُوئے - اب وہ کبھی
کسی معاملے میں ایک دُوسرے سے متفق نہ ہُوئے - اماں کو دیکھ کر ابا کی آنکھوں میں خون اُتر آتا - اور اماں کے بھی ماتھے پر لاتعداد شکنیں پڑ جاتیں
اور ان کے نتھنے پھڑکنے لگتے - یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک دُوسرے کو کوئی الزام دینا چاہتے ہیں ، ایک دُوسرے سے جی بھر کر لڑنا چاہتے ہیں
مگر پھر وہ خاموش کے خاموش رہ جاتے ہیں - اور فرخندہ سوچتی آخر یہ ایک دفعہ کھل کر ایک دوسرے سے لڑ کیوں نہیں لیتے - اس طرح دل کی
بھڑاس نکل جائے تو گھر کی کدر فضا میں شاید کوئی خوشگوار تبدیلی آ جائے - لیکن فضا کے تکدر میں تو اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا -

ایک دن فرخندہ کو کالج سے آنے میں دیر ہو گئی - جب وہ آئی تو ابا اور اماں اپنے اپنے طور پر اس کا انتظار کر رہے تھے ، اسے
دیکھتے ہی ابا نے کڑے لہجہ میں پوچھا "اتنی دیر کہاں رہی -"

"بس بگڑ گئی تھی -" یہ مختصر سا جواب دیکر وہ جلدی سے کمرے میں آ گئی - اسے ابا کا لب و لہجہ اور یُوں سوال کرنا سخت ناگوار گزرا
تھا - اور سب سے زیادہ تو اُسے یہ بات ناگوار گزر رہی تھی کہ ابا کی بات سُن کر اماں کی پیشانی کی شکنیں غائب ہو گئی تھیں - اور ان کے
چہرے کی نرماہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کم از کم اس معاملے میں ابا کی طرفدار ہیں -

تھوڑی ہی دیر بعد ابا کمرے میں آئے - انہوں نے اس کمرے بلکہ اس گھر کی واحد کھڑکی کو دھڑ سے بند کر کے قفل لگا دیا -

"ابا ـ" اس کا دم گھٹ کر رہ گیا - اسے یوں لگا جیسے ابا نے اسے جیتے جی قبر میں گاڑ کر اس پر مٹی کی موٹی تہیں جما دی ہوں - اس

سے پہلے تو وہ کمرے کی کھڑکی کھلی رہتی تھی یا بند۔ [illegible] کبھی تو بند رہتی تھی۔ [illegible] جہاں [illegible] کمرہ
جس میں وہ پہروں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ اب وہ اس کمرے میں اسے اکیلے نہ رہنے دیا جاتا۔ جب بھی وہاں بیٹھی اور پڑھنے لگتی کوئی
تو بند کمرے کی کھڑکی [illegible] ایکدم اس کی آنکھوں اور کتاب کے صفحات کے درمیان حائل ہو جاتے۔ دوسری طرف اماں نے گھر کے اندر
پلنگڑی ڈال کر اس کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ گھبرا کر صحن میں نکل آتی یا کوٹھے پر چڑھ جاتی تو اماں بھی کسی نہ کسی بہانے وہاں کے
چکر لگاتی رہتیں۔ وہ بشریٰ نہیں تھی، پھر بھی اُسے بشریٰ سمجھا جا رہا تھا۔ ان حالات میں وہ عجب گھٹن اور بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ بعض
اوقات اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اُسے بشریٰ بن جانے پر اکسا رہا ہے۔ وہ کیوں نہ بشریٰ بن جائے۔ لیکن پھر وہ ان خیالات کو
فوراً اپنے ذہن سے جھٹک دیتی، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس میں اور بشریٰ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ریک میں پڑی بے ترتیب
کتابوں کو دیکھ کر اکثر وہ اپنے دل میں بشریٰ کے لئے نفرت محسوس کرتی۔ عجب جذباتی، لاپروا، غیر متوازن ذہن کی متلون مزاج اور الجھے
ہوئے خیالات کی مالک لڑکی تھی۔ کئی بار اُسے بشریٰ پر غصہ بھی آیا۔ اس کے کئے کی وہ سزا بھگت رہی تھی۔ ابا اور اماں نے کڑی نگرانی
کے لئے نظروں کے چار چوکیدار اس پر بٹھا دیئے تھے۔

صبح ابا سائیکل پر اسے کالج چھوڑنے جاتے، پھر سائیکل پر ہی وہ کالج سے واپس آتی۔ اس پر بھی وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ ابا اور
اماں اس سے غیر مطمئن رہتے ہیں اور وہ ان کا رویہ دیکھ کر چڑچڑی بنتی جا رہی تھی۔ اور اس کی ذہنیت مجرمانہ سی ہوتی جا رہی تھی۔

کبھی کالج سے آتے یا جاتے وقت کوئی نوجوان سائیکل کے پیچھے لگ جاتا اور ابا مضطربانہ مڑ مڑ کر، گھور گھور کر اُسے دیکھتے
تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے۔ اُسے یوں لگتا جیسے ابا نوجوان کے قریب چلنے کو بھی اسی کا قصور سمجھ رہے ہیں۔ اگر ایسے لمحے طویل
ہو جاتے تو وہ بالکل نروس ہو جاتی۔ بعض اوقات تو اسے محسوس ہوتا جیسے اسے پھنسا [illegible] کیا جا رہا ہے۔ اُسے سمجھایا جا رہا ہے کہ وہ
بھی بشریٰ ہے اور اُسے اپنے جرم کا اقرار کر لینا چاہئے۔ بعض اوقات تو یہ احساس اتنا شدید ہوتا کہ اسے یوں لگتا جیسے کسی غیبی طاقت
کے زیر اثر وہ ابھی اپنا نقاب الٹ دے گی۔ اور صاف صاف کہہ دے گی: ”میں اس لڑکے کو جانتی ہوں۔ مجھے اس سے محبت ہے اور میں نے
آج آدھی رات کو اس کے ساتھ بھاگ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔“ لیکن یہاں پھر اس کے شعور کی پختگی کام آتی اور وہ یکدم سر کو ہلکا سا
جھٹکا دے کر خود کو سنبھال لیتی۔

شروع شروع میں یہ مخدوش حالات اس کے ذہنی توازن کو مختل اور مفلوج بناتے رہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ ان حالات
کی خوگر ہو گئی۔ اب کبھی وہ دل زبان سے کوئی فرمائش کرتی اور اماں بے دردی سے جواب میں کہتیں: ”بس بس اب فرمائش پوری کرنے کا بوتا
نہیں رہا۔ ایک کے بہت چاؤ لاڈ کر کے دیکھ لیا۔“ یہ باتیں اُسے ناگوار نہ گزرتیں۔ مگر یہ بات اُسے سخت ناگوار گزرتی کہ اسے ہر قدم پر
بشریٰ کے برابر کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کچھوے کی سی سست رفتاری سے دن رات گزرنے لگے۔ اور پھر ایک مدت بعد اس گھر کی خاموش اور ساکن فضا میں
ہلکی سی ہلچل محسوس کی۔

اس دن کچھ اجنبی عورتیں گھر میں آئی تھیں اور ابا صبح سویرے سائیکل اٹھا کر کہیں غائب ہو گئے تھے ——— شام کو جب

وہ لوٹ کر آئے تو اماں غصّے کے گھونٹ پیئے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانا نکالتے نکالتے وہ ایکدم برس پڑیں۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟" انہوں نے وکیلانہ جرح کی طرح پوچھا۔

"کیوں کیا کوئی ضروری کام تھا؟" ابا نے معصومیت سے پوچھا۔

"کہا جو تھا آج کچھ عورتیں آ رہی ہیں، آپ کہیں نہ جائیں۔" اماں نے جل کر جواب دیا۔

"عورتوں سے میرا کیا کام؟" ابا بھولے بن رہے تھے۔

"عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے اور بے وقوف منہ کے بل گر کر بھی ہوشیار نہیں ہوتا۔" اماں نے استعارہ استعمال کیا تو ابا ایکدم بھڑک اٹھے۔ "پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو، سیدھی طرح بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"میں کیا کہوں گی دنیا کہتی ہے کہ اس آدمی نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ لیکن اتنا یاد رکھو فرخندہ کو میں اس کنوئیں میں نہ گرنے دوں گی۔ اور تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

"اپنی اولاد کا بُرا کون چاہتا ہے۔ تم سے زیادہ مجھے فکر ہے۔ مگر پیسہ کہاں سے آئے گا۔" "رشتہ طے ہو جائے تو پیسے کا بھی انتظام کر لیں گے۔ ہماری کون سی دس اولادیں بیٹھی ہیں۔ ایک اکیلی لڑکی کو بھی بیاہ نہیں سکتے۔" ابا خاموش ہو رہے۔ لیکن اس کے بعد ابا اور اماں کے درمیان اکثر جھڑپیں ہونے لگیں اور وہ سمجھ گئی۔ آج سے دو سال پہلے کا ناٹک دھرایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اسی چھوٹے سے بند کھڑکی والے کمرے میں بیٹھی سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی۔ نت نئی عورتیں آتیں اور راستے لیکاؤ مال کی طرح دکھایا جاتا۔ پھر بھاؤ تاؤ ہوتا اور آخر میں تان ابا پر ٹوٹتی جو عین موقعوں پر کہیں غائب ہو جاتے۔ اسے نہ ابا پہ غصہ تھا، نہ اماں سے شکایت وہ بشریٰ نہیں تھی فرخندہ تھی، ایک خاموش تماشائی۔

اور پھر یوں ہوا کہ اماں کی دو سال کی کوششیں رنگ لائیں۔ اس کی منگنی ہو گئی۔ ڈاکٹر احمد ایک اونچے قد کا خوب صورت جوان تھا۔ جس کی گلبرگ میں ذاتی کوٹھی تھی اور شاندار فورڈ تھی۔ فرخندہ کی قسمت پر ہر کسی کو رشک آ رہا تھا۔ اور ایسی قسمت پر رشک آنا ہی چاہیئے۔ ابا جو کل تک سرد مہری کا اظہار کرنے پیش پیش ہوتے تھے، شادی کے دن کو قریب آتا دیکھ کر وہ بھی سستی جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چیزوں کی خرید فروخت میں جو صبح گھر سے نکلتے تو شام ہی کو واپس آتے۔ اماں نے سو جوڑ توڑ سے اچھا خاصا اپنی بساط سے بڑھ کر جہیز تیار کر لیا تھا۔ صبح سے شام تک چیزیں ڈھوتے ابا کی کمر دُہری ہو جاتی۔ شام کو تھک ہار کر بیٹھتے تو یا تو کسی نہ کسی بہانے اماں سے جھگڑنے لگتے۔ یا پھر بیٹھے یوں ہی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتے۔ ان دو چار برسوں میں جیسے وہ ایکدم بوڑھے ہو گئے تھے۔ چندیا کے بال اڑ گئے تھے۔ اور جو اِکا دُکا بال چندیا کے کناروں پر تھے وہ بھی سفید براق تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ گردن کا گوشت لٹک گیا تھا۔ پہلے کے فٹ کپڑے اب ڈھیلے ہو گئے تھے۔

[illegible] فرخندہ جب بھی کچھ سوچتی اسے بشریٰ یاد آ جاتی اور وہ اپنے دل میں اس کے لئے نفرت اور غصہ محسوس کرتی۔ پانچ سال سے اس گھر میں کسی نے اسے یاد نہ کیا تھا۔ اس کا نام تک کسی کی زبان پر نہ آیا تھا۔ پھر بھی فرخندہ کو محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ابھی تک اس گھر پر بشریٰ کا تسلط قائم ہے۔ وہ جا کر بھی نہیں گئی۔ اس کی چیزیں پانچ سال سے ویسی کی ویسی

پلنے لگتیں جیسی وہ چھوڑ گئی تھی۔ وہ خود انہیں وہاں سے ہٹا دینے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ اماں کے غم میں بوڑھے ہو گئے تھے۔ اور اماں جب اس کے جہیز کی چیزیں تیار کرتیں تو ان کے ہونٹوں سے خاموش آہیں نکلتی رہتیں۔ یہ سب باتیں فرخندہ کے پیچھے ایک بوجھ بن گئی تھیں۔ وہ اس گھر میں تنہا رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بشریٰ کے سامنے بے بس و مجبور محسوس کرتی۔ شادی کے اس ہنگامے میں ابھی تک اس کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔ پھر ایک دن اماں نے یہ بات چھیڑ ہی دی۔

”شادی پر بشریٰ کو نہیں بلاؤ گے“؟ اماں نے چاولوں کی چھان پھٹک کرتے ہوئے بات چھیڑی۔

ابا نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے چمک سی آئی۔ لیکن پھر فوراً ہی ان کا چہرہ بجھ کر پتھر کی طرح بے جان اور بے حس ہو گیا۔ وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر کمرے کے اندر چلے گئے۔

فرخندہ کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی۔ سلام چھوڑ کر وہ بہانے سے کمرے کے سامنے سے گزری۔ ابا کا سوکھا ڈھانچہ کرسی پر ڈھیر تھا اور وہ سامنے کی دیوار کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سگریٹ دھوئیں کے ساتھ سلگ رہا تھا۔

ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد ابا کے روزمرہ کے معمولات میں بڑی یکسانیت آ گئی تھی۔ صبح سویرے اٹھنا۔ بازار سے ضروری اشیاء مثلاً دودھ دہی، سبزی گوشت وغیرہ لانا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر لمبی تان کر سو جاتا۔ یا اپنا پرانا کھڑکھڑاتا ہوا سائیکل لے کر باہر نکل جانا۔ شام کو کسی دکان پر جا بیٹھنا اور رات گئے تک بیٹھے گپ شپ میں مشغول رہنا اور رات کا کھانا کھا کر سو رہنا۔

جب سے بشریٰ گئی تھی وہ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتے۔ جیسے وہ بشریٰ کے خیال سے ڈرتے ہوں۔ اور یہ حقیقت تھی کہ انہوں نے کبھی بشریٰ کے متعلق سوچا نہ تھا۔ بشریٰ ان کے دل کے بند کواڑوں کے پاس پانچ سال سے کھڑی سسک رہی تھی۔

اماں نے ذکر چھیڑا تو اچانک انہیں محسوس ہوا جیسے بند کواڑ خود بخود کھل گئے ہیں اور بشریٰ بے دھڑک اندر آ گئی ہے۔ اب جب بھی وہ اپنی سوچوں سے چونکتے انہیں یہ جان کر صدمہ سا ہوتا کہ ان کی سوچ کا مرکز سوائے بشریٰ کے اور کچھ نہ تھا۔ بشریٰ ان کی سوچوں میں جیسے دھنستی جا رہی تھی۔ کسی لوہے کے کھمبے یا پتھر کے بت کی طرح جو ہلانے نہ ہلے نکالے نہ نکلے۔

یہ انہیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ ان کا وہ غرور، وہ ٹھسا، وہ اونچی لمبی ناک کیوں خاک میں ملتی جا رہی تھی۔ لیکن بشریٰ کو ذہن سے اتار دینا ان کے اختیار میں نہ رہا تھا۔ ان کے دل پر پڑی مضبوط گرہیں خود بخود کھلتی جا رہی تھیں۔

بازار میں یا پارک میں کھیلتے ہوئے ننھے بچوں کو دیکھتے تو انہیں اچانک محسوس ہوتا، جیسے ان کے دائیں ہاتھ کی کلمے والی انگلی کسی نرم نرم اور بھیگی بھیگی مٹی میں دبی ہے۔ چلتے چلتے وہ بے دھیانی میں رک جاتے۔ اور جب وہ چونکتے تو کسی پھل والے یا مٹھائی والے کی دکان پر کھڑے ہوتے۔

”کیا چاہیئے بھائی صاحب؟“ دکاندار کی آواز انہیں چونکا دیتی۔ وہ جھجک کر اپنے دائیں بائیں یوں دیکھتے جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہو۔ ٹھیک اس وقت کوئی ان کے کان کے پاس تالی بجا کر دور بھاگ جاتا، چھپ جاتا، کہیں گم ہو جاتا۔

”صاحب کا کچھ کھو گیا ہے“ دکاندار کی دوسری تمسخر آمیز آواز انہیں بالکل پریشان کر دیتی۔

"ہاں ——— ہاں ——— ہاں ——— نہیں نہیں کچھ نہیں کھویا، کچھ بھی تو نہیں کھویا" وہ تیز قدموں سے چلنے لگ جاتے پارک کے نزدیک پہنچ کر وہ پھر ٹھٹھک جاتے۔ فٹ پاتھ پر اب بھی فوٹوگرافر اپنا اڈہ جمائے تھے۔ پس منظر کے لئے کالے نقشین پردے تانے کرسیاں بچھائے، کیمرے رکھے وہ گاہکوں کے انتظار میں سگرٹ پھونکتے رہتے۔

"یہاں بیٹھ جاؤ بشریٰ!" کندھوں سے اچکا کر وہ بشریٰ کو کرسی پر بٹھا دیتے۔

"تو بھئی پھر ہو جائے نمبر ون فوٹو۔" وہ کیمرہ مین سے کہتے۔

"ایسی تصویر اتاروں گا کہ جناب کی طبیعت خوش ہو جائے۔" کیمرہ مین اپنے پیلے پیلے دانت نکوسے کیمرہ فٹ کرنے لگتا۔

"صاحب تصویر کھچوایئے گا۔" وہ چونک پڑتے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ فوٹوگرافر کو کیا جواب دیں۔ پھر وہ احمقانہ انداز میں سر کو جھٹکتے۔ "نہیں بھئی اب کون سی عمر رہ گئی ہے تصویر کھچوانے کی۔ بس یوں ہی ذرا دیکھنے کو کھڑا ہو گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" فوٹوگرافر سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر سگرٹ پینے لگتا اور وہ چپ چپ چور نظروں سے ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے یوں چلتے جیسے پیچھے سے انہیں کوئی دھکیل رہا ہو۔

گھر میں بھی عجب مصیبت ہو گئی تھی۔ بہت سی چیزوں نے ایکدم سامنے آ آ کر انہیں ستانا شروع کر دیا تھا۔ بشریٰ کی الٹی پڑی ہوئی تصویر، کتابوں اور رسالوں سے لبالب بھرا ریک اور بھی بہت سی چیزیں تھیں جنہیں دیکھ کر انہیں بشریٰ یاد آ جاتی۔

بشریٰ کا خیال انہیں آتا رہا اور وہ بشریٰ کے اس اقدام کے اسباب و نتائج پر غور کرتے رہے۔ اور اس میں اپنے اور بشریٰ کے قصور کا موازنہ کرتے رہے۔ ان کا قصور کیا تھا۔ لیکن ان کا تو قصور کچھ نہ تھا۔ بشریٰ ہی انہیں غلط سمجھی تھی۔ وہ اس کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ جلد باز تھی اور نفسیات کی چند کتابیں پڑھ کر اپنے آپ کو تجربہ کار اور عقلمند سمجھنے لگی تھی۔

ایک دن دوپہر کو کمرہ بند کر کے انہوں نے مقفل صندوق سے کاغذ کا وہ پرزہ نکالا جو پانچ سال پہلے بشریٰ لکھ کر چھوڑ گئی تھی۔ کسی نام کسی القاب کے بغیر لکھا تھا۔

"آج جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ میں اس گھر میں کبھی زندگی کی حرارت محسوس نہ کر سکوں گی اور مجھے ہمیشہ بے حس اور موت کے ٹھنڈے سایوں میں جینا ہو گا تو میں نے اس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اپنے باپ کی احسان مند ہوں۔ جس نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور دنیا کے تمام باپوں سے بڑھ کر مجھ سے محبت کی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ان کی یہ شدید محبت آخر میں ایک نفسیاتی الجھاؤ اور جذباتی پیچیدگی کا شکار ہو گئی۔ وہ میری زندگی کو اس گھر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جو میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اس لئے میں جا رہی ہوں۔ اخلاق زیادہ مالدار آدمی نہیں، لیکن وہ میرے روشن مستقبل کا ضامن ضرور بنے گا۔

بشریٰ

پہلی بار یہ خط پڑھ کر بابا سکتے میں آ گئے تھے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ بشریٰ جو ان کے جگر کا ٹکڑا تھی، ان کے جسم کا ایک حصہ تھی جس کی صورت میں ان کی شبیہہ تھی اور جس کی رگوں میں ان کا خون ــ انہیں یوں ایک اجنبی انجانے شخص کے لئے چھوڑ کر بھی جا سکتی ہے

کاغذ کا وہ پرزہ ہاتھ میں لئے مٹی کی مورت کی طرح وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ پر بیٹھے رہے تھے۔ اس کاغذ کے ٹکڑے نے ان سے سوچنے سمجھنے بولنے اور حرکت کرنے کی تمام قوتوں کو سلب کر لیا تھا۔ اور جب بیٹے اور بہوؤں کو شکل سے ہی وہ ایک آنکھ نہ بھائے تو پہلی بار یہ محسوس کی کہ ان کے دل میں بشریٰ کے لئے نفرت اور غصے کے علاوہ کچھ نہیں رہا۔

لیکن اس دن جب انہوں نے وہ پرزہ نکال کر پڑھا تو انہیں بشریٰ پر ذرا کوئی غصہ آیا نہ صدمہ پہنچا۔ انہیں بشریٰ چھوٹی سی ضدی خود سر اور وہ ننھی بچی نظر آئی جس نے محض اپنی ضد اور خود سری میں آ کر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا تھا۔ اور اب وہ پچھتا رہی تھی۔ ان سے ناراض ہو کر اور روٹھ کر کونے میں منہ دبکائے چور نظروں سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ کب ابا آئیں اور اس کو منالیں۔ ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

" پگلی کہیں کی وہ آج ہی اُسے بلا لیں گے۔"

مگر جب یہی بات ابا نے اماں سے کہنے کی کوشش کی تو ان کا حلق خشک ہو گیا۔ اور ہونٹ سوکھ گئے۔ اور انہوں نے اپنی اونچی خاندانی ناک میں ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ بھلا وہ یہ بات اس طرح کھلم کھلا کس طرح کر سکتے ہیں۔ وہ انتظار میں رہے شاید اماں پھر یہ ذکر چھیڑیں تو وہ سر ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیں۔ لیکن اماں خاموش تھیں۔

توری رشتے دار گھر میں جمع ہوتے جا رہے تھے۔ اور فرخندہ خاموشی سے گھر میں چلتے پھرتے یا بند کھڑکی والے کمرے میں چپ بیٹھے حیرت سے ابا کی طرف دیکھتی رہتی۔ ابا کی اندر کو دھنسی ہوئی ویران اور خالی آنکھوں میں اچانک کسی کا انتظار سا بسا تھا۔ وہ اُجاڑ کھنڈروں جیسی آنکھیں گھر کے کونے کونے میں کسی کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن اماں خاموش تھیں۔ سگرے رشتہ داروں میں سے بھی کسی نے بشریٰ کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ ابا اداس اور منتظر تھے۔ اور فرخندہ حیران تھی۔

شادی میں دو ایک دن ہی رہ گئے تھے کہ ایک دن اماں نے فرخندہ سے کہا۔

" اے بیٹی یہ اپنے کمرے کو ذرا ٹھیک تو کر لے۔ جو بھی کاٹھ کباڑ اندر ٹھنسا ہے، باہر نکال دے۔ بیٹھنے کو کوئی ستھری جگہ تو ہو۔" اماں کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے فرخندہ ٹھٹک گئی۔ اسے بشریٰ کی چیزوں کو وہاں سے ہٹاتے ہوئے سر جھکاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کشمکش و پیچ میں رہنے کے بعد آخرکار اس نے کمرہ صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے اس نے ریک کو صاف کیا۔ فلمی رسالے اور سستے ناول نکال کر اس نے باہر صحن میں پھینک دیئے اور ان کی جگہ انگلش اور اردو کے چند معیاری ناول سجائے۔ میز سے بشریٰ کی الٹی رکھی ہوئی تصویر ہٹا کر نیا میز پوش بچھایا۔ اور اس پر ایک خوبصورت سا چھوٹا ٹیبل لیمپ رکھ دیا۔ میلی چادر والا بستر اور چارپائی بھی وہاں سے ہٹا دی اور کھڑکی کے قریب بڑا پلنگ بچھا کر اس پر نیا بستر لگایا۔ نیا تکیہ۔ نئی کاڑھی ہوئی چادر۔ دیواروں پر سے بشریٰ کے ہاتھ سے لگائے ہوئے کیلنڈر اور تصویریں اتار کر نئی تصویریں اور کیلنڈر لگائے۔ صرف ایک تصویر کو ہٹانے کی وہ ہمت نہ کر سکی یہ ایک گول مٹول سرخ کپڑوں میں ملبوس بچے کی تصویر تھی۔ موٹے موٹے سیب کی طرح سرخ سرخ سفید رخسار۔ نیلے پانیوں جیسی نیلی موٹی اور گہری آنکھیں۔ کیسا خوبصورت بچہ تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر اسے اچانک بشریٰ کے بچے کا خیال آیا۔ کیا اس کا بچہ بھی ایسا ہی سرخ سفید اور موٹا ہو گا۔ فرخندہ کا دل ان دیکھے بچے کی محبت سے بھر گیا۔ تبھی اُسے خیال آیا کہ اس نے سنا تھا کہ بشریٰ بیمار ہے۔

اس نے زمین پر گری ہوئی بشریٰ کی تصویر کو اٹھا کر دیکھا۔ بشریٰ مسکرا رہی تھی۔ فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔
اس نے دوپٹے کے پلّو سے تصویر کو صاف کیا اور پھر چپکے سے اُسے اپنے بکس میں چھپا دیا۔

فرخندہ اس نئے کمرے میں کرسیوں کی ترتیب کو ٹھیک کر رہی تھی کہ ابّا اچانک اخبار پوچھتے ہوئے اندر آ گئے۔ فرخندہ کو یوں لگا کہ جیسے وہ محض بہانہ سے اندر آئے ہیں۔ فرخندہ نظریں نیچی کئے کسی مجرم کی طرح کرسیاں ادھر سے اُدھر کرتی رہی۔ نہ جانے اسے ابّا سے کیوں شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔

"اخبار — آج کا اخبار کہاں ہے۔" اُن کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ انہوں نے گھومتی سی ایک نظر کمرے میں ڈالی۔ جُھک کر میز پر سے لیمپ کے قریب پڑی ہوئی تصویر اٹھائی۔

"اوہ!" تصویر انہوں نے فوراً نیچے رکھ دی۔ یہ بشیر کی تھی۔

فرخندہ نے دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

ابّا کی پھیکی۔ ویران اور بے رونق آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔ انہوں نے باری باری جُھک کر پلنگ اور ریک کو دیکھا۔ بشریٰ کی تمام نشانیوں اور یادوں کو مٹا دیا گیا تھا۔ اب وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے دیکھ کر بشریٰ بے اختیار یاد آ جائے۔

"اخبار نہیں ہے یہاں؟" انہوں نے جیسے وہاں بے مطلب کھڑے رہنے کا عذر پیش کیا۔ پھر باہر جانے کو مڑتے ہوئے اچانک ان کی نظر بند کھڑکی پر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے وہ ٹھٹھک گئے۔ انہیں وہ وقت یاد آیا جب اس کھلی کھڑکی کے پاس بشریٰ بڑے مزے سے بیٹھی الم غلم رسالے پڑھا کرتی تھی اور وہ دور صحن میں سر کے نیچے بازو رکھ کر لیٹے اس کی ان خودسریوں پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھایا کرتے تھے۔ بشریٰ انہیں اس کھڑکی کے بہت نزدیک بہت قریب محسوس ہوئی۔ انہوں نے مڑ کر فرخندہ کی طرف دیکھا پھر ان کے تھرتھراتے ہونٹوں کو جنبش ہوئی:

"اماں سے چابی لے کر یہ کھڑکی کھول دو۔"

[illegible]

طفیل صاحب تسلیم

میں نقوش کے مداحوں میں ہوں جو براہِ راست آپ کی قابلیت کا اعتراف ہے اس کے باوجود میں بصد احترام آپ کو
[illegible] کرتا ہوں نقوش کی تازہ اشاعت میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مقالہ "غالب اور حادثۂ اسیری" شائع ہوا ہے۔
ڈاکٹر نارنگ صاحب کی ان مایہ ناز ہستیوں میں سے ہیں جن پر اردو کو بجا طور پر فخر ہے۔ ان کے مقالے [illegible]
اور ان کے سلجھے ہوئے طرزِ بیان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ بھی ان کی وسعتِ نظر کی دلیل ہے لیکن صفحہ (۱)
[illegible] کا قصہ تاریخ پیش کرتے ہوئے ان کا اس قصۂ تاریخ کے متعلق یہ کہنا۔ "جو اس سلسلے میں [illegible]"
[illegible] پر منحصر ہے مکاتیبِ غالب صفحہ [illegible] پر تعلقات رام پور کے عنوان سے اس قصے کو پیش کرتے ہوئے مرزا غالب
کے واقعہ پر حسبِ ذیل حاشیہ بنا دیا گیا ہے:

"مرزا غالب کی قید کا پورا واقعہ یادگارِ غالب ۴۹، غالب ۱۲۳، غالب نامہ [illegible]
غالب ۳۰ میں ملاحظہ ہو۔ یہاں صرف یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ حادثہ [illegible] میں
پیش آیا تھا جو از روئے حساب ۱۲۶۳ھ کے مطابق ہے لہٰذا خواجہ صاحب مرحوم کا ۱۲۶۲ھ
تحریر کرنا کسی طرح درست نہیں اور نہ مولانا مہر کا یہ ارشاد صحیح ہے کہ ۱۲۶۳ھ کی عیدالفطر
۱۲ اگست ۱۸۴۷ء کو تھی اور عیدالاضحیٰ [illegible] نومبر ۱۸۴۷ء کو ہوئی کیونکہ ۱۲۶۳ھ کی عید
۱۴ اگست ۱۸۴۷ء کو ہوئی تھی اور ۱۸۴۶ء میں جو عیدالفطر ہوئی [illegible] ۱۲۶۲ھ کی تھی
اور غالباً ۲۲ ستمبر کے مطابق تھی۔"

مہر صاحب کے بیان میں ایک تسامح اور بھی ہے ان کا خیال ہے کہ مرزا صاحب کو ۲۵
جون ۱۸۴۷ء یا اس کے چند روز قبل گرفتار کیا گیا۔ اس خیال کی بنا خود ان ہی کے بیان
کے مطابق "احسن الاخبار" بمبئی کی ۲۵ جون کی اشاعت میں اس خبر کا شائع ہونا ہے۔ اوّل
تو یہی باور کرنا مشکل ہے کہ آج سے تقریباً سو برس پہلے [illegible] اخباروں کو دور دراز
مقامات سے ہر روز خبریں مل جاتی تھیں لیکن اس سے قطع نظر کر کے بھی ۲۵ جون [illegible]
سے چند روز قبل گرفتاری کا [illegible]

حاشیہ الاخبار کا جو اقتباس دیا ہے وہ فقرہ "دہلی ۱۵ جمادی الثانی" سے شروع ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ بیان ہونے والی خبر دہلی سے ۱۵ جمادی الثانی کو بھیجی گئی تھی ظاہر ہے کہ اس خبر سے متعلق واقعہ اسی تاریخ کا یا اس سے قبل کا ہوگا۔ بعد کا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ کی پندرہ تاریخ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء کے مطابق ہے لہذا مرزا صاحب کی گرفتاری ۳۱ مئی سے پہلے ہونی چاہیے۔ اخبار فوائد الناظرین (جلد ۲۔ نمبر ۱۰۔ مورخہ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء) میں دہلی کی خبروں کے تحت یہ عبارت درج ہے۔ ۲۵ ماہ مئی کو بیچ مکان مرزا نوشہ اسد اللہ خان صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی چنانچہ کوتوال صاحب یہ خبر پا کر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب کو مع اور قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے حق میں کیا حکم دیتے ہیں۔ یہ واضح ثبوت ہے اس امر کا کہ مرزا صاحب کی گرفتاری ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء مطابق ۹ جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ کو عمل میں آئی تھی۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ شاہ نصیر کے ایک شاگرد گھنشام لال عاصی دہلوی (متوفی بقول مرتب دیوان ۱۸۹۰ء و بقول خمخانہ جلد ۵ صفحہ ۴۴۳۔ ایام غدر ۱۸۵۷ء) نے اس واقعہ کے متعلق ایک قطعہ تاریخ لکھا ہے اور قطعہ کے ساتھ نثر میں واقعہ کی جزئیات پر روشنی ڈالی ہے اس کے مادہ ہائے تاریخ سے بھی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء نکلتے ہیں عاصی کی عبارت یہ ہے

مرزا نوشہ شاعر بے بدل دہلی۔ رند مشرب المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت ہو گئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرا دیا جس کی تاریخ مندرجہ ذیل نکالی گئی۔

سر ابجد سے فصلی میں تو سب "اظہار طوفان" ہے
اور اٹھارہ سو سینتالیس میں قید عنف بیان ہے
"قلق غالب" نہ کیوں کر موش اور گربہ کے دل پہ ہو
دہلی بلی کشا تی کان جو ہوں سے بد ذاں ہے
رہائی روز بد سے میرزا نوشہ کو کیوں کر ہو
زن محزوار۔ داں بن کر گیا فیض الحسن خاں ہے
سر باز و بچہ کر شمشیر تعتدی نے عاصی
اسد کو جوتیوں سے گھیر کر ڈالا بزنداں ہے

بغرضِ گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ میں تلاشی لینے آیا ہوں۔ اور
دھوکہ سے اندر داخل ہو گئے اور اندر مکان کے حضرات جوئے باز میں قید ہو گئے کہ باہر تک آواز
نہ گئی مگر زینہ کے اندر جمعیت بہت تھی اور کچھ امدادی برق انداز پہنچ گئے۔ گرفتار کر کے قید کرا دیا
بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے اور عدالت میں برأت کے ساعی ہوئے
مگر قید ہو گئی۔

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی۔ قیدیان جیل کو ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس
پہنچ گئے اور حال دریافت کیا آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا ؎

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں — کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا (کلام حامی ۲۶۳ صفحہ)

اس بیان سے یہ امور بالتصریح واضح ہو جاتے ہیں (۱) کوتوال کا نام (۲) گرفتاری کی تدبیر (۳) مرزا صاحب
اور اُن کے رُفقا کے ساتھ پولیس کا غیر شریفانہ سلوک (۴) رہائی کی سفارش کرنے والے کا نام (۵) اور
جس سے سفارش کی گئی تھی اس کا تعین (۶) مرزا صاحب کے ایک شعر کی وجہ نظم اور چونکہ یہ معاصرانہ
بیان ہے ہم اس سے خود مرزا صاحب کے بعض بیانوں کی تائید اور بعض کی تصحیح کر سکتے ہیں۔"

یہ حاشیہ ہے جو محترمی عرشی صاحب نے اپنی کتاب مکاتیبِ غالب میں غالب کی حراست کے واقعہ پر لکھا اس وقت میرے سامنے مکاتیبِ غالب کی تیسری اشاعت ہے جو ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ دوسری اشاعت ۱۹۴۲ء میں ہوئی ہے اس میں یہ حاشیہ کچھ مجمل طور پر موجود ہے بہرحال اگر ہم ۱۹۴۹ء کے تفصیلی حاشیہ کو ہی پیش نظر رکھیں تو بھی ڈاکٹر نارنگ کا یہ کہنا محلِ نظر ہے کہ غالب کی حراست کے سلسلہ میں حامی کا قطعہ آج تک پیش نہیں کیا گیا کیوں کہ پندرہ برس پہلے کا ثبوت تو مکاتیبِ غالب کی تیسری اشاعت نے دے دیا ہے۔

سب سے غالب کی حراست کے متعلق ڈاکٹر نارنگ کے اخذ کردہ نتائج تو وہ بھی تقریباً وہی ہیں جو مکاتیب کی اس اشاعت میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ڈاکٹر نارنگ جیسے "کتاب خور" کی نظر سے یہ کتاب نہ گزری ہو۔ بہرحال میں اس سلسلہ میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ نقوش کے محترم قارئین کو غلط فہمی سے بچانے اور ڈاکٹر نارنگ کی اطلاع کے لیے آپ مناسب طریقہ اختیار کریں۔

میرے اپنے خیال میں حامی نے قطعہ کے ساتھ نثر اپنے اشعار کی تفہیم کے لیے لکھی ہے کیوں کہ جب تک کوتوال کو رتھ میں بیٹھ کر جانا اور جوئے چلنے وغیرہ کا واقعہ معلوم ہو کہ کوتوال کا "زنِ غمزدہ" بن کر جانا اور اسد کو جوتیوں سے گھیر کر زنداں میں ڈالنا" یہ سب لفظ چیستان رہ جاتے ہیں۔

توقع ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام۔

مورخہ ۲۵ راگست ۱۹۶۰ء

راز یزدانی

عتیق بھائی!

"نقوش" کا تازہ شمارہ موصول ہوا اور اس میں "فراق کا تغزل" نامی مضمون پڑھ کر اچنبھا ہوا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی[1] نے ایک ساتھ بہت
اری باتیں چھیڑی ہیں اور جواب ایک کا بھی نہیں ڈھونڈ پائے۔ فراق کی شاعری کے بارے میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، وہ خود ان کے مضمون
صادق آرہا ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح پر ــــــ مضمون کا مطالعہ کرتے وقت صابر سے صابر شخص کے ذہن کو بے شمار جھٹکے لگتے ہیں
ر ذوق و شعور کو متوازن رکھنا آسان نہیں رہ جاتا۔ اسے پڑھ کر طبیعت کچھ اس درجہ برہم ہوتی ہے کہ مضمون کی معقولیت پر بھی شک ہونے
تا ہے۔ یہاں پر مضمون نگار نے خود اپنے طور پر بہت سے مفروضے تیار کر لیے اور اس کی بنیاد پر فراق کے تغزل کی کاٹ چھانٹ شروع
ر دی۔ وہ شاید یہ بھول گئے کہ فراق نے بیسویں صدی میں شاعری کی ہے، بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں نہیں۔ غالب کا دور ایک الگ
ر تھا اور فراق کا دور ایک الگ دور ہے۔ غالب کے دور پر فارسی اور عربی کی چھاپ تھی اور ان دونوں زبانوں کے پیچھے عرب کا
یران کا کلچر تھا۔ چنانچہ اس وقت کی شاعری میں اس کلچر کی خوبیاں اور خامیاں دونوں موجود تھیں۔

مغل شہنشاہ کے ہاتھوں سے فرمانروائی گئی اور انگریزوں کے سر پہ تاج سروری آیا۔ اب اردو پر انگریزی زبان اور
انگریزی کلچر کی چھاپ پڑنے لگی۔ ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار کے بعد ہی اقبال جیسی شخصیت نے جنم لیا۔ انھوں نے اردو
شاعری پر نگاہ ڈالی اور اپنی فکر کو تولا۔ اب ان کے سامنے سوائے بغاوت کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ بغاوت کو انھوں نے اپنا کر
اردو کو نئے نئے موضوعات دیے۔ ان موضوعات پر مختصر نظمیں اگر وہ غالب کو سناتے تو شاید غالب منہ بچکا بیٹھتے۔ بالکل اسی طرح
جیسے ڈاکٹر مغنی نے فراق کی شاعری سے منہ بچکایا ہے۔

انگریز گئے اور ملک کو آزادی ملی۔ اردو شاعری اب نئے موڑ پہ تھی۔ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اسے ہندی زبان کا
بھی اثر قبول کرنا تھا۔ اس بات کو تو سب ہی لوگ مانتے ہیں کہ فراق نے انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ ہندی اور سنسکرت زبانوں سے
بھی استفادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان زبانوں سے فائدہ اٹھائے گا اس کی شاعری پہ ان دونوں زبانوں کے کلچر اور اس کے
رنگا رنگ پہلوؤں کا بھی اثر پڑے گا۔ فراق کا لکھا ہوا "سراپا" خالصاً ہندی شاعری کی دین ہے۔ جائسی کی پدماوت (ہندی میں)
اٹھا کر پڑھ جائیے۔ جو "سراپا" (نک چھتر) انھوں نے "پدماوتی" کا کھینچا ہے اسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک نابینا شاعر
(ملک محمد جائسی کی آنکھ بچپن میں چیچک کی وجہ سے جاتی رہی تھی) نے اتنے کس بل کے ساتھ حسن پرستی شعار کی تھی۔ جائسی نے
"پدماوتی" کا جو "سراپا" لکھا۔ وہ ان کی پارہ سائز پہ چھپی ہوئی کتاب کے اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ مندرجہ ذیل حصے میں
ہندی سے ترجمہ کر کے دے رہا ہوں:

بال

"اس کے بال مثل بھونرے کے ہیں اور وہ مثل کمل مالتی کے ہے۔

---

(۱) عبدالمغنی صاحب پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرر ہیں۔ [illegible]

...پر جھکے ہوئے خوشبو لئے ہوئے ہیں
...پھول کی بات کرتی ہے تو ——
...سے آسمان تک اندھیرا چھا جاتا ہے ۔

مانگ

اُسکی مانگ ایسی ہے جیسے تلوار کی دھار پر خون
لگی آدھا جیسے چوٹی پر رکھ دیا گیا ہو
اور اُس مانگ میں جو موتی پرو دیے گئے ہیں
وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے جمنا میں گنگا ۔"

بھوں

سیاہ بھویں مثل کمان کے کھنچی ہیں
جس طرف اُٹھتی ہیں ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں"

پلک

پلکوں کا کیا بیان کروں ——
یا دو فوجیں آپس میں تیراندازی کر رہی ہیں
یا رام اور راون کی فوج جنگ کے لیے تیار ہے
دونوں پُتلیاں بیچ میں سمندر کی طرح لہرا رہی ہیں"

ہونٹ

اس کے سُرخ ہونٹ کو دیکھ کر جو آبِ حیات سے بھرے ہیں
[illegible]رو نے چکھنا بند کر دیا ——
گُلِ دوپہر کی طرح اُن لبوں کا رنگ سُرخ ہے
اور جب باتیں کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں"

دانت

"دانتوں کی قطار میں گویا ہیرے جڑے ہوئے
دانتوں پر مسّی جمتی ——
جیسے بھادوں کے اندھیرے میں بجلی کی لپک"

سینہ

"اُس کا سینہ مثل تھالی کے ہے جس میں دو ملدنے رکھے ہیں
جیسے سونے کے کٹورے اُلٹ کر رکھ دیے گئے ہوں
جیسے بھونرا اپنا نیش کلی پر چبھوتا ہے ۔
اُسی طرح اُسکی گلدریاں انگیا سے نکلنا چاہتی ہیں"

پیٹ

"اس کے پیٹ کی شکنیں مثل صندل کے ہیں
جو رنگ اور عطریت پر مثل زعفران کے ہیں
پیٹ کے روئیں مثل کالے ناگ کے ہیں
جو ناف سے نکل کر سینہ کی طرف مائل ہیں"

ناف

"اُس کی ناف مثل گردابِ بنارس کے ہے
اس کا سامنا وہ کرے جس کی قضا آئی ہو"

ران

"اُسکی دونوں رانیں اس طرح ہیں ——
جیسے کیلے کے دو سڈول پیڑ"

——

"شبِ عروسی" کے بیان میں تو جائسی رتن سین اور پدماوتی کے چشم دید گواہ ہو جاتے ہیں:

"مانگ کھل گئی اور گندھے ہوئے بال بکھر گئے
انگیا ریزہ ریزہ ہوگئی اور بند ٹوٹ گئے
چوڑیاں بالیاں اور کنگن سب ٹوٹ گئے

اور اب دیکھیے اسی موضوع کو سنسکرت میں دیکھیے :

"پانی کے وہ قطرے پاروتی کی لٹوں سے بہہ کر آنکھوں پر آئے اور آنکھوں سے نکل کر اس کے نا چشیدہ ہونٹوں تک پہنچے۔ گلاب جیسے ہونٹوں کو چوم کر وہ قطرے ناف تک پہنچے اور پھر کچھ اور نیچے کھسک کر ——— نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔"

[کمار سمبھو ۔ کالیداس]

کہنے کا مطلب یہ کہ :-

زیر و بم سینہ میں وُہ موسیقیِ بے صوت — یہ پنکھڑی ہونٹوں کی ہے گلزار بداماں

قامت ہے کہ کہسار پہ چڑھتا ہوا دن ہے — جوبن ہے کہ ہے چشمۂ خورشید میں طوفاں

ہر جنبشِ اعضا میں چھلک جاتے ہیں صد جام — ہر گردشِ دیدہ میں کئی گردشِ دوراں

کیسے اردو کی بنیں، ہندی اور سنسکرت ادب کی روایتیں ہیں اور وہ بھی سہمی ہوئی سی اور ہلکی ہلکی۔ ڈاکٹر مغنی نے مندرجہ بالا اشعار کو ہی "عورت کے سراپا کی ہیجان خیز تصویر" کہا ہے۔ اب دیکھیے جائسی کے سراپا کو کیا کہتے ہیں ؟

ہمارے یہاں کے مثنوی نگاروں نے کچھ "سراپا" لکھے مگر نہ جانے کیوں وہ سالم اور گوشت پوست کی عورت کو دیکھ کر سہم گئے۔ میر حسن اور دیا شنکر نسیم کا المیہ یہ تھا کہ انھوں نے پردے کے اندر والی "عورت" کو دیکھا اور اس عورت کا درشن ہی نہ کر پائے جو بازار میں "شاپنگ" کرتی ہے۔ کلب میں رقص کرتی ہے۔ فیکٹری میں کام کرتی ہے۔ اسپتال میں تیمار داری کرتی ہے اور فلم انڈسٹری میں پہنچ کر مردوں کو آنکھ مارتی ہے۔ اب خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ فراق کے "سراپا" میں بیسویں صدی کی اس "متحرک عورت" کی تصویر ہو گی یا میر حسن اور نسیم والی عورت کی۔ آج کے زمانے میں "سحر البیان" والی عورت "آؤٹ ڈیٹیڈ" ہے۔ اس طرح کی عورت کے بیان پر لوگ اس عورت کو بھی "ہوٹ" کریں گے اور اس شاعر کو بھی ڈائس سے اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔ فراق کے "سراپا" والی عورت تو اسی "تیر و کمان" والی عورت سے جو آج چست فراک اور تنگ شلوار پہنے ہوئے کناٹ پلیس اور میرین ڈرائیو پر نظر آتی ہے۔ اس "عورت" کو دیکھا دونوں (مغنی اور فراق) نے ہی مگر ڈاکٹر مغنی نے خوف کی وجہ سے صرف اتنا کہہ کر ٹال دیا کہ "جنس کا لطف احساس اور نا معلوم [illegible] جلوت میں اس کا اظہار و مظاہرہ یکسر وحشیانہ فعل ہے۔" لیکن فراق نے اسی "عورت" کو دیکھ کر اپنی شاعرانہ عافیت سنوار لی۔

مجیب اللہ مجیب

نقوش

کے سابقہ نمبر

			صفحات
۱	غزل نمبر	اُردو غزل کی پونے دو سو سالہ تاریخ	۷۵۲
۲	افسانہ نمبر	اُردو افسانے کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ	۱۰۹۰
۳	مکاتیب نمبر	اُردو خطوط کی سو سالہ تاریخ	۱۰۴۸
۴	شخصیات نمبر	مشاہیرِ ادب کی سو سالہ شخصی تاریخ	۱۵۱۴
۵	طنز و مزاح نمبر	طنزیہ و مزاحیہ ادب کی سوا سو سالہ تاریخ	۹۲۸
۶	لاہور نمبر	لاہور کی نو سو سالہ مستند مگر جامع تاریخ	۱۲۰۴
۷	ادبِ عالیہ نمبر	نقوش کی دس سالہ تخلیقات کا انتخاب	۱۲۷۲
۸	آپ بیتی نمبر	خود نوشت حالات، چار سو سالہ شخصی تاریخ	۱۹۶۴
۹	پطرس نمبر	پطرس کے سارے ہی مضامین کے ساتھ فن اور شخصیت پر مکمل کام	۶۴۰
۱۰	منٹو نمبر	منٹو کے منتخب افسانوں کے ساتھ فن اور شخصیت پر بھرپور کام	۳۸۴
۱۱	شوکت نمبر	شوکت کی اہم مزاحیہ تخلیقات کے ساتھ فن اور شخصیت پر دلچسپ کام	۶۲۴

اور ان کے علاوہ :-

آزادی نمبر — ناولٹ نمبر — پنج سالہ نمبر

دس سالہ نمبر — خاص نمبر اور — سالنامے

نقوش کے یہ نمبر دوبارہ چھپ رہے ہیں اگر ان میں سے کسی نمبر کی ضرورت ہو تو آج ہی آرڈر بک کرا دیں۔